JULY 2017

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU BOOKS AND MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

07 سرگزشت
داستان گو
ادارہ
آپ کی باتیں، آپ کے خیال، آپ کے مشورے اور آپ کے سوال

07 گفت و شنید
شہرِ خیال
مدیر اعلیٰ
ایک صفحہ میں مکمل، مختصر، مختصر ایک نادر روزگار کا تعارف

16 شخصیت
دانش مند دیوانہ
ضیا تسنیم بلگرامی
ایک مسلمان سائنس داں کا زندگی نامہ

33 ایمان افروز
عشقِ کامل
زویا اعجاز
اس صحابی کا ذکر جو زیارت رسول ﷺ سے محروم رہا

55 خراج تحسین
ہوائے حجاز
وسیم بن اشرف
اردو ادب کو اسلامی تاریخ سے سجانے والے کا قصہ

71 تحریر خاص
قوالی
تنویر ریاض
فن سماع پر ایک دلچسپ تحریر

81 پاسبان ہنر
شاعر خوشنوا
شاہد لطیف
پاکستان کے ایک ہر دل عزیز فنکار کا قصہ

87 فلم نگری
شہنشاہِ جذبات
انور فرہاد
پاکستانی فلمی دنیا کے ایک بڑے اداکار کا تذکرہ خاص

113 امتیاز
صلے کا دودھ
شفقت محمود
عرب سے درآمد ایک پراثر واقعہ

118 ذکر خاص
دکھی عورت
سلمیٰ اعوان
عالمی پیمانے پر مقبول فنکار کی بیوی کا قصہ

125 سفر کہانی
شمشال سے ٹورنٹو
ندیم اقبال
جاپانی اور الپائنی کا شہکار ایک الگ انداز کی داستان

ماہنامہ سرگزشت میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے جملہ حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں، کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔
● تمام اشتہارات نیک نیتی کی بنیاد پر شائع کیے جاتے ہیں۔ ادارہ اس معاملے میں کسی بھی طرح ذمے دار نہ ہوگا۔

sponsored
YouTube
YouTube
Health Care Club
To Get Notifications Follow Steps 1 & 2
STEP-1--->
Subscribe
<---STEP-2
چہرے کے فالتو بالوں کا
بہت ہی آسان علاج
Health Care Club
چہرے کی جھریوں کا
بہت ہی آسان علاج
Health Care Club
آم کے طبی
فائدے
Health Care Club
LIKE THIS VIDEO
Subscribe
خالص شہد کی پہچان
Health Care Club

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

معلومات 149
پیام بر
خالد قریشی
زمانہ قدیم کے پیام بر کا تذکرہ حالات کے تناظر میں

معاشرت 160
ناسور
ڈاکٹر عبدالرب بھٹی
ایک معصوم نوجوان کی خون رنگ، لہو گرما دینے والی داستان

پہلی سچ بیانی 200
قیمت
سیما صفدر
والدین کی پسند پر اپنی پسند کو فوقیت دینے کا انجام

دوسری سچ بیانی 215
چھتناز درخت
زرین قمر
ایک کچرا اٹھاتے والا کیسے چھتناز درخت بنا

تیسری سچ بیانی 225
دیر آید
کبیر عباسی
چادر سے زیادہ پاؤں پھیلانے کا یہی انجام ہے

چوتھی سچ بیانی 235
معذور
فرمان خان
اس نے معذور ہو کر بھی انتقام لے لیا

پانچویں سچ بیانی 243
عاجز
اعجاز احمد
وہ عاجز کر دینے کے فن کا ماہر تھا لیکن موت نے اسے عاجز بنا دیا

چھٹی سچ بیانی 248
مہرباں
اویس علی سید
ہمارے آس پاس کیسے کیسے جعلساز موجود ہیں

ساتویں سچ بیانی 261
غلط راستہ
ناظم بخاری
صحیح راستے کو اس نے چھوڑ دیا تھا

آٹھویں سچ بیانی 275
محسن
سلیم ناصر
جس نے اس کی زندگی بچائی اسی کی اس نے جان لے لی

نویں سچ بیانی 281
انتقام
مریم
اس نے عورت ہو کر بھی انتقام لے لیا

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہٰذا جن صفحات پر آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جلد 27 ❖ شمارہ 06 ❖ جولائی 2017ء

ماہنامہ سرگزشت کراچی

مدیرہ اعلیٰ: عذرا رسول

شعبۂ اشتہارات
نیجر اشتہارات محمد شہزاد خان 0333-2256789

قیمت فی پرچہ 60 روپے ❖ زرِ سالانہ 800 روپے

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول
مقامِ اشاعت: C-63، فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن
مطبوعہ: ابنِ حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی
خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

Phone: 35804200 Fax: 35802551
E-mail: jdpgroup@hotmail.com

MEMBER APNS
CPNE

قارئین کرام!

السلام علیکم!

مسجد سے ایک سپاہی نکلا، سر کی سفید ٹوپی کو اتار کر جیب میں رکھا اور سامنے کھڑے پھلوں کے ٹھیلے پر پہنچا۔ دو تین پھل اٹھائے، شاپر میں رکھا اور دوسرے ٹھیلے پر جا پہنچا۔ وہاں سے بھی دو تین پھل اٹھائے اور اس ٹھیلے پر آیا جہاں میں کھڑا تھا۔ وہاں سے بھی دو تین پھل اٹھائے تھے کہ میں نے کہا، یقیناً ان پھلوں سے افطار کریں گے تو اس نے جواب دیا۔ ”جی ہاں روزہ کھولنے کے لیے ہی تو پھل لے رہا ہوں۔“

”ان پھلوں سے افطار کریں گے تو کیا روزہ قبول ہو گا؟“

”کیوں نہیں ہو گا سیاست داں بھی تو حج عمرہ کرتے ہیں۔“ کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔

اس چھوٹی سی کہانی میں مجھے اپنا پورا معاشرہ نظر آ رہا ہے۔ کیا ہم سب اسلامی تعلیمات کو بھلا کر تباہی کی طرف نہیں بڑھ رہے ہیں؟ عذابِ خداوندی کو آواز نہیں دے رہے ہیں؟ بقول کمار پاشی

گھیرا ڈالے ہوئے ہیں دشمن بچنے کے آثار کہاں
خالی ہاتھ کھڑے ہو پاشی بچنے کے آثار کہاں

معراج رسول

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

داستان گو

ابھی اس کی عمر اتنی نہ تھی کہ وہ روزہ رکھتا پھر بھی اس نے روزہ رکھ لیا اور محلے کی مسجد میں باجماعت نماز ادا کرنے پہنچ گیا۔ خطیب مسجد عابد و زاہد بزرگ تھے وہ اسے وضو کا طریقہ بتانے لگے کہ اس طرح نیت کرتے ہیں اس طرح ہاتھ دھوتے ہیں۔ وضو کرانے کے بعد انہوں نے فخریہ کہا کہ اس بستی میں میرے جیسا مسائل بتانے والا نہیں ملے گا۔ کیونکہ اس بستی کا فرتوت مسلوب العقل ہو چکا ہے۔ ان کی یہ باتیں گاؤں کے پرانے نمبردار نے سنی تو غصے میں کہا۔ ”تم نے اس بچے سے کہا کہ مسواک کرنا روزہ میں ناجائز ہے مگر غیبت کرکے اپنے مردہ بھائی کے گوشت کھانے میں تامل نہیں کرتے۔“ یہ بات اس بچے نے گرہ میں باندھ لی۔ ابھی وہ اتنا چھوٹا تھا کہ زیب و زینت سے کوئی رغبت نہ تھی پھر بھی والد نے شوق میں اس کے لیے سونے کی انگوٹھی بنوادی۔ وہ انگوٹھی پہنے ہوئے دیگر بچوں کے ساتھ کھیل رہا تھا کہ ایک لالچی شخص کی نظر پڑ گئی۔ اس نے چند میٹھی کھجوروں کے عوض اس سے انگوٹھی لے لی۔ والد نے سنا تو کہا کہ اس میں بھی اللہ کی مصلحت ہے، مردوں پر سونا حرام ہے پھر بھی میں نے تمہیں دیا اور یہی بات اللہ کو پسند نہ آئی۔ جب تک والد زندہ رہے اس کی تربیت کا خوب خیال رکھا۔ تہجد کی نماز میں بھی اسے ساتھ رکھتے۔ ایک شب جب وہ اپنے والد کے ساتھ تہجد پڑھ رہا تھا اور گھر کے دیگر لوگ سو رہے تھے تو اس نے فخریہ کہا۔ ”ابا جان! ان نیند کے متوالوں کو نماز سے کوئی رغبت نہیں۔ ایسے غافل پڑے ہیں گویا موت نے انہیں سلا دیا ہے۔“ والد نے سنا تو تیوری چڑھا کر بولے۔ ”بیٹا اگر تم بھی سو جاتے تو خلق خدا کی غیبت کرنے سے بہتر تھا۔“ یہ بات اس کے ذہن سے چپک کر رہ گئی اور اس نے پھر کبھی کسی کی غیبت نہ کی۔ اس کا شہر شیراز تاتاری حملوں کی زد میں آیا تو شہر کا امن تباہ ہو گیا۔ مسجدیں ویران ہو گئیں۔ مجبوراً اس نے تحصیل علم کی خاطر بغداد کا رخ کیا۔ بغداد پہنچ کر اس نے مدرسہ نظامیہ میں داخلہ لے لیا۔ جستجوئے علم میں نظامیہ کے طلباء میں وہ امتیازی حیثیت کا حامل تھا جس کی وجہ سے دوسرے طلباء اس سے حسد کرتے۔ ایک دفعہ اس نے اپنے استاد شمس الدین ابوالفرج ابن جوزی سے شکایت کی کہ فلاں طالب علم مجھ سے حسد کرتا ہے۔ اس پر استاد نے کہا کہ تمہیں دوست کا حسد کرنا برا لگا لیکن اپنی غیبت کی عادت بری نہیں لگی۔ اس بات نے اسے اپنے مرحوم باپ کی نصیحت یاد کرادی اور اس نے پھر سے توبہ کرلی اس نے شیخ شہاب الدین سہروردی کو اپنا روحانی پیشوا مان لیا تھا۔ جب بغداد کا امن بھی تاتاریوں نے تاراج کردیا تو وہ اپنے روحانی پیشوا کے ساتھ حجاز چلا گیا۔ ایک دفعہ وہ فاریاب کے ایک بوڑھے درویش کے ساتھ ہمسفر تھا۔ ایک جگہ دریا پار کرنے وہ دونوں رکے۔ کشتی سے دریا پار کرنا تھا۔ اس کے پاس صرف اتنے پیسے تھے کہ وہ اپنا کرایہ ادا کر سکے جب کہ اس بوڑھے درویش کے پاس ایک درہم بھی نہ تھا۔ ملاح نے درویش کو ساتھ لینے سے انکار کردیا اور صرف اسے لے کر پار چل دیا۔ درویش نے پانی پر مصلیٰ بچھایا اور دوسرے کنارے پہنچ گیا۔ جب دونوں کی ملاقات دوسرے کنارے پر ہوئی تو اس نے درویش سے پوچھا۔ آپ کیسے آئے۔ درویش نے جواب دیا کہ تم کشتی سے آئے اور مجھے میرا خدا لے کر آیا۔ وہ اس بیان سے بہت متاثر ہوا اور درویشانہ انداز میں زندگی گزارنے کا قصد کرلیا۔ یاد خدا میں محو ہونے کے لیے اس نے آبادی سے دور ویرانے کو پسند کیا اور فلسطین کے بیابان قدس میں گوشہ نشین ہو گیا۔ صلیبی جنگ کے ایام تھے عیسائی فوجیوں نے اسے گرفتار کرکے خندق کھودنے پر لگا دیا۔ اتفاقاً حلب کے ایک واقف کار امیر سے اس کی ملاقات ہوگئی اس نے دس دینار دے کر اسے چھڑا لیا اور حلب لے آیا۔ یہاں لا کر سو دینار حق مہر میں اپنی بیٹی سے نکاح کرادیا۔ بیٹی زبان دراز تھی۔ اس نے طعنہ دیا کہ مت بھولو تمہیں میرے باپ نے دس درہم میں خریدا تھا۔ اس نے بیوی کو جواب دیا۔ ”اور تمہیں سو درہم میں مجھے بیچ دیا۔“ یہ سنتے ہی بیوی نے توبہ کرلی۔ اتنی سیر و سیاحت سے وہ جب ادب گیا تو اس نے وطن کا قصد کیا اور دوستوں کے لیے اس نے ”بوستان“ تیار کیا جس کے دس دروازے (باب) بنائے عدل، احسان، عشق، تواضع، رضا، قناعت، تربیت، شکر، توبہ اور مناجات۔ یہ کتاب بروز جمعہ ماہ ذیقعد 655ھ میں مکمل کی جسے دنیا جہاں نے پسند کیا۔ یہ ذکر ہے شیخ سعدی کا جن کی داستان و بوستان نے ایک دنیا کو گرویدہ کرلیا، جنہوں نے فارسی ادب کو بے بہا تحفے دیے۔

☆☆☆

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

شہرِ خیال

مدیراعلیٰ

☆نزابت افشاں مہورہ فتح جنگ سے لکھتے ہیں۔ ”رمضان المبارک کی آمد کے ساتھ سرگزشت کا دیدار ہوا۔ اداریہ ہمیشہ کی طرح بھرپور اور حقیقت پر مبنی تھا۔ امیر خسرو بہت عظیم شاعر تھے لیکن کچھ عوامی بولیاں اور کافیاں وغیرہ جو آج بھی بعض دیہاتوں میں شادی بیاہ کے موقع پر گائی جاتی ہیں ان کو ان سے منسوب کر دیا گیا لیکن اس میں شک نہیں کہ آپ ایک عظیم شاعر تھے۔ دیوانِ امیر خسرو آپ کی شاعرانہ عظمت پر شاہد ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس بار ایک اور نابغہ روزگار شاعر کی داستانِ حیات پیش کر کے ہمارے دل جیت لیے۔ باقی تحریر اپنی مثال آپ تھی۔ زین مہدی نے اس بار ”راجا گدھ“ کی خالق بانو قدسیہ پر لکھ کر حق ادا کر دیا۔ بانو قدسیہ اور اشفاق صاحب کا نام ہمیشہ ادب و احترام سے لیا جائے گا۔ ”نایاب پرندے“ اچھی تحریر تھی مگر بلبل کے حوالے سے جو اشعار لکھے گئے ان میں غلطیاں تھیں۔ صفحہ نمبر 95 پر اکبرالٰہ آبادی کا ایک شعر بغیر ان کے نام کے چھپا اور شعر تھا بھی غلط۔ درست شعر یوں ہے ”آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں۔ تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے قوم!“ (معروف شعر ہے اور یہی درست مانا جا رہا ہے۔ قوم کا لفظ کلیات میں بھی نہیں ملا)۔ باقی بفضلِ خدا یہ تمام پرندے ہمارے علاقے میں عام پائے جاتے ہیں۔ میں صبح و شام ان کی آوازیں سنتا ہوں۔ ”فن پارے“ مختار آزاد کی مختصر مگر اہم تحریر تھی۔ ایاز راہی صاحب بھی قدیم کتب خانوں کی سیر کرانے میں مصروف تھے۔ ”شمشال سے ٹورنٹو“ اپنے عروج پر ہے۔ ندیم صاحب سے گزارش ہے کہ ”شہرِ خیال“ میں بھی تشریف لائیں۔ ”ناسور“ میں نعمان کی وکیل دوست پر حملہ کیا گیا۔ اب دیکھیے آگے کیا ہوتا ہے۔ ”خود اعتمادی“ میں سعدیہ نے کمال کی منصوبہ بندی کر کے اپنے گھر کو ٹوٹنے سے بچالیا۔ ”اسیرِ ذات“ بہت زبردست کہانی تھی۔ ایسی کہانیاں ہی سبق آموز کہلا سکتی ہیں۔ تیرا بھائی، ایک موقع، گم شدہ، جیسی کرنی اور آئیڈیل بہترین تحریریں تھیں۔ اقتباسات بھی بہت پسند آئے مگر صفحہ نمبر 114 پر جوش کے بارے میں اقتباس شائع ہوا وہ غلطیوں سے پُر تھا۔ مراسلہ نگار نے لکھا کہ جوش 5 دسمبر 1894ء کو پیدا ہوئے جب کہ جوش نے خود اپنی پیدائش 1896ء لکھی ہے (متعدد کتابوں میں سن پیدائش الگ الگ ہے) جوش کے والد کا نام شبیر احمد خان نہیں۔ بشیر احمد خان تھا وہ بھی شاعر تھے۔ (ایسا سہواً ہوا ہے)۔ اعجاز صاحب صدارت پر فائز تھے اور عمدہ تبصرے کے ساتھ حاضر تھے۔ غلام حسین ضیا جامع تبصرے کے ساتھ موجود تھے۔ عبدالجبار رومی، انور عباس شاہ بھی اپنے اپنے انداز میں براجمان تھے۔ عریشہ نے سمندری سے حاضری لگوائی۔ انجم فاروق ساحلی اور رانا شاہد بھائی بھی خوب گہرائی سے تبصرہ کرتے ہیں۔ رانا بھائی آپ کی محبتوں کا بہت بہت شکریہ۔ منشی محمد عزیز مے آندھی و طوفان کی طرح آئے اور گزر گئے۔ بہت عرصے کے بعد موصوف نے اپنا دیدار کرایا۔ خوش رہیں۔ آپا طاہرہ اس بار غیر حاضر تھیں۔ انور عباس شاہ اور سسٹر سدرہ بانو ناگوری آپ نے یاد کرنا بھی گوارا نہیں کیا۔ آخر اس ناچیز کا قصور کیا ہے؟“

☆اعجاز حسین سحار کی آمد نور پور تھل سے۔ ”تھل کے علاقے میں مئی کی تپتی دوپہر، آگ برساتا سورج اور دن ڈھلنے کے ساتھ موٹی ریت کو اڑاتی تیز ہوائیں چل رہی ہوں تو من پسند سرگزشت کی آمد، اپنوں کی محفل اور میٹھی باتیں ٹھنڈی پھوار سے کیا کم ہوں گی۔ پھر خود کو مسند صدارت پر فائز دیکھ کر خوشی سے پھول گئے۔ ملک ثاقب شاد تونلی ایڈووکیٹ نے سراہا۔ جذبے جوان کر دیے شکریہ قبول کیجیے۔ عمران خانم عریشہ اور نزابت افشاں مہورہ نے یاد کیا۔ نیک خواہشات قبول کیجیے۔ اسلام آباد کے رقبے پر آغا نیاز مگسی کی طرح مجھے بھی حیرت ہے۔ اگر لمبائی میں کلو میٹر اور چوڑائی میں کلومیٹر ہو تو یہ 900 کلومیٹر رقبہ پر محیط ہوگا۔ ”جون کی شخصیات“ میں ساری توجہ وسیم اکرم نے کھینچ لی اور ہم اپنے ہیرو کے کارناموں اور ریکارڈز میں کھو کر رہ گئے اور ٹی وی پر دیکھے گئے کئی یادگار میچز اور سنسنی خیز لمحات آنکھوں کے سامنے آ گئے۔ ”نایاب پرندے“ میں سعید احمد سلطان سے معمولی اختلاف کروں گا۔ بٹیر، تیتر، بلبل اور فاختہ بالکل نایاب نہیں ہوئے ہیں۔ (لکھا گیا ہے کہ نایاب ہوتے جا رہے ہیں)۔ ایک مختصر الوجود سیاہ چڑیا بھی ان کے ساتھ شامل رہتی ہے۔ البتہ طوطا، کونج، تکور، تلیئر اور قیمتی شکاری پرندے نایاب ہو گئے ہیں۔ گلر کہار

اور شوقیہ پالنے والوں کے پاس مور بھی دکھائی دیئے جاتے ہیں۔ میانوالی اور بھکر میں بٹیر اور تیتر پالنے، لڑانے اور نسل بڑھانے والوں کی کمی نہیں ہے۔ تمام پرندوں سے متعلق معنف نے سیر حاصل معلومات لکھی ہیں جو قابل داد ہیں۔ ''ناسور'' میں عبدالرب بھٹی کی کرداروں پر گرفت مضبوط ہے۔ سچ بیانیوں میں ''خود اعتمادی'' کی سعدیہ کو حسب منشا نتائج حاصل ہو گئے لیکن تمام مرد علی کی طرح سیدھے اور بے ضرر نہیں ہوتے۔ جب فطرت پردیسی پرندوں جیسی ہو اور ٹہنی ٹہنی بیٹھنے کی عادت ہو تو بھلا ساتھ دینے والوں کی کہاں کمی ہوتی ہے۔ تو نہ سہی، اور کئی۔ بیسیوں دوسری انتظار میں ہیں تب مسز حسن کے تجربات اور مشورے الٹا گلے کا پھندا بن جاتے ہیں۔ یہ سعدیہ کی خوش قسمتی رہی کہ وقت کی زنجیر ہاتھ آگئی ورنہ علی کو ان سرگرمیوں کا شک ہو جاتا۔ سمیرا انتقام اور فواد بلیک میلنگ پر اتر آتا تو بدنامی اور شک کا ناگ سب کو ڈس چکا ہوتا۔ یہاں خود اعتمادی دکھانے سے زیادہ جوا کھیلا گیا جس میں جیت کا جتنا جشن منایا جائے، کم ہے۔ ''جنونی'' میں شائلہ کی عقل مندی کی وجہ سے وہ کسی سانحے سے بچ گئی وہ کالج میں شہرم سے غصہ کے ساتھ پیش آتی، نفرت کا اظہار یا دھتکار دیتی تو اس کے سمندر میں ڈوبنے کی نوبت ہی نہ آتی وہ پہلے ہی کوئی کارنامہ سرانجام دے چکا ہوتا اور شائلہ کی ذات سے بے شمار افسانے منسوب ہو چکے ہوتے۔ ''قرض'' ہمارے معاشرے کا کریہہ، تاریک اور چھپا ہوا چہرہ ہے۔ جیسا کردار انور اور عامر کا ہے یہ انوکھی بات نہیں ہے۔ تربیت کا فقدان، والدین کی تربیت اور دوستوں کے انتخاب میں معمولی غلطی انسان سے حیوان بنا دیتی ہے۔ درندے کی طرح جب ایک بار منہ کو خون لگ جائے تو پھر بے چینی فطری بات ہے لیکن مواقع ملنے کے باوجود بھی وہ نہ سدھر سکے۔ سبق حاصل کرنا اور توبہ تائب ہونا سرشت میں شامل نہ تھا۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ ان کے کرتوتوں کا سارا بوجھ اولاد کو اٹھانا پڑا۔ جو سزا نسرین کو ملی اس سے بڑھ کر حق دار تھی لیکن جو اذیت قریبی لوگوں کو پہنچائی ذہنی صدمے اور محلے میں شرمندگی سے سامنا رہا اس کا خون بہا کون دے گا۔ کہانی کے بکھرے اور الجھے واقعات کو زویا اعجاز نے خوب صورتی سے لفظوں کی مالا میں پرو دیا ہے اس کے لیے وہ بجا طور پر مبارک باد کی مستحق ہے۔ ''اسیرِ ذات'' میں عارفہ نے جیسی قربانی دی ہے ایسی مثالیں کم دیکھنے میں آتی ہیں۔ ''گمشدہ'' جیسے مافوق الفطرت واقعات دماغ میں ہلچل مچا دیتے ہیں اس لیے پڑھنے والا کچھ کہنے، سننے اور تبصرہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں رہتا۔ ''ایک موقع'' میں سنجیدہ معاملات سے ہٹ کر دوستوں کی معصوم خواہشات اور خود اعتمادی نے لبوں پر مسکراہٹ لا دی کیا ہی اچھی خبر ہو کہ عملی زندگی میں انہوں نے اپنا مستقبل سنوارنے کے لیے جو منصوبہ بنایا ہوا ہے اسی ثابت قدمی سے پایۂ تکمیل تک پہنچایا ہو، اگر یہ خواب سچا ہے تو ہماری نیک خواہشات بھی اپنی دعاؤں کے ساتھ شامل رکھیں۔ ''آئیڈیل'' میں نجمہ سے بے شمار غلطیاں ہوئیں وہ اپنی عزت، جسم اور وقار بھی نیلام کرتی رہی اور شادی شدہ ہوتے ہوئے خاوند کے ساتھ والدین کی رسوائی کا سامان کیا لیکن معاف کرنے والے آنکھوں دیکھے مناظر کی پروا نہیں کرتے لیکن طارق میری نظروں میں عورت کی توہین کے مرتکب ہوئے ہیں۔ وہ بیوی سے علیحدگی کا حق محفوظ رکھتے تھے لیکن انتقام لینے کا انداز پسند نہیں آیا۔ رافعہ نے کتنے خلوص اور ہمدردی سے معاملات سلجھانے کی کوشش کی۔ نجمہ کے سامنے وجیہہ مردوں کے اندر کا گند مثالوں سے سمجھایا پھر اسے قائل بھی کر لیا۔ دوبارہ ملاپ کے بعد کیسا خوب صورت گھرانا وجود میں آتا تھا لیکن طارق کی دشمنی اور نفرت کی پالیسی نے تمام منصوبے خاک میں ملا دیئے اب نجمہ کے پاس زندہ رہنے اور لوگوں کا سامنا کرنے کا حوصلہ ہی نہ ہوگا۔ شاید وہ پاگل ہو چکی ہو کیونکہ نارمل زندگی گزارنا اور معنی خیز نظروں کے تیروں کی اذیت برداشت کرنا ناممکن ہے۔ تمام دوستوں کو عیدالفطر کی خوشیاں پیشگی مبارک ہوں۔''

☆ پری زاد جہاں نے سیالکوٹ سے لکھا ہے۔ ''اف اس قدر گرمی ہے لیکن جو مزہ گرمی کے موسم میں املی کا شربت اور گول گپے کھانے کا ہے وہ بھلا کسی اور شے کا کیسے ہو سکتا ہے۔ ہم تو کالج سے واپسی پر پہلے گول گپے ہڑپ کرتے ہیں پھر سرگزشت خریدتے ہیں۔ اصل مسئلہ تو یہ ہے کہ ہمیں کوئی رسالہ، ڈائجسٹ وغیرہ پڑھنے ہی نہیں دیتا۔ خط بھی چھپ کر لکھتے ہیں مگر جو مزہ سرگزشت کا ہے وہ ٹی وی ڈراموں کا بھی نہیں ہے۔ ہمارے ہاں اور کالج میں ڈائجسٹ کو تقریباً حرام مانا جاتا ہے۔ اب کھٹی کھٹی املی کھاتے ہوئے ان کہانیوں پر تبصرہ کرتے ہیں۔ سب سے پہلے جس کہانی کو پڑھتے ہوئے خوشی ہوئی وہ ''نایاب پرندے'' تھی، واہ مزہ آگیا۔ معنف نے تو کمال ہی کر دیا۔ ''آپا جی'' بھی بہت عمدہ پائے کی کہانی تھی۔ معنف نے تو بہت زبردست لکھا۔ ''فن پارے'' بھی اعلیٰ کہانی تھی۔ بہت بہت مزہ آیا۔ نزابت افشال کا خط بہت اچھا تھا۔ نزابت نام کے معانی بتایئے گا اور ہاں ''بیت بازی'' میں ہادیہ، ماہا ایمان، موسوا اقبال، رومی، ماہ نور کے اشعار بہت عمدہ لگے۔ ہائے کاش ہمارا بھی ''علمی آزمائش'' میں انعام نکل آئے۔''

☆ ندیم اقبال کا ای میل مشی گن امریکا سے۔ ''سب سے پہلے تو میں ان دوستوں کا شکریہ ادا کروں گا جنہوں نے ''تانگا پربت کا عتاب'' خرید کر مجھے احسان مند کیا۔ میرے پبلشر ''رنگ ادب'' سے مجھے بتایا گیا ہے کہ جن لوگوں نے کتاب منگوائی ہے ان میں اکثریت سرگزشت کے قارئین کی ہے۔ سرگزشت میں جن لوگوں نے مجھے کتاب کی مبارک باد دی ہے۔ ان کا بھی شکریہ۔ اب آتے ہیں جون کے شمارے پر۔ نوائے خلیل، ڈاکٹر ساجد امجد کی ایک بہترین تحریر ہے۔ ادیب کی پوری زندگی کھول کر رکھ دی۔ ''آپا جی'' بھی نہایت عرق ریزی سے مرتب کی گئی ہے۔ محترمہ بانو قدسیہ کی زندگی کے وہ گوشے بھی عیاں کر دیے ہیں جن کے بارے میں ہمیں علم نہ تھا۔ ''جون کی شخصیت'' بھی پسند آئی کہ مختصر پیرائے میں بہت سے لوگوں کا تعارف کرا دیا۔ ''بابائے سندھی فلم'' میں انور فرہاد نے پاکستانی فلمی صنعت کے گوہر آبدار کا تعارف کرا دیا۔ ''سدا بہار صداکار'' میں زبیر الدین کے بارے میں پڑھ کر افسوس ہوا۔ ہم خود بھی عرصہ دراز تک انہیں پی ٹی وی پر دیکھتے رہے ہیں۔ اتنے سینئر براڈ کاسٹر کو اب تک وہ مقام نہیں دیا گیا جس کے وہ حقدار تھے۔ فن پارے، بہت مختصری تحریر تھی لیکن اچھی تھی ان باتوں کا تذکرہ

URDUSOFTBOOKS.COM

ہم نے اپنے سفرنامے میں بھی کیا تھا کہ ان فن پاروں کو محفوظ کیا جائے۔ قارئین کو یقیناً یاد ہوگا۔ ہمارا خیال ہے کہ ہم نے زیادہ تفصیل سے ان فن پاروں کا تذکرہ کیا تھا۔ سچ بیانیوں میں خوداعتمادی اور آئیڈیل بہت پسند آئی۔ اعجاز حسین سٹھار، جسے غلطی سے اعجاز احمد کر دیا گیا ہے کیونکہ ہمیشہ اعجاز حسین سٹھار پڑھتا رہا ہوں، کا خط بہت پسند آیا خوب لکھا ہے۔ ملک ثاقب اور محمد عمران خان کے خطوط بھی پُراثر تھے۔ غلام حسین ضیاء، عبدالجبار رومی، انور عباس شاہ، رانا محمد شاہد، عریشہ، منشی عزیز مے، آفتاب احمد، نصیر اشرفی، رضا احمد اعوان، نزاہت افشاں، سدرہ بانو ناگوری تو گویا سینئر تجزیہ کار ہیں اس لیے ان کے خطوط تو پسند آئیں گے ہی۔ دیگر ''عمیرِ خیال'' کے لوگوں نے بھی خوب لکھا آخر میں ایک بار پھر تمام دوستوں کا شکریہ کہ وہ ''شمشال سے ٹورنٹو'' کو پسند کر رہے ہیں۔''

☆ رانا محمد شاہد بورے والا سے لکھتے ہیں۔ ''امیر خسرو کے حوالے سے یک ملکی سرگزشت دلچسپ رہی۔ امیر خسرو اپنے عہد کے ایک بڑے اور عظیم شاعر تھے۔ اداریہ میں معراج رسول صاحب نے نہایت حساس اور باریک نکتے پر معاشرتی آئینہ دکھایا۔ یہ ہماری عادت اور نفسیات ہے کہ ہم طاقتور سے مرعوب ہو جاتے ہیں اور کمزور کو مغلوب کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ ''عمیرِ خیال'' میں اعجاز حسین سٹھار کرسیٔ صدارت پر تھے۔ ملک ثاقب شاہ کا تبصرہ بھی عمدہ تھا۔ عبدالجبار رومی نے مختلف علاقوں کے جو دو نام بتائے ہیں، گھسیٹ پورہ اور چنٹل چک یہ واقعی دلچسپ و عجیب ہیں۔ عریشہ کے ای میل میں آپ نے بتایا کہ ''اس ماہ کی شخصیت'' کا یہ آخری سلسلہ ہے۔ مشہور شخصیات کے حوالے سے یہ ایک منفرد اور معلوماتی سلسلہ تھا۔ اسے کیوں بند کر دیا گیا (قارئین کی دلچسپی کم ہو رہی تھی۔ محترمہ صائمہ اقبال کچھ نیا پیش کرنے والی ہیں) منشی محمد عزیز کافی عرصے بعد نظر آئے۔ نزاہت افشاں شاعروں کے حوالے سے آپ کی معلومات زبردست ہیں۔ اس حوالے سے کوئی تحقیقی مضمون تحریر کریں۔ آغا نیاز مگسی کی میرے مضمون کے حوالے سے تشنگی ضرور دور ہو گئی ہوگی۔ سدرہ بانو ناگوری بھی بالآخر نظر آ گئیں۔ تعلیمی ایڈیشن میں ان کی تحریر پڑھی تھی۔ معروف رائٹر اور ناول نگار ایم اے راحت انتقال کر گئے۔ ڈائجسٹ کی دنیا میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے، (آمین)۔ ڈاکٹر ساجد امجد اس دفعہ بھی اردو کے ایک معروف فنکار خلیل الرحمٰن اعظمی کا زندگی نامہ لے کر آئے۔ اردو کے ان محسنوں کی زندگیوں پر لکھ کر ڈاکٹر صاحب یقیناً اردو ادب کی خوب خدمت کر رہے ہیں۔ کیونکہ اکثر ان ادیبوں و شاعروں کے کام سے تو ہم آگاہ ہوتے ہیں جب کہ ان کی زندگیوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ ڈاکٹر صاحب یہ کام بخوبی نبھا رہے ہیں۔ اردو ادب کا ایک اور معروف نام ہر دلعزیز مصنفہ بانو قدسیہ (آپا جی) کے بارے میں زین مہدی کی تحریر دلچسپی سے بھرپور تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ بانو آپا اور اشفاق احمد سے زیادہ اردو ادب کی خدمت کسی نے نہیں کی۔ دونوں نے اردو ادب کو شاہکار ناول اور ڈرامے دیے۔ زین مہدی کے خوب صورت اندازِ بیاں نے تحریر کو دلچسپ بنا دیا۔ صائمہ اقبال نے جون کی جن 4 شخصیات پر تحریر رقم کی۔ ان سبھی نے اپنے اپنے شعبوں میں کارہائے نمایاں سرانجام دیے۔ میرے خیال میں تو اس معلوماتی سلسلے کو بند نہیں ہونا چاہیے بلکہ غیر ملکی شخصیات کو بھی شامل کر کے اسے مزید دلچسپ بنایا جا سکتا تھا۔ ''نایاب پرندے'' سعید احمد سلطان کی معلوماتی تحریر تھی۔ جیسے مینا، بٹیر، تیتر، بلبل اور فاختہ نایاب ہوتے جا رہے ہیں۔ اسی طرح ایسی تحریریں بھی نایاب ہیں۔ پرندوں کی نفسیات پر بہت خوب لکھا گیا۔ انور فرہاد فلمی موضوعات پر بہت اچھا لکھ رہے ہیں۔ اس دفعہ بابائے سندھی فلم شیخ حسن پر تحریر لائے۔ سندھی فلم ''عمر ماروی'' کے بارے میں ہم زیادہ نہیں جانتے البتہ پی ٹی وی ڈرامے عمر ماروی نے خوب شہرت سمیٹی تھی۔ شکور پٹھان کی ''سدابہار صداکار'' پی ٹی وی کے اچھے دنوں کی خوب صورت یادیں ہیں۔ انہوں نے صحیح کہا کہ انسان جتنا بھی ترقی کر لے۔ اپنے خوب صورت اور جدوجہد والے دنوں کی یادوں کو بھلا نہیں پاتا۔ یہاں تو معروف لوگوں کو ان کا حق نہیں ملتا۔ زبیر الدین صاحب کو کون پوچھے گا۔ مریم اقبال کا سفرنامہ حسبِ معمول دلچسپی لیے ہوئے تھا۔ ایاز راہی کی ''کتب خانے'' اور طارق عزیز خان کی ''ہنری ملاح'' مختصر مگر معلوماتی تحریریں تھیں۔''

☆ احمد خان توحیدی کا مکتوب راولپنڈی سے۔ ''سرگزشت بائیس تاریخ کو مل گیا۔ اوّل تو سب ساتھیوں کو مقدس رمضان المبارک کی مبارک کے ساتھ پیشگی عید مبارک۔ شاعرِ شاہی امیر خسرو کے بارے میں پڑھا۔ تفصیلی حالات کبھی شائع ہوئے ہوں تو مجھے یاد نہیں۔ ڈاکٹر ساجد امجد والیاس سیتاپوری صاحب کے تفصیل سے حالاتِ زندگی لکھیں تو اور مزہ آئے گا۔ برادر معراج رسول صاحب آپ اپنی باتوں کا خود ہی جواب دے دیتے ہیں۔ یہاں جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا قانون ہے۔ ''عمیرِ خیال'' میں اعجاز حسین سٹھار طویل جاندار تبصرہ لیے جلوہ افروز تھے۔ مبارکاں جی۔ غلام حسین ضیا بھکر نے اور طاہر گلزار کا اشارہ لوڈشیڈنگ اور گرمی کی طرف تھا۔ ساجد تنولی، رومی انصاری، نزاہت افشاں، سدرہ ناگوری، رانا شاہد، عریشہ سمندری، آفتاب اشرفی بھی اچھے تبصرے کے ساتھ آئے۔ ''نوائے خلیل'' ڈاکٹر ساجد کی اچھی تاریخی تحریر تھی۔ پلیز مولانا مفتی محمود، شیخ القرآن مولانا غلام اللہ خان راولپنڈی، مولانا غلام غوث ہزاروی، شہنشاہِ خطابت علامہ عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری، شاہ احمد نورانی، بابائے اتحاد نوابزادہ نصر اللہ خان کے بارے میں بھی لکھیں۔ زین مہدی کی آپا جی بیوٹی فل گھریلو تحریر جیسی تھی۔ صائمہ اقبال کی شخصیات دیکھی بھال ہیں۔ کوئی اور سلسلہ شروع کریں۔ نایاب پرندے کو بچوں نے بھی شوق سے پڑھا اسے جاری رکھیں۔ سدا بہار صداکار اور شکور پٹھان کے بارے میں عرض ہے۔ محنت اور نیک نیتی سے سب ملتا ہے۔ ڈاکٹر بخشی صاحب ''ناسور'' خوب جاری ہے مگر انجام جاننے کے لیے دو سے تین قسط زیادہ بہتر رہتی ہیں۔ سعدیہ نے مشورہ پر عمل کر کے واقعی ناممکن کو ممکن بنا کر تخت پر قبضہ کر لیا۔ ''جنوبی'' شہرم جیسے لوگ واقعی سب کچھ کر گزرتے ہیں۔ ''قرض'' عامر انور جیسے لوگ روزِ حشر جیسا کرو گے ویسا بھرو گے۔ ''اسیرِ ذات'' میں عارفہ کی

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS

قربانی وایثار لاجواب، بھیا بہت کم ظرف ثابت ہوا۔ ''گمشدہ'' ایسے واقعات واقعی پیش آتے ہیں، دفن کے بعد صفیہ کی روح کو سکون مل گیا۔ ''ایک موقع'' جانوروں سے پیار کرنے والے بہت ہیں۔ ''تیرا بھائی'' فضول شیخی باز تحریر صفحات ضائع کر دیے۔ ''جیسی کرنی'' میں ثمینہ کی تنگ نظری سوتیلے پن مکافاتِ عمل کی لاٹھی بے آواز خود ہی برباد ہوگئی۔''

☆ عبدالجبار رومی انصاری کی لاہور سے آمد۔ ''سب مسلمانوں کو ماہِ صیام کی بہت مبارک ہو اور ساتھ ہی عیدالفطر کی بھی ایڈوانس مبارک باد قبول کریں۔ جسے لوگ امیر خسرو کے نام سے جانتے تھے وہ بالا کا حاضر جواب تھا اور شاعری میں بھی لاجواب تھا کوئی بھی منظر دیکھ کر فوری اس پر شعر کہہ دیتا تھا۔ ''یک گمی'' بہت اچھی لگی۔ اعجاز حسین سٹھار خوب صورت تبصرے پر مبارک باد۔ ملک ثاقب شاد، محمد عمران خان، غلام حسین ضیاء کے تبصرے بھی عمدہ رہے۔ صلاالین زارا کو خوش آمدید کہ خاموش قاری سے اعلانیہ قاری بن گئیں۔ اچھا لگا۔ رانا محمد شاہد نے بھی زبردست لکھا۔ عریشہ، نشی عزیز مئے، آفتاب احمد نصیر، نزاہت افشاں اور سدرہ بانو نا گوری بھی نے بہت اچھی تبصرہ کیا۔ سعدیہ علی کی خوداعتمادی بہت اچھی لگی چلو تمام لڑکیوں کو اور خاص کرنئی نویلی دلہنوں کو ایک طرح کا مینو مہیا کر دیا اور خوداعتماد اور خوش اسلوبی سے زندگی گزارنے کا طریقہ بتا دیا۔ زویا اعجاز کی تحریر ''قرض'' بھی برے انجام سے باخبر کرتی اچھی تحریر تھی۔ سحرزدہ ماحول سے جڑی اجمل کی تحریر ''گمشدہ'' اچھی لگی۔ ''جیسی کرنی'' تو ویسے ہی بھرنی، کبھی کبھی قدرت بھی عین موقع پر انصاف کر دیتی ہے۔ ثمینہ اپنے سوتیلے بیٹے کو ماں کا پیار نہ دے سکی۔ الٹا اس کی جان لے لی اور پھر اسے اپنے بیٹے سے ہی ہاتھ دھونے پڑے۔ عبرت اثر اچھی تحریر تھی۔ جنگل نیوز سے اسٹوری زبردست رہی۔ موت کے روبرو ہو کر بچ جانا بھی کسی معجزے سے کم نہیں۔ لفظوں کی جادوگری سے آراستہ خوب صورت تحریر ''نایاب پرندے'' بہت عمدہ رہی، پاکستان سے عقیدت رکھنے والے ماضی کے یادگار فنکار اور ہدایت کار شیخ حسن کے حالات و واقعات زبردست رہے۔ صدا بہار صداکار زبیرالدین پر تحریر عمدہ رہی۔

☆ اویس شیخ کا خط ٹوبہ ٹیک سنگھ سے۔ ''شاعر شاہی'' کی معلومات کافی زبردست تھی۔ امیر خسرو شاعری کی دنیا کا عظیم نام تھے۔ اداریہ پڑھا۔ اپنے سے کم تر کو کم سمجھنا اب تو ہمارے معاشرے کی روایت بن گئی ہے۔ ہمارا پورا معاشرہ اسی اخلاقی گراوٹ کا شکار ہے۔ ''معیرِ خیال'' میں سٹھار صاحب کو خوب صورت خط کے ساتھ اوّل نمبر پر پایا، مبارک باد۔ عبدالجبار رومی انصاری اور نصیر اشرفی کے نام بھی اچھے لگے۔ یہ دونوں حضرات بھی اچھا لکھتے ہیں۔ مسرت رضوی بھی خدا جانے کہاں گم ہو گئے اس بار بھی خط نہیں تھا۔ میں نے 24 کو پوسٹ کر دیا تھا۔ اس کے باوجود بھی بروقت نہ پہنچا۔ سب ساتھیوں کو عید کی ڈھیروں خوشیاں مبارک ہوں۔ ''سچ بیانیوں'' میں ''خوداعتمادی'' بڑا گہرا سبق لیے ہوئے تھی۔ حالات پر مضبوط گرفت اور خود پر مکمل قابو ہو تب ہی ان معاملات کو خوش اسلوبی سے حل کیا جاسکتا ہے۔ اور ''کرائے کا عاشق'' کی اصطلاح بالکل نئی تھی۔ ''جنونی'' نفسیاتی داستان تھی۔ فطرتی چیزوں پر انسان کا کنٹرول کہاں ہوتا ہے۔ ''اسیرِ ذات'' پڑھی۔ عورت کے اظہارِ وفا کی انمٹ داستان بیان کی گئی۔ ''قرض'' سے کتنے المیے وابستہ تھے۔ یہ حیرت انگیز داستان آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہے۔ ''گمشدہ'' رونگٹے کھڑے کر دینے والی سچ بیانی تھی۔ ''ایک موقع'' میں کچھ خاص نہیں تھا۔ ''تیرا بھائی'' پڑھی۔ کہتے ہیں زبان شیریں تو ملک گیریں، باتونی لوگوں اور شعبدہ باز میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اس میں بھی کچھ ایسی ہی صورتِ حال تھی۔ ''جیسی کرنی'' مختصر انداز میں ماں کی ممتا کا ایک پہلو اجاگر کیا گیا۔ جو بالکل غیر اخلاقی تھا۔ ''آئیڈیل'' سنسنی خیز کہانی تھی۔ جسے ٹائٹل اسٹوری ہونا چاہیے تھا۔ شروع سے لے کر آخر تک شاندار جملوں نے جکڑے رکھا۔ یہ کہانی کسی مووی کا بہترین اسکرپٹ ثابت ہو سکتی ہے باقی تبصرہ اگلے ماہ۔''

☆ ذیشان شیخ کا تجزیہ فیصل آباد سے۔ ''سرگزشت کے ہر رسالے کا بے چینی سے انتظار رہتا ہے۔ لائبریری کے پاس سے گزر رہا تھا سوچا پتا کرتا چلوں کہ رسالہ آیا یا نہیں لیکن وقت سے پہلے رسالہ موجود تھا۔ سرورق دیکھا اور پڑھنے بیٹھ گیا تین دن میں رسالہ ختم ہو گیا۔ شوکت تھانوی مزاح کے بادشاہ تھے۔ طاہرہ گلزار کا خط کتنی دفعہ پڑھا۔ بہت خوشی ہوئی ان کا تعارف پڑھ کر۔ طاہرہ آپ کی زندگی مرد نے برباد کی۔ مرد ہی کا سہارا لے کر باقی زندگی بھی گزار سکتی ہیں۔ ماشاءاللہ تعلیم یافتہ ہیں اللہ تعالیٰ اور ترقی دے۔ خبر پڑھی ایم اے راحت انتقال کر گئے۔ سب قارئین سے مغفرت کی درخواست ہے۔ ناول کی دنیا میں ایم اے راحت کا نام رہتی دنیا تک امر رہے گا۔ غزالہ جلیل راؤ سے گاہے بگاہے ان کی خیریت معلوم ہوتی رہتی تھی۔ پچھلے چند ماہ سے وہ صاحب فراش تھے۔ رانا محمد شاہد بورے والا برسوں پہلے مزاج آشنائی تھی تم میں اور ہم میں۔ ڈاکٹر روبینہ نفیس انصاری بزم سے غیر حاضر تھیں۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' بہت اچھا جا رہا ہے اس دفعہ امریکا میں ہلچل مچا رہے ہیں۔ ڈاکٹر ساجد امجد سے گزارش ہے کہ ایم اے راحت کی بھی آپ بیتی لے کر آئیں۔ زویا اعجاز ویشیٹ کے موضوع پر بھی لکھیں۔ ''ناسور'' ڈاکٹر عبدالرب بھٹی گذ جا رہے ہیں۔ سب سے اچھی کہانی ''عشق ناکام'' تھی واقعی انسان زندگی میں بھی لفظوں کا محتاج نہیں ہوتا ہے اگر اظہار نہ ہو تو زندگی بے معنی ہو جاتی ہے۔ شاید وقت پر اظہار ہو جاتا تو وہ عشق مکمل ہو جاتا۔''

☆ محمد ابراہیم نے ڈی جی خان سے لکھا ہے۔ ''میں سرگزشت کا کافی عرصے سے قاری ہوں۔ آپ کے رسالے کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ مختلف موسیقاروں، گلوکاروں اور اداکاروں کے متعلق لکھیں (قلم نگری کے عنوان سے انور فرہاد لکھ تو رہے ہیں) پچھلے شمارے کی تمام کہانیاں زبردست تھیں مگر ''گورکن'' نے دل پر بے حد اثر کیا۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے اگر ان کی کوئی کہانی رہ گئی ہو تو ضرور چھاپ دیجیے

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

گا۔ اللہ آپ کو کامیابیاں دے۔“

☆م۔ انور مردان سے لکھتے ہیں۔ ”معبر خیال میں شاید تیسری انٹری ہے۔ سب سے پہلے عرض یہ ہے کہ سرگزشت ہر مہینے تین چار تاریخ کے بعد ملتا ہے۔ سرگزشت عمرو عیار کی زنبیلی ہے جو بھی چاہو نکالو اور پالو۔ ہاں اس دفعہ صدر اعظم کے سنگھاسن پر نصف آبادی کو دیکھ کر آپ کے انصاف پروری کو داد کو مکرر دینا پڑا۔ سرگزشت کے صفحہ نمبر 90 پر پری چہرہ نسیم کی والدہ شمشاد بیگم کو مشہور سنگر، لکھا گیا ہے جب کہ مشہور سنگر شمشاد بیگم کا دلیپ کمار کی ساس سے کوئی رشتہ نہیں صرف نام مشترک ہے (لیکن نسیم کی والدہ بھی سنگر تھیں) پرچہ دن بہ دن نکھرتا جارہا ہے۔ یہ آپ کے خلوص اور علم پروری ہے ورنہ اندھیروں کا راج ہے اور آنکھ والوں کے لیے ہوا مسموم ہو چکی ہے۔“

☆سعید احمد چاند نے کراچی سے تبصرہ کیا ہے۔ ”پرچہ ملا، سرورق کا جواب نہیں تھا۔ ”مزاح نگار“ میں شوکت تھانوی کے متعلق پڑھا۔ موصوف کے بارے میں سنا اور پڑھا تو بہت تھا مگر تفصیل سرگزشت میں معلوم ہوئی۔ معراج رسول کا اداریہ حالات کے عین مطابق تھا پڑھ کر خوشی ہوئی۔ مسند صدارت پر طاہرہ گلزار کو دیکھ کر خوشی ہوئی۔ میں نے کافی عرصہ پہلے ان کے متعلق لکھا تھا کہ آپ ایک دن بڑی لکھاری بنیں گی۔ دیکھ لو آج ان کو بڑی رائٹر بھی شمار کیا جاسکتا ہے۔ بس یاد کرنے کا شکریہ۔ دوسرے نمبر پر ہیں رانا محمد شاہد بورے والا اس کے بعد آفتاب احمد نصیر اشرفی ہیں۔ انور عباس، عبدالجبار رومی ہیں۔ سلیم رشید، امیر حمزہ اشرف، سیف اللہ، عریشہ، ایم اے حفیظ، تبصرے بھی دل کو لگنے والے تھے۔“

☆منشی محمد عزیز سے لڈن وہاڑی سے۔ ”22 مئی کو حاصل پور بک اسٹال والے سے فون پر سرگزشت کے متعلق پوچھا تو اس کا جواب نفی میں تھا۔ پھر وہاڑی فون کیا تو وہاں جون کا شمارہ آچکا تھا۔ اگرچہ ڈیوٹی پر تھا مگر فوراً اڈے پر پہنچا اور ایک گھنٹے بعد سرگزشت کا جون کا شمارہ میرے ہاتھوں میں تھا۔ ”معبر خیال“ میں سرسری نظر دوڑانے پر اپنے خط پر نظر پڑی۔ صد شکر کہ شائع ہو گیا (بے ربط اور مہمل جملے، بلاضرورت پیرے کاٹنا ہی پڑتا ہے ورنہ دوسروں کو جگہ نہیں ملے گی، اس لیے ہر بار قارئین سے التماس کرتا ہوں کہ مختصر الفاظ میں بھرپور خط لکھیں) ”معبر خیال“ کی صدارت اعجاز حسین سنھار کے نام تھی، مبارک باد قبول فرمائیں۔ ملک ثاقب شاد تونسی بھی کافی عرصے کی غیر حاضری کے بعد نظر آئے۔ ماشاء اللہ بھکر سے کافی دوست حاضری لگواتے ہیں۔ عبدالجبار رومی، رانا محمد شاہد، عریشہ، آفتاب احمد نصیر اشرفی اور سدرہ بانو ناگوری نے بھی بھرپور انداز میں تبصرہ لکھا۔ نزاہت انشال غلطیوں کی اصلاح کرتے نظر آئے۔ بہت خوب جناب۔ یک ملکی داستان شاعر شاہی حضرت امیر خسرو اردو کے اولین شاعر پر مختصر اور مسلسل مضمون لکھا تھا۔ اداریے میں انکل محترم ایک تلخ حقیقت بیان کررہے تھے۔ نوائے خلیل میں ایک اور شاعر کے حالات زندگی سے مکمل آگاہی حاصل ہوئی۔ خلیل الرحمن اعظمی کا نام میرے لیے تو نیا ہے اور معلومات میں اضافے کے لیے سرگزشت اور ڈاکٹر ساجد امجد کے مشکور ہیں۔ ”آپا جی“ زین مہدی نے بالوقد یہ پر انتہائی دلکش اور بہترین مضمون لکھا کہ آج سے پہلے جتنا بھی ان پر لکھا گیا، سب ہیچ لگا۔ انتہائی باریک بینی سے آپا کی حالات زندگی لکھی ہے زین مہدی نے۔ اشفاق احمد سے پہلی ملاقات، پھر شادی، بچوں کا پیار ہونا، پھر ڈاکٹرز کا تکلیف دہ رویہ غرض یہ کہ ہر روپ، ہر رنگ نمایاں کیا آپا بانو کا۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔ ”جون کی شخصیات“ نے بھی جنرل نالج میں اضافہ کیا۔ موت کے روبرو پڑھتے ہوئے ایک بار تو گویا سانس ہی رک گئی۔ اف! جب ہاتھی نے ڈرائیور کو سونڈ میں اٹھا کر فضا میں اچھال دیا تھا۔ نایاب پرندے بھی بہت عمدہ مضمون تھا۔ محترم سعید احمد سلطان نے گویا نثر میں ہی شاعری کروالی۔ واہ کیا بات ہے۔ محترم انور فرہاد بابائے سندھی قلم شیخ حسن پر تفصیلی مضمون کے ساتھ حاضر تھے۔ سدا بہار صداکار زبیر الدین کی یادیں، محترم شکور پٹھان بیان کررہے تھے۔ ”شمشال سے ٹورنٹو“ میں سرجی اور شہباز کی نوک جھونک پڑھ کر مجھے مرحوم علی سفیان آفاقی کے سفرنامے یاد آجاتے ہیں جن میں خان صاحب اور بٹ صاحب کا کردار ہوتا تھا۔ میں تو ندیم اقبال کے قلم کا اسیر ہو گیا ہوں۔ پولیس کے آنے کی خبر تشویشناک ہے۔ بھٹی صاحب کی ”ناسور“ ابھی جاری ہے۔ اب دیکھیں آگے کیا ہوتا ہے۔ پہلی سچ بیانی خود اعتمادی سے متعلق تھی۔ سعدیہ علی کو ایک مخلص دوست مل گئی جس نے اپنے بہترین مشوروں کی بدولت بالآخر اسے کامیابی سے ہمکنار کرڈالا۔ سعدیہ نے بڑی خوب صورتی سے اپنا گھر اور شوہر بچا لیا۔ جنونی اپنے جنون کی بدولت شائلہ کی جگہ خود مر گیا مگر اس نے اپنے الفاظ کا پاس رکھا۔ زویا اعجاز نے ایک انتہائی نازک اور سنجیدہ موضوع پر لکھا۔ اف خدایا! اتنے سنگین جرائم، استغفر اللہ۔ اب سرخ آندھیاں آئیں تو یہ ہماری شامت اعمال ہی کے سبب ہیں۔ اللہ معاف فرمائے۔ ”اسیر ذات“ میں راشد کا مزاج سمجھ میں نہیں آیا۔ پل میں ماشا پل میں تولہ شاید ایسے ہی لوگوں کے لیے کہا گیا ہے کہ جوش جذبات میں اپنی بیوی کو قتل کرڈالا اور پھر اپنی جگہ، سزا بھگتنے والی، بہن عارفہ کو ایسا بھولا کہ شہر کیا ملک ہی چھوڑ گیا۔ ”گمشدہ“ کو پُراسرار اور حیرت انگیز کہا جاسکتا ہے۔ روح بے چاری نجانے کب سے بھٹک رہی تھی۔ ”ایک موقع“ یقین کامل کے موضوع پر لکھی بہترین تحریر تھی۔ جیسی کرنی ویسی بھرنی مثل ہی صادق آتی ہے۔ ثمینہ نے اپنی سوتن کے بیٹے کو اپنا نہیں سمجھا اور اسے قتل کرڈالا تو اللہ نے اس کا بیٹا بھی چھین لیا۔ اب پچھتائے کیا ہوت۔ ”آئیڈیل“ میں لڑکیوں کو سبق دیا گیا ہے کہ وہ آئیڈیل کے پیچھے بھاگنے کی بجائے عقل و شعور سے کام لیں۔ نجمہ اپنے آئیڈیل کی وجہ سے بے عزت اور خوار ہوئی۔“

☆آفتاب احمد نصیر اشرفی نے کورنگی کراچی سے لکھا ہے۔ ”طلسم ہوش ربا اور داستان امیر حمزہ کے کردار عمرو عیار کے پاس ایک زنبیل تھی۔ اس زنبیل سے وہ سب برآمد ہو جاتا جو اسے مطلوب ہوتا۔ اس طرح جون کا سرگزشت بھی حیرت کدہ ثابت ہوا جہاں نہ صرف

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

دوشیزہ، سرورق کا حسن خوابیدگی کی جھیل میں غوطہ زن تھا بلکہ اس کے ارد گرد ادب کی طلسماتی شخصیات بھی اپنے سحر میں جکڑنے کے لیے پر تول رہی تھیں۔ نوائے خلیل کے خلیل الرحمٰن اعظمی کی اعلیٰ ہمتی اور محترمہ بانو قدسیہ یعنی آپا جی کی اولعزمی اور اعلیٰ ظرفی ان کے چہروں پر ثبت تھی۔ چیف صاحب کی اس زنبیل میں جھانکا تو حیرت کا ایک جہان دوار منتظر تھا۔ شاعر شاہی امیر خسرو کا جوابر پارہ انمول تھا جس کی وجہ سے قوالی کی شکل میں وجد کا روحانی جزیرہ آج بھی آباد و شاد ہے۔ ''جون کی شخصیات'' کے ساتھ صائمہ اقبال کی رخصتی حیران کن اور افسوس ناک ہے۔ تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ اس کے بہت سے پرت کھولے جاسکتے تھے۔ موت کے روبرو بیٹھ کر تو ہم دم بخود ہی رہ گئے۔ ڈرائل اور اس کی بیوی کا ہاتھی کے ساتھ ایڈونچر انہیں موت کے روبرو لے گیا۔ حیرت زدہ کردینے والی تحریر تھی۔ نایاب پرندے پڑھ کر ہمیں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی حجۃ اللہ البالغہ میں پڑھی ہوئی ایک حدیث یاد آئی کہ سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران قیامت کے روز صف بستہ پرندوں کی جماعتوں میں آئیں گی اور اپنے پڑھنے والوں کے لیے حجتیں کریں گی۔ بھلا کام اور برا کام دونوں مخلوق ہو کر لوگوں کے سامنے کھڑے کیے جائیں گے۔ جمعہ کی صورت شگفتہ اور تابناک ہوگی اور دنیا کو ایک عمر رسیدہ اور کراہیت زدہ عورت کے روپ میں اور موت کو ایک مینڈھے کی شکل میں لاکر جنت و دوزخ کے مابین ذبح کردیا جائے گا اور اس کے بعد ہماری ابدی زندگی کا آغاز ہوگا۔ نایاب پرندے بھی قدرت کی صناعی کا شاہکار ہیں اور قدرت کے طلسمی کدے کا ایک لازمی جزو بھی۔ انور فرہاد اور شکور پٹھان نے بھی اس ماہ ہمیں حیرت زدہ کردینے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ بابائے سندھی قلم شیخ حسن اور سدابہار صداکار اور پی ٹی وی نیوز کا سٹر زبیر الدین کے معاملات یوں اچانک ہمارے سامنے لے آئے۔ فن پارے، ہنری ملاح اور کتب خانے بھی چیف صاحب کی سرگزشت نامی زنبیل سے ہی نکل سکتی تھی۔ اس مرتبہ ندیم اقبال صاحب نے بھی اپنی نورنتو یاترا میں نظریۂ ارتقاء اور ڈارون کے نظریے پر بحث کی اور خوب کی۔ ''عمیر خیال'' کے انہی صفحات پر ہم نے کافی عرصہ پہلے کافی سیر حاصل نوٹ لکھا تھا جو نظرِ عنایت چیف صاحب آپ نے مکمل شائع بھی کردیا تھا۔ بے دینِ ڈارون اور اس کے حواری آج بھی دیگر صورتوں میں خدا کے وجود سے انکاری ہیں لیکن وقت کے ساتھ ساتھ سائنس کو ماننے والے اپنی سائنسی تحقیق کے ذریعے ہی خدا اور قدرت کے وجود کے قائل ہوتے جارہے ہیں اور مغرب میں تیزی سے پھیلتا ہوا ہمارا آفاقی مذہب اس بات کی دلیل ہے کہ جو لوگ مسلمانوں کو دہشت گرد سمجھتے ہیں وہی ان کے حسنِ سلوک سے متاثر ہوکر اسلام کا پرچار کرنے لگتے ہیں۔ ''ناسور'' کو کسی مشاق سرجن کے نشتر کی ضرورت ہے۔ ورنہ ڈر ہے کہ سرگزشت کا بدن اس سے متاثر نہ ہوجائے۔ ''خود اعتمادی'' اچھی تھی اگر آخر میں افسانوی فکشن سے گریز کیا جاتا۔ اس ماہ چونکہ ہماری سالگرہ بھی ہوتی ہے اس لیے جون کا سرگزشت ہمیں ہر سال گفٹ ہی محسوس ہوتا ہے۔ ''عمیر خیال'' میں شاعری لکھی نہیں جاتی کہی جاتی ہے پر ادبی تیج چیف صاحب کی سند کا درجہ رکھتی ہیں۔ اس کے علاوہ وہ انجم فاروق ساحلی کو ان کی تحریروں کے باحرار ہونے کی خوش خبری بھی دے رہے تھے اور ہمیں یہ تنبیہ بھی کررہے تھے کہ منگنی کے بعد جبرو کی علیحدہ فرمائش ٹھیک نہیں ہے۔ نظام لوہاروالی تحریر پر ہی اکتفا کریں جس میں جبرو کا تذکرہ موجود ہے چلیں مان لیا لیکن یہ کیسے مان لیں آغا نیاز مگسی کی طرح کہ اگر اسلام آباد کا رقبہ مربع کلومیٹر میں بھی ناپا جائے تو 226.5 کلومیٹر بنتا ہے۔ برائے مہربانی اسلام آباد کی حدود کا آغاز اور انجام بتا کر ابہام دور کردیں (گوگل سے رقبہ دیکھ لینے کی استدعا کرچکا ہوں) اس ماہ اداریہ بھی غریب کے استحصال پر مبنی تھا گویا آئینہ آپ نے دکھا دیا۔ ہابیل اور قابیل سے شروع ہونے والی یہ دوڑ دھائی ابد تک جاری رہے گی بس کوشش یہ ہونی چاہیے کہ آپ اپنے حصے کی شمع جلاتے جائیں تاکہ اس کی سنگینی کو کم کیا جاسکے ورنہ دولت کا گھمنڈ تو آج بھی غریبوں کے لیے فرعون صفت تھانیدار کو گڑگڑانے پر مجبور کردیتا ہے۔ اپنے سے برتر کے سامنے ایک درندہ صفت گھمنڈی صرف اس بات پر اپنے کتے ایک ضعیف عورت پر چھوڑ دیتا ہے کہ اس کی عزیزہ کو اس سے پرخاش تھی۔ اب ''عمیر خیال'' کو ہی دیکھ لیجیے یہاں بھی قابلیت کی دولت اپنے اثر ورسوخ سے اعجاز حسین سٹھار کو مسندِ صدارت پر بٹھا دیتی ہے۔ اپنا تبصرہ ہمیں ان کے تبصرے کے سامنے ایسے لگا جیسے کوئی مزارع نیازمندی سے کسی وڈیرے کے سامنے مسکین صورت بنائے بیٹھا ہو۔ اعجاز صاحب کے خوب صورت تبصرے پر واری صدقے، آخر میں ایم اے راحت کی سفرِ آخرت پر روانگی میں ان کے ساتھ اوّل و آخر درود شریف کے ساتھ سورۂ فاتحہ اور سورۂ اخلاص کا تحفہ اور ان کے لیے ڈھیروں دعائیں۔''

☆ سید محمد رضا شاہ نقوی نور نگر میانوالی سے رقم طراز ہیں۔ ''اب تو سرگزشت اور سسپنس ایک دوسرے کے آگے پیچھے جلد مل جاتے ہیں۔ آج مانچسٹر میں ایک گلوکارہ کے پروگرام میں بم دھماکوں کی خبر پڑھی۔ ہمارا ملک بھی دہشت گردی کا شکار ہے۔ دہشت گردوں نے معصوم بچوں کو بھی مانچسٹر (برطانیہ) میں نہیں بخشا۔ اللہ تعالیٰ ان گمراہ لوگوں کو عقل دے، (آمین)۔ سرگودھا میں پچھلے دنوں ایک جعلی پیر نے بیس آدمیوں کو قتل کردیا۔ شنید ہے کہ گدی پر بیٹھنے کا جھگڑا تھا۔ جعلی پیر نے اپنے ان داتا گرو کے بیٹے کو اور ایک میانوالی کے ڈی ایس پی کے فرزند کو بھی قتل کردیا۔ وجہ فساد صرف دولت ہے۔ صدرِ محفل اعجاز حسین سٹھار نور پور تھل کو مبارک باد۔ بھکر ضلع کے محمد عمران، غلام حسین ضیا، عبدالجبار رومی، انور عباس، رانا محمد شاہد، انجم فاروق ساحلی، آفتاب احمد، سدرہ بانو ناگوری وغیرہ کے محبت نامے پڑھے۔ سب کو مبارک باد۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی خلیل الرحمٰن ایک معلوماتی کہانی ثابت ہوئی۔ ڈاکٹر ساجد صاحب ہر ماہ جس شخصیت کے بارے میں لکھتے ہیں تو ہماری معلومات میں اضافہ کردیتے ہیں۔ زرین مہدی کی آپا جی ایک مکمل دستاویز ہے۔ بانو صاحبہ اور اشفاق احمد دنیائے ادب کے درخشندہ ستارے تھے۔ ''ماہ جون کی شخصیات'' ملک سراج خالد میاں طفیل، وسیم اکرم اور سنتوش کمار صاحب کمال شخصیات میں تھے۔ سعید احمد سلطان کا نایاب پرندے اچھا مضمون تھا انور فرہاد صاحب کا بابا سندھی قلم شیخ حسین کے بارے معلومات حاصل ہوئیں۔ انور فرہاد صاحب نے تلی سفیان آفاقی کی کمی پوری کردی ہے۔ شاعر

جوش ملیح آبادی اب ان لوگوں کی یادیں باقی ہیں۔ ندیم اقبال کا سفرنامہ بھی دلچسپ ہے سرجی اور شہباز کی چھیڑ چھاڑ بھی خوب ہوتی ہے۔ ڈاکٹر عبدالرباب بھٹی صاحب کی ''ناسور'' ایک اچھی کہانی ہے۔ سعدیہ علی کی خود اعتمادی ایک ایسی عورت کی کہانی ہے جو اپنا گھر اجڑنے سے بچالیتی ہے۔ ویسے یہ مرد حضرات عدیدے ہوتے ہیں، جگہ جگہ پھسل جاتے ہیں اور اپنی رفیقہ حیات کی قربانیوں کو بھول جاتے ہیں۔ جنونی لوگوں سے بھی دنیا بھری ہے جو دوسروں کے لیے قربانیاں دیتے ہیں۔ شمائلہ صاحبہ کی اچھی کاوش زویا اعجاز بھی اب صف اوّل میں آنے کی تیاریوں میں کامیاب مصنفہ بنتی نظر آرہی ہے۔ قرض لکھ کر انہوں نے یہ بات ثابت کردی ہے جو والدین اولاد کو شتر بے مہار چھوڑ دیتے ہیں۔ عامر کی طرح سر پکڑ کر رہ جاتے ہیں۔ محمد عارف قریشی کو بیٹی کی ''جیسی کرنی'' ایسی تحریر ہے کہ جو دوسروں کے لیے گڑھا کھودتا ہے خود اس میں گرتا ہے۔ آئیڈیل از مظہر سلیم میں نجمہ جیسی عورتیں ایک سبق ہیں۔ جو عورتیں چمک دمک اور ظاہری مردوں کی شخصیت کے سحر میں مبتلا ہوتی ہیں آخر میں نجمہ کی طرح ہاتھ ملتی رہ جاتی ہیں۔ ہاں آخر میں ایم اے راحت کی وفات پر دکھ ہوا۔ اللہ تعالیٰ ان کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور ان کے پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ (آمین)۔ آخر میں سرگزشت کے دوستوں تفسیر عباس، طاہرہ گلزار سمیت سب کو سلام و دعا۔''

☆ محمد سلیم قیصر کا سینٹرل جیل ملتان سے تبصرہ۔ ''میں بندۂ ناداں نہایت ادب سے جناب معراج انکل، ٹیم سرگزشت، رائٹرز اور قارئین کرام کو السلام علیکم کہتا ہوں۔ اللہ پروردگار آپ سب کو ہمیشہ سلامت رکھے۔ بوجہ چند مجبوریاں غیر حاضر رہا، معافی کا خواستگار ہوں۔ شمارہ مئی ہاتھوں میں موجود ہے۔ ''معبر خیال'' میں مسند نشین قابل عزت محترمہ طاہرہ گلزار کا لاٹھی چارج چند لوگوں کے لیے باعث افاقہ ثابت ہوا ہوگا۔ ویسے بھی آئین پاکستان ہر کسی کو پُرامن احتجاج کا حق دیتا ہے اور صرف باشعور انسان ہی کسی کے جذبات کی قدر کرتا اور سمجھتا ہے۔ مجھے فخر ہے کہ اس شمارے کے ہر رائٹر پر جو ہمہ وقت اچھا لکھنے کی کوشش میں مصروف نظر آتے ہیں، بلاشبہ انہی رائٹرز کی وجہ سے شمارہ باکمال ہوتا ہے۔ محترمہ طاہرہ گلزار، عریشہ، رضا احمد اعوان، محمد عمران خان، اعجاز حسین سٹھار، انجم فاروق ساحلی، سلیم رشید، رانا محمد شاہد، ایم اے حفیظ، آفتاب احمد نصیر اشرفی، سعید احمد چاند، انور عباس شاہ، سیف اللہ، عبدالجبار رومی انصاری اور امیر حمزہ صاحبان کے خوب صورت الفاظ ان کے خوب صورت ہونے کا عکس پیش کررہے تھے۔ انور عباس شاہ صاحب یاد فرمانے پر بہت شکریہ۔ دعا کرتے رہنا کہ میری زندگی کو تحفظ اور بقاء حاصل رہے۔ میری معزز بہنیں بشریٰ افضل، سدرہ بانو ناگوری، صائمہ، قرۃ العین پلیز پس منظر میں نہ جائیں۔ باجی گل میں آپ کا دکھ سمجھ سکتا ہوں۔ میرے اِک دوست مہر طارق گل نے ادارہ سے اپیل کی ہے کہ سلسلہ وار کہانی ایک مزید ہونی چاہیے۔ صائمہ اقبال کی ''مئی کی شخصیات'' اچھا لگا۔ خدا کرے کہ یہ ادارہ، ادارے کے معزز لوگ، لکھنے اور پڑھنے والے معززین ہمیشہ اللہ کی حفاظت اور پناہ میں رہیں۔''

☆ محمد ابراہیم کی ڈی جی خان سے آمد۔ ''میں کافی عرصے سے آپ کا خاموش قاری ہوں۔ آپ کے مضمون سب ایک سے بڑھ کر ایک ہوتے ہیں۔ گلوکاروں کا اور اداکاروں کا تبصرہ زبردست ہوتا ہے۔ یہ میرا پہلا خط ہے۔ اگر حوصلہ افزائی کریں گے تو وقتاً فوقتاً لکھتا رہوں گا۔ (بالکل اب آتے رہیں گے۔ ناغہ نہیں کرنا ہے)۔''

☆ فقیر غلام حسین ضیا بھکر سے محو تبصرہ ہیں۔ ''ماہنامہ سرگزشت کے قارئین اور ''معبر خیال'' کے دوستوں کی خدمت میں ہدیہ سلام۔ آپ نے پچھلے شمارہ میں قبریں کھودنے والے بابا کو کشف القبور بتا دیا ہے۔ کشف القبور ایک صحیح علم ہے اور صاحب قبر کے نزدیک بیٹھ کر عمل پڑھا جاتا ہے اور مراقبہ کی حالت جب طاری ہوتی ہے تو صاحب قبر سے رابطہ ہو جاتا ہے۔ ابھی قبر کی کھدائی نہیں ہوئی۔ فوت شدہ بزرگ کو ابھی دفنایا نہیں گیا تو کشف القبور کا عمل قبر پر پڑھ کر کس سے رابطہ کریں گے؟ یہ ناچیز فقیر اس علم سے الحمدللہ آگہی رکھتا ہے۔ عارفہ کی سچ بیانی ''اسیر ذات'' ایک دکھ بھری حقیقت ہے۔ اردو کے معروف قلم کار جناب خلیل الرحمٰن خلیل مولانا محمد شفیع اعظم گڑھی کے فرزند کا زندگی نامہ بڑی جامع تحریر ہے۔ آپا جی بانو قدسیہ اور اشفاق احمد خان دو عظیم انسانوں کی جوڑی کی داستانِ حیات۔ صبر و استقامت کے یہ عظیم پیکر کیسے کٹھن حالات میں گزرے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو جنت الفردوس میں جگہ دے، (آمین)۔ ''خود اعتمادی'' بہت ہی اچھی تحریر ہے اور نئی شادی شدہ بچیوں کے لیے بہت ہی اچھے مشورے اور حوصلہ اور صبر سے ان مشوروں پر عمل کرنا خوشگوار زندگی کا ضامن ہے۔ سعدیہ علی کی یہ تحریر نہایت اچھی گائیڈ لائن ہے۔ ''گمشدہ'' ایک بھٹکتی روح کی کہانی ہے۔ ''ایک موقع'' دو مزدور پیشہ بچوں کی کہانی ہے جو کوشش کرتے ہیں اس یقین کے ساتھ کہ محنت سے نصیب کا لکھا ضرور مل جائے گا۔ ''تیرا بھائی'' محلے کے ایک غنڈے کے بھائی راشد کی کہانی ہے جس کا تکیہ کلام تھا ''اس میں تیرے بھائی کا ہاتھ ہے'' حالانکہ وہ صرف گپ باز تھا اور ہوٹل میں بیٹھ کر صرف گپیں ہانکتا تھا۔ آخر انجام کو پہنچا تو پولیس نے پکڑ کر ایسی چھترول کی کہ توبہ کرلی اور پھر یہ مسجد کا مؤذن بن گیا۔ ''آئیڈیل'' کے تصورات نے اسے اپنے حقیقی شوہر سے بھی محروم کردیا۔''

☆ حنیف ادیب کا نامہ شوق لاہور سے۔ ''حسب سابق اس بار بھی آپ کا موقر ماہنامہ نظر سے گزرا۔ ابھی پڑھ تو نہیں سکا مگر جو چند ایک صفحے نظر سے گزرے انہی کے متعلق مختصراً کچھ لکھ رہا ہوں اسے محض حاضری ہی سمجھ لیں اس لیے کہ یہ مناسب سمجھا کہ کچھ نہ سہی مگر کچھ تو لکھ دیا جائے اس طرح کہ لہو لگا کر شہیدوں میں مل جائیں۔ آپ کا پہلا صفحہ پڑھنے کے قابل ہوتا ہے اور معلومات کا خزانہ بھی کہ محض ایک صفحے کی چند سطور میں بہت سی معلومات مل جاتی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں آپ کا یہ پہلا صفحہ بے حد قیمتی ہوتا ہے کہ قاری کو اکثر اوقات کسی قابلِ ذکر شخصیت کی طرز زندگی اور اس کے گزرے لمحات کا پتا چلتا ہے جو ایک پڑھنے والے کو اس کے راہ و عمل کا پتا دیتے ہیں۔ گزشتہ کسی شمارے میں ''فقیر آتش

نوا" کا ذکر پڑھا تھا، جی ساغر صدیقی ایک شعلہ نوا اور باکمال شاعر کی زندگی نہایت عسرت سے گزری مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ اس گدڑی پوش شاعری نے شاعر کے میدان میں ایک ایسا تہلکہ مچا دیا کہ اس کے بیسیوں شعر نہ صرف زبان زد عام ہو گئے بلکہ آج بھی ایک مدت گزرنے کے بعد صفحہ قرطاس پر چمک دمک رہے ہیں اور یہ چمک دمک نو واردان سخن کے لیے بھی اپنی جگہ ایک روشنی دے رہے ہیں۔ برسوں پہلے کی بات ہے جہاں میری رہائش تھی وہاں پڑوس کی ایک کتابوں کی دکان تھی جس کے مالک سے میری اچھی جان پہچان ہو گئی تھی۔ کبھی کبھی میں فارغ اوقات میں وہاں چلا جاتا وہاں ایک ملازم سیٹھی بھی تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ ساغر کا یہ شعر ضرور پڑھتا۔ "آؤ اک سجدہ کریں عالم مدہوشی میں۔ لوگ کہتے ہیں کہ ساغر کو خدا یاد نہیں" سلمیٰ اعوان بھی سرگزشت کی بہت اچھا لکھنے والی ہیں۔ صائمہ اقبال کی تحریر" اس ماہ کی شخصیات" قارئین کا ایک پسندیدہ سلسلہ ہے۔ ٹورنٹو کا سفرنامہ اپنی جگہ۔ الغرض سرگزشت اپنی معیاری روایت کو برقرار رکھے ہوئے ہر ماہ ایک نئی آب و تاب سے جلوہ گر ہو رہا ہے اور قاری کو اس کا انتظار رہتا ہے۔"

☆ انجم فاروق ساحلی کا تبصرہ لاہور سے۔ "سرگزشت ایک ایسا جریدہ ہے جو بڑی محنت سے ترتیب دیا جاتا ہے۔ سہل نگاری کے زمانے میں کون اتنی مغز ماری کرتا ہے جتنی مدیر سرگزشت کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ سرگزشت کے اوراق الٹتے ہی نگاہیں دنیا کے وسیع کینوس کی طرف اٹھتی چلی جاتی ہیں اور رنگ رنگ کے واقعات زندگی کے نت نئے تجربے سامنے آ جاتے ہیں۔ شکیل ادریس کی تحریر جدوجہد انسانی اور تجسس سے بھرپور ہے۔ مختار آزاد کی مختصر تحریر بھی خوب ہے۔ "شمشال سے ٹورنٹو تک" سفرنامہ اچھا چل رہا ہے۔ بلکہ بہت اچھا جا رہا ہے۔ "خلیل نامہ" معیاری کاوش تھی۔ خلیل صاحب کے اشعار فکر انگیز تھے۔ ایاز راہی کی "کتب خانے" عمدہ کاوش تھی۔ 27 مئی کی شام سرگزشت کا پرچا گم ہو گیا۔ لہٰذا آپ بیتیوں کا مطالعہ نہیں ہو سکا۔ آفتاب احمد نصیر بھائی! آپ جیسے باذوق قارئین کی ہمارے دل میں بڑی جگہ ہے۔ بس بعض مسائل کی وجہ سے رابطہ برقرار نہ رہ سکا۔ شکاریات کے علاوہ بھی کچھ نہ کچھ بھیج رکھا ہے۔ تمام قارئین کے خطوط... بھرپور تھے (آپ موقع نکال کر فون پر کبھی کبھی بات کر لیا کریں)۔"

☆ امیر حمزہ اشرف کی خوشا چینی بستی کوٹ رب نواز ملتان سے۔ "اداریہ میں انکل معراج کی حقیقت پر مبنی کہانی سنی۔ واقعی انکل ہمارا صبر و تحمل سے بھرا معاشرہ کہیں کھو گیا ہے۔ جلدی سے "معبر خیال" میں پہنچے۔ بھائی اعجاز حسین سٹھار کرسی صدارت پر براجمان تھے۔ بہت مبارک ہو بھائی جان عبدالجبار رومی انصاری، عریشہ، رانا محمد شاہد، آفتاب احمد اشرفی، نزاہت افشاں اور سدرہ بانو کے تفصیلی تبصرے قابل تعریف ہیں۔ بھائی منشی محمد عزیز میمن نے کافی عرصہ بعد "معبر خیال" کو رونق بخشی، ویلکم بیک جناب اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ سب سے پہلے سچ بیانی "آئیڈیل" پڑھی۔ آئیڈیل تراشنا ایک فطری عمل ہے اور میرے خیال سے اس دنیا میں آئیڈیل ہوتے بھی ہیں لیکن بندے کو کچھ حقیقت پسند بھی ہونا چاہیے۔ نجمہ صاحبہ کے سر پر آئیڈیل کا ایسا بھوت سوار تھا کہ شوہر سے بے وفائی کر بیٹھی نتیجے میں دنیا کے سامنے ذلت و رسوائی اس کا مقدر ٹھہری۔ "جیسی کرنی" پڑھی۔ اوہ میرے خدا کیا کوئی عورت اتنی سخت دل بھی ہو سکتی ہے۔ بے شک ثمینہ کو بہت عبرتناک سزا ملی۔ سلیم اور نعیم کی موت کا بہت افسوس ہوا۔ "گمشدہ" حیرت انگیز اور دلچسپ تحریر تھی۔ "قرض" ایک دل دکھا دینے والی سچ بیانی تھی، شاید میں اس کہانی کو کبھی نہیں بھلا پاؤں گا۔ "جنونی" اور "ایک موقع" بس گزارے لائق سچ بیانیاں تھیں۔ مختار آزاد کی "فن پارے" اور طارق عزیز کی "ہنری ملاح" نہایت مختصر مگر معلوماتی تحریریں تھیں۔ زین مہدی کی "آپا جی" میں بانو قدسیہ اور اشفاق احمد کے حالات زندگی جان کر بہت اچھا لگا۔ سعید احمد سلطان کی "نایاب پرندے" بہت ہی دلچسپ اور معلومات سے بھرپور تحریر تھی۔ شکور پٹھان کی "صدا بہار صداکار" میں زبیر الدین کی کچھ یادیں کچھ باتیں اچھی لگیں۔ ایم اے راحت صاحب کو اللہ تعالیٰ جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، (آمین)۔ میرے پیارے دوست وارث اور شاہ زیب جو سرگزشت کے خاموش قاری ہیں۔ دونوں سے "معبر خیال" میں حاضری کی درخواست ہے۔ آخر میں تمام بہن بھائیوں کو السلام علیکم۔"

☆ سیف اللہ ملک وال سے لکھتے ہیں۔ "زین مہدی کی تحریر آپا جی پسند آئی کتنی ہی میٹھی میٹھی خوشگوار باتیں معلوم ہوئیں۔ پھر اشفاق صاحب کے آخری وقت کی تصویر کشی اداس کر گئی۔ سعید صاحب کے نایاب پرندے اچھے لگے گو کہ یہ نایاب نہیں ہیں ہو سکتا ہے شہر والوں کے لیے ہوں۔ مضمون ختم ہونے پر شدت سے ارادہ کیا کہ ابھی مارکیٹ سے لا کر پرندے گھر میں رکھتے ہیں لیکن تحریر کا سحر ٹوٹنے پر یاد آیا کہ اگر یہ پرندے سارے مارکیٹ سے گھر میں لا کر رکھے تو گھر کے مکین کہاں جائیں گے کیونکہ پانچ مرلے کے مکان میں یا تو یہ پرندے رہ سکتے ہیں یا ہم لوگ جو کافی عرصے سے اس مکان میں رہتے ہیں۔ ایک ہی وقت میں دونوں کی گنجائش نہیں بن سکتی۔ "شمشال سے ٹورنٹو" سفرنامہ اب زیادہ باریکیوں کی آڑ لے کر اپنا کینوس وسیع کرتا نظر آتا ہے۔ کہیں کہیں بے جا طوالت محسوس ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود ندیم اقبال کی گرفت مضبوط ہے۔ موت کے روبرو نے ایک دفعہ تو رونگٹے کھڑے کر دیے۔ صدا بہار صداکار، فن پارے، کتب خانے ٹھیک ہیں لیکن زیادہ متاثر نہ کر سکے۔"

تاخیر سے موصول خطوط: اعجاز علی، سکھر۔ دردانہ شاہین، لاہور۔ اصغر فاروق، لاڑکانہ۔ زاہد خان، کوئٹہ۔ اشفاق احمد، پشاور۔

(کچھ خطوط ایسے نظر آئے جو کافی پہلے کے ہیں لیکن اب ملے ہیں جن پر لکھنے کی تاریخ پرانی ہے: سدرہ بانو ناگوری 3-23۔ سعید احمد جاند 3-7۔ فقیر غلام حسین ضیاء 3-6۔ آصف ضیا احمد 3-1۔ فہمی فردوس گوجرانوالہ، نزاہت افشاں، اویس شیخ 3-6۔ قیصر خان سکھر۔ منشی عزیز میمن)

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

دانشمند دیوانہ

ضیاء تسنیم بلگرامی

اس نے سائنس کی دنیا کو بے شمار نظریے دیے۔ اسی نے پہلی بار تصور دیا کہ اگر بحیرہ احمر کو بحیرہ روم سے ملا دیا جائے تو مغرب سے مشرق کی مسافت انتہائی کم ہو جائے گی۔ بعد میں اسی تصور کو عملی جامہ پہنایا گیا اور نہر سوئز بن گئی۔ اس نے ''نور'' پر کام کیا اور تصور پیش کیا کہ انسانی آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے وہ آنکھ کے عدسے پر الٹی پڑتی ہے۔ اسی تصور پر کیمرے کی ایجاد ہوئی۔ اس نے بے شمار ایسے تصور پیش کیے جس کو بعد میں یورپ کے سائنس دانوں نے عملی شکل دی۔ کئی اہم ایجادات دنیا کے سامنے آئیں۔

اسلامی دنیا کے ایک بڑے سائنس داں کی زندگی کا ایک اہم واقعہ

یہ 354 ہجری (965 عیسوی) کا زمانہ تھا بصرے کے ایک متوسط گھرانے میں ایک بچہ پیدا ہوا اس کا نام ابو علی محمد رکھا گیا۔ باپ کا نام ابو الحسن علی اور دادا کا نام ہیثم تھا۔ یہ عباسی خلافت کا دور تھا اور اس وقت تک عباسیوں نے عربی زبان کو دنیا کے مختلف علوم سے مالا مال کر دیا تھا۔ یونانی علم و ادب بطور خاص بہت مقبول تھا اور یونانی کتابوں سے ترجمے کیے جا رہے تھے۔ ہندوستانی علوم بھی عربی میں منتقل ہو رہے تھے چنانچہ بصرے کے اس بچے نے ہوش سنبھالنے کے بعد تعلیم حاصل کرنا شروع کی تو اسے کتب خانوں میں بے شمار ایسی کتابیں نظر آئیں جو دقیق موضوعات پر تھیں اور ان کا سمجھنا ہر ایک کے لیے ممکن نہیں تھا۔

ابو الحسن علی نے فلسفے اور ریاضی کو اپنے مزاج مذاق طبیعت کے مطابق پایا تو اس کے حصول میں دن رات ایک کر دیے اور انتہائی ذوق و شوق اور لگن سے بہت کچھ حاصل کر لیا اور یہ نکتہ ان کی سمجھ میں کم عمری ہی میں آ گیا کہ فلسفہ جملہ علوم کی اساس ہے۔

ابو الحسن علی نے ابن الہیثم کے نام سے شہرت حاصل کرنا شروع کر دی تھی اور زمانہ انہیں ان کے دادا کے نام سے جاننے لگا۔

ابن الہیثم عوام سے دور رہتے تھے۔ اسی لیے اس کا

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

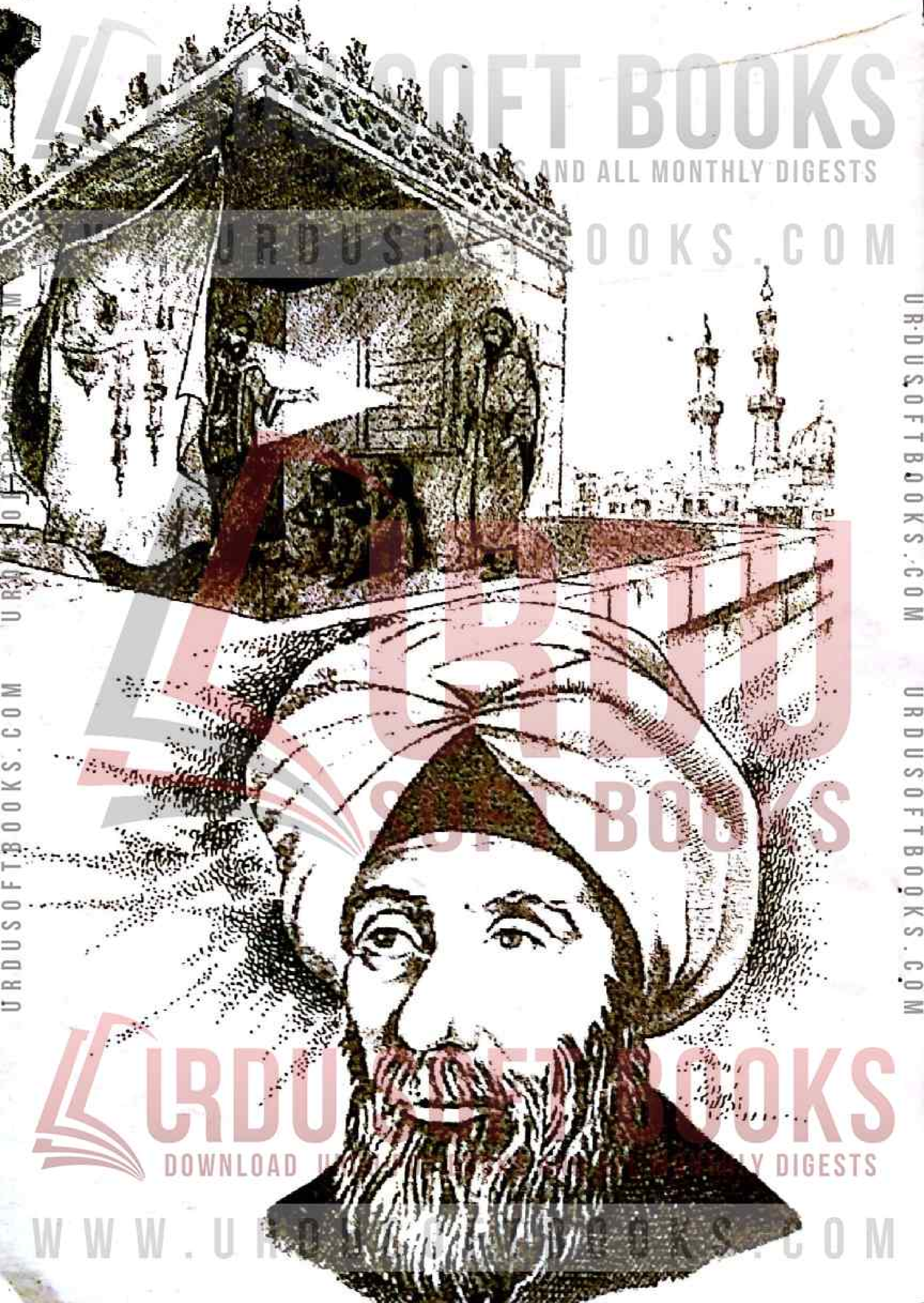

URDU SOFT BOOKS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

زیادہ وقت تحقیق اور تجسس میں گزرتا رہا خواص نے اسے کسی حد تک سمجھ لیا تھا اور اس کی رائے کو اہمیت دینے لگے خلیفۂ وقت بھی ابن الہیثم کے نام سے واقف تھا اور امراء اور حکام بھی ابن الہیثم کو جان اور پہچان چکے تھے۔

مزاج میں قناعت پسندی تھی اسی لیے مال و زر کی طرف ابن الہیثم کی توجہ بہت کم رہی تھی۔ انہیں اتنا مل جائے کہ وہ زندگی کو با آسانی گزار لیں یہی ان کے لیے کافی تھا۔

لوگ ان کے طرز زندگی اور قناعت پسندی کو صوفیوں سے مشابہہ قرار دیتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ ابن الہیثم تارک دنیا صوفیوں کی طرح بے نیازانہ زندگی بسر کرنے کا قائل ہے۔

لیکن ابن الہیثم کو تصوف یا صوفیوں سے کوئی سروکار نہیں تھا اور یہ شخص دنیا کو نہایت عمیق نظروں سے دیکھنے اور سمجھنے کا قائل بلکہ عادی تھا۔

گھر والوں کو ابن الہیثم کی قناعت پسندی اور مطالعے کا انہماک اس لیے پسند نہیں تھے کہ اس سے ابن الہیثم کو کوئی مالی فائدہ نہیں پہنچتا تھا وہ ابن الہیثم کو کتابوں کے مطالعے میں مستغرق دیکھتے تو انہیں بڑی الجھن ہوتی۔ ابن الہیثم کو دنیا بھر کے حالات جاننے کا جنون کی حد تک شوق تھا جہاں ریاضی کا مطالعہ ابن الہیثم کے لیے ضروری تھا وہیں اسے مسلم ملکوں کے جغرافیائی حالات اور واقعات کو جاننے کا بے حد شوق تھا اسے جب یہ معلوم ہوا کہ بغداد کی طرح مصر بھی علوم وفنون میں ترقی کی راہ پر گامزن ہے تو اسے مصر جانے کا شوق پیدا ہوا مگر مشکل یہ تھی کہ وہ ابھی اتنی شہرت حاصل نہیں کر سکا تھا کہ مصر کے فاطمی حکمران اسے بلواتے اس کے علاوہ اس کے اپنے مالی حالات بھی ایسے نہیں تھے کہ وہ خود اپنے طور پر مصر پہنچ کے وہاں کے علمی ذخائر سے فائدے اٹھاتا۔

خاندان والوں نے ابن الہیثم کو مجبور کیا کہ وہ علمی استغراق کے علاوہ کوئی کام بھی کرے، بصرے کے کئی حکومتی اداروں میں اسے ملازمت کی پیشکش کر دی گئی۔

وہ علم و فضل میں بہتوں سے ممتاز تھا اس لیے اس کو کوئی معمولی ملازمت کی پیشکش نہیں ہوئی۔ اسے ایک حکومتی ادارے کا سربراہ بنا دیا گیا اور بہت سے لوگ اس کی ماتحتی میں کام کرنے لگے۔

عملہ اس سے اس لیے خوش تھا کہ ابن الہیثم کسی کے کام میں بے جا مداخلت نہیں کرتا تھا اور اپنے حصے کا کام نہایت محنت اور دیانت داری سے انجام دیتا تھا۔

وہ اپنا کام اس وقت سے زیادہ کرتا تھا جتنا وقت اسے حکومت کی طرف سے دیا گیا تھا اس کی ہمیشہ یہی کوشش ہوتی تھی کہ آج کا کام دوسرے دن پر نہ ڈالا جائے اور اس مستعدی کی وجہ سے وہ رات تک کام میں مشغول رہتا۔

اسے چند سال کام کرنے کے بعد اپنے نفع اور نقصان پر غور کرنا پڑا تو معلوم ہوا کہ اس کے مطالعے میں بہت کمی ہو گئی ہے کیونکہ اس کا سارا وقت حکومتی ادارہ لے لیتا تھا وہ اس حد تک تھک جاتا کہ اپنے حکومتی کام سے فارغ ہونے کے بعد آرام کرنے کے علاوہ کوئی کام نہیں کر سکتا تھا۔

وہ شکوہ اور شکایت کا قائل نہیں تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اگر وہ حکومتی ادارے کی غیر معمولی مصروفیات کا ذکر کر کے حکومت سے رعایت چاہتا تو یہ اسے نہیں مل سکتی تھی اور یہ مشکل بھی پیش آ گئی تھی کہ وہ اپنی مرضی سے ملازمت چھوڑ بھی نہیں سکتا تھا۔

کئی ماہ اسی کشمکش میں گزر گئے اور وہ کوئی ایسا فیصلہ نہیں کر سکا جس سے وہ حکومتی ذمہ داریاں چھوڑ کے عراق سے کہیں اور چلا جاتا کیونکہ خلافت عباسیہ اسے اپنی حدود خلافت میں کہیں سے بھی زبردستی بلوا سکتی تھی صرف مصر ایسی جگہ تھی جہاں وہ آزادی سے رہ سکتا تھا اور عباسی خلیفہ مصر سے اس کو نہیں وہاں بلوا سکتا تھا۔

بصرہ میں مصر سے آنے والے اس سے ضرور ملتے تھے کہ اس نے اب اپنی علمی حیثیت کو دور دور تک دنیا سے منوا لیا تھا۔

اس نے مصر کے بارے میں بصرہ میں بیٹھے بیٹھے غیر معمولی معلومات حاصل کر لی تھیں۔ اسے جغرافیہ سے بھی غیر معمولی شغف تھا۔

مصر سے جو لوگ بصرہ آتے اور ابن الہیثم سے ملاقات کرتے تو گفتگو کے دوران ابن الہیثم مصر کے بارے میں جو رائے دیتا مصری ان پر حیرت زدہ ہو جاتے اور کبھی کبھی ابن الہیثم کی زبان سے کچھ ایسی معلومات افزا باتیں نکل جاتیں جن کا یہ مصری مصر پہنچ کے بہت چرچا کرتے اور اس طرح ابن الہیثم کی شہرت مصر پہنچتی رہی۔

مصری ابن الہیثم سے یہ شکایت کرتے رہتے تھے کہ دریائے نیل کبھی کبھی ان کو بہت نقصان پہنچاتا ہے۔ غیر معمولی سیلاب سے آبادیوں اور زمینوں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ جاتا اور کبھی کبھی پانی کی اتنی کمی ہو جاتی کہ آبادیاں اور زمینیں پانی کے لیے ترس جاتے اور بارش کی دعائیں مانگنے لگتے۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

ابن الہیثم مصر کے نقشے کو ذہن میں محفوظ کر لیتا اور دریائے نیل کی گزرگاہوں پر غور کرتے کرتے وہاں تک پہنچ جاتا جہاں دریائے نیل سمندر میں گرتا تھا۔

اس نے مصر سے آنے والے پڑھے لکھے لائق لوگوں سے بڑے اہم سوالات کیے اور ان کے جوابات چاہے مگر ایک مصری بھی اسے ایسا نہیں ملا جو اسے مطمئن کر دیتا۔

ابن الہیثم چاہتا تھا کہ ماضی میں مصری عالموں نے دریائے نیل کے بارے میں جو کام کیے تھے ان کی تفصیلات اس کو ملنی چاہیے کیونکہ ماضی کے مصری عالموں نے غیر معمولی کارنامے انجام دیے تھے اور یہ ناممکن بات تھی کہ مصریوں نے دریائے نیل سے پہنچنے والے نفع اور نقصان پر کبھی غور نہ کیا ہو اور ان کے بارے میں تجاویز نہ سوچی ہوں۔ ابن الہیثم مصر کے سابقہ عالموں کے کاموں سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ جب وہ مصر والوں سے مصر کے ماضی کے حوالے سے باتیں کرتا تھا تو یہ پوچھتا کہ کیا مصر میں ایسے ذخیرے اور کتب خانے اب بھی موجود ہیں جن میں دریائے نیل سے متعلق نقشے، تجاویز اور منصوبے موجود ہوں۔ تمام مصری اس کے اس سوال کا کبھی کوئی معقول جواب نہ دے سکے لیکن ان میں ایک ایسا تاجر ابن الہیثم کو ضرور ملا جس نے اس کو بتایا کہ وہ یہ معلومات کسی لائبریری یا علمی ذخیرے میں تو نہیں ملیں گی مگر اس کے باوجود ابن الہیثم کو مصر پہنچ کے اپنی مطلوبہ چیزوں کو تلاش کرنا چاہیے۔

ابن الہیثم نے پُرجوش لہجے میں کہا۔ ''تم اپنے خلیفہ الحاکم بامر اللہ تک میرا یہ پیغام پہنچا دو کہ میں دریائے نیل پر قابو پالینے کا ایک شاندار منصوبہ رکھتا ہوں۔ اس منصوبے پر عمل کرنے کے بعد نیل کی سیلابی تباہ کاریاں بے اثر ہو جائیں گی اور جب دریائے نیل میں پانی کم ہوگا تو اس سے بھی لوگوں کو نقصان نہیں پہنچے گا۔''

مصری تاجر نے یہ ساری باتیں بہت غور سے سنیں اور ابن الہیثم سے کہا۔ ''اگر تو اجازت دے تو میں تیری باتیں فاطمی خلیفہ تک پہنچا سکتا ہوں۔''

ابن الہیثم نے جواب دیا۔ ''میں تجھ سے جو کچھ کہہ رہا ہوں تو یہ کوئی چوپال والوں کی چوپال میں بیٹھے خوش گپیوں جیسی باتیں نہیں ہیں میں مصر کو فائدہ پہنچانا چاہتا ہوں۔''

مصری تاجر نے کہا۔ ''اے ابن الہیثم! میں تجھ کو اپنے ساتھ مصر لے جا سکتا ہوں تاکہ تو وہاں کا جائزہ اچھی طرح لینے کے بعد یہی باتیں خلیفہ سے کرے تو تجھے خلیفہ کی طرف سے شاندار پذیرائی اور مدد مل جائے گی۔''

ابن الہیثم نے مایوسی سے جواب دیا۔ ''بھائی! اس وقت تو میں عباسی خلیفہ کا ملازم ہوں اور اپنی مرضی سے یہ ملازمت نہیں چھوڑ سکتا۔ پہلے تو مجھے یہاں سے نجات حاصل کرنا ہے۔ اس کے بعد مصر کا قصد کر سکتا ہوں۔''

مصری تاجر نے کہا۔ ''یہاں سے نجات یا فراغت حاصل کرنا تیری ذمہ داری ہے میں تیرا سفر خرچ برداشت کر سکتا ہوں اور تیرا پیغام تیرے پہنچنے سے پہلے فاطمی خلیفہ تک پہنچا سکتا ہوں، بصرے اور عراق سے متعلق جو دشواریاں یا مسائل تجھ کو درپیش ہیں ان پر قابو پانا تیرا کام ہے۔ میں تو بس تجھے یہی مشورہ دے سکتا ہوں کہ پہلے تو بصرہ کی ملازمت سے کسی طرح پیچھا چھڑا اس کے بعد مصر کا خیال دل میں لا میں تیرا وسیلہ بن جاؤں گا لیکن عملاً تجھ ہی کو بہت کچھ کرنا ہوگا۔''

ابن الہیثم سر جھکائے کچھ دیر مصری تاجر کی پیشکش پر غور کرتا رہا اور پھر جیسے اس نے اپنی اس مصیبت کا حل تلاش کر لیا ہو مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اب تو مصر پہنچ کے خلیفہ سے میرا ذکر کر سکتا ہے اس دوران میں اپنی ملازمت سے نجات حاصل کر لوں گا۔''

مصری تاجر نے پوچھا۔ ''اب تو مجھے یہ بھی بتا دے کہ میں خلیفہ سے تیرا تعارف کس طرح کرواؤں اور دریائے نیل سے متعلق وہ تیری کون سی تجویز ہے جو فاطمی خلیفہ کو تیری طرف متوجہ کر سکتی ہے۔''

ابن الہیثم نے کہا۔ ''مصر میں جنادل کے قریب

حیدرآباد دکن کا آخری نظام

حیدرآباد دکن کی ریاست 1724ء میں اس وقت وجود میں آئی جب آخری عظیم مغل شہنشاہ اورنگ زیب کو وفات پائے 17 برس گزر چکے تھے۔ اس کے دور میں ریاست حیدرآباد کا کوئی وجود نہ تھا لیکن اس کے بعد مغل سلطنت کا زوال شروع ہوگیا۔ دکن کے ایک صوبیدار نے 1720ء میں مغلوں کے خلاف سرکشی کی اور ایک الگ ریاست کی بنیاد رکھی جو چار برس بعد 1724ء میں مکمل طور پر وجود میں آئی۔ اس باغی صوبیدار کا نام قمرالدین خان تھا۔

مرسلہ: افسر علی۔ کراچی

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

اسوان نامی جگہ ہے میں وہاں ایک ایسا انتظام کردوں گا کہ دریائے نیل مصریوں کے لیے ہر زمانے میں نفع بخش رہے گا۔"

مصری تاجر ابن الہیثم کا یہ پیغام لے کر مصر چلا گیا اور ابن الہیثم رات گئے تک دفتر میں کام کرنے کے بعد گھر پہنچا تو اس کی دماغی کیفیت بہتر نہیں تھی۔ وہ اپنے رشتے داروں سے بہکی بہکی باتیں کرنے لگا، ایسا لگتا تھا جیسے ابن الہیثم کی یادداشت اور حافظے سے تعلق رکھنے والا دماغی حصہ کمزور پڑ گیا ہو اس کی یادداشت کام نہیں کررہی تھی اور زبان بھی اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ وہ جو بھی کہنا چاہتا تھا اس کے لیے صحیح الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ اپنے بزرگوں کو بچوں کی طرح مخاطب کرتا اور بچوں سے احترام کے ساتھ پیش آتا۔ کھانے پینے کا بھی اسے ہوش نہیں تھا دیر تک دسترخوان پر بیٹھا کھاتا رہا۔ آخر میں گھر والوں کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ کھانا تو جوں کا توں موجود ہے اور وہ چند نوالے مسلسل چبائے چلا جارہا ہے۔

رات کو وہ کچھ مطالعہ ضرور کرتا تھا مگر اس رات اس نے اپنی کتابیں ایک طرف پھینک دیں اور بڑبڑانے لگا۔ "خدایا! مجھے اس مصیبت سے نجات دلوادے۔"

لیکن جب وہ اپنے دفتری امور انجام دینے لگا، اپنے عملے میں بیٹھا تو اس کی دماغی حالت درست تھی اور وہ گھنٹوں کار فرائض انجام دیتا رہا اس کا جنون رخصت ہوچکا تھا اور دل و دماغ صحیح کام کررہے تھے گویا وہ معمول پر آچکا تھا۔

چند ہفتے بخیر و خوبی گزر گئے اور اسے جب لوگ اس کی جنونی کیفیت کے بارے میں بتاتے تو اسے یقین نہیں آتا۔

حکومت کو اس کے جنون سے جو شکایت پیدا ہوئی تھی اور اس کا متبادل تلاش کیا جانے لگا تھا تو حکومت کی یہ فکر بھی دور ہوگئی۔

لیکن چار ہفتوں کے بعد اس پر پھر جنون کا دورہ پڑا اور وہ ناقابل فہم حرکتیں کرنے لگا۔ کام کرتے کرتے اپنی جگہ سے اٹھ کے کسی معمولی کارندے کا کان پکڑ لیتا اور اس کو تنبیہ کرتا کہ آئندہ ایسی غلطی نہ کرنا ورنہ نکال دیئے جاؤ گے۔

کارندہ اپنا کان چھڑا کے پوچھتا۔ "کون سی غلطی، مجھے میری غلطی تو بتائی جائے۔"

ابن الہیثم نے اس کا کان دوبارہ پکڑ کے اینٹھنا شروع کردیا اور اور کہا۔ "منحوس انسان! غلطیاں تو کرے اور اپنی غلطیوں کے بتانے کی ذمہ داری مجھ پر عائد کردے سدھر جا ورنہ ملازمت سے سبکدوش کردیا جائے گا۔"

کسی دوسرے کارکن کو بلا کر دھمکی دیتا۔ "رات تونے اپنی بیوی کو بے تحاشا مارا پیٹا وہ میرے پاس فریاد لے کر آئی تھی خبردار جو آئندہ تو نے اس پر ہاتھ اٹھایا اگر تیری بیوی میرے پاس دوبارہ شکایت لے کر آئی تو میں تیرے دونوں ہاتھ تڑوادوں گا۔"

اس شخص نے حیرت سے جواب دیا۔ "حضرت! میری تو ابھی شادی بھی نہیں ہوئی پھر میری شکایت آپ سے کس نے کردی۔"

ابن الہیثم نے اس کے بھی کان مروڑے اور کہا۔ "مجھے بے وقوف بناتا ہے۔ تیری بیوی اپنے ساتھ تین بچے بھی لائی تھی کیا وہ بچے شادی کے بغیر ہی پیدا ہوگئے تجھ پر تو حد کا مقدمہ چلنا چاہیے۔"

عملے کے دوسرے لوگوں نے بیچ بچاؤ کروادیا اور اسے ابن الہیثم کے پاس سے الگ لے گئے اور کہا۔ "آج کل ابن الہیثم کا دماغی توازن درست نہیں ہے اس لیے تو اس سے بحث نہ کر۔"

ابن الہیثم نے عملے کے جملہ کارکنوں کو سمجھایا کہ وہ اپنی گھریلو زندگی میں عدل و انصاف سے کام لیں، کمزور پر ظلم نہ کریں اور کسی کے مارنے پیٹنے کا حق کسی کو بھی حاصل نہیں۔

یہ خبریں دور دور تک پہنچ گئیں کہ ابن الہیثم کا دماغی توازن دوبارہ بگڑ گیا ہے۔

ابن الہیثم نے گھر پہنچ کر ہر کسی پر سختی شروع کردی بچوں کی تعظیم کرتا اور بزرگوں کو ڈانٹا پھٹکارتا، کھانا چھوڑ دیا اور اسے پانی سے نفرت ہوگئی۔

گھر کے لوگ بھی پریشان ہوگئے۔ لائق اطباء کی خدمات حاصل کی گئیں اور وہمی شکی لوگوں نے عاملوں، نجومیوں اور روحانی علاج کرنے والوں سے مشورے کیے مگر ابن الہیثم کے جنون کو کوئی بھی نہیں سمجھ سکا۔

حکومت کو ایک بار پھر ابن الہیثم کے متبادل کی ضرورت محسوس ہوئی۔

ابن الہیثم کی صحت بگڑنے لگی تو حکومت نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ ابن الہیثم کی جگہ کسی اور کو بٹھادے اور ابن الہیثم کو آرام کرنے دیا جائے۔

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

جن لوگوں کو ابن الہیثم سے محبت تھی اور اس سے عقیدت رکھتے تھے وہ یہی مشورہ دیتے رہے کہ ابن الہیثم کا علاج کیا جائے اور اس کی جگہ کسی اور کو نہ بٹھایا جائے کیونکہ اس جیسا لائق اور فائق انسان نہیں ملے گا۔

آخر کار حکومت نے اس کو کچھ عرصہ کام کرنے کا مزید موقع دیا کیونکہ اس کی دماغی کیفیت معمول پر آگئی تھی۔

طبیبوں کا خیال تھا کہ ان کے علاج سے فائدہ ہوا جب کہ رمال، نجومی اور روحانی علاج کرنے والے دعویٰ کررہے تھے کہ انہوں نے ابن الہیثم کو صحت یاب کردیا بصرے کے ایک روحانی علاج کرنے والے نے دعویٰ کیا کہ ابن الہیثم ایک جن کے زیر اثر ہے اور اس جن سے پیچھا چھڑانا مشکل ہے لیکن وہ کوشش کرے گا کہ ابن الہیثم کو اس کے اثر سے نجات دلائی جائے۔

اسی دوران کسی نے اس کے گھر والوں کو بتایا کہ اس جیسے مریضوں کا قاہرہ میں علاج دعوے کے ساتھ کیا جاتا ہے اور دنیا بھر سے اس قسم کے مریض وہاں سے پہنچتے رہتے ہیں۔ ابن الہیثم کے گھر والوں نے حکومت سے درخواست کی کہ انہیں ابن الہیثم کو مصر لے جانے کی اجازت دی جائے۔

عباسی حکومت کے ذمے داروں نے بتایا۔ ”ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے تم لوگ اسے مصر لے جاؤ اور اس کا علاج کرواؤ لیکن اب اسے اپنی ملازمت سے مستقلاً سبکدوشی اختیار کرنا پڑے گی۔“

چنانچہ ابن الہیثم کو ملازمت سے سبکدوش کردیا گیا اور اس کو مصر لے جانے کی تیاریاں ہونے لگیں۔

☆......☆

ابن الہیثم عراق سے نکل کر شام پہنچا اور یہاں وہ فاطمی خلافت کی طرف سے بلاوے کے دعوت نامے کا کچھ عرصہ انتظار کرتا رہا۔

مصر میں فاطمی خلیفہ کو اطلاع مل چکی تھی کہ ابن الہیثم نے عباسی خلیفہ کی ملازمت سے سبکدوشی حاصل کرلی ہے اور وہ قاہرہ میں مستقل قیام کرنے کی نیت سے شام تک پہنچ چکا ہے۔

فاطمی خلیفہ الحاکم نے باضابطہ دعوت بلاوا روانہ کردیا اور اس کے ساتھ ہی ابن الہیثم کو خاصی رقم بھی پہنچائی گئی جب کہ عباسی خلیفہ، امراء اور بصرہ کے عزیز و اقارب یہی سمجھتے رہے کہ ابن الہیثم اپنے مرض جنون کے علاج کے لیے قاہرہ جارہا ہے۔

قاہرہ میں ابن الہیثم کو اتنی عزت بخشی گئی کہ جب وہ مختصر خلافت کے قریب خندق نامی جگہ تک پہنچا تو فاطمی خلیفہ الحاکم اپنے امراء وزراء کے ساتھ وہاں منتظر نظر آیا۔

ابن الہیثم خلیفہ کے احترام میں گھوڑے سے نیچے آگیا اور آگے بڑھ کر الحاکم کے ہاتھوں کو بوسہ دیا۔

الحاکم بھی نہایت گرم جوشی سے پیش آیا اور کہا۔ ”مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ تو نے مستقل سکونت کے لیے عراق کی بجائے مصر کے قاہرہ کو ترجیح دی۔“

الحاکم اپنے ساتھ قصر خلافت میں لے گیا اور اس سے دیر تک باتیں کرتا رہا۔

گفتگو سے الحاکم کو اندازہ ہوا کہ ابن الہیثم کی لیاقت کے بارے میں اب تک اسے جو کچھ بتایا گیا تھا وہ بہت کم تھا ابن الہیثم جیسا مہندس اور ریاضی داں اس عہد میں دوسرا کوئی نہیں تھا۔ ابن الہیثم کا کمال یہ تھا کہ اسے دنیا بھر کی معلومات اپنے دماغی ذخیرے میں جمع کر رکھی تھی۔ حافظہ غضب کا تھا جب الحاکم نے مصر اور دریائے نیل کے حوالے سے گفتگو شروع کی تو ابن الہیثم نے اسے اتنی معلومات فراہم کردی جس سے وہاں کے مقامی لوگ بھی واقف نہیں تھے۔ ابن الہیثم کو دریائے نیل کی گزرگاہوں کا بھی خاصا علم حاصل تھا اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ قدیم مصری ماہرین نے جنادل نامی جگہ پر دریائے نیل کو مقید بنانے کے لیے کتنے کام کیے تھے وہ اس بلند مقام سے بھی آگاہ تھا جہاں نیل بلندی سے نیچے گرتا تھا اور جنادل کی اس جگہ کا نام خزائن تھا اور آج اسے اسوان کہا جاتا ہے۔

خلیفہ نے ابن الہیثم کو رہنے کے لیے ایک شاندار عمارت دینا چاہی مگر اس لائق و حاذق نابغۂ روزگار عالم نے خلیفہ سے درخواست کی کہ اسے جامعہ الازہر کے قریب رہنے کے لیے کوئی جگہ دے دی جائے۔ چنانچہ ابن الہیثم کو اس کی مرضی کے مطابق جامعہ الازہر سے ملحق زمین پر ایک چھوٹی سی عمارت بنوا کے دے دی گئی۔

اسے جہاں یہ سہولت حاصل تھی کہ وہ جب چاہتا جامعہ الازہر کے کتب خانے میں چلا جاتا تھا اور مطالعے کے ذوق کو تسکین پہنچاتا۔

جیسا کہ پہلے ہی بتایا جاچکا ہے کہ ابن الہیثم عوام کو پسند نہیں کرتا تھا ان سے الگ تھلگ رہتا اور انہیں اپنے قریب نہیں آنے دیتا تھا۔ قاہرہ میں اس نے اپنی یہ روش

برقرار رکھی اس کے پاس اس عہد کے عالم پہنچتے اور اس کی صحبت سے فیض یاب ہوتے۔

کچھ عرصے بعد خلیفہ الحاکم نے ابن الہیثم کو تخلیے میں طلب کیا اور کہا۔ ''تجھے تو معلوم ہے کہ میں نے تجھے یہاں آنے کی زحمت کیوں دی۔''

ابن الہیثم نے جواب دیا۔ ''بے شک میں خود بھی یہاں آنے کا خواہش مند تھا کیونکہ میں ایک ایسا کارنامہ انجام دینا چاہتا ہوں کہ دنیا کو مدتوں یاد رہے اور آپ کا نام اس کارنامے کے بانی، مُربی اور محسن کی حیثیت سے لیا جائے۔''

الحاکم نے جواب دیا۔ ''ہاں مگر اس کا بانی اور کارگزار تو تجھ ہی کو سمجھا جائے گا اور مجھے لوگ اس حیثیت سے یاد رکھیں گے کہ میں نے تیرے مشورے اور مرضی، علم اور منصوبے کی قدر کی اور تجھے اس کو عملی جامہ پہنانے کی اجازت دی تیری مالی مدد کی اور تجھے عزت و آبرو سے قاہرہ میں مستقل سکونت بخشی۔''

ابن الہیثم نے خلیفہ سے درخواست کی۔ ''فی الحال مجھے اپنے مطلب کے کچھ لوگ درکار ہیں۔ میں ان کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا اور جنادل کے قرب و جوار کا اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد اپنے عظیم الشان کام کی منصوبہ بندی کروں گا۔''

خلیفہ الحاکم نے اسے آزادی سے کام کرنے کی اجازت دی اور کہا۔ ''پہلے تو اپنے منصوبے سے متعلق مقامات کا اچھی طرح جائزہ لے اور پھر یہ کام کس طرح شروع کیا جائے گا اور اس کے لیے تجھے کن کن چیزوں کی ضرورت پیش آئے گی اور ان پر کتنے مصارف آئیں گے۔ کن کن شعبوں کے ماہرین کی مدد درکار ہو گی اور اس کام میں کتنے مزدوروں سے خدمت لی جائے گی ان... تمام امور کو اپنے ذہن میں رکھ کے اعلیٰ درجے کی منصوبہ بندی کرنے کے بعد ساری تفصیل میرے سامنے رکھ دے اور میں جیسے ہی اس کو عملی جامہ پہنانے کا حکم دوں تو اپنا کام شروع کردے گا۔''

ابن الہیثم نے خلیفہ کو بتایا۔ ''آپ نے مجھے رہنے کے لیے ایک شاندار قصر دینا چاہا لیکن میں نے اسے اس لیے قبول نہیں کیا کہ میں یہاں کام کرنے کے لیے آیا ہوں۔ آرام و آسائش کے لیے نہیں اور میں نے اپنے لیے جامعہ الازہر سے ملحق چھوٹی سی اراضی پسند کرلی ہے اور آپ مجھے میرے قیام کے لیے عمارت تعمیر کروادی ہے اس سے مجھے یہ فائدہ پہنچا کہ میں جامعہ کے کتب خانے سے فائدے اٹھا رہا ہوں۔ میں جب سے یہاں آیا ہوں ان تمام نقشوں اور تحریروں کا مطالعہ اور مشاہدہ کررہا ہوں جن کا تعلق قدیم مصر کے ان ماہرین سے ہے جو اس سلسلے میں کام کرنا چاہتے تھے مگر کسی وجہ سے نہیں کرسکے میں نے ان کا مطالعہ کیا ہے ان کے نقشے دیکھے ان کے جائزوں کو سمجھنے کی کوشش کی اور یہ کام ابھی جاری ہے جب ادھر سے فرصت پاؤں گا تو میں جنادل پہنچ کے خود بھی ان مقامات کا جائزہ لوں گا۔''

خلیفہ الحاکم نے حیرت سے پوچھا۔ ''اے ابن الہیثم! یہ تو ہمیں کیا بتا رہا ہے کیا تجھ سے پہلے بھی لوگوں کے ذہن میں ایسا کوئی منصوبہ آیا تھا۔''

ابن الہیثم نے جواب دیا۔ ''ہاں میں نہیں سمجھتا کہ دریائے نیل کے نفع اور نقصان سے متعلق پہلوؤں پر ماضی کے مصریوں نے غور نہ کیا ہو مگر کسی وجہ سے وہ اس پر عمل نہیں کرسکے ہوں گے۔''

خلیفہ الحاکم نے پوچھا۔ ''دوران مطالعہ اور تحقیق کے عرصے میں تجھے ایسا ذخیرہ یا ثبوت ملا جو تجھے کسی قسم کی مدد دے۔''

ابن الہیثم نے جواب دیا۔ ''کچھ چیزیں مل تو گئی ہیں مگر وہ میرے لیے بے کار ہیں اور میں ان سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتا اس لیے اب میں جنادل جاؤں گا اور وہاں کا اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد کام شروع کردوں گا۔''

خلیفہ الحاکم نے پوچھا۔ ''مجھے تو حیرت ہے کہ ماضی کے وہ کون لوگ تھے جو تیری طرح سوچ رکھتے تھے مگر کسی عمل کے بغیر ہی مر کھپ گئے آخر ان کو اپنے کام کو آگے بڑھانے سے کن امور نے روکا ہو گا۔''

ابن الہیثم نے جواب دیا۔ ''منصوبہ بندی ایک الگ چیز ہے اور اس کا عملی نظام مرتب کرنا دوسرے مرحلے کا کام ہے اور پھر اس پر عملاً کام شروع کردینا تیسرے مرحلے کا کام ہے۔ ماضی کے مصری ماہرین نے ضرور کوئی دشواری محسوس کرلی ہو گی کہ وہ پیچھے ہٹ گئے۔''

خلیفہ الحاکم نے کہا۔ ''مجھے ایسے لوگ بالکل پسند نہیں ہیں جو اپنے کام کو ادھورا چھوڑ کردنیا سے رخصت ہوجائیں، اے ابن الہیثم! یہ کام ضرور ہونا چاہیے کیونکہ اگر ماضی کے منصوبہ سازوں کی طرح ہم بھی ناکام رہے تو آنے والا زمانہ اور لوگ ہمیں بھی کم ہمت، نااہل اور غیر مستقل مزاج

URDU SOFT BOOKS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS

سمجھیں گے۔''

ابن الہیثم خلیفہ الحاکم کی اس صاف گوئی اور تہدید آمیز گفتگو سے ڈر گیا کیونکہ وہ جب سے قاہرہ میں مقیم تھا۔ اس نے خلیفہ الحاکم کے بارے میں عجیب و غریب خبریں سنی تھیں۔ لوگ کہتے تھے کہ خلیفہ الحاکم کی دماغی کیفیت ہمیشہ یکساں نہیں رہتی اور یہ ایسے فرامین اور احکام جاری کرتا رہتا ہے جن پر عمل نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے علاوہ خلیفہ ذرا ذرا سی غلطی پر انسانوں کو قتل کروا دیتا ہے اور یہ بھی مشہور تھا کہ خلیفہ خود کو دنیا بھر کے انسانوں سے ممتاز اور بالاتر سمجھتا ہے اس نے کبھی کبھی یہ بھی ظاہر کیا ہے کہ خدا اس میں حلول کر گیا ہے اور اس کی تعظیم و تکریم خدا کی طرح ہونی چاہیے۔ چنانچہ ابن الہیثم نے کئی بار خلیفہ کو لوگوں کے سامنے سے گزرتے ہوئے دیکھا تو لوگوں نے خلیفہ کے حق میں نعرے لگائے۔ ''اے جانداروں کے پیدا کرنے والے اور پھر انہیں ہلاک کرنے والے تجھے معبودیت مبارک ہم تیرے بندے ہیں۔''

ابن الہیثم خوف زدہ تھا کہ اب اس کا جس شخص سے واسطہ پڑا ہے وہ تو ابن الہیثم کو اس کی ناکامی و کوتاہی پر معاف نہیں کرے گا اور شاید حالتِ جنون میں خلیفہ الحاکم اس کو قتل کروا دے۔

خلیفہ الحاکم کے حکم کی تعمیل میں ابن الہیثم نے ایک چھوٹی سی فہرست تیار کی یہ وہ لوگ تھے جن سے ابن الہیثم مشورے کرتا اور منصوبے کے مختلف پہلوؤں سے متعلق ان سے کام لیتا۔ ان میں ارضی معلومات رکھنے والے بھی تھے۔ منصوبے میں مزدوروں کی تعداد کا تعین کرنے والے بھی مختلف آلات اور اوزار کا تفصیلی علم رکھنے والے بھی اس فہرست میں موجود تھے۔

وہ اپنی اس مختصر جمعیت کے ساتھ جنادل کی طرف روانہ ہوگیا کئی ہفتے اس نے نیل کی گزرگاہوں کا جائزہ لیا اور جنادل پہنچ کر اس نے اپنے مشیروں کو حکم دیا کہ وہ اس جگہ کو خوب اچھی طرح دیکھ لینے کے بعد بتائیں کہ یہاں کہاں سے کہاں تک کھدائی کی جائے گی اور یہ کھدائی کتنی گہری ہو گی اور اس کے لیے کون کون سے آلات درکار ہوں گے اور یہ بھی تخمینہ ہونا چاہیے کہ یہاں کتنے مزدور کام کریں گے اور یہ کام کتنے عرصے تک جاری رہے گا اور اس پر کتنا خرچا آئے گا۔

اس کے معاون و مددگار اپنے اپنے کاموں میں مشغول ہو گئے اور ابن الہیثم خود بھی اپنے طور پر اس خطرناک منصوبے کی تکمیل کے بارے میں غور و خوض کرنے لگا۔ اس نے جنادل کی وہ جگہ بھی دیکھی جہاں سے دریائے نیل کا پانی بالائی سطح سے نیچے گرتا تھا۔ زمین سخت اور پتھریلی تھی اور اس کی کھدائی نظری طور پر جتنی آسان سمجھی گئی تھی عملاً یہ کام اتنا ہی مشکل تھا۔

جنادل کے کئی آثار قدیمہ کے ماہر نے ابن الہیثم کو اس منصوبے کے ناممکن العمل ہونے کی تفصیل بتائی اور کہا۔ ''میں نے ان ماہرین کی کتابیں پڑھی ہیں جو ابن الہیثم سے پہلے اسی منصوبے پر کام کرنا چاہتے تھے مگر اس کے عملی پہلوؤں کا اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد ہمت ہار گئے۔''

اس شخص نے پرانے ماہرین کے کئی نقشے بھی دکھائے اور ابن الہیثم کو بتایا۔ ''انہیں دیکھو یہ میری آبائی ملکیت ہیں اور یہ تجھے جامعہ الازہر کے کتب خانے میں نہیں ملیں گے۔''

ابن الہیثم نے ان نادر و نایاب نسخوں کا بھی اچھی طرح مطالعہ کیا اور وہ نقشے بھی دیکھے جو ماضی کے ماہر صناعوں نے تیار کیے تھے اور وہ حساب کتاب بھی ابن الہیثم کی نظروں سے گزرا جو ماضی کے ماہرین نے تخمینے لگا کر تیار کیا تھا اور اس مدت کو بھی غور سے دیکھا۔ سمجھا اور اپنے طور پر حساب سے ان کا تخمینہ نکالا تو اس کی ہمت جواب دے گئی۔

وہ انتہائی مایوس اور پریشان سوچتا رہا کہ اسے یہ کام شروع کرنا چاہیے یا خلیفہ الحاکم سے معذرت کر لینا چاہیے۔ لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ شاید الحاکم اس کی معذرت قبول نہ کرے اور اس کے لیے کوئی خوفناک سزا تجویز کر دے۔

وہ یہاں تک سوچنے کے بعد اپنے کارندوں کا انتظار کرنے لگا کیونکہ ان سب سے بھی اپنے دور کے اعتبار سے تفصیلی معلومات حاصل کرنے کے بعد وہ خلیفہ سے موثر دلیلوں کے ذریعے معذرت کرنا چاہتا تھا۔

ہفتوں کے جائزوں کے بعد ابن الہیثم کے کام کرنے والے واپس آئے تو ابن الہیثم نے ان سب سے الگ الگ باتیں کیں۔

سب سے پہلے اس نے ان مہندسین کو بلوایا جو علم ہندسہ کے ماہر تھے اور جنہیں موجودہ زمانے میں انجینئر کہا جاتا ہے۔

یہ سارے مہندس متفقہ طور پر ابن الہیثم کو بتاتے رہے

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

کہ یہ کام ناممکن تو نہیں لیکن مشکل ترین ضرور ہے اور انہوں نے بتایا ہے کہ اگر پتھریلے حصوں کی کھدائی کی جائے گی تو اس پر کئی سال لگ جائیں گے اور مصارف بھی بہت زیادہ آئیں گے۔

ابن الہیثم نے پوچھا۔ ''میں تو یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اس کام میں کتنے آلات اور اوزار درکار ہوں گے اور انہیں کتنے آدمی استعمال کریں گے۔''

کسی مہندس نے آلات اور اوزار کی اتنی بڑی تفصیل پیش کردی کہ ابن الہیثم پریشان ہوگیا۔ اتنے آلات اور اوزار اسے فوراً کہیں سے دستیاب نہیں ہوسکتے اور اگر ان کی تیاری کا حکم دیا جائے گا تو ان کے لیے ہزاروں لوہار اور آہنگر درکار ہوں گے پہلے مدتوں وہ کام کریں گے اس کے بعد ان سے کام لینے والے ہنرمند تلاش کیے جائیں گے اور پھر مزدوروں کی ایک فوج جمع کی جائے گی ان سب سے کام لینے والوں کے لیے آدمیوں کا انتخاب بھی مشکل مرحلہ ہوگا۔

لیکن ان تمام مشکلات اور دشواریوں کا ابن الہیثم کا تحریر میں لانا بھی ایک مرحلہ تھا کیونکہ یہ ساری باتیں خلیفہ الحاکم کو زبانی سمجھانا مشکل ہوگا۔

ابن الہیثم نے اپنے ساتھ کام کرنے والوں کو حکم دیا کہ وہ اپنے اپنے حصے کی تفصیلی روداد اور تخمینے کو ضابطۂ تحریر میں لائیں۔

چنانچہ مہندسوں نے سب سے پہلے کھدائی کے لیے درکار آلات اور اوزار کی ایک بہت بڑی فہرست تیار کردی۔ بازار سے کتنے مل سکتے تھے انہیں بھی قیاس اور اندازے سے لکھ دیا گیا اور ان کی مزید تیاری کے لیے کتنے حداد آہنگر درکار ہوں گے کتنی بھٹیاں تیار کی جائیں گی اور کتنا لوہا کہاں کہاں سے لایا جائے گا، کس طرح لایا جائے گا۔ بار برداری کے لیے انہیں کتنے جانور درکار ہوں گے، یہ ساری تفصیل ضابطۂ تحریر میں لائی گئی تو ابن الہیثم کا حوصلہ بالکل جواب دے گیا۔

ان پر جو خرچ آرہا تھا وہ بھی اتنا تھا کہ اسے خلیفہ سے منظور کروانا مشکل تھا۔

پتھریلی زمینوں کی کھدائی میں کتنے مزدور لگائے جائیں گے اور سطح زمین کی کھدائی کے لیے کتنے ہزار مزدوروں کی ضرورت پیش آئے گی اور انہیں یومیہ کتنی اُجرت دی جائے گی اور یہ کام کتنے سالوں تک ہوتا رہے گا اور اسے کس طرح پایۂ تکمیل تک پہنچایا جائے گا۔

اس کے کارکنوں نے اپنی اپنی ضروریات اور منصوبے کی تفصیلات تحریری شکل میں ابن الہیثم کے حوالے کردیں تو اسے معلوم ہوا کہ اگر یہ کام متواتر اور یکساں جذبے اور حوصلے سے کیا جائے تو اس میں پچیس یا تیس سال لگ جائیں گے کیا خلیفہ الحاکم اتنے عرصے تک زندہ رہے گا اور وہ اپنی زندگی کے بارے میں بھی سوچتا اور غور کرتا رہا تو اس نتیجے پر پہنچا کہ اس دوران وہ خود بھی مرسکتا ہے۔

جناول کے آثار قدیمہ کے ماہر کے گھر میں بھی جمع ہوئے اور وہاں ہر شخص نے اپنی رائے سب کے سامنے بیان کردی۔

ابن الہیثم کی حالت غیر ہونے لگی۔

جناول کا ماہر آثار قدیمہ سب کی باتیں سنتا رہا اور مسکراتا رہا آخر میں ابن الہیثم سے کہا۔ ''اب بتا کہ تجھ سے پہلے تیری جیسی سوچ رکھنے والے پیچھے کیوں ہٹ گئے تھے؟''

ابن الہیثم نے جواب دیا۔ ''میں ان جیسا کم ہمت نہیں ہوں میرے ساتھ ایک دوسری مجبوری ہے اور میری بے بسی اس مجبوری کو بیان نہیں کرنے دے گی۔''

اس کے کئی ساتھیوں نے زور دیا کہ وہ اگر اس مشکل کام کو اب بھی قابل عمل سمجھ رہا ہے مگر اپنی کسی مجبوری کی وجہ سے اس کو وہ اپنی زبان تک نہیں لاسکتا تو لوگ یہی سمجھیں گے کہ ابن الہیثم حیلے بہانے سے کام لے رہا ہے ورنہ یہ کام حقیقتاً اس کے بس کا نہیں ہے۔

ابن الہیثم نے جناول کے آثار قدیمہ کے ماہر کو الگ لے جا کے پوچھا۔ ''تیرا بھی قاہرہ آنا جانا ہوتا ہے یا نہیں۔''

جناول کے آثار قدیمہ کے ماہر نے جواب دیا۔ ''میں ایک گوشہ نشین انسان ہوں اور درباروں سرکاروں سے دور رہنے میں اپنی عافیت سمجھتا ہوں اسی لیے میں آج تک قاہرہ نہیں گیا۔''

ابن الہیثم اس سے کچھ کہنا چاہتا تھا مگر کہتے ہوئے اسے خوف محسوس ہوا۔

جناولی آثار قدیمہ کے ماہر نے کہا۔ ''میں تجھ سے بہت متاثر ہوں اور تیرا احترام کرتا ہوں تو مجھ سے ہر قسم کی بات کرسکتا ہے اور یہ سمجھ کہ جو بات میرے علم میں آئے گی وہ میرے سینے میں دفن ہوجائے گی۔''

ابن الہیثم نے کہا۔ ''تو خلیفہ الحاکم کے بارے میں کیا کچھ جانتا ہے۔''

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

جناولی آثار قدیمہ کے ماہر نے جواب دیا۔ "میرا نام بدرالدین ہے اور میرے نام سے دور دور کے لوگ واقف ہیں مگر مجھے خوشی ہے کہ میرے جو عقائد ہیں خلیفہ کے عقائد اس سے متضاد ہیں اس لیے وہ مجھے کبھی قاہرہ نہیں بلائے گا اور نہ مجھ سے کوئی کام لے گا میں اسے اپنے حق میں مفید سمجھتا ہوں۔"

ابن الہیثم نے کہا۔ "خلیفہ الحاکم کے سوچنے کا انداز دنیا بھر سے مختلف ہے وہ خود کو دنیا کا سب سے بڑا انسان سمجھتا ہے کہتا ہے کہ مجھ میں خدا حلول کر گیا ہے اس لیے وہ اپنے عہد کا چلتا پھرتا متحرک خدا ہے چنانچہ کوئی بھی اس کی کسی بھی رائے کو رد نہیں کر سکتا، وہ ذرا ذرا سی بات پر لوگوں کو قتل کروا دیتا ہے۔ اب اگر میں اس سے زیادہ کچھ کہنا چاہوں تو وہ بے سود ہے۔"

ابن الہیثم نے اپنی مجبوری بیان کردی اور کہا۔ "الحاکم کچھ بھی سہی لیکن وہ اس کام کی طوالت کو برداشت نہیں کرے گا وہ اسے بھی پورا نہیں کرسکے گا اسی لیے میں یہ کام انجام کو نہیں پہنچا سکوں گا۔ کام کے دوران ہم دونوں مر بھی سکتے ہیں اور ہمیں یہ بھی سوچنا ہے کہ ہمارے بعد یہ کام کس طرح جاری رہے گا اور اسے تکمیل کے مرحلے تک کون پہنچائے گا۔"

جناولی ماہر بدرالدین نے کہا۔ "تیری بہتری اسی میں ہے کہ تو پیچھے ہٹ جا اور کسی بھی طرح اس سے معذرت کرلے۔"

ابن الہیثم کو دوران گفتگو اپنی وہی تدبیر یاد آئی جس سے اس نے بصرہ میں عباسی حکومت سے سبکدوشی حاصل کی تھی یعنی مصنوعی طور پر جنونی کیفیت میں مبتلا ہو جانا۔

اس نے اپنی اس تدبیر کا ذکر بدرالدین سے تو نہیں کیا مگر جناول کو چھوڑتے وقت اس نے یہ ضرور کہا کہ "میں اپنے منصوبے کی ناکامی پر غور کرتا ہوں تو میرے دل و دماغ ہم آہنگی سے محروم سے لگتے ہیں اور مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں پاگل ہو جاؤں گا۔"

جن لوگوں نے جناول تک اس کا ساتھ دیا تھا ان سب کو یہ کہہ کر سبکدوش کردیا گیا کہ جب خلیفہ سے اس کام کے شروع کرنے کی منظوری حاصل ہو جائے گی تو ان سب کو بلوا کے کام شروع کردیا جائے گا۔

قاہرہ پہنچنے کے بعد ابن الہیثم خلیفہ الحاکم سے فوراً نہیں ملا اور کئی دن تک اپنے مکان میں قید رہا لوگ اس کے در پر دستک دے کر چلے جاتے مگر وہ ان کے لیے دروازہ نہیں کھولتا۔

خلیفہ الحاکم کو بھی اس کی واپسی کا علم ہو گیا تھا مگر وہ حیران تھا کہ آخر ابن الہیثم اس کے پاس کیوں نہیں آیا اور اپنے کام کی تفصیلات سے خلیفہ کو آگاہ کیوں نہیں کیا۔

کئی دن انتظار کرنے کے بعد خلیفہ الحاکم نے ابن الہیثم کو طلب کرلیا۔ ابن الہیثم کو خلیفہ الحاکم کے پاس جانا پڑا وہ راستے بھر یہی سوچتا رہا کہ وہ خلیفہ سے کس قسم کی باتیں کرے جس سے وہ اس کی معذرت قبول کرلے اس کے بارے میں یہ بھی مشہور ہو گیا تھا کہ ان دنوں اس کی دماغی کیفیت معمول پر نہیں ہے۔

اسے خلیفہ الحاکم کے روبرو پیش کردیا گیا۔ اس وقت اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور چہرے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کے دل و دماغ معمول پر نہیں ہیں۔

خلیفہ نے پوچھا۔ "تو ماہرین کی ایک جماعت اپنے ساتھ جناول لے گیا تھا اور وہاں سے واپس آنے کے بعد تو نے مجھے اپنی کارگزاریوں سے آگاہ نہیں کیا اور چپ چاپ اپنے مکان میں قید ہو کر بیٹھ گیا۔"

ابن الہیثم نے جواب دیا۔ "اس وقت تو میں خود بھی حیران ہوں کہ میرے دل و دماغ کا بگڑا ہوا توازن معمول پر کس طرح آگیا بس ایک ہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ خلیفۂ وقت کو ماورائی قوتیں حاصل ہیں اور انہوں نے مجھے اس لائق کردیا کہ اب میں خلیفہ سے با آسانی باتیں کرسکتا ہوں۔"

خلیفہ الحاکم نے نرم پڑتے ہوئے پوچھا۔ "اس کام کا کیا ہوا جس کے لیے تو مصر بلایا گیا تھا۔"

ابن الہیثم زار و قطار روتا رہا اور رک رک کر خلیفہ کو بتایا۔ "یہ کام ناممکن تو نہیں ہے مگر طویل المیعاد اور طویل الاخراجات ہے۔ میں نے کھدائی کرنے والے ماہرین سے اس جگہ کو دکھا کر معلوم کیا کہ یہ کام کتنے دنوں میں پایۂ تکمیل تک پہنچ جائے گا تو انہوں نے کسی دباؤ کے بغیر آزادانہ اپنا فیصلہ سنایا کہ اس کام میں کم از کم تیس سال لگ جائیں گے۔ ہزاروں مزدور کام کریں گے اور ان کے لیے جو آلات درکار ہوں گے انہیں لوہاروں سے تیار کروانا پڑے گا۔ ہم نے لوہاروں اور مطلوبہ لوہے کی ضرورت کا حساب لگایا تو معلوم ہوا کہ ہمیں اس کام کے لیے دوسرے ملکوں سے بھی آدمی بلوانا ہوں گے اور لوہا بھی بیرونِ ملک سے منگوانا

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

پڑے گا۔'' یہ کہتے کہتے ابن الہیثم خاموش ہو گیا۔

خلیفہ الحاکم نے اس کی خاموشی کو ناگواری سے محسوس کیا اور حکم دیا۔ ''تو اپنی بات پوری کر، مجھے انتظار کی کوفت میں کیوں مبتلا کر رہا ہے۔''

ابن الہیثم نے جواب دیا۔ ''بے اندازہ اور بہت زیادہ اخراجات اور ہزاروں مزدوروں کا تیس سال تک لگاتار کام کرتے رہنا اس وقت تک تو میں خود بوڑھا ہو جاؤں گا اور اگر درمیان ہی میں چل بسا تو میرے اس کام کو پایۂ تکمیل تک کون پہنچائے گا اسی سوچ نے مجھے ہول میں مبتلا کر دیا اور کبھی کبھی میرے دل و دماغ میرے قابو میں نہیں رہتے۔''

خلیفہ الحاکم کو بھی ابن الہیثم کی ان باتوں سے بڑی تکلیف پہنچی لیکن وہ بھی غور کرتا رہا کہ اس کام پر اگر تیس یا پینتیس سال لگ گئے اور اسی دوران ابن الہیثم یا خود خلیفہ چل بسا تو یہ کام ادھورا رہ جائے گا اور اخراجات اتنے زیادہ آجائیں گے کہ خزانہ خالی ہو جائے گا۔

خلیفہ الحاکم نے پوچھا۔ ''تو اب یہ بتا کہ اس منصوبے پر کسی اور طرح عمل ممکن ہے، طویل مدت اور کثیر اخراجات کا کوئی حل نکالا جا سکتا ہے۔''

ابن الہیثم نے جواب دیا۔ ''اس کے لیے مجھے سوچنے کا وقت دیا جائے شاید کوئی حل نکل آئے۔''

خلیفہ الحاکم نے اس کو رخصت تو کر دیا مگر حکم دیا کہ اب وہ جامعہ الازہر سے ملحقہ مکان میں نہیں رہے گا اور اسے خلیفہ کی طرف سے ایک دوسرا مکان دے دیا گیا جو شاہی محل سے بہت قریب تھا۔

ابن الہیثم کو خلیفہ الحاکم کے آدمیوں نے اس نئے مکان میں پہنچا دیا اور کہا۔ ''جب تک ہمیں خلیفہ کی طرف سے کوئی نیا حکم نہیں ملے گا آپ اس مکان میں قیدی کی حیثیت سے رہیں گے اور آپ کا یہ مکان ہم لوگوں کی نگرانی میں رہے گا۔''

کئی دن بعد خلیفہ الحاکم نے اس کو دوبارہ قصر خلافت میں طلب کر لیا اور اسے بتایا گیا کہ فی الحال وہ دیوان کے منصب پر فائز رہے گا۔

ابن الہیثم اب خلیفہ کی کوئی ذمہ داری بھی قبول کرنے کو تیار نہیں تھا مگر وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس کی بڑی ناکامی کے بعد وہ کفرانِ نعمت کا الزام اپنے سر نہیں لینا چاہتا تھا مگر دیوان کا منصب قبول نہ کرنے کی صورت میں خلیفہ کا اس پر عتاب نازل ہو سکتا تھا اس لیے بدرجہ مجبوری اس نے یہ منصب قبول کر لیا اور وہ دیوان کے فرائض انجام دینے لگا۔

دیوان بن جانے کے باوجود اس کی نگرانی جاری تھی۔

اسی دوران جناولی کا بدرالدین اس سے ملاقات کرنے آیا لیکن اسے یہ دیکھ کر تکلیف پہنچی کہ ابن الہیثم دیوان ہونے کے باوجود قیدیوں کی طرح رہتا ہے۔

جناولی بدرالدین نے ان واقعات کی تفصیل معلوم کی کہ ابن الہیثم نے خلیفہ کو کس طرح مطمئن کیا۔ ابن الہیثم زیادہ باتیں کرنے سے گھبراتا تھا وہ یہ جانتا تھا کہ اپنی جو بات زبان سے نکل گئی وہ اپنی نہیں رہتی۔ چنانچہ ابن الہیثم نے کہا۔ ''میں نے خلیفہ کو پیش آنے والی ساری دشواریوں سے آگاہ کر دیا اور غالباً میری یہ بات خلیفہ کی سمجھ میں آگئی کہ اس پر اتنے زیادہ اخراجات آئیں گے کہ اس سے خزانہ بری طرح متاثر ہوگا اور یہ کہ اس کام میں تیس پینتیس سال لگ جائیں گے اور اتنا عرصہ تو شاید میں بھی زندہ نہ رہوں اور میرے مرنے کے بعد کام ادھورا رہ جائے۔''

جناولی بدرالدین نے یہ ساری روداد بڑی توجہ سے سنی اور پوچھا۔ ''خلیفہ کو تیری باتوں پر غصہ نہیں آیا میں نے تو یہ سنا ہے کہ خلیفہ اس قسم کی معذرت سننے کا قائل ہی نہیں ہے وہ بس یہی چاہتا ہے کہ اس نے جس کام کا حکم دیا ہے اسے پایۂ تکمیل تک پہنچنا چاہیے۔''

ابن الہیثم نے جواب دیا۔ ''لیکن خلیفہ میرے ساتھ ہمدردی اور محبت سے پیش آیا اور مجھے دیوان مقرر کر دیا۔''

جناولی بدرالدین نے کہا۔ ''ہاں! یہ اس کا... غیر معمولی حسن سلوک ہے ورنہ میں نے تو آج تک اس کے بارے میں یہی سنا ہے کہ وہ بہت متلون المزاج واقع ہوا ہے جس پر اس کی نوازشیں ہوتی ہیں انہی کو وہ ان کی کسی معمولی سی غلطی کے جرم میں قتل کروا دیتا ہے۔ تجھے نہیں معلوم کہ استاد برجوان نے خلیفہ کا کتنا ساتھ دیا تھا اسے تخت امامت پر بٹھا کر لوگوں سے بیعت لی اور پھر خلیفہ نے اس کی تمام کارگزاریوں کو نظر انداز کر دیا اور قتل کروا دیا۔ کئی دوسرے وزیر یکے بعد دیگرے قتل کیے گئے۔ آج اگر خلیفہ تجھ پر مہربان ہے تو کل تیری کسی معمولی سی غلطی پر تجھے قتل کروا دے گا اس لیے تیری سلامتی اسی میں ہے کہ تو خلیفہ کی خدمت سے باز آجا اور مصر چھوڑ کر چلا جا۔''

بدرالدین یہ نصیحت کر کے چلا گیا مگر ابن الہیثم کو

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

ڈانواں ڈول کر گیا۔ دوسروں نے بھی دبے لفظوں میں خلیفہ الحاکم کے بارے میں اسی قسم کی باتیں کی تھیں۔

اب ابن الہیثم کے پاس خلیفہ سے دو ٹوک بات کرنے کی ہمت نہیں تھی کہ وہ کہتا کہ میں دیوان کے فرائض انجام دینے کے لائق نہیں ہوں۔ اس کے علاوہ اگر وہ قاہرہ اور مصر چھوڑنا چاہتا ہے تو مکان کو گھیرے میں لیے ہوئے لوگ اسے ہلنے بھی نہ دیتے آخر کار اسے دیوانگی کا نسخہ یاد آیا اور اس نے جنونی حرکات شروع کر دیں۔ وہ گھر سے نکل کے پہرے داروں پر حملہ آور ہو جاتا اور پھر چھپ کے اندر بیٹھ جاتا۔ جب اس کے ہاتھوں پٹنے والے پہرے دار اس سے یہ پوچھتے کہ اس نے ایسی حرکت کیوں کی تو وہ رو رو کر ان سے معافی مانگتا مگر کچھ ہی دیر بعد ان سب کو دھکے دے کر نکالنے کی کوشش کرتا۔

کھانے پینے میں بھی وہ کوئی دلچسپی نہیں لے رہا تھا۔ کبھی تو وہ کھانا کھا لیتا اور کبھی اپنا کھانا پہرے داروں کو کھلا دیتا۔

اس نے اپنے مکان کے صحن میں پھاوڑا چلانا شروع کر دیا۔ کبھی کبھی کدال سے بھی کام لیتا اور جب اس کے پہرے دار اس سے پوچھتے کہ وہ یہ کیا کر رہا ہے تو ان سب کو فخریہ بتاتا کہ ''میں دریائے نیل کو بہت جلد اپنے قابو میں لے آؤں گا۔''

یہ باتیں خلیفہ کے علم میں لائی گئیں اور خلیفہ نے یہ بھی دیکھا کہ وہ ان دنوں قصر خلافت میں بھی حاضری نہیں دے رہا تو اسے طبیبوں کے حوالے کر دیا گیا اور اس کا علاج کروایا گیا معالجین نے خلیفہ الحاکم کو بتایا کہ ابن الہیثم اپنی ناکامی کی اذیت برداشت نہیں کر سکا جس سے اس کے دل و دماغ بہت متاثر ہوئے اور کچھ پتا نہیں کہ یہ شخص کبھی صحت یاب ہو گا بھی یا نہیں۔

خلیفہ الحاکم کو یہ ساری خبریں بہت ناگوار گزر رہی تھیں لیکن وہ اس پاگل کو کوئی سزا بھی نہیں دے سکتا تھا۔ وہ اور کچھ تو نہیں کر سکا مگر ابن الہیثم پر سخت پہرہ بٹھا دیا کہ اسے کہیں جانے نہ دیا جائے اور ابن الہیثم کے سامان اور مال و زر کو ضبط کر لیا۔

اب ابن الہیثم کی حالت بہت زیادہ بگڑ چکی تھی اور پہرے داروں کو بھی اس سے ہمدردی ہو گئی تھی۔

دربار خلافت کے کسی بھی شخص میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ ابن الہیثم کی سفارش کرتا۔

خلیفہ الحاکم کی بڑی بہن ست الملک کو ابن الہیثم پر رحم آیا اور اس نے موقع محل دیکھ کر ابن الہیثم کی سفارش کا فیصلہ کیا۔

محل کے جو لوگ ست الملک کو سمجھا سکتے تھے انہوں نے سمجھایا کہ ابن الہیثم کی سفارش نہ کی جائے کیونکہ خلیفہ الحاکم اپنے فیصلوں میں کسی کی مداخلت کو پسند نہیں کرتا اگر اس نے ست الملک کی سفارش پر غم و غصے کا اظہار کیا تو ابن الہیثم کو فوراً قتل کروا دیا جائے گا تاکہ ست الملک اس کی سفارش نہ کرے۔

لیکن ست الملک باز نہیں آئی اور کہا۔ ''میں ابن الہیثم کی سفارش ضرور کروں گی۔''

الحاکم کا یہ قاعدہ تھا کہ وہ ہفتے میں دو ایک بار اپنے قصبے سے نکل کر قاہرہ کی طرف جایا کرتا تھا اور شہر کے باہر جبل مقطم کی طرف تنہا گھوما پھرا کرتا تھا۔

اس کی بڑی بہن ست الملک اپنے بھائی کی دیوانگی سے عاجز آ گئی تھی اور چاہتی تھی کہ وہ سمجھا بجھا کے اپنے بھائی کو راہ راست پر لے آئے۔

ست الملک نے جب سے یہ سنا تھا کہ ابن الہیثم جنون کے مرض میں مبتلا ہے اور بظاہر اس کے بھائی خلیفہ الحاکم نے طبیبوں کی ایک جماعت اس کے علاج پر مامور کر رکھی ہے ان کے علاوہ ابن الہیثم کو اس کے بھائی کی طرف سے بہت سے خدمت گار بھی ملے ہوئے ہیں مگر وہ یہ بھی جانتی تھی کہ یہ سب ابن الہیثم کی نگرانی پر مامور ہیں اس لیے اگر ابن الہیثم سالوں زیر علاج رہنے کے بعد صحت یاب نہ ہوا تو اس کا بھائی الحاکم ابن الہیثم کو قتل کروا دے گا۔

ست الملک نے ابن الہیثم کی لیاقت اور قابلیت کا جو شہرہ سن رکھا تھا وہ اس سے ابن الہیثم پر مہربان ہو گئی تھی۔

وہ بھائی کو بتائے بغیر رات کے پچھلے پہر ابن الہیثم سے ملاقات کرنے پہنچ گئی۔ اس وقت الحاکم اپنے گدھے پر سوار ہو کر دو خدمت گاروں کے ساتھ جبل مقطم گیا ہوا تھا۔

ابن الہیثم کی نگرانی کرنے والے ست الملک کے اثر و اقتدار سے خوب واقف تھے وہ جانتے تھے کہ اس کی مخالفت یا دشمنی کا مول لینا خطرناک ہے۔ چنانچہ ان پہرے داروں نے ست الملک کو ابن الہیثم کے پاس پہنچا دیا اور ایک پہرے دار نے بستر پر دراز ابن الہیثم کو بتایا۔ ''خلیفہ وقت اور امام الحاکم کی بڑی بہن تجھ سے ملنے آئی ہیں۔ اس لیے اب تو اپنے ہوش و حواس میں آ جا یہ محترم بہن تجھے

مصیبتوں سے نجات دلواسکتی ہے۔"

ابن الہیثم بستر پر دراز رہا ایسا لگا جیسے وہ پہرے دار کی بات سمجھ ہی نہیں سکا۔

ست الملک اس کے قریب جا کھڑی ہوئی اس وقت ابن الہیثم کے کمرے میں دو معمولی روشنیوں والی قندیلیں روشن تھیں۔

ابن الہیثم نے ادھ کھلی آنکھوں سے ست الملک کو دیکھا تو اٹھ کر بیٹھ گیا بے اختیار جنونی کیفیت میں پوچھا۔ "اے عورت میں تو تجھے جانتا بھی نہیں کہ تو مجھ پر کب عاشق ہوگئی۔"

ست الملک نے جواب دیا۔ "آہستہ آہستہ باتیں کر میں نہیں چاہتی کہ ہم دونوں کی باتیں دربان سنیں۔"

ابن الہیثم نے کوئی جواب تو نہیں دیا بس ست الملک کو دیکھتا رہا۔

ست الملک نے پوچھا۔ "اے ابن الہیثم! مجھے تو سچ سچ بتا دے کہ تو بنا ہوا جنونی کیفیت میں مبتلا نظر آرہا ہے یا واقعی تیرا دماغی توازن جاتا رہا۔"

ابن الہیثم نے کہا۔ "میں نے خلیفہ الحاکم کو بتا دیا ہے کہ اس کے منصوبے پر بہت خرچا آئے گا اور پینتیس سال تک کام ہوتا رہے گا اور اسی دوران میں مرجاؤں گا میں ختم کام ختم۔"

ست الملک نے کہا۔ "مجھے اپنا جیسا دیوانہ نہ سمجھو، میں تیرے ماضی سے بھی واقف ہوں تو بصرے میں بھی اسی بیماری میں مبتلا ہوا تھا جس سے تجھ کو ملازمت سے سبکدوش کردیا گیا اور تو مصر چلا آیا۔"

ابن الہیثم، ست الملک کی باتوں سے واقعی پریشان ہوگیا کہ یہ عورت اس کے بارے میں زبردست معلومات رکھتی ہے۔

ابن الہیثم نے کہا۔ "اے ست الملک اگر تو واقعی میرا بھلا چاہتی ہے تو مجھے کسی طرح مصر سے نکلوادے۔"

ست الملک نے جواب دیا۔ "پہلے تو میں تیری سفارش کروں گی کہ تجھ پر سے یہ پہرہ اٹھالیا جائے اس کے بعد تجھے اس مکان سے جامعہ الازہر سے ملحق مکان میں منتقل کردیا جائے گا اور تیرا مال و زرسامان جو ضبط کرلیا گیا ہے تجھے واپس دلایا جائے گا۔"

ابن الہیثم اس عورت سے اور کیا باتیں کرتا جو کچھ یہ عورت اس کو دلوا رہی تھی اس کے لیے وہی کافی تھا۔

ست الملک اسے تسلی دلا سے دے کر واپس چلی گئی۔

صبح کی اذان کی صدائیں مسجدوں سے بلند ہوئیں اسی وقت خلیفہ الحاکم اپنے قصر میں داخل ہوا۔

فجر کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد اس نے اپنی بہن ست الملک کو طلب کرلیا اور پوچھا۔ "تو ابن الہیثم کے پاس کیوں گئی تھی۔"

ست الملک حیران تھی کہ یہ خبر اتنی جلدی اس کے بھائی کو کس طرح معلوم ہوگئی۔

ست الملک نے کہا۔ "میں نے ابن الہیثم کی بڑی تعریفیں سُنی ہیں۔ بس اس دیوانے کو دیکھنے کے لیے چلی گئی وہ واقعی قابل رحم ہے اور اس پر مزید سختیاں نہ کی جائیں تو بہتر ہے۔"

خلیفہ الحاکم نے پوچھا۔ "بس یا تجھے ابن الہیثم کے معاملے میں کچھ اور بھی کہنا ہے۔"

ست الملک نے جواب دیا۔ "اس دیوانے پر کوئی پہرہ نہ بٹھایا جائے اور اس کو اس کے مکان جامعہ الازہر سے ملحقہ میں بھیج دیا جائے جو کچھ آپ نے ضبط کر رکھا ہے وہ بھی اسے واپس دے دیا جائے۔"

خلیفہ الحاکم نے کہا۔ "یہ تجھے کیا ہوگیا ہے کہ تو حکومتی معاملات میں دخل دے رہی ہے کیا تو چاہتی ہے کہ میں ابن الہیثم کو قتل کروادوں۔"

ست الملک نے جواب دیا۔ "نہیں بھائی! آپ ایسا نہیں کریں گے۔ اب تک آپ نے جو کچھ کیا ہے اس سے یہاں کے حالات خراب ہوتے جارہے ہیں۔ مجھے تو یہ ڈر ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ گھرانا تمہاری وجہ سے برباد ہو جائے۔"

خلیفہ الحاکم ایک دم مشتعل ہوگیا۔ "بدکار عورت تو نے ابن الہیثم سے ناجائز تعلقات کب سے قائم کر رکھے ہیں تیری بدکاریوں کی داستانیں عام ہوتی جارہی ہیں اور میں تیرے جملہ عاشقوں کے ساتھ تجھ کو بھی قتل کروادوں گا۔"

ست الملک بھی غصے میں آگئی اور کہا۔ "بھائی! مجھ پر بے جا ناشائستہ اور شرمناک تہمتیں مت لگاؤ۔ میں ایک باکباز عورت ہوں اگر تم مجھے قتل کردو گے اور میرے ساتھ کچھ دوسرے بے گناہ بھی مارے گئے تو تم خدا کے سامنے جواب دہ ہوگے۔"

خلیفہ الحاکم نے حقارت سے پوچھا۔ "مجھ سے کیوں خدا بازپرس ہوگا۔"

ست الملک نے سوچا کہ اس پاگل سے بحث فضول ہے اس لیے وہ سامنے سے ہٹ گئی اور دیر تک غور کرتی رہی کہ اگر خلیفہ الحاکم کا کوئی علاج نہ کیا گیا تو یہ شخص فاطمی خلافت کو ختم کردے گا۔

ابن الہیثم کئی دن تک اس انتظار میں رہا کہ ست الملک نے اس کی سفارش کردی ہوگی اور اس پر سے پہرہ اٹھالیا جائے گا اور وہ جامعہ الازہر سے ملحقہ مکان میں منتقل ہوجائے گا اور اس کا ضبط کیا ہوا اثاثہ اسے واپس مل جائے گا لیکن یہ انتظار، انتظار ہی رہا اس پر پہلے سے زیادہ سخت پہرے داری کردی گئی اور ابن الہیثم کو بھی پاگل پنے کی اداکاری میں شدت سے کام لینا پڑا۔

جو لوگ ابن الہیثم سے ملنا چاہتے تھے وہ بھی احتیاط سے کام لینے لگے کیونکہ یہ بات تو مشہور ہو چکی تھی کہ ابن الہیثم خلیفہ کے زیر عتاب ہے۔

وہ اپنے کسی پہرے دار سے یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ ست الملک دوبارہ کیوں نہیں آئی؟ لیکن وہ ہوش و حواس میں آکر کسی پہرے دار سے کوئی بات بھی نہیں کرسکتا تھا۔

اسی دوران ست الملک کی ایک خاص کنیز ابن الہیثم سے ملنے کے لیے پہنچی اور آہستہ سے کہا۔ ''اے ابن الہیثم! مجھے تیرے پاس خلیفہ الحاکم کی بڑی بہن ست الملک نے بھیجا ہے اس لیے کچھ دیر کے لیے تو ہوش و حواس میں آجا تاکہ میں ست الملک کی باتیں تجھے پہنچادوں اور تیری باتیں ست الملک کے گوش گزار کردوں۔''

ابن الہیثم اس کنیز پر بھروسا نہیں کررہا تھا کیونکہ اسے اب بھی یہی شبہ تھا کہ خلیفہ الحاکم بھی کوئی کنیز ست الملک کا نام لے کر بھیج سکتا ہے۔

ابن الہیثم نے دونوں آنکھیں بند کرلیں اور کہا۔ ''او ناہنجار عورت تو کتنی بار میرا امتحان لے گی جب تک میں اپنا کام مکمل نہیں کرلوں گا میں کسی عورت سے شادی بھی نہیں کروں گا۔''

کنیز نے کہا۔ ''تیری دماغی اور جنونی کیفیت کا مجھے علم ہے تو نے تو مکان کے صحن میں کھدائی کرکے دریائے نیل سے فائدے اٹھانے کی کوشش کی ہے تو نے تو ست الملک سے عام انسانوں جیسی باتیں کی تھیں اب میں ست الملک کی نمائندگی کررہی ہوں تو مجھے بھگادینے کی فکر میں ہے۔''

ابن الہیثم نے اچانک ہوش و حواس میں آتے ہوئے پوچھا۔ ''اس عورت نے تو مجھ سے بڑے وعدے کیے تھے کہ وہ مجھے ان پہرے داروں سے نجات دلوادے گی اور مجھے میرے جامعہ الازہر سے ملحق مکان میں پہنچادیا جائے گا مگر میں نے تو اس عورت کے وعدے کے بعد اپنا وقت بہت زیادہ پریشانیوں میں گزارا ہے اب تو بتا مجھ سے کیا کہنا چاہتی ہے؟''

کنیز نے جواب دیا۔ ''ست الملک نے تیری سفارش کردی مگر خلیفہ نے انہیں مسترد کردیا اور اس نے تم دونوں کو قتل کروادینے کی دھمکی بھی دے رکھی ہے۔''

ابن الہیثم نے کہا۔ ''تو گویا میں بھی اب چند دنوں کا مہمان ہوں اور وہ مجھے بھی قتل کروادے گا۔''

کنیز نے بتایا۔ ''جناب! مجھے تو سب کچھ بتاتے ہوئے شرم آرہی ہے جب ست الملک نے تیری سفارش کی تو خلیفہ الحاکم آپے سے باہر ہوگیا اور اس سے پوچھا کہ تیرے ابن الہیثم سے ناجائز تعلقات کب سے ہیں۔ اس کے علاوہ اس نے یہ بھی کہا کہ اے ست الملک تو بدکار عورت ہے اور میں تجھ کو تیرے عاشقوں کے ساتھ قتل کروادوں گا۔''

ابن الہیثم نے کنیز کی ان باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا مگر خلیفہ الحاکم کے حق میں دعا ضرور کی کہ اللہ اسے سیدھی راہ پر لائے اور اس کے ذہنی توازن کو درست کردے۔''

کنیز نے پوچھا۔ ''اس سے میری طرف سے کہہ دے کہ اس نے جو وعدے مجھ سے کیے ہیں وہ کسی نہ کسی طرح پورے ہونا چاہئیں۔''

کنیز واپس چلی گئی اور دوسرے دن خلیفہ الحاکم نے ابن الہیثم کو طلب کرلیا اور اس نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے کہ لوگ تجھ سے ملاقاتیں کرتے ہیں جب کہ تو اپنے ہوش و حواس میں نہیں ہے۔''

ابن الہیثم نے پہلے تو اپنے ماحول کا جائزہ لیا اور پھر درباریوں سے پوچھا۔ ''تم سب کو تو جنادل کے اسوان میں ہونا چاہیے تھا بتاؤ وہاں کتنا کام ہوچکا ہے اور کتنا باقی ہے مجھے خلیفہ کو جواب دینا ہے۔''

الحاکم ابن الہیثم کی باتیں غور سے سنتا رہا پھر پوچھا۔ ''تجھ سے تو عورتیں بھی ملاقاتیں کرتی ہیں کیا تو ان سے بھی اسی طرح کی باتیں کرتا ہے۔''

ابن الہیثم نے جواب دیا۔ ''میں نے جنادل میں مزدوروں کی کمی اس طرح دور کردی کہ ہزاروں عورتوں کو کھدائی کے کام پر لگادیا اے خلیفہ اس طرح وہ کام جلدی ہو

جائے گا۔"

الحاکم نے اپنے مشیروں سے پوچھا۔ "یہ شخص جس قسم کی باتیں کررہا ہے اس سے میں کیا سمجھوں؟"

ایک مشیر نے جواب دیا۔ "سیدنا! اس شخص کا دماغی توازن بالکل ختم ہو چکا ہے اور یہ ہر وقت ہر کسی سے اسی قسم کی باتیں کرتا رہتا ہے جس سے یہی رائے قائم کی جاسکتی ہے کہ اس شخص نے جس بہت بڑے منصوبے پر کام کرنا چاہا تھا اس کی ناکامی نے اسے کسی کام کا نہیں رکھا۔"

الحاکم نے پوچھا۔ "کیا اس پر جو پہرہ بٹھایا گیا ہے اس میں کوئی خامی تو نہیں ہے آخر عورتیں اس کے پاس کیوں جاتی ہیں۔"

مشیر نے جواب دیا۔ "سیدنا! یہ شخص بہت زیادہ شہرت کا حامل ہے اس نے یونانی علوم کا عالمانہ مطالعہ کیا ہے اور یونانی فلسفے کی مشہور کتاب المجسطی کی شرح بھی لکھی ہے اسی لیے لوگ اسے قریب سے دیکھنے کے خواہش مند رہتے ہیں۔"

الحاکم نے کہا۔ "مجھے تو یہ شخص مکار لگتا ہے۔"

مشیر نے جواب دیا۔ "ہم اسے مکار اس لیے نہیں کہیں گے کہ یہ اپنے وطن بصرے میں بھی اسی عارضے میں مبتلا رہ چکا ہے اور وہاں بھی اسے اس لیے ملازمت سے سبکدوش کردیا گیا تھا کہ اس کا کبھی کبھی دماغی توازن رخصت ہو جاتا ہے اور اسی مرض نے اسے ملازمت سے سبکدوش کروادیا تھا۔"

کسی مشیر نے کہا۔ "اسے تو اس کے جامعہ الازہر سے ملحق مکان میں منتقل کردیا جائے تو مناسب ہوگا۔"

الحاکم نے ایک بار پھر ابن الہیثم کو مخاطب کیا۔ "تو نے ہماری باتیں سنیں کیا تجھ کو تیرے جامعہ الازہر سے ملحق مکان میں پہنچادیا جائے۔"

ابن الہیثم نے کوئی جواب نہیں دیا اور درباریوں کو وحشت زدہ نظروں سے دیکھتا رہا پھر اچانک پہلو کی جیب سے کچھ نکالا اور منہ میں ڈال کر چبانے لگا۔

خلیفہ الحاکم نے حکم دیا۔ "پتا لگاؤ کہ یہ کیا چبا رہا ہے؟"

کئی درباریوں نے ابن الہیثم کو پچھاڑ دیا اور زبردستی اس کا منہ کھول کر چھان بین شروع کردی لیکن منہ میں کچھ بھی نہیں تھا۔

خلیفہ نے تنگ آکر حکم دیا۔ "اسے اس کے ٹھکانے پر پہنچادیا جائے اور پہرے داروں کو حکم دیا جائے کہ اس سے کسی کو بھی نہ ملنے دیا جائے۔"

اس حکم کے بعد ابن الہیثم کے پہرے پر سختی کردی گئی لیکن کسی نے ابن الہیثم کو یہ پیغام پہنچادیا کہ ابن الہیثم کو بس چند دن مزید زحمتیں اٹھانا ہوں گی اس کے بعد اسے جامعہ الازہر سے ملحق مکان میں رہنے کی اجازت دے دی جائے گی اور اس کے جو اثاثے اور نقدی ضبط کرلی گئی ہیں وہ سب اسے واپس مل جائے گی۔"

ست الملک محسوس کررہی تھی کہ اس کا بھائی خلیفہ الحاکم اسے کسی وقت بھی بدکاری کا الزام لگا کے قتل کروادے گا۔

حسب معمول خلیفہ الحاکم جبل مقطم جانے کے لیے قصر شاہی سے نکلا۔ یہ رات کا پچھلا پہر تھا۔ ستائیس شوال دو شنبے کی رات تھی۔ دو خادم اس کے ساتھ تھے پہلے تو وہ قاہرہ کے بازاروں کی سیر کرتا رہا اس کے بعد جبل مقطم کی طرف روانہ ہوگیا ایک قبر کے قریب وہ رکا صبح ہونے والی تھی اس نے مڑ کے اپنے دونوں خدمت گاروں کو دیکھا۔

خدمت گار یہ سمجھے کہ خلیفہ الحاکم ان سے کوئی کام لینا چاہتا ہے مگر خلیفہ الحاکم نے دونوں خدمت گاروں کو واپس چلے جانے کا حکم دیا اور خود حلوان نامی مشرقی حصے کی جانب روانہ ہوگیا۔

محل میں اس کی واپسی کا انتظار ہوتا رہا اور جب وہ صبح ہونے کے بعد بھی قصر میں واپس نہیں پہنچا تو ست الملک نے اس کی تلاش شروع کروادی لوگ اسے دن بھر تلاش کرتے رہے مگر اس کا کہیں کوئی پتا نہ تھا لوگوں نے حلوان اور جبل مقطم کے کتنے ہی چکر لگا ڈالے مگر خلیفہ الحاکم کا پتا نہیں چل سکا۔

اب قصر خلافت میں خلیفہ کے خاندان والوں کو بہت پریشانیوں کا سامنا تھا۔

دوسرے دن شام کو خلیفہ الحاکم کا گدھا ایک گڑھے میں مردہ پایا گیا اور دو راہگیروں نے تلاش کرنے والوں کو اس مردہ گدھے کے بارے میں بتایا کہ انہوں نے اس گدھے کے پچھلے دونوں پاؤں کٹے ہوئے دیکھے تو انہیں بڑی حیرت ہوئی کہ گدھے کے قریب ہی اس کی زین اور لگام بھی موجود تھی۔

اب کھوجیوں سے مدد لی گئی اور شاہی تلاش کرنے والے کھوجیوں کی مدد سے ایک غار تک پہنچے یہ غار حلوان

کے جنوبی حصے میں تھا۔
ایک کھوجی غار میں داخل ہو گیا اور کچھ دیر بعد وہ ایک قمیص لے کر واپس آیا قمیص میں چار بٹن لگے ہوئے تھے اور یہ قمیص پہچان لی گئی کہ یہ الحاکم کی قمیص ہے۔
بٹنوں کے قریب خنجر کے نشانات تھے۔
اب اس میں کوئی شبہ باقی نہیں رہا کہ الحاکم کو قتل کر کے اس کی لاش غائب کر دی گئی ہے۔
اس کے باوجود دو شنبے تک خلیفہ الحاکم کی تلاش ہوتی رہی مگر الحاکم کے بیٹے الظاہر کو خلیفہ بنا دیا گیا اور اس نئے خلیفہ نے ست الملک کے کہنے سے ابن الہیثم کی پہرے داری ختم کر دی گئی اور اسے ضبط کیا ہوا اثاثہ اور نقدی بھی مل گئی اسے جامعہ الازہر سے ملحق مکان میں رہنے کی اجازت بھی دے دی گئی۔
اب ابن الہیثم صحیح الدماغ ہو چکا تھا اس کا ذریعۂ معاش تین کتابوں کی نقول کی فروخت پر منحصر تھا۔ اقلیدس، متوسطات اور المجسطی یہ تینوں کتابیں ڈیڑھ سو دینار میں بک جاتی تھیں اور سال بھر اس کی گزر اوقات ہو جاتی تھی اس کی اپنی کتابوں کی تعداد اٹھائیس بتائی گئی ہے۔
اس نے علم طب بھی حاصل کیا تھا مگر اس نے اسے عملاً اختیار نہیں کیا۔ المجسطی یونان کے بطلی خوس کی تصنیف ہے یہ ستاروں کا مشاہدہ کیا کرتا تھا اور اسی نے کتاب المجسطی تصنیف کی۔ کہا جاتا ہے کہ اس شخص نے اسطرلاب کردی۔ حالات نجوم، مقیاس، معائنے اور رسد کی بنیاد ڈالی المجسطی میں تیرہ مقالات تھے اور ابن الہیثم اس کتاب سے بہت متاثر تھا۔
اس کی دوسری کتابوں سے مذہبی لوگ خوش نہیں تھے اسی لیے بغداد میں اس کی کتابیں نذر آتش کر دی گئی تھیں۔
ابن الہیثم جس کے طفیل صحیح الدماغ ہوا اور آزادی سے کام کرنے کے مواقع میسر آئے اس کا اس نے احتیاطاً کہیں ذکر نہیں کیا لیکن الحاکم کے واقعہ گمشدگی کے چار سال بعد قبیلۂ بنی حسین کا ایک شخص ظاہر ہوا اس نے یہ اقرار کیا کہ اسی نے الحاکم کو قتل کر دیا تھا اور اس نے واقعۂ قتل کی تفصیل بتائی۔ "میرے ساتھ چار آدمی تھے جو مختلف شہروں میں اسی ارادے سے منتشر ہو گئے تھے۔"
اس سے پوچھا گیا کہ تو نے الحاکم کے قتل سے متعلق جو بیان دیا ہے اس کی کوئی شہادت بھی پیش کر سکتا ہے۔
قاتل نے لبنگی کا ایک ٹکڑا پیش کیا۔ یہ الحاکم کی لبنگی تھی۔"
اس سے پوچھا گیا۔ "تو نے الحاکم کو کیوں قتل کیا؟"
اس نے جواب دیا۔ "خدا اور اسلام کی غیرت کے لیے۔"
اس سے دوسرا اہم سوال کیا گیا۔ "تو نے الحاکم کو کس طرح قتل کیا۔"
قاتل نے خنجر نکالا اور اپنے سینے میں پیوست کر لیا اور کہا۔ "میں نے اس طرح اسے قتل کیا تھا۔"
قاتل کا سر کاٹ کے ان چیزوں کے ساتھ جو اس کے پاس سے برآمد ہوئی تھیں خلیفہ الظاہر کی خدمت میں پیش کر دی گئیں۔
ابن الہیثم کو بھی یہ ساری خبریں ملتی رہیں مگر اس نے ان میں کوئی دلچسپی نہیں لی لیکن جب الحاکم کی بہن ست الملک کا چار سال بعد ہی انتقال ہو گیا تو اسے صدمہ ہوا کیونکہ اسی عورت کی وجہ سے اسے سکون اور اطمینان حاصل ہوا تھا۔
ابن الہیثم کو لوگوں نے یاد نہیں رکھا مگر دس صدی بعد جب ابن الہیثم ہی کے منصوبے پر فرانس، انگلستان اور مصر نے نہر سوئز تیار کروائی تو ابن الہیثم کا نام ایک بار پھر زندہ ہو گیا۔
یہ شخص نو سو پینسٹھ (965ء اور بعض تاریخ دانوں نے 1040 بھی لکھا ہے) میں پیدا ہوا اور دس سو اڑتیس (1038ء) میں اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اسے قاہرہ کے قبرستان میں دفن کیا گیا۔
اس کی زندگی کے جو واقعات مشہور ہوئے ان میں اس کے جنون سے متعلق اداکاری کا ذکر ضرور کیا گیا اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اگر وہ جنونی کیفیت کی اداکاری نہ کرتا تو بصرے ہی میں سرکاری ملازمت کرتے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہو جاتا مگر اس کے جنون اور دیوانے پن نے عباسی خلیفہ سے نجات دلوائی اور جب وہ مصر پہنچا اور دریائے نیل سے متعلق اپنے منصوبے پر کام کرنا چاہا تو عملی مشکلات نے اس کے حوصلے کو پست کر دیا اور وہ مدتوں پاگل پنے کی زندگی بسر کرتا رہا مگر اس کے باوجود وہ شاندار 28 کتابیں بھی تصنیف کر گیا اور المجسطی کے کتنے ہی نسخے نقل کر کے آنے والی لائبریریوں کے لیے چھوڑ گیا۔
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS

عشقِ کامل

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

زویا اعجاز

عشق کی معراج حاصل کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں، یہ وہ آتش ہے جو فنا کر کے اوج دیتی ہے لیکن جب عشق حقیقی کا ذکر چھڑے تو اس مرتبے تک پہنچنے والی ایک شخصیت نظر آتی ہے جس کی تعریف حضور اکرمؐ نے بھی کی تھی۔

ایک جلیل القدر صحابہ کا ذکر جنہوں نے کبھی حضورؐ کی زیارت نہیں کی

وہ تین گھڑ سوار تھے۔

آگ برساتے سورج تلے اونچے نیچے صحرائی ٹیلوں کے درمیان کئی روز سے وہ اپنا سفر مستقل مزاجی سے جاری رکھے ہوئے تھے۔ رستے کی دشواری اور تھکاوٹ پس پشت ڈالے ان کے چہرے صرف جوش و عقیدت کا عکس نظر آ رہے تھے۔

ایک گھڑ سوار کے ہاتھ میں نارنجی مائل مخصوص تکونی پرچم تھا جسے اس نے بے انتہا عقیدت سے تھام رکھا تھا۔ تینے

URDUSOFTBOOKS.COM

ہوئے صحرا اور پانی کے تالاب گھوڑوں کے سموں تلے روندتے وہ برق رفتاری سے اپنی منزل کی جانب گامزن تھے۔

ان تینوں افراد کی مخصوص اور قیمتی عباؤں سے ان کی حیثیت کا تعین کرنا چنداں مشکل نہ تھا۔ سفیدی مائل ٹوپی کے نچلے کنارے بھورے تھے جس کے وسط میں ایک قیمتی جواہر اپنی جھلک دکھلا رہا تھا۔ منقش عبائیں' لمبے لہراتے بال اور آنکھوں میں اپنی حیثیت کے تعین کے اعتماد و غرور نے ان کی شخصیت کو خاصا بارعب بنا دیا تھا۔

کئی روز سے جاری یہ سفر اب اپنے اختتامی مراحل میں پہنچ گیا۔ گھوڑوں کی رفتار دھیمی کرنے کے بعد وہ صحرائی ٹیلوں کے درمیان سوچتی نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگے۔ ہر جانب ہو کا عالم طاری تھا۔ ٹیلوں سے ٹکراتی گرد آلود سرائی ہوا اور آسمان پر چیلوں کے شور کے سوا وہاں زندگی کی کوئی بھی علامت نہ تھی۔

وہ کچھ دیر یونہی ان ٹیلوں کے درمیان منڈلاتے رہے پھر سفید گھوڑے پر علم تھامے ہوئے شخص نے اپنے ساتھیوں کو ایک سمت اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یمن اس جانب ہے۔''

ساتھیوں نے خاموشی سے اثبات میں سر ہلایا اور اسی جانب بڑھ گئے۔

☆......☆

وہ نوعمر لڑکی سرپٹ بھاگ رہی تھی۔

اس بھاگ دوڑ میں اس کا سانس بری طرح پھول چکا تھا لیکن وہ ایک لمحہ کے لیے بھی رکنے کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کا تعاقب کرتا سگ بھی ڈھٹائی اور مستقل مزاجی میں اپنی مثال آپ تھا اور اسے محفوظ رستہ دینے کے لیے تیار ہی نہ تھا۔

اس نے بھاگتے ہوئے اپنے ہاتھ میں موجود ایک کپڑا لہرا کر اسے بھگانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہی۔

''کیوں میرے درپے ہو گئے ہو؟'' وہ چلائی۔

بے زبان سگ نے مخصوص آواز میں اپنے ارادے ظاہر کرتے ہوئے اس کا تعاقب جاری رکھا۔

''یا خدا!! کوئی تو میری مدد کرے!'' اس کے قدم لڑکھڑانے لگے۔

مختلف ٹیلے عبور کرتی اب وہ ایسے مقام پر پہنچ گئی تھی جہاں ایک چھتر نما سائبان موجود تھا۔ اردگرد چند اونٹ اور بھیڑ بکریاں چر رہی تھیں۔ اپنا بے ربط تنفس درست کرتی وہ ایک پتھر کی اوٹ میں کھڑی ہو گئی۔ اسی پل اسے دائیں جانب ایک ذی نفس کی موجودگی کا احساس ہوا۔

میانہ قد' گندمی رنگت اور قدرے لاغر اندام وہ شخص اپنے قرب و جوار سے بے نیاز عبادت میں مگن تھا۔ سورج اس کی پشت پر قدرے بلند تھا لیکن اسے جھکڑ آلود ہواؤں کی پرواہ تھی نہ ہی اس تپش کی۔ اس کی داڑھی گھنی اور بال لمبے تھے۔ سیاہ نیلگوں آنکھوں میں کسی اندرونی کرب اور دکھ ہلکورے لیتا واضح دکھائی دیتا تھا۔

اس کی ٹھوڑی روشن پیشانی کی جانب اُٹھی تھی۔ دونوں کندھوں کے درمیان فاصلہ قدرے زیادہ تھا تاہم اس کی شخصیت میں بدنمائی کا رتی بھر بھی تاثر نہ تھا۔ چہرہ پر افسردگی پریشانی اور وارفتگی موجزن تھی۔

بائیں جانب سلام پھیرنے کے بعد اس نے اس خونخوار سگ کی آنکھوں میں چند ثانیوں کے لیے خاموشی سے جھانکا اور ایک بار پھر عبادت میں مگن ہو گیا۔ سگ اپنا سابقہ مشغلہ اور خونخواری یکسر فراموش کرکے واپس پلٹ گیا۔

وہ لڑکی حیرانی سے اسے دیکھنے لگی۔ عبادت میں ایسا ارتکاز اور لگن اس نے آج سے قبل کہیں دیکھی' نہ سنی تھی۔ چند لمحوں بعد وہ گہری سانس لیے اٹھا اور سائبان میں دھرے چند برتنوں میں سے ایک پیالہ تھام کر اپنی بکری کا دودھ دوہنے لگا۔

''سلام...... میرا نام سلمٰی ہے۔'' لڑکی نے اسے اپنی جانب متوجہ کیا۔

''وعلیکم السلام۔'' اس نے سر اٹھائے بغیر مختصراً جواب دیا۔

''میں تمہاری کیا مدد کر سکتی ہوں؟ اگر میرے لائق کوئی خدمت ہو تو ضرور بتاؤ۔'' لڑکی نے کہا لیکن جواب ندارد۔

''اگر تم راضی ہو جاؤ تو میں تمہارے ان مویشیوں کی دیکھ بھال کر دیا کروں گی۔ ان کی رکھوالی کے علاوہ مجھے دودھ دوہنے اور بازار جا کر اسے فروخت کرنے میں بھی کوئی اعتراض نہیں۔''

اس کی پیشکش کے جواب میں وہ ہنوز بے نیازی سے اپنے مویشیوں میں مگن رہا۔ سلمٰی کو شدید اہانت محسوس ہوئی۔

''میری بات کا جواب کیوں نہیں دے رہے ہو؟'' وہ جزبز ہوئی۔ اس نے غور سے اجنبی کے ہاتھوں میں پکڑے پیالے کو دیکھا۔ دودھ کا پیالہ اب کافی بھر گیا تھا۔ ''تمہیں عورتوں سے برتاؤ کے طور طریقے نہیں آتے۔ قوت گویائی سے محروم ہو؟'' اس نے پے در پے چوکے لگائے۔

''میں نے تمہیں اس سگ سے اس لیے نجات نہیں

دلوائی کہ میں خود اپنے نفس کا شکار ہو جاؤں..... انسانی نفس کسی بھی خونخوار سگ سے ہزار گنا خطرناک ہے۔" وہ متوازن چال چلتا ہوا اس کے قریب آیا اور دودھ کا پیالہ تھماتے ہوئے پُرسکون انداز میں گویا ہوا۔

"بھلے آدمی!! تم نے میری جان بچائی ہے، اسی کے بدلے میں تمہاری مدد کرنا چاہتی ہوں میں۔" وہ چہک رہی تھی۔

"اگر تم واقعی میری مدد کرنا چاہتی ہو تو یہاں سے روانہ ہو جاؤ۔" اس نے رکھائی سے کہا۔

"کیا؟ میں یہاں سے روانہ ہو جاؤں؟ انتہائی بد تہذیب شخص ہو تم!" اس کی نسوانیت یہ رکھائی برداشت نہ کر پائی۔

مقابل ایک بار پھر بے نیازی کے خول میں سمٹ کر اپنی عبادت میں مگن ہو گیا۔ وہ بحرِ حیرت میں گھری دودھ پینے لگی۔ اسی پل قرب و جوار گھوڑوں کی ٹاپوں سے گونج اٹھا۔ تسلمٰی سراسیمہ ہو گئی۔ اس علاقہ میں لٹیرے اور چوروں کی بہت دہشت تھی۔

وہ پیالہ وہیں رکھ کر بھاگتی ہوئی ایک ٹیلے کی اوٹ میں چلی گئی۔

علم بردار تینوں گھڑ سوار سائبان کے قریب آ کر رک گئے اور گہری نظروں سے عبادت میں مشغول شخص اور اس کے مویشیوں کا جائزہ لینے لگے۔

"کمال ہے، مویشی کس قدر سکون سے چر رہے ہیں۔" سیاہ گھوڑے پر بیٹھے شخص نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔

"اے اجنبی شخص!! ہمیں پانی پلاؤ۔ ہم یہاں مسافر ہیں۔" علم بردار رعونت سے گویا ہوا لیکن وہ شخص ٹس سے مس نہ ہوا۔

"یہ کیسی عبادت ہے بھلا؟ یہاں تو کوئی بھی بت موجود نہیں، ہمارے علاقہ میں خانقاہی ایسے تو نہیں کرتے۔" تیسرے فرد نے حیرانی سے پوچھا۔

"اگر یہ نوجوان گھٹنوں کے بل جھکے اور جھک کر پھر سے کھڑا ہو جائے تو میں تمہیں بتا سکوں گا یہ کون سی عبادت کر رہا ہے؟" علمبردار نے سنجیدگی سے کہا۔

دیگر دو ساتھی اس شخص کو ہو بہو وہی حرکات و سکنات کرتے دیکھ کر پُرجوش ہو گئے۔

"تمہارا اندازہ بالکل درست ثابت ہوا..... اب بتاؤ یہ کس مذہب سے تعلق رکھتا ہے؟"

"مجھے خدشہ ہے کہ اگر میں تمہیں آگاہ کر دوں تو تم اس کی گردن اڑا دو گے۔" وہ مسکرانے لگا۔

"اوہ! کہیں اس کا تعلق یثرب کے اسی شخص سے تو نہیں جس نے پیغمبری کا دعویٰ کیا ہے؟" وہ اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا اور میان سے تلوار نکال کر بائیں جانب سے اس پر وار کرنا چاہا۔

"سلام ہو تم پر۔" اس شخص نے رکعت کی تکمیل پر انہیں فرداً فرداً مخاطب کیا۔ وہ تلواروں کی موجودگی اور خشونت زدہ تاثرات سے بالکل بھی مرعوب نہ تھا۔ اس کی دھیمی پُرسوز آواز اور آنکھوں کی مخصوص چمک نے انہیں ساکت کر دیا۔

"ہم یہاں مسافر ہیں..... ہمیں پانی پلاؤ۔" علمبردار نے کہا۔

وہ خاموشی سے اٹھا اور تین پیالوں میں دودھ بھر کر انہیں تھما دیا۔ گھڑ سواروں کی شاہی حیثیت اور ہتھیاروں کی موجودگی اس کے لیے گویا بے معنی تھی۔ وہ اطمینان سے اپنے سابقہ مشغلہ میں مصروف ہو گیا اور تکبیر ادا کرتے ہوئے زیرِ لب آیات کا ورد کرنے لگا۔

"اس کی بات کا کیا مطلب تھا؟" تیسرے فرد نے اپنے سردار سے تکبیر کے کلمات کی بابت دریافت کیا۔

"یہ کہہ رہا ہے کہ اس کا خدا ہم سب کے اندازوں، سوچ اور تصور سے بالاتر اور عظیم ہے..... ہم بھی اس کی کبریائی کا اندازہ نہیں کر سکتے۔" سردار نے حقارت سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

پیالوں میں سونے کے سکے پھینک کر وہ ایک جانب بڑھ گئے۔ منزل اب نزدیک تر تھی۔

موسم کی سختی، خوف، نفس، ترغیبات سے مبرا و بے نیاز یہ شخص اویس قرنیؓ تھے۔

اویس قرنیؓ کا تعلق 'یمن' کے علاقہ 'قرن' سے تھا جس کے متعلق روایت ہے کہ ایک مرتبہ اس علاقہ میں کسی کھدائی کے دوران گائے کا ایک سینگ (قرن) برآمد ہوا۔ اسی بدولت بستی کو بھی یہی نام دے دیا گیا۔

اسی بستی میں 'مراد' نامی ایک قبیلہ بھی آباد تھا۔ اویسؓ کی ولادت اسی قبیلہ کے ایک شخص 'عامر دارد' کے گھر 594 عیسوی میں ہوئی۔ ان کی والدہ کا نام 'بدار' تھا۔ اویس قرنیؓ کا نسب نامہ ایک ایسا اسرار ہے جو تا وقت لاینحل ہے۔ تاریخی حوالوں میں یہ نسب نامہ "اویس بن عامر بن خبرد بن مالک ابن عمرو بن سعد بن عصوان بن قرن بن رودان بن ناجیہ بن مراد بن مالک مذحجی" درج ہے لیکن حقیقت تو یہ ہے

کہ ان کا نسب محض ''عشق رسول ﷺ'' ہے اور تا قیامت یہی رہے گا۔

اویس قرنیؓ کے ابتدائی حالات اور نشوونما کی بابت بھی تاریخ کے اوراق خاموش ہیں تاہم کچھ حوالوں سے علم ہوتا ہے کہ ان کی کم سنی میں ہی عامر دارد کی وفات ہو گئی تھی۔ قبیلہ مراد ماضی میں حضرت سلیمانؑ کا پیروکار تھا۔

سرزمین حجاز میں جب پیغمبر اسلام ﷺ کا ظہور ہوا تو اس وقت اویسؓ بالغ و باشعور تھے۔ اسلام کی بازگشت دھیرے دھیرے حجاز سے پڑوسی ممالک میں پہنچی تو قبیلہ مراد بھی اس کے سحر میں گرفتار ہو گیا۔

اویس قرنیؓ کا روزگار شتربانی سے وابستہ تھا۔ ان دنوں یمن میں بھیڑیے اکثر اونٹوں پر حملہ آور ہو کر انہیں چیر پھاڑ دیتے تھے لیکن قدرت کا کرشمہ ایسا تھا کہ یہی خونخوار بھیڑیے ان کے اونٹوں کی جانب نگاہ بھی نہ اٹھاتے۔

اجرت پر اونٹوں کے علاوہ بھیڑ بکریاں بھی چراتے تھے اور معاوضہ اپنی ضعیف اور نابینا والدہ کی خدمت پر صرف کر کے راہ خدا میں خرچ کر دیتے۔

شتربانی کے علاوہ بعض روایات میں یہ بھی موجود ہے کہ وہ رستوں میں بکھری کھجوروں کی گٹھلیاں سمیٹ کر فروخت کر کے کھجوریں خریدتے اور زائد مال اللہ کی راہ میں دے دیا کرتے تھے۔ دنیاوی مال و دولت کی طلب تھی نہ ضرورت۔ وہ جنگل کے قریب ایک کچے گھر کے مکین تھے۔ عسرت، تنگدستی اور آزمائشیں بے انتہا محبوب تھیں کیونکہ وہ زندگی کے ہر معاملہ میں سنت رسول ﷺ کے پیروکار تھے۔

اویس قرنیؓ کی زندگی محض ایک ہی دائرہ میں مقید تھی، والدہ کی خدمت اور رسول خدا ﷺ سے والہانہ عشق۔

☆......☆

تینوں گھڑسوار اب یمن کے بازاروں میں محو سفر تھے۔

ہجرت کا چھٹا سال طلوع ہو چکا تھا۔ یمن میں عوام کی اکثریت مذہب سے کوسوں دور تھی۔ بدامنی، لاقانونیت اور راہ زنی ان کا شعار بن چکی تھی۔ ہر طرف استحصال اور ظلم و جبر کا دور دورہ تھا۔ شاہی کارندے طاقت کے نشے میں چور بدمست ہاتھیوں کی مانند دندناتے پھرتے۔ ان کے تکبر و فرعونیت کی زد میں جو بھی آتا، کچلا جاتا تھا۔ اس وقت بھی 'ابن اخنس' نامی شاہی کارندہ دس بارہ سالہ بچے کو رسن بستہ کیے اپنے گھوڑے کے ساتھ گھسیٹ رہا تھا۔

''میں نے چوری کا ارتکاب نہیں کیا، مجھے چھوڑ دو۔'' کم سن بچہ خوف و دہشت سے بلک رہا تھا۔

انہوں نے گھوڑے کی باگیں کھینچ لیں۔ اس مختصر گروہ کے ایک ساتھی نے صورت حال کا جائزہ لیا اور کڑکدار لہجہ میں دریافت کیا۔

''یہ کیا ہو رہا ہے یہاں؟''

''میرا تعلق شاہی محل سے ہے اور میں اپنے معاملات میں اجنبیوں کی مداخلت پسند نہیں کرتا۔'' ابن اخنس نے جواب دیا۔

''کیا تم بصارت سے محروم ہو؟ ہماری شناخت یہ پرچم ہے۔'' علمبردار شخص نے رعونت سے کہا۔

ابن اخنس نے ایرانی پرچم کی جانب دیکھا اور عقیدت سے سر جھکا لیا۔ اس نے بچے کو بھی رہائی دے دی کیونکہ یمن کا شاہی محل اس وقت شاہ ایران خسرو پرویز کے زیر اثر تھا۔ وہ ایرانی سپاہ کے حکم سے سرتابی کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ عدن، صنعاء اور یمن کے دیگر مضافاتی علاقوں میں خسرو کی جانب سے ایک خصوصی نمائندہ 'باذان' گورنر مقرر کیا گیا تھا۔ جاہ طلبی، درندگی اور انسانیت سوز سلوک میں باذان بھی اپنی مثال آپ تھا۔

گھڑسواروں کا وہ دستہ بالآخر اپنی حتمی منزل تک پہنچ گیا۔

شاہی محل کی شان و شوکت آنکھیں چندھیاتی تھی۔ دیدہ زیب پتھر سے تعمیر شدہ اس وسیع و عریض محل کی برجیوں پر خوفناک صورت پہریدار متعین تھے۔ یمن میں آتش پرستی کا رجحان عام تھا اس لیے محل میں بھی ہر جگہ آتش روشن تھی۔

تینوں افراد آراستہ راہداریوں سے گذرتے چلے گئے۔ کھڑکیوں پر حریری پردے اپنی بہار دکھلا رہے تھے۔ چند لمحوں بعد وہ ادھیڑ عمر 'باذان' کے سامنے موجود تھے۔ وہ اپنی پشت پر ہاتھ باندھے کسی بھوکے درندے کی مانند دکھائی دے رہا تھا۔ عبا قیمتی ترین ہیرے جواہرات سے منقش تھی اور سر پر مخصوص ٹوپی میں بھی قیمتی ہیرے جڑے تھے۔ اس کے عقب میں منقش چوبی تخت پر، شاہ یمن حارث' پریشان صورت لیے براجمان تھا۔

''شاہ ایران کے خصوصی نمائندہ باذان کی خدمت میں ہمارا سلام قبول ہو۔'' وہ رواج کے مطابق دوزانو ہوئے اور اپنا بایاں ہاتھ دائیں جانب سینے پر رکھ لیا۔

''کہو! کیا پیغام لائے ہو؟'' خسرو کا نام سنتے ہی باذان کی چھوٹی مکار آنکھوں میں عقیدت و احترام در آیا۔

DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

"یثرب میں ایک شخص نے پیغمبری کا دعویٰ کیا ہے اور اسی زعم میں خداوند خسرو کو ایک گستاخانہ پیغام بھیجا ہے کہ تم اسلام لاؤ تو سالم رہو گے۔ اگر تم نے روگردانی کی تو تم پر اریسیوں (رعایا) کا بھی گناہ ہوگا۔ شاہ ایران اس جسارت پر بے حد برہم ہیں اور اہل یثرب کو قرار واقعی سزا دینا چاہتے ہیں۔" اس نے مؤدبانہ کہا۔

خسرو پرویز درحقیقت ایک مغرور حکمران تھا۔ صلح حدیبیہ کے بعد جب پیغمبر خدا حضرت محمد ﷺ کو کفار مکہ کی شر انگیزیوں سے وقتی سکون نصیب ہوا تو آپ ﷺ نے مختلف حکمرانوں کو خطوط کے ذریعہ دین اسلام کی دعوت دی۔ خسرو پیغام توحید پا کر سیخ پا ہو گیا اور اپنے ایلچی حجاز کی قریب ترین جنوبی ریاست یمن کی طرف روانہ کر دیے۔

"صحرا نشین بدو عرب اس روئے ارض کی وحشی قوم ہے۔ ان کے پاس سواری کے لیے محض اونٹ ہیں... اور کھانے کے لیے سوکھی جو اور پیاز، ان میں پروردگار خسرو سے ٹکرانے کی جرأت کیونکر پیدا ہوگئی۔ کیا انہیں علم نہیں کہ ان کے دبدبہ اور دہشت سے روم بھی تھراتا ہے؟" باذان نے آتشیں لہجہ میں کہا۔ "مجھے اس ماجرا کی تفصیل بتاؤ۔"

"یثرب میں ایک اَن پڑھ عرب نے پیغمبر ہونے کا دعویٰ کیا ہے، اس نے پروردگار خسرو (قدیم فارس میں مقامی افراد بادشاہ وقت کو خداوند اور پروردگار کے القاب سے پکارتے تھے) کی خدمت میں عبداللہ بن حذافہ کے توسط ایک خط بھیجا جس میں اپنے خدا کا اور اپنا نام پروردگار کے نام سے پہلے درج کیا۔ انہیں یہ بات پسند نہ آئی اور خط ٹکڑے ٹکڑے کر کے ایلچی کے حوالے کر دیا۔ شاہ ایران کی خواہش ہے کہ اس عرب کو تائب ہونے پر آمادہ کیا جائے بصورت دیگر اہل یثرب ان سے جنگ کے لیے تیار رہیں۔" قاصد نے تفصیل بتائی۔

"یمن میں بھی مسلمانوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔" حارث نے دبے دبے لہجہ میں کہا۔ "ہمیں بھی راہ حق کی تلاش کرنی چاہیے۔"

حاکم یمن باذان کی موجودگی میں وہ محض ایک کٹھ پتلی فرماں روا تھا۔

"ہرگز نہیں، دو ایلچی یثرب روانہ کیے جائیں گے اور پروردگار خسرو کا پیغام اس عرب تک پہنچا کر جواب طلب کیا جائے گا۔" باذان نے حتمی انداز میں کہا اور ایرانی قاصدین کو ستانے کا اشارہ کر دیا۔

☆......☆

اویس قرنیؓ اپنی عبادت میں مصروف تھے۔

اردگرد اونٹ اور بھیڑ بکریاں خاموشی سے چر رہی تھیں۔ یہ بے زبان مخلوق ان کی عبادت میں کبھی بھی مخل نہ ہوتی تھی۔ عام شتربانوں کو اکثر و بیشتر مویشیوں کے اڑیل مزاج اور گمشدگی کے مسائل کا سامنا رہتا تھا لیکن اویسؓ قدرتی طور پر ہی ایسے مسائل و مشکلات سے مبرا تھے۔

عبادت، لگن، خشوع و خضوع اور مجذوبیت کے باعث قرن کا ایک طبقہ اگر ان کی بہت عزت کرتا تھا تو دوسری جانب ایک گروہ ایسا بھی تھا جو انہیں دیوانہ اور کم عقل گردانتا۔ اویسؓ نے کسی کی توصیف و تنقید کی کبھی بھی پروا نہیں کی۔

ان کی زندگی کا مطمع نظر تو محض محبوب خدا ﷺ کی تقلید اور عشق تھا۔ والدہ کی ضعیفی کے باعث وہ خواہش کے باوجود اب تک نبی آخر الزماں ﷺ سے ملاقات سے محروم تھے۔ ان کی زندگی میں واحد آرزو بھی یثرب میں اپنی محبوب ہستی کی زیارت تھی۔ اویس قرنیؓ کی زندگی رسول خدا ﷺ کے ایک قول کی مکمل تشریح تھی کہ تم میں سے کوئی بھی شخص اس وقت تک کامل مومن نہیں ہو سکتا جب تک نبی ﷺ کی ذات ان سب سے بڑھ کر عزیز نہ ہو جائے۔

اویسؓ بھی محبت میں اس مقام تک پہنچ چکے تھے جہاں دوئی کا تصور ہی ختم ہو جاتا ہے اور محب محبوب کی ذات میں فنا ہو جاتا ہے۔

کچھ سال قبل (۳ ہجری) میں مسلمانوں کو کفار مکہ کے خلاف احد کا معرکہ درپیش تھا۔ اس غزوہ میں نبی پاک ﷺ نے تیراندازوں کا ایک دستہ درے پر متعین کر کے تاکید کی تھی کہ فتح یا شکست کی صورت میں وہ اپنی جگہ نہیں چھوڑیں گے۔

مسلمانوں کے شدید حملہ کی صورت میں کفار کے قدم وقتی طور اکھڑ گئے اور وہ پسپائی اختیار کر گئے۔ تو مسلم مجاہدین نے دور اندیشی سے کام نہ لیا اور مال غنیمت جمع کرنے لگے۔ اس صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے درہ پر تعینات پچاس تیر اندازوں کے دستے نے بھی ہدایات فراموش کر دیں اور دیگر مجاہدین کے ساتھ شامل ہو گئے۔

حضرت خالد بن ولیدؓ اس وقت دائرہ اسلام میں داخل نہیں ہوئے تھے اور کفار ہی کی جانب سے جنگ میں شریک تھے۔ انہوں نے درہ خالی دیکھ کر مسلمانوں پر پوری قوت سے دھاوا بول دیا۔ اس گھمسان کے رن میں حضرت محمد ﷺ کے دندان مبارک شہید ہو گئے۔

جنگ کا نتیجہ مسلمانوں کے حق میں برآمد نہ ہو سکا۔

رسول خدا حضرت محمد ﷺ سے اویس قرنیؓ کی محبت کا یہ عالم تھا کہ جب انہیں اس بات کا علم ہوا تو وہ بے حد رنجیدہ اور آبدیدہ ہو گئے۔ دفور محبت میں انہوں نے بھی اپنا دندان توڑ دیا۔ پھر خیال آیا کہ شاید نبی ﷺ کا کوئی دوسرا دانت شہید ہوا ہو تو انہوں نے دوسرا دانت بھی توڑ دیا۔ اسی طرح کیے بعد دیگرے تمام دندان توڑے تو اضطراب، رنجیدگی اور بے سکونی میں قدرے کمی واقع ہوئی۔

روایات میں ملتا ہے کہ اللہ عزوجل و تعالیٰ کو ان کی یہ ادا اس قدر پسند آئی کہ ان کے دندان کچھ عرصہ بعد دوبارہ نکل آئے۔

اپنی دعاؤں اور مناجات کے دوران اویسؓ کو دو گھڑ سواروں کی آمد کی خبر ہی نہ ہو سکی۔ لباس اور انداز سے وہ دونوں شاہی قاصد معلوم ہوتے تھے۔

”اے اجنبی! ہمارا مشکیزہ پانی سے بھر دو۔“ ادھیڑ عمر اور باریش بابو نے کہا۔

”تم پر اللہ کی سلامتی ہو۔ کہیں طویل سفر کا ارادہ ہے کیا؟“ انہوں نے مسکراتے ہوئے پانی تھمایا۔

”ہاں! ہم یثرب جا رہے ہیں۔“ سخت گیر جواں العمر خسرو نے کہا اور گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔

اویس قرنیؓ کے وجود پر لرزہ طاری ہو گیا۔ ان خوش نصیب افراد کو حاصل ہونے والے اس سنہری موقع کے تصور نے ان کی آنکھوں سے رشک کے آنسو جاری کر دیئے اور وہ حسرت بھری نظروں سے ان کی پشت تکتے رہے۔

”علیک اسلام یا رسول اللہ ﷺ!!!“ ان کی زبان سے محض یہی الفاظ برآمد ہو سکے تھے۔

انہیں کامل یقین تھا کہ محسن انسانیت کا دیدار شاہی ایلچیوں کی زندگی میں انقلاب برپا کر دے گا۔

☆......☆

یمن کے بازاروں میں زندگی کی رونقیں اپنے جوبن پر تھیں۔

خرید و فروخت اور مول تول کے شور و غل میں کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی۔ دوپہر کے سائے ڈھلنے لگے تھے اور اویسؓ سر جھکائے ذکر الٰہی میں مگن اپنے گھر کی جانب گامزن تھے۔ ان کی مجذوبیت اکثر و بیشتر کم عقل لوگوں کی جانب سے ہرزہ سرائی، طعن و تشنیع اور سنگ زنی کا باعث بنی رہتی تھی۔

بستی کے شرارتی لڑکے بے رحمی سے ان پر پتھر برسایا کرتے۔ ایک روز وہ ان افراد سے التجا کرنے لگے۔

”برادران! مجھے بڑے پتھروں سے ضرب نہ لگایا کریں۔“

”گمان ہوتا ہے کہ تم خوفزدہ ہو چکے ہو۔“ انہوں نے قہقہہ لگایا۔

”نہیں برادر!! اگر آپ کو اس کام سے خوشی ملتی ہے تو بیشک اسے چھوٹے پتھروں سے جاری رکھیے۔ بڑے پتھروں کی ضرب سے لہو رسنے لگتا ہے اور میرا وضو قائم نہیں رہ پاتا۔“ اویسؓ نے دھیمے لہجہ میں عذر بیان کیا۔

گلی کوچوں سے گذرتے وہ اپنے گھر کی جانب گامزن تھے جب ایک منظر دیکھ کر ان کے قدم بے اختیار رک گئے۔

دو کم عمر بچے ایک شرپسند گروہ کی سنگ زنی کی زد میں تھے۔ قدموں کی چاپ سن کر وہ فوراً تتر بتر ہو گئے۔ ان میں سے ایک لڑکا خاصا زخمی ہو چکا تھا۔ آپ نے اسے سہارا دے کر اٹھایا اور اپنے کندھوں پر بٹھا لیا۔

”یہ کیا ماجرا ہے عزیزم؟“ انہوں نے دریافت کیا۔

”میرا نام سلیم ہے اور وہ ہمارے مخالف قبیلے کے بچے تھے۔ میرے والد کی وفات ہو چکی ہے۔ ہم بے حد غریب ہیں اس لیے ان امیروں کے عتاب کا نشانہ بنے رہتے ہیں۔“ لڑکے نے افسردگی سے کہا۔

”سلیم! ہمارے مذہب میں امیر غریب، اعلیٰ ادنیٰ، حاکم محکوم اور شاہ و گدا میں کوئی بھی فرق نہیں۔ میرے نبی ﷺ نے فرمایا ہے کہ کسی کی حق تلفی کرو نہ ہی ظلم برداشت کرو۔ مظلوم ناجائز ظلم برداشت کر کے ظالم کو مزید تقویت دیتا ہے۔“ اویسؓ اسے شفقت سے سمجھانے لگے۔

کچھ دیر بعد وہ سلیم کے ہمراہ اپنے گھر پہنچ گئے۔

گھر بھی کیا تھا کسی مسافر کی سرائے معلوم ہوتا تھا۔ مختصر صحن میں ایک چھوٹا سا کنواں موجود تھا۔ صحن کے آگے برآمدہ اور ایک ٹوٹا پھوٹا کمرا ان کی درویشی کا منہ بولتا ثبوت تھا۔

انہوں نے سلیم کو ایک چٹائی پر بٹھایا اور پانی سے پنڈلی کا زخم دھو کر صاف کر دیا۔

صحن میں کھٹر پٹر کی آوازیں سن کر بدار دیواریں ٹٹولتے وہیں چلی آئیں۔

”اویس! میرے بچے! میں کب سے تمہاری منتظر تھی۔“

”سلام ماں!! میرے ساتھ ایک مہمان بھی آیا ہے۔“ وہ خوشی سے نہال تھے۔

”خوش آمدید......“ بدار بھی مہمان کی آمد کی خبر پر خوش

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

ہوگئیں۔
اویسؓ نے گھر میں موجود روکھا سوکھا کھانا نہایت محبت سے سلیم کے سامنے دھر دیا۔ وہ بہت عجلت میں دکھائی دیتے تھے۔
''اویس کہاں گئے ہیں ماں؟'' سلیم نے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے دریافت کیا۔
''وہ یقیناً چھت پر گیا ہوگا، بلال حبشیؓ کی اذان کا وقت جو ہونے والا ہے۔'' بدار نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔
''لیکن بلال تو یثرب میں ہیں، یمن میں ان کی صدا کیوں کر سنی جا سکتی ہے؟'' وہ حیران ہوا۔
''اویس کو رسول خدا ﷺ سے بے حد عشق ہے میرے بچے!! وہ اپنی روح کی بصارت سے ان کا چلنا پھرنا 'ہنسنا بولنا اُٹھنا بیٹھنا دیکھ لیتا ہے۔''
''ایسا کیسے ممکن ہے بھلا؟'' سلیم بے یقین تھا۔
''عشق انہی معجزات کا ہی تو نام ہے بیٹا!! اور اگر یہ عشق حقیقی ہو تو عام انسانی ذہن اس کی گہرائی اور وسعت تک کسی صورت رسائی حاصل نہیں کر سکتا۔ اویس اپنے عشق میں اس مقام تک پہنچ چکا ہے کہ وہ رسول خدا ﷺ کی خوشبو مبارک بھی محسوس کرتا ہے۔''
''کیا اویس نے کبھی انہیں دیکھا ہے؟'' سلیم متاثر ہونے لگا۔
''نہیں میرے بچے!! وہ کبھی بھی یمن سے باہر نہیں گیا۔''
''پھر بھی عشق کی ایسی شدت...... لیکن وہ ان سے کیوں نہیں ملتے؟''
''محض میری وجہ سے، وہ اپنی ضعیف اور بیمار والدہ کو اکیلا چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا۔'' بدار نے محبت سے کہا۔
ان سب باتوں سے بے نیاز اویس قرنیؓ شمال کی جانب رخ کیے کھڑے تھے۔ فضا ساکت تھی اور وجود سراپا سماعت۔ اپنی آنکھیں موندے وہ من کی گہرائی سے اس صحابی کی پُرسوز اور عشق نبی ﷺ میں ڈوبی آواز سن رہے تھے جس کی خوش قسمتی پر وہ ہمیشہ ہی رشک کرتے تھے۔
حضرت بلال حبشیؓ کو نہ صرف رسول ﷺ کا قرب حاصل تھا بلکہ وہ اذان جیسے مقدس فریضہ کے لیے بھی تعینات کیے گئے تھے۔ ان کی خوش قسمتی 'خدمت رسول ﷺ' اور شعائر اسلام میں براہ راست شمولیت کی اویس محض تمنا ہی کر سکتے تھے۔
یثرب سے آنے والے تاجر بلالؓ کی زبان کی لکنت کا ذکر کرتے تو ایک اور حقیقت سے آگاہی بھی فراموش نہ کرتے کہ آقا ﷺ کو 'اشھد' کی بجائے 'اسھد' کا تلفظ بے حد بھاتا ہے۔ اویسؓ کی تڑپ میں کئی گنا اضافہ ہو جاتا اور وہ اپنی تمنا کی تکمیل کے لیے بارگاہ الٰہی میں گڑگڑانے لگتے۔
آنسو ایک بار پھر پلکوں کی حد بندی سے بغاوت کرتے ہوئے ان کا چہرہ بھگونے لگے۔ نماز عصر کے لیے تکبیر کہتے ہوئے وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو چکے تھے۔
ان کی تڑپ 'وارفتگی اور جذبات کی سچائی عرش پر اپنا مقام بنانے لگی تھی۔

☆......☆

بابویہ اور خسرو کا سفر جاری تھا۔
ان کی منزل تین اطراف سے لاوے کی چٹانوں میں گھرا ہوا شہر 'یثرب' تھا۔ وہ حاکم یمن 'باذان' کا پیغام عرب بدوؤں کے سردار تک پہنچانے پر مامور تھے۔ ایک مقام پر پہنچ کر وہ رک گئے۔ تھوڑی ہی دور ایک چرواہا نظر آرہا تھا۔
بابویہ اور خسرو نے نظروں میں ایک دوسرے کو اشارہ کیا اور اپنے مخصوص اکھڑ لہجہ میں چرواہے سے دریافت کیا:
''یثرب کس جانب ہے؟''
چرواہے نے دائیں سمت اشارہ کیا اور انہوں نے ایک بار پھر گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔
یثرب میں داخل ہوتے ہی انہیں اپنا وجود ایک بے عنوان اضطراب کی زد میں محسوس ہونے لگا تھا۔ طویل سفر کے بعد گھوڑے بھی ہانپ رہے تھے۔ اپنی اس تبدیلی پر الجھتے ہوئے انہوں نے گھوڑوں کی رفتار سست کر دی۔
سورج اپنی مسافت طے کرتے مشرق سے بے حد بلند ہو چکا تھا۔ یمن میں تو اس وقت کاروباری گہما گہمی عروج پر ہوتی تھیں لیکن جانے کیوں اس شہر میں ہو کا عالم طاری تھا۔
بابویہ کی جہاں ساز نظریں یثرب کے چپے چپے پر ایک انجانی مہک محسوس کرنے لگیں۔
ان کا سفر یونہی جاری رہا اور کچھ دور جاتے ہی بالآخر انہیں ایک بھٹی پر اپنے کام میں مشغول لوہار نظر آیا۔ شدید گرمی سے بے نیاز وہ لوہے کو آگ میں پگھلا کر ہتھیاروں کی صورت میں ڈھال رہا تھا۔
دو اجنبی گھڑسواروں کو اپنے سامنے کھڑا دیکھ کر اس نے اپنا مشغلہ ترک کر دیا۔
''کیا اس شہر میں اجنبی ہو؟'' اس نے خوش اخلاقی سے

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

پوچھا۔

"ہاں!! ہم محمد (ﷺ) سے ملنے آئے ہیں، کیا تم اس نام کے کسی شخص سے واقف ہو؟" خسرو نے کہا۔

"اس نام اور شخصیت سے بھلا کون واقف نہیں میرے دوست!! وہ عرب کے بہترین انسان ہیں جن کی شخصیت کا سحر انسان کو سب کچھ فراموش کردیتا ہے۔" اس حداد کے چہرے پر عقیدت اور محبت در آئی۔

"کیا تم یہ ہتھیار انہی کے لیے بناتے ہو؟" بابویہ نے پوچھا۔

"تم نے درست قیاس کیا۔"

"کتنی اجرت مل جاتی ہے تمہیں؟" خسرو نے طنزاً دریافت کیا۔

"محمد ﷺ کبھی کسی کی حق تلفی نہیں کرتے، وہ فرماتے ہیں کہ مزدور کو اس کا پسینا خشک ہونے سے قبل ہی اُجرت عطا کردو لیکن میں تمہیں اپنے دل کی بات بتاؤں۔ میں ان کے لیے بلا معاوضہ بھی ہر کام کرنے کے لیے تیار ہوں، ان کی مسکراہٹ اور اخلاق پر ساری دنیا نچھاور کی جاسکتی ہے۔"

حداد کی بات سن کر دونوں بے اختیار ہنسنے لگے۔ "ہمیں ان سے ملاقات کرنی ہے..... وہ کہاں ملیں گے؟"

"اس وقت وہ مسجد میں ہوں گے، میں تمہیں لیے چلتا ہوں۔" اس نے اپنی بھٹی پر اوزار اور سامان سمیٹے بغیر ان کے گھوڑوں کی باگیں تھامیں اور ایک جانب چل دیا۔

"اپنی دکان کیوں کھلی چھوڑ دی؟" خسرو حیران تھا۔

"بند کردینے کا بھی کوئی جواز نہیں دوست!" وہ مسکرایا۔

وہ شہر میں جوں جوں آگے بڑھ رہے تھے ویرانی، خاموشی اور سناٹے کا تاثر مزید گہرا ہورہا تھا۔ بابویہ اور خسرو کی الجھن شدید ہونے لگی۔

"تمہارے شہر کے مکین کہاں ہیں؟ کیا یہ جگہ بدروحوں اور بھوتوں کا مسکن ہے۔ ہمیں یہاں کوئی بھی ذی نفس کیوں نظر نہیں آرہا؟"

"مرد اور بچے اس وقت مسجد میں نماز کی ادائیگی میں مصروف ہوں گے۔" اس نے بے نیازی سے بتایا۔

"اور عورتیں؟"

"وہ اپنے گھروں میں نماز کا اہتمام کرتی ہیں۔"

"تو کیا تم مسلمان نہیں ہو؟" بابویہ نے پوچھا۔

"نہیں میرے دوست!! میں غیر مسلم ہوں۔"

"تم محمد (ﷺ) کے مذہب کو نہیں مانتے لیکن پھر بھی مسلمانوں کو ہتھیار بنا کر دیتے ہو تاکہ وہ ہم سے جنگ و جدل اور خون خرابہ کریں۔" خسرو نے تکبر جتایا۔

"میں محمد (ﷺ) کے مذہب کو بلاشبہ تا حال تسلیم نہیں کرپایا لیکن کیا تم بھول گئے کہ میں انہیں پہلے ہی اس عرب کا بہترین انسان قرار دے چکا ہوں اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ مظلوموں کے لیے مسیحا ہیں۔ ایسا شخص کبھی بھی بلاوجہ خون خرابہ نہیں کرتا۔ وہ جنگ و جدل میں بھی اخلاقیات کے قائل ہیں۔ صادق اور امین ہیں، اہلِ قریش سے دریافت کرلینا۔ وہ آج بھی ان کے اخلاق اور شخصی خوبیوں کی قسمیں اُٹھاتے ہیں۔" اس نے عقیدت سے کہا۔

"لیکن قریش تو مسلمانوں کے سب سے بڑے دشمن ہیں۔" ان کی الجھن بڑھتی ہی چلی جارہی تھی۔

"اس دشمنی کی وجہ محض یہ ہے کہ مسلمان بت پرستی کے خلاف ہیں ورنہ محمد (ﷺ) راضی ہوجائیں تو وہ انہیں اپنا سردار تسلیم کرنے میں ذرا بھی تامل نہ کریں گے۔"

"لوگ ٹھیک کہتے ہیں محمد (ﷺ) واقعی جادوگر ہیں۔" خسرو نے سرگوشی کی۔ وہ بابویہ کی غائب الدماغی کا اندازہ ہی نہ کرسکا۔

سفر اب خاموشی سے طے ہونے لگا۔ وہ کھوجتی ہوئی نظروں سے اردگرد کے مناظر دیکھنے لگے۔ دکانیں کھلی تھیں لیکن وہاں کوئی بھی دکاندار موجود نہ تھا۔ قیمتی سامان ہر طرف یونہی بکھرا پڑا تھا۔

"اگر یمن کے چور یہاں آجائیں تو پل بھر میں ہی ہر چیز کا صفایا کردیں گے۔" بابویہ بے اختیار بڑبڑایا۔ "کیا یہاں کسی کو چوری چکاری کا کوئی خدشہ نہیں؟"

"قطعی نہیں، اہل یثرب پیغمبر سے حیا کرتے ہیں میرے دوست!! ان کے مذہب میں چوری حرام ہے، وہ غربت میں فاقے کاٹ کر بھوک سے مرنا گوارا کریں گے لیکن ایسا کوئی بھی کام نہیں کریں گے جس کا حکم ان کے پیغمبر نے نہیں دیا۔"

خسرو اب بیزار ہونے لگا تھا اور بابویہ کسی گہری سوچ میں مگن تھا۔

تھوڑی ہی دور انہیں ایک ایسی عمارت کی جھلک نظر آنے لگی تھی جس کے ستون کھجور کے تنوں سے بنے تھے اور چھت کھجور ہی کے پتوں کی تھی۔ کچی دیواریں، فرش اور یمن کے شاہی محل کی شان و شوکت میں کوئی بھی مقابلہ نہ تھا لیکن پھر

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

بھی جانے کیوں یہ سادگی ان کے دلوں میں ایک عجب سی ہیبت پیدا کر رہی تھی۔

"مجھے ایسا کیوں محسوس ہو رہا ہے کہ یہ ایک عظیم اور سب سے برتر بادشاہ کا دربار ہے۔" بابویہ نے خود کلامی کی۔

فضا میں رچا ہوا سکون، تقدس اور محبت اس کے دل و دماغ پر غالب آنے لگی تھی۔

"چند ہی لمحوں میں نماز مکمل ہو جائے گی اور نمازی باہر آجائیں گے۔" حداد نے گھوڑوں کی باگیں چھوڑ دیں اور ایک آسودہ مسکراہٹ سے بولا۔

"کیا محمد (ﷺ) یہاں رہتے ہیں؟" خسرو نے اس سادہ سی عمارت کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں دوست! وہ کہتے ہیں کہ یہ خدا کا گھر ہے اور دن میں پانچ مرتبہ سب مسلمان یہاں عبادت کے لیے اکٹھے ہوتے ہیں۔"

صحرا نشیں بدو عربوں کا ایک بہت بڑا گروہ باہر آنے لگا۔ ان کے چہروں پر چمک اور وقار تھا۔ بشرے سے جھلکتا ایسا اطمینان اور بے نیازی انہوں نے آج تک کہیں بھی نہیں دیکھی تھی۔

"ان میں محمد (ﷺ) کون ہیں؟"

"وہ سفید لباس میں ملبوس ہوں گے۔ انہیں یہ رنگ بہت پسند ہے" حداد نے بتایا۔

"لیکن یہاں تو تقریباً سبھی افراد نے سفید لباس پہن رکھا ہے۔" خسرو جھنجلانے لگا تھا۔

"یہی تو ان کا کمال ہے میرے عزیز! انہوں نے کبھی اپنی ذات اور دیگر لوگوں میں کوئی فرق روا نہیں رکھا، وہ کہتے ہیں کہ میں بھی تم لوگوں جیسا ہی ایک انسان ہوں۔" اس کی باتیں ان کے دل و دماغ جھنجوڑ رہی تھیں۔

نمازی مسجد سے باہر آنے کے بعد دو اجنبی مسافروں کو تجسس اور عزت سے دیکھنے لگے۔ بابویہ کو محسوس ہوا کہ یہ ایک ایسے عظیم الشان شہنشاہ کی فوج ہے جو اپنے آقا کے ایک اشارہ پر اپنی جان نچھاور کر دینے کے لیے بھی تیار ہے۔ ان کی نظریں براق لباس میں اپنی جانب بڑھنے والے ایک ادھیڑ عمر، باوقار اور روشن چہرے والے شخص پر مرکوز تھیں۔

"تم ہی وہ ان پڑھ عرب ہو جس نے پیغمبری کا دعویٰ کیا ہے؟" خسرو نے پوچھا۔

"نہیں میرا نام سلمان فارسی ہے اور میں ایک عجمی ہوں۔" انہوں نے ملائمت سے جواب دیا۔

شاہ ایران کا پیغام لانے والے قاصدین اپنی سرزمین سے باغی اس شخص کو دیکھ کر گنگ رہ گئے۔

"کیا تم ایران اور پروردگار خسرو سے بغاوت کر کے ایک شاندار زندگی چھوڑ کر یہاں ان غیر مہذب بدو عربوں میں رہنے لگے ہو؟" بابویہ نے اپنی الجھن کو الفاظ کا پیراہن دیا۔

"میں ایک مجوسی خاندان کا بیٹا ہوں عزیزم! میرے والد ایران کے شاہی آتش کدے میں نگران تھے۔ لیکن میری روح ہمہ وقت بے چین رہتی تھی۔ تلاش حق کا یہ سفر مجھے عموریہ میں ایک راہب کے پاس لے گیا مگر سکون میسر نہ آیا۔ حالات کے بھنور میں گردش کرتے میں نے ایک یہودی کی غلامی بھی کی اور آخر کار مجھے میری منزل یہاں یثرب میں ملی۔" وہ سادگی سے گویا ہوئے۔

"گویا تم مجوسیت، نصرانیت اور یہودیت سے تائب ہو کر محمد (ﷺ) کے پیروکار بنے؟" بابویہ کی رگوں میں خون سنسنانے لگا۔

"میں نے آقا محمد ﷺ سے بہترین، باعمل اور مثالی انسان دنیا کے کسی مذہب میں نہیں دیکھا۔ عزیزم! میری جان، مال، خاندان سب ان پر قربان۔"

"کیا تم اپنے خاندان میں واپسی کے متمنی بھی نہیں۔" خسرو اس عجوبہ روزگار شخص کو دیکھ کر حیرت سے بولا۔

"میں مسلمان ہوں، اسلام میرا کنبہ ہے، محمد ﷺ میرے آقا ہیں اور میرا شجرہ نسب سلمان بن اسلام بن اسلام بن اسلام کے سوا اب کچھ نہیں۔" وہ مسکرائے۔

"ہم حاکم یمن کی جانب سے شاہ ایران کا پیغام لائے ہیں۔" بابویہ نے اپنے ذہن پر طاری ہونے والی دھند جھٹکی اور روایت کے مطابق دوزانو ہو کر شاہی فرمان انہیں تھما دیا۔

"میرے آقا ﷺ کو قطعی پسند نہیں کہ کوئی انہیں یا کسی بھی مسلمان کو تعظیم دینے کے لیے جھکے، اسلام ہمیں مساوات کا درس دیتا ہے اور ہم صرف اللہ کے سامنے جھکتے ہیں۔" سلمانؓ نے بابویہ کو اٹھنے کا اشارہ کیا۔

"آپ کا پیغام آقا ﷺ تک پہنچا کر کل صبح جواب دے دیا جائے گا، آپ فی الحال آرام کیجیے۔ ہم بدو عرب غیر مہذب ہی سہی لیکن ہمارے نبی نے مہمان نوازی کا درس سکھایا ہے۔" ایک اور شخص نے انہیں مخاطب کیا۔

لیکن بابویہ کی نظریں سلمانؓ کے عقب میں ایک روشن پیشانی، پر نور چہرے اور مسکراتے لبوں کی جانب مرکوز تھیں۔

اسے اپنے سینے میں دل پگھلتا ہوا محسوس ہوا اور جسم پر لرزہ طاری ہو گیا۔ نور کی ایک تجلی تھی جس نے اس کا وجود ایک مقدس خوشبو اور روشنی سے یکا یک لبریز کر دیا تھا۔

وہ کپکپاتے لہجہ میں گویا ہوا۔

"میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان لایا...... بے شک محمد ﷺ ہی اللہ کے آخری رسول ہیں......"

اویس قرنیؓ اور سلمان فارسیؓ کے آقا کی ایک ہی جھلک نے بابویہ کے دل و دماغ تہ و بالا کر دیئے تھے۔ وہ اس سرزمین سے واپسی کا اب تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

☆......☆

یمن میں رات کی تاریکی چھائی تھی۔

اویسؓ نے والدہ کو نہایت محبت اور توجہ سے کھانا کھلایا اور پیوند زدہ لحاف اڑھا دیا۔

"میری خواہش کب پوری کرو گے جان مادر؟" بدار نے ٹٹولتے ہوئے ان کے چہرے پر محبت سے ہاتھ پھیرا۔

"میری جان بھی آپ پر قربان ماں!" انہوں نے ادب سے والدہ کے ہاتھ پر بوسہ دیا۔"

بدار بیٹے کی شادی کرنے کی متمنی تھیں لیکن اویس کا عشق اور مجذوبیت انہیں اس جبلی تقاضے سے بھی مبرا رکھے ہوئی تھیں۔

"شادی کے معاملہ میں مجھے کچھ تحفظات ہیں۔"

"کیسے تحفظات میرے بچے؟" وہ الجھ گئیں۔

"ہمارا طرز زندگی بہت سادہ ہے ماں!! میرے آقا ﷺ نے فرمایا ہے کہ یہ دنیا ایک سرائے ہے اور یہاں ایسے ہی رہائش اختیار کرو جیسے تم کوئی مسافر ہو۔ مجھے دنیاوی اشیاء کی طلب ہے نہ چاہ دو وقت روکھی سوکھی کھا کر اپنے رب کے حضور شکرانہ ادا کرنا، اس کے احکام کی پابندی کرنا اور اپنے محبوب رسول خدا ﷺ کی پیروی کرنا ہی میری زندگی کا مدار ہے، مجھے خدشہ ہے کہ کوئی بھی شریک حیات ایسی زندگی سے نباہ نہیں کر پائے گی۔" انہوں نے سادگی سے اپنا نقطہ نظر بیان کر دیا۔

درحقیقت ان کی زندگی درویشی، قناعت و توکل کا ایک مکمل نمونہ تھی۔ شکستہ اور پرانے مکان میں رہائش کے باعث لوگ ان سے سماجی روابط کے بھی قائل نہ تھے۔ وہ اپنا زیادہ تر وقت جنگل ہی میں گزارتے تھے۔ کوڑا کرکٹ سے چیتھڑے اٹھا کر انہیں مکمل طور پر پاک کرتے اور یہی چیتھڑے سی کر زیب تن کر لیا کرتے تھے۔

انا اور ضمیر

عمانوئیل کانٹ نے کہا تھا کہ میں دو باتوں پر مسلسل حیرت زدہ ہوں۔ ان میں سے ایک اپنے اوپر ستاروں بھرا آسمان ہے تو دوسرا اپنے اندر موجود اخلاقی قانون۔ ضمیر ہمارے اندر فطری طور پر موجود اخلاقی قانون اور رویے کے ادغام کا نام ہے۔ ہمارے اندر پیدائشی طور پر ایک فہم پایا جاتا ہے جو ایمانداری اور انصاف کو سمجھتا ہے درست اور غلط میں امتیاز رکھتا ہے۔ یہ رحمدلی اور سنگدلی، نیکی اور گمراہی، سچ اور جھوٹ کے بارے میں ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ یہ ہمیں بتاتا ہے کہ کیا چیز ہمیں خوب صورت بناتی ہے اور کون سی چیز بات یا عادت ہمیں تباہ کرتی ہے۔ ضمیر ہمارے اندر موجود ایک دھیمی اور چھوٹی سی آواز ہے جو پُرسکون اور پُرامن ہوتی ہے۔ اس کے مقابلے میں انا ہے جو متشدد، جابر، خودسر اور مطلق العنان ہوتی ہے اور اس کی توجہ صرف اپنی ذات کی بقا، مسرت، دوسروں کو نظر انداز کرنے اور خود غرضانہ خواہشات پر مرکوز رہتی ہے۔ یہ بحران کے مواقع پر کام ضرور آتی ہے لیکن فیصلہ کرنے میں اس دانش کا مظاہرہ نہیں کرتی کہ بحران یا خطرہ کتنا شدید ہے۔ اس کے برعکس ضمیر اس امتیاز اور شعور سے مالا مال ہوتا ہے اور خطرے کی شدت کو سمجھتا ہے۔ اس کے پاس جوابی اقدامات کا بہت بڑا ذخیرہ ہوتا ہے۔ اس میں یہ فیصلہ کرنے کی دانش اور تحمل ہوتا ہے کہ کب کیا کرنا ہے جبکہ انا سو نہیں سکتی۔ یہ معمولی باتوں میں الجھ جاتی ہے، حاوی ہونا چاہتی ہے اور انسان کو کم ظرف بنا دیتی ہے۔ اس کے برعکس ضمیر ایثار پسند ہوتا ہے۔ یہ کسی کی ذات یا انا کو اعلیٰ مقاصد، نصب العین یا اصولوں کے لیے قربان کرنے کا یا ماتحت رکھنے کا شعور دیتا ہے۔

مرسلہ: زبیدہ تسنیم۔ مظفر گڑھ

ان کے پاس اونٹ کے بالوں کا ایک پاجامہ (گلیمی ازار) اور اونٹ ہی کے بالوں کا ایک کمبل (گلیمی ردا) موجود تھا۔ دنیا داری سے انہیں بالکل بھی محبت نہ تھی۔ رات کے وقت جو سامان ان کے پاس بچ جاتا اسے صبح ہوتے ہی خیرات کر دیا کرتے تھے۔ اپنے قرب و جوار میں کسی بھی ذی نفس کی بھوک پیاس پر رب کے حضور اپنے مواخذہ سے وہ ہمیشہ خوفزدہ رہتے۔

''شادی تو سنتِ رسول ﷺ ہے اویس! کیا تم اس سنت سے روگردانی کرو گے؟'' بدار آزردہ ہوئیں۔

''ہرگز نہیں ماں میں سنت سے روگردانی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔'' انہوں نے سنجیدگی سے کہا اور والدہ کی پیشانی پر بوسہ دے کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ ''اللہ نے چاہا تو میں یہ سنت بھی ضرور ادا کروں گا۔''

(اس کے بعد تاریخی اوراق اویس قرنیؓ کی شادی یا اولاد کے متعلق بالکل خاموش ہیں۔ مستند مورخین بھی اس بات پر اتفاق کرتے ہیں کہ ان کی ازدواجی زندگی کے معاملات کی کوئی روایت نہیں ملتی)

''آج رات پھر جنگل میں بسر کرو گے اویس!'' بدار نے استفسار کیا۔

''جی ماں!! آج کی رات ہی تو عبادت کا اصل لطف آئے گا۔'' انہوں نے سرشاری سے کہتے ہوئے آسمان کے تھال پر نگاہ دوڑائی جہاں ماہتاب اپنی دودھیا کرنوں سے ہر شے منور کر رہا تھا۔ ٹھنڈی پر کیف صحرائی ہوا اللہ عزوجل تعالیٰ کی حمد و ثناء کی طرف مائل کرتی تھی۔

مجاہدات اور ریاضتوں میں وہ لاثانی تھے۔ عبادات میں مستغرق رہتے۔ وہ ساری رات قیام میں بسر کر دیتے دوسری رات رکوع میں گذارتے تو تیسری رات سجدہ میں بسر کر دیا کرتے تھے۔

جسمانی طور پر وہ کمزور و ناتواں تھے۔ قرب و جوار میں لوگ ان کی اس ریاضت پر اکثر حیرت اور استہزاء سے ایک ہی سوال پوچھتے۔ ''اویس!! ایسی جسمانی حالت میں اتنی طویل راتیں ایک ہی حالت میں کیسے گذار لیتے ہو؟''

''طویل راتیں کہاں ہیں؟ میری شدید تمنا ہے کہ کاش ازل سے ابد تک ایک ہی رات ہوتی جس میں ایک سجدہ کر کے گریہ بسیار کرنے کا موقع مل جاتا افسوس یہ راتیں اس قدر مختصر ہیں کہ میں ایک ہی مرتبہ سبحان ربی الاعلیٰ کہہ پاتا ہوں اور دن طلوع ہو جاتا ہے۔''

اویس قرنیؓ لوگوں سے میل ملاپ سے بہت گریزاں رہتے۔ ہمہ وقت عشق رسول ﷺ کی مستی و بے خودی میں سرشار رہتے۔ ظاہری نمود و نمائش اور ذاتی شہرت سے انہیں چڑ تھی اسی لیے عام طور پر لوگوں سے بہت کم ملا کرتے۔

انہی عادات کی وجہ سے کچھ لوگ انہیں مغرور گردانتے تو کچھ ریاکار کہنے سے بھی نہ چوکتے لیکن اویسؓ کبھی ان باتوں کو خاطر میں نہ لاتے۔ ان کے عشق میں اس قدر شدت اور طاقت تھی کہ دنیاداری ایک بے معنی امر تھی۔

اویسؓ والدہ سے رخصت لینے کے بعد جنگل کی تنہائی اور سناٹے میں عبادت کی لذتوں میں مگن ہو گئے۔

☆......☆

وہ رات بھی گریہ و زاری میں بیتی تھی۔

نماز فجر کی ادائیگی اور درود و وظائف کے بعد وہ معمول کے مطابق والدہ کو ناشتا کروانے کے لیے گھر روانہ ہوئے تو ایک عزیز نے انہیں رستہ میں ہی روک لیا اور پیشانی پر بل لیے ان کے لباس، شدتِ گریہ سے سرخ آنکھوں اور منتشر حالت پر چوٹ کیے بنا نہ رہ سکا۔ ''اویس! تم کن راہوں کے مسافر بن گئے ہو؟ اس دنیا میں ملنے والی نعمتوں کی قدر کرو اور خوشیاں کشید کرنا سیکھو۔''

''ان وقتی خوشیوں اور لذت کے لیے میں آخرت کی سزا کیونکر بھگت پاؤں گا؟ صبح کو اللہ تعالیٰ کی محبت اور شام میں اس کی حمد و ثناء کرنے سے بڑھ کر خوش نصیبی کیا ہو سکتی ہے؟ اس زندگی میں اگلے پل کی کوئی ضمانت نہیں۔ موت اور اس کی یاد کوئی بھی خوشی یاد رہنے نہیں دے سکتی۔ ایک مسلمان کے دل میں سونے چاندی، جاہ و حشمت کی کوئی حیثیت نہیں ہونی چاہیے۔''

''تم لوگوں کے انہی عقائد نے زندگی بے حد مشکل بنا دی ہے۔ شاہی مذہب میں پناہ لے لو سب مشکلات آسان ہو جائیں گی۔ ورنہ انہی چیتھڑوں اور غربت میں قبل از وقت ہی موت سے بغلگیر ہو جاؤ گے۔'' اس نے نخوت سے کہا۔

''موت کا ایک ہی وقت متعین ہے اور کوئی بھی مسلمان دنیاوی مال و دولت اور عیش و عشرت کے لیے توحید کا رستہ ترک نہیں کرے گا۔ ہماری زندگی، موت، روزگار، خوشی، غم، محبت، نفرت اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی تعلیمات سے وابستہ ہیں۔'' اویسؓ نے اپنی مخصوص سادگی سے جواب دیا اور سر جھکائے گھر کی جانب چل دیئے۔

☆......☆

اونچے نیچے پہاڑی ٹیلوں کے وسط میں واقع اس خیمہ بستی میں اداسی کے دبیز بادل چھائے تھے۔

"کیا بات ہے برادر؟ اس قدر افسردہ کیوں ہو؟" بستی کے سردار نے لکڑیوں کا گٹھا تھامے بوجھل قدموں سے چلتے ایک شخص سے دریافت کیا۔

"ایمان کے اس سفر نے زندگی کا مفہوم ہی بدل دیا ہے۔ صلح حدیبیہ کی شرائط ہمارے لیے بہت کڑی ثابت ہو رہی ہیں۔" وہ گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔

"رسول خدا ﷺ کے ہر عمل میں حکمت پوشیدہ ہوتی ہے، ان شرائط میں بھی یقیناً ہمارے لیے کوئی بہتری موجود ہو گی۔" سردار نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ہجری میں کفار مکہ اور مسلمانوں میں طے پانے والے معاہدہ 'صلح حدیبیہ' کی شرائط کی رو سے مکہ مکرمہ کا کوئی بھی نو مسلم یثرب میں پناہ گزین ہونے کا مجاز نہ تھا بصورت دیگر راہ حق کے اس سفر میں یہ نو مسلم افراد قریش کی شرانگیزیوں کا نشانہ بنے رہتے۔ مکہ مکرمہ میں بھی ان کا ناطقہ بند تھا۔ عبادات میں رکاوٹوں کے علاوہ بھی وہ ان گنت ایذا رسانیوں کا شکار تھے۔

ایسے ہی ایک گروہ نے یثرب اور مکہ کے درمیان واقع بیابانی علاقہ میں ایک عارضی بستی قائم کر لی تھی۔ وطن سے دوری، کٹھنائیوں اور مشکلات میں حوصلہ برقرار رکھنا ہر گز آسان ثابت نہیں ہو رہا تھا۔

"یہ زندگی عارضی ہے میرے دوست!!! انہی کڑی آزمائشوں سے سرخروئی کے بعد ہی تو ہمیں وہ جنت دی جائے گی جس کا رب نے ہم سے وعدہ کیا ہے۔" سردار نے اسے ایک بار پھر تشفی دی۔

"قریشی ہمیں ستانے کی روش ترک کیوں نہیں کر دیتے؟"

"خیر و شر کی قوتیں ہمیشہ برسرِ پیکار رہتی ہیں، یہ وقت ضرور تبدیل ہوگا۔" سردار نے مضبوط لہجے میں کہا۔

اسی پل ان پر ایک قیامت ٹوٹ پڑی۔

چند ڈھاٹا پوش افراد برہنہ تلواریں لیے بستی میں در آئے اور ان کے سنبھلنے سے قبل ہی خیموں میں آگ لگا دی۔ جانوروں کی بلبلاہٹ، خواتین اور بچوں کی چیخ و پکار اور ہتھیاروں کی گھن گرج سے کان پڑی آواز سنائی نہ دے رہی تھی۔

چند ہی لمحوں میں اس بستی کا نقشہ تبدیل ہو چکا تھا۔ ہر طرف جلے ہوئے خیموں کی راکھ اور خون میں لت پت لاشیں نظر آ رہی تھیں۔

باقی ماندہ افراد کو بھی ان کے خطرناک ارادے واضح نظر آ رہے تھے۔

"بہت افسوس ہوتا ہے تمہاری حالت دیکھ کر مکہ کی عیش و آرام کی زندگی، آباؤ اجداد کا مذہب ترک کر کے کیا حاصل ہوا؟ یہاں اس بیابان میں تمہیں کون بچانے آئے گا؟" ایک گھڑ سوار نے کہا۔

"تم کبھی نہیں جان پاؤ گے کیونکہ کفر نے تمہاری بصارت چھین لی ہے اگر موت کی گھڑی نہیں آئی تو ہمیں خدا بچائے گا، اس کی کبریائی اور قوت کا تم کبھی بھی احاطہ نہیں کر سکتے۔" سردار نے بے خوفی سے جواب دیا۔

راہزن دیوانہ وار قہقہے لگاتے لوٹ مار میں مشغول ہو گئے۔

☆......☆

خسرو شدید پریشانی میں مبتلا تھا۔

بابویہ کی اس تبدیلی نے اسے شاہی عتاب سے خوفزدہ کر دیا تھا اور وہ متواتر اپنے اس دیرینہ دوست کو 'راہ راست' پر لانے کی کوشش میں مگن رہا۔ یثرب سے پیغمبر ﷺ کا جواب ملنے کے بعد اب وہاں قیام کا بھی کوئی جواز نہ بنتا تھا۔ بابویہ اسے الوداع کہنے یثرب کے سرحدی علاقہ تک ساتھ چلا آیا۔

"باذان تمہیں پاتال کی گہرائیوں سے بھی ڈھونڈ نکالے گا، وہ تبدیلی مذہب کے اس امر کو ہرگز قبول نہیں کرے گا۔" خسرو نے ایک بار پھر اسے سمجھانا چاہا۔

"مجھے قطعی پروا نہیں۔ میں سچ کہتا ہوں یثرب میں بے انتہا سکون ہے۔"

"باذان کو کیا جواب دوں؟" وہ مضطرب تھا۔

"وہ تمہاری صوابدید ہے، میں محمد ﷺ کے مذہب کو دل و جان سے قبول کر چکا ہوں۔" بابویہ نے دوٹوک جواب دیا

اپنے گھوڑے برق رفتاری سے دوڑاتے ہوئے وہ سرحد کے قریب پہنچے تو ایک خونی منظر نے انہیں بری طرح چونکا دیا۔

اونچے نیچے ٹیلوں کے درمیان ایک خیمہ بستی میں میدان جنگ کا سا سماں تھا۔ چند عمر رسیدہ افراد، عورتیں اور کم سن بچے تلوار کی زد میں تھے۔

"انہیں ہماری مدد کی ضرورت ہے خسرو!!" بابویہ نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور برق رفتاری سے مزید قتل و غارت پر آمادہ ان ڈھاٹا پوش افراد پر دھاوا بول دیا۔

ذرا سی دیر میں ہی وہاں نقشہ بدل گیا۔
قریش کے افراد شاہی محل کے تربیت یافتہ افراد کا مقابلہ نہ کرپائے اور پسپا ہوگئے لیکن اس پسپائی میں بھی بابویہ کا پہلو شدید گھائل ہوگیا۔
''یہ سب تمہاری ضد کا انجام ہے میرے دوست!! کاش تم نے یہ فیصلہ لینے کی حماقت نہ کی ہوتی۔'' خسرو نے اسے کہا۔
''یہی میری زندگی کا سب سے بہترین فیصلہ ہے، تم باذان کو کہہ دینا کہ بابویہ بیابان میں وحشی درندوں کا شکار ہوگیا اور جانبر نہ ہوسکا۔'' وہ کراہنے لگا تھا۔
خسرو تاسف سے سر ہلاتا واپس روانہ ہوگیا۔ وہ بخوبی جانتا تھا کہ باذان کے شاطر دماغ اور جہاندیدہ نگاہوں سے اس کا رتی بھر جھوٹ بھی پوشیدہ نہ رہ سکے گا۔ سچائی سے آگاہی یمن میں مسلمانوں کے لیے شاہی عتاب کا ایک نیا سلسلہ بھی شروع کرسکتی تھی۔
مستقبل قریب کی اس مبہم جھلک نے اسے بے اختیار جھرجھرا دیا۔
☆......☆
شاہی محل میں باذان کا طیش عروج پر تھا۔
''بابویہ کی بغاوت ناقابل معافی جرم ہے۔ تم نے اس گستاخی پر اس کا سر کیوں نہ قلم کردیا؟ کاش!! وہ مسلمان ہونے سے قبل وحشی درندوں کا نشانہ بن جاتا۔'' وہ خسرو پر گرجنے لگا۔
خسرو خاموش رہا اور باذان کے اشارہ پر اسے جوابی پیغام تھما دیا۔
رسول خدا ﷺ کے اس جوابی پیغام پر جوں جوں اس کی نظریں پھسلتی گئیں اس کا چہرہ مختلف کیفیات کی آماجگاہ بننے لگا۔ عبارت کے متن نے اس کے دل و دماغ میں ہلچل برپا کردی تھی۔
''خدا کے نام سے جو رحمن اور رحیم ہے۔''
محمد رسول اللہ کی جانب سے حاکم یمن باذان کے نام۔
شہنشاہ ایران خسرو پرویز، دس جمادی الاول، بروز منگل اپنے بیٹے شیرویہ کے ہاتھوں قتل ہوگیا ہے۔''
''ان عربوں کی گستاخیاں اب حد سے بڑھنے لگی ہیں حارث!'' اس نے شاہ یمن کو مخاطب کیا۔
''میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ ہمیں راہ حق کی تلاش کرنی چاہیے۔ یمن میں مسلم طبقہ کی تعداد میں ناقابل یقین حد تک اضافہ ہورہا ہے۔ اس پیغمبر کی تعلیمات میں ایسا کیا سحر ہے کہ بابویہ بھی مسلمان ہوگیا۔ اس نے شاہ یمن کو بھی اپنے مذہب میں آمد کی دعوت دی تھی۔'' حارث پریشانی سے بولا۔
''ہمیں راہ حق کی بجائے راہ حل تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔'' باذان کا لہجہ گمبھیر ہوگیا۔ ''میں ان کی چال ان پر ہی پلٹ دوں گا اور اس مرد عرب کو مجبور کردوں گا کہ وہ ہمیں بے خبر سمجھتے ہوئے اپنے لشکر کے ساتھ یمن پر حملہ کردے۔ اس جنگ میں مسلمانوں کے مٹھی بھر لشکر کا خاتمہ یقینی ہوگا۔ پروردگار خسرو کی شان میں ان گستاخیوں کی سزا ضرور دی جائے گی۔''
''لیکن اس حملہ کے لیے مجبور کیسے کروگے؟'' حارث نے بے یقینی سے دریافت کیا۔
باذان کی مکار آنکھیں اس کے سازشی دماغ میں پنپنے والے نئے منصوبے سے چمکنے لگیں۔
☆......☆
یمن میں مسلم بستیاں شاہی قہر کی زد میں آگئیں۔
مسلح سپاہی اور خصوصی کارندے مسلمانوں کے خلاف ایک خصوصی مہم پر مامور تھے۔ ان کے گھر نذر آتش کیے جانے لگے۔ املاک ضبط کرلی گئیں اور توحید کے نام لیوا افراد کو قیدی بنایا جانے لگا۔
باذان کی ہدایات پر گلی کوچوں میں روز و شب منادی کی جاتی تھی۔ ''محمد (ﷺ) کے دین کو ماننے والے اس سرزمین میں رہنے کے مجاز نہیں ہیں اگر جان اور مال کی امان درکار ہے تو حاکم یمن اور پروردگار خسرو کی اطاعت قبول کرنی ہوگی۔''
مظلوم اور بے بس افراد زنجیروں میں جکڑ کر شاہی قید خانہ میں منتقل کردیے گئے لیکن باذان تاحال اضطراب میں مبتلا تھا۔ اس نے اپنے بااعتماد کارندہ 'ابن اخنس' کو طلب کرلیا۔
''تم یمنی مسلمانوں کی بستیوں اور افراد سے کس حد تک واقف ہو؟''
''اپنے ہاتھ کی لکیروں کی مانند۔ میں ہر شخص کا چہرہ شناس ہوں۔''
''مجھے شاہی کارندوں کی کارکردگی کی مکمل تفصیل بھی درکار ہے۔''
ابن اخنس اکثر و بیشتر باذان کے لیے جاسوسی کے فرائض بھی سرانجام دیا کرتا تھا۔
''وہ مکمل ایمانداری سے یہ فریضہ سرانجام دے رہے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی اقربا پروری کے ناتے کسی مسلمان

کو رعایت نہیں دے گا۔'' اس نے پہلو بدلا۔ وہ اپنے ایک شناسا خاندان کے دو افراد' سلیم اور سلمیٰ' کو رہائی دے چکا تھا۔

''یمن میں کوئی بھی مسلمان ہماری قید سے بچنا نہیں چاہیے۔''

''حکم کی اطاعت ہوگی۔'' اس نے سر جھکایا۔ ''لیکن ایک مجذوب شخص تاحال گرفت میں نہیں آسکا ہے۔''

''مجھے محض اتنا علم ہے کہ اس کا نام اویس قرنیؓ ہے۔ اس کی رہائش عام بستیوں میں نہیں ہے۔ اسی لیے وہ اب تک آزاد ہے'' باذان کے چہرے پر غصیلے تاثرات دیکھ کر اس نے جلدی سے وضاحت دی۔

''اسے جلد از جلد قید خانہ میں منتقل کیا جائے۔ مجھے خدشہ ہے کہ کہیں اس نے جنگل میں عبادت کی آڑ میں مزید باغیوں کو پناہ نہ دے رکھی ہو۔'' باذان نے کہا۔

ابن اخنس نے فوری طور پر اپنے ماتحت افراد کے توسط 'زبیر' نامی گدھابان سے رابطہ قائم کیا۔ زبیر بے انتہا لالچی انسان تھا۔ لکڑیاں کاٹنے کے لیے اکثر جنگل میں اس کی آمدورفت ہوتی تھی لہٰذا اسے مالی منفعت پہنچانے کے بعد اویس قرنیؓ کی رہائشگاہ کا محل وقوع اگلوانے میں بالکل دشواری پیش نہ آئی۔

☆......☆

اگلی صبح جب اویسؓ حسبِ معمول جنگل سے لوٹے تو گھر کے باہر شاہی کارندوں کی موجودگی پر ٹھٹک گئے تھے۔

ابن اخنس کے اشارہ پر سپاہیوں نے انہیں گردن میں طوق پہنا کر پاؤں بھی بیڑیوں میں جکڑ دیے۔ اس قدر جم غفیر کو جنگل کی جانب کسی کی تلاش میں روانہ ہوتے دیکھ کر عوام بھی تجسس کی بدولت ان کے تعاقب میں ہمراہ آگئے تھے۔ وہ ایک مفلس' مجذوب اور بے ضرر نظر آنے والے اس شخص کی گرفتاری پر بہت حیران تھے۔

اویسؓ کی دور اندیش نظریں اس ہجوم میں بھی اپنے گھر کی مخبری کرنے والے فرد کو بھانپ گئی تھیں۔ زبیر بھی اس صورتحال پر بہت پشیمان تھا۔ اس کا بیٹا قیس اکثر اپنے دوست سلیم کے ساتھ اویسؓ سے ملنے جایا کرتا تھا اور وہ دونوں ہی بدار کی شفقت' محبت اور اویسؓ کے جذبہ خدمت سے بہت متاثر تھے۔

تاہم ان سب سے قطع نظر وہ مرد مومن پریشان تھا نہ ہی اپنے عقائد اور عشق رسول ﷺ کی پاداش میں ملنے والی ان آزمائشوں سے خوفزدہ۔ وہ اپنے آقا کے لیے انتہائی تکالیف سہنے میں بھی بہت راحت محسوس کر رہا تھا۔ اس کی تشویش کی اصل وجہ بدار کی ضعیفی اور معذوری تھی۔

قیس اور سلیم کو ایک جانب افسردہ حالت میں کھڑے دیکھ کر وہ محض اتنا ہی کہہ سکا۔ ''سلیم! میری ماں کا خیال رکھنا۔''

ابن اخنس کے جلاد صورت سپاہی انہیں بے رحمی سے گھسیٹتے ہوئے قید خانہ میں لے گئے۔

اس کے بعد ایک طویل مدت کے لیے ان سبھی مسلمانوں کو قید و بند اور ایذا رسانی کے کرب ناک مراحل سے گزارا گیا۔ توحید و رسالت کے خلاف ہرزہ سرائی کرنے پر ناتواں' محبوس اور بے بس قیدی شاہی کارندوں کے ہتھیار' قوت اور محل سے تفویض کردہ اختیارات سے خوفزدہ ہوئے بناء اپنی استطاعت کے بغیر ان پر حملہ کر دیتے تھے۔ انہیں اذیت کی پروا تھی نہ قتل عام کی۔ کئی قیدی اسی پاداش میں زندہ جلا دیے گئے لیکن مسلمانوں کا جذبہ پہلے سے بھی شدید تر ہو گیا تھا۔

حارث اور باذان اس صورتِ حال پر بے حد ذہنی تناؤ کا شکار تھے۔ وہ لاشعوری طور پر اس مٹھی بھر گروہ کے دباؤ میں آنے لگے۔ دربار میں آئے روز ان کے جذبہ کی موت کے ممکنہ طریقوں پر بحث جاری رہتی۔

''میں یہ نکتہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ یہ مسلمان آخر کس مقام پر ٹوٹیں گے؟'' حارث کے چہرے سے پریشانی مترشح تھی۔

''کیا تم نے یثرب میں اپنا قاصد روانہ کیا؟'' باذان نے استفسار کیا۔

حارث کا جواب مثبت تھا۔

''تو اب تک محمد (ﷺ) کا لشکر اپنے پیروکاروں کی رہائی کے لیے یمن کیوں نہیں پہنچا؟ کیا وہ جنگ سے خوفزدہ ہے یا اس کے پاس لشکر نابود ہے؟''

''یثرب میں ہماری فوج سے کئی گنا بہادر اور منظم فوج موجود ہے حاکم یمن!'' حارث نے طنزاً جواب دیا۔ ''اس فوج کو اپنے نبی کی قیادت میں صرف ایک جنگ میں شکست ہوئی ہے۔''

''آخر کون ہے محمد (ﷺ)؟ پیغمبر' سپہ سالار یا کوئی جادوگر؟''

''ایک عام انسان' جو کچھ عرصہ قبل تجارت کے میدان میں اپنی ایمانداری' سچائی' معاملہ فہمی اور فراست کے باعث ہردلعزیز تھا۔''

"ایک ان پڑھ عرب کامیاب تاجر کیسے ثابت ہوا؟ اور پھر پیغمبری کا دعویٰ! کیا اسے اقتدار اور حکمرانی درکار ہے؟"

"نہیں، قریش نے اسے قبائل کی سرداری، مال وزر اور حسین ترین عورتوں سے شادی کی پیشکش بھی کی تھی لیکن اس نے جواب دیا کہ اگر تم میرے ایک ہاتھ پر سورج اور دوسرے ہاتھ پر چاند بھی رکھ دو میں تب بھی اللہ کا نام لینے اور توحید کے رستے پر چلنے کی دعوت دینے سے باز نہیں آؤں گا۔"

"کیا قریش نے بھی اس گروہ کا ناطقہ بند نہیں کیا؟" باذان کے لہجہ میں سوچ اور تفکر کی پرچھائیاں تھیں۔

"قریش نے دو سال تک ان سے سماجی مقاطع کیے رکھا۔ ایک کھال پر معاہدہ لکھنے کے بعد اسے کعبہ کی دیوار پر لٹکا دیا گیا۔ محمد (ﷺ) اور اس کے پیروکاروں کو شعیب ابی طالب نامی گھاٹی میں محصور کرنے کے بعد ہر قسم کی خرید و فروخت ترک کر دی گئی۔ بھوک اور فاقوں سے ان کی ہڈیاں نمایاں ہونے لگیں لیکن توحید کا رستہ ترک نہ کیا۔ دو سال بعد کہا کہ عہد نامہ کو دیمک نے کھا لیا ہے اور پھر علم ہوا کہ ایسا ہی ہوا تھا۔"

"ناممکن، یہ محض جادوگری ہے۔" باذان نے خود کلامی کی اور اپنے محل کے خصوصی قید خانہ کی طرف روانہ ہو گیا۔

تنگ و تاریک سرنگ نما اس قید خانہ میں فضاء محبوس تھی۔ جلے ہوئے گوشت کی چراند اور لہو کی مہک سے دل متلانے لگتا لیکن وہ تجسس اور طیش کی ملی جلی کیفیات میں گھرا ان خارجی عوامل کو نظر انداز کیے محافظوں کے ساتھ اندرونی جانب بڑھ گیا جہاں ایذا رسانی کے لیے ان گنت اوزار موجود تھے۔

مشعل کی روشنی بمشکل یہاں ماحول روشن کیے ہوئے تھی۔ مغربی کونے میں چند مفلوک الحال افراد نماز ادا کرنے میں مصروف تھے۔ انہیں باذان کی آمد کی خبر ہی نہ ہو سکی۔ ابن اخنس نے اشارہ پاتے ہی اس عقوبت خانہ سے ایک خاردار کوڑا اٹھا کر مکمل قوت سے برسانا شروع کر دیا۔ اس کی وحشت و حیوانیت نے کئی ایک نمازیوں کی عبادت کا ارتکاز ختم کر دیا لیکن وہیں ایک شخص ایسا بھی موجود تھا جو اپنے جسم پر بے تحاشا کوڑے کھانے کے باوجود ٹس سے مس نہ ہوا۔

چند ہی لمحوں میں اویس قرنیؓ کا وجود زخم زخم ہو چکا تھا لیکن آتش عشق اب بھی فروزاں تھی۔ باذان اس استقامت اور جذبہ سے گھبرا گیا مگر وہ محافظوں کے سامنے اپنی اس تبدیلی اور کمزوری کا اظہار نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے اویسؓ کو اپنے دربار میں حاضر کرنے کا حکم دے کر واپس پلٹ گیا۔

اس پل اُسے بابویہ کے قلب و روح میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں اور بے بسی کا احساس ہونے لگا تھا۔ وجدان آگاہی دینے لگا تھا کہ یثرب میں اس کی قوت مدافعت کیوں کمزور ہو گئی تھی لیکن انا اور کروفر اب بھی شکست تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔

☆......☆

دودھیا روشنی اس بیابان بستی میں چاندی لٹا رہی تھی۔

دن بھر تھکے ہارے افراد اور مویشی اب اونگھنے لگے تھے۔ فضاء میں خنکی در آئی تھی اس لیے الاؤ روشن کیے محفل جما کر بیٹھنا بہت خوشگوار محسوس ہوتا۔ بابویہ بھی ایک جانب درخت کے تنے سے پشت ٹکائے آسمان کی وسعتوں میں جھانک رہا تھا۔ اس کے زخم اب کافی مندمل ہو گئے تھے۔ خیمہ بستی کے مکینوں نے بھی اس دوران اس کی مہمان نوازی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔

"کس پریشانی میں مبتلا ہو میرے دوست؟ کہیں تمہیں یمن کی یاد تو نہیں ستا رہی؟" سردار نے مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

"وطن کی یاد تو کسی پل بھی دل سے جدا نہیں ہو سکتی۔ کیا تم یہاں آنے کے بعد مکہ کو فراموش کرنے میں کامیاب ہوئے ہو؟" بابویہ نے اس کی نظروں میں جھانکا۔

"ہرگز نہیں، مکہ سے محبت تو میری رگوں میں خون کی طرح دوڑتی ہے لیکن اہل قریش کی ضد اور انا نے وہاں دہشت، بدامنی اور لاقانونیت کا ماحول پیدا کر دیا ہے۔ وہ ہمیں یہاں بھی زک پہنچانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے۔ یمن میں مسلمانوں کی حالت زار کیسی ہے؟"

"امیر باذان کی موجودگی میں وہاں بھی کم و بیش یہی حالات ہیں۔ خسرو پرویز کی خوشامد میں وہ ظلم کی ہر انتہا عبور کر سکتا ہے۔ آج سے قبل مجھے بھی مسلمانوں کے لیے تشویش محسوس نہیں ہوئی۔ ایک سپاہی ہونے کے ناتے میں نے اپنے جذبات پر ہمیشہ قابو رکھا لیکن اب تشویش فکرمندی میں ڈھلنے لگی ہے۔"

"رسول خدا ﷺ نے فرمایا ہے کہ مسلمان ایک جسم کی مانند ہیں۔ جب ایک عضو تکلیف میں مبتلا ہوتا ہے تو پورا جسم اس اذیت کو محسوس کرتا ہے۔" سردار کی بات سن کر بابویہ کے تصور میں ایک بار پھر یثرب میں ہونے والی ملاقات تازہ ہو گئی۔

"اس ظلمت، دہشت اور نفسانفسی میں رسول اللہ

URDU SOFT BOOKS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS

ﷺ کی ذات ہی اُمید کی واحد کرن ہے۔ قریش، یمنی اور خسرو پرویز ان کے لشکر کو چھوٹے چھوٹے تالاب گردانتے ہیں لیکن مجھے علم ہے کہ یہی تالاب ایک دن باہم مل کر طاقتور دریا میں تبدیل ہو جائیں گے جس کا سیلاب روم، شام، ایران، یمن اور مکہ کو اپنے ساتھ بہا لے جائے گا۔" بابویہ نے کہا۔

اسے یمن اور ایران کے شاہی آتش کدے بے نور ہوتے نظر آ رہے تھے۔

☆......☆

اویس قرنیؓ سرتاپا زنجیروں میں جکڑے شاہی دربار میں موجود تھے۔ باذان کے رگ و پے میں اضطراب برپا تھا۔ قید خانہ اور رستے میں اویسؓ کی نمازیں اور دعائیں اس کے لیے خاصے اچنبھے کا باعث تھیں۔

"اسیری میں عبادت تمہارے لیے بے فائدہ رہی ہے۔" وہ اپنے مخصوص پُرنخوت انداز سے بولا۔

"عبادت کبھی بھی بے فائدہ نہیں ہوتی اور میرے آقا ﷺ نے اللہ کی رضا کے لیے عبادت کا حکم دیا ہے۔" اویسؓ نے بےخوفی سے جواب دیا۔

"تمہارے آقا محمد (ﷺ) نے اب تک اپنے پیروکاروں کی رہائی کے لیے یمن پر لشکرکشی کیوں نہیں کی؟"

"وہ ہر کام اللہ کے حکم سے کرتے ہیں اور ان کے ہر عمل میں بہتری و حکمت پوشیدہ ہوتی ہے۔" اویس قرنیؓ کی آنکھیں اپنے محبوب نبی کا ذکر کرتے ہوئے آبدیدہ ہو گئیں۔

"غالباً تم خوفزدہ ہونے لگے ہو۔" باذان محظوظ ہوا۔

"ہرگز نہیں، یہ اشک تو میرے نبی کے دیدار کی طلب میں مچل گئے ہیں۔ ہم اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔"

"کیا تم نے کبھی پیغمبر سے ملاقات کی ہے؟" وہ ششدر تھا۔

اویس قرنیؓ کے آنسوؤں میں مزید تیزی پیدا ہو گئی۔

"تمہارے نبی نے دعویٰ کیا تھا کہ خسرو پرویز کا قتل ہو چکا ہے لیکن تاحال کسی ایرانی قاصد نے ایسے کسی بھی سانحہ کی اطلاع نہیں دی۔"

"میرے آقا ﷺ کا فرمان کبھی باطل نہیں ہو سکتا کیونکہ نبی کبھی جھوٹ نہیں بولتے اور جھوٹا شخص کبھی بھی نبوت کے عہدہ پر فائز نہیں ہوتا۔"

"اگر قاصد نے اس خبر کی تصدیق کر دی تو میں بھی مسلمانوں کو رہائی دے دوں گا ورنہ تمہاری موت لازم ہو گی۔" اس کی جھنجلاہٹ اور اندرونی بےبسی اب عیاں ہونے لگی تھی۔

اسی پل ایک چوبدار کی معیت میں تین اجنبی افراد دربار میں داخل ہوئے۔ گریہ زاری سے ان کی آنکھیں متورم اور چہرے بجھے ہوئے تھے۔ مخصوص پرچم کے ساتھ سیاہ ماتمی لباس دیکھ کر باذان اور حارث کو کسی انہونی کا احساس ہونے لگا۔

"شاہ ایران خسرو پرویز گزشتہ منگل اپنے بیٹے شیرویہ کے ہاتھوں قتل ہو گئے۔ تخت پر قبضہ کے بعد شیرویہ نے عوام پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑ رکھے ہیں۔" قاصدین نے مخصوص انداز میں تعظیم دینے کے بعد روتے ہوئے کہا۔

"محمد (ﷺ) کی پیشگوئی سچ ثابت ہو گئی حاکم یمن، وہ غیب کی باتیں جانتے ہیں، وہ حقیقتاً پیغمبر خدا ہیں۔" حارث ہکلا گیا۔

لیکن باذان کی نظریں سجدہ ریز مفلوک الحال چرواہے پر مرکوز تھیں۔ اس کی اندرونی کشمکش کو بھی ایک بےعنوان قرار نصیب آ گیا۔ محمد ﷺ کی سچائی اور پیغمبری نے اسے قائل کر لیا تھا۔

جلیانوالہ باغ

ایک بار نش بنگالی سندیپ مکھرجی اور ایک سردار جی گوبند سنگھ میں اس بات پر ٹھن گئی کہ پنجاب اور بنگال میں سے کس صوبے نے زیادہ مجاہدین آزادی پیدا کیے ہیں؟ انہوں نے باری باری مجاہدوں کے نام لینے شروع کیے اور طے کیا کہ ہر مجاہد کے نام پر وہ ایک دوسرے کی داڑھی کا ایک بال نوچیں گے۔ بنگالی کھودی "رام بوس" سے شروع ہوا اور سردار جی "بھگت سنگھ" سے۔ دونوں ایک دوسرے کے بال نوچنے لگے۔ ایک وقت آیا جب سردار جی کو احساس ہوا کہ پنجاب کے مجاہدین آزادی کی فہرست تو ختم ہوا چاہتی ہے جب کہ بنگالی کے ارادے بتاتے تھے کہ وہ سو پچاس نام ابھی گنوانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ سردار جی کو خطرے کا شدید احساس ہوا، ان کی عقل نے ان کا بروقت ساتھ دیا اور انہوں نے "جلیانوالہ باغ" کا نعرہ لگاتے ہوئے بنگالی کے سنبھلنے سے پہلے اس کی ساری داڑھی ایک ہی ہلے میں نوچ ڈالی۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS

دل و دماغ پر ازل سے طاری ظلمت کی سیاہی بالآخر چھٹ گئی تھی۔

☆......☆

باذان کی تبدیلی نے یمن کی فضائیں خوشگوار بنادیں۔ رہائی کے بعد اویسؓ کے دل میں ایک بار پھر برسوں سے مچلتی تمنا عود آئی۔ وہ رسول اللہ ﷺ سے ملاقات کے لیے یثرب جانے کے خواہشمند تھے۔ بدارا اپنی نابینا بصارت کے باوجود بیٹے کی اس تڑپ کو محسوس کیے بنا نہ رہ سکیں۔

"جانِ مادر! مجھے تمہاری روانگی سے کوئی اعتراض نہیں، میری زندگی کی سب سے بڑی تمنا بھی پیغمبر خدا ﷺ کا دیدار ہے۔ میں تمہاری بصارت سے انہیں دیکھنا چاہتی ہوں۔"

"لیکن ماں! میں آپ کو تنہا چھوڑ کر بھی نہیں جاسکتا۔"

"میں تنہا نہیں ہوں جانِ مادر! اسلیم، قیس اور سلمٰی میرا خوب خیال رکھتے ہیں۔" انہوں نے بیٹے کو تسلی دی۔

اویسؓ کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ ہی نہ تھا۔ انہوں نے اپنی بساط کے مطابق والدہ کی ضروریات کی بھی چیزیں منظم کرنے کے بعد زادِ سفر باندھ لیا۔ الوداعی ملاقات میں بدارا نے بیٹے کی پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے کہا۔ "تمہیں مجھ سے ایک عہد کرنا ہوگا اویس! یثرب میں صرف آٹھ پہر قیام کرنا اور پھر لوٹ آنا۔ ضعیف ماں کو انتظار کی اذیت میں جتلا نہ کرنا۔"

"آپ کا حکم سر آنکھوں پر ماں!" اویسؓ نے عقیدت و محبت سے جواب دیا اور روانہ ہوگئے۔

سینکڑوں میل پر مشتمل یمن سے یثرب کا فاصلہ بے حد کٹھن تھا۔ تپتے ہوئے صحرائی علاقوں کو پیادہ عبور کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا لیکن عشقِ رسول ﷺ کی تڑپ اور جذبات کی حدت نے انہیں ہر چیز سے بیگانہ کردیا۔ اس طویل مسافت نے آبلہ پائی اور نقاہت میں کئی گنا اضافہ کردیا تھا لیکن وہ صرف نماز کی ادائیگی کے لیے چند گھڑی قیام کرتے اور ایک بار پھر نئے جذبے سے اپنی منزل کی طرف بڑھ جاتے۔

پیدل اور مختلف قافلوں کے ساتھ سفر کرتے جب وہ یثرب پہنچے تو ان کی جلد سورج کی بے رحم تپش سے جھلس کر اپنی اصل رنگت کھو چکی تھی۔ گلی کوچوں میں بھٹکتے رسول اللہ ﷺ کے بارے میں دریافت کرتے وہ بالآخر حجرۂ مبارک تک پہنچ گئے۔ اپنے وجود کی لرزش اور اشتیاق پر قابو پاتے وفورِ جوش سے اب وہ ہلکان ہونے لگے تھے۔ آنسو ایک پل بھی آنکھوں سے جدا ہونے کے لیے تیار ہی نہ تھے۔

حجرۂ مبارک میں حضرت عائشہؓ موجود تھیں۔ در محبوب پر سوالی کی طرح کھڑے اس لاچار اور آزردہ درویش کو اندرونی جانب سے جب یہ خبر ملی کہ نبی کریم ﷺ کہیں باہر تشریف لے جاچکے ہیں اور واپسی کے بارے میں بھی کوئی اطلاع نہیں تو ان کا دل کسی نے مٹھی میں بھینچ لیا۔ رگیں چٹخنے لگیں اور اعصاب منتشر ہوگئے۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بمشکل اتنا ہی کہہ سکے۔ "میرے آقا ﷺ جب واپس تشریف لائیں تو ان کی خدمتِ اقدس میں میرا فدویانہ سلام عرض کردیجیے گا۔"

"اگر آپ مناسب سمجھیں تو مسجد نبوی میں انتظار کر لیجیے۔" اندر سے ایک آواز آئی۔

"میں نے بوقتِ رخصت اپنی والدہ سے عہد کیا تھا کہ آٹھ پہر سے زائد یثرب میں قیام نہیں کروں گا، پہلے عشق نبھانے آیا تھا اب قول نبھانے کے لیے لوٹنا ضروری ہے۔" وہ زخمی لہجے میں گویا ہوئے۔

اویسؓ کی افسردگی اور تڑپ ناقابلِ بیان تھی۔ وہ اپنی والدہ سے کیے گئے عہد کی بدولت تشنہ لب واپس لوٹے تو قدم بھاری ہورہے تھے۔ نگاہوں میں حسرت سموئے وہ اپنے اردگرد گلی کوچوں کو نہارتے رہے۔ مسجد نبوی ﷺ کے منبر اور در و دیوار میں ان کی موجودگی کی مہک محسوس کرکے اویسؓ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ انہیں وہاں موجود بے جان اشیاء کے مقدر پر بھی رشک آرہا تھا۔

بوجھل دل اور آنسوؤں کے ساتھ انہوں نے بمشکل اس مقدس دیار سے جدائی کے لیے اپنے قلب و روح کو آمادہ کیا۔ ستم ظریفی تو یہ تھی کہ اس جدائی میں وصل کا ایک بھی لمحہ نصیب نہیں ہوپایا تھا۔

اویس قرنیؓ کی واپسی کے کچھ دیر بعد رسول خدا ﷺ تشریف لائے تو انہیں ایک نور اور خوشبو محسوس ہونے لگی۔ حجرۂ مبارک میں داخل ہوکر حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے دریافت کیا۔ "آج یہ نور کیسا ہے؟ کیا کوئی مہمان آیا تھا؟"

"یا رسول اللہ ﷺ! یمن سے ایک شخص آپ سے ملنے آیا تھا۔ اس کا حلیہ چرواہوں کی مانند تھا۔ جب اسے آپ ﷺ کی غیر موجودگی کا علم ہوا تو اسی پل لوٹ گیا۔"

"کیا آپ جانتی ہیں وہ کون تھا؟" رسول پاک ﷺ کے لہجے میں بے پناہ محبت تھی۔

"اللہ اور اس کا رسول ﷺ بہتر جانتے ہیں!"

"وہ اویس قرنیؓ تھا۔ اس کی ماں بہت ضعیفہ اور نابینا

ہے، یہ وہ آدمی ہے، جس کے لیے اللہ اور اس کے رسولؐ کے سوا کچھ بھی محبوب نہیں اور اللہ بھی اس سے بہت محبت کرتا ہے۔"

حضرت عائشہؓ کو ان کی قسمت اور عشقِ کامل پر بہت رشک محسوس ہوا اور فرمایا۔ "وہ شخص کس قدر بلند مرتبہ ہوگا جس کے زہد و تقویٰ، محبت اور عبادات کے معترف اللہ اور اس کے رسول ﷺ بھی ہیں۔"

☆......☆

یمن واپسی کے بعد اویس قرنیؓ کی کم گوئی، زہد و تقویٰ اور گریہ زاری میں مزید شدت پیدا ہو گئی۔ مجذوبیت اور درویشی بھی سوا تھی۔

ایک مرتبہ کوڑے کے ڈھیر سے پھٹے پرانے کپڑوں کی چیتھڑے تلاش کرتے ہوئے کسی سگ نے ان پر بھونکنا شروع کر دیا۔ وہ اس سگ سے مخاطب ہوئے اور فرمایا۔ "کیوں بھونکتا ہے؟ جو کچھ تیرے پاس ہے تو کھا، جو کچھ میرے پاس ہے میں کھاؤں گا اگر میں پل صراط سے خیریت کے ساتھ گزر گیا تو پھر میں تجھ سے بہتر ورنہ میں تجھ سے بھی بدتر ہوں۔"

عبادات اور جنگل میں شب بسری کے علاوہ بدار کی دل و جان سے خدمات کا معمول بھی برقرار تھا۔ وقت خاموشی سے دبے پاؤں بیتتا رہا۔ حاکمِ یمن امیر باذان کے قبولِ اسلام نے یمن میں قدرے امن و آشتی کا ماحول پیدا کیا تو دوسری جانب سرزمین حجاز بھی بہت بڑی تبدیلیوں کی زد میں تھی۔

8 ہجری میں فرزندانِ اسلام نے اپنے آقا ﷺ کی قیادت میں مکہ فتح کر کے پورے عرب میں اپنی دھاک بٹھا دی۔ خانہ خدا کو بتوں سے پاک کر دیا گیا اور مکہ میں اسلامی حکومت قائم ہو گئی۔ حق آ گیا، باطل مٹ گیا، بے شک باطل مٹنے ہی والا ہے۔

معاملات کی درستگی، دیگر ریاستوں کو دعوت اسلام دینے اور حج کی ادائیگی کے بعد بالآخر وہ گھڑی بھی آن پہنچی جب رسول اللہ ﷺ بھی داعیٔ اجل کو لبیک کہہ گئے۔ اویس قرنیؓ کے دکھ اور کرب کی کوئی حد نہ تھی۔ پیغمبر خدا ﷺ کے وصال کے بعد بدار بھی سفرِ آخرت پر روانہ ہو گئیں۔

اویس قرنیؓ کی زندگی محض ذکرِ الٰہی کے لیے وقف ہو گئی۔ وہ اپنی باقی ماندہ زندگی تنہائی اور گوشہ نشینی میں بسر کر دینا چاہتے تھے لیکن اس حقیقت سے بے خبر تھے کہ ان کی رگوں میں دوڑتا عشقِ رسول ﷺ عرش پر مقبولیت کا درجہ حاصل کر چکا ہے اور مستقبل قریب میں جید صحابۂ رسول خدا ﷺ سے محبت خلوص اور عشق کی طویل مسافت کی داستان سن کر ان کی تلاش کا سلسلہ جاری کر دیں گے۔

☆......☆

روایات سے علم ہوتا ہے کہ نبی آخرالزماں ﷺ نے اپنے وصال سے قبل صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو وصیت فرمائی کہ "میرا جبہ مبارک اویس قرنیؓ کے پاس لے جانا اور امت کے لیے دعا طلب کرنا کیونکہ اویس کی دعا میری امت کے لیے مقبول ہوگی۔"

یہ ایک ایسی فضیلت تھی جس نے بھی صحابہ کرامؓ کو رشک میں مبتلا کر دیا۔ ان کی تلاش بے حد کٹھن مرحلہ ثابت ہوئی اور بالآخر حضرت عمرؓ نے ایک راہ ڈھونڈ نکالی تاہم کامیابی کئی سال بعد نصیب ہوئی۔

حج کے موقع پر خطبہ مسنونہ کے بعد حضرت عمر فاروقؓ نے حاضرین سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔ "تم میں سے یمن کے باشندے کون ہیں؟"

چند افراد نے لبیک کہا تو آپؓ نے ایک بار پھر فرمایا۔ "قرن کا رہائشی کون ہے؟"

اس پر ایک شخص کھڑا ہو گیا۔ آپؓ نے اس شخص سے اویس قرنیؓ کے بارے میں دریافت کیا تو اس نے جواب دیا۔ "یا امیر المومنینؓ!! وہ میرا بھتیجا ہے۔ (بعض روایات میں چچازاد بھائی مذکور ہے) اس کا مرتبہ ایسا ہرگز نہیں کہ آپؓ اسے یاد فرمائیں۔ وہ آبادیوں میں رہائش سے گریز کرتا ہے۔ خوشی اور غم سے بے نیاز ہے۔ دن کو اونٹ چراتا ہے اور رات کو خشک روٹی با مجبوری کھا لیتا ہے۔ بچے اسے ستاتے ہیں اور بڑے اس سے نفرت کرتے ہیں۔ جب لوگ ہنستے ہیں تو وہ روتا ہے اور جب لوگ روتے ہیں تو وہ ہنستا ہے۔ وہ ایک دیوانہ اور مجنوں ہے۔"

حضرت عمر فاروقؓ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور فرمایا۔ "مجھے اسی شخص کی تلاش ہے۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کو اکثر فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اس شخص کی دعا کے باعث اللہ تعالیٰ روزِ قیامت امت مسلمہ کے گناہ گاروں میں سے قبیلہ ربیعہ اور قبیلہ معنر کی بھیڑ بکریوں کے بالوں کی تعداد کے برابر بخش دے گا۔"

(بنی ربیعہ اور بنی معنر دو ایسے قبائل تھے جن کے پاس ان گنت بھیڑ بکریاں تھیں۔ یہ مویشی اپنے بالوں کی کثرت کی بدولت عرب میں مقبول تھے)

اویس قرنیؓ کا سراغ ملتے ہی حضرت عمر فاروقؓ نے داماد رسول ﷺ حضرت علیؓ کو ہمراہ لیا اور جبہ مبارک کی امانت

ان کے حوالے کرنے کے لیے روانہ ہوگئے۔ مزید تلاش بسیار کے بعد علم ہوا۔ ان دنوں وہ 'وادی عرنہ' میں شتربانی کرتے ہیں۔

دونوں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم منزلِ مقصود تک پہنچے تو اویس ؓ کیکر کے درخت تلے نماز کی ادائیگی میں مصروف تھے۔ نماز سے فراغت ملی تو انہوں نے آپ ؓ سے ہمکلام ہوتے ہوئے تعارف کروانے کی درخواست کی۔

"میں شتربان ہوں اور قوم کا مزدور ہوں۔" وہ بے نیازی سے گویا ہوئے۔

"آپ کا اسم مبارک کیا ہے؟"

"عبداللہ!" گمنامی اور گوشہ نشینی کے دلدادہ اویس ؓ نے اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

"زمین و آسمان کے مابین ہر چیز اللہ تعالیٰ ہی کی بندگی میں مصروف ہے۔ ہم آپ کا وہ نام جاننا چاہتے ہیں جو آپ کی والدہ ماجدہ نے رکھا تھا۔" حضرت علی ؓ نے فرمایا۔

"میرا نام اویس ہے۔" وہ سر جھکا کر بولے۔

صحابہ کرام نے اپنے یقین کو مزید تقویت دینے کے لیے ان کے جسم پر موجود برص کا ایک نشان دیکھا اور انہیں نبی پاک ﷺ کی وصیت سے آگاہ کردیا۔ اویس قرنی ؓ کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ اپنی محبت، خلوص اور عشق کی یہ پذیرائی ان کے لیے ناقابلِ تصور تھی۔

جبہ مبارک تھامنے کے بعد وہ ایک جانب چلے گئے اور اسے اپنے سامنے رکھ کر اللہ تبارک و تعالیٰ کے حضور سربسجود... ہونے کے بعد گڑگڑاتے ہوئے عرض کرنے لگے۔ "یا اللہ! تیرے محبوب نبی ﷺ کا یہ جبہ میں اس وقت تک زیب تن نہ کروں گا جب تک تُو امت محمد ﷺ کی بخشش نہ فرمادے۔"

وہ سجدے میں سر جھکائے انہی مناجات میں مصروف رہے۔ بدن ساکت تھا اور ارتکازِ دعا کی جانب مبذول۔ ان کے جسم میں جنبش نہ پاکر حضرت عمر ؓ کو گمان ہوا کہ کہیں آپ ؓ وصال نہ فرما گئے ہوں۔

وہ اویس قرنی ؓ کے نزدیک تشریف لے گئے۔ انہوں نے سجدہ سے سر اٹھایا اور فرمایا۔ "اگر آپ تشریف نہ لاتے تو میں اس وقت تک سجدہ سے اپنا سر نہ اٹھاتا جب تک مجھے امت محمد ﷺ کی بخشش کی نوید نہ مل جاتی۔"

اویس ؓ کے عشق کی شدت اور خلوص نے نبی پاک ﷺ کے ان دیرینہ ساتھیوں کو اس قدر متاثر کیا کہ حضرت عمر ؓ کے دل میں خلافت سے دستبرداری کی خواہش پیدا ہوگئی اور وہ بے اختیار پکار اٹھے:

"کیا کوئی ایسا شخص ہے جو روٹی کے ایک ٹکڑے کے عوض مجھ سے خلافت خرید لے۔"

"امیر المومنین ؓ!! ایسا سودا تو کوئی احمق ہی کر سکتا ہے۔ آپ کو خلافت فروخت کرنے کی بجائے اٹھا کر پھینک دینی چاہیے پھر جس کا دل چاہے اسے اٹھالے۔" اویس قرنی ؓ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا تو ان کی آنکھیں نم ہوگئیں۔

گفتگو کے دوران دونوں حضرات ؓ نے انہیں رسول اللہ ﷺ کے چند ارشادات کی بابت بتایا تو اویس قرنی ؓ کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ ہی نہ تھا۔

"میرے لیے اس سے بڑھ کر خوش نصیبی کیا ہوگی کہ میرے محبوب نبی ﷺ میرا ذکر فرماتے تھے۔" ان کی آواز کپکپانے لگی۔

"جی ہاں! انہوں نے فرمایا کہ تابعین میں سب سے بہتر ایک شخص ہے جس کا نام اویس ؓ ہے۔ اس کا تعلق قبیلہ مراد سے ہے۔ اس کی ایک ضعیفہ ماں ہے، اس کے جسم پر برص کے نشان ہیں جو سب مٹ چکے ہیں۔ صرف درہم کے برابر ایک نشان باقی ہے۔ وہ اپنی ماں کی بڑی خدمت کرتا ہے۔ جب وہ اللہ تعالیٰ کی قسم کھاتا ہے تو اللہ اسے پوری فرماتا ہے۔ تم جب اس سے ملو تو اسے کہنا کہ امت کے حق میں دعائے مغفرت کرے۔" حضرت عمر ؓ نے بتایا۔

"نبی کریم ﷺ اکثر فرماتے تھے، تابعین میں میرا بہترین دوست اویس قرنی ؓ ہے۔" حضرت علی ؓ نے مسکراتے ہوئے کہا تو اویس ؓ کی حالت دیدنی تھی۔

ان کے عشق کی یہ پذیرائی گویا پوری زندگی کا حاصل تھی۔

اویس قرنی ؓ کی عسرت اور حالات دیکھ کر امیر المومنین کے دل میں آپ ؓ کی مالی مدد کرنے کی خواہش پیدا ہوئی جس کے اظہار پر اویس ؓ نے مؤدبانہ عرض کی۔ "ہمارا کوئی بھی باہمی معاہدہ نہیں ہے۔ غالباً آج کے بعد ہماری ملاقات بھی نہ ہو پائے گی۔ میں زائد نفقہ اور لباس لے کر کیا کروں گا؟ میرے پاس دو درہم موجود ہیں جو ان اونٹوں کو چرانے کا معاوضہ ہے۔ اگر آپ اس بات کی ضمانت دیں کہ ان کے خرچ ہونے سے قبل میری موت نہیں آئے گی تو مجھے امداد لینے میں قطعی اعتراض نہیں ورنہ میرے لیے دو درہم ہی کافی ہیں۔ میں نے اپنا ہاتھ اس کائنات کے عظیم ترین حاجت روا کو تھما رکھا ہے اور کسی بھی شہرت و خصوصیت کی بجائے ذکرِ الٰہی میں ہی زندگی

بسر کر دینا چاہتا ہوں۔''

امیر المومنین اور شیر خدا اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکے اور آبدیدہ ہو گئے۔

''خلیفۃ المسلمین!! ہمارے سامنے ایک سخت اور ناقابل عبور گھاٹی ہے سوائے اس شخص کے جس کا شکم فاقہ زدہ رہے اور بدن سوکھ کر کانٹا ہو جائے۔''

''آپ دوبارہ کبھی مدینہ منورہ کیوں نہیں آئے؟'' حضرت عمرؓ نے استفسار کیا۔

''محبوب خدا ﷺ کے وصال کے بعد روضۂ اقدس پر حاضری کے لیے میں نے سفر مدینہ کا قصد کیا تھا لیکن سرحد ہی سے پلٹ گیا۔ جس مقدس سرزمین میں میرے نبی ﷺ کا جسد اطہر مدفن ہے اس زمین پر قدم رکھنے اور چلنے کی جسارت کی تاب مجھ میں نہ تھی۔''

خاتم نبوت حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے مقرب ترین صحابہ کرام عشق کے اس پیکر کو دیکھ کر ہر لحظہ دنگ ہو رہے تھے۔

☆......☆

رسول خدا ﷺ کے ارشادات سے اویس قرنیؓ کا ذکر سن کر کئی ایک صحابہؓ کے دل میں ان سے ملاقات کی خواہش جاگزیں ہوئی تھی لیکن ان کی گمنامی ہی اس سلسلہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بنتی رہی۔

روایات کے مطابق حضرت ہرم بن حیانؓ بھی اس عاشق رسول ﷺ کی تلاش میں یمن، کوفہ اور بصرہ کی خاک چھانتے رہے اور بالآخر دریائے فرات کے کنارہ ایک ناتواں شخص کو حضرت محمد ﷺ کے خرقہ مبارک میں ملبوس وضو کرتے دیکھ کر اپنے گوہر مقصود کی شناخت کر لی۔

حضرت ہرمؓ نے آگے بڑھ کر اپنا تعارف کروایا۔ ان کی کمزوری و نقاہت دیکھ کر صحابی رسول ﷺ کے دل پر رقت طاری ہوگئی اور فرمایا۔ ''اگر آپؓ اجازت دیں تو میں چند لمحات آپ کی صحبت میں بسر کرنا چاہتا ہوں۔''

''اللہ عزوجل و تعالیٰ کے ذکر میں گذارے گئے لمحات کا کوئی نعم البدل نہیں ہوتا۔'' اویسؓ بے نیازی سے گویا ہوئے۔

''میں آسودگی کے حصول کے لیے آپؓ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔''

''اللہ تبارک و تعالیٰ سے محبت ہی آسودگی کی اصل روح ہے عزیزم! اسے کسی بھی انسان میں تلاش نہیں کیا جا سکتا۔''

اویس قرنیؓ کی سادہ و بے نیاز گفتگو ان کے دل و دماغ کو منور کر رہی تھی۔ ان کے اصرار پر باہم گذارے گئے مختصر وقت میں وہ حضرت علیؓ اور حضرت عمرؓ کا تذکرہ ہی کرتے رہے۔ حضرت ہرمؓ نے ان سے حدیث بیان کرنے کی التجا کی تو اویسؓ کا کرب دوچند ہو گیا اور وہ دلگرفتہ لہجہ میں فرمانے لگے۔ ''میں کبھی بھی سرکار دو عالم ﷺ کی صحبت سے مستفید نہ ہو سکا۔ ہاں البتہ آپ ﷺ کے مقربین سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا تو چند احادیث کی منتقلی عمل میں آسکی۔ میں ایک لاچار اور گناہ گار انسان ہوں۔ محدثؒ، مفتی یا قاضی کے رتبہ تک رسائی میری بساط کہاں؟''

وقت رخصت حضرت ہرمؓ نے اپنے مستقبل کے سفر کی بابت رہنمائی طلب کی تو انہوں نے ملک شام کی طرف کوچ کرنے کا عندیہ دیا۔

''میری گذر بسر کا ذریعہ کیا ہوگا محترم؟'' انہوں نے اپنی الجھن بیان کی۔

''میرے دوست!! وہ دل ہلاکت میں مبتلا ہوں گے جنہیں اللہ تعالیٰ پر توکل نہیں اور جو شکوک میں مبتلا ہو گئے، ایسے دلوں کو نصیحت کرنا بھی بے سود ہے۔'' اویسؓ نے دلگیری سے فرمایا اور انتہائی محبت و عاجزی سے انہیں رخصت کر دیا۔

حضرت اویس قرنیؓ سے ملاقات کی خصوصی کوششیں کرنے والے اصحاب میں حضرت اسیر بن جابرؓ بھی شامل تھے۔ ان کی بیان کردہ روایات کے مطابق اللہ تعالیٰ نے اویسؓ کو خصوصی فضل و کرم عطا کر رکھا تھا۔ وہ ملاقات کے لیے آنے والے افراد کے دلی حالات سے آگاہ ہو جاتے تھے اور اکثر فرماتے تھے۔

''سمجھدار مومن، ناسمجھ مومن اور منافق کی مثال درخت اور بارش کی طرح ہے۔ سرسبز و شاداب درخت پر اگر پانی برستا ہے تو اس کی تراوٹ، شادابی اور حسن و خوبی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس اگر شاداب لیکن بنجر درخت پر برسے تو اس کے پتوں میں ہریالی پیدا ہو جاتی ہے لیکن اگر خشک گھاس اور کمزور شاخوں پر برسے تو اسے توڑ پھوڑ کر تباہ کر دیتا ہے۔''

اصحاب کی مسلسل آمد کے بعد وہ ایک بار پھر گوشہ نشین ہو گئے اور ایک طویل عرصہ بعد 37 ہجری میں جنگ صفین کے موقع پر منظر عام پر آئے۔

☆......☆

جنگ صفین خلیفہ چہارم حضرت علیؓ اور شام کے گورنر حضرت امیر معاویہ بن ابی سفیانؓ کے مابین دریائے فرات کے کنارے اس مقام پر لڑی گئی جو اب ملک شام میں شامل

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

ہے اور 'الرقہ' کہلاتا ہے۔

اس موقع پر حضرت عبداللہ بن عباسؓ جب امیر المومنین حضرت علیؓ کی خدمت میں پہنچے تو ان کے پاس کوفہ و اطراف کے لشکر اکٹھے ہوتے ہوئے دیکھا۔ ایک روز حضرت علیؓ نے فرمایا۔ ''میرے پاس آج بیس لشکر جمع ہو گئے ہیں اور ہر لشکر میں ایک ایک ہزار افراد ہیں۔''

ان کی اس بات پر عبداللہ بن عباسؓ کو بہت حیرانی ہوئی جسے بھانپتے ہوئے انہوں نے حکم دیا کہ جنگل میں دو نیزے گاڑ دیئے جائیں اور جو شخص خلیفہ کے لشکر میں شمولیت کا خواہشمند ہو وہ ان نیزوں کے درمیان سے گذرے۔

چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

اس کے بعد تمام لشکروں کی گنتی کی گئی۔ مغرب کے وقت تک صرف ایک سپاہی کی کمی رہ گئی تھی۔ لشکر کے کماندار نے آپؓ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''یا امیر المومنین!! یہ آخری شخص کون ہوگا؟''

حضرت علی مرتضیٰؓ نے فرمایا۔ ''یہ آخری شخص ہی مرد کامل ہوگا اور اس کی آمد سے تعداد مکمل ہو جائے گی۔''

امیر کی بات سنتے ہی سب کے تجسس میں اضافہ ہو گیا۔ کچھ ہی دیر گذری تھی کہ ایک جانب سے عمر رسیدہ شخص پاپیادہ آتا ہوا دکھائی دیا۔ اس کی جسامت کمزور تھی لیکن بشرے سے وقار اور دبدبہ جھلکتا تھا۔ چہرہ طویل مسافت کی وجہ سے گرد آلود تھا۔ کچھ افراد نے آگے بڑھ کر انہیں کمزوری و تھکاوٹ کی بدولت سواری کی پیشکش کی لیکن نو وارد نے نرمی اور شائستگی سے منع کرتے ہوئے کہا۔ ''امیر المومنین حضرت علیؓ میرے لیے بے حد معتبر ہیں۔ داماد رسول ﷺ کی شان یہی ہے کہ میں خود آگے بڑھ کر ان کی قدم بوسی کروں۔''

خلیفۃ المسلمین بھی نو وارد جناب اویس قرنیؓ کے مقام اور مرتبہ سے آشنا تھے۔ انہوں نے اپنے خیمہ سے نکل کر ان کا استقبال کیا۔

جنگ کا آغاز بے حد شدید تھا مگر دونوں گروہوں کے مابین فتح و شکست کا فیصلہ نہ ہو پایا۔ 8 صفر 37 ہجری کو بروز جمعرات دونوں اطراف کے لشکر آخری اور فیصلہ کن معرکہ کے لیے تیار تھے۔ بدھ اور جمعرات کی درمیانی شب جنگی تیاریاں عروج پر تھیں۔

اگلے روز نماز فجر کے بعد امیر المومنین نے اپنی سپاہ کے ساتھ قلب میں رہتے ہوئے شامیوں پر حملہ کیا۔ اس لشکر میں کوفہ و بصرہ کے قبائل کے علاوہ انصار، بنو خزاعہ اور بنو کنانہ بھی شامل تھے۔ میمنہ (دائیں جانب متعین کردہ لشکر) کی کمان حضرت عبداللہ بن بدیل بن ورقاء خزاعیؓ کے سپرد تھی اور میسرہ (بائیں جانب متعین لشکر) کے کماندار حضرت عبداللہؓ تھے۔

دوسری جانب حضرت امیر معاویہؓ نے بھی اپنے لشکر سے موت پر بیعت لی تھی۔ اس سپاہ میں میمنہ فوج حبیب بن مسلمہ اور میسرہ حضرت عبیداللہ بن عمرؓ کے سپرد تھا۔ دونوں ہی اطراف میں گھمسان کا رن تھا۔ نماز عصر تک سینکڑوں جانباز نہایت دلیری سے لڑتے ہوئے داعی اجل کو لبیک کہہ گئے۔

صبح سے شام تک میمنہ و میسرہ میں جنگ جاری رہی۔ اس موقع پر قلب میں تعینات فوج نے بھی آگے بڑھ کر بھرپور حملے کیے لیکن یہ جنگ کسی بھی نتیجہ تک منتج نہ ہو سکی۔

حضرت اویس قرنیؓ ایک گمنام مجاہد کی طرح اس لڑائی میں شریک ہوئے۔ ایک روز قبل دریائے فرات پر وضو کرتے ہوئے انہیں جنگ کے نقارہ کی آواز سنائی دی تھی۔ استفسار پر علم ہوا کہ امیر المومنین حضرت علیؓ کا لشکر جنگ کے لیے موجود ہے۔ محبوب خدا ﷺ کے داماد اور مقرب ساتھی کے لیے اویس قرنیؓ کے دل میں بے بہا محبت موجزن تھی۔ وہ اپنی ناتواں ذات سے انہیں تقویت دینا چاہتے تھے۔

اویسؓ تربیت یافتہ سپاہی نہیں تھے مگر اپنے جذبات اور عشق کی قوت سے وہ جوانمردی سے لڑتے رہے۔ اس موقع پر بڑھاپا آڑے آیا نہ ہی تربیتی محرومی۔ نظروں کے سامنے ابدی منزل اور دل میں عشق رسول ﷺ موجزن تھا۔

لڑائی کے دوران ان کے جسم پر چالیس سے زائد گھاؤ لگ چکے تھے۔ قوت برداشت اپنے آخری پڑاؤ تک پہنچی تو لبوں پر آلوہی مسکراہٹ لیے وہ بے دم ہو کر گر گئے۔ دھندلاتی بصارت میں مدینہ منورہ کے مقدس مناظر اور رسول خدا ﷺ کا تصور ہلکورے لے رہا تھا۔

یمن کی صحرائی وادیوں سے طلوع ہونے والا ماہتاب عشق کی منزلیں عبور کرتا خاموشی سے جام شہادت نوش فرما کر اپنے آخری سفر پر روانہ ہو گیا۔

ماخذات:

۱:طبقات ابن سعد......۲:سیرت حضرت اویس قرنیؓ از محمد الیاس عادل......
۳:عاشق رسول ﷺ:حضرت اویس قرنیؓ از پیر سید ارتضیٰ علی کرمانی......۴:وکی پیڈیا...... ۵:پیام ٹی وی

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

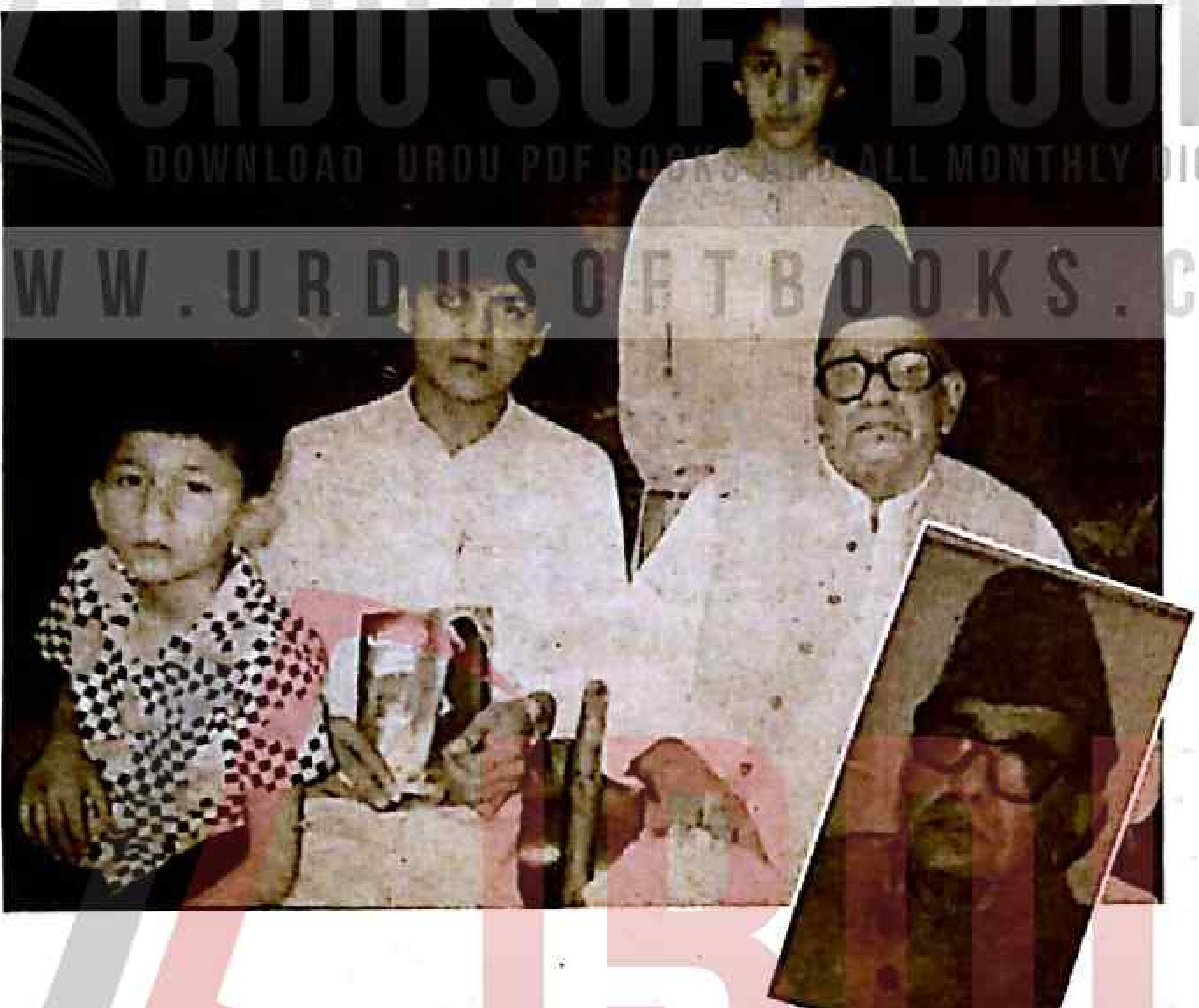

ہوائے حجاز

وسیم بن اشرف

اس نے ایسے دور میں ہوش سنبھالا جب مسلمانوں کو غیر مسلم حقارت کی نظر سے دیکھ رہے تھے اور یہی تعصب اسے مہمیز کررہا تھا۔ وہ سوچنے پر مجبور تھا کہ اب یہاں گزارہ مشکل ہے۔ ان بنیوں کے چنگل سے نکلنا ضروری ہے مگر وہ کوئی سیاست داں تو تھا نہیں کہ لوگوں کو جگانے کے لیے نکل پڑتا، اس کے ہاتھ میں قلم تھا سو اس نے قلمی جہاد شروع کردیا۔

اس قلمکار کا ذکرِ خاص جس کے ناولز ایمان تازہ کردیتے ہیں

مشرقی پنجاب کا ضلع گورداس پور کئی معنوں میں اہمیت کا حامل ہے۔ اسی کے نزدیک دھاریوال ہے اس سے متصل ایک گاؤں سوجان پور ہے۔ محکمہ ماہی پروری کے انسپکٹر چودھری محمد ابراہیم اسی گاؤں میں رہتے تھے۔ ان کے ہاں 19 مئی 1914ء کو ایک بچے کی پیدائش ہوئی۔ نام محمد شریف رکھا گیا، وہ تین بہنوں کے بعد پیدا ہوا تھا۔ ایک بہن تو اس کی پیدائش سے قبل ہی وفات پا گئی تھی، جو اکثر کہا کرتی تھی ”میرا بھائی آئے گا“ لیکن جب وہ آیا تو خود نہ رہی۔

Download These Beautiful PDF Books

Click on Titles to Download

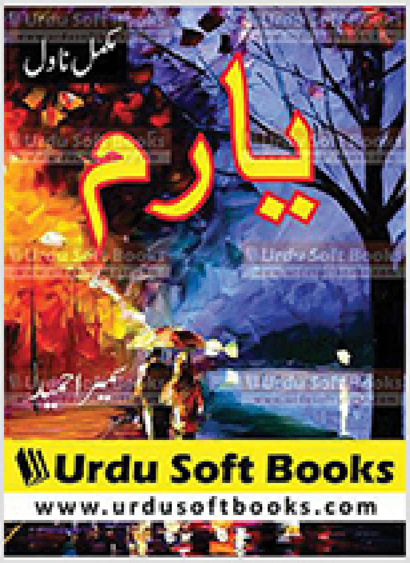

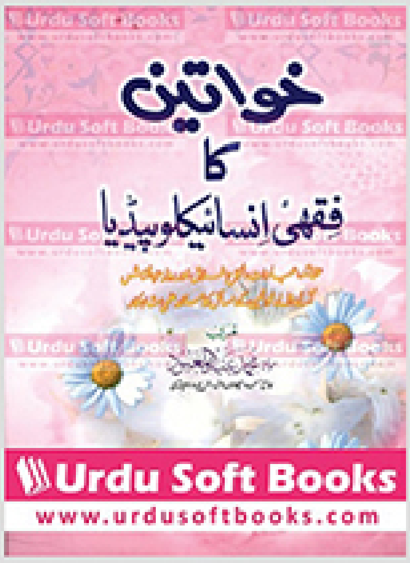

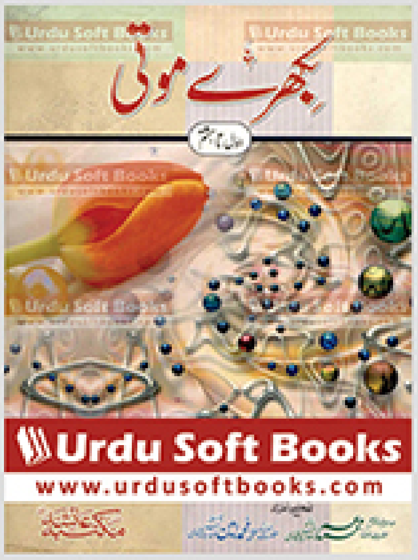

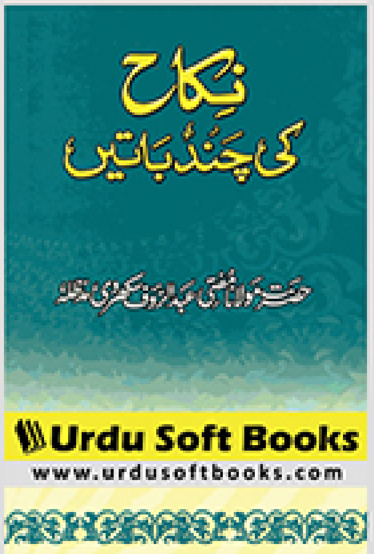

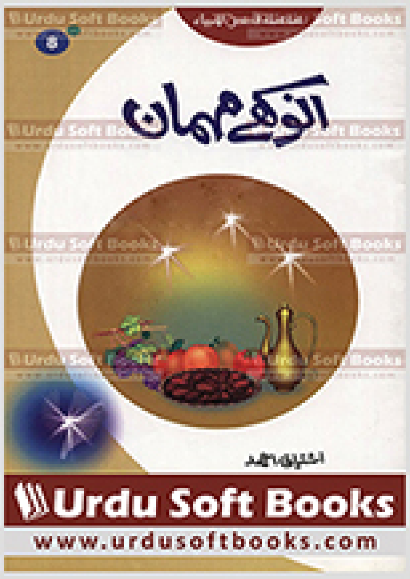

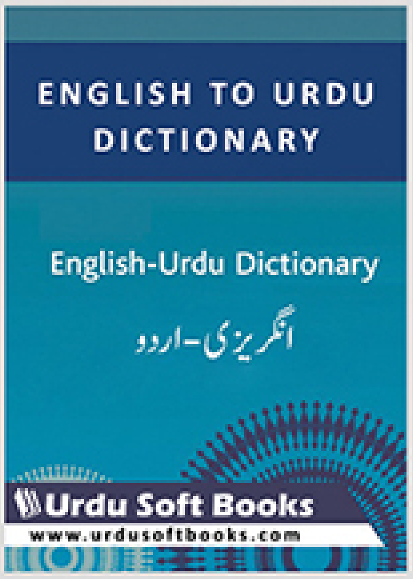

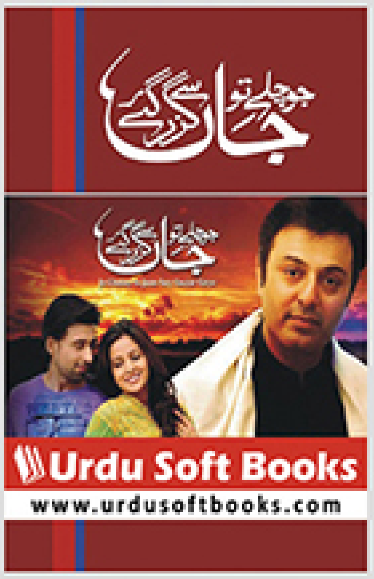

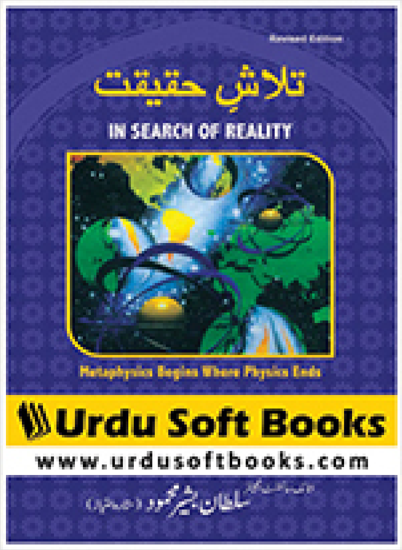

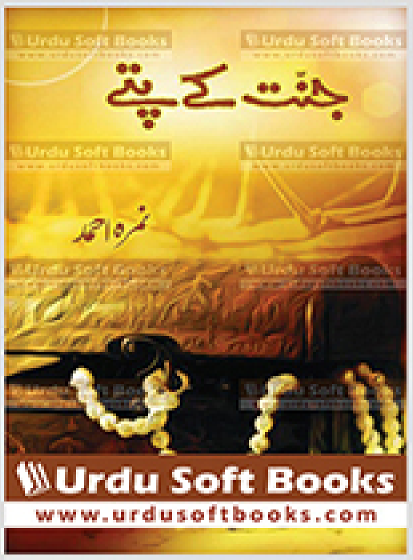

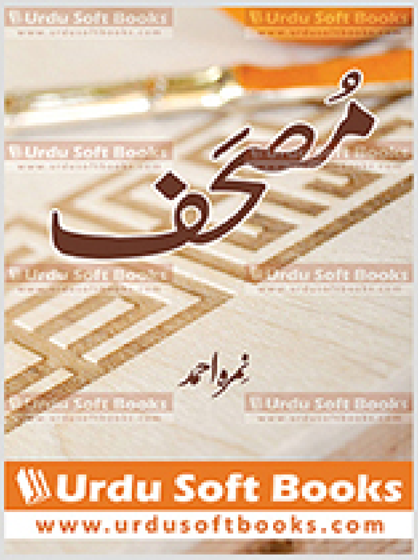

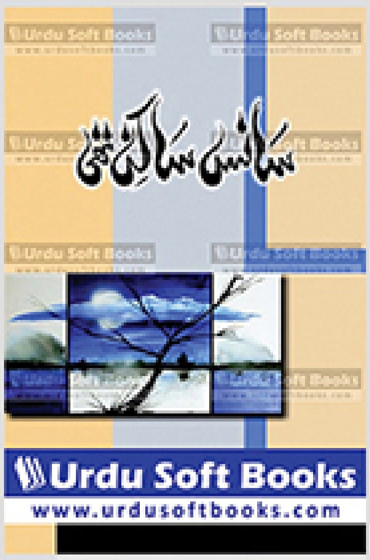

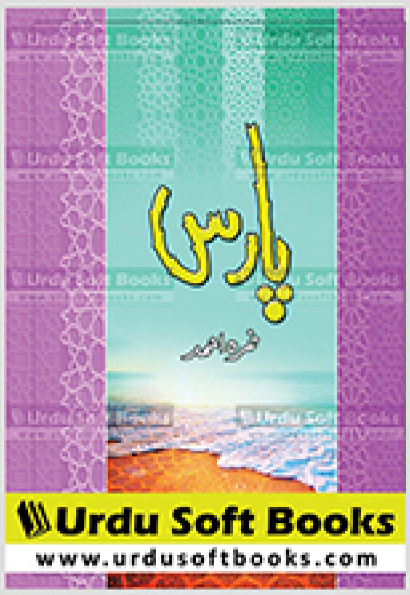

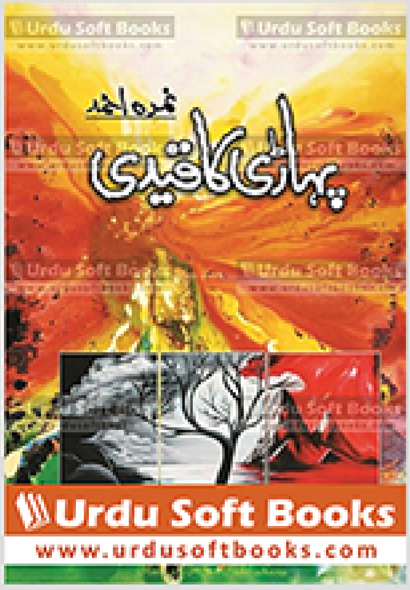

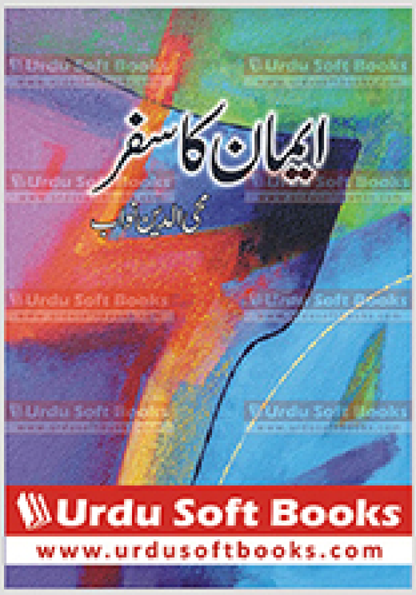

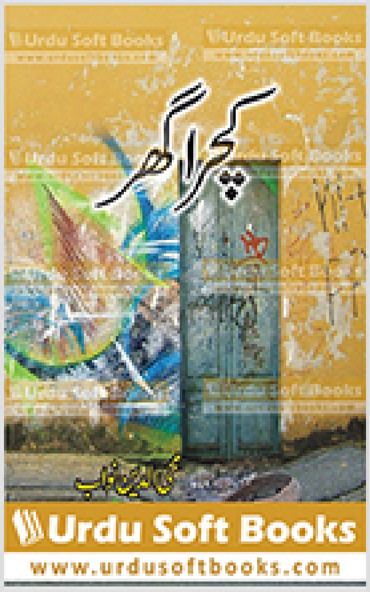

Download These Beautiful PDF Books

Click on Titles to Download

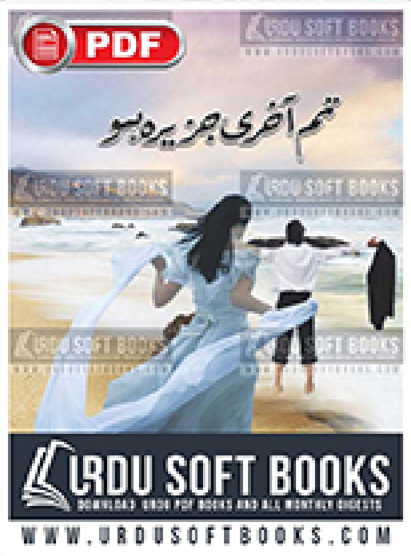

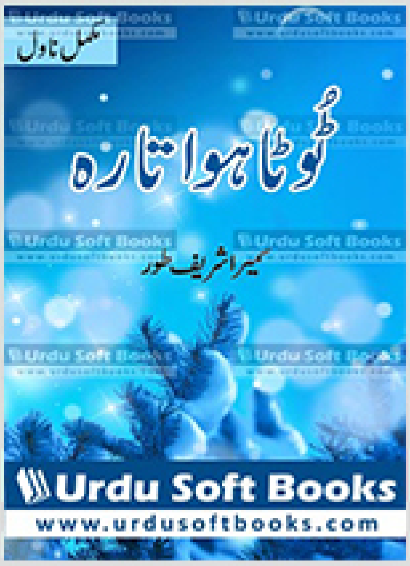

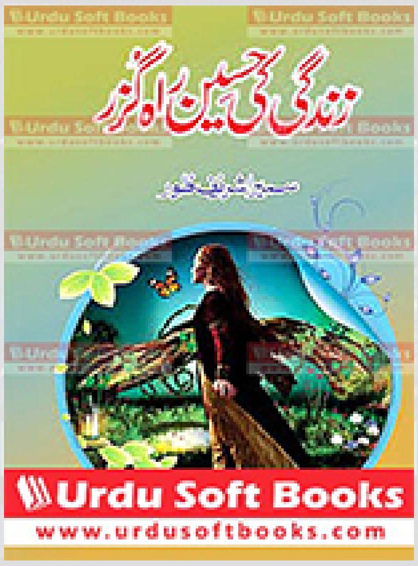

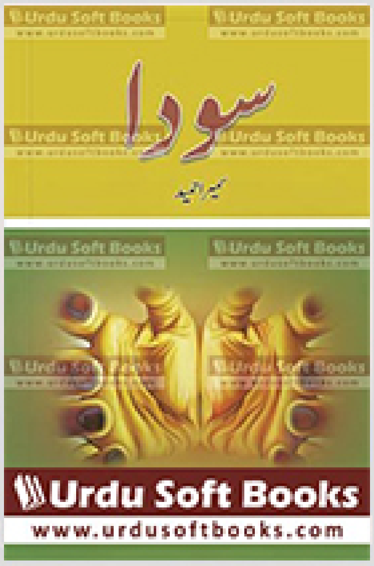

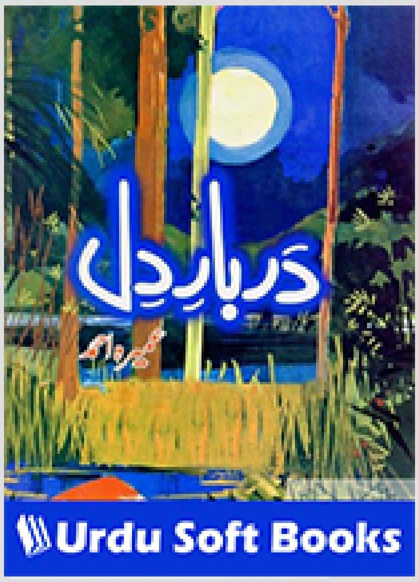

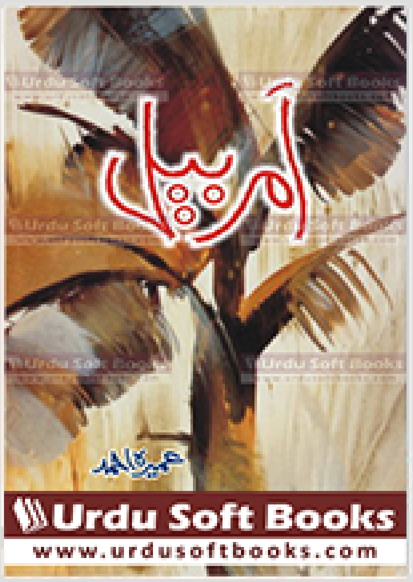

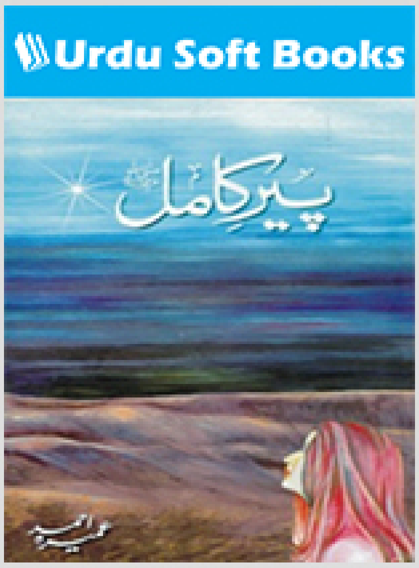

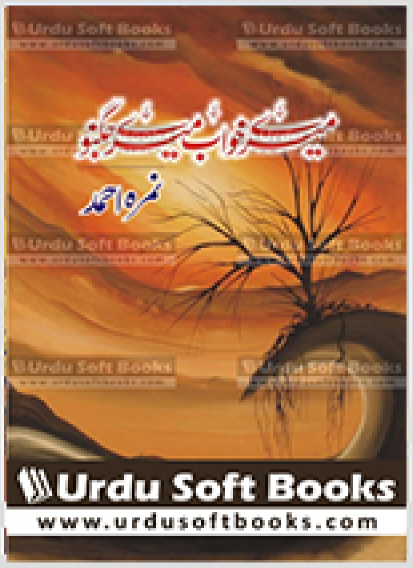

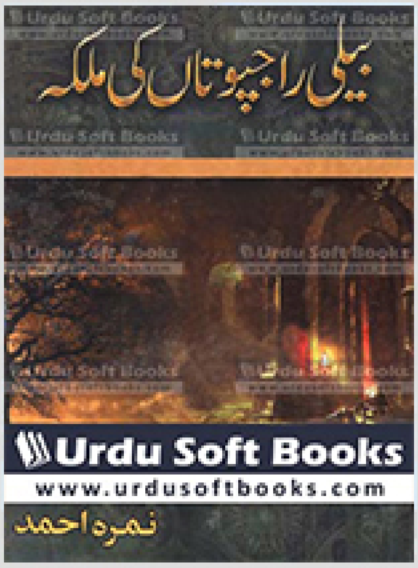

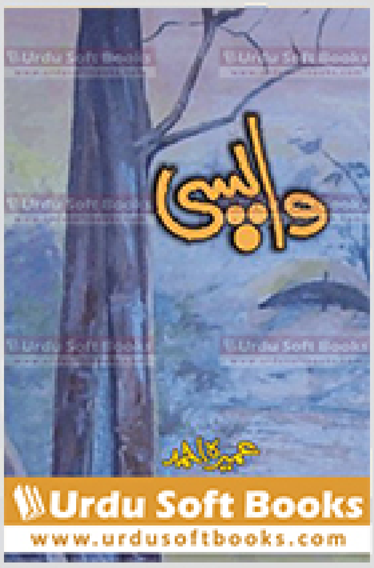

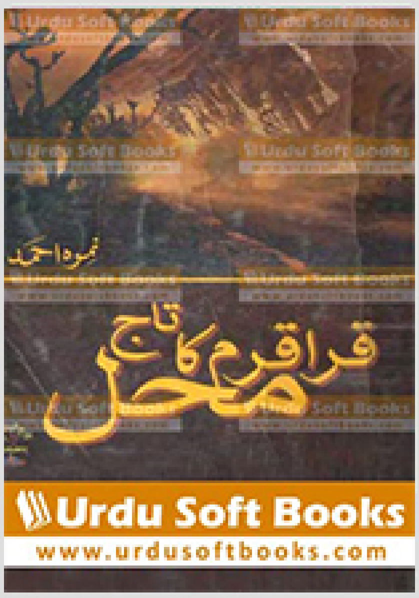

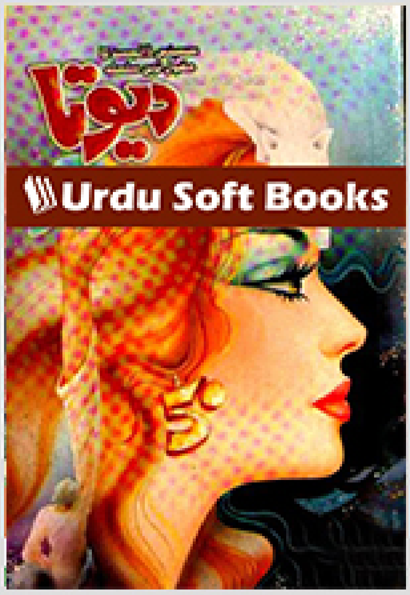

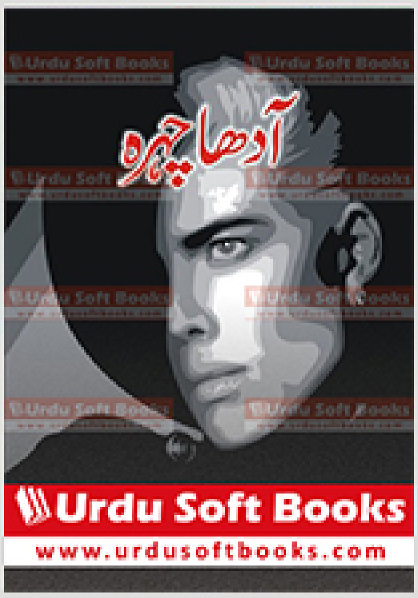

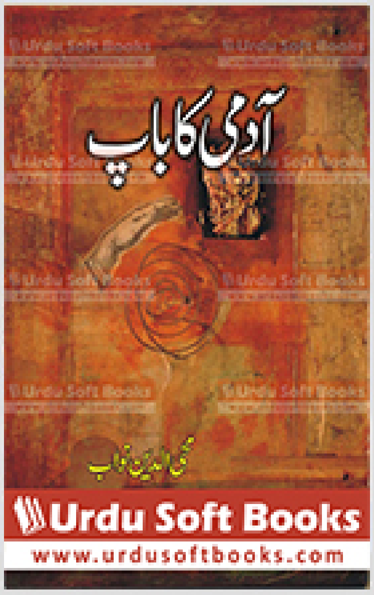

Download These Beautiful PDF Books

Click on Titles to Download

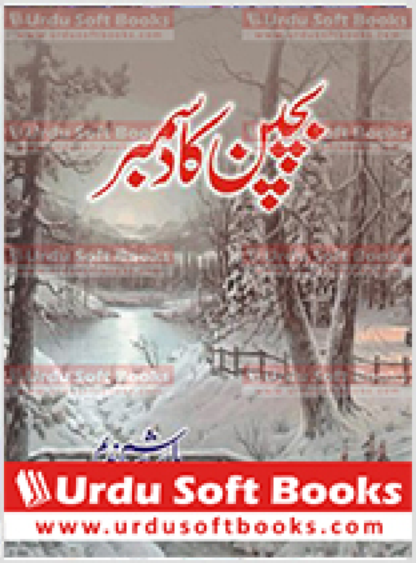

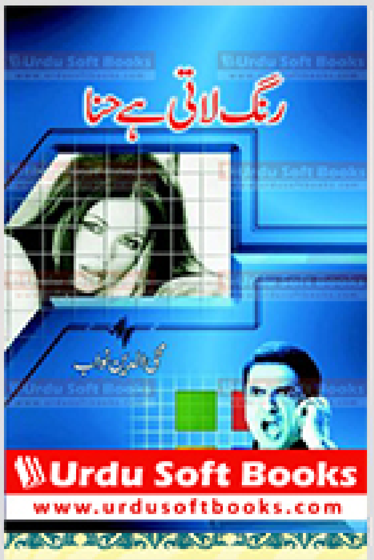

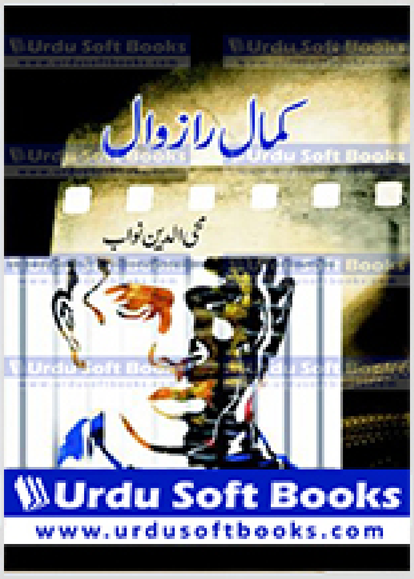

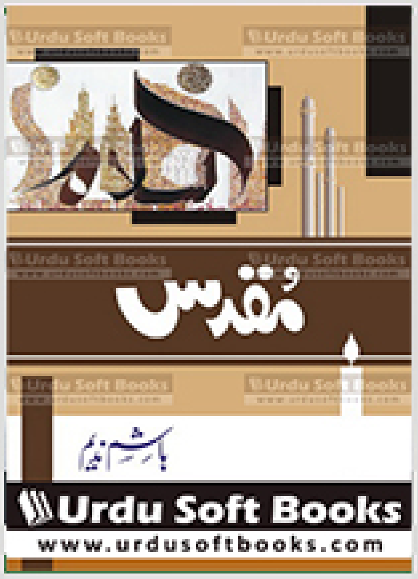

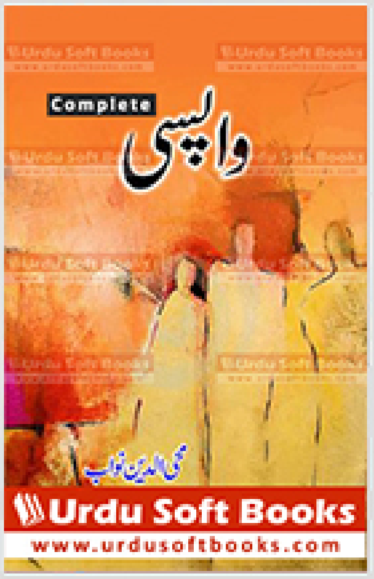

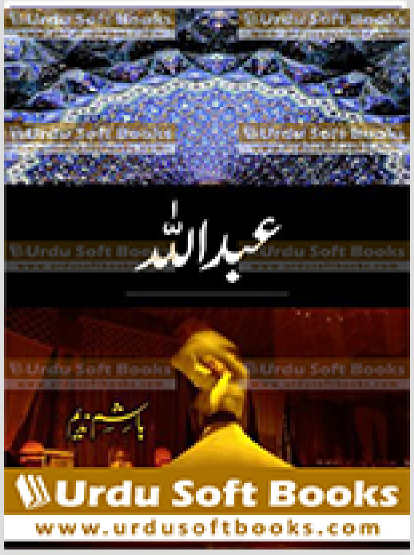

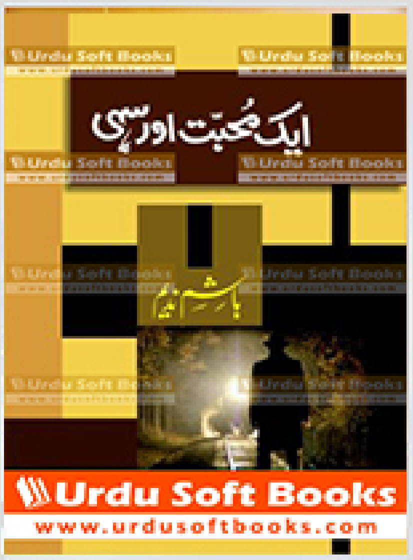

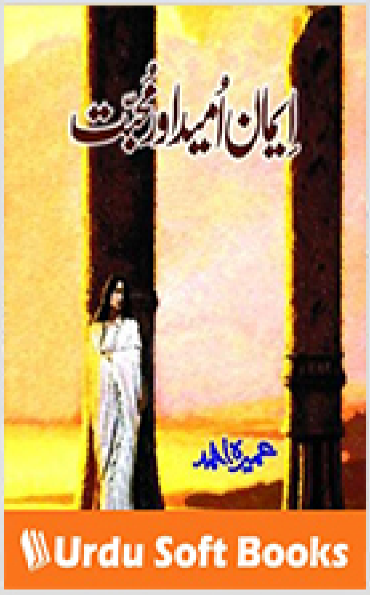

تلے اوپر تین بہنیں تھیں اس لیے پورے گھر کی تمنا تھی کہ ایک بیٹا بھی ہو جائے یہی وجہ تھی کہ جن دنوں اس کی اماں، اُمید سے تھی تو اس کی دادی بزرگوں سے دعائیں کراتے نہ تھکتی تھیں، خوب خیرات کیا کرتی تھیں اور خاندان کے ہر فرد کو تاکید کرتیں کہ وہ اولادِ نرینہ کے لیے دعا کرے۔ اسی لیے سب کے لبوں پر بس یہی ایک دعا تھی کہ اب کی بار بیٹا پیدا ہو۔

بچے کی دادی نے تو عادت بنالی تھی کہ شام ہوتے ہی وہ مکان کی چھت پر چڑھ جاتیں اور مغرب کی طرف رخ کرکے دعا کرتی رہتیں پھر جب تھک جاتیں تو تھوڑی دیر آرام کرنے نیچے آجاتیں اور پھر چھت پر چلی جاتیں، دادی نے ہر ایک کو کہہ رکھا تھا جو مجھے پوتے کی خبر دے گا میں اسے خوش کردوں گی۔

اس دور کی رسم کے مطابق انہوں نے بہو کو میکے بھیج دیا تھا اور اب خوش خبری کی اُمید لگائے بیٹھی تھیں مگر اپنے معمول سے ہٹی نہ تھیں۔ شام ہوتے ہی چھت پر پہنچ جاتیں اور مغرب کی طرف چہرہ کرکے زیرلب التجا کرتی رہتیں۔ ''اے یثرب والے آقا، اولاد نرینہ ہی دینا۔''

اس روز بھی چھت پر کھڑی دعا کررہی تھیں کہ بہو کے گاؤں کا نائی آتا نظر آیا۔ اس نے نزدیک پہنچ کر سر اٹھایا اور چھت کی طرف دیکھا پھر کہا۔ ''ماں جی پوتا مبارک ہو۔''

دادی نے یہ خوشخبری سنی تو سیڑھیوں سے اترنے کی بجائے منڈیر سے لٹک کر زمین پر کود گئیں، وہ ہاتھ پاؤں کی مضبوط تھیں۔ نیچے پہنچتے ہی انہوں نے وہ کمرا جو گڑ سے بھرا ہوا تھا کھول دیا اور آواز دی۔ ''لوگو! لے جاؤ۔''

یہ خبر سنتے ہی گاؤں کے لوگ دوڑ پڑے۔ ان افراد میں سکھ، عیسائی سب شامل تھے۔ یوں انہوں نے گڑ کا تمام ذخیرہ بانٹ دیا۔

گاؤں میں وہ واحد گھر تھا جہاں کا ہر شخص خدمت خلق کو عبادت سمجھتا تھا۔ آس پاس کے جتنے گھر تھے وہ سب اس گھر کے لوگوں سے فیض اٹھاتے۔ بچے کے دادا جن کا نام میاں نور محمد تھا وہ خود بھی عملی طور پر ہر ایک کی مدد کرتے۔ ایک روز وہ ریلوے اسٹیشن سے گزر کر گاؤں کی طرف جارہے تھے کہ انہوں نے دیکھا کہ ایک معزز خاتون چھوٹے سے بچے کو گود میں اٹھائے ہاتھ میں گٹھڑی لیے دائیں بائیں دیکھ رہی ہے، انہوں نے قریب جاکر پوچھا۔ ''بہن آپ نے کہاں جانا ہے، آپ کے ساتھ کوئی نہیں ہے کیا؟''

خاتون نے جواب دیا ''جی مجھے کسی نے لینے آنا تھا، غلطی یہ ہوگئی کہ ہم نے آدمی بھیجنے کی بجائے خط بھیج دیا پتا نہیں خط ملا بھی ہے یا نہیں؟''

نور محمد نے اسے پہچان لیا تھا پھر بھی تصدیق کے لیے پوچھا۔ ''بہن آپ برابر والے گاؤں سنتوکھ سنگھ کی بہو تو نہیں ہیں؟''

خاتون نے سکون کا سانس لیا، وہ مطمئن ہوگئی کہ یہ شخص جاننے والا ہے۔ اس نے میاں نور محمد کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''شاید آپ بابا رحمت اللہ کے خاندان سے ہیں۔'' (رحمت اللہ محمد شریف کے پردادا کا نام تھا)۔

''ہاں، بہن میں ان کا بڑا بیٹا ہوں، چلو آپ کو چھوڑ آتا ہوں۔'' یہ کہہ کر انہوں نے بچے کو اپنے کندھے پر بٹھالیا اور گٹھڑی ہاتھ میں پکڑ لی۔ خاتون اطمینان سے ان کے ساتھ چل پڑی۔

اس کا گاؤں نور محمد کے گاؤں سے دو میل آگے تھا۔ میاں جی اسے ساتھ لیے آدھے گھنٹے میں اس گاؤں کے درمیان واقع اس کے مکان کے دروازے پر پہنچ گئے پھر گٹھڑی خاتون کے ہاتھ میں دی، بچے کو اتارا اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے کے بعد ایک روپیا نکال کر بچے کے ہاتھ میں تھمادیا۔ خاتون کچھ کہنا چاہتی تھی مگر میاں صاحب اسے موقع دیے بغیر واپس ہوگئے، ابھی وہ راستے میں ہی تھے کہ خاتون کے گھر سے ایک آدمی بھاگم بھاگ ان کے قریب پہنچا اور کہنے لگا۔ ''میاں جی! ایسے تو نہیں جانا چاہیے تھا آپ کو، آپ کچھ کھائے پیے بغیر ہی چلے آئے۔''

محمد شریف کے دادا نے جواب دیا ''بہن کو پہلے بھائی کے گھر آکر کچھ کھانا پڑے گا۔''

یہ تیسرے روز کا ذکر ہے وہ خاتون اپنی خادمہ کے ہمراہ میاں جی کے گھر پہنچ گئیں، ان کا شوہر بھی ہمراہ تھا، شوہر کو بیٹھک میں بٹھایا، خود اندر آگئیں اور گھر کی خواتین سے کہا۔ ''میں میاں نور محمد کی بہن ہوں۔''

میاں صاحب کا نام سنتے ہی تمام خواتین احتراماً ادب سے کھڑی ہوگئیں۔ اس دن سے محمد شریف کی چچیوں، والدہ اور دوسری خواتین کے لیے وہ پھوپی بن چکی تھیں، وہ جب بھی آتیں۔ ان کے لیے کھانا پکانے کو ایک سکھ عورت بلائی جاتی تھی۔ وہ سال میں ایک یا دوبار چند دن کے لیے دادا جی کے گھر قیام کرتی تھیں، شادی بیاہ کے موقع پر تو ان کو خاص مقام حاصل ہوتا تھا۔ جب محمد شریف اس دنیا میں تشریف لائے تو وہ ان کے ہاتھوں میں سونے کے کڑے ڈال کر گئیں۔ محمد شریف

ہمہ وقت وہ کڑے پہنے رہتا۔ وہ کچھ اور بڑے ہوئے، ذرا ہوش سنبھالا تو لڑکے اس کا مذاق اڑایا کرتے کہ اس نے لڑکیوں جیسے کڑے پہن رکھے ہیں۔ تنگ آکر محمد شریف نے کڑے اتروا دیئے، جب میاں نور محمد خالق حقیقی سے جا ملے تو اس کے بعد بھی پھوپی کے ساتھ تعلقات جوں کے توں قائم رہے۔ محمد شریف کے والد محمد ابراہیم جب بھی انہیں دیکھتے تھے ادب سے سلام ضرور کرتے۔

محمد شریف ابھی بچہ تھا، وہ گھر میں بزرگوں سے کہانیاں سنا کرتا تھا، جنوں، بھوتوں، درندوں، سانپوں اور ان کا مقابلہ کرنے والے بہادر کسانوں کی کہانیاں، محمد شریف کے گاؤں میں ایک داستان گو پرچون فروش تھا، لوگ اس کے گرد جمع ہو جاتے اور کہانیاں سنتے۔ محمد شریف بھی اس کی زبانی کہانیاں سنا کرتا تھا۔ کہانیاں عجیب وغریب قسم کی ہوتی تھیں، مہمل اور عقل میں نہ آنے والی بعض اوقات محمد شریف کو ہنسی آ جاتی، وہ سوچتا کہ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ تو جھوٹ کا پلندہ ہے۔

یہ اس کا بچپن تھا۔ مگر اکلوتا تھا اس لیے سب کا لاڈلہ تھا باپ کی خواہش تھی کہ وہ بڑا ہو کر فوج میں شامل ہو، فوج کا افسر بنے اس لیے اس کی تعلیم کی طرف ان کی خصوصی توجہ تھی۔ اسے گاؤں کے قریب ایک مدرسے میں داخل کرا دیا تھا۔ درس گاہ آتے جاتے وہ دوستوں کو قصے کہانیاں سنایا کرتا تھا۔ یہ قصے کہانیاں اس کے اپنے ذہن کی تخلیق کردہ ہوتی تھیں۔ اور اس میں ایسی کوئی بات نہ ہوتی جسے سن کر کوئی کہہ دے کہ یہ جھوٹ ہے۔ اس کی اس خوبی نے دوستوں کی اچھی خاصی تعداد جمع کر لی تھی۔ انہی میں وہ لڑکا بھی تھا۔ اس لڑکے سے اس کی خوب بنتی تھی۔ اس لیے اس دن وہ اسے اکیلا بیٹھے دیکھ کر اس کی طرف لپکا۔ وہ لڑکا ایک پیڑ کے سائے میں بیٹھا روٹی کھا رہا تھا، اس کا ہاتھ اس لڑکے کو چھو گیا اس بات پر وہ آپے سے باہر ہو گیا اس نے روٹی کھانا ترک کر دی، کھانا بھی پھینک دیا۔

شریف حیران رہ گیا کہ لڑکے کو کیا ہوا؟ حالانکہ اس نے انتہائی قیمتی لباس زیب تن کر رکھا تھا، صاف ستھرا رہنا اس کی عادت تھی، پھر ایسا کیا ہوا کہ لڑکے نے اپنا کھانا پھینک دیا، اس کا ہاتھ ہی تو چھو گیا تھا، وہ اسی جستجو میں تھا کہ وجہ معلوم کرے، اس نے کئی لوگوں سے پوچھا تب اسے معلوم ہوا کہ چونکہ وہ مسلمان ہے اسی لیے اس ہندو لڑکے نے اس کا ہاتھ لگنے پر کھانا پھینک دیا، وہ دن اس کی شخصیت میں ایک نمایاں تبدیلی لانے کا دن تھا، اس واقعہ نے اسے اسی روز اصلی پاکستانی بنا دیا تھا، اس لڑکے کی نفرت نے اس کے اندر اسلام سے محبت کی شمع روشن کر دی اور یہ شمع وقت کے ساتھ مزید فروزاں ہوتی گئی۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب وہ اسکول میں پڑھتا تھا، وہ شاید فروری کا مہینا تھا، شام کا وقت تھا، فضاء میں خنکی تھی، وہ موسم سے لطف اندوز ہوتا، گندم کے لہلہاتے کھیتوں میں گھومتا ہوا گاؤں سے کچھ دور نکل آیا، بیری کے درختوں کے درمیان اسے زرد رنگ کی چمکتی ہوئی ایک شے نظر آئی، قریب گیا، دیکھا تو وہ بیری کا ایک چھوٹا درخت تھا، جس پر زرد رنگ کی بیلوں نے قبضہ جما رکھا تھا اور وہ درخت سوکھ رہا تھا تاہم زرد رنگ کے ہزاروں خوش نما ہار اس درخت کو دوسروں کے مقابلے میں کہیں زیادہ جاذب نظر بنا رہے تھے، اس کی سوکھی ہوئی بدنما ٹہنیاں اس عجیب وغریب بیل نے ڈھانپ رکھی تھیں۔ اس نے محسوس کیا کہ دوسرے درخت اپنے سرسبز لباس کی زینت کے باوجود اس زیور کے محتاج ہیں، اس نے بیل کے تاروں کا ایک گچھا اس سوکھے درخت سے کھینچ کر اتارنا چاہا، لیکن وہ باریک تار کے گچھے سوکھی ٹہنی سے اس مضبوطی سے چمٹے ہوئے تھے کہ وہ ٹہنی بھی ساتھ ہی ٹوٹ گئی، اس نے ایک ایک کر کے اس ٹہنی سے تار علیحدہ کیے اور ایک سرسبز درخت پر پھینکنے ہی والا تھا کہ پیچھے سے آواز آئی۔

''اے.....رکو۔'' اس نے عقب میں دیکھا ایک کسان آ رہا تھا، کندھے پر کلہاڑی تھی، قریب پہنچا تو بولا ''کیا تم چاہتے ہو کہ میرے سارے درخت سوکھ جائیں۔''

''نہیں تو۔'' محمد شریف نے گھبرا کر جواب دیا۔

کسان نے بیل کا ٹکڑا لڑکے سے لیا اور پاؤں تلے مسل دیا۔ لڑکے کو ایسی خوبصورت چیز کے بے دردی سے روندے جانے پر افسوس ہوا اور ابھی اس حرکت کی وجہ پوچھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ کسان بول اٹھا۔ ''تم نہیں جانتے کہ یہ بیل درختوں کے لیے کتنی خطرناک ہے۔''

''یہ خوبصورت اور نرم و نازک شے خطرناک کیسے ہو سکتی ہے، میرے خیال میں تو یہ درختوں کو سردی اور گرمی سے بچاتی ہوگی۔'' شریف بولا۔

''یہ درختوں کی دشمن ہے۔'' اس نے کہا۔ ''ہم اسے آکاس بیل کہتے ہیں، اس کی جڑ زمین میں نہیں ہوتی، یہ درخت کی سبز ٹہنیوں سے خوراک حاصل کرتی ہے، بہت جلد بڑھتی اور پھلتی پھولتی ہے۔ جس درخت پر اس کا قبضہ ہو جاتا ہے وہ آہستہ آہستہ سوکھ جاتا ہے۔ یہ بیل اس بے رحم راجا کی طرح ہے جو اپنی رعایا کا خون پیتا ہے۔'' یہ کہہ کر کسان نے اس سوکھے درخت کو کاٹنا شروع کر دیا۔

URDU SOFT BOOKS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

"اب اس درخت کو کاٹنے کا فائدہ؟" وہ محمد شریف بولا۔ "اسے اس آکاس بیل کے لیے رہنے دو۔"

"اگر اس درخت کو رہنے دیا تو یہ بیل پھیلتے پھیلتے دوسرے درختوں تک پہنچ گی اور وہ بھی اس کی طرح سوکھ جائیں گے، اس درخت میں ابھی تھوڑی جان باقی ہے۔ ممکن ہے نیچے سے کوئی شاخ پھوٹ نکلے، لیکن اس کے کٹ جانے پر یہ بیل خود بخود سوکھ جائے گی۔" کاشتکار نے تفصیل سے بتایا۔

فضاء پر شام کا سکوت طاری ہو رہا تھا، پرندے کھیتوں سے اڑ اڑ کر درخت پر جمع ہو رہے تھے، وہ اس سوکھے درخت کی زندگی کے متعلق سوچتا ہوا، گھر کی طرف چل دیا۔

محمد شریف کو اپنی ماں سے بے حد محبت تھی، چاندنی راتوں میں کھیل کود میں لگا رہنے کی وجہ سے والد صاحب نے اسے بورڈنگ ہاؤس میں داخل کرا دیا مگر اس کے باوجود موقع ملتے ہی وہ کبھی صبح کا ناشتا اور کبھی رات کو ماں کے ہاتھ کا پکا کھانا کھانے کے لیے گھر آ جاتا تھا جہاں ماں منتظر ملتی تھی۔ اب وہ 15 برس کی عمر میں تھا کہ اسے ایک زبردست دھچکا لگا، ماں اللہ کو پیاری ہو گئی تھی، ماں کے چلے جانے پر اسے یوں محسوس ہوا جیسے ایک روشنی چھن گئی ہو۔

وقت ظالم بھی ہے اور مسیحا بھی، دھیرے دھیرے اس نے اپنے دل کو سمجھا لیا کہ ایسا ہونا ہی تھا ماں کو خالق حقیقی کے پاس جانے سے کون روک سکتا ہے۔

بشیر الدین مشن ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر کرچن تھے، وہ ذہین، بااصول اور شفیق انسان تھے، محمد شریف ان سے بہت متاثر تھا۔ اسکول میں انگریزی کے استاد امریکی تھے، بورڈنگ میں شام کو اسمبلی ہوتی تھی، جس میں انجیل پنجابی زبان میں گائی جاتی تھی۔ شریف نے ایک شام چند دوستوں سے مشورہ کیا اور چھت پر چڑھ گیا اور عین اس وقت اذان دینا شروع کر دی جب اسمبلی ہو رہی تھی۔ پادری بہت برہم ہوا، اس نے کہا یہ ایک خطرناک لڑکا ہے، مگر ہیڈ ماسٹر نے معاف کر دیا۔

میٹرک کے بعد شریف نے اسلامیہ کالج لاہور میں داخلہ لے لیا، 1938ء میں یہاں سے بی اے کا امتحان پاس کیا۔ تاریخ اور کلاسک اس کے پسندیدہ مضامین تھے۔ جسٹس انوار الحق، مولانا عبدالستار نیازی اور مرحوم حمید نظامی اس کے ہمعصر تھے۔ آکاس بیل اور بیری کے درخت والے واقعہ کے کئی برس بعد جب وہ کالج میں زیر تعلیم تھا کہ ایک روز اخبار میں ایک مضمون اس کی نظر سے گزرا، مضمون میں اچھوتوں یعنی بھارت ماتا کے سوتیلے بیٹوں کی تازہ جدوجہد کا ذکر تھا۔ اچھوتوں کے ایک لیڈر کا بیان بھی شامل تھا کہ اگر ہندو سماج نے ہمارے حقوق تسلیم نہ کیے تو ہم اپنے لیے کوئی اور راہ عمل اختیار کریں گے۔

ہندو سماج کا مکروہ چہرہ اس کے سامنے تھا۔ مضمون نے آکاس بیل کی یاد تازہ کر دی۔ یہ ہندو بھی تو آکاس بیل کی طرح اچھوتوں کی محنت کو چوس رہے ہیں۔ اسے آکاس بیل اور ہندوؤں میں فقط یہ فرق نظر آیا کہ اس بیل کو ایک درخت کی زندگی تباہ کرنے کے بعد خود بھی تباہی کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن ہندو سماج کئی ہزار برس سے اچھوتوں کی سوکھی ہوئی ہڈیوں پر اپنے عشرت کدے تعمیر کر رہا ہے اور باغ وطن کے کسی مالی نے ابھی یہ تک نہ محسوس کیا تھا کہ سماج کا جو بوجھ اس قوم کے نحیف کندھوں کے لیے ناقابلِ برداشت ہو چکا ہے، اسے اتار ڈالا جائے۔

درخت کے مقابلے میں ایک انسان کی یہ بے بسی، یہ صبر اور یہ استقلال اس کے دل پر غیر معمولی اثر کیے بغیر نہ رہ سکا، اس نے سوچا ممکن ہے اس قوم نے اپنے غیر معمولی صبر و استقلال کے باوجود اس طویل عرصے میں ظالم سماج کے طرزِ عمل کے خلاف کئی بار آواز اٹھائی ہو، لیکن خشک گلے اور سوکھی زبان سے نکلی ہوئی آواز بیری کے درخت کی اس مرجھائی ہوئی ٹہنی کے خاموش احتجاج کے مشابہ تھی، جس پر اس نے زرد رنگ کی چند پتیاں دیکھی تھیں اور جس کی رہی سہی زندگی آزادی کی جدوجہد کے باوجود آکاس بیل کے بے پناہ ذوق و نمو کی نذر ہو رہی تھی۔

اس کا تصور ماضی کے ہزاروں نقاب الٹتا ہوا دور جا پہنچا۔ شاہراہ حیات پر ماضی کے دھندلکوں میں اسے اس بے کس قوم کی ہزاروں ایسی آہیں سنائی دیں جنہیں سماج کے ہنگامے دبا چکے تھے۔ وہ ان گنت آنسو دکھائی دیے جو سماج کی شور زمین میں جذب ہو چکے تھے۔ ان آہوں اور اشکوں کے بے پناہ طوفان نے اس کے سامنے چند تصاویر بنا دیں۔ یہ تصاویر اس کی زندگی میں انقلاب لانے والی تھیں۔

اسلامیہ کالج لاہور میں جب محمد شریف زیرِ تعلیم تھا تو کئی بار ایسا ہوا، اسے خرچ کے لیے پیسے گھر سے تاخیر سے ملے، اس تاخیر سے اسے مشکل تو ضرور پیش آئی لیکن زبان سے شکوہ یا شکایت کسی نے نہیں سنی، کبھی ماتھے پر بل نہ پڑا۔ یہ 1933ء اور اس کے چند برس بعد کا دور ہے، تب کالج کا ماہانہ خرچ کل 10 روپے تھا جبکہ محمد شریف 80,70 روپے خرچ کر جاتا تھا۔

قریبی گاؤں سے تعلق رکھنے والا محمد شفیع جو محمد شریف کے ساتھ رہتا تھا (محمد شفیع بعد میں پاک فوج سے بطور بریگیڈیئر ریٹائر ہوئے) کے مطابق شریف کو مچھلی بہت پسند تھی۔ خوش لباس تھا اور خوش خوراک بھی، گھڑسواری اور کشتی رانی کا بہت شوقین تھا۔ دوستوں کو کشتی میں سیر کرایا کرتا تھا۔ کالج کے قریبی ساتھیوں کے مطابق محمد شریف کھلنڈرا اور لاابالی طبیعت کا تھا۔ محمد شریف نصابی کتب کی طرف کم توجہ دیتا مگر ناول پڑھنے کا شوقین تھا۔ انہی سب میں اس کا چیسا ہوا ہو جاتا تھا۔

کہانیوں سے دلچسپی کا ہی نتیجہ تھا کہ وہ افسانے اور ناول پڑھنے کی طرف راغب ہوا تھا۔ اسی زمانے میں اس کے ایک استاد نے اسے "الفاروق" پڑھنے کے لیے دی، علامہ شبلی کی بدولت اس کے دل میں اپنی شناخت بنانے کی تڑپ پیدا ہوئی، یہ دو امنگیں تھیں ایک تو ناول نگار بننے کی خواہش اور اس کے ساتھ ہی اپنا ملی تشخص اجاگر کرنے کی تڑپ، دونوں یکساں طور پر اس کی زندگی پر اثر انداز ہو رہی تھیں، اسکول کی طرح کالج کے زمانے میں بھی نصابی کتب کی بجائے افسانوی ادب میں زیادہ دلچسپی لینا اسی امر کا عکاس تھا۔

1934ء تک اس نے دنیا کے کئی مشہور ناول نگاروں کے شاہکار پڑھ لیے تھے۔ مرے کالج سیالکوٹ کے پروفیسر صوفی محمد اشرف سے جب اس کی ملاقات ہوتی تو وہ پوچھتے۔ "تم کیا بننا چاہتے ہو؟"

محمد شریف کا جواب ہوتا۔ "میں ایک بڑا ناول نگار بننا چاہتا ہوں، اس لیے کہ میرے اندر کہانیاں جنم لیتی ہیں۔"

پروفیسر صاحب نے اسے دنیا کی مختلف زبانوں کے زندۂ جاوید ناول نگاروں کے مطالعہ کا مشورہ دیا، چنانچہ اس نے ٹالسٹائی، وکٹر ہیوگو، چارلس ڈکنز، فیلڈنگ، ٹامس ہارڈی، گالز وردی اور بہت سے دوسرے ناول نگاروں کی تصانیف کھنگال ڈالیں اور پھر انسانی تاریخ کا انتخاب کر کے اس بحر بیکراں سے وہ موتی نکال لایا کہ جس کی تابانی میں کبھی فرق نہیں آیا۔

اس نے "شودر" کے عنوان سے اپنا اولین افسانہ لکھا، یہ افسانہ لاہور کے ایک معروف دینی رسالے "حقیقت اسلام" میں شائع ہوا، قارئین نے اسے بہت پسند کیا، ممکن تھا کہ یہ افسانہ محمد شریف کی ادبی زندگی کا راستہ متعین کر دیتا لیکن اس دور کے سیاسی حالات اور پھر اسلامیہ کالج کا ماحول بڑی تیزی سے اس کے ذہن پر اثر انداز ہو رہے تھے، شعور میں کہانیاں جنم لینے لگیں اور اسلامی تشخص کا احساس اس کے دل

بیگم نسیم فرماتی ہیں کہ ان کے شوہر اس دن بہت خوش تھے جس روز ان کا بیٹا خالد پیدا ہوا، وہ مغرب کی نماز کے بعد دعا مانگ رہے تھے کہ میرے چھوٹے بھائی نے انہیں بچے کی پیدائش کی خوشخبری سنائی، یہ سنتے ہی وہ سجدہ ریز ہو گئے۔

منجھلے بیٹے جاوید نسیم کی وفات ہماری زندگی کا سب سے المناک حادثہ ہے، جب وہ غرق آب ہوا تو 19 برس کا تھا، پہلے دن اس کی لاش نہ ملی، رات بھر متعدد افراد جوہڑ کے اردگرد بیٹھے رہے، کئی افراد نے لاش کی تلاش میں غوطے بھی لگائے، نسیم صاحب کو اس بات کی فکر تھی کہ کوئی غوطہ لگانے والا ڈوب نہ جائے، اگلے روز فوج کی جانب سے ٹرک پر ایک کشتی بھیجی گئی اور کمانڈر ان چیف جنرل محمد موسیٰ نے حکم دیا کہ اگر لاش جلدی نہ ملے تو پمپ لگا کر جوہڑ خالی کر دیا جائے۔ فوجیوں نے کشتی اتاری اور کھینچنے والے کا انتظار کرنے لگے، نسیم صاحب آگے بڑھے اور کشتی کے چپو سنبھالتے ہوئے لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگے، تم میں سے دو اچھے تیراک میرے ساتھ آ جائیں، دو کے بجائے چار افراد آگے بڑھے اور نسیم حجازی صاحب کے ساتھ کشتی میں بیٹھ گئے۔ نسیم صاحب نے دو تین مقامات پر کشتی روکی اور پھر ایک جگہ گہرے پانی میں غوطہ خور کود پڑے، تھوڑی دیر بعد بیٹے کی لاش مل گئی، اور جب تک وہ اسے سپرد خاک کر کے واپس نہیں آ گئے کسی نے انہیں روتے ہوئے نہیں دیکھا، دوست احباب انہیں تسلیاں دے رہے تھے کہ ان کا حوصلہ جواب دے گیا اور وہ سسکیاں لیتے اپنے کمرے میں چلے گئے، تھوڑی دیر بعد کسی نے دروازہ کھولا تو وہ جائے نماز پر بیٹھے ہوئے تھے۔

......☆......☆......

نسیم حجازی کے ناولوں پر ڈرامے بنے، فلمیں بنائی گئیں، "خاک اور خون" ناول پر فلمائی گئی فلم بہت مقبول ہوئی۔ ان کے ناولوں کے کئی زبانوں میں ترجمے بھی ہوئے، نسیم حجازی اپنے آخری ایام میں اپنی سائنسدان ڈاکٹر عبدالقدیر کی خواہش پر سیاچن کے محاذ پر افواج کی جانبازی کے پس منظر میں ناول لکھ رہے تھے مگر شدید علالت کے باعث مکمل نہ کر سکے۔

URDUSOFTBOOKS.COM

دماغ پر چھانے لگا تھا جو اس سے کہتا۔ "محمد شریف تم جیسے ایک ناولسٹ ہو اسی طرح سے تم ایک پاکستانی بھی ہو۔" ایک تڑپ اس کے دل میں تھی کہ مسلمان برصغیر میں اپنا نظریاتی حصار قائم کرلیں۔

زمانہ طالب علمی میں یہ اس کے تصور میں بھی نہ تھا کہ ہندو اس پر حکومت کریں گے، کانگریس اور برہمنی سیاست سے نفرت اسے ورثہ میں ملی تھی اور یہ اس نوجوان کی خوش قسمتی تھی کہ جس عمر میں غیر مسلم اور بعض مسلمان طالب علم بھی راون اور ہنومان کے قصے سنا کرتے تھے اس کے بزرگ خالد بن ولید، محمد بن قاسم، طارق بن زیاد اور محمود غزنوی کی ایمان افروز داستانیں اسے سنایا کرتے تھے، تب اس نے ایک طویل افسانہ "مجاہد" کے عنوان سے لکھا، ان دنوں مسلسل مطالعہ اس کی عادت ثانیہ بن چکی تھی اور شاید یہ اسی شوق مطالعہ کا ثمر تھا کہ "داستانِ مجاہد" لکھنے کے بعد اس نے محسوس کیا کہ اس کہانی میں تو پورے ناول کا پلاٹ موجود ہے، اور اسی طرح شودر افسانے میں بھی ایک پورے ناول کا پلاٹ موجود تھا، ایک سال کالج میں چھٹیاں ہوئیں تو محمد شریف ٹرین کے ذریعے اپنے آبائی گاؤں پہنچا، اسے حیرت کا جھٹکا لگا کہ گاؤں میں تو اُلّو بول رہے ہیں، معلوم ہوا کہ بھی لوگ ساتھ والے گاؤں کے سکھوں سے لڑنے گئے ہیں اور وہاں دونوں گاؤں کے افراد ڈنڈوں، لاٹھیوں سے لیس موجود ہیں، اس نے فوراً گھوڑے کو لگام ڈالی اور چشم زدن میں اس کی ننگی پیٹھ پر سوار دوسرے گاؤں کی جانب بجلی کی طرح لپکا، وہاں پہنچ کر یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ دونوں گاؤں کے لوگ آمنے سامنے صف آراء تھے، جنگ کا ماحول تھا۔ اس نے قریب پہنچتے ہی للکارا۔ "خبردار!"

شیر کی دھاڑ، لاٹھیاں اور ڈنڈے فضاء میں ہی بلند رہ گئے۔ وہ آگے بڑھا، دو تین کو تھپڑ مارے، اور اپنے لب ولہجے اور شیریں بیانی سے انہیں ایسا رام کیا کہ اب طرفین کشتی لڑنے کے لیے اکھاڑے میں اتر رہے تھے، کبڈی بھی کھیلی گئی، وہ مخالف گاؤں کی طرف سے کھیلا تھا کیونکہ وہ کمزور تھے اور یوں یہ لڑائی اس کی فہم وفراست سے ٹل گئی۔

کالج کے ہی دور کا ایک اور واقعہ ہے "منظر لاہور کے چڑیا گھر کا تھا، چیتوں کے پنجرے کے سامنے ایک لڑکا بار بار اپنا ہاتھ سلاخوں کے اندر لے جا کر چیتے کے بچے کو کچھ کھلا رہا تھا، وہیں محمد شریف بھی موجود تھا کہ اچانک چیتے کے بچے نے اس لڑکے کا ہاتھ منہ میں دبالیا، لڑکے کی چیخیں بلند ہوئیں، محمد شریف نے ایک لمحے کے لیے کچھ سوچا پھر انتہائی پھرتی سے قریب کھڑے ایک شخص سے چھتری لی اور چھتری کا مضبوط لوہے کا راڈ اس زور سے چیتے کے بچے کو مارا کہ اس نے چشم زدن میں لڑکے کا ہاتھ چھوڑ دیا جو لہولہان ہو چکا تھا۔ لوگوں نے خوشی سے تالیاں بجائیں، محمد شریف کی بہادری کو سراہا۔

اس نے تقریباً 23 برس کی عمر میں 1937ء میں "داستانِ مجاہد" کے عنوان سے اپنا پہلا ناول لکھنے کا فیصلہ کیا اور 1938ء میں اسے پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا، (1938ء میں ہی اس نے بی اے کا امتحان پاس کیا) مرحوم حمید نظامی اور مولانا عبدالستار خان نیازی اور محمد شریف ایک ہی مکان میں رہائش پذیر تھے، جسٹس انوارالحق بھی ان کے ہم عصر تھے۔ مولانا عبدالستار نیازی وہ پہلی شخصیت تھے جنہوں نے اس کی تصانیف میں دلچسپی لی اور حوصلہ افزائی کی۔

وہ پریشانیاں جو اکثر مصنفین کے حصے میں آتی ہیں وہ اس کے مقدر میں بھی تھیں لیکن دنیا کے کلاسیکی ادب کے مطالعہ نے اس میں یہ خوداعتمادی پیدا کردی تھی کہ "اس ناول کے ساتھ اس کے سارے مسائل حل ہو جائیں گے" لیکن شومئی قسمت کہ یہ پریشانیاں اس ناول کی تکمیل کے بعد مزید بڑھ گئیں۔ یہ "ترقی پسند ادب" کا دور تھا۔ وہ جس مشہور پبلشر کے پاس بھی ناول کا مسودہ لے کر گیا وہ "داستانِ مجاہد" کا عنوان دیکھ کر ہی تلملا اٹھتا اور کہتا "جناب آپ کس زمانے کی بات کرتے ہیں؟ یہ ترقی پسند ادب کا دور ہے اور ہم صرف ترقی پسند ادیبوں کی ہی کتابیں شائع کرتے ہیں۔"

پبلشرز کی یہ باتیں سن کر وہ دل میں اسی قسم کی ہنسی محسوس کرتا جو کبھی گاؤں کے دکاندار کی بے ربط کہانیاں سن کر محسوس کرتا تھا۔ بہرکیف وہ اپنا مسودہ اٹھاتا اور پبلشر کو یہ ضرور کہتا "جناب وہ دن زیادہ دور نہیں جب آنے والی ہر تصنیف میری پچھلی تخلیق سے کہیں زیادہ مقبولیت حاصل کرے گی اور اس دن آپ اپنی اس گفتگو پر ضرور ندامت محسوس کریں گے۔"

لیکن اس کے ان تصورات کے باوجود "داستان مجاہد" کا مسودہ تقریباً 6 برس اس کے گلے کا ہار بنا رہا، 1939ء میں جنگ شروع ہوگئی تو اس ناول کے شائع ہونے کے امکانات اور بھی معدوم ہو گئے، پھر حالات نے کروٹ بدلی اور محمد شریف کو کراچی لے گیا۔ صحافت کا شوق اسے کراچی لایا تھا۔ کراچی میں محمد شریف تین ماہ کے لیے روزنامہ "حیات" اور بعدازاں روزنامہ "زمانہ" کا ایڈیٹر مقرر ہوا، اس دور میں سید ہاشم رضا جو سیکرٹری اطلاعات تھے ان سے محمد شریف کے دوستانہ مراسم

URDU SOFT BOOKS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS

تھے اور یہ مراسم گہری دوستی میں بدل چکے تھے۔ ان دنوں اخبارات کو حکومت ہند کی طرف سے "وار فنڈ" کے نام پر گرانٹ ملا کرتی تھی، اس اخبار کے حصے میں بھی 10 ہزار روپے آئے، مالکان اخبار نے اسے مبارک باد پیش کی۔ دوسرے روز اس نے "وار فنڈ" پر اداریہ لکھا، جب اداریہ چھپ گیا تو ساتھ ہی اپنا استعفیٰ بھی دفتر چھوڑ آیا، وہ سمجھ رہا تھا کہ جس اخبار کو حکومت کی طرف سے 10 ہزار روپے کی گرانٹ مل چکی ہے وہ اب کانگریسی گورنمنٹ کے خلاف تو کوئی بات نہیں لکھ سکتا، اسے اپنے قلم کی موت نظر آ رہی تھی جسے وہ ہر قیمت پر بچانا چاہتا تھا۔ اس نے اخبار کی ملازمت چھوڑ دی، مالکان نے منت سماجت کی مگر اس نے قطعی انکار کر دیا۔

کراچی کے علاقے ڈرگ روڈ پر ایک انجمن کی نگرانی میں ایک مڈل اسکول چل رہا تھا، بورڈ آف گورنرز کی درخواست پر اس نے اسکول میں انگریزی کے استاد کے طور پر پڑھانا شروع کر دیا۔ اس نے اس شرط پر تدریسی فرائض قبول کیے تھے کہ نظم و ضبط کے حوالے سے اسے مکمل اختیارات حاصل ہوں گے۔ اس اسکول میں 3 ماہ تک اس نے بچوں کو پڑھایا اور ان کی تربیت کا جو سنہری موقع ہاتھ آیا تھا اس سے بھی اس نے پورا پورا فائدہ اٹھایا لیکن ایک روز جب وہ اسکول پہنچا تو گیٹ اس کے لیے بند تھا۔ اسے وہیں پر ہی ملازمت سے برخاستگی کا پروانہ مل گیا، اس کا سبب اس کا ایک ایسا اداریہ بنا تھا جو اس نے کچھ عرصہ قبل ایران کی پہلوی شہنشاہیت کے بارے میں لکھا تھا۔ بچے اسکول کے گیٹ کی سلاخوں سے ہاتھ نکال نکال کر اس سے مصافحہ کر رہے تھے، اس کی آنکھیں نم ہو گئیں، اسے وہ بچے بہت یاد آ رہے تھے جنہیں ان کی علیحدگی کا اس قدر رنج تھا کہ وہ رو رہے تھے۔

محمد شریف ابھی سندھ میں ہی تھا کہ ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ یہ واقعہ ہے 1942ء کا ہے، دریائے سندھ کا بند ٹوٹ گیا تھا، سکھر اور شکارپور کے درمیان قریباً 18 سے 20 میل کا علاقہ زیر آب آ گیا تھا۔ محمد شریف بھی دیگر متاثرین کے ساتھ محفوظ مقام پر پہنچنے کے لیے شکارپور سے اندازاً 5,4 میل آگے ایک کشتی میں سوار ہوا تھا۔ کشتی میں چند خواتین بھی سوار تھیں۔ اس کشتی میں تین ملاح تھے، ان میں سے ایک ایسا بھی تھا جس کو تمیز چھو کر بھی نہیں گزری تھی، وہ کشتی میں سوار تمام افراد سے بدسلوکی سے پیش آ رہا تھا، حالانکہ آفت کا شکار تمام لوگ ہی منہ مانگا کرایہ دے کر جا رہے تھے، یہ جولائی کے

بیگم نسیم حجازی بتاتی ہیں کہ ان کے شوہر ایک معما ہیں، اپنے لیے بھی اور دوسروں کے لیے بھی، ان کے ایک دوست راجا ذوق اختر سواتی ریچھ کا ایک بچہ لے آئے اور نسیم صاحب نے اسے اپنے پاس رکھ لیا، میں نے کافی احتجاج کیا لیکن انہوں نے فرمایا "بیگم! اس کے بہت سے فائدے ہیں آپ کو معلوم ہے جو لوگ ایبٹ آباد سیر کے لیے آتے ہیں، ان میں سے کئی لوگ انہیں دیکھنا ضروری سمجھتے ہیں حالانکہ انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ایک ادیب اور مصنف بڑا مصروف ہوتا ہے، اسے وقت بے وقت پریشان نہیں کرنا چاہیے، یہ ریچھ ان کا راستہ روکے گا، اسی دوست نے ایک کتا بھی پیش کر دیا، نسیم صاحب نے ریچھ اور کتے کو ایک ہی زنجیر سے باندھ دیا اور پھر نہ کتا کتا رہا اور نہ ہی ریچھ ریچھ، نسیم صاحب اور بچے سیر کے لیے جاتے تو ریچھ کو کھلا چھوڑ دیا جاتا، کتے کی طرح یہ ریچھ بھی ان کے پیچھے پیچھے چلا یا کرتا تھا۔ ایک دفعہ ایم اسلم مرحوم ہمارے گھر آئے، وہ نسیم صاحب کے ساتھ مردانہ میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ ریچھ بیٹھک میں جا پہنچا اور حسبِ عادت اس نے نسیم صاحب سے معانقہ کیا اور پھر اسلم صاحب سے لپٹ گیا، نسیم صاحب نے اسے کان سے پکڑ کر باہر نکال دیا۔ اسے ہماری خوش قسمتی سمجھیے کہ ہماری بیٹھک ذرا سی تاریک تھی اور ایم اسلم صاحب یہ نہ سمجھ سکے کہ وہ ایک ریچھ سے گلے ملے ہیں، انہوں نے صرف اتنا فرمایا "یار یہ کتا بڑا ہیبت ناک ہے"، کسی بچے نے دروازے کے پیچھے سے کہا "یہ کتا نہیں ریچھ ہے" تو ایم اسلم صاحب گھبرا گئے اور جب وہ رخصت ہونے لگے تو کہا "نسیم صاحب ریچھ رکھنے کی کیا ضرورت ہے اپنے دروازے پر Danger کی تختی کیوں نہیں لگا دیتے"۔

☆☆☆

نسیم حجازی کے ناولوں کے کردار عورتیں اور مرد ایک دوسرے کے لیے اس قدر پاکیزہ محبت کے جذبات رکھتے ہیں کہ جنہیں دیکھ کر فرشتے بھی رشک کریں۔ خواہ وہ "شاہین" کا بدر بن مغیرہ ہو یا "قیصر و کسریٰ" کا عاصم "اور تلوار ٹوٹ گئی" کا انور علی ہو یا ثمینہ "داستان مجاہد" کے نرگس اور نعیم "ہوں یا محمد بن قاسم" کے ابوالحسن، خالد، سلمیٰ یا ناہید" سبھی پاکیزہ سیرت و کردار کی اعلیٰ مثالیں ہیں۔

URDUSOFTBOOKS.COM

آخری ایام تھے، جس سے سانس لینا بھی دشوار تھا اور کشتی کے سارے سوار پریشان تھے، ایک نوجوان لڑکی ہوش وحواس سے بیگانہ ہوئی جا رہی تھی، وہ باہر کھلی فضاء میں سانس لینے اٹھی تو ملاح نے اسے جھڑکا ''اندر بیٹھو'' دوسری سواریاں ملاح کی گرجدار آواز سے سہم گئیں لیکن سروقد، مضبوط ہاتھوں پیروں والا نوجوان محمد شریف اٹھا اور لڑکی سے کہا۔ ''بہن آرام سے تازہ ہوا میں سانس لے لو تاکہ تمہاری طبیعت سنبھل جائے'' اور پھر اس ملاح کو ڈانٹ پلائی کہ وہ تمیز سے بات کرے، ملاح تو تکار کرنے لگا تو ایک زناٹے دار تھپڑ اس کے گال کو سرخ کر گیا۔ محمد شریف نے اس سے بانس چھینا اور گرجدار آواز میں کہا خبردار، ملاحوں میں سے کوئی بھی میرے نزدیک نہ آئے میں اکیلا ہی کشتی پار لے جاؤں گا، اور وہ کشتی کو پار لے گیا۔

اس واقعہ کے بعد وہ کراچی میں ہی تھا کہ میر جعفر خان جمالی نے اسرار احمد خان کو کراچی بھیجا کہ محمد شریف کو بلوچستان لے آؤ۔ اسے انگریزی کے استاد کی حیثیت سے بلایا گیا تھا۔ جمالی صاحب تو بہت کچھ پہلے ہی جانتے تھے۔ مگر انگریزی سیکھنے میں محمد شریف نے ان کی رہنمائی کی اور ان کے بچوں کے اتالیق رہا۔

برصغیر کی تقسیم سے قبل کا یہ وہ زمانہ تھا جب بلوچستان میں داخل ہونے والے ہر شخص کے بارے میں بڑی چھان بین کی جاتی تھی۔ اس سے بھی بڑے سوال پوچھے گئے کہ کون ہو، کہاں سے آئے ہو، کس سے ملنے جا رہے ہو؟ وغیرہ وغیرہ۔

میر جعفر اللہ جمالی کا حوالہ دینے سے اس کو بلوچستان میں داخلے کی اجازت مل گئی۔ کچھ عرصہ بعد محمد شریف نے واپس آنا چاہا مگر جمالی صاحب سے مراسم اتنے گہرے ہو چکے تھے کہ واپسی کی اجازت نہ ملی، بلکہ بلوچستان کی مروجہ روایات کے مطابق جعفر خان جمالی نے اس کے پاؤں پکڑ لیے اور کہا۔

''سائیں! اپنا فیصلہ بدل لو اور ہمیں چھوڑ کر نہ جاؤ۔''

وہ بھی ہٹ کا پکا تھا جب کوئی فیصلہ کر لیتا تو اس کو بدلوانا جوئے شیر لانے کے مترادف ہوتا تھا، مگر جمالی صاحب کی بات وہ نہ ٹال سکا اور وعدہ کیا کہ اب جب تک وہ خود نہ کہیں گے کہ ''اب تمہاری ضرورت نہیں رہی۔'' بلوچستان سے باہر قدم نہیں رکھے گا۔

کشتی والے واقعہ کو گزرے 5 سال ہو چلے تھے، کوئٹہ میں کچھ لوگ بڑے اشتعال انگیز نعرے لگاتے نظر آئے، یہ قیام پاکستان کے چند ماہ قبل کی بات ہے۔ پتا چلا کہ میر جعفر خان جمالی کے بعض سیاسی حریفوں نے ایک شخص کے قتل کی آڑ میں شہر میں ہنگامہ مچا رکھا ہے، ایک گھنٹے میں شہر میں ہڑتال ہو چکی تھی، انجمن اسلامی اسکول کے سامنے لوگوں کا جم غفیر تھا، محمد شریف اپنے گھر سے نکلا تو کچھ لوگوں نے اسے روک لیا اور کہا۔ ''آج گھر سے نکلنا تمہارے لیے خطرناک ہے، پارک کے جلسے میں تمہارے خلاف بھی نعرے لگیں گے کیونکہ تم جعفر جمالی کے ساتھی ہو۔

اس نے انہیں تسلی دی کہ اس کا وہاں موجود ہونا ضروری ہے، کیونکہ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ اس کے خلاف نعرے لگ رہے ہوں اور وہ وہاں موجود نہ ہو۔

وہ بھاگنے کے انداز میں مجمع کے درمیان پہنچا، اسے آتا دیکھ کر متعدد نوجوان اس کی طرف لپکے اور اسے گھیرے میں لے لیا، اس وقت لیڈر تقریر کر رہا تھا، اسے جب اس نوجوان کی آمد کی اطلاع ملی تو اس کی آواز حلق میں اٹک کر رہ گئی، اس نے بمشکل تمام جملہ مکمل کیا مگر جب اس نے مجمع کو مخاطب کیا تو ماحول بدل گیا اور وہی لوگ جو لڑنے مرنے پر آمادہ تھے خاموشی سے اپنے اپنے گھر لوٹ گئے۔ کچھ دیر بعد وہ بھی لوٹ آیا۔ گھر پہنچنے کے بعد وہ قلم کاغذ لے کر بیٹھ گیا۔

دوسرے روز اس جلسے کے حوالے سے اس کا مضمون چھپا تو اشتعال پھیلانے والے کو چھپنے کی جگہ نہ مل رہی تھی۔

ایسی چھوٹی چھوٹی باتیں اس کی شخصیت کو ابھار رہی تھیں۔ وقت گزرتا جا رہا تھا کہ اس نے بلوچستان سے باہر نکلنے پر غور کرنا شروع کر دیا۔ پہلے اس نے سوچا کہ لاہور جا کر کسی اخبار سے منسلک ہو جائے۔ پھر اس نے اس خیال کو مسترد کر دیا اور کراچی جانے کی تیاری شروع کر دی۔ یہ سفر اس لیے نہیں تھا کہ وہ ہمیشہ کے لیے کراچی میں ٹھہر جائے۔ صرف تبدیلی آب و ہوا کے لیے وہ کراچی جا رہا تھا۔

کراچی آ جانے سے قبل محمد شریف اپنے خسر مولانا غیاث الدین کا تعارفی مکتوب لے کر مولانا عبدالمجید سالک (مرحوم) کے پاس گیا، سالک صاحب نے خط پڑھا اور ان کی آنکھیں پرنم ہو گئیں، چائے منگوائی اور پھر کچھ لکھنے میں مصروف ہو گئے، چائے پیتے پیتے انہوں نے فارسی میں چند اشعار لکھ دیے، پھر اس پرزہ کی تحریر کو اپنے پیڈ پر منتقل کیا اور اسے محمد شریف کو دیتے ہوئے کہا۔ ''انہیں پڑھ لو اور مولانا تک پہنچا دو۔''

اس دور میں سالک صاحب کا ادب میں ایک مقام بن چکا تھا۔ سسر کے خط نے ان تک پہنچا دیا تھا۔ اس ملاقات کے

بعد وہ تواتر سے ان کے پاس جانے لگا۔ دونوں کے مراسم گہرے ہوتے چلے گئے، ایک دن محمد شریف نے ڈرتے ڈرتے انہیں "داستانِ مجاہد" کا مسودہ پیش کیا، تین روز کے بعد سالک صاحب سے ملاقات ہوئی تو سالک صاحب نے ناول کی خوب تعریف کی، ان کی دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے کئی مقامات پر بعض الفاظ کی تصحیح بھی کردی، وہ مسودہ لے کر کئی پبلشرز سے ملا لیکن کوئی بھی اسے چھاپنے کے لیے تیار نہ ہوا، انہی دنوں حفیظ جالندھری، انارکلی کے ایک کتب فروش اور سید نذیر نیازی نے مل کر ایک ادارہ قائم کیا۔ ایک دکان پر اس ادارے کا سائن بورڈ بھی نصب کردیا گیا۔ عبدالمجید سالک صاحب نے بھرپور سفارش کے ساتھ محمد شریف کی کتاب کا مسودہ انہیں پیش کردیا، ڈاکٹر تاثیر ایک طرح سے اس ادارے کے مشیر تھے، انہوں نے ناول کا مسودہ دیکھا تو کہا۔ "یہ پسند کی جانے والی چیز ہے۔"

سالک صاحب نے محمد شریف کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا "اب تم اطمینان سے بلوچستان جاسکتے ہو، جب واپس آؤ گے تو تمہاری کتاب مارکیٹ میں آچکی ہوگی۔"

محمد شریف بلوچستان جانے سے قبل لاہور آیا اور جب اس ادارے کے سامنے واقع انقلاب کے دفتر پہنچا۔ تو اسے حیرت کا جھٹکا لگا، حفیظ جالندھری کے دفتر کا نام ونشان نہ تھا، سائن بورڈ غائب تھا، دکان میں کچھ ایسا سامان بھرا ہوا تھا جس کا تصنیف وتالیف سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا، وہاں موجود لوگوں کے چہرے بھی اجنبی تھے۔ اسے یوں لگا شاید وہ جگہ اور مقام بھول گیا ہے، جب معلوم کیا تو پتا چلا کہ یہاں جو بورڈ لگا تھا وہ مالکان اتار کر لے گئے ہیں۔

حفیظ جالندھری کے بارے میں تو انہیں کچھ معلوم نہ ہوا، لیکن مسودہ جوان کا خزانہ تھا جس کی انہوں نے برسوں حفاظت کی تھی، وہ غائب ہوچکا تھا۔ وہ کسی لٹے پٹے مسافر کی مانند عبدالمجید سالک صاحب کے پاس پہنچا، سالک صاحب حسبِ معمول بڑے تپاک سے ملے، محمد شریف کی جرأت نہ ہوئی کہ ان سے براہ راست کوئی سوال کرتا، سالک صاحب چائے کا آرڈر دے کر اپنے کام میں مصروف ہوگئے، تب محمد شریف اٹھ کھڑے ہوئے، عرض کیا "جناب مجھے اجازت دیجیے، اس وقت چائے کو جی نہیں چاہ رہا، مجھے ایک ضروری کام بھی ہے۔"

سالک صاحب نے عینک کے اوپر سے اسے دیکھا اور کہنے لگے۔ "بھئی بیٹھ جاؤ، تھکے ہوئے ادیب کے لیے چائے

نسیم حجازی کے فنی سفر پر نظر ڈالیں تو محسوس ہوتا ہے کہ نسیم حجازی نے اپنے ناولوں میں مسلمانوں کے عروج وزوال کے ادوار اور ان کے اسباب پر خاص روشنی ڈالی ہے، ان کے ناولوں میں آپ کو مسلم تہذیب، تمدن اور ثقافت باتیں کھول کر ہنستی مسکراتی جبکہ دوسری جانب مسلمانوں پر آنے والے مصائب پر تاریخ آنسو بہاتی نظر آئے گی، ان تحریروں میں ادبی معیار، سلاست اور روانی اور شگفتگی خوب ملے گی، ان کے ناولوں میں شرم وحیا اور عفت و پاکدامنی کا تحفظ کرتی بیٹیاں آپ کو اپنی تاریخ سے محبت کرنا سکھادیں گی اور اس پر آپ کا احساس تفاخر جاگ اٹھے گا، دین کی خاطر اسلاف کے طرز پر قربانیاں دیتے بیٹے آپ کے انگ انگ میں جوش اور جذبے بھر دیں گے، جہاں مسلم سلطنتوں میں تہذیبوں کا سنگم آپ کو خوشگوار حیرت میں ڈال دے گا تو دوسری طرف اپنوں کی ریشہ دوانیاں آپ کو خون کے آنسو رلائیں گی۔

☆☆☆

آپ مسلم دور کی اہم فتوحات کے بارے میں جاننا چاہیں تو "داستانِ مجاہد" پڑھ لیجیے۔ جزیرہ نمائے عرب میں اسلام کے ابتدائی دور کا جائزہ لینا چاہیں تو "قیصر وکسریٰ" کی ورق گردانی کرلیجیے، خلافت راشدہ کا دور دیکھنا چاہیں تو "قافلہ حجاز" کا مطالعہ کیجیے، اندلس میں مسلمانوں کے عظیم الشان دور اور وہاں سے انخلاء اور سقوط غرناطہ کا کرب جاننا چاہیں تو "شاہین" اٹھا لیجیے، اسی طرح "اندھیری رات کے مسافر" اور "کلیسا اور آگ" میں اسپین کی گلیاں آج بھی اس عظیم دور کی راہ تکتی نظر آئیں گی، فتح بیت المقدس اور سقوط بغداد کے لیے "آخری چٹان" پر نظر ڈال لیجیے، ہندوؤں کے ہاں ذات پات کی تقسیم کے پس منظر میں قدیم ہندوستان کی جھلکیاں دیکھنا چاہیں تو "انسان اور دیوتا" میں آپ کو تاریخ اور تہذیب دونوں نوحہ کناں نظر آئیں گی۔ قیام پاکستان سے قبل برصغیر متحدہ ہندوستان کی تاریخ، تہذیب اور حالات کو سمجھنا چاہتے ہیں تو "پردیسی درخت"، "گمشدہ قافلے" اور "خاک وخون" سے بہتر کوئی چیز نہیں، جس میں آپ کو اس دور کی اتنی ہی بہترین عکاسی ملے گی، یہی نہیں! بلکہ نسیم حجازی نے چند اہم مسلم شخصیات پر بھی خوب خامہ فرسائی کی، انہوں نے تاریخ اسلام کے کم عمر ترین سپہ سالار "محمد بن قاسم" پر، "محمود غزنوی پر آخری معرکہ"، شہید ٹیپو سلطان کی دلیرانہ زندگی پر "اور تلوار ٹوٹ گئی" جبکہ ان کے والد حیدر علی پر "معظم علی" جیسے ناول لکھ کر ان شخصیات کو زبردست خراج عقیدت پیش کیا۔

سے زیادہ ضروری کام کوئی نہیں ہوتا۔"
محمد شریف بیٹھ گیا تو سالک صاحب نے اس کی طرف دیکھا اور چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی، میز کی دراز کھولی اور مسودہ نکال کر محمد شریف کے سامنے رکھ دیا اور بولے۔ "مجھے حیرت تھی کہ تم نے مجھے دیکھتے ہی شور کیوں نہیں مچایا۔"

محمد شریف نے جواب دیا۔ "مولانا آپ مسودے کے مل جانے کے حوالے سے میری آخری امید تھے اور مجھے ڈر تھا کہ اگر آپ نے بھی کہہ دیا مجھے مسودے کا کچھ علم نہیں تو پھر کیا ہوگا؟"

سالک صاحب مسکرانے لگے۔ "بھئی مجھے احساس تھا کہ تخلیق اس کے خالق کو کتنی عزیز ہوتی ہے، چنانچہ میں حفیظ صاحب کی نقل مکانی کی اطلاع ملتے ہی وہاں پہنچ گیا تھا اور مسودہ لے آیا تھا۔"

محمد شریف مسودہ لے کر گھر لوٹ گیا، اتفاق سے اس کے ایک دوست محمد اسماعیل جن کا خط بہت اچھا تھا وہ آئے ہوئے تھے، مسودے کی حالت خستہ ہو چکی تھی، انہوں نے ایک بار پھر اس کی اصلاح اور نقل کے لیے مسودہ محمد اسماعیل کے سپرد کر دیا، انہوں نے شب و روز کی محنت کے بعد تین ہفتوں میں مسودہ نقل کر دیا۔ محمد شریف دوبارہ مولانا سالک سے ملے، انہوں نے مشورہ دیا کہ تم شیخ محمد نصیر ہمایوں کے پاس جاؤ، اگر کاغذ کا مسئلہ حل ہو گیا تو وہ شائع کر دیں گے، میری ان سے بات ہو چکی ہے، محمد شریف قومی کتب خانہ جا پہنچا، وہاں میاں صاحب کے بڑے صاحبزادے شیخ محمد احسن موجود تھے۔ وہ اسلامیہ کالج میں اس کے ہم جماعت رہے تھے لیکن تب محمد شریف کو معلوم نہ تھا کہ ان کا قومی کتب خانے سے کوئی تعلق ہے، انہوں نے مسودہ وہاں چھوڑ دیا۔

1943ء اور 1944ء سے محمد شریف کی زندگی کے اہم سال تھے، انہی دو برسوں میں انہیں اپنے خوابوں کی تعبیریں ملنا شروع ہوئیں۔ وہ خواب جو اس نے کئی برس پہلے دیکھے تھے۔ اس کی تعبیر سامنے آنے لگی۔

اس کے لیے کاروبار کے بھی ایسے امکانات پیدا ہو گئے کہ وہ سال میں لاکھوں کما سکتا تھا لیکن اس نے کاروبار کے خیال کو رد کر دیا۔ کیونکہ ایک کامیاب ناول نگار بن جانے کا خیال ذہن میں پختہ ہو چکا تھا۔ رازق کو شاید اس کی یہ ادا پسند آ گئی تھی کہ اس نے کسی اور کام سے لاکھوں کمانے کی بجائے اپنے قلم کی کمائی سے حاصل ہونے والی روکھی سوکھی کو ترجیح دے دی۔ اسی برس بلوچستان میں تحریکِ پاکستان کی حمایت کے لیے میر جعفر اللہ جمالی صاحب نے محمد شریف کی ادارت میں روزنامہ "تنظیم" کی اشاعت شروع کی انہی دنوں شیخ محمد احسن نے اپنے ادارے سے ان کی تصنیف "داستانِ مجاہد" بھی شائع کر دی۔ یوں دیکھتے ہی دیکھتے ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک اس کی ناول نگاری کا ڈنکا بج اٹھا مگر یہ ناول اس نے قلمی نام سے لکھا۔ وہ محمد شریف نہیں بلکہ نسیم حجازی بن چکا تھا، سرزمین حجاز سے والہانہ عقیدت کے باعث اس نے اپنا قلمی نام "نسیم حجازی" (حجاز کی معطر ہوا) اختیار کر لیا تھا، ہر سو "داستان مجاہد" کے چرچے تھے۔

داستان مجاہد نے پورے برصغیر میں دھوم مچا دی تھی۔ اب کئی پبلشر نے نئے ناول کے لیے فرمائش شروع کر دی تھی۔

1945, 1946 اور 1947ء اس کی زندگی کے معروف ترین سال تھے۔ اس کا بیشتر وقت تحریک پاکستان کے سلسلے میں صرف ہوتا، مجبوراً تصانیف کے لیے اس نے رات کا آرام تیاگ دیا تھا، میر جعفر جمالی "تنظیم" کے سرپرست تھے اور وہ سیاست میں ان کے رفیق کار تھے۔ ان کے دوسرے مربی اور رفیق نواب محمد خان جوگیزئی تھے جنہوں نے بلوچستان کا پاکستان سے الحاق کے لیے مرکزی کردار ادا کیا تھا۔ ان کے فرزند ارجمند جہانگیر شاہ جوگیزئی (جن سے دوستی 40 سال سے زائد پر محیط تھی) وہ اس کے ہم سفر تھے لیکن نواب زادہ صاحب اتنے زیادہ قریب ہونے کے باوجود یہ نہیں جانتے تھے کہ وہ اخبار نکالنے اور تحریک پاکستان کے لیے عملی کوشش کے علاوہ بھی کوئی کام کرتا ہے۔ یہ راز ان پر اس وقت کھلا جب وہ پولیٹیکل ایجنٹ بن کر چلاس جا چکے تھے۔ اس وقت تک نسیم حجازی کے 5 ناول شائع ہو چکے تھے۔

ریفرنڈم کے دوران وہ "تنظیم" کی ادارت کے ساتھ ساتھ سیاسی ذمے داری بھی پوری کر رہے تھے۔ لوگ انہیں عزت دینے لگے تھے۔ ہر کوئی انہیں ادب سے مخاطب کرتا اور یہ ان کی بے لوث خدمت عوام کے باعث ممکن ہوئی تھی۔ وہ سندھ کی انتخابی مہم چلانے کے لیے جیکب آباد پہنچ گئے اور پبلسٹی کا کام اپنے ذمہ لے لیا، ساتھ ہی پنجاب کے انتخابات میں بھی اپنے ضلع گورداس پور کا دورہ کیا، اور ایک ہی روز میں کئی کئی جلسوں سے خطاب کیا، واپس آ کر انہوں نے پنجاب سے متعلق اپنے تاثرات پر مبنی جو رپورٹ قلمبند کی تو وہ 90 فیصد صحیح ثابت ہوئی۔

ان کی حالت اس کسان کی سی تھی جس کے دو کھیت گھر

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

سے دو مختلف اطراف میں ہوں، جب وہ ایک کھیت کی طرف متوجہ ہوتا ہو تو اسے یہ دھڑکا لگا رہتا کہ کہیں دوسری کھیتی نظر انداز نہ ہو جائے، ناول جو اس کے لیے ذوق کی تسکین کا باعث ہی نہ تھے بلکہ روٹی کے حصول کا ذریعہ بھی تھے اسے بھی پابندی سے وقت دے رہے تھے۔

فروری 1947ء کے اختتام پر جعفر جمالی صاحب نے یہ محسوس کرتے ہوئے کہ نسیم حجازی بہت تھک گئے اور ان کی صحت بھی خراب ہو رہی ہے، تار بھیج کر انہیں کوئٹہ سے جیکب آباد بلا لیا، وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ ان کے لیے کشمور میں شکار کا انتظام کیا گیا ہے۔ دوسرے روز ڈرائیور انہیں کشمور لے جاتا۔

کئی مہینوں کے بعد پہلا موقع تھا کہ دوپہر کے کھانے سے فراغت کے بعد انہیں آرام کا موقع ملا تھا۔ شام کو تازہ دم ہو کر اٹھے تو لکھنے کا موڈ طاری ہو گیا، لکھنے بیٹھے تو کمرا پتنگوں سے بھر گیا، مچھر سے بڑا اور مکھی سے چھوٹا ایک سیاہ پتنگا ہے جس کے لیے جیکب آباد میں برسات کا موسم اور اس کے بعد بہار کے ایام انتہائی سازگار ہوتے ہیں، اس نے گویا ہلہ بول دیا تھا۔ مجبوراً وہ ایک کرسی اور تپائی اٹھا کر چھت پر چلے گئے اور لائٹ جلانے کی بجائے چاند کی روشنی میں لکھنا شروع کر دیا۔ غالباً 12ویں 13ویں رات کا چاند ضوفشاں تھا۔ ان کی بینائی بہت تیز تھی، اس رات انہوں نے ''شاہین'' کا ایک باب لکھا جسے وہ اپنی بہترین تحریروں میں شمار کرتے ہیں۔

دوسرے روز انہوں نے کشمور جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور مزید ایک رات چاند کی روشنی میں لکھا۔ اس کے بعد کشمور گئے اور پھر ایک ہفتہ تک کشمور کے آس پاس شکار کھیلتے رہے، پھر کوئٹہ پہنچ گئے اور پھر بلوچستان کے پاکستان سے الحاق تک انہیں ایک دن کی فرصت نہ ملی، یکم اگست سے لے کر 14 اگست تک تو یہ حالت تھی کہ رات کو آرام کرنے کی روزانہ اوسط بمشکل اڑھائی تین گھنٹے تھی۔ انہیں جن سازشوں کا سامنا کرنا پڑا ان کی تفصیل کے لیے سینکڑوں صفحات درکار ہیں۔

14 اگست کے بعد انہیں مشرقی پنجاب میں اپنے عزیز، رشتہ داروں کی کوئی خبر نہ تھی، پیغام رسانی کے تمام سلسلے منقطع ہو چکے تھے، ان حالات میں بھی ان کی سب سے بڑی تمنا یہی تھی کہ جس طرح بھی ممکن ہو سکے، ''شاہین'' مکمل کر لیں، اور وہ اپنی قوم کو وہ سب باتیں سمجھا سکیں جو 5 صدی قبل اندلس کے مسلمانوں کے ذہن میں نہ آ سکی تھیں۔

پنجاب اور یوپی میں مسلمانوں کے قتل عام کی

اس ملک میں جب کبھی ادبی تعصب اور دھڑے بندیوں سے بالاتر ہو کر حقیقی ادب عالیہ کی تاریخ لکھنے والا کوئی فرد پیدا ہوا تو وہ یقیناً نسیم حجازی کا نام سرفہرست سنہری حروف میں لکھے گا، وطن عزیز میں ایک دن ایسا ضرور آئے گا جب طاؤس و رباب کی باتیں کرنے والوں پر شمشیر و سناں کی باتیں کرنے والا سبقت لے جائے گا۔

نسیم حجازی، ''حجاز'' گہوارہ اسلامی تہذیب کا اور جو ''نسیم'' اس گہوارہ تہذیب و تمدن سے نکل کر عاشقین وحدت و رسالتؐ کے قلب و ذہن کو سکون عطا کرنے کا باعث بنے اسے کیوں نہ دوامی مقبولیت اور عزت و افتخار حاصل ہو، نسیم حجازی صاحب نے اپنی شخصیت میں اس قدر محاسن جمع کر لیے تھے کہ ان کا احاطہ کرنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے، ان پر قلم اٹھانا آسان نہ تھا، تلوار کی دھار تیز ہوتی ہے اسے تیزی سے استعمال کیا جا سکتا ہے، قلم کے استعمال سے قبل کئی جتن کرنا ہوتے ہیں، اس گراں مایہ اور ہمہ صفت شخصیت کے بارے میں قلم کا استعمال کرتے ہوئے میں محسوس کر رہا ہوں کہ شاید میں ان کی شخصیت کے بارے میں انصاف کے تقاضے پورے نہیں کر سکا۔

☆☆☆

نسیم حجازی کا آج کے پاکستان کے نام ایک خط۔

اے قوم! مشرقی پنجاب میں جو کچھ ہوا، وہ فرقہ وارانہ فساد کا نتیجہ نہ تھا۔ تاریخ انسانی کے اس عظیم ترین قتل عام کے لیے فرقہ وارانہ فساد کا لفظ پروپیگنڈا کے فن کے ان استادوں کے دماغ کی اختراع ہے جنہوں نے دنیا کی نگاہوں کے سامنے اہنسا پرمودھرما کا نقاب ڈال کر بدترین بھیڑیوں کی فوج تیار کی تھی۔ مشرقی پنجاب، دہلی، بھرت پور، الور، پٹیالہ، فرید کوٹ، نابھہ اور کپورتھلہ کے اسٹیج پر جو خونیں ڈراما کھیلا گیا، اسے فرقہ وارانہ فساد سے کوئی نسبت نہ تھی۔ یہ وہ قتل عام تھا جس کی سرپرستی اور رہنمائی بھارت کی حکومت، بھارت کی فوج، پولیس اور بھارت میں شامل ہونے والی ریاستوں کے حکمران کر رہے تھے۔ نہرو اور پٹیل سے لے کر ایک سیوا سنگھی اور بلدیو سنگھ سے لے کر ایک اکالی رضا کار تک سب مسلمانوں کے قتل عام میں شریک تھے یہ قتل عام ہندوستان سے مسلمانوں کے مکمل استحصال کے منصوبے کی ایک کڑی تھی۔

اطلاعات سن کر کوئٹہ کے بعض افراد بھی مشتعل ہو گئے تھے اور شہر کے مختلف علاقوں میں فائرنگ کی آواز سنائی دینے لگی تھیں۔ وہ لکھ رہے تھے اور تازہ ہوا کے لیے ایک دروازہ کھول رکھا تھا، دروازے کے سامنے اگلی گلی تک ایک چھوٹا میدان تھا، اچانک انہوں نے پستول سے فائرنگ کی آواز سنی، ٹارچ لے کر باہر نکلے تو کیا دیکھتے ہیں کہ دوسری گلی میں ایک آدمی پڑا ہے جو شدید زخمی تھا۔ انہوں نے نبض ٹٹولی تو محسوس ہوا اس کی سانسیں رک رہی ہیں، ان کی گلی کی طرح اس گلی میں بھی مکینوں کی زیادہ تعداد ہندوؤں اور سکھوں پر مشتمل تھی اور زخمی ہونے والا مسلمان معلوم ہوتا تھا۔ قریب ہی ایک ہجوم نعرے لگاتا آ رہا تھا۔ وہ بھاگے اور ہجوم کو روکا، جلوس کے لیڈر سے کہا ''دیکھو! تمہاری نادانی کی وجہ سے ایک آدمی زخمی ہو گیا ہے، اسے فوراً اٹھا کر اسپتال لے جاؤ۔ لوگ ان کو اچھی طرح جانتے اور پہچانتے تھے چنانچہ فوراً زخمی کو اٹھا کر لے گئے۔

وہ واپس کمرے میں آئے اور پانی کے چند گھونٹ پینے کے بعد پھر لکھنے میں مصروف ہو گئے، فجر کی نماز کے بعد سو گئے، جب بیدار ہوئے تو انہیں محسوس ہوا کہ رات کوئی خواب دیکھا ہے۔ وہ جب لکھتے تھے تو گرد و پیش سے بے خبر ہو جاتے تھے گویا اپنے ناول میں گم ہو جاتے تھے۔ تاہم گزشتہ سطور میں مذکورہ واقعہ کے اثرات اتنے گہرے تھے کہ وہ باہر نکلے، دوسری گلی میں پہنچے اور وہاں خون کے نشان دیکھے تو انہیں یقین آیا کہ یہ خواب نہ تھا بلکہ حقیقت تھی۔

مشرقی پنجاب میں ان کے خاندان کے 11 افراد شہید ہو گئے، انہوں نے شدت سے محسوس کیا کہ شہید ہونے والوں کے لواحقین کی دیکھ بھال ان کی اولین ذمہ داری ہے، انہیں ضلع لائل پور (فیصل آباد) میں آباد کرنے کے بعد انہوں نے دیگر عزیز رشتہ داروں کی تلاش میں جگہ جگہ کی خاک چھانی، مہاجرین کے کیمپوں میں گئے پنجاب اور سندھ کے حالات دیکھے تو ان کے ذہن میں ایک اور ناول کا پلاٹ تیار ہو گیا لیکن ابھی بلوچستان میں ان کی ایک اہم ذمہ داری باقی تھی، وہ سمجھتے تھے کہ بلوچستان کی ریاستوں کے الحاق اور ساحلی علاقوں کو پاکستان کے لیے محفوظ بنائے بغیر برٹش بلوچستان کے الحاق کے کوئی معنی نہ تھے۔

بلوچستان کی ریاستوں کے پاکستان سے الحاق کی داستان طویل ہے۔ بہرحال جس روز یہ ریاستیں پاکستان میں شامل ہو گئیں تو انہوں نے سوچا کہ اب بلوچستان میں ان کا کام پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا ہے چنانچہ کسی ایسی جگہ جا کر لکھنے کی ضرورت ہے جہاں انہیں کوئی نہ جانتا ہو، وہ سیاست اور صحافت سے کنارہ کش ہونا چاہتے تھے، لیکن ہمت نہ ہوئی کہ وہ میر جعفر جمالی کو یہ کہہ سکیں کہ وہ انہیں چھوڑ کر جا رہے ہیں، انہوں نے میر صاحب کے ایک دوست سے درخواست کی کہ وہ اس مسئلہ پر جمالی صاحب سے بات کریں، ان کے یہ دوست حکیم ظہیر الحسن تھے، وہ جمالی صاحب سے ملاقات کے لیے نسیم حجازی کو ساتھ لے کر کراچی گئے۔ انہوں نے علیحدگی میں بات شروع کی تو میر صاحب نے انہیں فوراً کمرے میں بلایا اور مغموم لہجے میں بولے۔ ''حکیم صاحب کو تکلیف دینے کی کیا ضرورت تھی، تمہارے دل کی باتیں مجھ سے بہتر کوئی نہیں جانتا۔''

دوسرے روز انہوں نے نمناک آنکھوں سے حجازی صاحب کو رخصت کر دیا۔

نسیم حجازی بلوچستان سے لاہور پہنچنے کے بعد شمالی علاقوں کے دورے پر نکل گئے، انہیں ایبٹ آباد پسند آ گیا، یہ علاقہ گورداس پور کی طرح سرسبز و شاداب تھا اور وہاں انہیں اس قسم کے برفانی پہاڑ بھی دکھائی دیتے تھے جو وہ مشرقی پنجاب میں اپنے آبائی گھر کی چھت سے دیکھا کرتے تھے۔

ایبٹ آباد میں قیام کے دوران چند دوستوں نے انہیں آ گھیرا اور ملک کے تیزی سے بدلتے حالات کے پیش نظر راولپنڈی سے اخبار نکالنے پر اصرار کیا۔ عنایت اللہ مرحوم شیخ محمد احسن کی طرف سے پیغام لے کر آئے کہ اگر وہ ہامی بھر لیں تو تمام اخراجات وہ برداشت کریں گے، احباب کا یہ کہہ دینا ہی ان کے لیے کافی تھا کہ جہاد کشمیر میں آپ کے قلم کی ازحد ضرورت ہے۔

انہوں نے اس شرط پر ہامی بھر لی کہ میں اعزازی طور پر اخبار کے نگراں کی حیثیت سے تعاون کروں گا، یہ کام چونکہ خالصتاً قومی اہمیت کا حامل ہے چنانچہ کوئی معاوضہ نہیں لوں گا۔ ان کا یہ فیصلہ بھی دراصل اس وعدے کی خلاف ورزی تھی جو تحریک پاکستان والے نسیم حجازی نے بلوچستان چھوڑتے وقت ناول نگار نسیم حجازی سے کیا تھا۔ اس سلسلے میں ان کا کہنا تھا کہ اگر میں بحیثیت ناول نگار سوچوں تو مجھے یہ کہنا پڑے گا کہ یہ میری غلطی تھی لیکن جب پاکستانی کی حیثیت سے سوچتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ مجھے اگر قدرت دوبارہ زندگی کا سفر کرنے کا موقع بھی دے تو میں وہی کچھ کروں گا جو میں نے اس وقت کیا تھا، میں نے اپنے اندازے کے مطابق چند ماہ یا زیادہ سے زیادہ ایک سال رضاکارانہ خدمت کے لیے وقف کیا تھا لیکن

یہ کام بڑھتا چلا گیا۔ مجھے اس بات کا افسوس نہیں کہ روزنامہ "تعمیر" سے وابستگی کے بعد میں نے روزنامہ "کوہستان" نکال کر 14 برس اور قربان کر دیئے لیکن میری ادبی زندگی کا سب سے بڑا المیہ یہ تھا کہ بعض ہوشیار ساتھی میرا اور احسن صاحب کا راستہ الگ کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

تصنیف و تالیف کے تراجم کے دوران 1954ء میں نسیم حجازی کی کمر میں شدید درد شروع ہوا، تو انہوں نے شرف الدین اصلاحی جو ڈاکٹریٹ کر چکے تھے اور اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد میں ریسرچ اسکالر بھی رہے، ان کے رفیق کار اور معاون بن گئے۔ نسیم حجازی نے دو برس کے عرصہ میں بستر پر لیٹے لیٹے انہیں اپنے دو ناول بول کر لکھوائے، اخبار کے لیے اداریے اور فکاہی کالم بھی ساتھ ہی ساتھ لکھواتے رہے اور کبھی کبھار بعض مراسلوں کے جواب بھی انہی سے لکھواتے، 1957ء تک ان کی طبیعت قدرے بہتر ہو گئی، اسی سال انہوں نے مدتوں بعد گھوڑے کی سواری شروع کی۔

نسیم حجازی کو عروج حاصل ہو چکا تھا۔ قارئین سے اس قدر، محبت و شفقت مل رہی تھی کہ انہوں نے ادبی زندگی کے ابتدائی ایام میں تصور بھی نہیں کیا تھا۔ 1964ء میں نسیم حجازی نے صحافت کی دنیا کو خیر آباد کہا اور اپنی تمام تر توجہ اپنے اصلی اور بنیادی کام ناول نویسی پر مرکوز کر دی۔

اور اتنا ڈوب کر لکھنے لگے کہ ان کا قاری ہمیشہ یہی محسوس کرتا کہ جیسے ان کا محبوب ناول نگار، ان کی انگلی تھامے نگر نگر کی سیر کرا رہا ہے۔ ناول شاہین کے بارے میں ان کا کہنا تھا کہ مجھے یوں لگتا ہے جیسے میری عمر قرطبہ، اشبیلیہ اور اندلس کے دریاؤں، سمندروں، پہاڑوں اور میدانوں میں گزری ہے، "قیصر و کسریٰ" کا ذکر آتا تو کہتے اس ناول کا ایک ہی باب لکھنے کے بعد خیال آیا کہ جو مقامات دیکھے ہی نہیں تو ان کا ذکر بھی نامکمل رہے گا، یہ خیال آتا تھا کہ انہوں نے کہانی روک دی، اور پھر ایک شب خواب میں دیکھا کہ "وہ اپنے آبائی علاقے میں ہیں اور گھوڑے پر اپنے ایک استاد محترم سے ملنے ان کے گاؤں گئے ہیں۔ استاد محترم نے بتایا کہ حضور نبی اکرمؐ ایک جگہ جمعہ کا خطبہ ارشاد فرمانے والے ہیں، حجازی صاحب استاد محترم سے بولے کہ جانا تو مجھے کہیں اور تھا، لیکن چلیں اتنی بڑی سعادت سے محروم کیوں رہیں، پہلے خطبہ سننے کا شرف حاصل کرتے ہیں۔ آپؐ تشریف نہیں لائے تھے، ایک کھیت تھا جس میں تازہ تازہ کسی نے ہل چلایا تھا، وہ تنہا وہاں بیٹھے رہے، پھر ان کی آنکھ کھل گئی۔ اس خواب کو دیکھے ہوئے کچھ ہی روز گزرے ہوں گے کہ صدر جنرل ایوب خان کی طرف سے ایک خط انہیں ملا، خط میں تحریر تھا وہ ترکی اور ایران کے دورے پر ان صحافیوں کو ساتھ لے جانا چاہتے ہیں، جو اپنے اخراجات خود برداشت کر سکتے ہوں، نسیم حجازی صاحب نے فوری حامی بھر لی اور رخت سفر باندھنا شروع کر دیا۔ دل میں فیصلہ کیا کہ ترکی سے عمرے کی سعادت حاصل کرنے چلا جاؤں گا، انہیں یقین ہو گیا تھا کہ یہ بلاوا شاہ یثرب کی طرف سے آیا ہے۔

ایران پہنچے تو دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ روضۂ رسولؐ

جینیاتی تعمیر

فروری 1997ء میں برطانیہ کے روز لین (Roslin) انسٹی ٹیوٹ ایڈنبرا میں ایک بھیڑ ڈولی کی کامیاب کلوننگ کی گئی۔ اپریل 2002ء میں، کو سیلیر اجینومکس (ادارہ) نے انسانی جینوم کی نقشہ کشی مکمل کر لی اور اس طرح اربوں ڈالر کے عالمی منصوبے ہیومن جینوم پروجیکٹ کو شکست فاش دے دی، تاہم کلنٹن انتظامیہ نے 21 جون 2000ء کو سیلیر اجینومکس کے سربراہ کریگ ونٹر اور ہیومن جینوم پروجیکٹ کے غیر سرکاری نگران اعلیٰ فرانس کولنز کو مذاکرات کی میز پر لائے۔ فروری 2001ء کو انسانی جینیاتی نقشہ یا ہیومن جینوم کی تشریح شائع کر دی گئی۔ واشنگٹن کے نیشنل ہیومن جینوم انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر ڈاکٹر فرانسس کولنز کے مطابق یہ تحقیق اس بنا پر انتہائی اہم ہے کہ سائنس دانوں نے کم از کم جزوی طور پر جین کے معمہ اور پُر اسراریت کو حل کر لیا۔ اس سے ایک بات یہ بھی سامنے آئی کہ انسان میں جین کی مقدار اتنی نہیں ہوتی، جتنی کہ سمجھی جاتی تھی۔ دوسرے یہ کہ جینیاتی طور پر جو اچھائیاں اور برائیاں کسی فرد میں موروثی طور پر منتقل ہوتی ہیں اس کی ذمہ داری مردوں پر ہے۔ یعنی وراثت مرد کے ذریعے منتقل ہوتی ہے۔

جین کے ذریعے ہر چیز کا فیصلہ ہوتا ہے کہ آنکھیں کیسی ہوں گی، رنگت کیا ہوگی اور کن بیماریوں کا خطرہ ہوگا۔ انسان میں کم و بیش 30 ہزار جینز ہوتی ہیں۔ 2003ء میں انسانی جینوم کا مکمل ڈرافٹ شائع ہوا۔

پر حاضری دینے جا رہا ہوں، راستے میں عاشقانِ رسولؐ سے بھی ملتا جاؤں، چنانچہ حضرت شیخ سعدی، حضرت ایوب انصاری اور مولانا رومیؒ کے مزارات پر حاضری دی، انقرہ میں قیام کے دوران قدرت اللہ شہاب اور چند دوسرے صحافی بذریعہ جہاز مولانا رومی کے مزار پر حاضری کے لیے آ گئے تھے، نسیم حجازی کو جب یہ معلوم ہوا تو انہیں دکھ ہوا کہ معلوم نہیں اب وہ جا سکیں گے یا نہیں، اسی شب ایک شخص نے جہاں وہ ٹھہرے تھے اس کمرے کے دروازے پر دستک دے کر پوچھا۔ ''کیا آپ واقعی مولانا روم کے مزار پر حاضری دینا چاہتے ہیں؟''

نسیم حجازی نے کہا میں تو ابھی چلنے کو تیار ہوں، سعید نامی وہ شخص یہ کہہ کر چلا گیا کہ صبح انہیں ساتھ لے جائے گا، دوسرے روز نسیم صاحب اور مولوی سعید کار میں اڑھائی تین سو کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے قونیہ پہنچے جہاں مولانا روم کا مزار مرجع خاص و عام بنا ہوا تھا۔ انقرہ سے استنبول پہنچے تو بتانے لگے مجھے اپنے ناول کے لیے کچھ ایسے کرداروں کے مزارات کی ضرورت تھی جو قدیم استنبول میں ملنے چاہئیں تھے۔ ایک جگہ ٹوٹی دیوار دیکھ کر رک گئے اور وہاں موجود چند لوگوں کی اجازت سے اس دیوار پر چڑھ گئے انہیں سامنے مسجد اور چند قبریں دکھائی دیں جو ہو بہو وہی تھیں جنہیں وہ عالم خواب میں دیکھ چکے تھے، ان میں ایک قبر سلطان سلیمان کی دختر مہرو ماہ کی تھی۔

استنبول سے براستہ بیروت انہیں جدہ پہنچنا تھا۔

وہ جب سعودیہ پہنچے اور خانہ کعبہ میں داخل ہوئے تو باران رحمت سے ان کا احرام بھیگ گیا، انہوں نے اپنا نیا قلم جسے پہلے آب زم زم میں ڈبویا تھا، میزان رحمت کی دھار کے نیچے رکھ دیا، اس قلم سے انہوں نے ناول ''قیصر و کسریٰ'' مکمل کیا۔

اس سے قبل انہوں نے مکہ آتے ہوئے راستے میں چٹیل پہاڑیاں دیکھیں، ہر پہاڑی اپنی اپنی جگہ پر علیحدہ علیحدہ ایستادہ تھی، جنہیں دیکھ کر ان کے ذہن میں عرب کا سارا قبائلی نظام گھوم گیا۔ عرب قبائل بھی ان پہاڑیوں کی طرح جداگانہ حیثیت کے مالک تھے۔ پھر وہ مدینہ منورہ پہنچے اور اس باغ کو دیکھا جس میں تازہ تازہ ہل چلایا گیا تھا تو انہیں وہ خواب یاد آ گیا۔ یہاں نسیم حجازی کو گلاب کے پھول پیش کیے گئے جن کی پتیاں انہوں نے پاکستان واپسی پر احباب میں تقسیم کر دی تھیں۔ استنبول میں حضرت ابوایوب انصاریؓ کے روضہ پر

نوبل انعام یافتہ مسلمان

1901ء سے لے کر (جب نوبل انعام کا آغاز ہوا) اب تک 853 نوبل انعامات میں سے مختلف شعبہ جات میں 165 نوبل انعام یہودیوں کے حصے میں آئے ہیں جب کہ مسلمانوں کو صرف نو انعامات کا مستحق گردانا گیا ہے۔ نوبل انعام کی طرح سعودی عرب ہر سال مختلف شعبہ ہائے حیات میں کارہائے نمایاں انجام دینے والوں میں بھاری مالیت کے انعامات شاہ فیصل ایوارڈ کے نام سے تقسیم کرتا ہے ان میں سائنس کے شعبے میں اکثر عیسائی اور غیر مسلم شامل ہوتے ہیں (یہ بھی تمام مسلمانوں کے لیے عبرت کا مقام ہے) نوبل انعام حاصل کرنے والے مسلمان۔ (1) مصر کے سابق صدر انوار السادات (1979ء)، (2) مصر ہی کے نجیب محفوظ کو (1988ء) (3) فلسطین کے صدر یاسر عرفات (1992ء)، (4) ڈاکٹر احمد ذویل مصری (1999) (5) ایران کی شیریں عبادی (2003ء)، (6) محمد البرادی مصری (2005ء)، (7) بنگلہ دیش کے محمد یونس گرامین بینک (12006ء) (8) ترکی کے اورخان پاموک (2006ء)، (9) 2011 میں یمن کی خاتون توکل کرمان (یہ ایک اشاریہ چھ ارب مسلمانوں کے لیے عبرت کا مقام ہے۔)

آپ بیتی

اپنی آپ بیتی میں بشپ فلٹن شین نے لکھا ہے کہ ایک بار وہ فلاڈلفیا میں لیکچر دینے ٹاؤن ہال جا رہے تھے اور راستہ بھول گئے۔ انہوں نے چند نوجوان لڑکوں سے راستہ پوچھا۔ راستہ بتانے کے بعد ان لڑکوں نے پوچھا کہ وہ وہاں کیا کرنے جا رہے ہیں؟ بشپ فلٹن شین نے انہیں فخریہ طور پر بتایا کہ وہ وہاں ''جنت جانے کا راستہ'' کے عنوان سے لیکچر دینے جا رہے ہیں۔ اگر وہ چاہیں تو ان کے ساتھ چل سکتے ہیں۔ ان لڑکوں میں سے ایک نے مضحکہ اڑاتے ہوئے کہا۔ ''کیوں بے وقوف بناتے ہو ہم کو، ٹاؤن ہال جانے کا راستہ تو تمہیں معلوم نہیں اور چلے ہو جنت کا راستہ بتانے۔''

مرسلہ: جوزف مسیح۔ لاہور

بیٹھے تھے کہ ایک ساتھ تین پتے ان کی گود میں آ گرے، آپ نے انہیں حفاظت سے جیب میں رکھ لیا اور ان کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے دوستوں میں تبرک کے طور پر تقسیم کیے۔

نسیم حجازی صاحب کی ناول نگاری کی ابتداء "انسان اور دیوتا" سے ہوئی تھی جو تقریباً مکمل ہو چکا تھا لیکن ان کی خواہش تھی کہ پہلے "داستان مجاہد" منظر عام پر آئے کہ وقت کا تقاضا یہی ہے، چنانچہ ان کا پہلا ناول جو زیور طباعت سے آراستہ ہو کر قارئین کے ہاتھوں میں پہنچا وہ "داستان مجاہد" ہی ہے پھر "محمد بن قاسم" شائع ہوا، اس کے بعد "انسان اور دیوتا" یہ وہ زمانہ تھا جب نسیم حجازی ایک عجیب اضطراری کیفیت سے گزر رہے تھے، انہیں بار بار یہ خیال ستا رہا تھا کہ تاریخ کا ایک پہلو ابھی تک ان کے قلم کی زد میں نہیں آیا جس پر انہیں ضرور ناول لکھنا چاہیے تھا۔ اس دوران انہوں نے ایک خواب دیکھا کہ "کیچڑ کا ایک سیلاب ہے مگر جہاں وہ کھڑے تھے وہاں صاف اور شفاف پانی بہہ رہا تھا" جو پینے میں بہت میٹھا اور خوش ذائقہ تھا" انہیں کسی بزرگ نے خواب کی تعبیر یہ بتائی کہ جو تصنیف آپ کے ذہن میں ہے اس کو لکھ لیں، ناول کی پوری کہانی ذہن میں آ چکی تھی اور جب یہ ناول مکمل ہوا تو "آخری چٹان" کے نام سے چھپا۔

"آخری چٹان" جیسی معرکتہ الآرا تصنیف کے بعد ان کی طبیعت ہلکی پھلکی تحریروں کی طرف مائل ہوئی تو ان کی کتاب "سو سال بعد" منظر عام پر آ گئی، یہ وہ دور تھا جب یہ خطہ زمین غرناطہ بنا ہوا تھا اور قوم کو کسی حوصلہ افزا پیغام کی اشد ضرورت تھی۔ چنانچہ حجازی صاحب کا قلم پھر حرکت میں آیا اور "شاہین" جیسا بہترین ناول قارئین تک پہنچا، اس وقت تک ترقی پسندوں کے عزائم ناکام ہو چکے تھے۔ انہیں یہ یقین ہو گیا تھا کہ نسیم حجازی کا راستہ روکنا ان کے بس میں نہیں ہے۔

یوں بھی وہ بلوچستان سے ایبٹ آباد منتقل ہو چکے تھے۔ اس وقت "خاک اور خون" کا نصف حصہ لکھا جا چکا تھا، پھر "یوسف بن تاشفین" لکھا، یوسف بن تاشفین سے نسیم حجازی صاحب کی عالم خواب میں ملاقات بھی ہوئی۔

پھر نسیم حجازی مشرق وسطیٰ اور یورپ و امریکا کے دورے پر نکلے۔ "ہالی ووڈ" والوں نے ان کے ناول "محمد بن قاسم" پر فلم بنانے کی پیشکش کی، جسے انہوں نے ٹھکرا دیا۔ ان کے سامنے ایک اور بڑا چیلنج تھا۔ وہ سلطان محمود غزنوی پر ایک بہترین ناول لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ اس عظیم سلطان کی 18 سال کی کہانی لکھنے کی تڑپ نے انہیں امریکا میں مزید قیام کا

لورالائی

کوئٹہ ڈویژن کا ایک ضلع لورالائی ہے۔ اس ضلع کے شمال میں ژوب اور ڈیرہ اسماعیل خان، جنوب میں کوہلو اور راجن پور ہیں۔ اس کے مشرق میں ڈیرہ غازی خان اور مغرب میں بی ہے۔ دریائے لورالائی پورے ضلع سے گزرتا ہے۔ اس ضلع کا رقبہ 19 ہزار 73 کلو میٹر یعنی 7364 مربع میل ہے۔ شہر چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں سے گھرا ہوا ہے۔ جن کی بلندی ایک ہزار سے تین ہزار فٹ تک ہے۔ یہ علاقہ سطح سمندر سے 4700 فٹ بلند ہے۔ ضلع کی کل آبادی 50 ہزار کے لگ بھگ ہے۔ جس میں شہر لورالائی کی آبادی بیس ہزار کے قریب ہے۔ ضلع چار تحصیلوں پر مشتمل ہے جن میں موسیٰ خیل، بارکھان، دکی اور بوری شامل ہیں۔ لورالائی بوری میں آتا ہے۔ شہر لورالائی کوئٹہ سے 256 کلو میٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ شہر اور چھاؤنی کے درمیان ایک برساتی نالہ بہتا ہے۔ جس کو پشتو میں لوڑہ لئی کہتے ہیں۔ انگریز لوگ "ڑ" نہیں بول سکتے۔ اس لیے لورالائی مشہور ہو گیا۔ یہ قدیم شہروں میں سے ہے۔ مغربی ایشیا اور پاک و ہند کے درمیان تجارتی شاہراہ اسی میں سے گزرتی تھی۔ اس کی باقاعدہ تعمیر 1886ء میں ہوئی تھی۔ قیام پاکستان کے بعد یہ چھوٹا سا قصبہ تھا۔ 1960ء میں یہاں ٹاؤن کمیٹی تشکیل دی گئی۔ 1974ء میں ٹاؤن کمیٹی کو بڑھا کر میونسپل کمیٹی کا درجہ دے دیا گیا۔ شہر کے لوگوں کا پیشہ بنیادی طور پر سرکاری ملازمت اور کاروبار ہے جب کہ ضلع کے لوگوں کا بنیادی پیشہ باغات کی کاشت کاری اور پھلوں کی پیداوار اور فروخت ہے۔ شہر میں قالین بافی کا بڑا مرکز ہے۔ یہاں بھیڑ بکریوں کی افزائش نسل بھی ایک اہم پیشہ اور اون کی پیداوار کا سبب ہے۔ ضلع میں کوئلے کی کئی کانیں ہیں۔ تحصیل بارکھان میں تیل کے کنوئیں اور قدرتی گیس کے ذخائر دستیاب ہوئے ہیں۔ پھلوں میں خاص طور پر سیب، خوبانی، شفتالو، انار، انگور لورالائی میں کثرت سے پیدا ہوتے ہیں۔ شہر میں طلبہ کے لیے ڈگری کالج، طالبات کے لیے انٹر کالج، ایک ثانوی اسکول، ایک ماڈل اسکول اور متعدد پرائمری اسکول ہیں۔ ضلع بھر میں 13 ہائی اسکول، 333 پرائمری اسکول اور 291 مسجد اسکول ہیں۔ شہر میں چار بڑی مساجد ہیں۔ جن میں قرآن مجید اور دینی تعلیم کا بھی بندوبست ہے۔ تحریک آزادی میں یہاں کے لوگوں کی خدمات شامل رہی ہیں۔ جنگ آزادی کے وقت خان عبدالصمد خان اچکزئی نے "انجمن وطن" کی وساطت سے انگریزوں کے خلاف آزادی کی جنگ لڑی۔ سردار باز محمد خان اور حاجی صورت خان نے قائداعظم کی سرپرستی میں علاقے میں مسلم لیگ کی داغ بیل ڈالی۔ آزادی کی خاطر تختہ دار پر چڑھنے والے غازی ارسلان اور غازی ساون موسیٰ خیل کے نام تحریک آزادی کی تاریخ کے اوراق زریں ہیں۔ لورالائی کی ایک خاص اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ یہاں سے 1915ء میں ایک ادبی رسالہ "قندیل خیال" جاری ہوا تھا۔ جسے لورالائی کے سردار محمد یوسف دہلی جا کر وہاں سے چھپوا کر لاتے تھے۔

مرسلہ: انیلہ ظفر۔ لورالائی

موقع نہ دیا۔ وہ پیرس میں تھے کہ انہیں خبر ملی کہ لیاقت علی خان کو شہید کر دیا گیا ہے۔ وہ پریشان ہو گئے اور پہلی پرواز سے پاکستان پہنچے۔ اب جو ناول منظر عام پر آیا وہ ”آخری معرکہ“ تھا اور اس کے ساتھ ہی ایک اور کتاب ”ثقافت کی تلاش“ شائع ہوئی، پھر ”معظم علی“ اور اس کے بعد ”اور تلوار ٹوٹ گئی“ جیسے خوبصورت ناول لکھے۔

ناول نگاری کے ایک طویل سفر کے بعد نسیم حجازی نے ”قیصر و کسریٰ“ لکھا، اس تصنیف سے ایوان ناول نگاری جگمگا اٹھا، وہ کہتے ہیں پورے 40 سال تک وہ کوشش کرتے رہے کہ یہ ناول شروع کریں لیکن طبیعت مائل نہیں ہوتی تھی۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس موضوع پر ناول کیسے لکھیں گے، ایک روز ایسا بھی آیا کہ حسب معمول وہ ایک ایسی کیفیت سے گزرے جس کے بعد ”قیصر و کسریٰ“ کی کہانی کا مکمل خاکہ ان کے ذہن میں بن چکا تھا۔

اس کے بعد ”قافلہ حجاز“ لکھا جس میں ”حضرت ابو بکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمان غنیؓ اور حضرت علیؓ کے عہد خلافت کے واقعات قلمبند کیے، اب ایک ایسے ناول کی کہانی مکمل ہو رہی تھی جسے لکھ کر ایک طرح سے جناب نسیم حجازی نے پھانسی کا پھندا اپنے گلے میں ڈال لیا تھا اور پبلشرز کی ہمت اور حوصلے کی بھی داد دینی چاہیے کہ جس نے بھٹو دور میں یہ ناول چھاپ دیا۔ اس ناول کا نام ”اندھیری رات کے مسافر“ تھا۔ سقوط ڈھاکا کی خبر ان پر بجلی بن کر گری تھی، ان کا کہنا تھا ”سقوط ڈھاکا کی خبر سن کر کچھ دیر کے لیے میری زبان اور قلب و ذہن پتھرا گئے تھے، آنسوؤں کا ایک سمندر سمٹ کر خشک ہو گیا تھا، صرف اس قدر پانی بچا تھا کہ جس سے پلکیں بھیگ سکتی تھیں، انہوں نے ہوش و حواس کو مجتمع کیا اور ”اندھیری رات کے مسافر“ لکھنے کا عزم لے کر کاغذ قلم سنبھال لیے۔“

نسیم حجازی کے ناولوں میں ان کی آخری تصنیف ”کلیسا اور آگ“ تھی جو 1976ء میں شائع ہوئی، اسپین پر بہت کچھ لکھا جا چکا تھا لیکن سقوط غرناطہ کے بعد یہاں کیا ہوا؟ اس پر کسی نے قلم نہ اٹھایا تو انہوں نے اس شہرہ آفاق ناول میں وہ ہزاروں ”کربلائیں“ جمع کر دیں جن سے یہاں کے مسلمان گزر رہے تھے، 20,10 سال نہیں بلکہ پوری ایک صدی تک لوگوں کو زندہ جلایا جاتا رہا۔

اسپین جانے کے لیے نسیم حجازی بہت بے چین رہتے تھے، وہ بتاتے تھے کہ مجھے یہ خیال بار بار پریشان کر رہا تھا کہ وہاں پہنچ کر زندہ کیسے رہوں گا، اس لیے کہ وہاں تو آج بھی قدم قدم پر خون مسلم کے چھینٹے نظر آئیں گے۔

1965ء میں ”پورس کے ہاتھی“ کے نام سے ناول لکھا، جس میں جنگ پر طنز کیا گیا تھا، اسے مفت تقسیم کیا۔ 1965ء کی پاک بھارت جنگ کے دوران انہیں مختلف محاذوں پر جانے کا اتفاق ہوا، اور اسی دوران ہی یہ کتاب مکمل ہوئی، جناب حجازی زیادہ تر بیٹری کی روشنی میں بیٹھ کر لکھا کرتے تھے۔

انہوں نے جب ڈھاکا میں ہتھیار ڈالنے کی حوصلہ شکن خبر سنی جس کا یحییٰ خان نے اعلان کیا تھا تو وہ ”اندھیری رات کے مسافر“ لکھ رہے تھے۔ اس خبر نے انہیں اس طرح شاکڈ کیا کہ ہاتھ سے قلم گر پڑا اور تقریباً 3 ماہ تک دایاں ہاتھ ناکارہ رہا۔

نسیم حجازی اپنے آخری ایام میں ممتاز ایٹمی سائنسدان ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے توجہ دلانے پر سیاچن کے محاذ پر افواج کی جاں بازی کے پس منظر میں ایک ناول لکھ رہے تھے مگر شدید علالت کے باعث مکمل نہ کر سکے۔

تاریخی واقعات کو اجاگر کرنے والے نسیم حجازی 2 مارچ 1996ء کو تقریباً 82 برس کی عمر میں خود تاریخ بن گئے۔ 2014ء میں نسیم حجازی کو حکومتِ پاکستان نے شاندار خدمات پر نشان امتیاز سے نوازا۔ حکومت کی طرف سے اتنے بڑے ناول نگار کی خدمات کو ان کی موت کے بعد اگر خراج عقیدت پیش کیا گیا تو یہ اچھی بات ہے۔ وہ اسلام آباد کے مرکزی قبرستان میں آسودۂ خاک ہیں۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

ماخذ

راقم الحروف کا نسیم حجازی سے اپریل 1993ء میں انٹرویو...... نسیم حجازی ......ایک مطالعہ از: ڈاکٹر تصدق حسین راجا...... نسیم حجازی۔ داعی عظمت رفتہ مسلمانان عالم از: ڈاکٹر صغریٰ بانو شگفتہ)...... تاریخ اسلام از: معین الدین ندوی...... میں اور میرے بزرگ نسیم حجازی از: ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی...... نسیم حجازی...... چند تاثرات از: یوسف طلال علی ترجمہ: اعجاز احمد فاروقی...... نسیم حجازی از: بریگیڈیئر گلزار احمد...... نسیم حجازی...... میرا محبوب ادیب از: فضل حسین قتیل...... میرے خالو اور ہم از: بیگم شہباز خالد...... نسیم حجازی میری نظر میں از: بریگیڈیئر (ر) محمد شفیع...... نسیم حجازی اور بلوچستان از: نوابزادہ جہانگیر شاہ جوگیزئی...... شجر سایہ دار از: عارفہ عباسی...... نسیم حجازی...... ایک بھولا بسرا محسن از: ڈاکٹر واسع شاکر......

قوالی

تنویر ریاض

خالقِ ذات کی تنویر، علم و عرفان کی تفسیر، عرش پہ صاحبِ توقیر، لوحِ ایمان پر تحریر، کُل جہان میں سب سے افضل امام الانبیاء، وجہ خلقِ کائنات کی بڑائی بیان کرنے کا نام سماع ہے۔ اولیائوں نے اسے پسند کیا لیکن گزرتے وقت کے ساتھ اس میں کافی تبدیلیاں لائی گئیں۔ یہ کب کیسے اور کیوں، پسندیدگی کی حامل ٹھہری؟

سماع پر ایک مختصر سی تحریر قصۂ دلپذیر

قوالی صوفی میوزک کی ایک شکل ہے جس میں عارفانہ کلام پیش کیا جاتا ہے اور یہ جنوبی ایشیا کے مختلف حصوں میں سنی جاتی ہے۔ پاکستان میں سندھ اور پنجاب، شمالی ہندوستان میں حیدرآباد اور دہلی کے علاوہ بنگلہ دیش میں یہ ایک مقبول صنف سمجھی جاتی ہے اور اس کی روایت گزشتہ سات سو سال سے موجود ہے۔ قوالی کو متعارف کروانے کا سہرا عظیم صوفی شاعر حضرت امیر خسرو کے سر ہے۔ اسی طرح انہوں نے اردو شاعری

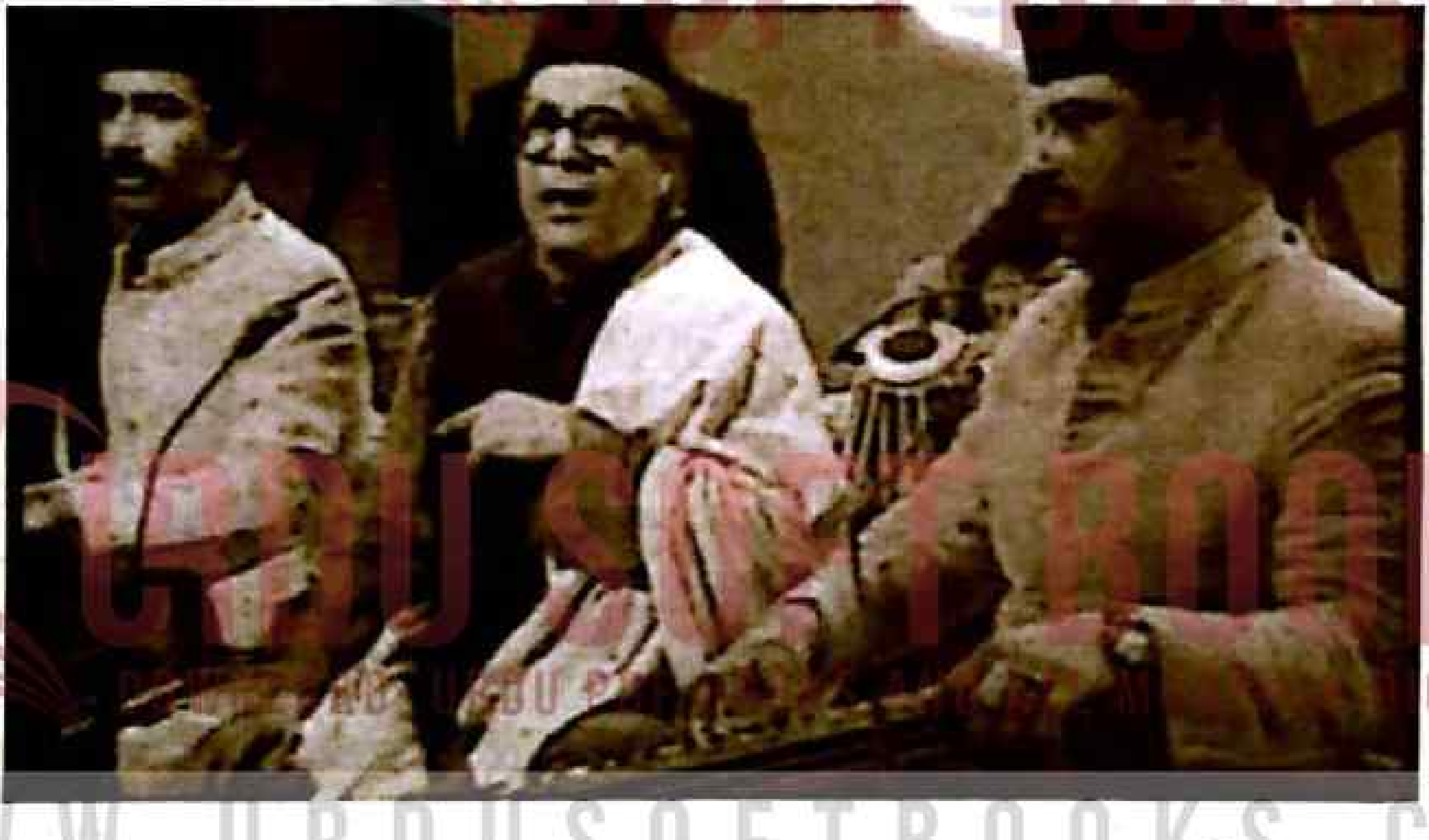

میں غزل کی بنیاد بھی ڈالی۔ یہ دونوں اصناف آج بھی برصغیر پاک و ہند میں مقبول ہیں۔ امیر خسرو شاعر اور اسکالر ہونے کے علاوہ موسیقار بھی تھے اور انہوں نے ستار اور طبلہ جیسے ساز ایجاد کیے۔ انہوں نے فارسی اور عربی میں بھی شاعری کی۔

قوالی عموماً اولیائے کرام اور بزرگانِ دین کے مزارات پر کی جاتی ہے۔ خصوصاً عرس کے موقع پر قوالوں کی مختلف ٹولیاں عارفانہ کلام کی صورت میں خراجِ عقیدت پیش کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ خاص خاص مواقع پر گھروں، محلوں اور اداروں میں بھی محافلِ سماع منعقد ہوتی ہیں۔ قوالی کی مقبولیت کے پیشِ نظر فلموں میں بھی اس کا رواج شروع ہوگیا۔ اس میں قوالی کے علاوہ حمد اور نعت بھی پیش کی جانے لگی۔ فلمی قوالی کی شکل وہ ہے جس میں کسی گانے کو قوالی کے انداز میں گایا جاتا ہے جب کہ کئی فلموں میں دو پارٹیوں کے درمیان قوالی کا مقابلہ بھی دیکھا گیا ہے۔

ٹیلی ویژن نے بھی قوالی کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔ کسی زمانے میں پی ٹی وی سے ہر ہفتے محفلِ سماع نشر ہوتی تھی جس میں ملک کے مایہ ناز قوال اپنے فن کا مظاہرہ کیا کرتے تھے پھر پرائیویٹ چینلز کی یلغار نے پاکستان ٹیلی ویژن کو پسپائی اختیار کرنے پر مجبور کردیا۔ اب ریٹنگ کی دوڑ میں سرکاری ٹی وی بہت پیچھے ہے اور اپنی بقاء کی جنگ لڑ رہا ہے اگر سرکاری سرپرستی اور لائسنس فیس کا سہارا نہ ہوتو یہ چینل بھی کا بند ہو چکا ہوتا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ پی ٹی وی نے دوسرے پروگراموں کو نظرانداز کر کے ساری توجہ ٹی وی ڈراموں پر مرکوز کردی ہے۔ راقم الحروف نے پی ٹی وی کی ویب سائیٹ بڑے غور سے دیکھی لیکن الف نون، ففٹی ففٹی جیسا کوئی پروگرام محفلِ مشاعرہ، محفلِ سماع، راگ رنگ اور محفلِ موسیقی میں کوئی پروگرام نظر نہیں آیا۔ اب قوالیاں کسی اسلامی چینل یا رمضان نشریات میں ہی دیکھنے کو ملتی ہیں۔

اس کے باوجود قوالی کا فن پوری آب و تاب سے زندہ ہے اور اسے اس مقام تک پہنچانے میں ان نامور قوالوں کا بہت بڑا حصہ ہے۔ جنہوں نے فلموں، ٹیلی ویژن، البم، پرائیویٹ محفلوں، فنکشن اور بیرونِ ملک اجتماعات کے ذریعے اسے پروان چڑھایا۔ شاعری کی مختلف اصناف مثلاً حمد، نعت، منقبت، غزل، کافی اور مناجات قوالی کے انداز میں پڑھی جاتی ہیں۔

قوال پارٹی عموماً آٹھ یا نو افراد پر مشتمل ہوتی ہے۔ جن میں مرکزی قوال کے علاوہ دو ساتھی قوال شامل ہوتے ہیں جب کہ چار پانچ افراد کورس کے انداز میں بول دہراتے ہیں۔ بقیہ لوگ ڈھول اور تالیاں بجاتے ہیں۔ ویسے تو خواتین ہر میدان میں مردوں کا مقابلہ کر رہی ہیں اور گلوکاری کے شعبے میں بھی انہوں نے اپنی پہچان بنائی ہے لیکن قوالی میں ان کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔ پاکستان میں صرف عابدہ پروین اور بھارت میں شکیلہ بانو بھوپالی ہی اس شعبے میں ممتاز نظر آتی ہیں۔

قوالی عموماً پندرہ سے تیس منٹ دورانیہ پر مشتمل ہوتی ہے۔ تاہم اب تک سب سے طویل ترین قوالی عزیز میاں قوال کی آواز میں "حشر کے روز یہ پوچھوں گا" 115 منٹ کی ہے جب کہ نصرت فتح علی خان کی بھی کم از کم دو قوالیاں ساٹھ منٹ سے زیادہ کی ہیں۔ ذیل میں چند ایسے قوالوں کا تذکرہ کیا جارہا ہے جنہوں نے اس فن کو پروان چڑھانے میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔

غلام فرید صابری: ان کا شمار پاکستان کے صفِ اوّل کے قوالوں میں ہوتا ہے جنہوں نے ایک طویل عرصہ تک قوالی کی دنیا پر راج کیا۔ انہیں قوالی کے شعبہ میں نمایاں خدمات انجام دینے پر 1978ء میں صدر پاکستان نے تمغۂ حسنِ کارکردگی سے نوازا۔ وہ 1930ء میں ضلع روہتک کے گاؤں

کلیانہ میں پیدا ہوئے اور چھ سال کی عمر میں انہوں نے اپنے والد عنایت صابری سے کلاسیکی موسیقی اور قوالی کی تعلیم حاصل کرنا شروع کی۔ پاکستان بننے کے بعد وہ کراچی آگئے اور یہاں مہاجر کیمپ میں قیام کیا۔ ابتدائی ایام بڑے کٹھن تھے۔ تاہم انہوں نے ایک ایک اینٹ جوڑ کر اپنا مکان بنایا تاکہ گھر والوں کو سر چھپانے کا ٹھکانا میسر آجائے۔

انہوں نے پہلی پبلک پرفارمنس 1946ء میں صوفی بزرگ مبارک شاہ کے عرس کے موقع پر کلیانہ میں دی۔ پاکستان آنے کے بعد 1956ء میں انہوں نے اپنے بھائی مقبول احمد صابری کے ساتھ مل کر گروپ بنایا اور صابری

URDUSOFTBOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

برادران کے نام سے پہچانے جانے لگے۔ ان کی پہلی ریکارڈنگ 1958ء میں ای ایم آئی پاکستان نے ریلیز کی۔ ''میرا کوئی نہیں ہے تیرے سوا'' کے نام سے یہ قوالی زبردست ہٹ ہوئی۔ ان کی دیگر مشہور قوالیوں میں ''بھردو جھولی میری یا محمد، تاجدار حرم، سرلامکاں سے طلب، بلغ العلیٰ بکمالہٖ، پیا گھر آیا یا صاحب الجمال ہوئے سویرے، خواجہ کی دیوانی، اندھیرے میں دل کے چراغ'' وغیرہ شامل ہیں۔ انہوں نے فارسی میں بھی کئی قوالیاں گائیں جن میں ''نمی دانم کہ منزل بود'' خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

صابری برادران نے پہلی بار 1975ء میں نیویارک کے کارنیگی ہال میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ وہ وہاں پرفارم کرنے والے پہلے پاکستانی تھے۔ اس کے علاوہ انہوں نے یورپ، ایشیا اور مشرق وسطیٰ کے کئی ملکوں کے دورے کیے۔ 1970ء میں حکومتِ پاکستان نے انہیں نیپال میں ہونے والی شاہی شادی میں نمائندگی کے لیے بھیجا۔ 1981ء میں انہوں نے ایمسٹرڈیم کے رائل ٹراپیکل انسٹی ٹیوٹ میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ 1989ء میں برطانیہ میں ہونے والے فیسٹیول میں حاضرین کو اپنی قوالی سے محظوظ کیا۔

غلام فرید صابری کی کئی قوالیاں فلموں میں بھی شامل کی گئی ہیں۔ ان کی ایک مشہور قوالی میرا کوئی نہیں ہے تیرے سوا، 1965ء میں بننے والی فلم عشق حبیب، میں اداکار ابراہیم نفیس پر فلمائی گئی۔ دیگر ستاروں میں طلعت صدیقی، ترنم، گرج بابو اور کمال ایرانی شامل تھے۔ فلم کے پروڈیوسر اے حمید اور موسیقار ظفر خورشید تھے۔ 1970ء میں بننے والی فلم چاند سورج، میں ان کی قوالی محبت کرنے والو ہم محبت اس کو کہتے ہیں شامل کی گئی۔ اس فلم کی کاسٹ میں شبانہ، ندیم، روزینہ اور وحید مراد شامل تھے جب کہ یہ قوالی غلام فرید صابری اور مقبول صابری پر ہی فلمائی گئی تھی۔ اس فلم کی موسیقی ناشاد نے ترتیب دی تھی۔ 1972ء میں ریلیز ہونے والی فلم ''الزام'' میں ان کی قوالی ''آئے ہیں تیرے در پہ تو کچھ لے کے جائیں گے'' کو شامل کیا گیا۔ اس فلم میں مرکزی کردار محمد علی، زیبا اور شاہد نے ادا کیے جب کہ موسیقی ناشاد کی تھی ان کی ایک اور سپرہٹ قوالی بھردو جھولی میری یا محمد، 1975ء میں ریلیز ہونے والی فلم بن بادل برسات میں موجود تھی۔ اس فلم میں زیبا، محمد علی، شاہد اور ننھا نے اہم کردار ادا کیے۔ ڈائریکٹر پروڈیوسر زینت بیگم اور موسیقی شمیم

نازی کی تھی۔ کراچی میں اس فلم نے گولڈن جوبلی منائی۔ بعد میں یہی قوالی عدنان سمیع خان نے سلمان کی فلم بجرنگی بھائی جان کے لیے گائی جس پر امجد صابری مرحوم نے شدید اعتراض کیا تھا۔ 1976ء میں ریلیز ہونے والی فلم سچائی، میں ان کی قوالی تیری نظر کرم کو شامل کیا گیا۔ اس کے اداکاروں میں شبنم، ندیم، طالش اور علاؤالدین شامل تھے۔ ہدایت کار پرویز ملک اور موسیقار نثار بزمی کی اس فلم نے کراچی میں گولڈن جوبلی منائی۔ ان کی ایک اور مشہور قوالی تاجدار حرم، 1982ء میں ریلیز ہونے والی فلم سہارے کی زینت بنی۔ اس کے اداکاروں میں شبنم، محمد علی۔ نشو وغیرہ شامل تھے۔ جب کہ موسیقی نیاز احمد کی تھی۔ فلم میں یہ قوالی صابری برادران پر ہی پکچرائز کی گئی۔ بعد میں اس قوالی جمشید صابری، فرید ایاز اور ابو محمد، عاطف اسلم، امجد صابری، اویس رضا قادری، احمد رضا قادری، شاب اینڈ توشی وغیرہ نے بھی گایا۔ ان کی ایک اور قوالی آفتاب رسالت، بھارتی فلم سلطان ہند میں انہی پر فلمائی گئی۔ وہ برصغیر پاک و ہند کے واحد قوال تھے جن کی سب سے زیادہ قوالیاں فلموں میں شامل کی گئیں۔

مقبول احمد صابری: غلام فرید صابری کے چھوٹے بھائی کلیانہ میں پیدا ہوئے اور انہوں نے بھی موسیقی کی ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ پاکستان آنے کے بعد انہیں استاد فتح دین خاں، استاد رمضان خان اور استاد لطافت حسین خان رامپوری کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا۔ انہوں نے گیارہ سال کی عمر میں بچہ قوال پارٹی کے نام سے اپنا ایک گروپ بنایا لیکن بہت جلد اپنے بھائی غلام فرید صابری کے ساتھ شامل ہو گئے اور صابری برادران کے نام سے پہچانے جانے لگے۔ انہوں نے بیشتر کلام اپنے بھائی کے ساتھ ہی گایا۔ تاہم انفرادی طور پر بھی ان کی کارکردگی نمایاں رہی۔ جن میں زیادہ تر غزلیں شامل ہیں۔ ان کی مقبول عام غزلوں میں تیرے گھنگھرو ٹوٹ گئے، آ جان وفا، کبھی تنہا بیٹھ کے، گل بدن گل پیرہن، جب بھی آنکھیں

ملاتے ہیں، وہ ایک ستم، میرے مزاج کی آوارگی اور آئینہ توڑ دیا شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی انفرادی قوالیوں میں ”بن گئی بات ان کا کرم ہوا، ہم مصطفوی مصطفوی“ دل سے میں شیدا ہو گیا، دیوانی دیوانی خواجہ کی دیوانی، تاجدار حرم، یہ میرا من بولے اور جیئے .... شاہ نورانی قابلِ ذکر ہیں۔ مقبول صابری کا انتقال 21 ستمبر 2011ء کو جنوبی افریقا میں ہوا۔

امجد صابری: غلام فرید صابری کے فرزند امجد فرید صابری یکم دسمبر 1976ء کو پیدا ہوئے۔ انہوں نے نو سال کی عمر میں اپنے والد کی شاگردی اختیار کی اور پہلی بار 1988ء میں بارہ سال کی عمر میں اپنے والد کے ہمراہ اسٹیج پرفارمنس دی۔ انہوں نے اپنے خاندان کے

کام کو آگے بڑھایا اور اس سلسلے میں بھارت، امریکا اور یورپ کے کئی دورے کیے۔ انہوں نے نہ صرف یہ کہ صابری برادران کی قوالیوں کو اپنے انداز میں پیش کیا بلکہ انفرادی طور پر قوالیاں، غزلیں اور نعتیں پڑھیں جن میں دعا مانگتا ہوں، ملتا ہے کیا نماز میں، زہرہ کی شادی، میں نذر کروں، میں مدینے چلا، بے خود کیے دیتی ہے، آؤ مدینے چلیں (جنید جمشید کے ساتھ) اور مست قلندر شامل ہیں۔ ان کا آخری پروگرام سماء کی سحری تھا جس میں انہوں نے ”روشن میری تربت کو“ اس انداز میں پڑھا کہ شرکاء کے آنسو نکل آئے اور وہ خود بھی آبدیدہ ہو گئے۔ اسی روز سفاک قاتلوں نے فائرنگ کر کے انہیں قتل کر دیا اور وہ چالیس سال کی عمر میں اپنے لاکھوں مداحوں کو روتا بلکتا چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

عزیز میاں قوال: ان کا شمار صف اوّل کے قوالوں میں ہوتا ہے، جنہوں نے غزل کو اپنے مخصوص قوالی کے انداز میں گا کر شہرت حاصل کی۔ انہیں طویل ترین قوالی حشر کے روز یہ پوچھوں گا۔ ریکارڈ کروانے کا اعزاز بھی حاصل ہے جس کا دورانیہ 115 منٹ تھا۔ ان کا اصل نام عبدالعزیز ہے۔ وہ 17 اپریل 1942ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ 1947ء

میں ان کا خاندان بھی پاکستان آ گیا۔ دس سال کی عمر میں انہوں نے لاہور میں استاد عبدالواحد خان کی شاگردی اختیار کی۔ اس کے علاوہ داتا گنج بخش اسکول میں بھی سولہ سال زیرِ تربیت رہے اور پنجاب یونیورسٹی سے اردو لٹریچر، عربی اور فارسی میں ڈگریاں حاصل کیں۔ وہ پاکستان کے واحد معروف گلوکار تھے جو اپنا کلام خود لکھتے تھے۔ گو کہ انہوں نے دوسرے شاعروں کا کلام بھی گایا ہے۔ وہ صابری برادران اور ان کے ہم عصر اور ایک طرح سے حریف بھی تھے۔

ان کی پہلی قابلِ ذکر پرفارمنس 1966ء میں سامنے آئی۔ جب انہوں نے شاہ ایران محمد رضا شاہ پہلوی کے سامنے اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ کیریئر کے ابتدائی دنوں میں وہ فوجی قوال کے نام سے مشہور تھے کیونکہ ان کی زیادہ تر قوالیاں فوجی بیرکوں میں جوانوں کے لیے ہوتی تھیں۔ انہوں نے اپنی شاعری کے علاوہ علامہ اقبال، سیف الدین سیف اور قتیل شفائی کا کلام بھی گایا۔ ان کی نمایاں خدمات کے اعتراف میں حکومتِ پاکستان نے انہیں تمغۂ حسن کارکردگی سے نوازا۔

ان کی کچھ مقبول قوالیاں یہ ہیں۔ عاشقی دل لگی نہیں ہوتی، انکھ لڑ گئی یار نال، بڑے بدنصیب تھے ہم، حشر کے روز میں پوچھوں گا، جنت مجھے ملے یا نہ ملے، میں شرابی شرابی، ملے کی شیخ کو جنت تیری صورت نگاہوں میں۔ یہ پیسا کیا کرے گا، نبی نبی یا نبی، بے وفا یوں تیرا مسکرانا، مجھے آزمانے والے، شکوہ جواب شکوہ، شہباز قلندر، وہ دل ہی کیا۔ آج کی رات ہے اور کبھی کہا کسی سے۔

عزیز میاں کا انتقال 8 دسمبر 2000ء میں تہران میں ہوا جہاں وہ حکومت ایران کی دعوت پر گئے تھے۔ ان کے چار بیٹے جنید، تبریز، عمران اور فاران باپ کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں اور ان کا انداز بھی عزیز میاں جیسا ہی ہے تاہم تبریز کا انداز اپنے باپ سے قریب تر ہے۔ وہ عزیز میاں کو خراجِ عقیدت پیش کرتے کے لیے شمالی امریکا کا

معزز قارئین آپ سے التماس ہے کہ ہم www.urdusoftbooks.com پر آپ حضرات کے لیے مسلسل اچھی اچھی کُتب فراہم کرنے کے لیے کوشاں رہتے ہیں جس کے لیے وقت اور رقم دونوں صرف ہوتے ہیں جس کی غرض سے ہماری اِس ویب سائٹ کُچھ سپانسر اشتہارات لگائے گئے ہیں جب ویب سائٹ وزٹرز اُن اشتہارات میں سے کسی اشتہار پر کلک کرتے ہیں تو ویب سائٹ کو تھوڑی سی آمدن حاصل ہوتی ہے، یہ آمدن ویب سائٹ کے اخراجات کو برداشت کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہے اس لیے آپ حضرات سے گزارش ہے کے اپنے Google Chrome یا Mozilla Firefox کی Adblocker Extension کو Pause کردیں یا صرف ہماری ویب سائٹ کے لیے Pause کردیں۔ نیچے نظر آنے والی تصویر میں دکھایا گیا ہے کے Adblocker کے Pause ہونے یا انسٹال نہ ہونے کی صورت میں اشتہارات **Green Box** والی جگہ پر ظاہر ہوں گے۔

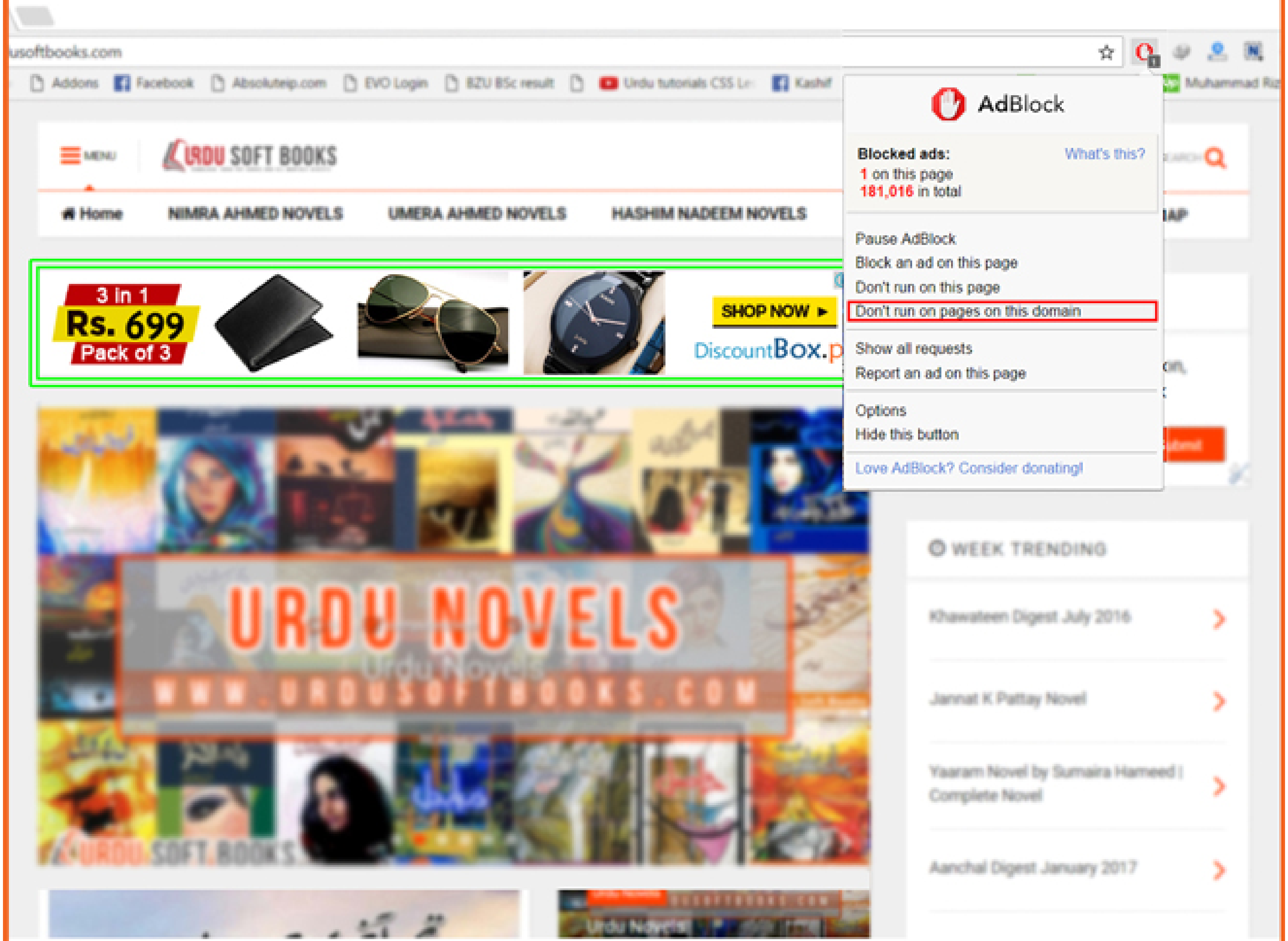

دورہ بھی کر چکا ہے۔

نصرت فتح علی خان: ان کا شمار پاکستان کے نامور قوالوں میں ہوتا ہے۔ انہیں یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ انہوں نے قوالی کو بین الاقوامی شائقین سے روشناس کرایا۔ وہ شہنشاہ قوالی کے نام سے پہچانے جاتے ہیں۔ نصرت فتح علی خان 13 اکتوبر 1948ء کو فیصل آباد میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے پہلی پبلک پرفارمنس اپنے والد کے چہلم پر 16 سال کی عمر میں دی۔ 1971ء میں انہیں خاندانی قوال پارٹی کا سربراہ بنا دیا گیا۔ برمنگھم کی اورینٹل اسٹار ایجنسیز کے ساتھ معاہدہ کیا اور 80ء کی دہائی میں انہوں نے یورپ، انڈیا، جاپان، پاکستان اور امریکا میں اپنے البم ریلیز کیے، انہوں نے مغربی فنکاروں کے ساتھ مل کر بھی کافی کام کیا اور ورلڈ میوزک آرٹسٹ کے طور پر پہچانے جاتے تھے۔ انہوں نے اپنے کیریئر کے دوران بے شمار سفر کیے اور چالیس سے زیادہ ملکوں میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔

نصرت فتح علی خان کے کارناموں کی فہرست بہت طویل ہے۔ 1985ء کے موسم گرما میں انہوں نے ورلڈ آف میوزک آرٹس اینڈ ڈانس فیسٹیول لندن میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ 1985ء اور 1988ء میں پیرس کے شائقین کو اپنے فن سے محظوظ کیا۔ 1987ء میں جاپان فاؤنڈیشن کی دعوت پر پہلی بار جاپان گئے اور پانچویں ایشین فیسٹیول میں کارکردگی دکھائی۔ 1989ء میں بروکلین اکیڈمی آف میوزک نیویارک میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔

انہوں نے کئی پاکستانی فلموں میں گانے گائے اور پرفارم کیا۔ انتقال سے کچھ عرصہ پہلے انہوں نے بولی وڈ کی تین فلموں ''اور پیار ہوگیا، کارتوس اور کچے دھاگے'' کی موسیقی ترتیب دی اور پیار ہوگیا، میں انہوں نے ایک گانا کوئی جانے کوئی نہ جانے بھی گایا اور اسکرین پر ایشوریہ رائے اور بوبی دیول کے ہمراہ نظر آئے۔ یہ فلم ان کی وفات کے بعد ریلیز ہوئی۔ کچے دھاگے میں ان کا ایک گانا اس شان کرم کا کیا کہنا شامل تھا۔ یہ فلم ان کے انتقال کے دو سال بعد ریلیز ہوئی۔ انہوں نے سنی دیول کی دل لگی کے لیے ''سایہ بھی ساتھ چھوڑ جائے'' ریکارڈ کروایا جو ان کی وفات کے دو سال بعد ریلیز ہوا۔ انہوں نے ایک اور فلم دھڑکن کے لیے ''دولہے کا سہرا'' گایا۔ یہ فلم 2000ء میں ریلیز ہوئی۔ ان کا انتقال لندن کے کرامویل اسپتال میں 48 سال کی عمر میں ہوا۔

نصرت فتح علی خان کو ان کی اعلیٰ فنی خدمات کے صلے میں کئی اعزازات ملے۔ 1987ء میں حکومت پاکستان نے انہیں تمغہ حسن کارکردگی دیا۔ 1995ء میں انہیں یونیسکو میوزک پرائز ملا۔ اس کے علاوہ بھی انہیں بے شمار بین الاقوامی اعزازات سے نوازا گیا۔ ان کی چند مشہور قوالیاں اور غزلیں یہ ہیں۔ میرے رشک قمر، تم اگر یونہی نظریں ملاتے رہے، سوچتا ہوں کہ وہ کتنے معصوم تھے، یہ جو ہلکا ہلکا سرور ہے، ہے کہاں کا ارادہ، تم ایک گورکھ دھندا ہو، خدا کے لیے چھوڑ دو، سانوں اک پل چین نہ آوے، اب کیا سوچا کیا ہونا ہے، کہتے ہو مجھ سے، حسن والوں سے اللہ بچائے، کسے دا یار نہ وچھڑے، اکھیاں اڈیک دیاں، سانسوں کی مالا، دم مست قلندر، مجھے تم یاد آتے ہو، اس کرم کا کروں شکر کیسے ادا، میری توبہ میری توبہ، غم ہے یا خوشی ہے تو، آنکھ اٹھی، شمس الضحیٰ بدرالدجیٰ، یہ ترک تعلق کا، ایسا بنا سنورنا، کیوں کھڑے تو نظریں ہٹا داں، آفریں آفریں، وہی خدا ہے، جے تو رب نوں مانونا، میرے گھر سے کہاں جائے گی۔ گنج شکر، نی میں جانا جوگی دے نال، علی مولا علی.... ہر دم علی علی کر، یاحی یاقیوم، مست نظروں سے اللہ بچائے، نہ رکتے ہیں آنسو، اے ری سکھی موہے خواجہ گھر آئے، بے وفا سے بھی پیار ہوتا ہے، شکوہ جواب شکوہ وغیرہ۔

راحت فتح علی خان: نصرت فتح علی خان کے بھتیجے اور فرخ فتح علی خان کے بیٹے ہیں۔ وہ 1974ء میں پیدا ہوئے۔ بنیادی طور پر قوال ہیں لیکن غزل اور ہلکی پھلکی موسیقی میں بھی جواب نہیں رکھتے۔ وہ تین سال کی عمر سے اپنے والد اور چچا کے ساتھ گا رہے تھے۔ سات سال

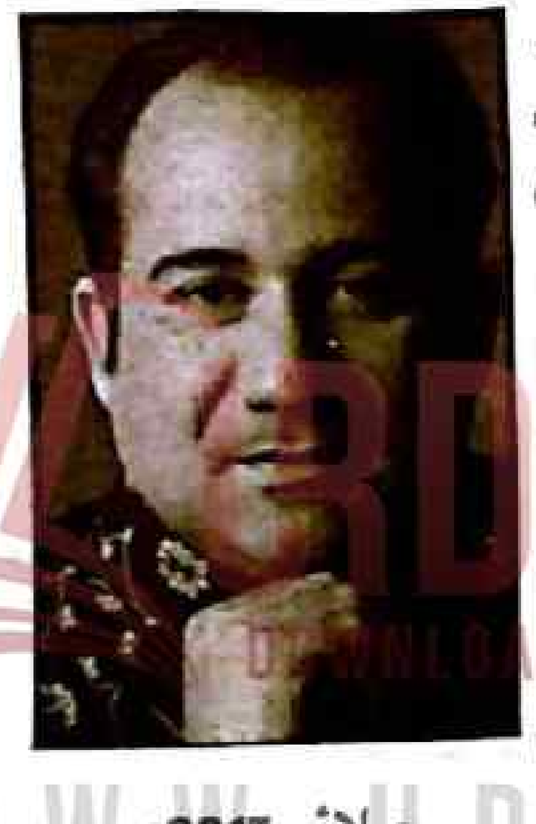

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

کی عمر میں انہوں نے اپنے چچا سے باقاعدہ تربیت لینا شروع کی اور نو سال کی عمر میں دادا کی برسی کے موقع پر پہلی بار پبلک میں پرفارمنس دی۔ پندرہ سال کی عمر میں وہ نصرت فتح علی خان کی قوال پارٹی کا حصہ بن چکے تھے۔ 1985ء میں انہوں نے انگلستان کا دورہ کیا اور گروپ کے علاوہ سولو پرفارمنس بھی دی۔ 27 جولائی 1985ء کو برمنگھم میں ہونے والے ایک کنسرٹ میں انہوں نے سولو غزل گائی۔ 2003ء میں انہوں نے پہلی بار بولی وڈ کی فلم ''پاپ'' کے لیے گانا گایا۔ ٹیلی ویژن پر انہوں نے سونو نگم کے ساتھ چھوٹے استاد کیا۔ 2008ء میں ہونے والے ریلیٹی شو ''جنون'' میں جج کے فرائض انجام دیے۔ راحت پہلے پاکستانی گلوکار ہیں جنہیں 2014ء میں ہونے والے نوبل امن انعام کے کنسرٹ میں گانے کا موقع ملا۔ جہاں انہوں نے نصرت فتح علی کی یادگار قوالیاں جنہیں دل گی اور مست قلندر سنائیں۔

23 مارچ 2016ء کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں یوم پاکستان کی تقریب منعقد ہوئی۔ اس موقع پر صوفی نائٹ کے عنوان سے ایک کنسرٹ کا اہتمام کیا گیا جس کے واحد پرفارمر راحت فتح علی خان تھے۔ انہوں نے 140 ملکوں کے مندوبین کے سامنے اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ وہ کوک اسٹوڈیو کے تین سیزن میں شرکت کر چکے ہیں۔ انہوں نے پہلے سیزن میں علی عظمت کے ساتھ مل کر گرج برس گایا۔ چھٹے سیزن میں عابدہ پروین ان کے ساتھ تھیں جب کہ نویں سیزن میں مومنہ مستحسن کے ساتھ آفریں آفریں اور امجد صابری کے ساتھ رنگ گایا۔

راحت فتح علی خان کے کچھ مشہور گانے، غزلیں اور قوالیاں یہ ہیں۔

ضروری تھا، جنہیں دل گی، آفریں آفریں، زندگی تم، دل دا حال، میں جہاں رہوں، اک خواب سناواں، محبت تم سے نفرت ہے، اکھیاں، اج ہونا دیدار، ایسی ملاقات ہو، نظر سے نظر ملی، تم اتنی خوب صورت ہو۔ درد سے تجھ کو، او رے پیا، میں تینوں سمجھاواں کی، اپنا مقام پیدا کر، پیارے پیارے، تیرے ہونٹوں کو سلام، آ کے تیری گلی، یاداں تیریاں، تجھے دیکھ دیکھ، میرے مہرباں، تیری میری، آمد مصطفیٰ مرحبا و خدایا، کیتا سوہنا تینوں رب نے بنایا، تیرے بنا، میرا یار ملا دے، تیرے مست مست دو نین، تو نا یاد کر، تیرے بنا جینا، کوئی امید بر نہیں آتی، تیری میری پریم کہانی۔

بدر میاں داد: اصلی نام بدر علی خان ہے۔ 17 فروری 1962ء کو پاک پتن میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد استاد میاں داد اور دادا استاد دین محمد اپنے زمانے کے معروف قوال تھے۔ بدر میاں داد نے اپنا کیریئر 1975ء میں شروع کیا اور 80ء کی دہائی کے وسط تک ان کی شہرت دور دور پھیل چکی تھی۔ انہوں نے کئی پاکستانی اور بولی وڈ فلموں میں موسیقی بھی دی۔ ان کی مشہور قوالیوں میں دم دم حسین مولا حسین، جشن آمد رسول، تو نئیں تے تیریاں یاداں سہی، حسن والو خدا کے لیے چھوڑ دو شامل ہیں۔ بدر علی خان کا انتقال 2 مارچ 2007ء کو حرکت قلب بند ہو جانے سے ہوا۔ پاکستان میں ان کی دو سو البم ریلیز ہو چکی ہیں۔

عابدہ پروین: ان کا شمار عظیم صوفی سنگر، موسیقار کے طور پر ہوتا ہے۔ وہ 20 فروری 1954ء کو لاڑکانہ میں پیدا ہوئیں۔ اپنے والد غلام حیدر سے تربیت حاصل کی جو خود بھی مشہور گلوکار اور موسیقی کے استاد تھے۔ وہ مختلف سازوں کا استعمال بڑی مہارت سے کرتی ہیں۔ انہوں نے

1970ء کے اوائل میں اپنا کیریئر شروع کیا اور 1990ء تک وہ بین الاقوامی شہرت حاصل کر چکی تھیں۔ انہوں نے 1993ء میں دنیا کا دورہ کیا اور پہلی بار کیلی فورنیا میں پرفارمنس دی۔ وہ پاکستان کے مقبول شو کوک اسٹوڈیو میں بھی حصہ لے چکی ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے ایک میوزک شو میں رونا لیلیٰ اور آشا بھونسلے کے ساتھ جج کے فرائض بھی انجام دیے۔ وہ کئی پاکستانی اور بھارتی ریلیٹی شوز میں حصہ لے چکی ہیں۔ جن میں پاکستان آئیڈول، چھوٹے استاد اور اسٹار وائس آف انڈیا شامل ہیں۔ انہیں غزل،

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

ٹھمری، خیال، قوالی، راگ، کلاسیکل اور نیم کلاسیکل گانے پر عبور حاصل ہے جب کہ کافی، ان کا خاص شعبہ ہے۔ وہ اردو، سندھی، سرائیکی، پنجابی، عربی اور فارسی زبانوں میں گا چکی ہیں انہوں نے نیپالی زبان میں بھی گایا ہے۔

انہیں 1984ء میں صدارتی تمغۂ حسن کارکردگی دیا گیا۔ 2005ء میں ستارۂ امتیاز اور 2012ء میں ہلال امتیاز ملا۔ اس کے علاوہ انہیں گولڈ لال شہباز قلندر میڈل، شاہ بھٹائی ایوارڈ (دو مرتبہ)، سندھ گریجویٹ ایوارڈ، پاکستان ٹیلی ویژن ایوارڈ، چگل سرمست ایوارڈ، اے آر وائی قلم ایوارڈ اور ہم ایوارڈ بھی مل چکے ہیں۔ ان کے سو سے زیادہ البم ریلیز ہو چکے ہیں۔ عابدہ پروین کے گائے ہوئے کلام کی تفصیل یہ ہے۔

یار کو ہم نے جا بجا دیکھا، مولائے کل، ارے لوگو تمہارا کیا، جب سے تو نے مجھے دیوانہ بنا رکھا ہے، اب مجھے ہوش کی دنیا میں، تیرے عشق نچایا، کچھ اس ادا سے آج وہ، میں نعرہ مستانہ، لال شہباز شاہ کی چادر، اک نکتے وچ گل مکدی، علی حق دا امام، زاہد نے میرا حاصل ایمان، ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں، دمادم مست قلندر، نادعلی، ملک خدا، یہ نہ تھی ہماری قسمت، کوئی امید بر نہ آئی۔ دل ہی تو ہے وغیرہ۔

استاد بہاؤالدین خان: 1934ء میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے موسیقی کی تعلیم اپنے والد سلیمان خان اور چچا سردار خان سے حاصل کی۔ انہوں نے چھ سال کی عمر میں ہی پبلک پرفارمنس دینا شروع کردی۔ وہ منظور نیازی قوال اینڈ پارٹی کے ممبر ہونے کے علاوہ علیحدہ بھی اپنے فن کا مظاہرہ کیا کرتے تھے۔ 2000ء میں انہیں حکومت پاکستان نے تمغۂ امتیاز دیا۔ انہوں نے ساری دنیا میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ وہ یورپ، مشرق وسطی، مشرق اور جنوبی افریقا، ایران اور بھارت کئی بار گئے۔ بھارت میں نیشنل سینٹر فار دی پرفارمنگ آرٹس نے ان کی قوالی کا اسٹائل گولڈ ٹیپ پر ریکارڈ کیا تاکہ دو سو سال تک محفوظ رہے۔ بی بی سی کے فرانسیسی حکام نے

1960ء کی دہائی کو پاکستانی موسیقی کے سنہرے دور کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ اس دور میں ملکہ موسیقی روشن آرا بیگم، استاد امانت علی خاں، استاد فتح علی خاں، استاد نزاکت علی خاں، استاد سلامت علی خاں، استاد شریف خاں پونچھ والے ستار نواز، کلارنٹ نواز سوہنی خاں، بیانو بجانے والے ماسٹر صادق علی، استاد نبی بخش خاں سارنگی نواز، استاد حیدر بخش، استاد ناظم علی سارنگی نواز، استاد شوکت علی اور استاد طالب حسین خان طبلہ نواز کلاسیکی موسیقی کے تابندہ ستارے تھے۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ برِاعظم میں کلاسیکی موسیقی ہندوؤں کی وجہ سے پھلی پھولی جب کہ حقیقت یہ نہیں ہے۔ جب مسلمان ہندوستان میں وارد ہوئے تو ہندوؤں میں دھرو، پد، چھند، کبت اور دوہا گانے کا رواج تھا۔ راجا خاں سنگھ کے درباری بخشو اور مجھو نے دھرو اور پد کو ملا کر گانا شروع کیا جس سے دھروپد کی گائیکی شروع ہوئی "دھر" کے معنی ٹھہرا ہوا اور "پد" کے معنی لفظ یا مرتب۔ دھرپد کے مزاج میں ٹھہراؤ اور دبدبہ ہے۔ اس کے چار حصے ہیں۔ 1۔ استھائی۔ 2۔ انترا۔ 3۔ سنچاری۔ 4۔ ابھوگ۔ پندرہویں صدی میں جون پور کے شاہانہ شرقیہ میں سے سلطان حسین شرقی نے ایک نئے ڈھنگ کا گانا ایجاد کیا اور اس کا نام "خیال" رکھا۔ ایک روایت یہ ہے کہ حضرت امیر خسروؒ نے دوسری ایجادات کے ساتھ خیال بھی ایجاد کیا۔ شاہد احمد دہلوی کا کہنا ہے کہ "ممکن ہے یہ طریقہ امیر خسرو ہی نے وضع کیا ہو مگر خیال کی ترویج کا سہرا سلطان حسین شرقی کے سر ہی ہے"۔ مسلمان گویوں نے خیال (گائیکی) کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے یعنی 1۔ الاپ۔ 2۔ استھائی۔ 3۔ انترا۔ 4۔ ترانہ۔ الاپ کو ایرانی موسیقی میں اہم سمجھا جاتا تھا۔ اسے ادا یا پیش بھی کہتے تھے۔ خیال گائیکی کی لطافت اور ریاض نے اسے اس بام عروج تک پہنچا دیا ہے جہاں اسے مسلمان گھرانوں کی میراث ہونے کا درجہ حاصل ہے۔ کلاسیکی موسیقی سولہویں صدی سے لے کر انیسویں صدی کے اواخر تک استادوں کی موسیقی بن چکی تھی یعنی ان صدیوں میں اکابر موسیقار، کتھک کار، طبلچی اور پکھاوجی مسلمان استاد تھے جنہوں نے ہندوستانی موسیقی کو وہ ہیئت اور اسالیب عطا کیے جو فی زمانہ بھارت اور پاکستان کی موسیقی میں رائج ہیں۔

مرسلہ: عنایت اللہ۔ کوئٹہ

بھی تحقیق اور حوالے کے پیشِ نظر ان کا کلام ریکارڈ کیا، ان کی اردو، فارسی اور عربی قوالیاں باقاعدگی سے ٹیلی کاسٹ ہوتی رہی ہیں۔ ان کے پانچوں بیٹے، باپ کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔ ان کی چند منتخب قوالیاں یہ ہیں۔

آج رنگ ہے، حیرت عشق نہیں، کفتم کہ روشن از قمر، نقاب رخ سے اٹھاؤ، یا حبیبی یا محمد، چاپ تلک، گنج شکر، مجھے ہوش نہیں، کرپا کرو مہاراج معین الدین، آج کرتا ہے چراغاں، کیسا ناچ نچایا، نمی دانم چہ منزل بود، علی مولا علی مولا، تم سنگ موہن، نی میں جانا جوگی دے نال وغیرہ۔

شیر میانداد: بدر میانداد کے چھوٹے بھائی اور نصرت فتح علی خان کے کزن ہیں۔ وہ 1968ء میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد استاد میانداد خان سے موسیقی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی اور 1996ء میں اپنا گروپ شروع کردیا۔ وہ امریکا، انڈیا، سنگاپور، جنیوا اور ناروے میں اپنے فن کا مظاہرہ کر چکے ہیں ان کی چند مشہور قوالیاں یہ ہیں۔

واقعہ کربلا، میرے اللہ مینوں معاف کردے، ماں دی شان، آئے مرشد والے بھی سہارے، اللہ بادشاہ اللہ شہنشاہ، جمعرات نوں، رازدیاں گلاں، یا غوث پاک آج کرم کرو، چڑیاں بول دیاں، چلو کوئی گل نہیں۔ تصیا کھول دے میرا وغیرہ۔

فرید ایاز: ان کا تعلق دہلی کے قوال بچوں کے گھرانے سے ہے۔ انہوں نے اپنے بھائی استاد ابو محمد کے ساتھ گروپ بنا رکھا ہے۔ انہوں نے کلاسیکل موسیقی کی تربیت اپنے والد منشی ریاض الدین احمد خان سے حاصل کی۔ یہ دونوں بھائی صوفی پرفارمنس کے لیے مشہور ہیں۔ اب تک برطانیہ، امریکا، کینیڈا، فرانس، جرمنی، اٹلی، نیدرلینڈ، پرتگال، آسٹریلیا، انڈیا، کینیا، نیپال، زمبابوے، بنگلہ دیش، ترکی، مراکش، یونان، مصر، تیونس، بیلجیم، ایران، یو اے ای، سعودی عرب اور اردن میں اپنے فن کا مظاہرہ کر چکے ہیں۔ ان کی چند مشہور قوالیاں یہ ہیں۔

موری رنگ دو چنریا، تسکین کو ہم نہ روئیں، قصیدہ بردہ

شریف، چاپ تلک سب چھین لی، بہت دن بیتے اپنے سیاں کو دیکھے، اللہ ہو، گنگنا، پڑھا رو مہارے دیس، میرا پیا گھر آیا، تیری یاد ہے من کا چین، کبھی اے حقیقت منتظر، تیرا نام پاک معین الدین، جو میں جانتی وغیرہ۔

عبداللہ نیازی قوال: 1960ء میں پیدا ہوئے ان کا تعلق بھی دہلی کے قوال بچوں کے گھرانے سے ہے یہ منظور نیازی قوال کے بڑے بیٹے ہیں اور ان کی قوالی پارٹی میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ منظور نیازی کے انتقال کے بعد وہ اس گروپ کے سربراہ بن گئے۔ وہ ٹھمری، خیال، شراف، سوفی ازم اور کلاسیکل پر عبور رکھتے ہیں۔ انہوں نے قوالی کا فن اپنے والد منظور نیازی قوال اور چچا بہاؤ الدین قوال سے سیکھے۔ وہ اپنے تین بیٹوں وقاص، سعد اور فہد کے ساتھ اس فن کو آگے بڑھا رہے ہیں۔ وہ اب تک جنوبی افریقا، امریکا، کینیڈا، ناروے، ڈنمارک، سوئیڈن، دبئی، ابوظہبی، مسقط، انڈیا، بنگلہ دیش، سعودی عرب اور سری لنکا میں اپنے فن کا مظاہرہ کر چکے ہیں۔ ان کی کئی سی ڈیز اور آڈیو کیسٹ ریلیز ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے کیو ٹی وی اور پی ٹی وی کے لیے بھی قوالیاں ریکارڈ کروائی ہیں۔ ان کی چند مشہور قوالیاں یہ ہیں۔

کب تک میرے مولا، صرف ایک بار، میرے بنے کی بات نہ پوچھو، میرا پیا گھر آیا، اے جان جہاں، رنگ، ہو کرم تاجدار مدینہ، لاج نبھانا خواجہ، خواجہ دیوانی، کہوں کیسے سکھی وغیرہ۔

منشی ریاض الدین احمد خان: ان کا تعلق بھی دہلی کے قوال بچوں کے گھرانے سے ہے۔ ابتدا میں انہوں نے نظام

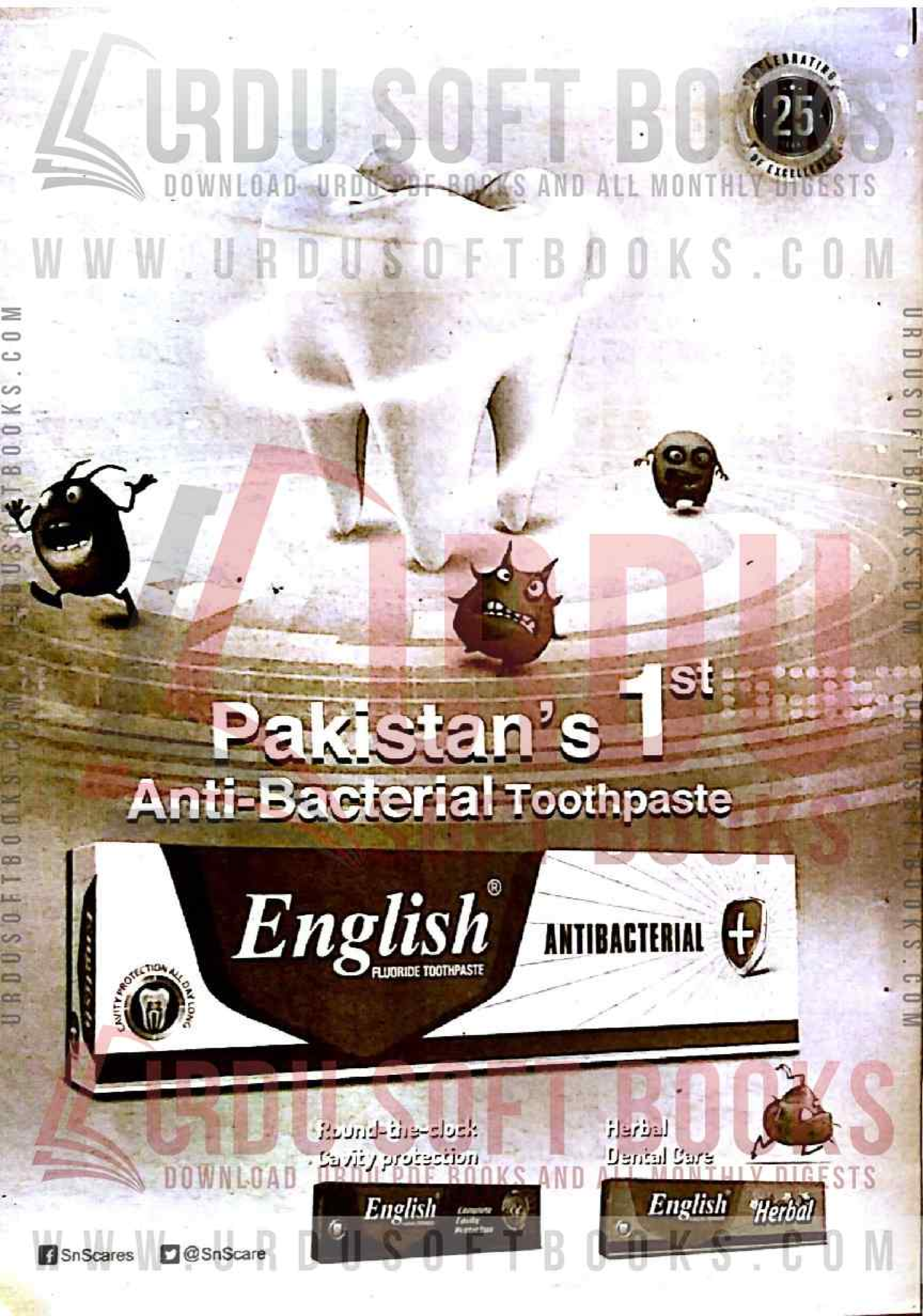

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

حیدرآباد کے دربار سے وابستگی اختیار کی لیکن 1948ء میں زوال حیدرآباد کے بعد کراچی آگئے۔ 1956ء میں انہوں نے منظور نیازی کے ساتھ مل کر گروپ بنایا۔ جس میں ان کے کزن بہاؤ الدین قوال بھی شامل تھے۔ یہ گروپ 1966ء تک قائم رہا۔ اس کے بعد منشی ریاض الدین نے اپنی پارٹی بنائی اور 2003ء میں اپنی وفات تک وہ ایک کامیاب قوال سمجھے جاتے رہے۔ انہیں 1967ء میں حکومت پاکستان کی جانب سے تمغہ حسن کارکردگی ملا۔ ان کی کچھ مشہور قوالیاں یہ ہیں۔

تیرے عشق نچایا، میرے بنے کی بات نہ پوچھو۔ نمی دانم چہ منزل بود، موہے اپنے ہی رنگ میں، آ ادھر آ تو پھر مانگ، ترانہ امیر خسرو، تم ہند کے راجا مہاراجا، رحمت کا ہے دروازہ کھلا وغیرہ۔

منظور احمد نیازی قوال: منظور نیازی پاکستان کے معروف قوال اور کلاسیکل موسیقار تھے۔ انہوں نے اپنے کزن منشی ریاض الدین اور بہاؤ الدین قوال کے ساتھ مل کر قوال گروپ بنایا جو 1966ء تک قائم رہا۔ پھر انہوں نے انفرادی کام شروع کیا اور اپنے بیٹے عبداللہ نیازی قوال کی مدد کی۔ وہ 9 اپریل 2013ء کو 91 سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔ انہیں 2005ء میں حکومت پاکستان کی جانب سے تمغۂ امتیاز ملا۔

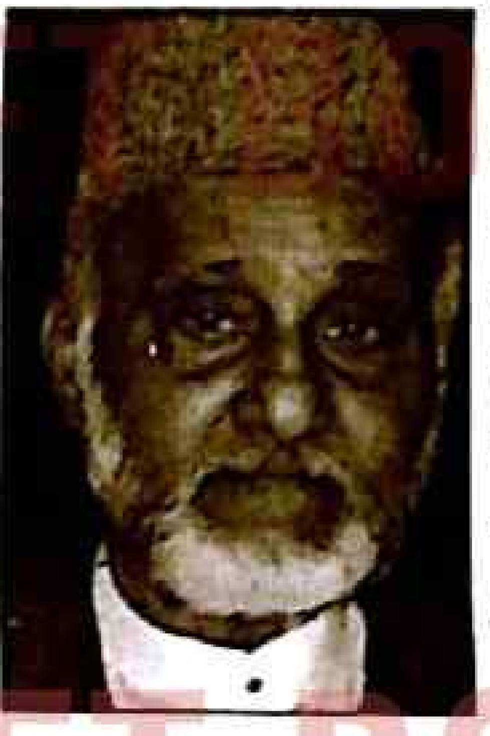

شکیلہ بانو بھوپالی: فلمی قوالی میں ایک معتبر نام جنہوں نے اس صنعت کو اپنے اسلوب سے ایک نیا رنگ دیا۔ انہوں نے آٹھ سال کی عمر میں ہی گھریلو محفلوں میں گانا شروع کر دیا تھا۔ ماں باپ اس شوق کے خلاف تھے اور اسے خوفزدہ کرنے کے لیے اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دیا کرتے تھے لیکن شکیلہ پیچھے نہ ہٹی اور اس نے ورائٹی تھیٹر میں شمولیت اختیار کر لی۔ فلمی دنیا میں اس کی آمد اتفاقیہ تھی۔ مشہور ہدایت کار بی آر چوپڑہ، بھوپال کے نزد نئی فلم نیا دور کی شوٹنگ کر رہے تھے لیکن بارش کی وجہ سے شوٹنگ منسوخ ہو گئی۔ تبھی کسی نے تجویز پیش کی کہ محفل قوالی کے لیے شکیلہ کو بلایا جائے۔ اس نے اپنے فن سے سامعین کو سحر زدہ کر دیا۔ تبھی دلیپ کمار نے ان کو بمبئی آنے کی دعوت دی۔ وہ اپنے والدین اور بہن بھائیوں کے ساتھ ممبئی چلی گئی جہاں اس نے کئی مشہور قوالیاں ریکارڈ کروائیں۔ پھر ایک وقت ایسا آیا کہ پروڈیوسر اپنی فلاپ فلموں میں شکیلہ کی قوالی کا اضافہ کر کے دوبارہ ریلیز کرنے لگے۔ شکیلہ کو غالب اور میر کا بیشتر کلام زبانی یاد تھا۔ انہوں نے کبھی میوزک کمپنیوں کے دباؤ میں آ کر اپنی قوالیاں ریکارڈ نہیں کروائیں اور جب فلموں سے آفرز ملنی کم ہو گئیں تو انہوں نے لائیو پرفارمنس شروع کر دی۔ ایک حادثے میں ان کی بینائی متاثر ہوئی اور سانس لینے میں بھی تکلیف ہونے لگی۔ بالآخر وہ ساٹھ سال کی عمر میں اس دنیا سے رخصت ہو گئیں۔

ان کی چند مشہور قوالیاں یہ ہیں۔

سب کے لب پر نام ہمارا، محبت میں اگر دامن کسی کا تھام لیتے ہیں، سحر کا وقت ہے۔ یا اللہ یا اللہ دل لے گئی، ملتے ہی نظر تم سے ہم ہو گئے دیوانے، پینے والے میری آنکھوں سے پیا... کرتے ہیں، سیاہ ڈولی لے کے آیا تیرے دوار، اب یہ چھوڑ دیا ہے تجھ پر وغیرہ۔

دیگر فلمی قوالیوں میں پردہ ہے پردہ (امر اکبر انتھونی)، عرضیاں (دہلی) خواجہ میرا خواجہ (جودھا اکبر) اور کن فیا کن (راک اسٹار) قابل ذکر ہیں۔ پاکستانی فلمی قوالیوں میں، ناز کر ناز گر، کبھی ہم میں تم میں، حال دل کیا کہیں، حسنی لال قلندر، نگاہ ناز کے ماروں کا حال، جب تیرا نام لیا اور میرا عشق یار دا دیوانہ کافی مقبول ہوئیں۔

☆☆☆

URDU SOFT BOOKS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

شاعرِ خوش نوا

راشد لطیف

اردو ادب میں اس کا ایک مقام تھا اور اسی وجہ سے وہ فلمی دنیا میں جانا نہیں چاہ رہا تھا مگر جب وہ اس دنیا میں پہنچا تو اس کا ثانی نہ رہا۔ پاکستان کی فلمی صنعت کو اپنے گیتوں سے سجانے والے شاعر کا قصہ۔

لالی ووڈ کے ایک اہم شاعر کا تذکرہ

خاکسار، پاکستان ٹیلی وژن کا مشکور ہے کہ اس کے طفیل، فلم، ٹی وی، ریڈیو اور اسٹیج کی نامور شخصیات کے ساتھ کام کرنے، اور ان کے پاس بیٹھنے کا موقع ملا۔

1981 کے اوائل میں کراچی شہر میں موسم بہار تھا یا نہیں، میں نہیں جانتا لیکن یہ پورا سال میرے لیے بہار ہی بہار رہا۔ وہ ایسے کہ پہلے نثار بزمی صاحب سے میری شناسائی ہوئی پھر ان کی معرفت ایک ایسی شخصیت کا ساتھ ملا، جس کو زمانہ مسرور انور کے نام سے یاد کرتا ہے۔ بزمی صاحب پر انشاءاللہ پھر بات کروں گا آج مسرور بھائی کے سلسلہ میں بات ہوجائے۔

'الوقار'۔ B-80 بلاک آئی نارتھ ناظم آباد، کراچی۔ یہ بزمی صاحب کا مکان تھا جہاں میں نے پاکستانی فلمی صنعت کی نامور شخصیات کو دیکھا۔ ایسی ہی ایک خوش قسمت گھڑی مسرور انور سے ملاقات ہوئی۔ مسرور بھائی نے بزمی صاحب کی کئی ایک یادگار فلموں کے گیت لکھے تھے۔ اداکار ندیم کی طرح یہ بھی جب کراچی آتے تو بزمی صاحب کے ہاں ضرور ملنے آتے۔

راقم ایک مرتبہ لاہور گیا، وہاں حضرت کو فون کیا، موصوف بہت خوش ہوئے اور اپنے ہاں آنے کی دعوت دی۔ دوبئی چوک، اقبال ٹاؤن، گلشن بلاک۔ مکان کا کیا پیارا نام تھا 'سوہنی دھرتی'۔ وہ اتنے تپاک اور گرم جوشی سے ملے کہ مجھ کو شرمندگی ہونے لگی۔

کہاں میں کہاں یہ مقام اللہ اللہ

مسرور بھائی کمال کی شخصیت تھے۔ بھلا میرا ان کا کیا جوڑ۔ مگر وہ سب لوگوں سے اسی طرح ملتے تھے۔ بس پھر اس دن کے بعد، جب بھی آپ کراچی آتے، راقم کو ضرور بتاتے۔ میں بھی جب لاہور جاتا آپ سے لازما ملاقات ہوتی۔ مسرور بھائی کی معرفت لاہور کے مشہور اداکار اور اداکاراؤں، گلوکار اور گلوکاراؤں، موسیقار اور فلمی شعراء، صدابندی اور دیگر شعبوں کے ہنر مندوں سے ملاقات ہوا کرتی۔ ایک مرتبہ فلمساز جمشید ظفر کے دفتر میں فلم پروڈیوسر ایسوسی ایشن کے اجلاس میں بھی لے گئے جہاں، فلمساز سہیل بٹ اور کراچی سے غفار دانے والا بھی موجود تھے۔

ٹی وی کے پروگراموں کے سلسلے میں پاکستانی فلمیں، گانوں کے لیے درکار ہوتیں۔ ان کے حصول کے لیے اکثر مجھ کو یہ کام سونپا جاتا تھا۔ جلد ہی مسرور بھائی کی معرفت ایور ریڈی پکچرز (جنہوں نے علی سفیان آفاقی صاحب کی فلم 'آس' ریلیز کی تھی) اور نگار پکچرز (جنہوں نے ڈبلیو۔ زیڈ۔ احمد کے بیٹے فرید احمد کی سپرہٹ فلم عندلیب ریلیز کی تھی) والوں سے بھی سلام دعا ہوگئی۔

ایک مرتبہ مسرور بھائی کی وجہ سے راقم نے انہونی کو ہونی بنا دیا۔ وہ ایسے کہ پی ٹی وی۔ کراچی مرکز کے کسی ڈرامے کے لیے اداکار ابراہیم نفیس درکار تھے۔ صورت حال کچھ یوں تھی کہ ان کے نہ آنے سے دن بھر کی ریکارڈنگ متاثر ہورہی تھی اور موصوف نے کسی معروفیت کی بنا پر، آنے سے قطعی معذرت کرلی تھی۔ راقم نے اس وقت کے پروگرام منیجر محسن علی صاحب سے لاہور ایک فون کرنے کی اجازت مانگی۔ مسرور بھائی کو فون کیا کہ وہ نفیس بھائی کو ریکارڈنگ میں آنے کا کہیں۔ اس خاکسار کو علم تھا کہ مسرور بھائی اور نفیس بھائی کی دوستی، کراچی میں بننے والی فلم 'بنجارن' سے قائم تھی۔ تو یہ انہونی اللہ کے کرم سے ہوگئی۔ اور پی۔ ٹی۔ وی۔ کی انتظامیہ میں اس کمتر کے وقار میں اضافہ ہوگیا۔

پاکستان ٹیلی وژن کے راولپنڈی ایوارڈ منعقدہ 1981 کے سلسلہ میں مجھے میوزک کے شعبہ کا نگران مقرر کیا گیا۔ اس لائیو اسٹیج شو Live stage show کے لیے میری نظر میں موسیقار کریم بھائی، المعروف کریم شہاب الدین بہترین انتخاب تھے۔ ہم دونوں میں یہ طے ہوا کہ لاہور کی فلمی صنعت کے سازندے ہماری محنت کو چار چاند لگا سکتے ہیں۔ مسرور بھائی کو یہ بات بتلائی گئی اور کراچی میں بیٹھ کر پنڈی کے ایوارڈ کا مسئلہ براستہ لاہور، مسرور بھائی نے حل کر دیا۔ نتیجہ؟ نتیجہ یہ کہ راقم کی نگرانی میں موسیقی کا ڈپارٹمنٹ، توقع سے بڑھ کر کامیاب رہا۔ ڈائرکٹر پروگرامز جناب ماہ رخ زبیر (پلے بیک سنگر ناہید نیازی کی بہن، گلوکارہ نجمہ نیازی)، ڈائرکٹر ایڈمنسٹریشن اینڈ پرسنل جناب زمان علی خان اور جناب عشرت انیس انصاری (آخری دو حضرات نے کراچی مرکز میں راقم کی تربیت بھی کی تھی) اور دیگر ہیڈ آفس کے افسران کی نظر میں خاکسار کی عزت دو چند ہوگئی اور پی ٹی وی کے اعلیٰ حکام میں یہ بات عام ہوگئی کہ موسیقی کا کوئی کام ہو، کوئی رکاوٹ ہو، فکر کی کوئی بات نہیں۔ کراچی میں فلاں شخص موجود ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا احسان اور مسرور بھائی کی بے لوث مدد تھی۔

ان چیدہ واقعات کے لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ میں اس وقت پی۔ ٹی۔ وی۔ میں ایک معمولی معاون پروڈیوسر تھا پھر بھی مجھ کو ان سے بھرپور فوائد پہنچے۔ مسرور بھائی کا مقصد یہ ہوا کرتا تھا کہ اگر کسی کو ان کی ذات سے کوئی فیض پہنچتا ہے تو اس کا ہاتھ پکڑ کر چل دیا کرتے تھے۔ میری طرح، آج بھی ایک عالم ان کا معترف ہے۔

مسرور انور صاحب جب دوسروں پر بغیر کسی لالچ کے مہربان تھے تو لازماً ان کو ایک ذمہ دار شوہر اور ایک نہایت شفیق باپ بھی ہونا چاہیے تھا۔ میں نے ان کو اس سلسلہ میں بہت متوازن پایا۔ انہیں ہم سے بچھڑے 20 سال ہوگئے۔ آج بھی آپ ان کے اکلوتے بیٹے، احمد فراز سے 'سوہنی دھرتی' میں جاکر یہ سوال کرسکتے ہیں۔ وہ لازماً کم وبیش وہی کہیں گے جو راقم نے دیکھا اور محسوس کیا۔

میں نے پاکستان ٹیلی وژن لاہور مرکز میں اس وقت کے ایک بہت فعال اور مستند موسیقار، جناب محسن رضا خان کے ساتھ مسرور بھائی کو کام کرتے دیکھا۔ اسی نشست میں خوش قسمتی سے استاد نذر حسین بھی آگئے۔ اس روز مجھ کو اندازہ ہوا کہ مسرور بھائی شیٹ میوزک sheet music) (موسیقی کا لکھنا اور پڑھنا) سے واقفیت رکھتے تھے۔

کراچی میں جناب شمی فاروقی صاحب کے بعد، لاہور میں مسرور بھائی کو دیکھا جو اپنے گیتوں کی صدابندی کے

وقت، اسٹوڈیو میں ضرور موجود ہوا کرتے تھے۔ کیوں کہ صدابندی کے دوران، کبھی صرف ایک لفظ کو آگے پیچھے یا تبدیل کرنے سے گلوکار رگلوکارہ کو سانس لینے یا توقف کرنے میں آسانی ہوجایا کرتی ہے۔

مجھے مسرور بھائی کے ساتھ فلمسازوں، تقسیم کاروں اور ہدایت کاروں کے دفاتر جانے اور وہاں ہونے والی گفتگو بغور سننے کا کئی دفعہ اتفاق ہوا۔ فلمی کہانیوں، منظر ناموں، گیتوں اور مکالموں کی باتوں کے علاوہ، پچھلے پیسوں کی عدم ادائیگیوں کا بھی ذکر ہوتا جن کی ایک سے زیادہ دفعہ وعدہ خلافی ہو چکی ہوتی تھی۔ ایسے حالات میں بھی مسرور بھائی کی وہی مسکراہٹ قائم رہتی۔ اللہ تعالیٰ نے مسرور بھائی کو واقعتاً صحیح معنوں میں مسرور رکھا ہوا تھا۔ زمانے کے سرد و گرم، مالی معاملات اور دیگر ذاتی مسائل کا کبھی ذکر نہیں کیا کرتے بلکہ ہم جیسے عام سے لوگوں کے ننھے منے مسائل حل کر کے تمام وقت شاداب رہا کرتے تھے۔

وہ ایک عملی انسان تھے۔ فلمی صنعت میں ہونے والی کسی گروہی سیاست رلابی کے حصہ دار نہیں رہے۔ چونکہ آپ کو اپنے کام پر مکمل گرفت تھی لہٰذا، آخر وقت تک استقامت اور دل جمعی سے کام کیا۔ دیبو بھٹہ چاریہ Deebo Bhattacharya (جن کے ساتھ مسرور بھائی نے پہلا فلمی گیت 'بنجارن' کے لیے لکھا تھا۔ 'بدنام' کی موسیقی بھی انہوں نے ترتیب دی تھی)، سہیل رعنا، لال محمد اقبال، امجد بوبی، خلیل احمد، ایم۔ اشرف، روبن گھوش، ناشاد، نثار بزمی، محسن رضا خان اور دوسرے موسیقاروں کے ساتھ کئی مشہور گیت لکھے جو آج بھی نہ صرف عوام کی زبان پر رہتے ہیں بلکہ روز مرہ ضرب الامثال کا درجہ حاصل کر چکے ہیں، جیسے۔

آئے ہیں تیرے در پر تو کچھ لے کر جائیں گے
ورنہ اس آستاں پہ یہ جاں دے کے جائیں گے

فلم۔ الزام گلوکاران۔ صابری برادران

ابھی ڈھونڈ ہی رہی تھی تمہیں یہ نظر ہماری
کہ تم آگئے اچانک بڑی عمر ہے تمہاری

فلم۔ بے وفا گلوکارہ۔ نور جہاں

1965 کی دوسری پاک بھارت جنگ میں آپ نے یہ مشہور قومی نغمہ لکھا۔

اپنی جاں نذر کروں اپنی وفا پیش کروں
قوم کے مرد مجاہد تجھے کیا پیش کروں

قومی جذبے سے سرشار یہ لازوال نغمہ، مسرور بھائی نے موم بتی کی ہلکی روشنی کی مدد سے دوران جنگ، بلیک آؤٹ میں

ڈاکٹر عطاء الرحمن

معروف قومی سائنس دان ڈاکٹر عطاء الرحمن 22 ستمبر 1942ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہیں۔ وہ اپنے خاندان کے ہمراہ 1947ء میں لاہور آگئے۔ بعدازاں 1952ء میں کراچی منتقل ہو گئے۔ ان کے والد جمیل الرحمن ایک وکیل تھے۔ تاہم انہوں نے وکالت ترک کر کے ٹیکسٹائل فیکٹری قائم کرلی۔ جب کہ دادا سر عبدالرحمن پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے۔ بعدازاں جب پاکستان بنا تو وہ پاکستان کی سپریم کورٹ کی پہلی بینچ کے جج بھی رہے۔

ڈاکٹر عطاء الرحمن نے اپنی ابتدائی تعلیم کراچی گرامر اسکول سے حاصل کی۔ 1960ء میں کیمبرج یونیورسٹی سے اوورسیز ہائی اسکول سرٹیفکیٹ میں فرسٹ پوزیشن لی۔ 1963ء میں کراچی یونیورسٹی سے بی ایس سی (آنرز) کیا۔ اور دوسری پوزیشن حاصل کی۔ 1964ء میں کراچی یونیورسٹی ایم ایس سی (نامیاتی کیمیا) میں پہلی پوزیشن حاصل کر کے 1968ء میں کیمبرج یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی جب کہ 1987ء میں کیمبرج یونیورسٹی سے ڈائریکٹریٹ آف سائنس کی سند حاصل کی۔ 1964ء میں اپنے کیریئر کی ابتداء جامعہ کراچی میں لیکچرار کی حیثیت سے کی۔ 1977ء میں حسین ابراہیم جمال انسٹی ٹیوٹ آف کیمسٹری میں "کو ڈائریکٹر" اور 1990ء میں ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ انہوں نے بین الاقوامی شہرت یافتہ سائنسدان ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی مرحوم کے نہ صرف دست راست کی حیثیت سے کام کیا بلکہ ان کی رہنمائی میں سائنسی اور تحقیقی کام کو بھی آگے بڑھایا۔ انہوں نے جامعہ کراچی کے علاوہ غیر ملکی جامعات میں بھی درس و تدریس کے فرائض انجام دیے۔ آج انہی کی کوششوں سے ایچ ای جے کو تیسری دنیا میں کیمیاوی تحقیق میں پہلا نمبر ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ مادر وطن پاکستان میں سائنس و ٹیکنالوجی کی ترقی کے سلسلے میں ان کی بیش بہا خدمات ہیں جنہیں اہل علم حضرات ہرگز فراموش نہیں کر سکتے۔

ڈاکٹر عطاء الرحمن کے اب تک سوا دو سو کے لگ بھگ ریسرچ پیپرز شائع ہو چکے ہیں اور کئی سائنس دانوں نے اپنی تحقیق کو آگے بڑھانے کے لیے ڈاکٹر عطاء الرحمن کی تحقیق سے مدد حاصل کی ہے۔ ان کے ریسرچ پیپرز اور بعض کتب کے کئی زبانوں میں ترجمے بھی شائع ہو چکے ہیں اور بعض مغربی ممالک کی جامعات کے نصاب میں شامل ہیں۔

ایچ ای جے کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ ہر سال ملک کی تمام جامعات سے پی ایچ ڈی ہونے والے طلباء کی نصف تعداد کا تعلق اسی انسٹی ٹیوٹ سے ہوتا ہے۔ ڈاکٹر عطاء الرحمن درجنوں ملکی و بین الاقوامی ایوارڈز حاصل کر چکے ہیں اور وفاقی وزیر برائے سائنس و ٹیکنالوجی بھی رہے۔ انہیں حکومت پاکستان کی جانب سے ستارۂ امتیاز، تمغۂ امتیاز اور ہلال امتیاز کے اعزازات عطا ہو چکے ہیں۔

مرسلہ: اعجاز حسین۔ کراچی

لکھا تھا۔ مجھ کو یہ بات ان کے صاحبزادے احمد فراز نے بتائی، جن کو ان کی تائی لتاں نے بتایا تھا۔ اگلی صبح وہ اس نغمہ کو ریڈیو پاکستان کراچی لے کر گئے؛ جہاں بہت کم وقت میں اس کی دھن بنی اور مہدی حسن کی آواز میں صدابند کر کے نشر کر دیا گیا۔

بعد میں اس قومی نغمہ کو بچوں کے نصاب میں شامل کر لیا گیا۔

..... پڑھنے والوں کی دلچسپی کے لیے عرض ہے کہ یہ دھن مہدی حسن صاحب نے بنائی تھی۔

اسی طرح 1971 کی تیسری پاک بھارت جنگ میں آپ نے ایک اور معرکہ مارا۔ یہ تب سے لے کر اب تک، ہر خاص و عام کی زبان پر رہتا ہے۔ آج کل "کوک اسٹوڈیو" میں اس کو نئے اور پرانے گلوکار رگلوکارہ پیش کرتے ہیں۔ اور اس کے آخر میں جناب انور مقصود صاحب بھی کچھ فرماتے ہیں۔ لیکن بہت ستم اور افسوس کی بات ہے کہ اس گیت کے خالق، مسرور انور کا نام تک نہیں لیا جاتا۔ اسی نغمہ پر آپ کو بعد از مرگ تمغہ حسن کارکردگی ملا تھا۔ وہ نغمہ ہے۔

سوہنی دھرتی اللہ رکھے قدم قدم آباد......

اس قومی نغمہ کی دھن موسیقار سہیل رعنا نے بنائی ہے۔ اصل نغمہ شہناز بیگم کی آواز میں صدابند ہوا تھا۔ بعد میں اس کو پاکستان کے نامور فنکاروں نے بھی پیش کیا۔ سہیل رعنا بعد میں کینیڈا میں نقل مکانی کر گئے۔ یہاں بھی انہوں نے ایک حیرت ناک کام کر کے ملک کا نام روشن کیا۔ آپ نے کینیڈا کے قومی ترانے کی دھن پر اردو میں بول لکھے۔ پھر ادھر کی مقامی آوازوں میں صدابند کر دیا۔ وہاں کی حکومت سے اسے منظور بھی کروالیا۔ اب اس اردو ترانے کو سرکاری درجہ دے دیا گیا ہے۔ یہ بات مجھے شان الحق حقی صاحب کے صاحبزادے اور اس کمترین کے استاد، عدنان حقی نے دسمبر 2015 میں بتلائی۔ یہ خود بھی وہیں رہتے تھے اور سہیل رعنا صاحب سے دعا سلام ہوتی رہتی تھی۔ اس نغمہ کو بھی ہمارے ملک کے نصاب میں شامل کیا گیا ہے۔

مسرور بھائی کا ایک اور ملی نغمہ بھی بے حد مقبول ہوا تھا۔

جگ جگ جیئے میرا پیارا وطن

ان کے مقبول فلمی گیتوں کی ایک طویل فہرست بن سکتی ہے۔ ذیل میں چند گیتوں کا ذکر ہے:۔

نمبر شمار	گانے	فلم
1	اکیلے نہ جانا ہمیں چھوڑ کر تم	فلم: ارمان
2	بڑے بے مروت ہیں یہ حسن والے	فلم: بدنام
3	کوکو کورینا	ارمان
4	اے ابر کرم آج اتنا برس، اتنا برس کہ وہ جا نہ سکیں	فلم: نصیب اپنا اپنا
5	تمہیں کیسے بتادوں تم میری منزل ہو	فلم: دوراہا
6	مجھے تلاش تھی جس کی وہ ہمسفر تم ہو	فلم: جہاں تم وہاں ہم
7	مجھے تم نظر سے گرا تو رہے ہو مجھے تم کبھی بھی بھلا نہ سکو گے	فلم: دوراہا
8	یوں زندگی کی راہ میں ٹکرا گیا کوئی	فلم: آگ
9	بیتے دنوں کی یادوں کو کیسے میں بھلا دوں	فلم: آگ
10	میں جس دن بھلادوں تیرا پیار دل سے	فلم: خوشبو
11	آئے ہیں تیرے در پر تو کچھ لے کر جائیں گے	فلم: الزام
12	کچھ لوگ روٹھ کر بھی لگتے ہیں کتنے پیارے	عندلیب
13	دل دھڑکے میں تم سے یہ کیسے کہوں	فلم: انجمن
14	دل ہو گیا ہے تیرا دیوانہ اب کوئی چارہ نہیں	فلم: مشکل
15	اک بار ملو ہم سے تو سو بار ملیں گے	فلم: بوبی
16	اللہ اللہ کیا کرو دکھ نہ کسی کو دیا کرو	فلم: پہچان

مسرور بھائی ڈائری باقاعدگی سے لکھا کرتے تھے۔ جو معلومات کا خزانہ اور خود ان کے لیے گیتوں، کہانیوں اور منظر نامہ لکھنے کے لیے مددگار ہوتیں۔ ایک مرتبہ کہنے لگے کہ یہ ڈائریاں ان کے لیے خیالات، کہانیوں کے پلاٹ وغیرہ کا ایک سرچشمہ ہیں۔

مسرور بھائی کو بعد از وفات، اس وقت کے صدر پاکستان جناب فاروق لغاری صاحب نے تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا۔ جو ان کی بیگم نے وصول کیا۔ یہ بھی اتفاق ہے کہ استاد نصرت فتح علی خان کی بیگم نے بھی اسی تقریب میں ان کا بعد از وفات تمغہ حسن کارکردگی وصول کیا۔ گلوکارہ مہناز بھی اس تقریب میں صدر پاکستان سے تمغہ حسن کارکردگی وصول کرنے کراچی سے آئی تھیں۔ اس خاکسار کو اعزاز حاصل ہے کہ انہوں نے میرے غریب خانے میں بھی قیام کیا۔

URDU SOFT BOOKS — DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS — WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

مسرور انور صاحب نے غالباً اب تک سب سے زیادہ نگار ایوارڈ حاصل کیے ہیں۔ آپ نے 17 مذکورہ ایوارڈ حاصل کیے۔ مجھ کو یہ بات ان کے صاحبزادے، احمد فراز نے بتلائی جو آجکل 'جیو' لاہور میں اہم ذمہ داریاں نبھا رہے ہیں۔ لاہور ہی میں منعقدہ ایک تقریب میں مسرور بھائی نے نعت روزہ نگار کے روحِ رواں، جناب الیاس رشیدی صاحب سے میری ملاقات کروائی تھی۔

ایک مرتبہ میں نے مسرور بھائی کو تجویز پیش کی کہ کیوں نہ بڑے پیمانے پر بزمی صاحب کو خراجِ عقیدت کا پروگرام پیش کیا جائے۔ مجھے اس کا خیال کراچی میں آیا۔ ہوا یوں کہ میری موجودگی میں بزمی صاحب کے لیے گاہے بگاہے بمبئی بھارت سے، لکشمی کانت اور پیارے لال، المعروف لکشمی کانت پیارے لال اور آنند بخشی کے ٹیلی فون آیا جایا کرتے تھے۔ مجھے آنجہانی جناب لکشمی کانت صاحب سے دو مرتبہ گفتگو کرنے کا اعزاز حاصل ہوا ہے۔ لکشمی کانت کے سپرد معاملات طے کرنا، تعلقات عامہ اور کاروباری معاملات تھے، جبکہ پیارے لال کے ذمہ میوزک ارینجمنٹ Music Arrangement تھا۔ پیارے لال شرمیلے، کم گو اور بہترین ارینجر تھے۔

مسرور انور اس قبیل کے لوگوں میں سے تھے کہ جن کے نزدیک ناممکنات، ناممکنات نہیں ہوا کرتیں۔ میں نے اپنی پریشانی بیان کی تو وہ بولے۔ ''ہاں یہ پروگرام بالکل ہوسکتا ہے۔'' فوراً اپنی ڈائریاں کھولیں اور ایک صفحہ پر ترتیب سے پہلے نام لکھے پھر فون نمبر اور پھر فون کرنا شروع ہوئے۔ ایک لمحہ کو بھی نہیں پوچھا کہ آخر وہ یہ سب کیوں کریں؟

تو اس روز گھنٹا بھر میں ڈھاکا، بنگلہ دیش میں رونا لیلیٰ سے بات بھی کرلی اور کراچی میں بیمان انٹرنیشنل (بنگلہ دیش کی قومی ائر لائن) سے رونا لیلیٰ اور ان کے ساتھ آنے والوں کے اعزازی ٹکٹ اور لاہور میں پانچ ستارہ ہوٹل میں ان کے اعزازی قیام کے بندوبست کی بات بھی ہوگئی۔ ادھر لکشمی کانت صاحب سے بھی تفصیلی بات ہوئی۔ خاکسار پر اس وقت حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے جب لکشمی کانت صاحب نے کہا کہ بزمی صاحب کے لیے وہ، یعنی لکشمی کانت اور پیارے لال، 30 سازندوں کا آرکسٹرا، گلوکار محمد عزیز اور گلوکارہ الکا کو وہ خود اپنے خرچا پر لے کر آئیں گے۔ اور ہوٹلوں کے قیام کے اخراجات کے بھی وہی ذمہ دار ہوں گے۔ کیوں؟

راقم کو اس کیوں کے جواب پر بے انتہا خوشی

گوشہ تنہائی میں کبھی کسی کی غیبت نہ کرو

حضرت شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ بیان فرماتے ہیں کہ حضرت ابو سلیمان داؤد طائی کے پاس ان کا ایک مرید آیا اور اس نے بتایا کہ آج میں نے فلاں صوفی کو نشہ میں مست دیکھا اور اس کا لباس قے کی وجہ سے خراب ہو چکا تھا اور کتے اس کے گرد جمع تھے۔ آپؒ نے مرید کی بات سن کر ناگواری کا اظہار کیا اور فرمایا کہ تو نے اس کی مدد کیوں نہ کی؟ وہ اگرچہ حرام فعل میں مبتلا تھا تو جاؤ اور اس کو اس کے ٹھکانے پر چھوڑ کر آؤ۔ مرید کو مرشد کا حکم گراں گزرا اور ٹال مٹول بھی نہ کرسکتا تھا۔ اس لیے گیا اور اس صوفی کو پیٹھ پر لاد کر لے جانے لگا تو لوگوں نے اس کا مذاق اڑایا کہ کیسا درویش ہے؟ یہ بھی کوئی شرابی ہے اور ان درویشوں نے شراب کی خاطر اپنے لباس کو ہی گروی رکھ دیا۔ مرید ان لوگوں کی کڑوی کسیلی باتیں سنتا رہا مگر اس درویش کو اس کے ٹھکانے پر پہنچا کر دم لیا۔ اگلے روز جب وہ حضرت ابو سلیمان داؤد طائی کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپؒ نے مسکرا کر اسے دیکھا اور فرمایا کہ گوشۂ تنہائی میں بھی کسی کی آبروریزی نہ کرو ورنہ لوگ تمہارا کھلم کھلا مذاق اڑائیں گے۔ تم دوست کو محلے میں بدنام کرو گے، وہ تمہیں شہر میں بدنام کرے گا۔ لوگوں کو گناہوں پر نادم کرنے کی بجائے ان کی مدد کرو اور جو کسی کو رسوا کرتا ہے وہ خود رسوا ہو جاتا ہے۔ شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں کہ پس یاد رکھو کہ جب تم لوگوں کی بری عادتوں پر انہیں نفرت کا نشانہ بناؤ گے تو وہ بھی یقیناً تمہیں برا بھلا کہیں گے۔ اگر تم کسی کو مصیبت میں مبتلا دیکھو تو اس کی مدد کرو۔

(حکایات سعدیؒ...... گلستان)

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

ہوئی۔ آنجہانی لکشمی کانت نے کہا کہ بمبئی کی فلمی صنعت میں ہم بزمی صاحب کی بدولت داخل ہوئے۔ ہم کو تیسرے درجہ سے دوسرے، پھر اس کے بعد درجہ اوّل کے سازندے بنانے میں بزمی صاحب کا بہت ہاتھ ہے۔ پیارے لال صاحب کا کہنا تھا کہ آج اگر بمبئی میں مجھ کو ایک اچھا ارینجر Arranger مانا جاتا ہے تو وہ بھی بزمی صاحب کی مرہون منت ہے۔ آنند بخشی آنجہانی فرمانے لگے کہ مجھے پہلی فلم میں گانے لکھوانے کے لیے بزمی صاحب خود ساتھ لے کر گئے تھے۔ مجھے پہلا فلمی گیت نثار بزمی صاحب کی بدولت ہی ملا۔

جب اس پروگرام کے سرحد پار انتظامات اس قدر عمدگی سے طے ہوئے تو ملکی فلمی صنعت کے نامور فنکار، اداکار اور اداکارائیں، کامیڈین وغیرہ کے بھرپور حصہ لینے میں بظاہر کوئی رکاوٹ نظر نہیں آتی تھی۔

میں نے تعلقات عامہ کے سلسلہ میں آپ کے جیسا کوئی اور نہیں دیکھا۔ مجھے اس مجوزہ پروگرام کی کامیابی نظر آنے لگی۔ آپ دیکھیے نا! آنند بخشی آنے کو تیار، رونا لیلیٰ آنے کو تیار، بیمان انٹرنیشنل اور ہماری قومی ایر لائن بھی اعزازی ٹکٹ دینے پر رضامند۔

☆......☆

مسرور بھائی ملک میں اور ملک کے باہر فلمی طائفہ لے جانے کے ماہر تھے۔ مختلف محکموں کی منظوریاں، ضابطے، پھر دوسرے ممالک میں پیش آنے والے بعض مخصوص مسائل وغیرہ احسن طریقے سے حل کرواتے تھے۔

جب مسرور بھائی کا لکھا، امجد بوبی کی موسیقی اور سلمیٰ آغا کی آواز میں یہ گیت۔

اک بار ملو ہم سے تو سو بار ملیں گے

ہم جیسے کہاں تم کو طلبگار ملیں گے

مقبول ہو کر سلمیٰ آغا کی مقبولیت کو چار چاند لگا رہا تھا تو دو تین مرتبہ وہ سلمیٰ آغا پر مشتمل طائفے لے کر براستہ کراچی، ملک سے باہر گئے۔ وہ کراچی ائرپورٹ کے قریب ہوٹلوں میں قیام کرتے۔ ان کے پاس بہت کم وقت ہوتا تھا پھر بھی جب میں وہاں جاتا تو ہمیشہ کی طرح گرم جوشی سے ملتے۔

تنویر نقوی، قتیل شفائی، کلیم عثمانی، تسلیم فاضلی، احمد راہی، شباب صاحب اور دوسرے فلمی شعراء نے فلمی گیتوں کے ساتھ ساتھ بہت عمدہ غزلیں بھی کہی ہیں۔ اسی طرح مسرور انور بھی گیت نگار کی حیثیت سے مشہور ہیں حالاں کہ ابتدا ہی میں فلم 'بدنام' میں ان کی لکھی گئی غزل مشہور ہوگئی تھی۔

"بڑے بے مروت ہیں یہ حسن والے کہیں دل لگانے کی کوشش نہ کرنا" دھن دیبو بھٹہ چاریہ نے بنائی اور گلوکارہ ثریا ملتانیکر تھیں۔ اس غزل نے پورے ملک میں دھوم مچادی تھی۔

وہ نثار بزمی والا شو تو کسی وجہ سے نہ ہو سکا لیکن اس کے وسیلے سے کئی شخصیات سے ملاقات ہوگئی۔

کہانی نویس اور گیت نگار مسرور انور، موسیقار سہیل رعنا اور ہدایت کار پرویز ملک، یہ ایک عرصہ کامیابی کی اکائی رہی۔ کراچی کی بنی ہوئی یہ فلمیں، جیسے ارمان، دوراہا، احسان وغیرہ اس کی مثال ہے۔

بعض وجوہات کی بنا پر سہیل رعنا نے کافی کم فلموں کی موسیقی ترتیب دی، جس کا مجھ کو ہمیشہ افسوس رہے گا۔ آپ ان کی پہلی فلم 'جب سے دیکھا ہے تمہیں' کے گیت سنئے تو ایسا لگتا ہے کہ باغ کی کیاریوں کی پانی اور مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو آ رہی ہو۔ ہیرا اور پتھر، ارمان، دوراہا، احسان، سوغات، بازی وغیرہ اور پاکستان میں ان کی آخری (غالباً) فلم 'بادل اور بجلی' کی موسیقی میں کافی حد تک یہی مہکار محسوس ہوتی ہے اور جسم اور روح کو ایک تازگی کا احساس ہونے لگتا ہے۔

مسرور بھائی نے لاہور آ کر اوّل اوّل نثار بزمی صاحب کے ساتھ کافی کام کیا۔ لاکھوں میں ایک، آگ، انجمن وغیرہ۔ ان کے ساتھ ساتھ، لاہور کی انڈسٹری کے تقریباً سب ہی موسیقاروں کے ساتھ مسرور بھائی نے کام کیا۔ گیتوں کی تعداد کے لحاظ سے سب سے زیادہ گیت ایم اشرف صاحب کے لیے لکھے۔

آپ نے فلموں کے مکالمے بھی لکھے: مثلاً 'دل میرا دھڑکن تیری، فرض، کرن اور کلی' وغیرہ۔

وہ بے شک ایک ہنس مکھ اور زندہ دل انسان تھے۔ فلم اور فلمی صنعت، مسرور بھائی کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ اس بات کو وہ بہت سنجیدگی سے لیتے تھے۔ میں نے انہیں کبھی فالتو بیٹھے نہیں دیکھا۔ بھاگ دوڑ، محنت، لکھنا لکھانا۔ اتنی بہت سی جہتیں یا اتنے بہت سے شعبوں میں بیک وقت اس لیے کام کرتے تھے کہ زندگی کی گاڑی پُرسکون چلے۔ دن ہو یا رات، کوئی اپنا مسئلہ ان کے پاس لایا نہیں اور وہ پیشانی پر بل لائے بغیر اس کے ساتھ ہو گئے نہیں۔ پیسا اور شہرت آنی جانی شے ہیں۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی شرم نہیں کہ مسرور بھائی کو دیکھ کر میں نے بھی ان کے نقش پا پر چلنے کی کوشش کی۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ مسرور بھائی کو جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔

☆☆☆

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

شہنشاہِ جذبات

انور فرہاد

پاک فلم نگری نے کم سرمایہ اور کم وسائل کے باوجود اعلیٰ ترین فلمیں پیش کیں اور ایسا تبھی ممکن ہوا کہ اداکار و ہنرمند اپنے پیشے سے مخلص تھے۔ انہوں نے وسائل کی کمی کا شکوہ نہ کر کے اپنے کام کو نکھارنے کی کوشش کی۔ وہ بھی ایک ایسا ہی مخلص اداکار تھا۔ اس نے جہدِ مسلسل کے ذریعے خود کو منوایا۔ اداکاری میں وہ کمال حاصل کیا کہ پوری دنیا اش اش کر اٹھی۔

ایک باکمال اداکار کی زندگی کے مدوجزر کا بیان

اللہ رب الرحیم و کریم کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے ہمارے پیارے پاکستان کو جہاں بہت بڑی عنایتوں سے سرفراز کیا ہے۔ وہاں شوبز کے فنکاروں کے حوالے سے بھی عظیم اور نابغۂ روزگار فنکار اور پر وقار مرعطا کیے۔ ایسے ہی فنکاروں میں محمد علی بھی شامل ہیں۔ جن کے بارے میں بہت سے لوگ بہت کچھ جانتے ہیں مگر وہ اتنی خوبیوں کے مالک تھے کہ اس کے باوجود ان کی بے شمار خوبیاں باخبر لوگوں کی نظروں سے بھی پوشیدہ ہیں۔

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

آج میں اس عزم کے ساتھ اس عظیم پرفارمر کے بارے میں لکھنے بیٹھا ہوں کہ اس انمول ہیرے کے بارے میں پڑھنے والوں کو زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کروں۔
اس موقع پر میں پاکستان کے ایک بہت بڑے شوبز جرنلسٹ دکھی پریم نگری کے ایک مضمون کا اقتباس پیش کروں گا۔ انہوں نے محمد علی پر ایک مضمون لکھتے وقت لکھا تھا۔ ''بھارت میں دلیپ کمار، اشوک کمار، راجکپور، دیو آنند، بلراج ساہنی اور امیتابھ بچن مخصوص نوعیت کا کام کرتے تھے۔ جو کام ایک فنکار کرتا وہ دوسرا انہیں کرتا جب کہ محمد علی میں یہ خوبی کہ یہ تنہا ہر طرح کے کام کر لیتے ہیں۔ محمد علی میں بھارت کے ان تمام فنکاروں کی خوبیاں یکجا ہیں جس کی وجہ بھارتی اداکار خود پر فخر کرتے ہیں۔''
یہ میرا نہیں ایک بڑے اور مستند صحافی کا تجزیہ اور ریمارکس ہیں۔ جب وہ دونوں حیات تھے۔ یہ تحریر اس وقت کی ہے۔ مولا کریم دونوں کو غریق رحمت کرے۔ ان کی یہ تحریر پتھر کی لکیر کی طرح ہے۔ آج بھی نقادانِ فن اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ دکھی پریم نگری نے محمد علی کی پرفارمنگ کے سلسلے میں جو کچھ لکھا تھا وہ صد فیصد حقیقت پر مبنی ہے۔
اس مضمون میں دکھی پریم نگری نے آگے چل کر لکھا ہے۔
''میرے ایک عزیز کینیڈا میں رہتے ہیں۔ وہ پاکستان آئے تو انہوں نے بتایا۔ میں نے بھارت اور پاکستان کی بے شمار فلمیں دیکھی ہیں لیکن محمد علی جیسا مکمل اداکار بھارت میں نہیں دیکھا۔ وہاں سب سلو کام کرتے ہیں۔ محمد علی کی طرح فاسٹ کام کرنے والا کوئی نہیں ہے۔''
یہ تجزیہ بھی ایک ایسے شخص کا ہے جس نے بے شمار بھارتی فلمیں دیکھی ہیں اور وہاں کے اداکاروں کے کام کو دیکھا اور پرکھا ہے۔
کوئی کسی کی تعریف یونہی نہیں کرتا۔ اس کی کارکردگی مجبور کرتی ہے کہ اس کی تعریف و توصیف کی جائے۔
محمد علی بڑے قد کے ایک بڑے فنکار تھے۔ اس بات سے کوئی صاحب دانش انکار نہیں کر سکتا۔ محمد علی نے کردار نگاری کو ایک نیا رنگ دیا۔ چہرے کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ آواز کا استعمال محمد علی کی نمایاں خوبی تھی۔ انہی بے شمار خوبیوں کی وجہ سے وہ ایک عہد اور بلاشبہ انہیں فن کی دنیا میں ایک یونیورسٹی کا درجہ حاصل تھا۔
محمد علی کئی حوالوں سے شہرت رکھتے تھے۔ اپنے فنی محاسن کے علاوہ مردانہ وجاہت، محبت کرنے والے شوہر، باادب شاگرد، محب وطن پاکستانی اور دکھی انسانیت کے ہمدرد کوئی بھی سائل ان کے در سے کبھی مایوس نہیں لوٹتا تھا۔ وہ اپنی سحر انگیز شخصیت کی وجہ سے آج بھی شائقین فلم کے دلوں میں زندہ ہیں۔ آج جب انہیں اس جہان فانی سے کوچ کیے گیارہ برس بیت چکے ہیں۔
اس سے پہلے کہ ان کی فنی کارکردگی کا ذکر کروں۔ مناسب ہے کہ ان کی ابتدائی زندگی کے بارے میں اپنے قارئین کو آگاہ کروں۔ آپ نے اکثر سنا ہوگا کہ فلاں اداکار یا اداکارہ فنکار گھرانے سے تعلق رکھتا ہے۔ جس کا باپ یا جس کی ماں پرفارمنگ شعبہ سے وابستہ ہو اس کی اولاد کا فن کی دنیا سے وابستگی ضروری ہوتی ہے۔ دھرمیندر اور ہیما مالنی کے بیٹے ایتابھ کا بیٹا۔ راج کپور کا پورا خاندان، شتروگھن سنہا کی بیٹی، انیل کپور کی بیٹی، ایسی بے شمار مثالیں بھارتی فلمی صنعت میں ملتی ہیں۔ پاکستان میں بھی ایسے کئی لوگ ہیں جن کی اولاد فلم انڈسٹری میں آئی مگر محمد علی کے ساتھ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ بے چارہ تو ایک امام مسجد کے گھر پیدا ہوا تھا جہاں کھیل تماشوں اور آرٹ و فن کا دور دور تک نام و نشان نہیں تھا۔
فن کی دنیا کا یہ انمول شاہکار 19 اپریل 1931ء کو رہتک راجپور (انڈیا) میں پیدا ہوا۔ ان کی فیملی بعد میں پٹیالہ (مشرقی پنجاب) آ گئی۔ ان کی والدہ کا انتقال اس وقت ہو گیا تھا جب ان کی عمر کوئی ڈیڑھ سال تھی ان کے والد سید مرشد علی کے بے شمار مرید تھے۔ رہتک راجپور کی مسجد کے وہ امام تھے۔ بعد میں ملتان اور پھر حیدر آباد کی مسجدوں میں وہ امام اور خطیب رہے۔
محمد علی دو بہنیں اور دو بھائی تھے۔ یہ چاروں بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ گھر والے اور عزیز و اقارب انہیں منا کہتے تھے۔ جب کہ دوست احباب انہیں بھورے میاں کہا کرتے تھے۔ والدہ کے انتقال کے بعد ان کی پرورش ان کی بڑی بہنوں عصمت آپا اور رضیہ آپا نے کی۔
محمد علی نے ملت ہائی اسکول ملتان سے میٹرک پاس کیا اور سٹی کالج حیدر آباد سے انٹر پاس کیا۔ ان کا قد چھ فٹ چار انچ تھا جب کہ ان کی صحت اور تندرستی بہت اچھی تھی۔ شاید اسی لیے وہ چاہتے تھے کہ پائلٹ بن کر ہوائی جہاز اڑائیں۔ مگر ان کے حالات ایسے نہیں تھے کہ ان کی یہ خواہش پوری

ہوتی۔ 1950ء کے عشرے میں 77 روپے ماہوار پر انہوں نے کلیم آفس حیدرآباد میں ملازمت اختیار کی۔ کچھ عرصہ محکمہ آبادکاری میں بھی نوکری کی۔ بعدازاں 1956ء سے ریڈیو پاکستان حیدرآباد سے صداکاری کا آغاز کیا جہاں ان کے بڑے بھائی ارشاد علی پہلے سے ہی بطور صداکار منسلک تھے۔

ریڈیو کی دنیا انہیں اتنی پسند آئی کہ انہوں نے جو ملازمت وہ کر رہے تھے اسے چھوڑ دی اور مکمل طور پر اپنی خدمات ریڈیو کے لیے وقف کر دیں۔

ان کی سحرانگیز آواز نے آگے بڑھنے میں ان کا ساتھ دیا۔ اس دوران ریڈیو حیدرآباد سے محمد علی کے دو ڈرامے ''آخری چٹان'' اور ''اندھیرا اجالا'' بہت مقبول ہوئے۔ جس کے بعد ان کا شمار ریڈیو حیدرآباد کے مقبول صداکاروں میں ہونے لگا۔ محمد علی کی اس مقبولیت سے متاثر ہو کر ریڈیو پاکستان کراچی کے سینئر پروڈیوسر ایس ایم مسلم نے انہیں کراچی ریڈیو سے منسلک ہونے کی دعوت دی۔ انہوں نے یہ آفر قبول کر لی۔ سوچا کراچی حیدرآباد کے مقابلے میں بڑا شہر ہے۔ اس کے ریڈیو اسٹیشن کے وسائل بھی وسیع ہیں۔ وہاں جا کر اپنی صلاحیتوں کا اظہار کرنا زیادہ سودمند ہوگا۔ پھر انہیں خیال آیا۔ ''ریڈیو کراچی کے اسٹیشن ڈائریکٹر تو جناب زیڈ اے بخاری ہیں جو صداکاری میں یونیورسٹی کا درجہ رکھتے ہیں۔ کراچی جانا اور ریڈیو کراچی سے وابستہ ہونا میرے مستقبل کے لیے بہت فائدہ مند ہوگا۔ میں بخاری صاحب کی شاگردی اختیار کر کے صداکاری کے اسرار و رموز حاصل کروں گا۔''

ان خیالات نے محمد علی کو حیدرآباد سے کراچی آنے میں مہمیز کیا اور وہ بلا کسی تاخیر کے کراچی آگئے۔ اگرچہ حیدرآباد ریڈیو والوں نے انہیں روکنے کی بڑی کوشش کی اور کہا۔ ''کہاں کراچی جیسے بڑے شہر میں جا رہے ہو۔ وہاں پہلے ہی بڑے بڑے صداکاروں کی بہتات ہے۔ ان کے سامنے تمہیں آگے بڑھنے کا موقع کب ملے گا۔ مت جاؤ یہیں رہو۔''

مگر وہ کسی کے روکے نہیں رکے۔ کراچی آگئے اور کراچی ریڈیو جوائن کر لیا۔ اس سے پہلے وہ کچھ عرصہ بہاولپور ریڈیو اسٹیشن میں بھی کام کر چکے تھے۔ کراچی آکر محمد علی اپنے چچا سید شرافت علی کے گھر ٹھہرے جو میکلوڈ روڈ کی ایک بلڈنگ میں رہا کرتے تھے۔ ان کے گھر سے وہ کراچی

زندگی نامہ

نام: محمد علی

والد کا نام: سید مرشد علی

ولادت: 19 اپریل 1931ء

مقام پیدائش: رہتک راجپوتانہ انڈیا

ہجرت: سید مرشد علی بھارت سے پہلے ملتان پہنچے، پھر وہاں سے حیدرآباد منتقل ہو گئے۔ مرشد علی رہتک میں بھی مسجد کے امام تھے۔ ملتان اور حیدرآباد میں امام مسجد اور خطیب رہے۔

بھائی بہن: محمد علی دو بھائی اور دو بہنیں تھے۔ محمد علی سب سے چھوٹے تھے۔ والدہ کا انتقال بچپن میں ہو گیا تھا اس لیے بڑی بہنوں نے ان کی پرورش کی تھی۔

تعلیم: ملتان کے ملت ہائی اسکول سے میٹرک پاس کیا جب کہ سٹی کالج حیدرآباد سے انٹر پاس کیا۔

ملازمت: 1950ء کے عشرے میں 77 روپے ماہوار پر کلیم آفس حیدرآباد میں ملازمت اختیار کی۔ کچھ عرصہ محکمہ آبادکاری میں بھی نوکری کی۔ 1956ء میں ریڈیو پاکستان حیدرآباد سے صداکاری کا آغاز کیا پھر ریڈیو پاکستان کراچی سے وابستہ ہو گئے۔

فلم: پہلی فلم ''چراغ جلتا رہا'' بطور ولن پرفارم کیا۔ بطور ہیرو پہلی فلم ''شرارت''۔ بیرون ملک بننے والی پہلی فلم ''میرے ہمسفر''۔ پہلی رنگین سینما اسکوپ فلم ''جان پہچان''۔ پہلی بار ینگ ٹو اولڈ کردار 1966ء میں فلم غدار میں کیا۔ آخری فلم دم مست قلندر 1995ء میں ریلیز ہوئی۔

وفات: 19 مارچ 2006ء میں دل کا دورہ پڑنے سے اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔

☆☆

☆ پہلی سلور جوبلی فلم ''چراغ جلتا رہا'' 1962ء میں ریلیز ہوئی۔

☆ پہلی گولڈن جوبلی فلم ''کنیز'' 1965ء میں ریلیز ہوئی۔

☆ پہلی پلاٹینم جوبلی فلم ''امیر'' 1978ء میں ریلیز ہوئی۔

☆ پہلی ڈائمنڈ جوبلی فلم ''بوبی'' 1984ء میں ریلیز ہوئی۔

ریڈیو اسٹیشن پیدل چل کر جایا کرتے تھے۔ کچھ عرصہ بعد انہوں نے اپنی رہائش کے لیے مارٹن کوارٹر کے سیکٹر 20/2 کے کوارٹر کا انتخاب کیا۔ بعد ازاں کچھ دنوں تک ناظم آباد 4 نمبر عقب انو بھائی پارک میں بھی رہائش پذیر رہے۔

کراچی ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہونے والے محمد علی کے دوڈرامے ''آوازیں'' اور ''دھڑکن'' بہت مقبول ہوئے۔

یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ ''چراغ جلتا رہا'' سے پہلے بھی محمد علی نے ایک فلم میں اداکاری کی تھی۔ اگرچہ یہ بہت مختصر کردار تھا اور بطور مہمان اداکار انہوں نے اس فلم میں کام کیا تھا جس کا نام ''آگ اور خون'' تھا مگر یہ فلم بوجوہ ریلیز نہ ہو سکی۔ جس کا محمد علی کو بہت دکھ تھا۔ جن دنوں محمد علی ناظم آباد نمبر 4 میں رہا کرتے تھے۔ انہی دنوں ان کی ملاقات اسی علاقے میں رہائش پذیر اداکار آزاد سے ہوئی تھی۔ جو بمبئی میں کچھ عرصہ قائداعظم کے ڈرائیور بھی رہ چکے تھے اور جن کی ایک وجہ شہرت یہ بھی تھی۔ محمد علی ان کی بڑی عزت کرتے تھے اور انہیں اپنا بڑا اور بزرگ سمجھتے تھے اور چچا کہہ کر انہیں مخاطب کرتے تھے۔ آزاد صاحب بھی اس فرمانبردار لڑکے کو بہت پیار کرتے تھے۔ فلم ''آگ اور خون'' کے مصنف سلیم احمد، آزاد صاحب کے دوستوں میں تھے۔ آزاد صاحب کے کہنے پر ہی اس فلم میں بطور مہمان اداکار محمد علی کو اداکاری کا موقع دیا گیا تھا۔ یہ فلم ریلیز نہیں ہوئی تو نوجوان محمد علی کو بہت دکھ ہوا جو ایک فطری بات تھی۔ انہیں پہلی بار کسی فلم میں اداکاری کا موقع ملا تھا۔ انہوں نے جانے کیسے کیسے خواب دیکھنا شروع کر دیے تھے لیکن جب یہ فلم ریلیز نہیں ہو سکی تو ان کے خوابوں کا سارا شیش محل چکنا چور ہو گیا۔ وہ ہر وقت اداس رہنے لگے۔ ایک دن آزاد صاحب نے انہیں دل شکستہ دیکھ کر کہا۔

''علی! کیا بات ہے؟ میں کچھ دنوں سے تمہیں بہت بجھا بجھا سا دیکھ رہا ہوں۔''

''اس حالت میں، میں بجھا بجھا نہیں رہوں گا تو کیا کھلا، کھلا رہوں گا؟''

''کیسی حالت میں بچے!''

''آپ کی وجہ سے ایک فلم میں کام کرنے کا موقع ملا تھا۔'' محمد علی نے اداس لہجے میں کہا۔ ''سوچا تھا صداکار سے اداکار بن جاؤں گا مگر......'' وہ ٹھنڈی آہ بھر کر رہ گئے۔ آگے ان سے مزید کچھ کہا نہیں گیا۔

آزاد سمجھ گئے کہ اس لڑکے کو اپنی پہلی فلم ''آگ اور خون'' کے ریلیز نہ ہونے کا غم ہے۔ انہوں نے محمد علی کو سمجھایا، دلاسہ دیا۔ ''ارے یار! اتنی سی بات کا اتنا دکھ۔ اس فلم میں میرا کتنا بڑا کردار تھا مگر میں تو اس کے ریلیز نہ ہونے پر ماتم نہیں کر رہا ہوں۔ تم بھی دکھی نہ ہو۔ تم نے سنا نہیں، ہو نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی۔ اللہ نے چاہا تو اور فلمیں بھی ملیں گی تمہیں۔ اللہ کی ذات سے کبھی مایوس نہیں ہونا چاہیے۔''

محمد علی مسجد کے امام اور خطیب کے بیٹے تھے۔ اللہ رسولؐ کی باتیں سن سن کر بڑے ہوئے تھے۔ ان کے ابا جی بھی ہمیشہ اسی بات کی تعلیم دیتے تھے۔ ''جو لوگ اللہ پر بھروسا کرتے ہیں اللہ انہیں کبھی مایوس نہیں کرتا۔''

اس وقت چچا آزاد بھی اللہ پر بھروسا کرنے کی تلقین کر رہے ہیں۔ انہوں نے سوچا۔ وہ غلط نہیں کہہ رہے ہیں۔

انہوں نے دل ہی دل میں دل کی گہرائیوں سے دعا کی۔ ''یا اللہ! میری مدد فرمائیے۔ میری آرزو پوری کیجیے۔''

اس کے بعد وہ مطمئن ہو گئے کہ اب ان کا معاملہ ان کے اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ ان کی اداسی ختم ہو گئی اور وہ دل جمعی کے ساتھ صداکاری کرتے رہے۔

زیڈ اے بخاری صاحب اس ننھے لڑکے کی صلاحیتوں سے بہت متاثر تھے۔ اسے اکثر بٹھا کر صداکاری کی باریک بین باتیں سمجھاتے۔ اور کہتے۔ ''بیٹے! تم بہت ترقی کرو گے۔ تمہاری منزل ریڈیو اسٹیشن نہیں۔ اس سے بہت آگے ہے۔''

نوجوان محمد علی، بخاری صاحب کی بات کچھ سمجھے کچھ نہیں سمجھے مگر انہیں ان سے اس کی وضاحت کرنے کی ہمت نہیں ہوئی اور یہی سوچ کر خاموش رہے کہ اتنا بڑا آدمی جو کہہ رہا ہے وہ درست ہی کہہ رہا ہوگا۔

اور پھر واقعی وہ درست ہی ثابت ہوا۔ کچھ دنوں کے بعد بخاری صاحب کے ادیب و شاعر دوست فضل احمد کریم فضلی نے اپنی فلم ''چراغ جلتا رہا'' شروع کی تو انہوں نے فضلی صاحب سے کہا۔ ''فضلی صاحب! میرا ایک بڑا ٹیلنٹڈ شاگرد ہے۔ اسے بھی اپنی فلم میں چانس دو۔ مجھے یقین ہے کہ وہ آپ کو مایوس نہیں کرے گا۔''

''اگر وہ آپ کا شاگرد ہے تو یقیناً باصلاحیت ہوگا۔ کون ہے وہ؟ کیا نام ہے اس کا؟''

''اس کا نام محمد علی ہے اور وہ ہمارے ریڈیو اسٹیشن کا ایک کامیاب صداکار ہے۔ اس میں اداکاری کی صلاحیتیں

بھی ہیں۔ مجھے یقین ہے وہ آپ کے معیار پر پورا اترے گا۔‘‘

’’ٹھیک ہے۔ اسے میرے پاس بھیج دیجیے۔ ویسے بھی میں اس فلم میں نئے ٹیلنٹس کو زیادہ موقع دے رہا ہوں۔‘‘

اس کے بعد کی بات ہے۔ زیڈ اے بخاری صاحب نے محمد علی کو اپنے چیمبر میں بلایا۔ محمد علی ڈرتے ڈرتے اور یہ سوچتے ہوئے بخاری صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ’’خدا جانے مجھ سے کیا غلطی ہو گئی ہے کہ انہوں نے بلایا ہے۔‘‘

بخاری صاحب اس بات کے لیے مشہور تھے کہ صدا کار چھوٹا ہو یا بڑا جہاں بھی اس سے ذرا بھی کوتاہی ہوتی اسے بلا کر تنبیہ کرتے تھے، سمجھاتے تھے۔

’’دیکھو ایسی غلطی آیندہ نہیں ہونی چاہیے۔ مانا کہ یہ بہت مائنر غلطی ہے مگر اس کی روک تھام ضروری ہے۔‘‘

محمد علی بخاری صاحب کی خدمت میں پہنچے تو بخاری صاحب ان کی کیفیت دیکھ کر بھانپ گئے کہ یہ لڑکا یہی سوچ کر آیا ہے کہ شاید میں اس کی کلاس لوں گا۔ اس لیے انہوں نے ہنس کر اور بڑی خندہ پیشانی سے اس کا استقبال کیا۔ ’’آؤ آؤ محمد علی۔‘‘

محمد علی کی جان میں جان آئی۔ ’’یہ مجھ سے ناراض نہیں۔‘‘ انہوں نے سوچا۔

’’ارے بھئی! تمہارے لیے ایک خوش خبری ہے۔‘‘

’’خوش خبری!‘‘ کا لفظ سن کر محمد علی کے چہرے پر خوشی کی ایک لہر نمودار ہوئی۔ وہ پوچھنا چاہتے تھے۔ کیسی خوش خبری؟ مگر بخاری صاحب کے رعب کی وجہ سے انہیں سوال کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ بخاری صاحب نے خود ہی بات آگے بڑھائی۔ ’’میں نے تمہارے لیے ایک فلم میں کام کرنے کی سفارش کی ہے۔ اس میں کام کرو گے؟‘‘

محمد علی کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ انہوں نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر ان سے کہا نہیں گیا۔ بخاری صاحب کو محمد علی کی اس وقت کی کیفیت کا بخوبی اندازہ تھا۔ ’’وہ بھئی! بات یہ ہے کہ میرے دوست فضل احمد کریم فضلی صاحب ایک فلم بنا رہے ہیں۔ میں نے تمہارے سلسلے میں بات کی تو بولے۔ میرے پاس بھیج دیں۔ میں ان کا پتا تمہیں دوں گا تم کسی وقت جا کر ان سے ملاقات کر لو۔‘‘

’’کیا وہ مجھے منتخب کر لیں گے؟‘‘

محمد علی نے زیبا کے ساتھ 70، شبنم کے ساتھ 40، بابرہ شریف کے ساتھ 35، وحید مراد کے ساتھ 27 فلموں میں کام کیا۔ جب کہ اداکارہ رانی ایسی اداکارہ تھیں جن کے ساتھ محمد علی نے محبوب، شوہر، بھائی، بیٹا اور باپ کے کردار کیے۔

☆☆

19 تاریخ محمد علی کی زندگی میں خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اسے حسن اتفاق ہی کہا جا سکتا ہے کہ 19 اپریل 1931ء کو محمد علی پیدا ہوئے۔ 19 ستمبر 1966ء کو زیبا کے ساتھ شادی کے بندھن میں بندھے اور 19 مارچ 2006ء کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

☆☆

زیبا

زیبا کے ساتھ محمد علی کی شادی 19 ستمبر 1966ء میں ہوئی۔ دن جمعرات بھری مراد کا تھا اور مقام تھا ناظم آباد کراچی۔ گھر تھا کیریکٹر ایکٹر آزاد کا۔ ان کا نکاح قاضی سید احتشام نے پڑھایا تھا۔ مہر کی رقم 37500 روپے تھی۔ زیبا کے ساتھ ان کی پہلی فلم چراغ جلتا رہا تھا۔ دونوں کی آخری فلم محبت ہو تو ایسی ہو تھی جو 1989ء میں نمائش پذیر ہوئی تھی۔ زیبا کے ساتھ محمد علی نے 70 فلموں میں کام کیا۔ 40 سال تک محبت سے بھرپور ازدواجی زندگی بسر کی۔ شادی کے بعد فلموں سے زیادہ گھر کو اہمیت دی کم کم فلمیں کیں۔ وہ بھی صرف اپنے جیون ساتھی کے ساتھ۔

☆☆

عمر

30 سال 325 دن کی عمر میں محمد علی کی پہلی فلم چراغ جلتا رہا ریلیز ہوئی۔ 32 سال 94 دن کی عمر میں ہیرو کی حیثیت سے ان کی پہلی فلم ’’شرارت‘‘ نمائش پذیر ہوئی۔ 58 سال 145 دن کی عمر میں ہیرو کی حیثیت سے ان کی آخری فلم ’’محبت ہو تو ایسی ہو‘‘ ریلیز ہوئی۔ 64 سال دو دن کی عمر میں ان کی آخری فلم دم مست قلندر کی نمائش ہوئی۔

URDUSOFTBOOKS.COM
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS

''اللہ پر بھروسا رکھو۔ اس کی رحمت سے کبھی مایوس نہیں ہونا چاہیے۔''

محمد علی نے فضلی صاحب سے ملاقات کرنے میں دیر نہیں لگائی۔ فضلی صاحب بخاری صاحب کے بھیجے ہوئے نوجوان کو دیکھ کر بہت متاثر ہوئے اس کے باوجود ان کا امتحان لیا اور مطمئن ہوئے۔ ''دیکھو میاں! میں نے فلم کے ہیرو کا انتخاب تو کرلیا ہے۔ وہ بھی تمہاری طرح ایک نیا لڑکا ہے۔ اس کا نام عارف ہے۔ میں تمہیں بطور ولن اس فلم میں کاسٹ کروں گا۔''

''بہت بہت شکریہ مجھے منتخب کرنے کا۔'' محمد علی نے بہت سنبھل کر اور محتاط انداز میں کہا۔ ''آپ جاہے جس کردار کے لیے میرا انتخاب کریں، انشاء اللہ الرحمٰن میں آپ کے معیار پر پورا اترنے کی کوشش کروں گا۔''

فضلی صاحب سے مل کر وہ سیدھے ریڈیو پاکستان گئے اور اپنے استاد محترم بخاری صاحب کو یہ خوش خبری سنائی کہ فضلی صاحب نے انہیں منتخب کرلیا ہے اور وہ انہیں ولن کے کردار میں پیش کریں گے۔

''مبارک ہو۔'' بخاری صاحب نے پُرمسرت لہجے میں کہا۔ ''مجھے بھی اس خوش خبری نے بہت خوش کیا ہے۔'' وہ ذرا رک کے پھر بولے۔ ''میں نے تم سے کہا تھا نا۔ تمہاری منزل صداکاری نہیں۔ اس سے بہت آگے ہے۔''

''جی ہاں آپ نے کہا تھا۔ مجھے یاد ہے۔''

''تم حقیقتاً صداکار نہیں، اداکار ہو اچھا صداکار ہی اچھا اداکار ثابت ہوتا ہے۔ تم اپنی اداکاری اور صداکاری کے سہارے بہت ترقی کروگے۔ یہ نہ سوچنا کہ تمہیں پہلی فلم میں ولن کا کردار دیا گیا ہے تو تمہیں ہیرو کے طور پر کام کرنے کا موقع نہیں ملے گا۔ تمہیں جو کردار ملا ہے اس کی ڈیمانڈ کے مطابق اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرنا۔ تمہاری اداکارانہ صلاحیت ہی تمہیں آگے بڑھنے میں تمہاری مددگار ثابت ہو گی۔ اداکاری ہی وہ پیمانہ ہے جس سے اچھے اور باہنر ہدایت کار کو اندازہ ہو جاتا ہے کہ کس کی اداکاری میں کتنی گہرائی ہے۔ کون مشکل اور پیچیدہ کرداروں کو حقیقت کا رنگ دے سکتا ہے۔''

زیڈ اے بخاری تھے تو بنیادی طور پر براڈ کاسٹر مگر فن کے ہر شعبے پر ان کی نظر بڑی گہری تھی۔ انہوں نے ابتدائی دور ہی میں بھانپ لیا تھا کہ اس نوجوان کے اندر فن کا دریا موجزن ہے۔

''چراغ جلتا رہا'' کی ابتدائی تیاریاں مکمل ہو گئیں تو شوٹنگ کا مرحلہ آیا۔ فضل احمد کریم فضلی بہت بڑے سرکاری افسر رہ چکے تھے۔ ادیب اور صحافی و شاعر کی حیثیت سے ان کا اعلیٰ مقام تھا۔ ان کے خاندان میں سبطین فضلی جیسے فلم میکر بھی تھے۔ فضلی صاحب جب تک سرکاری ملازم رہے۔ فلم سازی کے بارے میں کبھی نہیں سوچا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد اچانک انہیں خیال آیا کہ وہ بھی فلم سازی کریں۔

محمد علی کو اس فلم میں بطور ولن اداکاری کرتے ہوئے معلوم ہوا کہ فلم کی کہانی اور مکالمے وغیرہ بھی فضلی صاحب نے خود لکھے ہیں تو انہیں تعجب ہوا۔ انہوں نے تو بخاری صاحب کی زبانی سنا تھا کہ انہوں نے ایک طویل عرصہ تک مشرقی پاکستان میں اعلیٰ سرکاری عہدوں پر رہ کر گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ کوئی سرکاری افسر فلم بنائے اور اس کی کہانی بھی لکھے، مکالمے بھی لکھے، کیا یہ حیران کن بات نہیں؟

فلم کی تکمیل کے دوران محمد علی نے جب اپنے ان خیالات کا اظہار کیا تو چند ایسے افراد نے جو فضلی صاحب کو بہت قریب سے جانتے تھے انہوں نے بتایا۔ ''یہ درست ہے کہ فضلی صاحب نے آئی سی ایس کا امتحان پاس کرنے کے بعد متحدہ بنگال کے مختلف علاقوں میں مختلف عہدوں پر کام کیا۔ مشہور زمانہ قحط بنگال میں وہ مشرقی بنگال کے ضلع میمن سنگھ میں بحیثیت کلکٹر متعین تھے۔ یہ وہی ضلع ہے جو قحط میں سب سے زیادہ متاثر ہوا تھا۔ فضلی صاحب نے قحط زدہ لوگوں کی دیکھ بھال میں دن رات ایک کردیئے تھے۔ تقسیم ہند کے بعد بھی مشرقی پاکستان میں ان کی خدمات جاری رہیں۔ بتانے کی بات یہ ہے کہ وہ ایک ناول نگار بھی ہیں۔ ان کے دو ناول ''خونِ جگر ہونے تک'' اور ''سحر ہوتے تک'' اردو ادب میں ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں۔''

بتانے والے نے محمد علی کو بتایا۔ ''خونِ جگر ہونے تک'' بنگال کے مشہور قحط کے پس منظر میں لکھا جانے والا یہ ناول ایک شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے۔ فضلی صاحب جس زمانے میں آئی سی ایس افسر کی حیثیت سے ضلع میمن سنگھ میں متعین تھے اور انہوں نے اپنی آنکھوں سے قحط اور اس سے پیدا شدہ آلام و مصائب کو دیکھا تھا۔ ایک دردمند شاعر و ادیب کی حیثیت سے اسے محسوس کیا تھا۔ ناول کی صورت میں وہ سارے احساسات اور مشاہدات ''خونِ جگر ہونے تک'' کی صورت میں پیش کر رہا تھا۔ دوسرا ناول ''سحر

ہونے تک" یوں سمجھیے کہ دوسرا حصہ ہے۔"

"یعنی فضلی صاحب ایک اچھے شاعر ہی نہیں ایک ممتاز ناول نگار بھی ہیں۔"

"ہاں علی! جبھی تو انہوں نے اپنی اس پہلی فلم کی کہانی اور اس کے مکالمے بھی لکھے ہیں۔" بتانے والے نے بتایا۔ "انہوں نے اپنی علمی ادبی صلاحیتوں کو اس فلم میں آزمایا ہے۔ تمہیں معلوم ہے اپنی اس فلم میں انہوں نے کن شاعروں کے نغمات شامل کیے ہیں؟"

"میرا تو خیال ہے کہ انہوں نے سارے گانے بھی خود ہی لکھے ہوں گے۔"

"نہیں۔" ان کے مخاطب نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اس فلم میں امیر خسرو، ماہر القادری، جگر مراد آبادی، مرزا غالب اور میر تقی میر کا کلام استعمال کیا گیا ہے۔"

"اچھا! یہ تو بڑی حیران کن بات ہے کہ ایک مستند شاعر نے اپنے کلام کی بجائے اردو ادب کے سارے مشاہیر کا کلام اپنی فلم میں استعمال کیا ہے۔"

"ہاں! یہ اپنی نوعیت کی پہلی بات ہے مگر اس فلم کے لیے انہوں نے بھی دو گیت لکھے ہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ فضلی صاحب ایک بے حد پڑھے لکھے اور روشن خیال شخص ہیں۔ انہوں نے عام فلم میکرز کی روش پر چلنا گوارا نہیں کیا اور اپنے اوریجنل انداز اور طریقے پر فلم بنا رہے ہیں جس سچویشن میں انہوں نے جس شاعر کا جو کلام موزوں دیکھا اسے فلم میں استعمال کر رہے ہیں۔ اس فلم "چراغ جلتا رہا" میں لڑکی کی رخصتی کا ایک منظر ہے۔ تم اگر فلم دیکھتے رہے ہو تو تمہیں معلوم ہوگا کہ مختلف فلموں میں مختلف انداز میں رخصتی کا گیت استعمال کیا گیا ہے۔"

"جی ہاں مجھے فلم "بابل" کا گیت یاد ہے۔

چھوڑ بابل کا گھر موہے پی کے نگر
آج جانا پڑا دل لگانا پڑا

جسے مشہور مغنیہ شمشاد بیگم نے "ہم جولیوں" کے ساتھ بڑے پُرسوز انداز میں گایا تھا۔

ہمارے فضلی صاحب نے اس موقع پر جو رخصتی کا نغمہ استعمال کیا وہ اردو ادب کے لی جنڈ شاعر امیر خسرو کا لکھا ہوا ہے۔ جو غالباً رخصتی کے موضوع پر پہلا گیت ہے جو کچھ یوں ہے

کاہے کو بیاہی بدیس رے بابل
کاہے کو بیاہی بدیس

محمد علی کی ابتدائی زندگی

قیام پاکستان کے بعد محمد علی اپنے والد سید مرشد علی اپنی نانی اماں، بھائی ارشاد علی اور دو بڑی بہنوں عصمت آپا اور رضیہ آپا کے ساتھ ہجرت کر کے پاکستان آ گئے۔ ابھی محمد علی ایک ڈیڑھ سال کے تھے کہ ماں کے سائے سے محروم ہو گئے۔ ان کی پرورش عصمت آپا اور رضیہ آپا نے کی۔ 1949ء میں محمد علی کو ملتان کے ملت ہائی اسکول میں ساتویں جماعت میں داخل کیا گیا۔ اس اسکول سے انہوں نے میٹرک پاس کیا۔ 1955ء میں انہوں نے گورنمنٹ کالج ایمرسن ملتان میں ایف اے تک پڑھا۔ پھر حیدر آباد آ کر یہاں کے سٹی کالج سے ایف اے کی تعلیم مکمل کی۔ حیدر آباد آنے کے بعد ان کا قیام حیدر آباد کے علاقے ٹھنڈی سڑک پر سندھ یونیورسٹی کے موجودہ اولڈ کمپلیکس کے ساتھ والی دوسری گلی میں تھا۔ حیدر آباد سے ہی انہوں نے عملی زندگی کا آغاز کیا۔ کلیم آفس حیدر آباد میں بحیثیت کلرک 77 روپے ماہانہ پر ملازمت کی۔ اس کے بعد ریڈیو حیدر آباد سے بطور صداکار منسلک ہو گئے۔

☆☆

فلم سازی

محمد علی نے اپنے فلمی کیریئر میں بطور فلم ساز فلمیں بھی بنائیں۔ ان کی پہلی فلم عادل تھی۔ یہ ایک کاسٹیوم ایکشن فلم تھی۔ اس فلم میں محمد علی نے گھڑ سواری، نیزہ بازی اور تلوار بازی کے کرتب خوب دکھائے۔ ہندوستان سے آئے ہوئے ڈائریکٹر اکبر علی کو اس کا ہدایت کار بنایا۔ اسی فلم سے نامور ولن ادیب کی شہرت اور مقبولیت میں اضافہ ہوا۔ اس فلم کی ہیروئن سلونی تھیں۔ زیبا سے شادی کے بعد علی زیب پروڈکشن کے نام پر فلم ساز ادارہ قائم کیا اور اس کے بینر تلے "آگ" اور "جیسے جانتے نہیں" بنائی۔ ریونیو اسٹوڈیو میں داخل ہوتے ہی ان کا پروڈکشن آفس تھا۔ دونوں فلمیں باکس آفس پر کامیاب ہوئیں۔

بھائیوں کو دیئے محلے دو محلے
ہم کو دیا پردیس
کاہے کو بیاہی بدیس
ہم تو ہیں بابل تیرے کھونٹے کی گئیاں
جدھر ہانکے ہنک جائیں
ہم تو ہیں بابل تیرے بیلے کی کلیاں
گھر گھر مانگی جائیں
ہم تو ہیں بابل تیرے پنجرے کی چڑیاں
بھور بھئے اڑ جائیں
تانکوں بھری میں نے گڑیاں جو چھوڑیں
چھوٹا سہیلی کا ساتھ
کوٹھے تلے سے پالکی جو نکلی
بیرن نے کھائے پچھاڑ
ڈولی کا پردہ اٹھا کر جو دیکھا
آیا پیا کا دیس
کاہے کو بیاہی بدیس رے بابل
کاہے کو بیاہی بدیس

''کیوں کیسا ہے یہ رخصتی کا گیت؟'' مخاطب نے سوال کیا۔

''زبردست۔''

''کیا فضلی صاحب کا یہ کمال نہیں کہ انہوں نے اس ادبی شاہکار کو اپنی فلم میں پیش کیا؟''

''یقیناً ہے۔ اردو ادب میں لکھے گئے اس پہلے رخصتی گیت کو فلم میں شامل کرکے فضلی صاحب نے نہ صرف امیر خسرو اور ان کے اس گیت کو عوامی مقبولیت کا درجہ دیا بلکہ یہ ایک ادبی کارنامہ بھی ہے۔''

نہال عبداللہ اس فلم کے موسیقار تھے۔ ان کی بھی یہ پہلی فلم تھی۔ انہوں نے اس رخصتی کے گیت کی دھن کمپوز کی اور اسے کجن بیگم اور ہم جولیوں سے گوایا۔ کجن بیگم بنیادی طور پر سوز و سلام پڑھنے میں ماہر تھیں۔ انہوں نے اس گیت کو بڑی دلسوزی کے ساتھ گایا۔ جس نے بھی سنا، سن کر رو پڑا۔ واضح رہے کہ کجن بیگم مشہور گلوکارہ مہناز کی والدہ تھیں۔

''چراغ جلتا رہا'' 1962ء میں کراچی میں بنائی گئی ایک منفرد فلم تھی۔ جس میں محمد علی کے علاوہ زیبا، دیبا، عارف اور کیریکٹر ایکٹر کمال ایرانی نے پہلی بار اداکاری کرکے اپنا فلمی کیریئر شروع کیا۔

یہ وہ دور تھا جب فلم کے میدان میں سنتوش کمار، سدھیر، سید کمال، درپن اور حبیب جیسے خوب صورت اور باصلاحیت اداکار تماشائیوں کے دلوں پر راج کرتے تھے۔

فضل احمد کریم فضلی کی پہلی مگر اپنی نوعیت کی منفرد فلم ''چراغ جلتا رہا'' 9 مارچ 1962ء کو عیدالفطر کے موقع پر مین تھیٹر نشاط سینما (کراچی) میں نمائش پذیر ہوئی۔ اس فلم کے پریمیئر شو میں مادر ملت محترمہ فاطمہ جناح نے خصوصی طور پر شرکت کی۔ جب کہ اس وقت کے صدر ایوب خان نے خصوصی طور پر اس فلم کو دیکھا۔

جس وقت محمد علی کی یہ پہلی فلم ریلیز ہوئی اس وقت محمد علی کی عمر 30 سال اور 325 دن تھی۔ اس فلم کی اداکاری پر محمد علی کو بہترین اداکار کا پہلا اسکرپٹ لائٹ ایوارڈ ملا۔

یہ محض اتفاق ہے اور اسے محمد علی کی خوش نصیبی کہا جاسکتا ہے کہ ان کی پہلی فلم اس نوعیت کی تھی کہ اسے عوام اور خواص میں خصوصی طور پر دیکھا اور پسند کیا گیا۔ اس فلم نے سلور جوبلی کا اعزاز حاصل کیا۔

کریکٹر ایکٹر آزاد جنہیں محمد علی قابل صد احترام سمجھتے تھے اور چچا کہہ کر مخاطب کرتے تھے انہوں نے ''چراغ جلتا رہا'' کی نمائش کے بعد اپنے منہ بولے بھتیجے کو مبارک باد دیتے ہوئے کہا۔ ''بچے! تمہیں یاد ہے۔ تمہاری پہلی فلم کے ریلیز نہ ہونے پر میں نے کہا تھا۔ ''اللہ کو یہی منظور تھا جو ہوا۔ اللہ جو کرتا ہے اس میں اس کی کوئی مصلحت پوشیدہ ہوتی ہے۔ اپنے بندے کی بھلائی ہوتی ہے۔''

''جی ہاں! آپ نے کہا تھا۔''

''اب بتاؤ اگر وہ فلم کیا نام تھا اس کا؟''

''آگ اور خون۔''

اگر ''آگ اور خون'' ریلیز ہو جاتی تو تمہارے کریڈٹ میں وہ تمہاری پہلی فلم ہوتی۔ جس میں تم نے بطور مہمان اداکار ایک مختصر سا کردار ادا کیا تھا۔ جب کہ اس کے ریلیز نہ ہونے پر تم بہت مایوس ہوگئے تھے اور میں نے تمہیں تسلی تشفی دی تھی۔ اس کے بعد تمہیں ''چراغ جلتا رہا'' میں کام کرنے کا موقع ملا اور یہ تمہاری پہلی فلم قرار دی گئی جو اپنی نوعیت کی بہت بڑی فلم ہے۔ جس کا افتتاح ہمارے صاحب (قائداعظم) کی ہمشیرہ محترمہ فاطمہ جناح نے کیا اور جسے صدر مملکت ایوب خان نے خصوصی طور پر ایوان صدر میں دیکھا۔''

''ہاں..... چچا جان! آپ نے غلط نہیں کہا تھا۔ مجھے یاد ہے ان دنوں میں بہت دل گرفتہ تھا۔ آپ نے مجھے اس

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

وقت تسلی اور تشفی دیتے ہوئے کہا تھا۔ ''ارے یار! اتنی سی بات پر اتنا دکھ! اگر یہ فلم ریلیز نہیں ہوئی تو اللہ کی اس میں کوئی مصلحت ہوگی۔''

اس ملاقات کے دوران باتیں کرتے ہوئے محمد علی نے سینئر اداکار آزاد سے اپنے دل کی ایک چبھن کا ذکر کردیا۔ ''چچا جان! یہ جو مجھے اس فلم میں ولن کے کردار میں پیش کیا گیا ہے کیا مجھ پر ولن کی چھاپ نہیں لگ جائے گی؟ لگتا ہے اب میں کبھی ہیرو کے کردار میں کاسٹ نہیں کیا جاؤں گا۔''

''قدرت تم پر مہربان ہے۔'' آزاد بولے۔ ''اس لیے تمہیں اس فلم میں ولن کا کردار ملا۔ اس فلم کے ہیرو کا کردار روایتی انداز کا ہے۔ میرے خیال میں بالکل بے جان ہے۔ اگر اس لڑکے عارف کی جگہ تم ہیرو ہوتے تو تمہاری اداکاری بھی بے جان ہوتی۔ جب کہ تم کو ولن کے رول میں پرفارمنس کا زبردست موقع ملا۔ سب نے تمہاری اداکاری کی تعریف کی۔'' اتنا کہہ کر آزاد رکے پھر بولے۔ ''رہی بات تم پر ولن کے چھاپ لگنے کی......تو......تو منے بیٹے! شاید شروع میں تمہیں ولن کے طور پر ہی کاسٹ کیا جائے۔ کیونکہ ہمارے زیادہ تر فلم میکرز لکیر کے فقیر ہوتے ہیں مگر اس سلسلے میں تمہیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ تمہیں جو بھی کردار ملے تم اس میں اپنی بھرپور فنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرو۔ تمہاری اداکارانہ صلاحیت ہی تمہاری مددگار ثابت ہوگی اور تمہیں ہیرو کے کردار میں بھی کاسٹ کیا جائے گا۔''

محمد علی کو یاد آیا۔ بخاری صاحب نے بھی مجھ سے ایسی ہی بات کہی تھی اور پھر اب چچا آزاد بھی یہی کہہ رہے ہیں اگر دو بڑے آدمی ایک ہی بات کہہ رہے ہیں تو یقیناً ایسا ہی ہوسکتا ہے۔ آنے والے دنوں میں فلموں میں جو کردار ملے مجھے کرلینا چاہیے۔ باقی اللہ مالک ہے جو اس کو منظور ہوگا میرے حق میں بہتر ہی ہوگا۔

اور لکیر کی فقیر فلم انڈسٹری میں ایسا ہی ہوا۔ محمد علی وقفے وقفے سے فلموں میں کاسٹ کیے گئے مگر منفی کرداروں کے لیے۔ جاوید ہاشمی نے اپنی فلم ''دل نے تجھے مان لیا'' اقبال یوسف نے ''دال میں کالا'' شیخ حسن نے ''بازی گر'' اور پھر لاہور میں انور کمال پاشا نے ''سفید خون'' اور شباب کیرانوی نے ''عورت کا پیار'' میں محمد علی کو ولن کے کرداروں میں پیش کیا۔

پہلے انکار پھر اقرار

فلموں کی بعض پسِ پردہ باتیں بڑی دلچسپ اور انوکھی ہوتی ہیں جو عام لوگوں کو معلوم ہوتی ہیں تو وہ حیران رہ جاتے ہیں۔ ایسی ہی باتوں میں ایک بات یہ ہے کہ محمد علی نے اپنی سب سے زیادہ یادگار فلم ''خاموش رہو'' میں کام کرنے سے انکار کردیا تھا۔ یہ کردار ایک نائیکہ (مینا شوری) کے کارندے کا تھا۔ جو نائیکہ کے کہنے میں آکر کئی لڑکیوں سے شادی کرتا ہے اور پھر ان کو طوائف بنا دیا جاتا ہے۔ حالات اس کو ایک ایسے موڑ پر لے جاتے ہیں جہاں اس کی شادی اس کی اپنی ہی بہن دیبا سے کرا دی جاتی ہے۔ محمد علی کو جب فلم کے مصنف ریاض شاہد نے یہ کردار سنایا تو محمد علی نے یہ کردار ادا کرنے سے انکار کردیا۔ فلم کے ہدایت کار جمیل اختر نے پوچھا۔ ''کیوں انکار کررہے ہو؟'' محمد علی نے جواب دیا۔ یہ فلم میری بہنیں بھی دیکھیں گی وہ میرے بارے میں کیا سوچیں گی؟ اور میرے والد صاحب تو مجھے گھر سے نکال دیں گے۔''

حمایت علی شاعر نے کہا کہ کردار بہت اچھا ہے۔ تو محمد علی نے جواب دیا کہ بے شک کردار اچھا ہے لیکن میں یہ کروں گا نہیں۔

حمایت علی شاعر نے محمد علی کے والد سید مرشد علی سے اس سلسلے میں بات کی تو انہوں نے جواب دیا۔ میں اس کی بہنوں کو سمجھا دوں گا کہ وہ اپنے بھائی کی یہ فلم نہ دیکھیں۔''

والد کی اجازت کے بعد محمد علی نے ریاض شاہد کو بتایا کہ وہ یہ کردار کرنے کے لیے تیار ہے۔ تو ریاض شاہد نے کہا۔ ''دیکھنا خاموش رہو۔ میں جمال کا یہ کردار تمہیں فلم کی دنیا میں ایک اعلیٰ مقام عطا کرے گا۔'' فلم دیکھنے والوں نے جب محمد علی کا یہ روپ دیکھا تو انہیں محمد علی سے نفرت ہوگئی مگر جہاں سے یہ گانا شروع ہوا۔ ایسے دستور کو صبح بے نور کو میں نہیں مانتا میں نہیں مانتا۔ اس گانے کے بعد فلم بینوں کی نفرت محبت میں بدلنے لگی اور آخری مناظر میں انہیں محمد علی پر ترس آنے لگا۔

محمد علی ان نفرت انگیز کرداروں کو ادا کرتے رہے مگر حقیقتاً وہ خوش نہیں تھے۔ کبھی کبھی ان کا جی چاہتا وہ ایسے رول ایسی بے دلی سے ادا کریں کہ فلم ساز و ہدایت کار ان سے ایسے منفی کردار کروانا بند کردیں لیکن اگلے ہی لمحے انہیں اپنے محسنوں اور بڑوں کی نصیحت یاد آجاتی۔

"تمہیں جیسے بھی کردار ملیں انہیں نہایت دیانتداری سے اور اپنی بھرپور صلاحیتوں سے ادا کرنا۔ تمہاری اچھی اداکاری ہی تمہارے بہتر مستقبل کی ضمانت ہوگی۔ تمہیں مثبت اور اچھے کردار اسی صورت میں ملیں گے جب فلم میکرز کو یقین ہو جائے گا کہ تم ہر طرح کے کردار بخوبی ادا کرلو گے۔"

اور محمد علی منفی خیالات ذہن سے جھٹک دیتے اور ایک دن ان کے بڑوں کا کہا واقعی سچ ثابت ہوا۔ کراچی کے معروف ہدایت کار رفیق رضوی (باپو) نے انہیں اپنی فلم "مسٹر ایکس" میں بطور ہیرو کاسٹ کرلیا۔ مگر یہ فلم پسند نہیں کی گئی۔ عام لوگوں نے تو یہی سمجھا کہ ولن کو ہیرو کے طور پر تماشائیوں نے قبول نہیں کیا مگر بعض مبصروں اور تنقید نگاروں نے اس خیال کا اظہار کیا کہ اس فلم کی ناکامی کی اصل وجہ اس کی ہیروئن ناصرہ ہے۔ ناصرہ فلموں میں ریپ کا کردار ادا کرتی تھی اسے ہیروئن کے طور پر پیش کرنا ہدایت کار کی بھول تھی۔ بیک وقت ولن اور ریپ کو ہیرو اور ہیروئن بنانے کا تجربہ مناسب نہیں تھا۔ باپو کو بھی اپنی یہ غلطی تسلیم کرنی پڑی اور انہوں نے اگلی بار اپنی فلم "شرارت" میں ایک بار پھر محمد علی کو ہیرو کاسٹ کیا تو پہلی والی غلطی نہیں دہرائی۔ شرارت 1964ء میں ریلیز ہوئی اور اس نے نہ صرف عوامی مقبولیت حاصل کی بلکہ عوام نے محمد علی کو بطور ہیرو پسند بھی کیا۔ اس کے بعد بطور ہیرو محمد علی کی جو گاڑی چلی وہ رکی نہیں۔

اس سے پہلے کہ محمد علی کی بطور ہیرو کامیاب فلموں کا ذکر کروں، یہ بتانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ "مسٹر ایکس" کے بعد کراچی میں بننے والی فلم "ہیڈ کانسٹیبل" میں بھی محمد علی کو زیبا کے مقابل ہیرو لیا گیا مگر اس کی کامیابی کا سارا کریڈٹ فلم کے دوسرے ہیرو حبیب لے گئے جنہوں نے اپنے مخصوص رول اسمگلر کے کردار میں حقیقتاً بہت اچھی اداکاری کی تھی جب کہ ہیڈ کانسٹیبل کے روپ میں کمار اور ان کی بیوی کے کردار میں بیگم کی اداکاری کی بھی خوب واہ واہ ہوئی اور محمد علی کو بطور ہیرو اس فلم میں کسی نے تعریف کے

کنجوس سجنا کو مشورہ

دس ہزار کا دلکش سوٹ
جوتے، پرس
گولڈ پلیٹڈ چوڑیاں
دو نمبر کی ڈائمنڈ رنگ بھی
تو آپ نے اس عید پر مجھے دلوائی نہیں ہیں
تو پھر......
تو پھر عید پر مجھے عیدی ہی دے دینا
صرف پچاس ہزار......

شاعرہ: حمیرا نوشین، منڈی بہاؤالدین

اے چاند اس سے کہنا

وہ جو دور بہت دور بستا ہے
اسے کوئی یاد کرتا ہے
اور یاد بے حساب کرتا ہے
اے چاند اس سے کہنا
جب وہ بھی کسی اور کے سنگ ہنستا ہے
تو پھر دور بہت دور کسی کا دل دھڑکتا ہے
اور جب وہ اداس ہوتا ہے
پاس اس کے نہ کوئی غم شناس ہوتا ہے
تو پھر دور بہت دور کسی کی آنکھوں سے لہو برستا ہے
اے چاند اس سے کہنا
جسے وہ چھوڑ گیا تھا
جسے وہ توڑ گیا تھا
وہ آج بھی تیرے آس پاس بستا ہے

از: لیلیٰ رب نواز لیلیٰ، بھکر

کچھ بھی نہیں

مجھے اکثر ستاروں سے یہی آواز آتی ہے
کسی کے ہجر میں نیندیں گنوا کر کچھ نہیں ملتا
جگر ہو جائے گا چھلنی یہ آنکھیں خون روئیں گی
وصی بے فیض لوگوں سے نبھا کر کچھ نہیں ملتا

از: صبا نور...... لیہ

قابل نہ سمجھا۔ اس موقع پر انہیں جو دکھ ہونا چاہیے تھا وہ ہوا، جو ایک فطری بات تھی مگر اپنے جذبات کا اظہار کسی سے نہیں کیا کہ شاید اللہ کو یہی منظور تھا۔ ان کے اس صبر و شکر کا نتیجہ یہ سامنے آیا کہ "شرارت" ہٹ ہوگئی اور اس فلم کی اداکاری پر سب نے ان کی اداکاری کی دل کھول کر تعریف کی۔

محمد علی کے بہی خواہوں نے ان سے کہا۔ "تم اپنا کام دل جمعی سے کرتے رہو۔ اداکاری کی کامیابی کا انحصار کردار کی نوعیت پر ہوتا ہے۔ جو کردار جتنا پاورفل ہوتا ہے اس میں اچھی اداکاری کا اتنا ہی اسکوپ ہوتا ہے۔"

اور پھر اس کا عملی ثبوت اس وقت ملا جب محمد علی کو ہدایت کار جمیل اختر کی ڈرامائی فلم "خاموش رہو" میں کام کرنے کا موقع ملا جس میں محمد علی کی کردار نگاری فن کی معراج بنی۔ "خاموش رہو" میں محمد علی کے مقابل ہیرو کا کردار یوسف خان نے ادا کیا تھا اگرچہ یوسف خان نے بھی بہترین اداکاری کا مظاہرہ کیا تھا لیکن اس کے برعکس محمد علی نے اپنا کردار اس طرح ادا کیا کہ فلم بینوں کی نظر میں محمد علی ہی اصل ہیرو نظر آئے۔

اس فلم کی ناقابلِ فراموش اداکاری کے بعد محمد علی آگے اور آگے ہی بڑھتے چلے گئے۔ محمد علی جلد ہی صفِ اول کے ہیروز میں شمار کیے جانے لگے۔

انہی دنوں کی بات ہے۔ ایک انٹرویو کے درمیان ان سے ایک صحافی نے پوچھا۔ "علی بھائی! آپ تو ایک صداکار تھے۔ آپ کو اداکاری کا خیال کیسے آیا؟"

"صداکاری میں عوام تک صرف ہماری آواز پہنچتی ہے۔ جب کہ ہماری شکل وصورت سے کوئی آشنا نہیں ہوتا۔ بطور صداکار جب ہم مقبول ہو جاتے ہیں تو فطری طور پر ہماری یہ خواہش ہوتی ہے کہ عام لوگ ہمیں جانیں پہچانیں۔ ہمیں دیکھ کر لوگ یہ کہیں کہ یہ محمد علی ہے مگر آپ جانتے ہیں صداکاروں کی شناخت صرف ان کی آواز ہوتی ہے۔ اس لیے میرے دل میں یہ آرزو تھی کہ میں اداکاری کے میدان میں بھی اپنے جوہر دکھا کر اپنی شناخت اور پہچان بناؤں۔"

"ان کے بعد آپ کو "چراغ جلتا رہا" میں اداکاری کا موقع ملا؟"

"نہیں، یہ تو بہت بعد کی بات ہے۔ اس سے بہت پہلے جب میں ریڈیو حیدرآباد سے منسلک تھا مجھے پہلی بار اداکاری کا موقع ملا تھا۔"

"بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔ ریڈیو میں رہ کر آپ

خوشبو جیسی باتیں

☆ صرف بددعائیں ہی خوشیوں کے راستے بند نہیں کرتیں، بعض اوقات صبر بھی سکھ کی راہ کی ڈھول بن جایا کرتا ہے۔

☆ زخم ہمیشہ اسی سے ٹھیک ہوتا ہے جو اسے عنایت کرتا ہے اور کبھی تو یہ اس کے بھی بس کی بات نہیں رہتی۔

☆ اپنے آپ سے زبردستی مت کریں ورنہ ٹوٹ جائیں گے۔

☆ کچھ تعلق انا سے ٹوٹ جاتے ہیں لیکن کچھ رشتوں کو قائم رکھنے کے لیے انا ضروری ہوتی ہے۔

☆ امن کی فاختہ وہیں اترتی ہے جہاں پیار، صلح اور صبر کی دھوپ پھیلی ہو۔

☆ زندگی وہ نہیں جو ہم سوچتے ہیں زندگی وہ ہے جو ہم جیتے ہیں۔

از: ارم کمال، فیصل آباد

لالچ کی بات

☆ شادی امیر لڑکی سے ہو یا غریب سے دونوں ہی میاں سے بحث کرنے کی عادی اور اپنی بات منوانے کی خواہش مند ہوتی ہیں۔

☆ سائیکل ہو مہران ہو یا بی ایم ڈبلیو، سڑک دونوں کے لیے ایک ہی ہوتی ہے۔

☆ آئی فون ہو یا نوکیا، آپ میسج اور کال دونوں پر حاصل کرتے ہیں۔

☆ رولکس ہو یا عام گھڑی ٹائم دونوں پر ایک ہی ہوتا ہے اور آپ اکانومی کلاس میں جائیں یا عام پر، آپ کی منزل تبدیل نہیں ہوتی۔ کچھ بھی غلط نہیں ہے اگر ہم ضرورت تک رہیں، لالچی نہ بنیں کیونکہ ضرورت پوری ہو جاتی ہے لالچ کبھی پوری نہیں ہوتی۔

از: فریحہ شبیر، شاہ نکڈر

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

نے اداکاری کیسے کی؟"

محمد علی مسکرائے۔ "بات کچھ یوں ہے کہ حیدر آباد ریڈیو میں نشر ہونے والا میرا ایک ڈراما "اندھیرا اجالا" بہت مقبول ہوا تو معروف شاعر حمایت علی شاعر نے جو خود بھی ان دنوں حیدر آباد ریڈیو سے منسلک تھے۔ اس ڈرامے کو اسٹیج کرنے کا ارادہ کیا۔ اسٹیج کی ضرورت کے تحت اسے دوبارہ لکھوایا اور اسے "اندھیرے اجالے" کے نام سے حیدر آباد ہی میں اسٹیج پر پیش کیا۔ اس ڈرامے میں پہلی بار میں نے ایک اداکار کے طور پر پرفارم کیا۔ میرا کردار سردار علی کا تھا جو ناظرین نے پسند کیا اور میری اداکاری پر تالیاں بجا کر اپنی پذیرائی کی سند ادا کی۔"

محمد علی نے اس انٹرویو کے دوران بتایا۔ "اس ڈرامے کی کہانی میرے بڑے بھائی ارشاد علی نے لکھی تھی۔ وہ بھی حیدر آباد ریڈیو سے وابستہ تھے۔ اس کہانی کی ڈرامائی تشکیل مکالمے اور ہدایات حمایت علی شاعر کی تھیں۔ اس ڈرامے میں مصطفیٰ قریشی نے بھی ایک فوجی افسر کا کردار ادا کیا تھا۔"

"یہ ڈراما کہاں اسٹیج ہوا تھا؟"

"گورنمنٹ گرلز کالج ہیر آباد (حیدر آباد) میں ارژنگ کے زیر اہتمام اسٹیج کیا گیا تھا۔"

"آپ کو کچھ یاد ہے۔ یہ کس زمانے کی بات ہے۔"

"بہت اچھی طرح یاد ہے جس دن یہ ڈراما اسٹیج ہوا تھا۔ وہ دسمبر کی 21 تاریخ تھی اور سال تھا 1959ء کا۔ کیونکہ یہ میری دلی آرزو کی تکمیل کا دن تھا۔ میری اداکاری پر کئی لوگوں نے بشمول حمایت علی شاعر اور مصطفیٰ قریشی نے دل کھول کر تعریف کی تھی اور کہا تھا۔ تمہاری صداکاری کی طرح تمہاری اداکاری بھی قابل ستائش ہے۔"

محمد علی نے صحافی کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ "میرا اداکاری کرنے کا شوق اس ڈرامے کے بعد میرے اندر ہی اندر پنپنے لگا۔ صداکاری کرتا رہا مگر اداکاری کو ہی اپنی منزل تصور کرتا رہا۔"

"اور پھر آپ کا آخر کار چراغ جلتا رہا......"

"نہیں۔" محمد علی نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ "اس سے پہلے بھی اداکاری کا ایک چراغ جلا تھا۔ مگر اس کی روشنی نہ پھیل سکی۔"

"کیا مطلب؟ ذرا وضاحت کے ساتھ بتایئے۔"

"ایک فلم میں اداکاری کا مختصر سا رول ملا تھا۔ بطور

گانوں کی پکچرائزیشن

گانا برصغیر کی فلموں میں بڑی اہمیت کے حامل سمجھے جاتے ہیں مگر ہر اداکار کو گانے کی پکچرائزیشن پر مہارت حاصل نہیں ہوتی۔ ہمارے ہاں اس سلسلے میں وحید مراد صفِ اوّل کے اداکار تھے۔ ہر گانے میں اپنی اداکاری سے جان ڈال دیتے تھے۔ اس ضمن میں محمد علی بہت اناڑی تھے۔ وہ گانوں میں زیادہ اچھی اداکاری نہیں کر پاتے تھے۔ اس کے باوجود انہوں نے بعض فلموں کے گانوں کی پکچرائزیشن میں زبردست اداکاری کی جن میں یہ گانے قابلِ ذکر ہیں۔

☆ گوری کے سر پہ سج کر سہرے

☆ مجھے کر دے نہ دیوانہ۔ ترا انداز مستانہ

☆ ہمارے دل سے مت کھیلو۔ کھلونا ٹوٹ جائے گا

☆ ایسا پیار کرنے والا میری جان

☆ کہنے کو تو آئی سہاگ رات لیکن

☆ تیرے میرے پیار کا ایسا ناطہ ہے

☆ ٹھہرا ہے سماں ہم تم ہیں جہاں

مہمان اداکار کام کرنے کا موقع ملا تھا مگر بوجوہ یہ فلم ریلیز نہ ہو سکی۔ اس فلم کا نام "آگ اور خون" تھا۔ اور یہ کراچی میں بنی تھی۔"

بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جو اس وقت تک دوسروں کو معلوم نہیں ہوتیں جب تک کوئی خود دوسروں کو نہ بتائے۔ یہ ڈرامے میں اداکاری کرنا اور اسٹیج اداکار کے طور پر اپنی اداکارانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کرنا اسی نوعیت کی بات ہے۔ اس کی ایک مثال اور بھی ہے۔

ایک فلم میں ایک بار ایک سین میں محمد علی کو بیڑی پیتے ہوئے دکھانا تھا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب وہ ایک بڑے اداکار بن چکے تھے۔ اسسٹنٹ ڈائریکٹر ہاتھ میں بیڑی پکڑے ہچکچاہٹ کے ساتھ کہہ رہا تھا۔ "سر! آپ یہ نامراد بیڑی پی لیں گے؟"

"پی لوں گا یار! پی لوں گا۔ اداکار ہوں۔ سیٹ پر ہدایت کار کی بادشاہی چلتی ہے۔ وہ جو چاہتا ہے، جس طرح چاہتا ہے ہمیں اس کا حکم ماننا پڑتا ہے۔ اس کی تکمیل کرنی پڑتی ہے۔" اتنا کہہ کر وہ ہنسنے لگے۔ یہ بات بڑی سنجیدہ تھی اس لیے

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

ہنسنے کی تو کوئی بات نہیں تھی۔ نائب ہدایت کار کے علاوہ وہاں موجود دوسرے لوگوں نے بھی محمد علی کو حیرت سے دیکھا جو ہنس پڑے تو بولے۔ ''ارے یار! میں نے تو اپنی اسموکنگ کی ابتدا بیڑی ہی سے کی تھی۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں حیدر آباد میں تھا۔ مجھ پر نئی نئی نوجوانی کی بہار آئی تھی۔''

محمد علی کے بارے میں اگر یہ کہا جائے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے انہیں اداکاری کے لیے ہی بنایا تھا تو غلط نہیں ہو گا۔ یوں تو ان میں بے شمار خوبیاں تھیں مگر اداکار کی حیثیت میں وہ بے مثل صلاحیتوں کے مالک تھے۔ کیسا ہی کردار ہو مشکل سے مشکل، پیچیدہ الجھا ہوا۔ فقیر کا کردار ہو یا بادشاہ کا، جرنیل کا ہو یا ایک اجڈ گنوار کا، ہر کردار میں وہ ایسے فٹ ہو جاتے تھے جیسے انگوٹھی میں نگینہ۔ ہدایت کار رضا میر کی شاہکار فلم ''آگ کا دریا'' میں وہ دلاور ڈاکو کے رول میں حقیقی ڈاکو نظر آئے تھے۔ شباب کیرانوی کی سوشل فلم ''انسان اور آدمی'' میں ایک جج کا مشکل کردار نبھایا۔ شمیم آراء کی ذاتی فلم ''صاعقہ'' میں شمیم آراء کے مقابل ہیرو کا جذباتی کردار انہوں نے جس طرح ادا کیا اس نے اس فلم کو ان کی یادگار فلم بنا دیا۔ حسن طارق کی ''کنیز'' بھی محمد علی کی یادگار فلم ہے۔ جس میں سنتوش کمار، صبیحہ خانم، وحید مراد کی زبردست پرفارمنس کی موجودگی میں اپنی اداکارانہ صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ ایس سلیمان کی فلم ''الزام'' میں پہلے ایک شریف انسان ناصر اور پھر آزاد ڈاکو کے کردار میں اداکاری کے وہ جوہر دکھائے کہ دیکھنے والے دنگ رہ گئے۔ فلم کے اختتامی منظر میں انہوں نے اپنی اداکاری سے فلم دیکھنے والوں کو اشکبار کر دیا۔ ''آگ'' محمد علی کی دوسری ذاتی پروڈکشن تھی جس میں انہوں نے لہری کے ساتھ ہلکی پھلکی کامیڈی اداکاری کر کے یہ ثابت کر دیا کہ وہ محض بھاری بھرکم کردار ہی نہیں کر سکتے۔ لائٹ اداکاری کر کے بھی عوامی توجہ حاصل کر سکتے ہیں، حسن طارق کی فلم ''وحشی'' محمد علی کی وہ شاہکار فلم ہے۔ جس میں انہوں نے اپنے کردار کو سچائی کے سانچے میں ڈھال کر اسے امر کر دیا۔ یہ کردار ایک بردہ فروش کا تھا جسے محمد علی نے اپنے فن کی پہچان بنایا۔ ایک دن یہی وحشی اپنی سگی بیٹی کو اغوا کر کے کوٹھے کی زینت بنا دیتا ہے۔ اس فلم میں محمد علی کی اداکاری فن کے عروج پر نظر آتی ہے۔ امیر محمد علی کی پلاٹینم جوبلی فلم تھی جس میں انہوں نے ندیم کے ساتھ ناقابلِ فراموش پرفارمنس کا مظاہرہ کیا تھا۔

اس سپرہٹ فلم کا شمار محمد علی کی یادگار اور شاہکار فلموں میں ہوتا ہے۔ ''ضمیر'' ہدایت کار اقبال اختر کی ایک ناکام فلم تھی۔ بڑی کاسٹ کے باوجود یہ فلم کامیاب نہ ہو سکی۔ وحید مراد اور محمد علی کی موجودگی بھی اسے ناکامی سے نہیں بچا سکی۔ اس فلم میں بھی محمد علی کی اداکاری کو تماشائیوں کی اکثریت نے پسند کیا اور اسے محمد علی کی یادگار فلموں میں شمار کیا۔ ''آواز'' شباب کیرانوی کی ایسی فلم تھی جس میں محمد علی کے ساتھ نغمہ وحید مراد، غلام محی الدین اور شبنم نے بھی اپنی اداکارانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا تھا لیکن ان سب میں محمد علی کی پرفارمنس فن کی بلندیوں پر نظر آئی۔ اتنے بڑے اسٹارز کی موجودگی میں ''آواز'' محمد علی کی ہی فلم سمجھی گئی۔

''آگ کا دریا'' کے بعد ڈاکو کے روپ میں محمد علی کی شخصیت پر ایسی چھاپ لگی جو مٹائے نہ مٹ سکی۔ ڈاکو کے کردار میں فلم میکرز کی پہلی پسند محمد علی ہوتے تھے۔ یوں علی بھائی نے زیادہ تر ڈاکو کے کردار نبھائے۔ سنگرام پاکستان کی پہلی فلم تھی جس میں محمد علی نے اپنے اصل نام سے کام کیا۔ ہندو سنگرام مسلمان ہو کر محمد علی بن جاتا ہے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ محمد علی کے اسلامی کردار سے متاثر ہو کر سندھ کا ایک خاندان مسلمان ہو گیا تھا۔

''آس'' محبت کے رشتوں میں بندھے ایسے پیار کرنے والوں کی کہانی ہے جو مر کر بھی امر ہو جاتے ہیں۔ یہ محمد علی اور شبنم کی ایسی فلم ہے جیسی فلمیں بار بار نہیں بنا کرتیں۔ یہ علی سفیان آفاقی کی کامیاب ترین فلم تھی جس میں محمد علی کی کردار نگاری نے اسے شاہکار فلم بنا دیا اس فلم کی اداکاری پر انہیں نگار ایوارڈ بھی ملا۔ محمد علی خود بھی اپنی اس فلم اور اس کی کردار نگاری کا ذکر اکثر کرتے تھے اور کہتے تھے اگر رائٹر اور ڈائریکٹر پڑھا لکھا اور باشعور ہو تو ''آس'' جیسی فلم وجود میں آتی ہے۔

جن لوگوں نے یہ فلم دیکھی ہے وہ اس کا وہ منظر کبھی نہیں بھول سکتے جب محمد علی دلہن بنی شبنم کی لاش کو کاندھے پر اٹھا کر سیڑھیوں سے اترتے نظر آتے ہیں۔ یہ ایسا منظر تھا جسے دیکھتے ہوئے فلم بینوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی ہے۔

محمد علی کی یادگار فلموں میں ایک فلم ''دامن اور چنگاری'' بھی تھی۔ یہ شباب پروڈکشن کی ایک ایسی میوزیکل سپرہٹ فلم تھی جس میں محمد علی زیبا، ندیم، عالیہ، اسلم پرویز اور علاؤالدین نے بہترین اداکاری کی تھی مگر محمد علی کی کردار

نگاری سب سے مختلف اور فن کی بلندیوں کو چھوتی ہوئی تھی۔ ناقدین فن کی اکثریت کا خیال تھا کہ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ ''دامن اور چنگاری'' کی عوامی مقبولیت کا سبب محمد علی کی پرفارمنس ہے۔

''سلاخیں'' ہدایت کار حسن عسکری کی کامیاب فلموں میں شمار ہوتی ہے۔ اس فلم میں محمد علی نے اپنی بہترین پرفارمنس سے اسے اپنی یادگار اور شاہکار فلم بنا دیا۔ جب کہ اس فلم میں بابرہ شریف کی اداکاری بھی لاجواب ہے، فلم بین جس سے متاثر ہوئے۔ اس فلم کا ایک گیت ''تیرے میرے پیار کا ایسا ناطہ ہے'' جو محمد علی اور بابرہ شریف پر فلمایا گیا تھا۔ بہت پسند کیا گیا اور فلم کی کامیابی میں اہمیت کا حامل سمجھا گیا۔

محمد علی کی یادگار فلموں میں ایک فلم ''حیدر علی'' بھی ہے۔ یہ تاریخی فلم ہدایت کار مسعود پرویز نے ڈائریکٹ کی تھی جو پاکستان کی فلمی تاریخ کی سب سے عظیم، یادگار اور بہترین فلم ثابت ہوئی۔ محمد علی نے اپنے گیٹ اپ سے ہی فلم دیکھنے والوں کو متاثر نہیں کیا، اپنی آواز اور ایک ایک ایکشن سے یوں لگنے جیسے عظیم سپہ سالار حیدر علی حقیقی معنوں میں ان کے سامنے موجود ہے۔ محمد علی کی اداکاری کا یہی تو کمال تھا کہ وہ ہر کردار کو حقیقت کے روپ میں پیش کرتے تھے۔

محمد علی اپنی اداکاری کے حوالے سے ایک ایسے انمول فنکار تھے جو ہر کردار کی ادائیگی سے فلم کی اہمیت میں گراں قدر اضافہ کرتے تھے۔ فلمساز و ہدایت کار یہ سوچ کر انہیں مشکل اور پیچیدہ کرداروں میں پیش کرتے تھے کہ وہ اپنی خداداد صلاحیتوں سے اس کردار کو یادگار بنا دیں گے۔ اس ضمن میں ان کی ایک دو نہیں متعدد فلمیں قابلِ ذکر ہیں جنہیں شاہکار کا درجہ حاصل ہے۔ دل بے تاب، گھر کا اجالا، دل کے ٹکڑے، خاندان، رواج، جاگ اٹھا انسان، آئینہ، پاکیزہ، آسرا، نغمۂ صحرا، دوریاں، خریدار، ہیڈ کانسٹیبل، نیلا پربت، بازی، دشمن، تاج محل، صورت اور سیرت، ان داتا، نوکر، گمراہ، پروفیسر، زخمی، پرچھائیں، آبرو، آئینہ اور صورت، تم سلامت رہو، داغ، حقیقت، ہزار داستان، ایک گناہ اور سہی، ایثار، اجنبی، خون اور پانی، شکوہ، نیک پروین، بہو رانی، پھول اور شعلے، یہ ساری ایسی فلمیں ہیں جو محمد علی کے نام سے پہچانی جاتی ہیں۔

یوں تو محمد علی کی زندگی کا ہر پہلو قابلِ ذکر ہے اس موقع پر ہم ان کی کچھ مخصوص فلموں کا ذکر کر کے ان کی فلمی شخصیت کی عکاسی کریں گے۔ محمد علی کی پہلی رنگین اور سینما اسکوپ فلم ''جان پہچان'' تھی جو 1967ء میں ریلیز ہوئی۔ ان کی پہلی بیرونِ ملک بننے والی فلم ''میرے ہمسفر'' تھی جو 1972ء میں نمائش پذیر ہوئی۔ محمد علی نے پہلا ڈبل رول فلم خاندان میں کیا جو 1964ء میں ریلیز ہوئی۔ پہلی بار نیگیٹو، بولڈ کردار 1966ء میں فلم ''غدار'' میں کیا۔ محمد علی کی بیرونِ ملک چلنے والی پہلی فلم ''مسٹر ایکس'' ہے جو ایران میں فارسی زبان میں چلی۔ ''ٹائیگر گینگ'' جرمنی کے اشتراک سے بننے والی پہلی فلم تھی جو 1974ء میں ریلیز ہوئی۔ محمد علی نے اس فلم میں غیر ملکی فنکاروں کے ساتھ کام کر کے اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ بیرونِ ملک بھی کیا۔ محمد علی کی پہلی بھارتی فلم ''کلرک'' تھی جس میں انہوں نے زیبا بیگم کے ساتھ کام کیا تھا۔ یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ اس وقت کی بھارتی وزیراعظم اندرا گاندھی کی خواہش پر انہوں نے اس بھارتی فلم میں کام کیا تھا۔ قصہ کچھ یوں ہے کہ فلم ساز و ہدایت کار اور اداکار منوج کمار پاکستان آئے تو محمد علی نے ان کا شاہانہ استقبال کیا۔ پاکستان میں ان کی بڑی پذیرائی ہوئی۔ واپس جا کر منوج کمار نے محمد علی اور دیگر پاکستانیوں کی محبتوں کا خوب ذکر اذکار کیا۔ اندرا گاندھی کو خیال آیا کہ کیوں نہ ان دونوں (محمد علی اور منوج کمار) کی دوستی کا سہارا لے کر دونوں ملکوں (بھارت اور پاکستان) کی دوستی کی راہیں استوار کی جائیں۔ انہوں نے اس وقت کے صدر پاکستان ضیاء الحق سے رابطہ قائم کر کے کہا۔ ''میں چاہتی ہوں آپ کا اداکار محمد علی ہماری کسی بھارتی فلم میں کام کرے۔''

''اچھا آئیڈیا ہے۔''

''اسے عملی جامہ پہنانے کے لیے آپ کو بھی کچھ کرنا ہوگا۔''

''مجھے کیا کرنا ہوگا؟''

''آپ اسے یہاں آنے کی خصوصی اجازت دیں گے اور میں اسے بھارتی فلم میں کام کرنے کی اجازت دوں گی۔''

واضح رہے کہ ان دنوں پاکستان میں بھارتی فلموں کی نمائش پر پابندی عائد تھی اور سرکاری طور پر کسی آرٹسٹ کو بھارتی فلموں میں کام کرنے کی اجازت بھی نہیں دی جاتی تھی۔

محمد علی جہاں سیکڑوں تماشائیوں کے محبوب اداکار تھے

URDUSOFTBOOKS.COM
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS

وہیں ضیاء الحق کی ایک بیٹی کے بھی پسندیدہ اداکار تھے۔ اس بیٹی کی فرمائش پر محمد علی کو ایوانِ صدر بلایا جاتا تھا۔ صدر صاحب اور ان کی فیملی بھی محمد علی سے مل کر بہت خوش ہوتے تھے۔

ایک دن محمد علی صدر صاحب کے ایوان گئے تو ضیاء الحق صاحب نے ان سے کہا۔ ''ارے بھئی! تمہیں ایک بھارتی فلم میں کام کرنے کی آفر ہے۔ کرو گے؟''

''کیسی فلم؟ کس کی فلم؟ مجھے تو اس سلسلے میں کسی نے کچھ نہیں بتایا۔''

''میں بتا رہا ہوں ناں۔'' ضیاء الحق صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''سر! آپ کہہ رہے ہیں تو غلط نہیں کہہ رہے ہوں گے مگر کون سی فلم ہے؟ کس کی فلم ہے؟''

''یہ سب تمہیں معلوم ہو جائے گا۔ پہلے تمہاری رضا مندی تو حاصل ہو جائے۔''

''سر جی! آپ کا حکم ہے تو سر آنکھوں پر۔''

''بھئی! بات دراصل یہ ہے کہ......'' کہہ کر صدر صاحب نے اندرا گاندھی کی خواہش کا اظہار کر دیا اور کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ اس طرح وہ دونوں ملکوں کے درمیان دوستی اور بھائی چارگی کا رشتہ استوار کرنا چاہتی ہیں۔''

''اگر ایسی بات ہے تو اس سے اچھی بات کیا ہوگی۔ فنکار یوں بھی امن کے سفیر ہوتے ہیں۔ یہ بات میرے لیے باعث فخر ہوگی کہ میں اپنے وطن عزیز کے سفیر امن کے طور پر بھارت جا کر وہاں کی کسی فلم میں کام کروں گا۔''

''شاباش! مجھے تم سے ایسے ہی جواب کی توقع تھی۔ جلد ہی تمہیں باقی باتیں معلوم ہو جائیں گی۔''

اس کے بعد صدر صاحب نے بھارتی وزیراعظم اندرا گاندھی کو اطمینان دلا دیا کہ میں نے محمد علی کو رضا مند کر لیا ہے۔ آپ لوگوں کی طرف سے باقی تفصیل معلوم ہونے پر محمد علی کو بھارت جا کر وہاں کی فلم میں کام کرنے کی خصوصی اجازت دے دی جائے گی۔''

چند روز بعد منوج کمار کا ٹیلی فون محمد علی کے پاس آیا۔

''میرے پیارے علی بھائی! مجھے تم کو یہ بتاتے ہوئے کتنی خوشی ہو رہی ہے کہ میں اس کا اظہار نہیں کر سکتا۔''

''کیا بتاتے ہوئے بھائی! یہ بھی بتا دو۔''

''پاکستان میں تم نے میری زبردست مہمان نوازی کا جو مظاہرہ کیا تھا۔ بھگوان نے مجھے بھی تمہاری مہمان نوازی کا موقع دیا ہے۔''

''کیا مطلب! میں کچھ سمجھا نہیں۔''

''ارے یار! اداکاری نہ کرو۔ میں تمہیں بلاؤں گا تو آؤ گے نا؟''

''آپ بلائیں اور میں نہ آؤں۔ ایسے تو حالات نہیں۔'' محمد علی نے مصرعہ پڑھتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے شوٹنگ سے دو چار دن کی فراغت ملی تو آنے کی کوشش کروں گا۔''

اب منوج کمار نے کھل کر کہا۔ ''ارے نہیں یار! تمہیں اپنی ساری مصروفیات ترک کر کے فوری طور پر آنا پڑے گا۔''

''کیوں بھئی! خیریت تو ہے؟ کہیں تم دوسری شادی تو نہیں کر رہے ہو؟''

''ابھی نہیں، تمہاری شادی کا پروگرام بنایا ہے مگر گھبراؤ نہیں زیبا بھابی کے ساتھ ہی تمہاری شادی کرواؤں گا۔''

''کیا......کیا......کیا...... یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟'' علی بھائی نے سب کچھ سمجھتے ہوئے انجان بن کر پوچھا۔

''بھئی بات دراصل یہ ہے کہ میری زیر تکمیل فلم ''کلرک'' کی کاسٹ میں، میں نے تمہیں اور زیبا بھابی کو شامل کر لیا ہے۔ تم اپنی فلموں کے فلم سازوں سے کچھ دنوں کی مہلت لے کر فوراً آ جاؤ۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تم دونوں کا کام میں جلد ہی مکمل کر کے تم لوگوں کو واپس بھجوا دوں گا۔''

اور پھر جلد ہی علی زیب بھارتی فلم ''کلرک'' میں کام کرنے کے لیے بمبئی چلے گئے۔

ان کے بھارت جانے اور منوج کمار کی فلم میں کام کرنے کی خبر پر پاکستان میں ایک بحث چھڑ گئی۔ میڈیا میں مختلف لوگ مختلف قسم کی باتیں کرنے لگے۔

''محمد علی نے اچھا کیا۔ محمد علی نے اچھا نہیں کیا۔ بھارت کے متعصب لوگ اس کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کریں گے۔ منوج کمار ان کا دوست ہے۔ وہ ایسا نہیں ہونے دے گا۔ اگر اس نے پیار اور محبت سے بلایا ہے تو اس کے برخلاف نہیں ہونے دے گا۔''

محمد علی اور زیبا کا کردار ''کلرک'' میں بہت پاورفل تھا۔ نہ بھی ہوتا تو بھی وہ اپنی خداداد فنی صلاحیتوں سے قابل ستائش بنا دیتے۔ دونوں میاں بیوی نے ایسی اداکاری کی کہ دیکھنے والے دنگ رہ گئے۔

منوج کمار نے وعدے کے مطابق جلد ہی ان کا کام مکمل کرلیا اور وہ دونوں پاکستان واپس آگئے۔ یہاں آکر انہیں معلوم ہوا کہ ان کے بھارت جانے اور بھارتی فلم میں کام کرنے پر فلمی اور غیر فلمی لوگوں کی اکثریت خوش نہیں ہے۔ انہوں نے اس تاثر کو ختم کرنے کی کوشش کی کہ جو کچھ آپ لوگ سوچ رہے ہیں ایسا نہیں ہوگا۔ فلم میں ہم دونوں کا کردار بہت اچھا ہے۔ ہماری اداکاری سے بھی سب مطمئن ہیں اگر تعصب کی کوئی بات ہوتی تو ہمیں معمولی کردار میں پیش کرتے۔

اندرا گاندھی کو جب یہ خبر ملی کہ علی زیب نے بہت اچھا کام کیا ہے اور ان کی وجہ سے فلم زبردست کامیابی حاصل کرے گی تو بہت خوش ہوئیں۔ دوسری طرف حکومت مخالف سیاسی طاقتوں کو اس بات پر سخت تشویش ہوئی اگر یہ فلم کامیاب ہوگئی تو اندرا گاندھی اپنی کوشش میں کامیاب ہو جائیں گی۔ پاکستان کے ساتھ پینگیں بڑھانے کا انہیں اچھا موقع ملے گا۔ لہٰذا اندرا گاندھی کی کوشش کو ناکام بنانے کے لیے مخالف سیاسی طاقتوں نے ساز باز شروع کردی اور اندر ہی اندر ڈسٹری بیوٹر اور سینما مالکوں کو یہ کہہ کر ورغلانے لگیں کہ اگر یہ فلم کامیاب ہوگئی تو پاکستان سے پاکستانی آرٹسٹوں کا آنا جانا شروع ہوجائے گا اور بھارتی فنکاروں کی سخت حق تلفی ہوگی۔ ہماری فلم انڈسٹری کو ایک دھچکا لگے گا۔ اس لیے کلرک کو کسی صورت کامیاب نہ ہونے دیا جائے۔ جن بھارتی صحافیوں نے پاکستانی فنکاروں کی پرفارمنس دیکھی تھی انہوں نے فلم کے بارے میں بڑی حوصلہ افزا خبریں چھاپی تھیں اور فلم کی کامیابی کی پیش گوئی کی تھی مگر...... مگر جب یہ فلم ریلیز ہوئی تو نتیجہ اس کے بالکل برعکس سامنے آیا۔ فلم بری طرح فلاپ ہوگئی۔ دونوں پاکستانی آرٹسٹوں کا کام تماشائیوں کو بالکل بکواس لگا اور اس کی وجہ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں تھی کہ علی زیب کے کام کو کاٹ چھانٹ کر اس طرح کا بنا دیا تھا کہ وہ بے ربط اور بے معنی بن کر رہ گئے تھے۔ ایسی حالت میں نہ صرف پاکستانی آرٹسٹوں کے کام کو فلاپ قرار دیا گیا بلکہ فلم پر بھی زبردست ناکامی کی چھاپ لگی۔ نیکی ہار گئی اور بدی جیت گئی۔

شنید ہے کہ اندرا گاندھی نے منوج کمار سے سختی کے ساتھ باز پرس کی کہ ”یہ تمہاری کیا حرکت ہے؟ تم نے تو کہا تھا کہ دونوں نے زبردست کام کیا ہے۔“

”میں نے غلط نہیں کہا تھا۔“ منوج کمار نے کہا۔

”ان دونوں کو اور فلم کو فلاپ کرانے میں دوسروں نے کردار ادا کیا ہے۔ جن لوگوں پر فلم کی نمائش کی ذمہ داری تھی انہوں نے یہ سازش کی ہے۔“

”مگر کیوں؟“

”یہ تو وہی بتا سکیں گے جنہوں نے یہ سب کچھ کیا ہے۔“

اندرا گاندھی کی سمجھ میں بات آگئی کہ یہ دراصل ان کے خلاف سازش ہے۔ ان کے سیاسی مخالفین ان کی سیاسی ڈپلومیسی کو ناکام بنانے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔

”کلرک“ کے سپر فلاپ ہونے کی خبر پاکستان میں بھی پہنچی۔ دونوں میاں بیوی کو پہلے تو یقین نہیں آیا۔ ”یہ کیسے ہوسکتا ہے۔“ مگر یہ ہوگیا تھا۔ میڈیا غلط خبر تو نہیں دے سکتا۔ انہوں نے سوچا۔ منوج کمار سے پوچھیں کہ تمہاری اتنی اچھی فلم فلاپ کیسے ہوگئی؟

”وہ بے چارہ کیا جواب دے گا۔“ زیبا بیگم نے کہا۔ ”اس فلم کو سازش کے تحت ناکام کرائی گئی ہے۔ یہاں ہمارے میڈیا نے جو قیاس آرائی کی تھی۔ وہ غلط نہیں تھی۔ متعصب ہندوؤں نے نمائش کے وقت فلم کا خانہ خراب کردیا ہوگا۔“

”ہاں تم درست کہہ رہی ہو۔ اسی بات کا امکان ہو سکتا ہے۔“

دوسری طرف منوج کمار کو اپنی فلم کے فلاپ ہونے سے زیادہ اس بات کا دکھ تھا کہ علی بھائی میرے بارے میں ”کیا سوچتے ہوں گے، ہائے ربا! یہ کیا ہوگیا! میں نے تو ان کی زبردست مہمان نوازی کا قرض اتارنے کے لیے اپنی سی کوشش کی تھی۔ میرے دشمنوں نے یہ کیا کردیا۔ مجھے تو انہوں نے علی زیب کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رکھا۔“

منوج نے کئی بار سوچا کہ ان سے معذرت کرلینا چاہیے۔ انہیں اپنی بے گناہی کا یقین دلا دینا چاہیے مگر ہر بار وہ حوصلہ ہار گئے۔

ادھر محمد علی بڑے اداکار ہی نہیں بڑے دل گردے کے انسان بھی تھے۔ انہوں نے یہ سوچ کر اس واقعہ کو بھلا دیا کہ یقیناً اس میں منوج کمار کا کوئی قصور نہیں۔ اور اپنی معروفیات میں گم ہوگئے۔

قدرت نے محمد علی کو بے پناہ خوبیوں کا پیکر بنایا تھا۔ حسین وجمیل، مردانہ وجاہت سے بھرپور، دراز قد، مضبوط جسامت، بھرے ہوئے بازو، چوڑا چکلا سینہ، اس پر گھنے

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

سیاہ بال، صاف رنگت، بڑی بڑی اور گہری آنکھیں، چہرہ ایسا پُرکشش کہ جو دیکھے دیکھتا رہ جائے۔ گفتار میں شائستگی، فکر میں گہرائی، نشست و برخاست، چلنا ٹھہرنا پلٹنا مسکرانا، دُکھی ہو جانا، ہر ادا سحر انگیز، یہ ساری وہ باتیں تھیں جن کی وجہ سے دیکھنے والے ان کے گرویدہ ہو جاتے تھے۔

زیبا بیگم بھی ان کی اس سحر انگیز شخصیت سے متاثر تھیں۔ دونوں نے ''چراغ جلتا رہا'' سے جو سفر شروع کیا تھا اس کی روشنی دونوں کی زندگی کو غیر محسوس طور پر منور کرتی رہی۔ اکثر فلموں میں دونوں ساتھ کام کرتے، رومانوی کردار نبھاتے ہوئے دونوں اس قدر ڈوب جاتے کہ دیکھنے والے یہی محسوس کرتے جیسے درحقیقت پیار کرنے والے ایک دوسرے سے محبت کا اظہار کر رہے ہیں۔ بظاہر وہ کردار کی ڈیمانڈ اور ہدایت کار کی ڈائریکشن پر عمل کر رہے ہوتے تھے مگر ایسے مواقع پر ان کے حقیقی جذبات و احساسات اثر انگیز ہوتے تھے۔

دونوں چونکہ آرٹسٹ تھے اس لیے دونوں کو دوسرے آرٹسٹوں کے ساتھ بھی کام کرنا پڑتا تھا مگر اندرونی طور پر انہیں وہ لطف وہ مزہ نہیں ملتا تھا جو مزہ اور لطف انہیں ایک دوسرے کے ساتھ کام کر کے ملتا تھا۔ دونوں چونکہ بڑے اور اچھے اداکار اور اداکارہ تھے، اس لیے اپنی جانب سے فنی تقاضوں کو بھرپور طور پر پورا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ محمد علی کے ساتھ دوسری ہیروئنز بھی پسند کی جاتی تھیں اور زیبا کے ساتھ دوسرے ہیرو بھی جچتے تھے۔ وحید مراد ان میں نمایاں تھے۔ ''ارمان'' اور کئی دوسری فلمیں وحید مراد کے ساتھ بہت مقبول ہوئیں۔

کبھی کبھی زیبا کو محسوس ہوتا کہ وحید مراد ان کے ساتھ اپنی جوڑی کو زیادہ سے زیادہ مقبول بنانے کے لیے ان میں کچھ زیادہ ہی دلچسپی لینے لگے ہیں۔ انہیں خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں وہ محمد علی کی محبت پر ڈاکا تو نہیں ڈالنا چاہتا ہے؟

یہ وہ وقت تھا جب زیبا بیگم کو ایک فیصلہ کرنا پڑا۔ اپنے دل کی نہاں خانوں میں علی کی جو محبت پوشیدہ تھی اسے زبان پر لانے کا فیصلہ کرنا پڑا۔ ایک دن انہیں دل کی بات زبان پر لانی پڑی۔

''علی! اس سے پہلے کہ کوئی مجھے تم سے چھین لے، علیحدہ کر دے، تم میرا ہاتھ مضبوطی سے تھام لو۔''

محمد علی نے زیبا کو غور سے دیکھا۔ وہ بے حد سنجیدہ تھیں۔ ''تمہیں کون مجھ سے چھیننا چاہتا ہے؟''

''کئی ہاتھ ہیں جو میری طرف خطرناک انداز میں بڑھ رہے ہیں۔ میں محسوس کر رہی ہوں کہ کچھ لوگ مجھے اپنانے کے لیے......''

اس کے آگے وہ اور کچھ نہ کہہ سکیں۔ ان کی آواز بھرا گئی۔ محمد علی کچھ دنوں سے خود بھی یہ محسوس کر رہے تھے کہ کچھ بڑے اداکار زیبا میں کچھ زیادہ دلچسپی لینے لگے ہیں۔ زیبا کو فلمسازوں اور ہدایت کاروں کی مرضی پر ہر اداکار کے ساتھ کام کرنا پڑتا تھا۔ اس لیے وہ سب کے ساتھ کام کرتی ہے مگر اب اس نے خود محسوس کر لیا ہے کہ ان اداکاروں کی نیت اچھی نہیں ہے۔

محمد علی نے آگے بڑھ کر زیبا کے ہاتھوں کو مضبوطی کے ساتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ ''زیبا! میں کسی بدنیت کو بھی اس کی مذموم کوشش میں کامیاب ہونے نہیں دوں گا۔''

''یہ اس صورت میں ممکن ہے علی! جب دو بولوں کی مضبوط بندھن میں مجھے باندھ کر ہمیشہ کے لیے اپنا بنا لو گے۔ کیا تم اپنے اس عروج کے دنوں میں ایسا کرنے کی ہمت کرو گے؟ جسارت کرو گے؟''

''تم میری زندگی ہو، میری زندگی کا مقصد ہو۔ اس لیے تمہارے لیے ہر خطرے سے گزرنے پر تیار ہوں۔''

''تو پھر دیر نہ لگاؤ۔ اس سے پہلے کہ کوئی بدخواہ ہمارے درمیان کوئی دیوار کھڑی کر دے۔ تم ایسے حالات پیدا کر دو کہ ہم اس کے بعد نہ کہہ سکیں۔'' تاکس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری''

''ہاں ایسا ہی ہوگا۔ انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔ اور جلد ہی ہوگا۔''

اس کے فوری بعد محمد علی، اپنے مربی، خیرخواہ اور منہ بولے چچا آزاد سے ملے۔ اور کہا۔ ''چچا جان! میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔ فوری طور پر بغیر کسی تاخیر کے۔''

آزاد گھبرا گئے۔ ''ارے بھئی منے میاں! اچانک یہ کیا ماجرا ہو گیا۔ اتنی جلدی تمہیں کون پسند آ گئی۔ وہ کون خوش نصیب لڑکی ہے؟ جس نے تمہیں اپنی زلفوں کا اسیر کر لیا ہے؟''

''چچا جان! یہ کام بس آپ کو کرانا ہے اور جلد ہی کرانا ہے۔ کرا دیں گے نا؟''

''پہلے میرے سوالوں کا جواب دو۔ اتنی جلدی تمہیں کون پسند آ گئی۔ شادی بیاہ تو بڑے آرام اور اطمینان سے کی جاتی ہے۔ یہ زندگی بھر کا سودا ہوتا ہے۔ اس لیے بہت

چھان پھٹک کے بعد کی جاتی ہے۔"

"چچا جان! کسی چھان پھٹک کی ضرورت نہیں۔ میں نے ہر طرح اطمینان کر لینے کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے۔"

"مگر کون ہے وہ؟ یہ تو بتاؤ۔"

"وہ کوئی نئی یا اجنبی لڑکی نہیں۔ وہ زیبا ہے۔"

"زیبا یعنی اپنی فلم انڈسٹری کی خوب صورت اور بے پناہ صلاحیتوں کی حامل اداکارہ زیبا؟"

"جی ہاں وہی...... وہی...... بالکل وہی۔"

"کیا وہ بھی تم سے شادی پر رضا مند ہوگئی ہے؟"

"آپ کیا سمجھتے ہیں کیا میں اس سے زور زبردستی شادی کر رہا ہوں؟"

"نہیں تم شریف آدمی ہو ایسا نہیں کر سکتے مجھے یقین ہے۔"

"تو پھر ہم دونوں کی شادی خانہ آبادی کا بندوبست کیجیے۔"

آزاد سوچ میں پڑ گئے۔

"کیا سوچنے لگے؟" علی بھائی نے بے قراری کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "کیا یہ کام آپ کے بس کا نہیں؟"

"ہے بالکل ہے مگر میں تمہاری طرح دل سے نہیں دماغ سے سوچ رہا ہوں۔"

"کیا سوچ رہے ہو؟"

"یہی کہ یہ تم دونوں کے عروج کا دور ہے۔ کیا تمہاری شادی دونوں کی ساکھ پر اثر انداز نہیں ہوگی؟"

"اثر پڑے گا۔ مگر ہم پڑنے نہیں دیں گے۔"

"کیا مطلب!"

"مطلب یہ ہے میرے پیارے چچا جان کہ ہم خاموشی کے ساتھ نکاح کر لیں گے، کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہونے دیں گے۔ اس شادی کو خفیہ رکھیں گے۔ جب مناسب موقع ہوگا تب سب کو بتا دیں گے۔"

آزاد کسی قدر مطمئن ہوئے کہ اس عشق میں یہ عاشق مکمل دیوانہ نہیں ہوا ہے۔ ابھی اس کے ہوش و حواس قائم ہیں۔

اور پھر آزاد نے دونوں آزاد پنچھیوں کو نکاح کے دو مقدس بولوں کے پنجرے میں ہمیشہ کے لیے قید کرا دیا۔ یہ خوشگوار اور یادگار واقعہ 29 ستمبر 1966ء کو آزاد صاحب کے گھر ناظم آباد نمبر 4 کراچی میں پیش آیا جس میں چند انتہائی اعتماد کے لوگوں نے شرکت کی۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ دونوں لاہور میں فلم "تم ملے پیار ملا" کی شوٹنگ چھوڑ کر خاموشی کے ساتھ کراچی آئے تھے۔ نکاح قاضی سید احتشام نے پڑھوایا۔ مہر کی رقم 37500 مقرر ہوئی۔ بہت دنوں تک دونوں نے اس شادی کو خفیہ رکھا مگر آہستہ آہستہ یہ بات طشت از بام ہوگئی کہ اب محمد علی اور زیبا۔ علی زیب ہو گئے ہیں ایک دوسرے کے لیے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایک ہو گئے ہیں۔ شادی کے بعد زیبا دوسرے ہیروؤں کے ساتھ کام کرنے سے آہستہ آہستہ گریز کرنے لگیں۔ ان کا اصرار ہوتا ہے انہیں محمد علی کے ساتھ ہی کاسٹ کیا جائے۔ وجہ وہ یہ بتاتیں کہ عوام کی اکثریت محمد علی کے ساتھ ہی مجھے دیکھنا چاہتی ہے۔ مگر تاڑنے والے تاڑ گئے کہ وجہ کچھ اور ہے۔

دونوں نے ایک ساتھ 68 فلموں میں کام کیا مگر شادی کے بعد کی فلموں کی تعداد 57 ہے۔ ایسی فلموں میں زندگی کتنی حسین ہے۔ آگ، مجھے جانے نہیں۔ دل دیا درد لیا، کنیز، دامن اور چنگاری، محبت، سبق، افسانہ زندگی کا، محبت ہو تو ایسی ہو خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

دونوں نے کم و بیش 40 سال محبت بھرا، پرخلوص دور گزارا۔ ان کی محبت بھری ازدواجی زندگی قابلِ رشک اور قابلِ تقلید رہی۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم تھے۔ ایک جان دو قالب کی طرح۔ یہی وجہ تھی کہ انہیں دو ناموں کی بجائے علی زیب کے نام سے پکارا جانے لگا۔

ہماری فلم انڈسٹری میں کامیاب فلمی جوڑیاں اور بھی گزری ہیں جیسے کہ سدھیر، سورن لتا نذیر، صبیحہ سنتوش، نیئر سلطانہ درپن، پنا ایس سلیمان، شبنم روبن گھوش، نیلو ریاض شاہد، نشو تسلیم فاضلی، ریبو صاحبہ وغیرہ لیکن زیبا اور محمد علی کی جوڑی کا جواب نہیں تھا۔ دونوں کی جہاں گویا چاند سورج کی جوڑی تھی۔ ایسی مثالی جوڑی کم از کم ہماری فلمی دنیا میں کوئی اور نہیں تھی۔ دونوں نے پیار محبت سے بھرپور زندگی بسر کی۔

اس خوش نصیب جوڑے کی زندگی میں ایک وقت ایسا بھی آیا تھا کہ انہوں نے گھبرا کر فلم انڈسٹری سے کنارہ کشی کا فیصلہ کر لیا تھا مگر فلم سازوں اور ہدایت کاروں نے انہیں ایسا کرنے نہیں دیا۔

محمد علی اس لحاظ سے بہت خوش نصیب تھے کہ ہر دور کے حکمرانوں سے ان کے تعلقات بہت اچھے رہے۔ ان میں ذوالفقار علی بھٹو سرفہرست تھے۔ 1977ء میں جب بھٹو صاحب کی حکومت قائم ہوئی تو علی بھائی ان کے بے حد منظور نظر تھے۔ جب لاہور میں اسلامی سربراہ کانفرنس ہوئی

تو بھٹو صاحب کے کہنے پر انہوں نے اپنا محل نما بنگلا مہمان سربراہوں کے لیے مختص کر دیا۔ بھٹو صاحب، محمد علی پر اس قدر مہربان تھے کہ 1974ء میں انہیں پنجاب کا گورنر بنانا چاہا مگر علی بھائی نے یہ پیشکش قبول نہ کی۔ جب 1977ء کے الیکشن قریب آئے تو بھٹو صاحب کے جلسوں میں محمد علی، مصطفیٰ قریشی، طارق عزیز اور شاہ نواز بھی شامل ہوتے تھے۔ جب 77ء میں حیدر آباد میں ایک جلسہ حیدر آباد کے پولیس گراؤنڈ میں ہوا تو اس میں اس وقت کی 9 ستاروں والی پارٹی پر سخت تنقید کی گئی۔ مختلف 9 سیاسی جماعتوں نے بھٹو صاحب کا مقابلہ کرنے کے لیے گرینڈ الائنس بنایا تھا۔ اس اتحاد کے بعد حیدر آباد اور کراچی میں 9 ستارہ پارٹی کی مقبولیت میں تیزی سے اضافہ ہونے لگا۔ اس تقریر کے بعد جو حیدر آباد کے پولیس گراؤنڈ کے جلسے میں کی گئی تھی 9 ستارہ پارٹی کے حامیوں میں سخت اشتعال پھیلا۔ اس پارٹی کے نوجوان حامیوں نے علی زیب کی فلموں کے بائیکاٹ کا اعلان کر دیا۔ اس اعلان کے بعد کراچی اور حیدر آباد کے جس سینما گھر میں ان کی فلم ریلیز ہوئی 9 ستاروں کے بلوائی وہاں پہنچ جاتے اور ہنگامہ آرائی شروع کر دیتے۔

"اگر علی زیب کی فلم چلے گی تو سینما گھر کی ہر چیز جلے گی۔"

بلوائیوں کے اس زور زبردستی اور احتجاج کی وجہ سے سینما مالکان فوراً ان کی فلم اتار کر کوئی اور فلم دوسرے اداکاروں کی لگا دیتے۔

چونکہ یہ دونوں اپنے وقت کے سپر اسٹار تھے۔ اس لیے اس وقت ان کی کچھ فلمیں نمائش کی منتظر تھیں۔ کچھ تکمیل کے آخری مرحلے میں تھیں جب کہ متعدد فلمیں زیر تکمیل تھیں۔ یہ صورتِ حال فلم سازوں کے لیے زیادہ تشویش ناک تھی۔ فلم سازوں کے کروڑوں کا سرمایہ خطرے میں پڑ گیا۔ یہ احتجاج یہ بائیکاٹ بہت پُراثر ثابت ہوا۔ اس وقت تک ہماری فلم انڈسٹری میں کسی اداکار یا اداکارہ پر ایسا وقت نہیں آیا تھا۔ کسی کے خلاف ایسا عوامی احتجاج نہیں ہوا تھا۔ ایسا بائیکاٹ کسی کے خلاف نہیں ہوا تھا۔ فلمی فنکاروں کا سب سے بڑا اثاثہ ان کے چاہنے اور پسند کرنے والے ہوتے۔ سیاسی ہنگامہ آرائی نے علی بھائی کے دل و دماغ کو بری طرح متاثر کیا اور وہ یہ فیصلہ کر بیٹھے ہیں اب پرفارمنگ کے پیشے ہی کو ترک کر دوں۔ کمانے کھانے کے اور بھی دھندے ہیں۔ فلم سازوں کو ان کے اس ارادے کی بھنک ملی تو وہ اور گھبرا گئے اور انہیں سمجھانے لگے۔

"آپ جیسا فولادی اور اعصاب کا انسان اتنی معمولی سی بات پر گھبرا جائے۔ یہ بات ہم سب کے لیے اور آپ کے لاکھوں چاہنے والوں کے لیے بڑی تکلیف دہ ہوگی علی بھائی! یہ سب وقتی باتیں ہیں۔ سیاست کی گرما گرمی ختم ہوگی تو نفرت کا یہ دریا بھی اتر جائے گا۔"

"مگر یہ وقت ہم کیسے گزاریں۔ خالی وقت میں سوچتے سوچتے......"

"سارا قصور اس خالی وقت کا ہے۔ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھنے والوں کو شیطان ورغلاتا ہے اور وہ سب کچھ کر دیتا ہے جو اس کے لیے سراسر نقصان دہ ہوتا ہے۔"

"تو پھر میں اس خالی وقت کو کیسے پُر کروں۔"

"آپ دونوں اپنی زیرِ تکمیل فلموں کو مکمل کروائیں۔"

"اور جو بلوائی نگار خانوں میں بھی آ گئے تو....؟"

"اب ہم ایسے بھی نادان اور ناسمجھ نہیں کہ آپ دونوں کی شوٹنگ کا ڈھنڈورا پیٹیں۔ ہم لوگ بڑی خاموشی سے اور رازداری کے ساتھ آپ دونوں کا کام مکمل کروائیں گے۔ انشاء اللہ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوگی۔ جب آپ کی شوٹنگ ہوگی سیٹ پر صرف ہمارے بندے موجود ہوں گے۔"

علی بھائی نے اپنی شریکِ حیات زیبا بیگم کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ "اگر یہ لوگ کہہ رہے ہیں تو ان کے کہنے پر ہمیں اعتبار کرنا چاہیے گھر میں بے کار بیٹھے بیٹھے تو وقت نہیں کٹتا۔"

"چلو بھئی! ہماری ہوم منسٹری نے بھی گرین سگنل دکھا دیا۔ آگے اللہ کی مرضی۔"

بائیکاٹ کے دنوں کا فلم سازوں نے خوب فائدہ اٹھایا جب پروگرام بڑی رازداری کے ساتھ ان کا کام مکمل کروایا۔ نیت صاف ہو تو منزل آسان ہو جاتی ہے۔ بائیکاٹ کے ختم ہوتے ہوتے بہت سی نامکمل فلمیں مکمل ہو گئیں۔

بھٹو صاحب کی حکومت 5 جولائی 1977ء کو ختم ہو گئی۔ ملک میں مارشل لاء لگ گیا مگر علی زیب کی فلموں کا بائیکاٹ ختم نہیں ہوا۔ اس طرح بائیکاٹ کے 9 ماہ گزر گئے۔

عید الفطر 77 میر ظفر شباب کی اردو فلم "بھروسا"

URDUSOFTBOOKS.COM
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

کی نمائش کا اعلان ہوا تو پھر یہ قیاس آرائیاں شروع ہو گئیں کہ اب یہ فلم کیسے چلے گی؟ اس فلم کی نمائش کے حقوق سندھ سرکٹ کے لیے کاشف فلمز کے پاس تھے۔ سینما گھروں کی بکنگ کا آغاز بھی کر دیا گیا۔ دوسری طرف اس فلم کی نمائش کے بارے میں شکوک و شبہات بہت تھے۔

آخر عیدالفطر 77 کا دن آ گیا اور ظفر شباب کی فلم ''بھروسا'' کراچی اور حیدرآباد میں ریلیز کر دی گئی جو دونوں بائیکاٹ زدہ سپر اسٹار کی تھی۔ اس عید کے موقع پر ''درد'' اور ''میرے حضور'' بھی لگی تھی۔ پہلے دن بھروسا کو دیکھنے والوں کا ہجوم دیدنی تھا۔ کراچی اور حیدرآباد میں ایسا والہانہ استقبال کسی فلم کا نہیں ہوا تھا۔ فلمی ناقد کی جماعت پر یہ حیران تھی۔ فلم کی رپورٹ اے ون نکلی۔ کسی طرف سے بھی ایک آواز نہیں آئی کہ فلم کیوں چلائی گئی ہے۔ دوسرے دن سے حیدرآباد اور کراچی کے جن سینماؤں میں بھروسا زیر نمائش تھی وہاں عوام کا سمندر موجود تھا۔ سینما والے اس رش کی وجہ سے بہت پریشان ہوئے اور انہوں نے کاشف فلمز سے درخواست کی کہ انہیں روزانہ چار شو چلانے کی اجازت دی جائے لیکن کاشف فلمز نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ہم تمام سینماؤں میں اس فلم کو دوسرے ہفتے میں بھی بک کرتے ہیں۔ فلم ''ان داتا'' کے بعد ''بھروسا'' دوسری فلم تھی جو دوسرے ہفتے میں بھی تمام سینماؤں میں زیر نمائش رہی۔ اس فلم نے اپنی کامیاب نمائش سے ثابت کر دیا کہ فلم عوام کی پسند سے چلتی ہے۔ عوام کی پسند اور ناپسند ہی فنکاروں کی فنی حیات یا موت ہوتی ہے۔ کسی سیاسی دباؤ کی وجہ سے وقتی طور پر فنکار یا اس کی فلموں کا بائیکاٹ کیا جا سکتا ہے مگر اس کا اثر دیرپا نہیں ہوتا۔

دوسرے ہفتے میں بھی ''بھروسا'' کے تمام شوز فل تھے۔ یقین نہیں آتا تھا کہ یہ انہی فنکاروں کی فلمیں ہیں جن کی فلموں کو 9 مہینوں تک بائیکاٹ کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اس فلم کی باکس آفس پر زبردست کامیابی کے نتیجے میں اپنی ایم جی دو ہفتے میں مکمل کر لی پھر اپنی گولڈن جوبلی مکمل کرنے تک ہر ہفتہ کئی سینماؤں میں چلتی رہی۔

''بھروسا'' محمد علی کے اپنے شہر حیدرآباد میں بیک وقت 4 سینماؤں میں چلی۔ یہ سینما گھر تھے بمبینو، ڈیلائٹ، اوڈین اور چراغ محل۔ اوڈین اور چراغ محل میں یہ فلم دوسرے ہفتے اتر گئی۔ جب کہ ڈیلائٹ سینما میں دو ہفتے تک چلی۔ بھروسا کا کامن تھیٹر بمبینو سینما تھا جہاں یہ فلم مسلسل عید قربان تک دس ہفتے چلی۔ کاشف فلمز والوں نے اسے زبردستی اتار کر اپنی نئی فلم ''بڑے میاں دیوانے'' لگا دی مگر اس کا کوئی شو فل نہ ہوا۔ ''بھروسا'' بمبینو سے اتاری جانے کے بعد نور محل میں چلائی گئی۔ یہاں بھی بھروسا نے شاندار بزنس کیا۔ اگر یہ فلم 10 ہفتے کے بعد بمبینو سے اتاری نہ جاتی تو اس کے کامیاب بزنس میں مزید اضافہ ہوتا۔ ''ان داتا'' کے بعد حیدرآباد میں تیز ترین بزنس کرنے والی فلم ''بھروسا'' تھی۔ اس فلم نے اس دفعہ تین لاکھ سے زائد بزنس کر کے ایک نیا ریکارڈ قائم کیا۔

''بھروسا'' کی نمائش سے علی زیب کے بائیکاٹ کے خاتمے پر دونوں کو جو خوشی نصیب ہوئی اس کا اظہار مشکل ہے۔ فلمی اور غیر فلمی دوستوں نے انہیں مبارک باد دی۔ بہتوں نے ان کے بنگلے پر پہنچ کر ان سے عید بھی ملی اور ان کی عید کی خوشیوں کو دوبالا کرنے والی خبر پر بھی انہیں دل کھول کر مبارک باد دی۔

علی بھائی کی بے شمار خوبیوں میں ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہ بے حد مہمان نواز تھے۔ ان کی میزبانی کا شرف حاصل کرنے والے صرف فلمی لوگ ہی نہیں ہوتے تھے۔ ادب اور آرٹ سے تعلق رکھنے والی شخصیات بھی ہوتی تھیں اور عمائدین شہر بھی اور عام لوگ بھی جو ان کے پرستار ہوتے تھے یا پھر کچھ ایسے لوگ بھی جو اپنی حاجت اور ضرورت کے سائل بن کر آتے تھے۔ علی بھائی انہیں بھی عزت و تکریم کے ساتھ بٹھاتے۔ انہیں کھلاتے پلاتے اور ان کی مدد بڑی خاموشی کے ساتھ کرتے تھے۔

وہ جو کہا جاتا ہے تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیے مگر محمد علی بغیر کسی وجہ کے بھی تقریب کا انعقاد کر دیتے تھے۔ ان کے مہمان فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، حمید اختر، حبیب جالب، ظفر اقبال، عطاء الحق قاسمی اور اسی پائے کے ادیب و شاعر کے علاوہ بڑے بڑے سرکاری افسران ہوتے تھے۔

کبھی کبھی تقریب کی وجہ بھی ہوتی تھی۔ جیسے منوج کمار یا کوئی اداکار یا ہدایت کار بھارت سے آ گیا تو اس کے اعزاز میں محفل سجائی۔

قدرت نے علی بھائی کو جہاں ہر طرح کی نعمتوں سے نوازا تھا وہاں ایک بہت بڑی دولت سے محروم بھی رکھا تھا اور یہ دولت تھی اولاد۔ وہ بے اولاد تھے جس کا انہیں بڑا دکھ تھا۔ ان کا محل نما گھر جس میں ان کے علاوہ زیبا بیگم رہتی تھیں اور خدمت گاروں کی فوج ظفر موج جو ایک اشارے

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

پر حاضر ہو جاتی تھی۔ وہ گھر بھی انہیں ویران اور بے رونق نظر آتا تھا۔ انہیں ایسے موقع پر میر انیس کا یہ مصرعہ یاد آتا تو وہ دکھی ہو جاتے تھے۔

''گھر قبر سے بدتر ہے جو فرزند نہیں ہے۔''

ایک دن وہ انہی افسردہ خیالات میں اداس بیٹھے تھے کہ زیبا بیگم نے ان کے پاس آکر پیار بھرے لہجے میں کہا۔ ''کیا بات ہے۔ یہ چاند سا چہرہ گہنایا گہنایا سا کیوں نظر آرہا ہے؟''

علی نے زیبا کی طرف دیکھا اور پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''نہیں کوئی بات نہیں۔''

''میں نہیں مانتی، کوئی بات تو ہے تم اکثر اداس ہو جاتے ہو۔ آخر تمہیں کیا غم ہے؟ کیا دکھ ہے؟ اللہ کا دیا تمہارے پاس سب کچھ ہے پھر یہ......''

''سب کچھ کہاں ہے میرے پاس؟'' محمد علی نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ''میرے مولا نے مجھے اتنا خوب صورت گلشن دیا ہے مگر اس میں کہیں کوئی پھول نہیں ہے۔ ایسا گلشن میرے کس کام۔ جس میں کوئی پھول نہ ہو۔ کیا یہ بات میرے لیے......''

''ایسا کرو۔'' زیبا جھٹ بول پڑیں۔ ''تم دوسری شادی کرلو۔''

''ایسا جھانپڑ رسید کروں گا، خبردار ایسی بات دوبارہ زبان پر نہیں لانا۔''

زیبا مسکراتے ہوئے ان کے اور قریب آگئیں۔ علی بھائی نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔ ''میں اپنی خوشی کے لیے تمہیں کوئی غم نہیں دے سکتا۔''

''کتنا چاہتا ہے یہ شخص مجھے۔'' زیبا نے دل ہی دل میں کہا۔ ''کیا وہ بات میں اس سے کہہ دوں جس سے اسے آج تک بے خبر رکھا ہے؟''

''تم میرے بارے میں فکرمند نہ ہو۔ زندگی میں صرف خوشیاں ہی نہیں کچھ غم بھی تو ہونا چاہئیں۔ کچھ دکھ بھی تو ہونا چاہئیں۔''

پھر زیبا نے ایک دم کہہ دیا۔ ''علی! آج میں تم کو ایک بات بتانا چاہتی ہوں جو آج تک تم سے پوشیدہ رکھی تھی۔''

محمد علی ہمہ تن گوش ہو گئے۔

''میرے ہمدم! میرے دوست وہ بات یہ ہے کہ میری ایک بیٹی ہے۔''

علی بھائی کا موڈ مزاج ایک دم بدل گیا۔ اپنی ران پر ایک ہاتھ مار کر کھڑے ہو گئے اور نہایت غصیلے لہجے میں کہا۔ ''تم نے یہ بات مجھ سے کیوں چھپائی؟''

زیبا لرز کر رہ گئیں۔ ''یا اللہ خیر۔'' انہوں نے دل ہی دل میں کہا۔ ''اب یہ شخص جانے کیا طوفان کھڑا کرے گا۔''

''تم نے اتنی بڑی...... اتنی اہم بات مجھ سے پوشیدہ رکھ کر...... مجھ پر بہت زیادتی کی ہے۔'' علی بھائی کا انداز بے حد جذباتی تھا۔ ''مجھے بہت دکھ ہوا ہے تمہاری اس بات پر۔''

زیبا بیگم معذرت کے طور پر شاید کچھ کہنا چاہتی تھیں مگر علی بھائی نے انہیں اس کا موقع نہیں دیا۔ ''تم کسی معافی تلافی کے قابل نہیں ہو۔ تم نے مجھے ہی دکھ نہیں دیا۔ اپنے آپ کو بھی ایک اذیت میں مبتلا رکھا اور سب سے زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ اس بچی کو اس معصوم بچی کو ماں باپ کے سائے سے شفقت سے...... محبت سے محروم رکھا۔''

محمد علی کی گفتگو کے اس رخ پر زیبا بیگم کو کسی قدر سکون ملا۔ ''یعنی......'' انہوں نے سوچا۔ ''علی کو اس بات پر اعتراض نہیں کہ میں ایک بچی کی ماں ہوں۔''

''تم کس قدر سنگ دل ہو کہ اپنی اولاد کو اپنے جگر گوشے کو خود سے دور رکھا۔ مجھے تو اس بچی کے حال پر رحم آرہا ہے جو ماں باپ کے ہوتے ہوئے کسی لاوارث بچی کی طرح کسی کے گھر میں پرورش پارہی ہے۔''

''مجھے معاف کردو علی۔''

''تمہارا جرم بہت سنگین ہے۔ تمہیں اسی صورت میں معاف کیا جاسکتا ہے کہ جتنی جلدی ممکن ہو سکے اس بچی کو یہاں لاؤ۔ یہ ہمارے ساتھ اور اس بچی کے ساتھ کیسی ناانصافی ہوئی ہے کہ ہم اولاد کے ہوتے ہوئے اس کے لیے ترستے رہے اور وہ بچی ماں باپ کی موجودگی کے باوجود ان کی شفقت اور محبت کو ترستی رہی۔''

زیبا بیگم کی اس وقت کیفیت بڑی عجیب و غریب تھی۔ انہیں اپنی حرکت پر جہاں ندامت تھی وہیں علی کی عظمت پر قربان ہونے کو بھی ان کا دل چاہ رہا تھا۔ علی کو انڈر اسٹیمیٹ کرنے پر شرمندہ بھی تھیں اور اس بات کی بھی بے انتہا خوشی تھی کہ علی نے ان کی اولاد کو اپنی اولاد سمجھ کر قبول کرلیا ہے۔

بچی پہنچی تو اس کی ماں سے زیادہ اس کے سوتیلے باپ کو خوشی ہوئی۔ علی نے اسے بہت پیار کیا۔ اسے اپنے سینے سے لگا کر اولاد کی محرومی کا احساس دور کیا۔ پھر اسے مخاطب

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
URDUSOFTBOOKS.COM

کر کے کہا۔ ”بیٹی ثمینہ! ہم دونوں آپ سے بہت شرمندہ ہیں کہ آپ کو اتنے دنوں تک اپنے سے دور رکھا۔ کیا کریں۔ ہماری کچھ مجبوریاں تھیں۔ اب آپ یہیں رہیں گی۔ ہماری آنکھوں کا نور بن کر۔ ہمارے دل کا سرور بن کر اور اس گھر کی رونق بن کر۔“

محمد علی ایک اچھے فنکار ہی نہیں تھے بہت اچھے انسان بھی تھے۔ فلمی اداکار عام طور پر بڑے دل پھینک ہوتے ہیں۔ اگر آج اس سے دل لگایا تو کل اس سے۔ مگر محمد علی ایسے نہیں تھے۔ انہوں نے زیبا کو چاہا۔ انہیں اپنایا تو بس انہی کے ہو رہے۔ جب تک زندہ رہے زیبا بیگم کو ٹوٹ کر چاہتے رہے۔ زیبا بھابی نے بھی اس وفا شعار شوہر کی محبت میں کبھی کوئی کمی آنے نہیں دی۔ علی سے شادی کے بعد انہوں نے صرف ان ہی کے ساتھ فلموں میں کام کیا۔ ان کا انتقال ہوگیا تو اداکاری سے ہی کنارہ کشی اختیار کر لی۔

محمد علی نے اپنے فلمی کیریئر میں انڈسٹری میں موجود ساری ہی بڑی اداکاراؤں کے ساتھ کام کیا اور سب ہی ان کے ساتھ اچھی لگیں مگر ان کی جوڑی زیبا بیگم کے ساتھ ہی سب سے زیادہ پسند کی گئی۔

اسی طرح پاکستانی فلموں کے تمام ہی بڑے ہیرو ندیم، حبیب، شاہد، وحید مراد، یوسف خان کے ساتھ مختلف فلموں میں مختلف اوقات میں پرفارم کرتے رہے لیکن جب علی بھائی نے لالہ سدھیر کے ساتھ اداکاری کی تو فلم بینوں کو زیادہ مزہ آیا۔ ان کا خیال تھا کہ محمد علی کا اصل ٹکراؤ سدھیر کے ساتھ ہے۔ دونوں جہاں ڈیل ڈول میں ایک جیسے تھے۔ وہاں فنی طور پر بھی دونوں ایک دوسرے سے کم نہیں تھے۔ ہر لحاظ سے دونوں ایک دوسرے کے مدمقابل تھے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ محمد علی، لالہ سدھیر سے بہت جونیئر فنکار تھے۔ اس کے باوجود محمد علی نے اپنی خداداد صلاحیتوں سے ترقی کر کے لالہ سدھیر جیسے ناقابلِ تسخیر فنکار کے مدمقابل اپنے آپ کو پیش کیا۔

دونوں نے ایک ساتھ جن فلموں میں کام کیا ان میں مجاہد، نغمہ صحرا، سیرت اور صورت، ان داتا اور جینے کی راہ شامل ہیں۔ ناقدین اور بصرین کا کہنا ہے کہ ان فلموں کی کامیابی اور پسندیدگی کی ایک وجہ ان دونوں مہان کلاکاروں کی پرفارمنس ہے۔

اچھے اداکاروں کی آزمائش اس وقت ہوتی ہے جب انہیں ایک ہی فلم میں ایک سے زیادہ کرداروں میں پیش کیا جاتا ہے۔ اچھے اداکار اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کے دو یا دو سے زیادہ کردار ایک دوسرے سے بالکل مختلف نظر آئیں۔ یہ اداکار کا بڑا کمال ہوتا ہے کہ وہ اپنے ہر روپ میں دوسرے کردار سے یکسر الگ نظر آئے۔

محمد علی کو بھی فلم سازوں اور ہدایت کاروں نے ڈبل کرداروں میں پیش کر کے ان کی اداکارانہ صلاحیتوں کا امتحان لیا۔ ایسی فلموں میں خاندان، ہزار داستان، محل، میرا گھر میری جنت، آنسو بن گئے موتی، ندیا کے پار، گمراہ، راجا جانی، ملن، کورا کاغذ اور انقلاب شامل ہیں۔

فلم خاندان میں محمد علی نے ایک غریب اور بے روزگار نوجوان کے روپ میں اور دوسرے کردار میں ایک مالدار اور دولت مند اور خوش حال شخص کا کردار بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ ادا کیا۔

ہزار داستان میں علی بھائی نے بیک وقت ایک مچھیرے، ایک بادشاہ اور ملک یمن کے شہزادے کے کردار نبھائے۔

محل میں وہ ایک بادشاہ اور ایک غریب نوجوان بنے۔ میرا گھر میری جنت میں ایک بے روزگار نوجوان اور ایک رئیس زادے کے روپ میں پیش ہوئے۔

ہدایت کار ایس سلیمان کی فلم ”گمراہ“ میں محمد علی نے ایک جواری اور ایک ڈاکو کے کردار میں اپنی فنی صلاحیتوں کا کامیاب مظاہرہ کیا۔

راجا جانی میں محمد علی کا ایک کردار ایک بینڈ باجے والے کا تھا جب کہ دوسرا رول ایک اسمگلر کا تھا۔

”کورا کاغذ“ میں محمد علی سے ایک کردار شرابی اور جواری نوجوان کا کروایا گیا۔ دوسرا رول ایک مل اونر کا تھا جس میں وہ سچ مچ ایک مل مالک نظر آتے ہیں۔ اسی طرح فلم ”انقلاب“ میں انہوں نے ایک فلسطینی مجاہد اور دوسرے فوجی کمانڈو کے روپ میں اپنی لازوال اداکاری کا مظاہرہ کیا۔

اداکاری ایک بہت ہی مشکل فن ہے۔ بہت کم لوگوں کو اس کا شعور ہے۔ محمد علی فلموں میں اسٹیج اور ریڈیو کی تہذیب کے ساتھ وارد ہوئے تھے۔ وہ اداکاری کو محض کھیل تماشا نہیں سمجھتے تھے۔ بلکہ عبادت سمجھتے تھے اور انتہائی دیانتداری کے ساتھ، محنت اور خوش دلی سے ہر کردار کی ادائیگی کرتے تھے۔

کسی بھی کردار کی کیفیت کو اجاگر کرنے کے لیے کسی بھی اداکار پر یہ لازم ہے کہ وہ اپنے چہرے کے تاثرات،

آنکھوں کے تاثرات اور آواز کے زیر و بم سے کردار کی ترجمانی کرے اور اپنی ذاتی شخصیت کو پس پشت ڈال کر کردار کو اپنے آپ پر طاری کر لے۔ محمد علی جب ڈاکو بنے تو ایک ڈاکو نظر آئے۔ جب وکیل بنے تو ایک وکیل نظر آئے۔ جب بردہ فروش بنے تو سچ مچ بردہ فروش ہی لگے۔ جب معاشرے کے ہاتھوں ستائے ہوئے ایک مظلوم کا کردار کیا تو تماشائیوں کی تمام ہمدردیاں حاصل کیں۔ ان حوالوں سے آگ کا دریا، انسان اور آدمی، وحشی اور خاموش رہو میں محمد علی کی کردار نگاری کو کون بھول سکتا ہے؟ ایسی ہی فلموں میں صاعقہ، آس، پھول میرے گلشن کا آئینہ اور صورت بھی ہیں جن میں محمد علی نے اپنے کرداروں کو اپنی لازوال اداکاری سے یادگار بنا دیا۔

مکالموں کی ادائیگی بھی ایک فن ہے۔ محمد علی بہت سوچ سمجھ کر اور کردار کے مزاج کو پیش نظر رکھ کر مکالمہ ادا کرتے تھے۔ وہ مکالمے ادا کرنے میں یکتا سنائی بھی دیتے اور دکھائی بھی دیتے۔ یہ تربیت ریڈیو کی تھی جو قدم قدم پر ان کے کام آئی۔

عام طور پر لوگوں کو اپنے شہر سے بہت محبت ہوتی ہے مگر محمد علی کو اپنے شہر حیدرآباد سے کچھ زیادہ ہی محبت تھی۔ انہیں پہلے ریڈیو پھر فلم کے لیے حیدرآباد کو چھوڑ کر کراچی اور لاہور میں سکونت اختیار کرنی پڑی مگر حیدرآباد سے ان کی محبت کا یہ عالم تھا کہ جب کوئی حیدرآباد کا باسی ان سے آکر ملتا۔ وہ اس سے اپنے عزیز اور رشتے دار کی طرح ملتے۔ بے حد خلوص اور محبت سے اس کی آؤ بھگت کرتے۔ حیدرآباد کے پرانے دوستوں اور ساتھیوں کو جب وہ لاہور بلاتے تو اپنے گھر پر ہی ٹھہراتے۔ مہمان نوازی کے بارے میں تو ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ ایورنیو اسٹوڈیو میں ان کا پروڈکشن آفس تھا۔ وہاں دونوں میاں بیوی کا کھانا گھر سے آتا تھا مگر یہ دو بندوں کا کھانا نہیں ہوتا تھا کئی بندوں کا ہوتا تھا۔ وہ کئی لوگوں کو اپنے ساتھ شریک کرتے تھے۔ کھلانے پلانے کے مقابلے ہی میں وہ حاتم طائی نہیں تھے خدمت خلق کے معاملے میں بھی حاتم تھے۔ ان کے دروازے پر کوئی بھی سائل آتا اسے مایوس نہیں لوٹاتے تھے۔ متعدد بیواؤں اور یتیموں کی سرپرستی کرتے تھے۔ بے سہارا غریب بچیوں کی شادی بیاہ بھی کرواتے تھے۔ انہوں نے بڑے لوگوں کی بھی بڑی خدمت کی۔ صدر ضیاء الحق نے جب بھٹو صاحب اور نصرت بھٹو صاحبہ کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا تو علی بھائی نے انہیں جیل میں ہر ممکن طریقے پر سہولت بہم پہنچائی۔ ان کے گھر سے ان کے لیے کھانا اور دیگر ضروری اشیاء بھیجی جاتی تھیں۔

محمد علی جو کماتے تھے اس کا بڑا حصہ انسانیت کی خدمت کے لیے خرچ کر دیتے تھے۔ انہوں نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ اپنے کل کے لیے کچھ پس انداز کریں۔ انفرادی طور پر تو وہ ہر خاص و عام کی جہاں جس کو ضرورت ہوتی تھی کام آتے تھے جب کہ اجتماعی طور پر بھی انہوں نے کئی ایسے ادارے قائم کیے تھے جو آج تک جب وہ اس دنیا میں نہیں فیض پہنچا رہے ہیں۔ ایسے اداروں میں تھیلیسیمیا کے کئی مراکز قابل ذکر ہیں جو انہوں نے کئی شہروں میں قائم کیے۔ بچوں میں خون کی کمی کو دور کرنے کے لیے یہ ادارے قائم کیے گئے جہاں بغیر رنگ و نسل اور کسی امتیاز کے ہر ضرورت مند بچے کا علاج ہوتا ہے۔ علی بھائی کو اس دنیا سے کوچ کیے گیارہ برس بیت گئے ہیں مگر ماشاء اللہ یہ ادارے آج بھی ضرورت مند بچوں کو حیات نو بخش رہے ہیں۔ یہ صدقہ جاریہ جاری ہے اور انشاء اللہ ہمیشہ جاری رہے گا۔

محمد علی کہنے کو ایک اداکار تھے مگر انسان کے روپ میں فرشتہ تھے۔ ان کے سینے میں ایسا دردمند دل تھا جو سب کے لیے دھڑکتا تھا۔ فلم انڈسٹری کے چھوٹے اداکاروں اور ہنرمندوں کی مدد اور معاونت کرتے تھے۔ کار خیر کسی طرح کا بھی ہو وہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے اور صاحب حیثیت فلم والوں کو بھی اس میں حصہ لینے کو کہتے تھے۔

ان کے خدمت خلق کے جذبے کو دیکھتے ہوئے انہیں مشیر ثقافت بھی بنایا گیا اور فلم انڈسٹری کے مسائل حل کرنے والے وفود کے میر کارواں بھی مقرر کیے گئے۔ ان کے ساتھ ان کی شریک حیات زیبا بیگم بھی ان کے فلاحی اور رفاہی کاموں میں تعاون و مددگار ثابت ہوتی رہیں۔ شوہر کی عدم موجودگی میں وہی ان کے مشن کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ علی بھائی عام لوگوں ہی کے پسندیدہ شخصیت نہیں تھے۔ بڑے اور نامور سیاسی شخصیتوں اور رہنماؤں کے گڈ بک میں بھی شریک تھے۔ ذوالفقار علی بھٹو اور صدر ضیاء الحق کے ہی چہیتے نہیں تھے۔ مسقط کے شاہ قابوس سے بھی محمد علی کے خوشگوار مراسم تھے۔ فلسطین کے رہنما یاسر عرفات بھی علی بھائی کے لیے اچھے خیالات رکھتے تھے۔ سعودی عرب کے شاہ فیصل اسلامی کانفرنس کے دوران علی زیب ہاؤس میں رہے تو ان کی مہمانی سے بے حد

متاثر ہوئے۔ ایران کے شہنشاہ نے انہیں اپنے دور میں پہلوی ایوارڈ سے نوازا۔ وہ نواز شریف کے مشیر ثقافت بھی رہے۔ حکومت پاکستان سے ''پرائیڈ آف پرفارمنس'' اور ''تمغۂ امتیاز'' حاصل کیا۔ مختلف فلموں پر بہترین کارکردگی پر دس نگار ایوارڈز حاصل کیے۔

ایوارڈ اور اعزاز فنکاروں کی بہترین پرفارمنس پر دیئے جاتے ہیں جو سرکاری سطح پر بھی دیئے جاتے ہیں اور پرائیویٹ طور پر بھی۔ محمد علی جنہیں عوام نے شہنشاہ جذبات کے خطاب سے نوازا تھا۔ ان کے اعزازات اور ایوارڈز کی ایک طویل فہرست ہے۔ 1984ء میں انہیں سپر پرفارمر کا نگار ایوارڈ ملا۔ 1987ء میں پہلا قومی ایوارڈ تمغۂ حسنِ کارکردگی سے نوازا گیا۔ 1997ء میں قومی اعزاز ستارۂ امتیاز سے سرفراز کیا گیا۔ 1998ء میں الیاس رشدی گولڈ میڈل ملا۔ 1998ء ہی میں نگار لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ اور نگار ملینیم ایوارڈ سے نوازا گیا۔ النصر دبئی ایوارڈ اور توشادا ایوارڈ (بھارت) سے بھی ان کے فن کو خراجِ تحسین پیش کیا گیا۔ ان کے علاوہ نگار ایوارڈ، گریجویٹ ایوارڈ، روحان ایوارڈ، چترالی ایوارڈ، کرٹیکس ایوارڈ، اسکرین لائٹ ایوارڈ، سندھ عوامی ایوارڈ، وحید مراد میموریل ایوارڈ، مصور ایوارڈ، بولان ایوارڈ، نیشنل اکیڈمی ایوارڈ، ایشین اکیڈمی ایوارڈ، دھنک ایوارڈ، نور جہاں ایوارڈ، ایم اسماعیل ایوارڈ اور دیگر ایوارڈ اور متعدد شیلڈز سے بھی ان کی لازوال اداکاری کو خراجِ تحسین پیش کیا گیا۔

ایک ایسا فنکار جسے اللہ نے اتنی عزت دی۔ دولت اور شہرت سے نوازا۔ کیسی عجیب طبیعت تھی اس شخص کی کہ اسے ان تمام باتوں کے باوجود وہ بڑا حلیم الطبع انسان تھا۔ کیا بڑا کیا چھوٹا سب سے جھک کر ملتا۔ سب کے دکھ درد میں کام آتا۔ عجز و انکساری کا پیکر۔ سب سے ہنس کر مسکرا کر بات کرتا۔ اس کی عادت ثانیہ تھی۔ اتنا کشادہ قلب کہ جو بھی ان کے پاس گیا اور امداد طلب کی اس کی دادرسی کی۔ ان کی اس عادت کے پیشِ نظر کچھ لوگ جھوٹ موٹ کے مستحق بن کر ان سے فائدہ اٹھا لیتے تھے۔ زیبا بیگم کہتیں۔

''حاتم طائی صاحب! کم از کم یہ تو معلوم کرلیا کریں کہ کون حقیقتاً مستحق ہے اور کون فراڈی۔''

''چھان پھٹک میرا کام نہیں جو میرے پاس آئے گا کچھ لے کر ہی جائے گا۔''

محمد علی کو اللہ نے فلموں کے حوالے سے بھی بڑی عزت دی تھی۔ انہیں اس بات کا اعزاز بھی حاصل ہے کہ ان کی ایک فلم بین الاقوامی طور پر بھی شہرت کی حامل رہی۔ یہ فلم ٹائیگر گینگ تھی جس کا سرسری طور پر پہلے ذکر ہو چکا ہے مگر یہ اس نوعیت کی فلم تھی کہ اس کا تفصیلی ذکر بھی ضروری ہے۔

یہ فلم پاکستان اور جرمنی کی مشترکہ پروڈکشن تھی۔ دونوں ممالک نے ایک دوسرے سے بھرپور تعاون کیا۔ یہ واحد پاکستانی فلم تھی جس کو جرمن اور اردو زبان کے علاوہ دیگر ممالک میں وہاں کی مقامی زبانوں میں بھی نمائش کے لیے پیش کیا گیا۔ ہدایت کاری، اداکاری، کہانی نویسی، عکس بندی، اشتہاری مہم اور دیگر شعبوں میں دونوں طرف سے مشترکہ طور پر کام ہوا تھا۔

فلم کی کہانی کو دونوں ممالک کے فلم بینوں کے مزاج کو مدِنظر رکھ کر فلمایا گیا۔ مثال کے طور پر برصغیر کے خطے میں فلم گیتوں کے بغیر ادھوری تصور ہوتی ہے۔ اس لیے پاکستان میں اس فلم کو ریلیز کرتے وقت معمولی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ گیتوں کا اضافہ کیا گیا۔ جب کہ امریکا، جرمنی اور دیگر یورپی ممالک میں یہ فلم گیتوں کے بغیر ریلیز ہوئی۔ البتہ مجموعی طور پر فلم کی کہانی کو تبدیل نہیں کیا گیا۔ اردو اور جرمن دونوں زبانوں میں اس فلم کے مختلف پوسٹر بھی تیار کیے گئے۔

اس فلم کو بنانے میں جرمنی کی 3 پروڈکشن کمپنیاں ڈیوینا فلم، ریکتیا فلم اور ورجنیا سینماٹوگرافیکا شامل تھیں۔ جب کہ پاکستان سے مونٹانا فلمز کا اشتراک تھا۔ ان چاروں فلم ساز اداروں نے مل کر اسے پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ جرمنی سے اس کے ہدایت کار ہیرالڈ رینل جب کہ پاکستان سے اقبال شہزاد نے ہدایت کاری کی ذمے داریاں نبھائیں۔ اس فلم کے پاکستانی فلم ساز بھی اقبال شہزاد تھے جب کہ جرمنی سے تھیوریم وارنر تھے۔

یورپ کے 6 ممالک میں مقامی زبانوں میں اس فلم کو ریلیز کیا گیا۔ 1971ء میں مغربی جرمنی، 1972ء میں اٹلی، 1973ء میں فرانس اور سویڈن 1974ء میں اسپین اور فن لینڈ میں ریلیز ہوئی۔ پاکستان میں یہ فلم 1974ء میں نمائش کے لیے پیش کی گئی۔

اس فلم کا مرکزی خیال ایم ویگز کے ناول سے اخذ کیا گیا۔ اسکرین پلے لکھنے والوں میں تین جرمن فلم نگار تھیو ماریہ وارنر، کیلس آرا وان شیورز اور وارنر پی زیباشو شامل تھے۔ موسیقاروں میں پاکستان سے دیبو بھٹاچاریہ اور خلیل احمد تھے جب کہ جرمنی سے فرانسیکو ری ماسو کا

اشتراک تھا۔

اس فلم کے ستاروں میں پاکستانی، اطالوی اور جرمن اداکار شامل تھے۔ پاکستان سے محمد علی، زیبا، نشو، علی اعجاز، قوی خان، ساقی، بینا چودھری، روبینہ طلعت صدیقی اور زرقا تھے جب کہ اٹلی سے ٹونی کینڈل اور جرمنی سے بریڈ حریٹ مدبر یٹو پشینا، چارلس وکی ٹیلو، میک چارجر فیلنڈرز اور دیگر اداکار شامل تھے۔

اردو زبان کے لیے اس کے مکالمے سلیم چشتی نے لکھے اور جرمن زبان میں زباسکو نے لکھا۔

فوٹو گرافی میں جرمنی سے ایف ایز اریلی اور پاکستان سے صادق موتی شامل تھے۔ اس فلم کی شوٹنگ تین ممالک میں کی گئی۔ جن میں افغانستان، پاکستان اور امریکا شامل ہیں۔ افغانستان میں اس کی شوٹنگ سرحدی علاقے کے پہاڑوں پر ہوئی۔ پاکستان میں پشاور اور لاہور میں مختلف مقامات اور امریکا میں اس کی عکس بندی نیویارک میں کی گئی۔

فلم کے پاکستان ورژن میں چونکہ گیت بھی شامل تھے۔ اس لیے فلم کی تشکیل میں گیت نگاری اور موسیقی سے تعلق رکھنے والے فنکار بھی شامل ہو گئے۔ موسیقار دیبو اور خلیل احمد تھے جب کہ تمام گیت ریاض الرحمٰن ساغر کے لکھے ہوئے تھے۔ سوائے ایک گیت کے۔ اس گیت کے بول تھے ”شمشیر برہنہ مانگ غضب“۔

اور یہ بہادر شاہ ظفر کی غزل تھی جس کو فلمی موسیقی کے سانچے میں ڈھال کر فلم میں شامل کیا گیا تھا۔ اس فلم کے گلوکاروں میں حبیب ولی محمد، رونا لیلیٰ اور شہناز بیگم کی آوازیں شامل تھیں۔

ٹائیگر گینگ ایک ایکشن فلم تھی جس کی کہانی میں تجسس رومان اور مزاح کے رنگ بھی شامل کیے گئے تھے۔

محمد علی نے اس فلم میں پولیس افسر کا کردار نبھایا جب کہ زیبا نے شیریں کا کردار کیا جو مجرموں کی نشاندہی کے سلسلے میں پولیس افسر کی مدد کرتی ہے۔

اس فلم کا شمار پاکستان کی ان چند فلموں میں ہوتا ہے جو مغرب اور مشرق کی ثقافت کا ملاپ ثابت ہوئیں۔ اس فلم میں کام کرنے والے تمام اداکار اپنے ملکوں میں شہرت کے حامل تھے۔ یہ وہ وقت تھا جب محمد علی اور زیبا کی جوڑی شہرت کے آسمان سے باتیں کر رہی تھی۔

جرمن میں بنائی گئی اس فلم کا ٹائٹل

غرق محبت

محبت کے دل آزار معاملات...... جہاں کوئی راز پوشیدہ نہیں رہتا مگر حال دل کسی پر کھلتا بھی نہیں۔ آخری صفحات پر **طاہر جاوید مغل** کا شاہکار

سلسلے وراثت کے

سورج ڈوبتا ہے اور پھر اگلے دن نکلتا ہے...... دراصل ڈوبنے اور ابھرنے کا حصہ ہی تاریخ ہے جبکہ بادشاہت اور وراثت کا سلسلہ بھی ختم ہی ہو جاتا ہے۔ ابتدائی صفحات پر **ڈاکٹر ساجد امجد** کے قلم کی روانی

شیش محل

انتقام کی گہری کھائی سے نکلتے ہوئے حسرتوں اور کچھ خواہشوں کے درمیان گزرتے لمحات اور دلنشیں واقعات پر مشتمل اس دلربا داستان کا آخری پڑاؤ...... **اسما قادری** کے خیالات کی پرواز

وقت

دھیرے دھیرے اپنا رنگ جماتا اور کرداروں سے آنکھ مچولی کرتا ہوا یہ وقت مزید واقعات کی تخلیق کرتا ہے...... **حسام بٹ** کی حیرت انگیز تحریر

اس کے علاوہ

منظر امام، ظفر اقبال ظفر، کبیر عباسی، تنویر ریاض، سلیم انور اور شاکر لطیف کا دلچسپ انداز

Kommissar x jagt die roten tiger

تھا جب کہ انگریزی زبان میں ڈب کر کے اسے ریلیز کیا گیا تو اس کا نام

FBI operation pakistan

رکھا گیا جب کہ اردو زبان میں اس فلم کا نام ٹائیگر گینگ رکھا گیا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ ایک فلم کو تین مختلف نام سے ریلیز کیا گیا۔ اس فلم کا ورلڈ پریمیئر بھی ہوا اور مختلف یورپی ممالک میں اس کی نمائش کی گئی۔ ان تمام باتوں کے باوجود پاکستان میں یہ فلم فلاپ ہوگئی۔

محمد علی نے فلم سازی کے میدان میں بھی قسمت آزمائی کی۔ بحیثیت فلم ساز ان کی پہلی فلم ''عادل'' تھی جو 1966ء میں ریلیز ہوئی۔ یہ ایک کاسٹیوم فلم تھی۔ جو کاروباری طور پر کامیاب بھی ہوئی تھی۔ اس فلم میں محمد علی نے تلوار بازی کے بڑے کرتب دکھائے تھے۔ علی زیب پروڈکشن کے تحت انہوں نے دو فلمیں ''آگ'' اور ''جیسے جانتے نہیں'' بنائیں۔ دونوں فلمیں ہلکی پھلکی اور مزاحیہ تھیں۔ جو کامیاب ثابت ہوئیں۔

محمد علی نے اردو فلموں کے علاوہ کچھ پنجابی فلموں میں بھی کام کیا جب کہ ان کی کچھ اردو فلمیں پشتو زبان میں بھی منتقل ہو کر ریلیز ہوئیں۔ البتہ یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ ان کی ایک فلم بنگالی زبان میں بھی ریلیز ہوئی۔ اس بنگالی فلم کا نام ''آپوش'' (سمجھوتا) تھا یہ بنگلہ دیش میں 27 فروری 1987ء میں ریلیز ہوئی تھی اور سپرہٹ ثابت ہوئی تھی۔ دراصل یہ پاک بنگلہ دیش کو پروڈکشن کے تحت بنائی جانے والی پروڈیوسر محمد اسلم نعیم کی اردو فلم ''جانے انجانے'' تھی جو مکمل ہونے کے بعد اختلافات کا شکار ہوگئی۔ اس کی تمام ترعکس بندی بنگلہ دیش میں کی گئی تھی۔ جس کی وجہ سے بنگالی پروڈیوسر طاہر چوہدری کے قبضے میں تھی۔ اس نے پاکستانی فلم ساز کو پرنٹ فراہم نہیں کیا اور آج تک فلم جانے انجانے پاکستان میں نمائش سے محروم رہی۔

''آپوش'' کی ہدایت کاری کے فرائض بنگلہ ورژن میں نور الحق اور اردو ورژن کی ہدایت کاری اکبر رومی نے کی تھی۔ افضل چودھری اس کے عکاس اور روبن گھوش موسیقار تھے۔ پاکستان سے اس فلم کی کاسٹ میں محمد علی، لہری اور فیصل تھے جب کہ بنگلہ دیشی ستاروں میں چھمپا، بینا، انور حسین، انجنا اور احمد شریف نمایاں نام تھے۔

محمد علی کی پہلی رنگین اور سنیما اسکوپ فلم ''جان پہچان'' تھی۔ اس فلم میں انہوں نے ایرانی اداکارہ شہ پارہ کے مقابل ہیرو کا کردار ادا کیا تھا۔ اس فلم کی شوٹنگ کے دوران علی بھائی شہ پارہ پر ہزار جان سے فدا ہو گئے۔ ایرانی اداکارہ اپنا کام مکمل کروا کر واپس چلی گئی مگر علی بھائی اس کی محبت میں تڑپتے رہے۔ یہاں تک کہ وہ اسے اپنانے کی نیت سے ایران جا پہنچے کہ اس سے اپنی زندگی کی بھیک مانگیں گے اور کہیں گے کہ میری بن جاؤ ورنہ یہ بندہ بے موت مر جائے گا مگر ایران جا کر ان پر یہ منکشف ہوا کہ شہ پارہ نہ صرف شادی شدہ ہے بلکہ بال بچے دار بھی ہے۔ اس غیر متوقع انکشاف کے بعد ان کے عشق کے غبارے کی ہوا نکل گئی اور وہ واپس پاکستان آ کر اپنی فلموں میں معروف ہو گئے۔ یہ 1967ء کا قصہ ہے۔

اس کے بعد ان کی دوسری محبت زیبا تھیں۔ کم و بیش چالیس برس تک دونوں نے محبت اور خلوص بھری زندگی گزاری۔ ان کی جوڑی فلمی دنیا میں مثالی ثابت ہوئی۔ اولاد کی محرومی کے باوجود ان کی محبت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ زیبا کی بیٹی ثمینہ کو انہوں نے زیبا سے زیادہ محبت دی۔ پال پوس کر پڑھا لکھا کر اس کی شادی ایسی دھوم دھام سے کی کہ آج تک اسے لوگ یاد کرتے ہیں۔

دونوں میاں بیوی کے فلاحی کاموں کا ذکر پہلے بھی کر چکا ہوں۔ اس سلسلے کی مزید معلومات یہ ہیں کہ علی زیب فاؤنڈیشن کے نام سے انہوں نے تھیلیسیمیا خون کا سرطان جیسے موذی مرض میں مبتلا بچوں کو خون فراہم کرنے کے لیے ادارہ قائم کیا۔ اس ادارے کا قیام فیصل آباد، سرگودھا، میانوالی، ساہیوال اور گوجرانوالہ میں ہو چکا ہے اور وہاں بہت کامیابی سے خدمت خلق میں مصروف ہیں۔ ان کے علاوہ بھی علی زیب، فاؤنڈیشن کے تحت فلاحی کاموں کا جو سلسلہ محمد علی نے شروع کیا تھا وہ آج بھی جاری و ساری ہے اور ان کے لیے صدقۂ جاریہ ہے۔

محمد علی پاکستانی فلمی صنعت و تجارت کا ایک قابل افتخار فنکار 70 سال کی عمر میں 19 مارچ 2006ء کو صبح 11 بجے بروز اتوار اپنے خالق حقیقی سے جا ملا۔ ان کا جنازہ اٹھا تو تا حد نظر سر ہی سر نظر آتے تھے۔ انہیں مزار حضرت میاں میرؒ کے احاطے میں مدفون کیا گیا۔ آسمان ان کی لحد پر شبنم افشانی کرے۔

☆......☆

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

صلے کا دودھ

شفقت محمود

لوگ انسانیت کی خدمت کو وبال جان سمجھنے لگے ہیں جس کی وجہ سے ہمارا معاشرہ تو بگڑ ہی رہا، ساتھ ہی ساتھ ہم خدا کی ناراضی بھی مول لے رہے ہیں۔ اسلام نے اسی وجہ سے انسانیت کی خدمت کو مقدم جانا ہے۔ ہم راہ خدا میں ایک درہم بھی خرچ کرتے ہیں تو صلے میں کئی گنا زیادہ وہ وقادر مطلق ہمیں دے دیتا ہے۔

عرب سے درآمد عربی کا ایک دلچسپ قصہ

ابن جدعان عرب کا ایک مال دار شخص تھا۔ اس کے پاس دوسری مال و دولت کے علاوہ ڈھیر سارے اونٹ بھی تھے۔ ایک دن ایک اونٹنی گم ہوگئی۔ وہ اسے تلاش کرنے کے لیے نکلا۔ وہ اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا رہا، جلد ہی اسے وہ مل گئی۔ اس کی وہ اونٹنی خوب موٹی تازی اور زیادہ دودھ دینے والی تھی۔ اس اونٹنی کا ایک بچہ بھی تھا۔ اسے یہ اونٹنی اور اس کا بچہ اپنی تمام اونٹنیوں سے سب سے زیادہ پسند تھے۔ وہ اکثر اوقات انھیں محبت سے تکتا رہتا تھا۔

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
URDUSOFTBOOKS.COM URDUSOFTBOOKS.COM
URDUSOFTBOOKS.COM URDUSOFTBOOKS.COM

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

ایک دن اسے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان یاد آیا۔
"تم ہرگز نیکی کے اعلیٰ درجہ کو نہیں پہنچ سکتے، جب تک کہ ان چیزوں میں سے خرچ نہ کرو، جنھیں تم محبوب رکھتے ہو۔"
(سورۃ آل عمران......۹۲)
اس نے سوچا۔
"اللہ تعالیٰ مجھ سے اس وقت تک مکمل طور پر راضی نہیں ہو سکتا جب تک میں اپنی پسندیدہ چیز اس کی راہ میں قربان نہ کر دوں۔"

چوں کہ اسے اپنے مال میں سب سے زیادہ وہ اونٹنی اور اس کا بچہ عزیز تھا، اس لیے اس نے اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لیے اپنے غریب پڑوسی کو صدقہ کرنے کا پختہ ارادہ کر لیا۔
اس غریب پڑوسی کی سات بیٹیاں تھیں اور ان کے پاس گزر اوقات کے لیے کوئی معقول بندوبست نہیں تھا۔ وہ اپنی اونٹنی لے کر اس کے پاس گیا اور اس سے کہا۔
"اے میرے عزیز پڑوسی! یہ اونٹنی اور اس کا بچہ میری طرف سے تمھیں ہدیہ ہے، جو تمھارے مشکل حالات میں تمھارے بہت کام آئے گا۔"
"کک......کک...کیا کہہ رہے ہیں بھائی آپ؟"
"میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔"
یہ سن کر وہ بہت خوش ہوا اور ہاتھ اٹھا کر ابن جدعان کے لیے دعا مانگنے لگا۔
"اے اللہ! اس کے مال اور اولاد میں برکت دے اور ہر برائی و شر سے اسے محفوظ فرما۔"
پھر ابن جدعان نے اس سے کہا۔
"اب میں چلتا ہوں۔ میرا ایک کام کرنا۔"
"کام......کیسا کام؟"
"جب تم اور تمھاری بیٹیاں اس کا دودھ استعمال کریں، تو مجھے دعاؤں میں ضرور یاد رکھیں۔"
"ان شاء اللہ تعالیٰ!"
پھر وہ وہاں سے چلا آیا۔

☆☆☆

وقت گزرتا گیا۔ اس غریب پڑوسی کی زندگی اس اونٹنی کی وجہ سے خوب گزر رہی تھی۔ وہ اس کا دودھ بھی استعمال کرتے اور ضرورت کے وقت اس پر سواری بھی کرتے۔ اب وہ اس کے بچے کے جوان ہونے کا انتظار کر رہے تھے تاکہ اسے بیچ کر وہ اپنی دوسری ضروریات پوری کر سکیں۔
موسم بہار آیا تو وہ اپنے ساتھ اپنی تمام خوب صورتیاں لے آیا۔ جب وہ چلا گیا تو خزاں آ گئی۔ خزاں کیا آئی کہ ان کے علاقے میں قحط پھیل گیا۔ پانی سوکھ گیا۔ پانی کا سوکھنا تھا کہ ہریالی کا نام و نشان تک مٹ گیا۔ یہ قحط اتنا سخت تھا کہ لوگوں کا وہاں رہنا دوبھر ہو گیا، اس لیے انھوں نے وہاں سے نقل مکانی شروع کر دی۔ وہ ان علاقوں کی طرف جا رہے تھے جہاں پانی اور چارہ کی کثرت ہو۔
ایک دن ابن جدعان اور اس کے بیٹے خوراک کی تلاش میں نکلے تاکہ گرمی کے اس موسم میں وہ اپنے اونٹوں کی پیاس بجھا سکیں۔ وہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے ایک ایسے غار کے دہانے پر پہنچ گئے جس کے اندر پانی موجود تھا۔ یہ غار ایسے ہوتے ہیں کہ ان کا دہانہ تو چھوٹا ہوتا ہے، لیکن اندر بہت بڑی جگہ ہوتی ہے اور بہت سارے راستے بھی بنے ہوتے ہیں۔ ایسی جگہوں کو وہ اچھی طرح سے پہچانتے تھے۔
چوں کہ شدید گرمی کا زمانہ تھا اور پیاس بھی شدت سے لگی ہوئی تھی اس لیے اس نے اپنے بیٹوں کو غار کے دہانے پر کھڑا ہو کر انتظار کرنے کو کہا اور خود پانی کی تلاش میں غار کے اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر تلاش کرنے کے بعد اسے چشمہ دکھائی دیا۔ وہ بہت خوش ہوا اور اچھی طرح سے اپنی پیاس بجھانے کے بعد اس نے پانی بھرنا شروع کر دیا تاکہ باہر لے جا کر اپنے بچوں کو پلا سکے۔ وہ واپسی کا ارادہ کر کے باہر نکلنے کے لیے چل پڑا۔ وہ چلتا رہا لیکن اسے واپسی کا راستہ نہ ملا اور وہ راستہ بھٹک گیا۔
اس کے بیٹے باہر اس کا انتظار کر رہے تھے۔ انتظار کرتے کرتے انھیں شام ہو گئی اور رات کا اندھیرا ہر سو چھا گیا۔ ان کے والد نے باہر آنا تھا نہ آیا۔ اسی انتظار میں تین دن گزر گئے۔ ان تین دنوں میں وہ مسلسل غار کے باہر اپنے والد کا انتظار کرتے رہے۔ ان میں سے کسی کو غار کے اندر کا پتا نہیں تھا اس لیے وہ باہر ہی بیٹھے رہے اور ان میں سے کوئی اندر نہ گیا۔
دو اور دن گزر گئے۔ اب وہ اپنے والد کی واپسی سے مایوس ہو گئے تھے اور انھیں اس بات کا یقین ہو چلا تھا کہ ان کے والد اب زندہ نہیں ہیں۔ ان کے اس یقین کی وجہ یہ تھی کہ اس خوف ناک غار میں کوئی اتنے دن کھائے پیے بغیر کیسے رہ سکتا ہے۔

☆☆☆

ابن جدعان کے بیٹے اپنے والد کے نافرمان تھے اور انھیں یہ بات پسند نہیں تھی کہ ان کا والد اپنا مال و دولت غریبوں

اور محتاجوں میں تقسیم کرتا پھرے۔ اس وجہ سے وہ اپنے والد کو بے وقوف سمجھتے تھے اور اس انتظار میں تھے کہ وہ کب اس دنیا سے کوچ کرتا ہے۔ انھیں اپنے والد کی جو بات سب سے زیادہ ناپسند تھی وہ یہ کہ ان کے والد نے اتنی اچھی اونٹنی اس غریب پڑوسی کو کیوں دے دی تھی، حالاں کہ یہ بھی تو ہوسکتا تھا کہ وہ کوئی عام سی اونٹنی اسے دے دیتا۔

ان میں سے ایک بھائی نے کہا۔

''کیا تم لوگوں کو وہ اونٹنی یاد ہے؟''

''کون سی اونٹنی؟'' باقی بھائیوں نے پوچھا۔

''وہ اونٹنی جو ہمارے والد نے اس غریب پڑوسی کو دے دی تھی۔''

''ہاں، ہاں! اچھی طرح یاد ہے۔ بھلا وہ بھی بھول سکتی ہے؟''

''وہ اونٹنی اتنی اچھی تھی کہ وہ صرف ہمارے ہی قابل تھی۔ کیا خیال ہے کہ ہم وہ اونٹنی اس سے واپس نہ لے لیں اور اس کے بدلے میں اسے کوئی دوسری اونٹنی دے دیں؟''

''بہت اچھا خیال ہے لیکن وہ اونٹنی دینے سے انکار بھی تو کرسکتا ہے؟'' ایک بھائی نے خدشہ ظاہر کیا۔

''اگر اس نے خوشی سے دے دی تو بہت اچھی بات ہے۔ ورنہ ہم اس سے زبردستی لے لیں گے اور اس کے بدلے میں کوئی دوسری اونٹنی بھی نہیں دیں گے۔''

سب اس بات پر راضی ہوگئے۔ پھر وہ اس پڑوسی کے گھر جا پہنچے اور اس سے کہا۔

''کیا تمھیں یاد ہے کہ چند ماہ پہلے ہمارے والد نے تمھیں ایک اونٹنی دی تھی؟''

''ہاں! بالکل یاد ہے۔ وہ اس وقت بھی میرے پاس موجود ہے۔ ہم اس سے اپنی ضرورتیں اچھی طرح پوری کرتے ہیں۔''

''ایسا کرو کہ وہ اونٹنی ہمیں واپس کردو اور اس کے بدلے میں دوسری اونٹنی لے لو۔''

''کیوں بھئی؟ وہ اونٹنی تو تمھارے والد نے اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لیے مجھے ہدیے میں دی تھی، اس لیے میں تمھیں نہیں دے سکتا اور دیکھو! اگر تمھارے والد صاحب کو اس بات کا پتا چل گیا تو وہ بہت ناراض ہوں گے۔''

یہ سن کر وہ غصے سے بولے۔

''سنو! اگر تم نے اونٹنی خوشی سے ہمارے حوالے نہ کی، تو ہم تم سے زبردستی چھین لیں گے اور دوسری اونٹنی بھی نہیں دیں گے۔''

''میں تم لوگوں کی شکایت تمھارے والد سے کروں گا۔''

یہ سن کر انھوں نے اس کا مذاق اڑاتے ہوئے قہقہے لگائے اور کہنے لگے۔

''چاچا! یہ بات تو بہت پرانی ہوگئی ہے۔''

''پرانی ہوگئی ہے...... کیا مطلب؟''

''ہمارا باپ مرچکا ہے اور اس کا سارا مال اب ہمارا ہے۔''

جب اس پڑوسی نے یہ سنا تو وہ دھک سے رہ گیا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ اب کیا کرے؟ پھر اس نے

مسلسل چھ سو برس تک گولکنڈہ کی کانوں سے ہیروں کا نہ ختم ہونے والا سمندر بہتا اور ابلتا رہا اور جب تک اٹھارہویں صدی عیسوی میں جنوبی افریقا میں ہیروں کی نئی دنیا دریافت نہیں ہوگئی، یہ شہر قیمتی پتھروں کی ایک چمکتی دمکتی آماجگاہ بنا رہا۔ قلعہ کے اندر داخل ہوں تو آپ کو نسوانی حماموں، باغوں، بوستانوں اور خوب صورت ایوانوں کا ایک لامتناہی سلسلہ دیکھنے کو ملے گا۔ جب 1642ء میں فرانس کے مشہور جوہری جین باپٹسٹ ٹیورنیر نے گولکنڈہ دیکھا تھا تو اس کو یہاں کی سوسائٹی اتنی ہی مہذب اور متمدن لگی تھی جتنی ان عمارتوں کی خوشنمائی اور زیبائی تھی۔ اس نے لکھا تھا کہ اس شہر میں 20 ہزار ایسی رقاصائیں مقیم رہتی ہیں جو جمعہ کے جمعہ سلطان کے دربار میں جا کر رقص و سرود کی محفلیں سجاتی ہیں۔

مرسلہ: شعیب مرزا۔ کراچی

***

حیدرآباد کی...... عظیم الشان عمارات کا ایک سلسلہ لیفٹیننٹ کرنل کرک پیٹرک نے تعمیر کروایا تھا جو 1797ء سے 1805ء تک حیدرآباد دربار میں حکومت برطانیہ کی طرف سے بطور ریذیڈنٹ (اور سفیر) تعینات رہا۔ کہا جاتا ہے کہ کرک پیٹرک نے نہ صرف یہ کہ حیدرآبادی لباس پہننا شروع کردیا تھا بلکہ حیدرآبادی طرز بود و ماند بھی اختیار کرلی تھی۔

مرسلہ: شعیب مرزا۔ کراچی

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

حیرت سے پوچھا۔
"کیا وہ وفات پا چکے ہیں؟ کب، کیسے اور کہاں؟"
"عجیب بات ہے! کیا تمھیں پتا نہیں ہے؟"
"میں کھانے پینے کی تلاش میں اپنے بچوں کے ساتھ گیا ہوا تھا اور چند دن پہلے ہی واپس آیا ہوں۔"
"ہمارے والد پانی کی تلاش میں ایک غار میں گئے تھے لیکن پھر واپس نہ لوٹ سکے۔ ہم نے کئی دن تک ان کا انتظار کیا لیکن وہ نہ لوٹے۔ پھر ہم نے یقین کر لیا کہ وہ راستہ بھول گئے ہوں گے اور بھوک نے انھیں ختم کر دیا ہوگا۔"
یہ سن کر وہ پڑوسی بولا۔
"اللہ تعالیٰ تمھیں اچھی جزا دے۔ تم یوں کرو کہ مجھے اس غار کا پتا بتا دو اور اس کے بدلے میں مجھ سے وہ اونٹنی اور اس کا بچہ لے لو۔"
یہ سن کر وہ بہت خوش ہوئے اور اپنے پڑوسی کو لے کر اس غار تک چلے گئے۔ انھوں نے اسے وہاں تنہا چھوڑا اور اس سے اونٹنی اور اس کا بچہ لے کر لوٹ گئے۔

☆☆☆

وہ پڑوسی غار کے منہ پر تنہا کھڑا تھا۔ اس کا دل اس بات کو نہیں مان رہا تھا کہ اس کا محسن اس غار میں بھٹک کر مر گیا ہے۔ اسے یقین تھا کہ وہ زندہ ہے اور اسے اندر جا کر تلاش کرنا چاہیے۔ وہ ایسی کوئی ترکیب سوچنے لگا کہ جس سے وہ غار میں راستہ نہ بھٹک سکے۔ آخر اسے ایک ترکیب سوجھ ہی گئی۔ اس نے ایک بہت بڑی رسی لی۔ اس کا ایک سرا باہر ایک پتھر سے باندھا اور دوسرا سرا اپنے پاس رکھا۔ پھر وہ رینگتا ہوا اس غار کے چھوٹے سے منہ سے اندر داخل ہو گیا۔ وہ تنگ راستوں میں سے رینگتا رہا۔ کبھی اوپر، کبھی نیچے، کبھی چل کر تو کبھی لیٹ کر۔ آخر کار وہ تھک گیا۔ اب وہ مایوس ہونے لگا تھا، کیوں کہ اسے اب تک اپنے محسن کا کچھ پتا نہیں چلا تھا۔ اب تو اسے بھی یہی لگنے لگا کہ وہ اس غار کی بھول بھلیوں کا شکار ہو کر فوت ہو چکا ہے۔
اچانک اسے گیلی مٹی کی مہک محسوس ہوئی اور یہ مہک پاس ہی سے آ رہی تھی۔ اسے تجسس ہوا۔ تھوڑی دیر کی تلاش کے بعد اسے ایک چشمہ دکھائی دیا۔ جیسے ہی وہ چشمے کے پاس گیا تو اس نے بہت کمزور سی ایک آواز سنی۔ وہ چونک پڑا۔ جب وہ اس آواز کی طرف چلا تو اچانک اس کے منہ سے نکلا۔
"اے میرے مالک! یہ تو کوئی آدمی ہے، جو بے چارہ تڑپ رہا ہے اور تکلیف کے مارے کراہ رہا ہے۔"
اس نے دل میں سوچا کہ یہ کون ہو سکتا ہے؟ شاید یہ اس کا محسن نہ ہو، کوئی اور آدمی ہو۔ اصل میں وہاں اچھا خاصا اندھیرا تھا جس کی وجہ سے وہ پہچان نہیں سکا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑا۔ اوپر سے مٹی ہٹائی۔ اس کی سانسیں ابھی تک چل رہی تھیں۔
اس نے اسے وہاں سے باہر نکالنے کا فیصلہ کیا۔ اسے اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی کہ یہ اس کا محسن ہے یا کوئی اور شخص۔ وہ تو بس انسانیت کے ناتے اس کی مدد کر رہا تھا۔ اس نے ہمت کر کے اسے اٹھایا اور اپنے کندھے پر لاد لیا۔ پھر وہ اسی راستے سے غار سے باہر نکلنے لگا۔
جیسے ہی وہ باہر نکلا اور سورج کی روشنی اس نیم مردہ شخص پر پڑی تو اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ وہ اس کا محسن ابن جدعان تھا۔ اس کا دل خوشی کے مارے زور زور سے دھک دھک کرنے لگا۔ پھر اس نے اپنے محسن کو اٹھایا اور اپنے گھر لے گیا۔ وہاں اس کا علاج شروع ہو گیا۔ اس نے چوں کہ دس دن سے کچھ نہیں کھایا تھا، اس لیے اس کے علاج کے لیے طاقت کی ادویہ استعمال کی گئیں تاکہ کمزوری جلد ختم ہو جائے۔ اس نے اپنے محسن کا بھرپور طریقے سے خیال رکھا۔
آہستہ آہستہ اس کی طبیعت سنبھلنا شروع ہو گئی۔ پھر اس نے اپنے آس پاس کے ماحول کو پہچاننا شروع کر دیا اور پچھلے تمام واقعات اسے یاد آنے لگے۔ جب اس کے حواس اچھی طرح بحال ہو گئے، تو اس نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ اس نے اسے موت کے منہ سے بچا لیا ہے۔
دن اسی طرح گزرتے گئے اور اس کی صحت اچھی ہوتی گئی۔ ایک دن اس پڑوسی نے اپنے محسن سے کہا۔
"آپ مجھے بتائیں کہ آپ اس غار میں دس دن رہے۔ وہاں تو کچھ کھانے کے لیے نہیں تھا۔ پھر آپ کیسے کھائے بغیر اتنے دن زندہ رہے؟"
یہ سن کر وہ سنبھل کر بیٹھا اور کہنے لگا۔
"میں تمھیں ایک عجیب بات بتاتا ہوں۔"
"کیسی عجیب بات؟"
"جب میں اس غار میں داخل ہوا تو مجھے ایک چشمہ دکھائی دیا۔ میں نے خوب سیر ہو کر پانی پیا اور اپنے بیٹوں کے لیے مشکیزے میں پانی بھرا لیکن میں واپس آتے ہوئے راستہ بھٹک گیا۔ یوں میں باہر نہ نکل سکا۔ پھر میں نے سوچا کہ ایسا کرتا ہوں کہ واپس جا کر اس چشمے کے پاس بیٹھ جاتا ہوں اور

URDU SOFT BOOKS WWW.URDUSOFTBOOKS.COM DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS

انتظار کرتا ہوں کہ یا تو اللہ تعالیٰ مجھے موت دے دے یا پھر میرے بیٹے مجھے اس غار سے باہر نکالیں۔ میں چشمے کے پاس بیٹھا رہا اور اس کا پانی پیتا رہا۔ لیکن صرف پانی پینے سے کیا ہوتا ہے۔ بھوک کی شدت بڑھتی چلی گئی۔ پیٹ جسم سے لگ گیا۔ اسی حال میں تین دن گزر گئے اور بھوک کی وجہ سے مجھے اپنی موت کا یقین ہو گیا۔ میں چت لیٹا ہوا تھا کہ اچانک میں نے گرم دودھ کا ذائقہ محسوس کیا۔ دودھ میرے منہ میں ٹپکا تھا۔

پہلے تو مجھے کچھ سمجھ نہیں آیا اور میں نے گمان کیا کہ شاید میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ پھر میں ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا کہ اچانک ایک چمکتا ہوا پیالہ میرے منہ کے قریب ہوا۔ پھر میں نے اس میں سے دودھ پیا۔ اس دودھ کا ذائقہ ایسا تھا کہ ایسا ذائقہ میں نے کبھی زندگی میں نہیں چکھا تھا۔ میں نے خوب جی بھر کر دودھ پیا۔ پھر وہ پیالہ چلا گیا اور یہ پیالہ میرے پاس دن میں تین بار آتا تھا، لیکن جس وقت تم میرے پاس پہنچے، اس سے کافی دیر پہلے سے وہ پیالہ میرے پاس نہیں پہنچا تھا۔ اس کے نہ آنے کی وجہ سے میں کمزور ہو گیا تھا۔ مجھے اس بات کی سمجھ نہیں آئی کہ پیالہ آنا کیوں رکا؟ مجھے اپنی موت کا یقین ہو گیا تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے مجھے بچانے کے لیے تمھیں بھیج دیا۔"

یہ سن کر پڑوسی کہنے لگا۔

"میں آپ کو اس پیالے کے نہ آنے کا سبب بتاتا ہوں۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی۔ آپ کے بیٹوں نے جب یہ دیکھا کہ آپ واپس نہیں آ رہے ہیں، تو وہ سمجھے کہ آپ فوت ہو چکے ہیں۔ انھوں نے سارا مال آپس میں بانٹ لیا۔ پھر وہ میرے پاس آئے اور اس اونٹنی اور اس کے بچے کا مطالبہ کیا، جو آپ نے مجھے دیا تھا۔ میں نے انھیں وہ دے دیے اور ان سے اس غار کا پتا پوچھ لیا، کیوں کہ میرا دل کہتا تھا کہ آپ زندہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مہربانی کی اور میرا یقین کامل نکلا۔ یوں میں آپ کو زندہ و سلامت باہر نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔"

اتنا کہہ کر وہ کچھ دیر کے لیے خاموش رہا۔ پھر کہنے لگا۔

"اے میرے محسن! اللہ تعالیٰ نے غار میں جو دودھ آپ کو پلایا تھا، وہ اس وجہ سے پلایا تھا کہ آپ نے ہمیں ایک اونٹنی دی تھی، جس کا ہم دودھ پیا کرتے تھے۔ جب بھی میں اور میری بیٹیاں اس دودھ کو استعمال کرتے، تو ہم آپ کے لیے دعا کرتے تھے لیکن آپ کے بچوں نے وہ اونٹنی ہم سے لے لی اور یوں ان دعاؤں کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آپ کے پاس دودھ آنا بند ہو گیا۔ آپ کو تو پتا ہی ہوگا کہ مسلمان بندہ دنیا و آخرت میں اپنے صدقے کے سائے میں ہوتا ہے۔ دنیا میں برائی اور شر سے حفاظت ہوتی ہے اور صدقہ آخرت میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک اجر و ثواب کا باعث ہوتا ہے۔"

یہ سن کر ابن جدعان رونے لگا اور کہا۔

"اے میرے دوست! تم نے سچ کہا۔ بے شک صدقہ برائی سے بچاتا ہے اور ہر آدمی دنیا و آخرت میں اپنے صدقے کے سائے تلے ہوتا ہے۔ تم نے جو میرے ساتھ نیکی اور بھلائی کی ہے اس کے بدلے میں، میں اپنا آدھا مال تمھیں ہدیہ کرتا ہوں۔"

پھر جب ابن جدعان بالکل صحت یاب ہو گیا، تب وہ اپنے گھر گیا۔ اس کے بیٹے اس کے زندہ بچ جانے کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ اس نے جب دروازے پر دستک دی، تو انھوں نے دروازہ کھولا اور دوسرے ہی لمحے دھک سے رہ گئے۔ انھیں اپنے والد کو زندہ سلامت دیکھ کر یقین نہیں آ رہا تھا۔ پھر وہ انجان بن کر بولے۔

"آپ کون ہیں؟"

اس نے غصے سے کہا۔

"تمھارا باپ......! جسے تم نے زندہ دفن کر دیا تھا اور اس غار میں تنہا چھوڑ دیا تھا لیکن اللہ تعالیٰ تو سب کا حامی و ناصر ہے، اس نے اس غریب پڑوسی کو میری مدد کے لیے بھیجا اور یوں میں موت کے منہ سے بچ گیا۔ تم لوگوں نے مجھے میرے احسانات کا یہ بدلہ دیا ہے؟ میں نے تمھیں پالا، پرورش کی، مال خرچ کیا اور اس کے بدلے میں تم نے مجھے مرنے کے لیے چھوڑ دیا۔ کبھی نیکی کا صلہ ایسے بھی دیا جاتا ہے، جیسے تم نے مجھے دیا ہے؟"

اب تو وہ بوکھلا اٹھے۔ انھوں نے شرم سار ہو کر خوشی کا اظہار کیا اور اپنے والد کو مبارک باد دینے لگے کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں بچا لیا۔ اب ان کے والد کے خیالات بدل چکے تھے۔ اس نے انھیں جھڑک کر کہا۔

"اللہ تعالیٰ کی قسم! تمھیں تمھارے کیے کی سزا ضرور ملے گی۔ سن لو! میں نے اپنے مال کے دو حصے کیے ہیں۔ آدھا میرا اور آدھا میرے اس عزیز پڑوسی کا۔ اس کے لیے میں یہ دعا کرتا ہوں کہ جس طرح اس نے مجھے دنیا میں موت سے بچایا ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ اسے آخرت میں آگ سے بچائے۔"

☆☆☆

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

دکھی عورت

سلمیٰ اعوان

وہ ایک بہت بڑے مصنف کی بیوی تھی مگر اس کی زندگی میں غم ہی غم تھے۔ ہنسی کا نام و نشان تک نہ تھا۔ شوہر کی جانب سے دیئے گئے طعنوں کے زخم ہر ہر قدم پر تھے مگر وہ مسکرا مسکرا کر خود کو خوش ظاہر کرتی۔ دیپ اشکوں کے جلاتی لیکن چھپ چھپ کے۔

ایک عالمی شہرت یافتہ قلمکار کی بیوی کا احوال

ماسکو میں قیام کے دوران Yasnaya ployana جانے کی خواہش مند تھی۔ ٹالسٹائی کا وہ گھر جہاں وہ پیدا ہوا۔ جہاں اس نے اپنے ادبی شہ پاروں کی تخلیق کی تھی اسے دیکھنا چاہتی تھی لیکن موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔ پر جیسے وہاں حاضری دینی میری قسمت میں نہ ہو۔

یوں ماسکو میں کروپوٹکن اسٹریٹ پر موزے ٹالسٹائی میں اس کی اپنی لکھائی میں لکھے ہوئے اس کے دو شہرۂ آفاق ناولوں وار اینڈ پیس اور اینا کرینینا کے مسودے رکھے ہوئے ہیں اور ٹالسٹائی اسکوائر کے ویران سے پارک میں اس کے مجسمے کے ساتھ تصویریں وغیرہ بنوا کر دل کے رانجھے کو منانے کی کوشش کی تھی۔

پھر بھی یاسنایا پولیانہ جانے کی ہڑک نچلا نہ بیٹھنے دے رہی تھی۔ اس دن اپنے ہوٹل کے سامنے ریسٹورنٹ میں ناشتا کرتے ہوئے میں ویٹرس ورونیکا جو یاسنایا پولیانہ سے تھی کہہ بیٹھی۔

”تمہارا تو گھر ہے وہاں۔ جس دن تمہاری چھٹی ہو۔ ہمیں لے چلو نا اپنے ساتھ۔“

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔ ”آپ کو معلوم ہے وہاں کوئی بھی چیز اصلی نہیں ہے۔ نہ وہ درخت جنہیں ٹالسٹائی نے خود اپنے ہاتھوں سے لگایا تھا، نہ وہ فرنیچر، نہ وہ کمروں کا سامان، نہ وہ تصویریں۔ دوسری جنگ عظیم میں نازی فوجوں نے ماسکو پر حملے کے دوران یاسنایا پولیانہ پر قبضہ کرلیا تھا۔ ایسے ننگ انسانیت لوگ تھے کہ درختوں کو کاٹ ڈالا۔ فرنیچر جلا دیا۔ یادگار تصویروں کو آگ لگا دی۔

مجھے احساس ہوا تھا کہ نئے کی ورونیکا اور داشا پڑھی لکھی ہی نہ تھیں، ادبی ذوق کی حامل بھی تھیں۔ جب وہ پنیر پراٹھا اور بھاپ اڑاتی چائے ہمارے سامنے رکھ رہی تھیں۔ میں نے ان سے ٹالسٹائی کے ان دونوں شاہکار ناولوں کی بابت پوچھا تھا کہ وہ انہوں نے پڑھے ہیں۔ ورونیکا نے اثبات میں سر ہلایا۔ ساتھ ہی داشا کی طرف ہاتھ پھیلایا جو کاؤنٹر پر کھڑی ہمیں مسکراتے ہوئے دیکھتی تھی اور بولی۔ ”دراصل یہ صوفیہ ٹالسٹائی کو پڑھے بیٹھی ہے اور میں ٹالسٹائی کو۔ چلو اگر شام میں ایک نشست ہو جائے تو لطف آئے گا۔ آج شام ہم دونوں فارغ ہیں۔ سیمی چبوترے پر بیٹھ کر باتیں ہوں گی۔“

شام بہت خوبصورت تھی۔ ہمارے ہوٹل کی دیو ہیکل عمارت کینے اور اس سے ملحقہ کمپاؤنڈ پر کسی مہرباں کی طرح

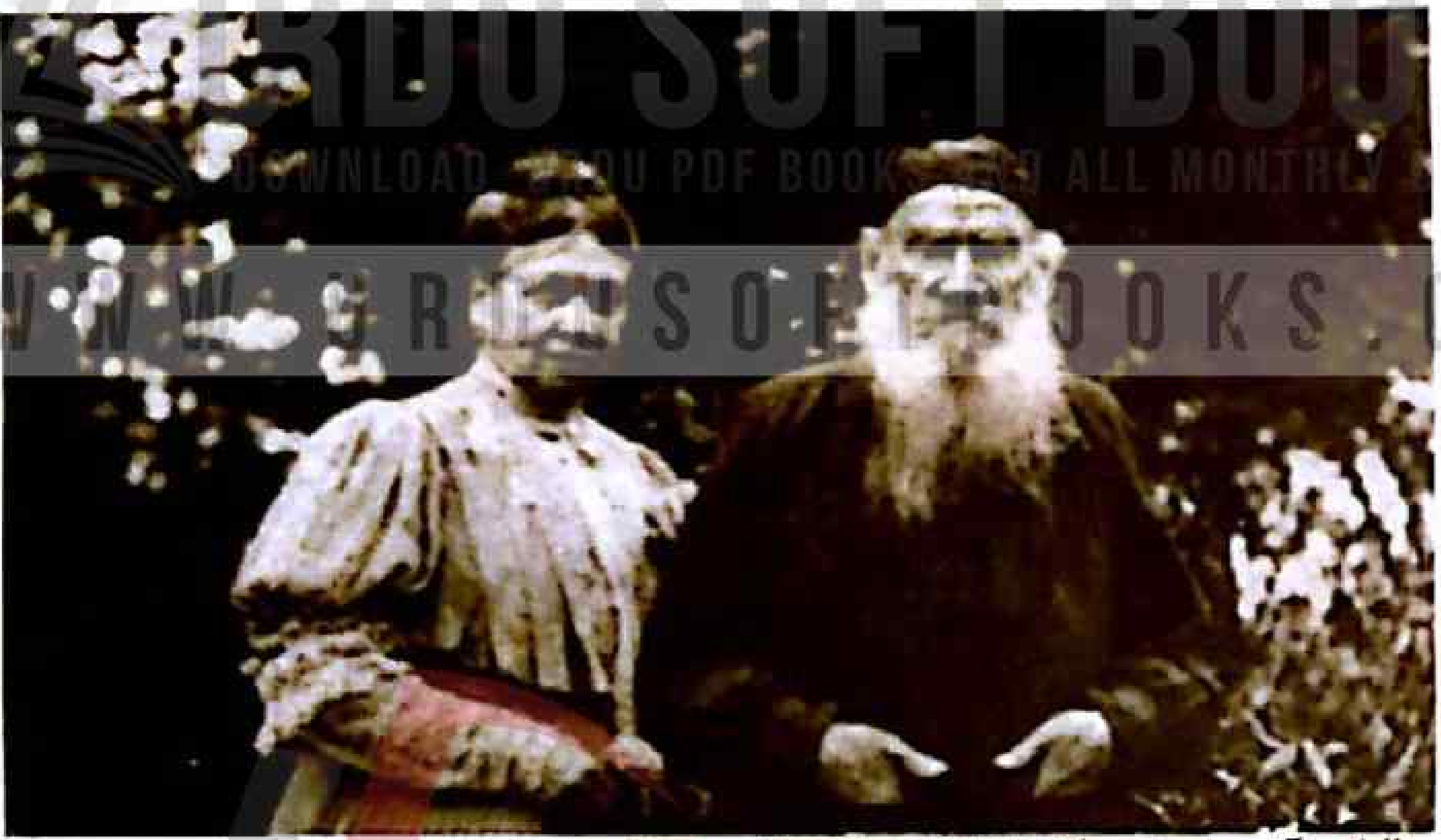

سایہ فگن تھی۔ کچھ دوری پر بسوں کے یارڈ میں دھوپ اپنا بڑھاپا بڑے کروفر کے سے انداز میں گزار رہی تھی۔ مستقل کے بلندوبالا پیڑوں میں ہوا کی مست خرامیاں جاری تھیں۔

یارڈ کے موتی بکھیرتے فوارے کی سنگی دیواروں پر بیٹھے ہوئے ہم نے کونے والی دکان سے کسی اجنبی زبان میں گائے گیت کے بول فضا میں بکھرتے سنے تھے۔ درمیانی عمر کی خوبصورت ورونیکا ان بولوں پر جھومتے، زیرِ لب گنگناتے چبوترے پر بیٹھی اور ساتھ ہی اس نے مجھ سے سوال کر ڈالا تھا کہ میں نے کون کون سے ناول پڑھے ہیں اور کس نے زیادہ متاثر کیا ہے؟

پڑھے تو میں نے دونوں تھے اور دونوں میرے پاس بھی ہیں۔ وار اینڈ پیس روسیوں کی نپولین بونا پارٹ کے خلاف عظیم جدوجہد کی شاندار کہانی ہے اس ناول کا ایک حصہ "1805 کا سال" کے عنوان سے "The Russian Messenger" جیسے ادبی پرچے میں چھپنے سے اس کے بارے میں بے حد پسندیدگی سامنے آئی تھی۔ تین مزید باب چھپے۔ دونوں تنقید نگاروں اور عام قارئین نے اس ناول کے تاریخی پس منظر کو پسند کیا تھا۔

سچی بات تو یہ ہے کہ اینا کرینینا کی بات ہی اور ہے۔ یہ اس کا دوسرا ناول تھا۔ اینا کرینینا کے کچھ حصے میں روس کی ترکی کے ساتھ جنگ کا بھی ذکر ہوا۔ تاہم یہ سچائی کی حقیقت نگاری اور جذبوں کی انتہاؤں کو چھوتا ایسا دلکش ناول جس نے اپنے وقت اور عہد کے بہترین لکھاریوں سے خود کو منوایا۔ نقادوں کی رائے ہے۔

This is less a work of art than a piece of life, but what it loses in art it gains in reality.

اس کے سارے کردار تو جیسے چھم چھم کرتے میری آنکھوں کے سامنے آگئے تھے۔ اینا کرینینا کے چہرے پر پھیلی متانت اور خوبصورتی کی گمبھیرتا اس کے احساسات کی داخلی کشمکش، روح کی افسردگی، ورونسکی کے اندر بھرا ہوا جوش و جذبہ، جوانی کا حسن اور جنون ایک شادی شدہ عورت سے انتہا درجے کا عشق، دلیر مگر اندر سے خوف زدہ بھی۔ ورونسکی کے کردار کے اِن پہلوؤں کی عکاسی کس درجہ خوبصورت تھی۔

Levin بھی انتہا درجے کا متاثر کن کردار ہے انیسویں صدی کی آخری نصف صدی کے روسی معاشرے پر اثر انداز ہوتے مختلف رجحانات جن میں تعلیم، خواتین کے حقوق، سیاسی نظریات، کسانوں کا معاشرے میں کردار جیسے موضوعات پر بے باکانہ اظہار لیوین کی شخصیت کو دل کش بناتے تھے۔

دراصل جب لکھنے والا اپنے زمانے کی معاشرتی خرابیوں کو موضوع بناتا ہے تو جذباتیت بڑھ جاتی ہے۔ اس ناول نے روسی معاشرے میں پھیلے ہوئے منافقانہ رویوں، ایک دوسرے کی ٹانگیں کھینچنے کی عادتوں، حسد، بغض سے بھرے جذبوں کی بڑی مکمل عکاسی کی تھی۔

خاندانوں میں شادی بیاہ کے مسائل بھی اس وقت کا

ایک اہم مسئلہ تھا۔ ناول میں یہ پہلو بھی مختلف انداز میں زیرِ بحث آیا۔ سوسائٹی میں نفسانی خواہشات کے بے ڈھنگے اور بے ڈھبے اظہار، اخلاقی اقدار کی کمی، شہری زندگی کے طرزِ معاشرت میں دیہی زندگی اور زرعی مسائل کا دخول سب ایسے موضوع تھے کہ جو اس وقت کی سوسائٹی میں رچے بسے ہوئے تھے۔ جن کی خامیوں اور کہیں خوبیوں سے معاشرے کا تانا بانا بنا ہوا تھا۔

یہاں ٹالسٹائی کا منفرد اسلوب سامنے آتا ہے کہ ان پر لکھتے ہوئے ٹالسٹائی ان کی اخلاقی نقطۂ نظر یا بطور نشان دہی کے، کسی وضاحت کے چکر میں ہرگز نہیں پڑا، بلکہ وہ اپنے موضوع اور خیالات کو روسی زندگی کے وسیع پینوراما میں پھیلائے چلا جاتا ہے اور وہ جو پیغام دینا چاہتا ہے وہ بھی عیاں ہوجاتا ہے۔ کہہ لیجیے کہ لیوین کے کردار میں خود ٹالسٹائی ہے۔ اس کی فکر، اس کے خیالات، اس کی جدوجہد، اس کے تجربات بھی کا کھل کر اظہار سامنے آتا ہے۔

ورونیکا نے میری باتوں سے لطف اٹھاتے ہوئے کہا۔

"دراصل تو سارا کمال ہی مصنف کا ہے۔ سچ تو یہی ہے کہ اس کی ناول نگاری نے روسی سوسائٹی کی سبھی پرتوں کو جن میں وہ خود بھی رہ رہا تھا تہہ در تہہ کھول کر اپنے قارئین کے سامنے پیش کیا ہے۔"

اب The Cossacks کو ہی دیکھیں۔ یہ ناول بھی بنیادی طور پر ٹالسٹائی کے تجربات پر ہی مبنی ہے۔ جب وہ کاکیشیا کے علاقوں میں رہا تھا۔

کہانی دیکھیں۔ اس کے ایک مرکزی کردار دیمتری Olenin جو روسی فوج کا کیڈٹ ہے۔ جس پر اس علاقے کا فطری حسن، انسانی نفسیات اور رویوں کی پیچیدگیاں، سچائی، انسان کے اندر نیکی کا حسن اور کوساک معاشرہ اپنے تمام تر حسن اور کجیوں کے ساتھ آشکارہ ہوا تھا۔ کوساک لڑکی ماریانا کی سادگی، اس کا کاکیشیائی حسن، پہناوے اور Luka ماریانا کے منگیتر کی دلیری، شجاعت، کینہ، نفرت جیسے جذبات کے ساتھ ناول ایک خوبصورت ادب پارہ بن گیا ہے۔

میں محسوس کررہی تھی کہ دل کش خدوخال والی دوشا کے لیے اب خاموشی سے اسے مزید سننا بہت مشکل ہورہا تھا۔ اس نے لب کھول لیے تھے۔

"آپ کی رائے اپنی جگہ اہم ہے۔ اس پر بحث نہیں ہوسکتی۔ تحریر کو دیکھنے اور پرکھنے کے پیمانے ہر ایک کے اپنے ہوتے ہیں۔ تاہم میری ناقص رائے میں "جنگ اور امن" کو عظیم ترین ناولوں میں سے ایک شاہکار خیال کیا گیا ہے۔ اس کے موضوع کی وسعت اور کرداروں کی اختتام تک جرأت کمال کی ہے۔ ناول میں بکھرے ہوئے سینکڑوں کی تعداد میں کردار کہیں گھریلو زندگی، کہیں نپولین کے ہیڈ کوارٹر کہیں زارِ روس الیگزینڈر اول اور کہیں جنگ کے میدانوں کی کیا خوب عکاسی کرتے ہیں۔

ایک خیال یہ بھی ہے کہ ٹالسٹائی کا ناول کو لکھنے کا بنیادی مقصد تو صرف دسمبرسٹ بغاوت کی وجوہات کو کھوجنا اور انہیں فکشن کی صورت دینا تھا۔ دراصل دسمبرسٹ تحریک تاریخ روس میں انقلابی تحریک بن کر ظاہر ہوئی تھی۔ مگر ہوا کیا کہ وہ بہت سے دوسرے موضوعات میں الجھ گیا اور یہ صرف اختتامی باب تک ہی محدود ہوکر رہ گیا جہاں اس نے اینڈریو بالکونسکی کے بیٹے کو ایک دسمبری بنا کر قصہ پار کیا۔

ہاں ورونیکا رک گئی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک میٹھی سی مسکراہٹ کی کلی کھلی۔ آنکھوں میں سرور کی سی کیفیت کی لو جلی اور انگلیوں کا چٹکی کے سے انداز میں بجانے کی کھنک فضا میں گونجی۔ میں نے نگاہوں کا رخ پھیرا۔ ماحول میں تیرتی تبدیلی نے مجھے سمجھایا تھا کہ بارڈ کی دکان سے آتی گانے اور موسیقی کی آوازیں ورونیکا کے کسی پسندیدہ گیت میں ڈھل گئی ہیں۔ بات کے موڈ میں اس وقت آئی جب گانا ختم ہوا۔

عجیب سی بات ہے ٹالسٹائی تو اپنے اس ناول کو ناول نہیں بلکہ کچھ اور ہی خیال کرتا ہے۔ یہ بھی مزے کی بات ہے کہ اپنے وقت کے بڑے ناولوں اور ناول نگاروں کا اعتراف کرنے سے بھی وہ انکار کرتا ہے۔ تاہم اس کے اس خیال کی حیرت اس وقت کم ہوجاتی ہے جب آپ محسوس کرتے ہیں کہ ٹالسٹائی ایک حقیقت پسند ناول نگار ہے جس کے خیال میں انیسویں صدی کی زندگی کے سیاسی اور سماجی مسائل میں گھری اور اس کی حقیقی ترجمانی کرتی ہی کوئی تحریر ہوسکتی ہے۔

میں ہنس پڑی تھی۔

اب دیکھو لو ورونیکا وہ تو خود کہتا ہے کہ اینا کرینینا ہی میرا پہلا سچا اور کھرا ناول ہے۔

اسی طرح what is to be done میں کیسے وہ ملک میں پھیلی انارکی کی کیفیت سے امن پسندی کی خواہش میں عیسائیت کے فلسفے سے متاثر روسی آرتھوڈوکس چرچ کی گود میں چلا جاتا ہے۔

بلاشبہ بطور لکھاری وہ روسی ادب کا دیو ہے۔ اس نے شاہکار تخلیقات دنیا کو دیں۔ مگر بطور شوہر ایک بیوی کی نظر میں

وہ کیسا انسان ہے؟ یہ بھی دیکھنے والی بات ہے۔

یہ کس قدر ستم کی بات ہے کہ وہ آدمی جس کا دماغ عجیب وغریب سے مذہبی خیالات سے بھرا ہے۔ وہ جو روسی ارسٹو کریسی عورتوں کے بارے میں ایک رائے رکھتا ہے اور وہ رائے بڑی منفی قسم کی ہے کہ وہ اچھے کردار کی مالک نہیں۔ اور یہ کہ اسے شادی ہی نہیں کرنی۔

اب ہوتا کیا ہے۔ شادی ماسکو میں ہوتی ہے۔ 1862 میں ماسکو کے ایک ڈاکٹر اینڈریو کی تیسری بیٹی صوفیہ بہرز سے، چونتیس سال کا آدمی عشق میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ خط کے ذریعے اسے بتاتا ہے کہ وہ اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔

شادی کے فوراً بعد اسے اپنی ڈائریاں دیتا ہے جن میں اس کے عشق کی داستانیں ہیں۔ اس کے عجیب وغریب سے مذہبی خیالات ہیں جن میں وہ روسی ارسٹو کریسی کی عورتوں کو بہت اچھی طرح جاننے کا دعویٰ کرتا ہے۔ ان کے بارے میں اس کے خیالات بڑے منفی قسم کے ہیں۔ اس کا فیصلہ تھا کہ وہ شادی ہی نہیں کرے گا۔

ان ڈائریوں میں اس کے عورتوں سے تعلقات کی بھی تفصیلات ہیں۔ زرعی کسان غلام جنہیں سرف کہتے ہیں کی ایک خوبرو عورت سے غلط تعلقات اور ایک بچے کا باپ ہونے کی نوید اپنی تحریر کے ذریعے اس کی آنکھوں سے گزار کر دل کو گھائل کرتا ہے۔

ذرا اپنے آپ کو اس کی جگہ رکھ کر تصور کریں کہ امنگوں اور آرزوؤں سے بھری ایک دلکش لڑکی اپنی آنکھوں میں خواب سجائے یہ سب پڑھتے ہوئے کتنی دل برداشتہ ہوئی ہوگی۔ زمانہ بھی تقریباً سوا ڈیڑھ صدی پیچھے کا ہے جب روسی عورت اتنی آزاد بھی نہ تھی جتنی آج ہے۔ پرحقیقت یہ ہے کہ آج کی ماڈرن عورت کو بھی اگر ایسی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑے تو وہ بھی صوفیہ ٹالسٹائی کی طرح روتی اور کرلاتی ہے۔

ورونیکا کھلکھلا کر ہنسی اس کے دانت گو سفید موتیوں جیسے نہ تھے مگر خفیف سی درزوں کے ساتھ ایک تناسب سے جڑے خوبصورت لگتے تھے۔

''من وعن یہی سین ٹالسٹائی اینا کرینینا میں دہراتا ہے۔ جب چونتیس سالہ کونسٹین اپنی انیس سالہ منگیتر کیٹی کو ڈائریاں دیتے ہوئے کہتا ہے۔''

''انہیں پڑھ لینا میرے ماضی سے واقف ہوجاؤ گی۔''
اب دونوں میں ہلکی پھلکی سی نوک جھونک کا منظر پیدا ہوگیا تھا۔

جراثیم ہمارے دوست بھی ہیں اور دشمن بھی

جراثیم ہماری روزمرہ زندگی پر بہت اثر ڈالتے ہیں۔ یہ مختلف اقسام کے ہوتے ہیں اور زمین، ہوا، پانی، درخت یہاں تک کہ انسانی جسم کے اندر اور باہر بھی پائے جاتے ہیں۔ یہ ہمارے دشمن بھی ہوتے ہیں اور ہمارے دوست بھی۔ عام حالات میں ہمارے دوست جراثیم جلد کے اوپر، منہ، پورے نظام انہضام، پیشاب کی نالی، سانس کی نالیوں اور بلغمی جھلی پر موجود ہوتے ہیں۔ ان کو نارمل فلورا کہا جاتا ہے اور یہ ہمیں دشمن جراثیم سے بچا کر رکھتے ہیں۔

دشمن جراثیم وہ جراثیم ہوتے ہیں کہ جب وہ ہمارے جسم میں داخل ہوتے ہیں تو کہیں نہ کہیں بیماری کا سبب بن جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر سالمونیلا جو ٹائیفائیڈ کا سبب بنتا ہے۔ ایچ آئی وی وائرس جو ایڈز جیسی مہلک بیماری میں مبتلا کردیتا ہے۔ ہیپاٹائٹس اے، بی اور سی کے وائرس جو یرقان پیدا کرنے والے جرثومے ہیں۔ یہ جرثومے بہت چھوٹے ہوتے ہیں۔ خوردبین کے بغیر انہیں دیکھنا ممکن نہیں ہوتا۔ عموماً یہ ایک خلیے پر مشتمل ہوتے ہیں۔ کوئی کوئی Fungus ایک سے زیادہ خلیے پر بھی مشتمل ہوسکتے ہیں۔

مرسلہ: ڈاکٹر عفت۔ کراچی

''ایک نوخیز دلہن کے جذبات کا ذرا سوچو تو یہ کتنا سفاکانہ پہلو تھا، کیا تم اسے سراہوگی۔''

داشا نے قدرے نروٹھے پن سے ورونیکا کو گھورا اور بولی۔ صوفیہ اپنی ڈائری میں کیسے یاس بھرے انداز میں لکھتی ہے۔

''مجھے تو یوں محسوس ہوا تھا جیسے میرے اوپر کوئی بم پھٹا ہو۔ ایک خوف میری رگوں میں سرایت کرنے لگا تھا کہ وہ کہیں دوبارہ اس کے پاس نہ چلا جائے۔''

شادی کے تھوڑے عرصے بعد ہی اس نے جو لکھا اسے ذرا سنو۔

شادی جو جوانی کے خوبصورت اور محبت بھرے رومانس سے شروع ہوئی تھی۔ اس میں کچھ خوشی بھرے لمحے بھی آئے۔ مگر ان کی مدت کتنی تھوڑی تھی۔ جھگڑے بہت جلد شروع ہوگئے تھے۔

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

"وہ بہت سرد مہری کا سلوک کرتا تھا۔ گھر سے نکلتا تو گھنٹوں واپس آنے کا نام نہ لیتا۔ میں صبح، دوپہر اور شاموں میں اکیلی ہوتی۔ مجھے محسوس ہوتا میں اس کے بچے کی نرس ہوں، گھر میں رکھے فرنیچر کا ایک ٹکڑا ہوں۔ اسٹور میں پڑے سامان کا ایک حصّہ ہوں۔ میں ناکارہ، کوئی فالتو چیز ہوں۔ میں کتنی تنہا ہوں۔"

یہ تو پاگلوں جیسی باتیں کرتی ہے۔ عورتیں تو سدا ہی شوہروں سے شاکی رہتی ہیں۔ جس سے پوچھ لو وہ سو کیڑے نکالے گی ان میں۔ زمانہ جس کی عظمتوں کا گواہ ہوا۔ میرا وہ پیرو مرشد، میرا راہبر، میرا محبوب لینن کلاسیک لٹریچر کا دیوانہ۔ کیا بتاؤں کہ وہ ٹالسٹائی کا کتنا بڑا مداح تھا؟ اسے بار بار پڑھتا۔ لطف اٹھاتا اور اپنی نصف بہتر سے کہتا۔ "کرپسکا یورپ میں ٹالسٹائی کا مقابلہ کس سے کروگی؟"

اپنے ہاتھوں کو خوشی و مسرت سے مسلتے ہوئے وہ اپنے سوال کا جواب خود ہی دیتا۔

"کسی سے بھی نہیں۔ ارے کرپسکا یا کوئی بھی اس جیسا نہیں۔" داشا کی آواز بھرّا سی گئی تھی۔

وہ مزید اپنے کرب کا اظہار کرتے ہوئے لکھتی ہے۔

"میں ہمہ وقت حاملہ ہی رہتی تھی۔ زندگی کتنی ناقابلِ برداشت ہوتی جارہی ہے۔ میں اکثر اپنے دل کو ٹٹولتی اور خود سے پوچھتی ہوں۔ میں کیا چاہتی ہوں؟ اور جو جواب آتا ہے وہ مجھے خوف زدہ کردیتا ہے۔ میرا اندر رنگ رلیوں سے بھری زندگی کا متمنی ہے۔ میں سمارٹ رہنا چاہتی ہوں۔ لوگوں سے سننا چاہتی ہوں کہ تم کتنی خوبصورت ہو۔ پھر جیسے میں جھلا جاتی ہوں اور کہتی ہوں کہ مجھے کیا ہوتا جارہا ہے؟"

ورونیکا کچھ بولنا چاہتی تھی۔ داشا نے بھانپ لیا اور ٹوکتے ہوئے بولی۔

"عورت کے نقطہ نظر سے ان جملوں میں چھپا درد دیکھو۔"

اس کی یادداشتوں کو لکھتے ہوئے میں ایک جملہ پڑھتی ہوں۔ "دنیا میں محبت قسم کی کوئی چیز نہیں۔ یہ صرف جسمانی ضرورت ہے۔ تعلقات کے لیے ساتھی کی ضرورت بس۔ اگر میں یہ چیزیں شادی سے پہلے کہیں پڑھ لیتی تو کبھی اس سے شادی نہ کرتی۔"

دوشا کو کیفے کے اندر سے کسی نے آواز دی تھی وہ ابھی آئی کہتی ہوئی چلی گئی۔

"چلو ورونیکا تم ٹالسٹائی کی زندگی کے بارے میں کچھ بتاؤ۔"

نومبر 1828ء میں روس کے صوبے Tula میں اپنی ذاتی جاگیر یاسنا یا پولیانہ میں پیدا ہونے والا یہ عظیم لکھاری چار بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا۔ ماں شہزادی نی (Nee) اسے صرف دو سال کی عمر میں ہی چھوڑ کر دنیا سے چلی گئی۔ ان بچوں کی پرورش کی پہلی ذمہ داری ان کے باپ کاؤنٹ نکولائی ٹالسٹائی کی کزن نے اٹھائی۔ جب وہ نو سال کا تھا تب باپ بھی رخصت ہوا۔ قانونی گارجین ان کی پھوپی ٹھہری۔ مگر ابھی تھوڑا سا ہی وقت گزرا تھا کہ اسے بھی موت چھین کر لے گئی۔ سارے بچوں کو کازان ایک اور خالہ کے پاس جانا پڑا۔

بچپن میں ان انتہائی قریبی رشتوں کی پے در پے محرومیاں تھیں۔ اس کا اندازہ اس کی یادداشتوں سے ہوتا ہے ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ جرمن اور فرنچ استاد تھے۔ اسکولنگ میں احساس ہوا کہ وہ اچھا طالب علم نہیں ہے۔ ہمیشہ معمولی نمبر لیتا۔ کازان یونیورسٹی سے کوئی ڈگری یا ڈپلوما تک نہیں حاصل کرسکا۔ اب کرنے کو کیا کام تھا؟ باپ کی جاگیر پر آگیا۔ کھیتی باڑی میں مصروف ہوا۔

روس میں اس زمانے میں زرعی غلامانہ نظام رائج تھا۔ اس نے کسان غلامی تحریک کو متحرک کیا اور اس کا لیڈر بن گیا۔ مگر وہ اسے بھی زیادہ فعال نہ کرسکا کہ آئے دن تو وہ ماسکو اور طولا (Tula) بھاگا پھرتا۔ تاہم ایک کام کا اس نے باقاعدہ آغاز کیا اور وہ اس میں کامیاب ہوا اور اسی نے اسے ناول نویسی کی طرف متحرک کیا۔ یہ اس کا روزنامچہ لکھنے کی عادت تھی۔

ابھی وہ اپنی جاگیر پر ہی تھا جب اس کا بھائی نکولائی Nokoley اسے ملنے آیا۔ وہ آرمی میں تھا۔ اس نے اسے بھی آرمی جوائن کرنے کو کہا۔ کاکیشائی پہاڑوں کے قصے تفصیلات کے ساتھ اسے سنائے۔

فوج میں اس نے جنکر کے طور پر شمولیت کی اور یہی وہ مقام تھا جہاں اس کی زندگی نے راہ بدلی۔ وقت کی فراوانی تھی۔ اس نے وقت گزاری کے لیے اپنے بچپن کی یادوں کو کہانی کے طور پر لکھنا شروع کیا۔ پھر یہ اس وقت کے پسندیدہ اور مقبول ترین روزنامہ "The Contemporary" میں چھپنے کے لیے بھیج دیا۔ اور بس یہی مقام آغاز تھا کہ اسے پڑھنے والوں نے انتہائی پسندیدگی کا مرتبہ دیا تھا۔

یہ اہم بات تھی کہ یہ لکھنا جیسے عادت ہی بن گئی۔ جنگ کریمین کے دوران اس نے لڑکپن Boy

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

hood'' لکھی۔ اور اسی دوران اس نے جنگ سے متعلق تضادات پر اپنے خیالات کا اظہار تین سیریز پر مشتمل Seva stopl Tales کے عنوان سے کرتے ہوئے اسے ایک نیا رنگ اور نیا اسلوب دیا۔

یہ سیریز ایک سپاہی کے شعور و آگہی کی خوبصورت عکاس تھی۔ جنگ ختم ہوگئی۔ اس نے فوج کو خیرباد کہا اور روس آ گیا۔

تیزی سے ابھرتے مصنف کو پیٹرز برگ کے ادبی حلقوں میں بڑی پذیرائی ملی۔ ضدی، ہٹیلے اور منہ زور سے ٹالسٹائی نے کسی بھی ادبی تنظیم سے وابستہ ہونے سے انکار کر دیا۔ بانگ دہل اس نے خود کو انارکسٹ کہا اور پیرس آ گیا۔ جو پیسا ساتھ لایا تھا وہ جوئے کے شوق کی نظر ہوا۔ جب جیب میں پھوٹی کوڑی نہ رہی تب گھر لوٹا۔

"Youth" نے 1857 میں چھپ کر اس مثلث کو مکمل کر دیا جو اس کے بچپن، لڑکپن اور جوانی پر پھیلی ہوئی تھی۔ وار اینڈ پیس کے بعد 1873 میں اینا کرینینا اور 1986 میں The Death of ivan Ilyich چھپے۔ Resurrection اس کا بے حد ضخیم ناول تھا۔ 1904 میں ہادی مراد لکھا گیا جو اس کی موت کے بعد چھپا۔

داشا واپس آئی۔ خوبصورت دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے اس نے کہا تھا۔ ''اس کے فن پر قصیدے ابھی جاری ہیں۔''

''ہم تو تمہارے انتظار میں تھے کہ کب آؤ اور صوفیہ کی ڈائری کے چند ورق الٹو۔ اور صوفیہ کی شان میں اس کی عظمتوں کے گیت گاؤ۔''

''تو سنیے پھر۔ میں ورق پلٹتی ہوں۔''

میں اپنے شوہر کے لٹریری کام میں کتنی بڑی معاون تھی۔ اس کا شاید اسے احساس ہی نہیں تھا۔ ''وار اینڈ پیس'' کو میں نے دو تین بار نہیں سات بار لکھا۔ یہ نہیں کہ اس کا کوئی حصہ جس میں کہیں ترمیم یا کوئی اضافہ ہوا ہو۔ بلکہ اول سے آخر تک لکھا۔ اس کی تمام تر سفاکیوں کے باوجود، اس کے رلا دینے والے رویوں سے دل برداشتہ جہاں وہ مجھے مجبور کرتا کہ میں ہر بچے کو اپنا دودھ پلاؤں۔ اس کے لیے سبزی کا سالن بھی خود بناؤں کیونکہ وہ ویجیٹیرین تھا۔ کام کے بوجھ نے مجھے بیمار کر ڈالا تھا۔ کمر کا درد مستقل رہنے لگا تھا۔ نکسیر اکثر پھوٹی رہتی اور دانتوں کی تکالیف آئے دن مجھے رلاتیں۔

مگر یہ کیسی عجیب بات ہے کہ ان تکالیف کی شدت اس وقت بہت کم ہو جاتی ہے جب میں اس کا لکھا ہوا پڑھتی اور اسے لکھتی۔ سچ تو یہ تھا کہ مجھے کوئی بھی چیز اتنی متاثر نہیں کرتی تھی جتنے اس کے خیالات اور اس کی ذہانت۔ الفاظ جیسے کھلونوں کی طرح اس کے ہاتھوں میں کھیلتے اور خیالات کسی آسمانی پھوار کی طرح اس کے دماغ سے برستے۔

بہت سالوں بعد صوفیہ کی ایک اور تحریر ہماری آنکھوں کو بھگوتی ہے۔ درمیانی عمر کی وہ عورت ابھی بھی بہت پرکشش تھی۔ ڈھیروں بچوں کے باوجود اس عورت نے اپنی ذات کو خود اذیت پرستی میں مبتلا کر لیا تھا۔ گندی اور بے ہودہ کتابیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر لاتی اور انہیں پڑھتی۔ گھنٹوں پیانو بجاتی رہتی۔ ٹھنڈے پانیوں میں دیر تک پیراکی کرتی اور نوجوان کمپوزر سرگئی تانیر سے گپ شپ کرتی۔

قدرتی بات تھی ٹالسٹائی کو شدید حسد محسوس ہوا تھا۔ اس نے دھمکی دیتے ہوئے کہا تھا۔ ''میں خودکشی کر لوں گا اگر تم باز نہ آئیں۔''

اور اسے نہ چاہنے کے باوجود اپنی ان تمام سرگرمیوں کو ختم کرنا پڑا جن سے وہ مسرت کشید کرنے لگی تھی۔

کاش اسے نسائی نفسیات کی ذرہ سی بھی سوجھ بوجھ ہوتی تو وہ یقیناً میرے اندر پھیلے درد اور یاس بھرے جذبات کو سمجھتا۔ میں تو اپنے گھر میں ہی مہاجر ہو گئی تھی۔

ہم سب قدرے اداس اور ملول سی فضا میں سانس لیتے تھے۔ داشا پھر صوفیہ کا روپ دھارے بولتی چلی جا رہی تھی۔

میں کھانا کھانے، سونے اور خاموش رہنے میں تو خود مختار تھی پر کسی ایسے کو پیار کرنے میں، جس میں میری رضا اور خوشی شامل ہو آزاد نہیں تھی۔ کبھی کسی محفل میں جب لوگ یہ کہتے تم کتنی خوش قسمت عورت ہو۔ تمہارا شوہر جینئس ہے۔ کیا تم خوش اور شکر گزار نہیں ہو؟ میرا اندر کبھی کبھی میرے چہرے پر رقم ہو جاتا تب میں حیرت بھرے جملے بھی سنتی۔ ''تم کتنی ناشکری عورت ہو۔''

اور جب میں بڑے بڑے لکھنے والوں کے تاثرات اور آراء پڑھتی جیسا کہ دوستووسکی نے کہا کہ یہ ایسا کمال کا کام ہے جس میں کوئی خلا نہیں، کوئی نقص نہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ آرٹ کا شاہکار ہے۔ ایسے ہی خیالات کا اظہار ولادی میر نبوکوو Nabokov اور ولیم فوکنر نے کیا جن کے خیال میں وہ ایسا ناول ہے جو شاید ہی کبھی لکھا گیا ہو۔ جادوئی اثر والا۔

تب میں عجیب سے احساسات کا شکار ہو جاتی۔ بہت

دیر ایک تاسف اور دکھ کی سی کیفیت میں گم رہتی۔ پھر جیسے میرا اندر بلبلانے لگتا۔ میں خود سے باتیں کرتی۔

یہ ناشکری عورت اس کی سیکریٹری تھی، پروف ریڈر، ایڈیٹر، ہاؤس کیپر، اس کی ایجنٹ اس کے اسٹیٹ معاملات کی نگران، اس کے تیرہ بچوں کو پیدا کرنے والی ماں اور ایک نرس۔

سچ تو یہ ہے کہ میں نے چالیس سال تک ایک جینئس کی خدمت کی۔ اپنی کتنی خواہشوں کا گلا گھونٹا اور اس نے کیا کیا؟ وہ اپنی پُرسکون، آرام دہ اور پُرامن گھریلو زندگی کو 82 سال کی عمر میں چھوڑ کر بھاگ نکلا۔

صوفیہ اپنی ساٹھویں سالگرہ کو مناتے ہوئے کہ جو عین اس دن تھی جب اسے پروپوز کیا گیا تھا خود سے پوچھتی ہے کہ اس نے اٹھارہ سالہ لڑکی کے ساتھ کیا کیا؟ جس نے اپنی ساری زندگی اسے دے دی۔ اپنی محبت، اپنا اعتماد، سبھی کچھ اس کے قدموں میں نچھاور کر دیا اور میں نے کیا حاصل کیا؟ اذیتیں، سرد مہری، ظلم۔

زندگی کی آخری دو دہائیوں میں اس نے ایک اور مصیبت اپنے گلے میں ڈال لی تھی۔ ایک کامیاب ناول نگار ہونے اور بے حد شہرت پانے کے باوجود وہ روحانیت کے جھنجھٹ میں پڑ گیا اور اکثر بہت ڈپریس رہنے لگا۔ ''زندگی کیا ہے'' اس کا مفہوم واضح کرنے کے لیے وہ آرتھوڈوکس گرجوں میں جانے لگا۔ اس کا یقین پختہ ہو گیا کہ یہ سب خرابیوں کے اڈے ہیں۔ اس نے اپنے خیالات اور عقائد کو لکھنا شروع کیا۔

1883 میں The Meditator چھپی اور اس نے گورو کی سی حیثیت اختیار کر لی۔ اس کے مداحوں کے تانتے تو پہلے ہی تھے اب عقیدت مندوں اور پیروکاروں کی قطاریں لگ گئیں۔ اس نئے مشغلے کی دیکھ بھال کا بوجھ بھی صوفیہ کو ہی اٹھانا پڑا۔

انہی دنوں کا وہ لکھتی ہے۔ ''میں خود سے پوچھتی ہوں کیا میں نے اپنے شوہر کو خوش نہیں کیا۔ کبھی کبھی میرا جی اسے قتل کرنے کو چاہتا ہے۔ کبھی میں اپنے آپ کو قتل کرنے کا سوچتی ہوں۔''

اس کی ایک اور بڑی ہی افسردہ تحریر دل کو ملول کرتی ہے۔

''انقلاب، بالشویک انقلاب دروازوں پر دستک دے رہا ہے۔ قتل و غارت اور لوٹ مار کا بازار گرم ہونے جیسی سرگوشیوں نے واضح صورت اختیار کر لی ہے۔ آئے دن دھمکیاں ملنا معمول بن گیا ہے۔ تاریخ ہر چیز کو تباہ کرنے پر تلی نظر آتی ہے۔

اف میں اپنی چار ہزار 4000 ایکڑ کی اسٹیٹ پر ایک نظر ڈالتے ہوئے خود سے کہتی ہوں۔

''ہمیں یہاں رہتے ہوئے نصف صدی گزر گئی ہے۔ اس طرزِ زندگی کی عادت سی ہو گئی ہے۔ ہر روز ہم اکٹھے ہوتے ہیں۔ میٹنگ ہونا معمول بن گیا ہے۔ اس میں سوچ بچار ہوتی ہے کہ ہمیں اس لوٹ مار سے خود کو کیسے محفوظ رکھنا ہے؟ میری آنکھیں دیکھتی ہیں۔ ہمارے گھوڑے، خچر، بیل مزارعے سب طولا کی ہائی وے پر بھاگے چلے جا رہے ہیں۔ میری ہر وہ چیز لٹتی جا رہی ہے جس سے مجھے پیار ہے۔ جن کے ساتھ میرا وقت گزرا جو میرے خوشی اور یاس کے دنوں کے ساتھی ہیں۔''

اس کی موت بھی عجیب ڈرامائی انداز میں ہوئی۔

نمونیے کا پرانا مریض تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ چھوٹی چھوٹی باتوں پر غصہ و اشتعال، بے چینی اور اضطراب میں اضافہ ہو رہا تھا۔ خودکشی کرنے کی خواہش بھی اکثر اندر سر اٹھاتی تھی۔

ٹالسٹائی کا ایک بااعتماد پیروکار ولدیمیر chertkov سابق فوجی افسر ایک بڑا بیوروکریٹ اس کے ادبی معاملات کو ڈیل بھی کرتا تھا مگر وہ صوفیہ کی آنکھوں میں تنکے کی طرح کھٹکتا تھا۔ اس کے خیال میں وہ شیطان تھا۔ اسے دونوں کے درمیان غلط تعلقات کا بھی شبہ تھا۔

7 نومبر 1910 کی سرد ہڈیوں میں گودا جماتی رات تھی۔ جب بیاسی سال کی عمر میں اس نے ڈرامائی فیصلہ کیا۔ اس نے اس عورت کو جو اس کے ہر دکھ درد میں اس کی ساتھی تھی کو بتانے کی تکلیف بھی گوارا نہ کی کہ اس کے دل میں کیا ہے؟

آدھی رات کو اس نے کسی کو بتائے بغیر اپنا آرام دہ گھر اپنی اسٹیٹ چھوڑی۔ چھتیس گھنٹے کے سفر کے بعد وہ شمارڈینو Sharmardino پہنچا۔ یہاں اس کی بہن ماریا رہتی تھی۔ یہیں کوئی ہٹ کرائے پر لے کر وہ بقیہ زندگی گزارنے کا متمنی تھا۔ لیکن اسے وہاں ٹکنا نصیب نہ ہوا۔ اسے مجبور کیا گیا کہ وہ کاکیشیا جانے کے لیے گاڑی میں سوار ہو جائے۔ اس کی کمزور صحت اسے برداشت نہ کر سکی۔ Astaporo ایک بہت چھوٹے سے دور افتادہ اسٹیشن پر اسٹیشن ماسٹر نے اس کے لیے اپنے گھر کے دروازے کھولے۔ یہ بیس نومبر روز تھا اور وقت ساڑھے چھ کا جب اس نے دنیا کو الوداع کہا۔

اور میری آنکھیں کھلی تھیں نہ داشا کی آنکھیں کھلی تھیں۔

☆☆☆

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

شمال سے ٹورنٹو

ندیم اقبال

شاعر نے غلط نہیں کہا ہے کہ چاند میری زمیں پھول میرا وطن۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ میرا وطن چاند سے بھی زیادہ خوب صورت ہے۔ اس کی وادی، اس کے دریا، شہر وکوہسار سب کے سب بے نظیر و بے مثال ہیں۔ لیکن ان فضاؤں سے جو نکل کر کسی اور شاخ پر آشیانہ سجانے کی خواہش کرتا ہے۔ اسے کیسی کیسی پریشانیاں گھیرتی ہیں اس کا ذکر۔ جو یورپ و امریکا میں بسنا چاہتے ہیں وہ اس تحریر کو ضرور پڑھیں۔

ایک جداگانہ انداز کی دلچسپ سفر کہانی کا پندرھواں حصہ

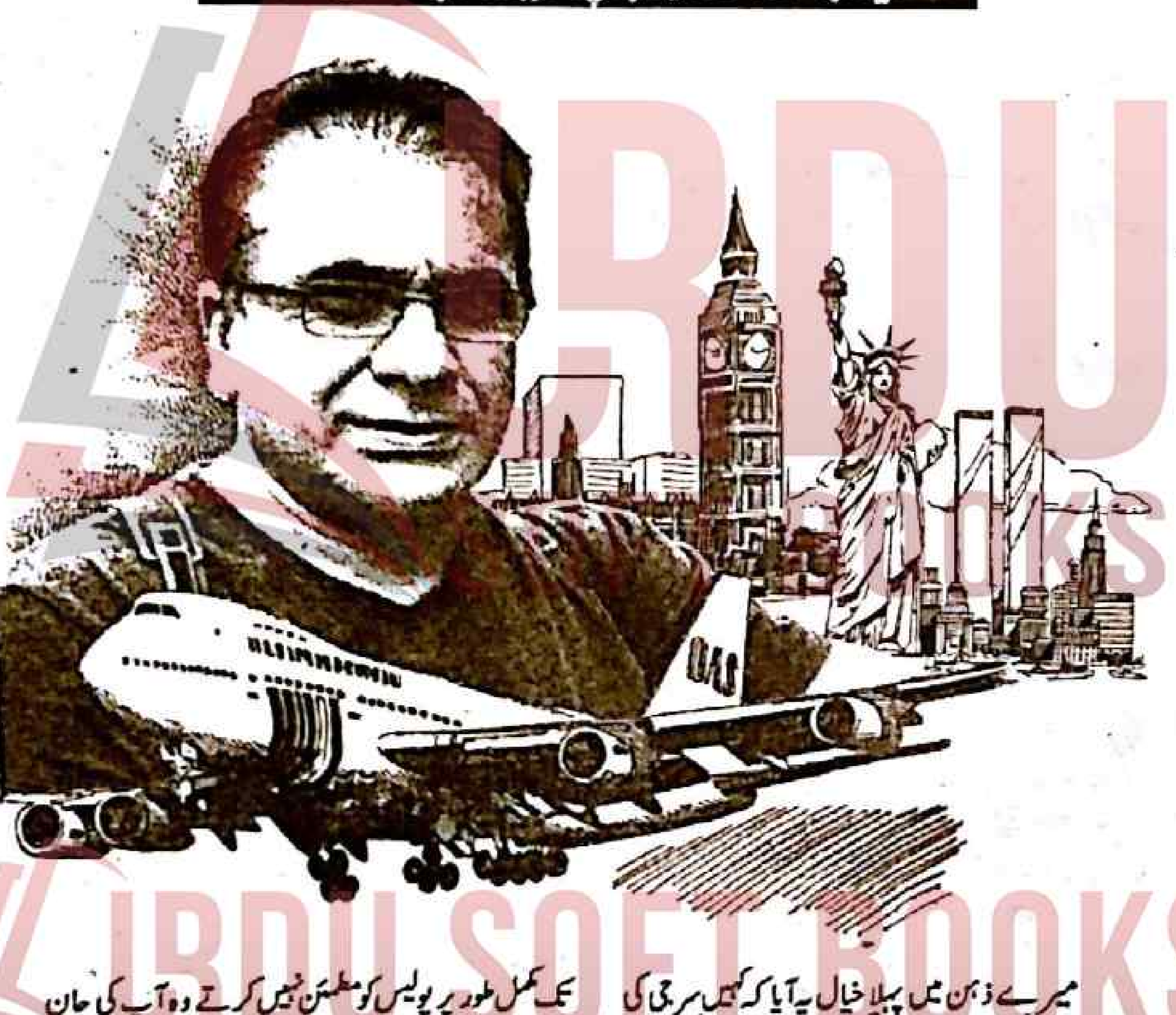

میرے ذہن میں پہلا خیال یہ آیا کہ کہیں سرجی کی طرف سے کوئی ایسی حرکت نہ ہوگئی ہو کہ لڑکیوں کو پولیس بلانا پڑ گئی ہو۔ یہ کوئی تیسری دنیا کا شہر تو ہے نہیں جہاں ٹکہ ٹکا کی رسم ادا کر کے رہائی مل جاتی ہے۔ یہاں تو آپ جب تک مکمل طور پر پولیس کو مطمئن نہیں کرتے وہ آپ کی جان نہیں چھوڑتی اگر انہیں آپ کی جانب سے اطمینان ہو جائے تو ان کے چہروں پر وہی جھلکتی ہے اگر مطمئن نہ ہوں تو ان پر چھائی کرختگی دیکھ کر ہی جھرجھری آجاتی ہے۔

"آپ وہاں کیا کرنے گئے تھے؟" میں نے سخت لہجے میں پوچھا۔

"میں کب گیا تھا؟" سرجی نے گھبراہٹ پر قابو پا کر کہا۔

"پھر آپ کو کیسے پتا چلا پولیس آئی ہے۔"

ان کے کملائے چہرے پر خوف کی پرچھائیاں تھیں وہ بولے۔ "میں نے تو تبدیلی آب و ہوا کے لیے راہداری میں جھانکا اور وہ ساتھ والے کمرے کے دروازے پر کھڑی تھیں۔" پھر تھوک نگلتے ہوئے بولے۔ "مجھے دیکھا تو نہ جانے کیوں مسکرا پڑیں۔ تو میں نے بھی تہذیب کا مظاہرہ کیا اور مسکرانے لگا۔"

میں سرجی کو بغور دیکھ رہا تھا اور شہباز لگا تار اپنے بستر پر لیٹا غرا رہا تھا۔ سرجی میری نظروں کی چبھن کو برداشت نہ کر سکے اور سر جھکا کر بولے۔

"وہ لڑکیاں بہت خوب صورت تو نہیں، بس میری حسن پرست نگاہوں کی وجہ سے وہ مجھے دیکھ کر مسکرا رہی تھیں۔ پھر ہنسنے بھی لگی تھیں اور پولیس کو نہ جانے کیسے خبر ہو گئی۔ یوں سمجھ لیں کہ صیاد نے پکڑ لیا اتنی سی بات پر فصل بہار دیکھ رہے تھے۔ راہداری سے ہم۔" سرجی ٹھنڈی سانس لے کر بولے۔

"ہم دروازے پر کھڑے تھے کہ پولیس آ گئی۔"

"آپ سے وہ کیا بولے؟" میں نے پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں، وہ ان لڑکیوں کو لے کر کمرے میں گھس گئے اور میں آپ کو اٹھانے آ گیا۔"

پولیس کا نام سن کر میں بھی پریشان ہو گیا! میں نے فون پر ریسپشن سے پتا کیا تو معلوم ہوا وہ لڑکیاں اسپین کی ہیں اور جعلی کاغذات پر آئی ہیں۔ ریسپشن والا کہنے لگا کہ آپ لوگ باہر نہ نکلیں اور اپنے کمرے ہی میں رہیں اور یہ بھی کہا کہ یہ سب یہاں کا معمول ہے۔

قصور سرجی کا بھی نہیں تھا۔ یہاں کوئی ممانعت تو نہ تھی کہ آپ رات کو کمرے سے باہر نہیں نکل سکتے۔ سرجی نے لڑکیوں کی آوازیں راہداری میں سنی ہوں گی تو باہر جھانک لیا ہوگا، پولیس ان لڑکیوں کو فالو کر رہی ہوگی اور سرجی کی مسکراہٹوں کے تبادلے کے دوران ہی آ پہنچی۔

میں نے سرجی کو ڈرایا۔ "اگر آپ ان کے ساتھ کھڑے ہوتے تو پولیس آپ کو ضرور لے جاتی۔"

وہ بولے۔ "مجھے کیوں؟"

میں نے کہا۔ "بارڈر پر آپ نے کہا تھا کہ آپ سالی کے گھر نیوجرسی جا رہے ہیں اور ادھر آپ مینہٹن کے ایک ہوٹل میں پُراسرار حالت میں برآمد ہوتے تو نامعلوم کیا سلوک آپ سے کرتے؟" یہ سن کر وہ اپنے بستر میں جا گھسے اور رضائی اوڑھ لی۔

اور میں پھر سے سو گیا۔

دوسرے دن بیدار ہوا تو دن نکل آیا تھا۔ ہوٹل کا فری ناشتا ہم نے مس کر دیا تھا کیونکہ دن کے بارہ بج رہے تھے۔ سرجی اور میں ایک ہی وقت پر بیدار ہوئے اور شہباز ابھی الٹا سیدھا لیٹا اپنے مخصوص انداز میں خراٹے لے رہا تھا۔

سرجی نے مجھے بستر چھوڑتے دیکھا تو سلام کیا اور پھر آنکھیں بند کر کے دوبارہ مراقبے میں چلے گئے۔ رات خوب گہری نیند لی تھی اسی کے باعث میں تروتازہ تھا۔ اٹھ کر سیدھا واش روم میں گھس گیا۔ رگڑ رگڑ کر شیو بنائی، شاور لیا اور کپڑے تبدیل کر کے دوبارہ کمرے میں آیا تو سرجی مراقبے سے نکل کر چھت کو گھورے جا رہے تھے۔ میں نے پوچھا۔ "رات کیسی گزری اور وہ لڑکیاں تو خواب میں نہیں آئیں؟"

اچانک انہیں کچھ یاد آیا اور بے چین ہو کر بولے۔ "شہباز کو رات کے واقعے کا نہیں بتانا ورنہ وہ سارا الزام مجھ پر ڈال دے گا۔"

میں نے تسلی دی تو اپنی بات کو آگے بڑھایا اور کراہ کر بولے۔ "رات تو ایسے گزری جیسے ٹرین کے ڈبے میں گزرتی ہے۔"

وہ دراصل شہباز کے خراٹوں کی بابت بات کر رہے تھے۔ میں نے انہیں کہا۔ "آپ جلدی سے شاور لے لیں، پھر شہباز نے بھی واش روم جانا ہے۔"

یہ سن کے سرجی نے چھلانگ لگائی اور بیڈ سے نیچے کھڑے یہ فرما رہے تھے۔ "اس نے تو پانی کی ساری ٹنکی خالی کر دینی ہے، میں اتنے میں ہلکے سے چھینٹے مار لوں۔"

آدھے گھنٹے بعد "چھینٹے" مار کر نکلے تو کپڑوں پر ہوٹل والوں کا تاول گاؤن بھی پہن رکھا تھا جس کا نچلا حصہ کارپٹ سے ٹکرا رہا تھا۔ میں نے اسے پہننے کی وجہ پوچھی تو بولے۔ "ایک بار جیمز بانڈ بھی اپنے ہوٹل کے واش روم میں اسے پہن کر نکلا تھا۔" پھر فریج کی جانب بڑھ کر بولے۔ "یہ سوچا ذرا ہمیں بھی تو پتا چلے کہ گاؤن پہننے سے کیسا محسوس ہوتا ہے؟"

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

میں نے کہا۔ ''پھر کیسا لگ رہا ہے؟''

''فریج کے اندر کا نظارہ کرنے کو دل کر رہا ہے۔'' پھر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولے۔ ''جیمز بانڈ بھی کسی فلم میں ایسے ہی گاؤن پہنے پہلے فریج کی طرف جاتا ہے۔''

یہ کہہ کر پھر سے فریج کھول لیا۔ میں اپنے بستر پر لیٹے لیٹے یہ سارا تماشا دیکھ رہا تھا۔ وہ فریج کھول کر واڈکا کی بوتل ہاتھ میں پکڑ کر بولے۔ ''قسم سے سرکے کی بوتل لگتی ہے۔'' پھر اس کو سونگھا اور چکرا کر بولے۔ ''بہت معطر اور مہکی مہکی بدبو بھی آرہی ہے۔''

میرے دماغ میں یہ بات کسی بھی طرح سے نہیں بیٹھ سکتی تھی کہ کوئی بدبو بھی مہکتی یا معطر ہوسکتی ہے؟ گو میں نے اپنے چہرے پر سنجیدگی اور ایمان کی روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہوئی تھی مگر آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔ مجھے یقین تھا کہ وہ سب جانتے ہیں لیکن مجھ سے کچھ اگلوا کر بات کا بتنگڑ بنانا چاہتے ہیں۔ شہباز منہ کھولے گہری نیند میں خراٹے لے رہا تھا۔ وہ اس کی جانب دیکھ کر بولے۔ ''کیا اس بوتل کے کچھ چھینٹے اس پر پھینکوں تاکہ یہ خراٹے تو ختم ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''اگر سیل کھول بھی دی تو ایک لیٹر واڈکا کی ادائیگی کرنا ہوگی۔'' پھر میں نے ایک تجویز دی۔ ''شہباز کے کھلے منہ میں دو ڈھکن بھر کر ڈال دو تو پورا دن مہکتا مہکتا پھرے گا۔''

وہ اب بوتل پر نظر جمائے سنجیدگی سے میرے مشورے پر غور کر رہے تھے۔ پھر کہنے لگے۔ ''ہوٹل والوں کو قیمت کون دے گا؟''

میں نے سوتے ہوئے شہباز کی جانب اشارہ کر کے کہا۔ ''اسی سے وصول کریں گے۔''

میری بات کو ناقابل عمل جان کر بولے۔ ''شہباز کی مثال تو ایسے ہی ہے کہ گھر میں لالٹین نہیں اور بیٹا مانگے پاور ہاؤس۔''

میں نے ان کی بات کا یہ مطلب نکالا کہ شہباز خود تو مایا کا برگر مانگ کر کھاتا ہے تو کسی اور کے پیالے میں جام کیسے بھرے گا۔

انہوں نے وہ بوتل احترام سے واپس فریج میں رکھ دی اور شہباز کی جانب متوجہ ہو کر کہنے لگے۔ ''اسی کی وجہ سے ہوٹل والوں کا لذیذ ناشتا آج ہاتھ سے گیا۔ اب سامان اٹھا کر اسی دیسی ریسٹورنٹ سے ناشتا کرتے ہیں جہاں کل گئے تھے۔''

میں نے کہا۔ ''ایک اور رات بھی ٹھہرتے ہیں۔ ہمارے کون سے بچے گھر پر بیٹھے رو رہے ہیں۔''

یہ کہہ کر میں نے طارق کو فون ملایا۔ سنڈے تھا اور وہ گھر پر موجود تھا۔ میں نے ایک اور رات رہنے کی خبر دی تو کہنے لگا۔ ''یار! اتنا تو میں بھی مینہٹن میں پچھلے چودہ سال میں نہیں رہا اور تم اس پر اپنا وقت پلید کر رہے ہو۔''

میں نے جھٹ کہا۔ ''وہ سرجی اور شہباز ضد کر رہے ہیں اسی لیے ایک اور دن رکنا پڑ رہا ہے۔ کل تو میں آجاؤں گا۔''

پہلے تو وہ خوب بولتا رہا اور میں خاموشی سا سنتا رہا۔ جب دیکھا کہ اس کی باتوں کا کوئی اثر نہیں ہو رہا ہے تو کہنے لگا۔ ''میں ابھی ہوٹل کے ریسپشن پر فون کر کے ایک اور رات کی ادائیگی کر دیتا ہوں مگر کل ضرور آجانا۔''

سرجی بہت خوش ہوئے اور اسی خوشی میں دوبارہ وہی گاؤن پہنے بستر میں گھس گئے اور وہیں سے اپنے بہت سے تکیوں میں سے ایک تکیہ اٹھا کر زور سے شہباز کو مارا اور بولے۔ ''ایک رات اور مینہٹن کے نظارے مفت میں دیکھنے کو مل رہے ہیں۔ جلدی سے اٹھ جاؤ۔''

پہلے شہباز کے خراٹے بند ہوئے، اس کی آنکھیں کھلیں اور پھر اٹھ کر سرجی کو کوسنے لگا۔ ''اتنی جلدی اٹھا دیا، کچھ دیر اور سونے دو۔''

جب میں نے کہا۔ ''دن کا ایک بج رہا ہے۔''

وہ حیران ہو کر گھڑی دیکھنے لگا، پھر بولا۔ ''بارہ بجے ہوٹل چھوڑنا تھا اور اب دن کا ایک بج رہا ہے۔ مجھے اٹھا دیتے۔'' پھر پریشانی سے سر ہلا کر بولا۔ ''اب ہوٹل والوں سے کیسے نمٹیں گے؟''

سرجی نے پروگرام میں تبدیلی کی بابت بتایا اور کہا۔ ''تم بھی کیا یاد کرو گے کہ کن سے پالا پڑا ہے جنہوں نے اپنی ساری عمریں عیاشی میں بسر کر دیں۔''

رات کی بھرپور نیند نے ہماری تھکاوٹ دور کر دی تھی۔ شہباز کو سرجی نے اب اپنے آئندہ کے پروگرام کے بارے میں بتایا۔ ''آج مینہٹن میں گھومنے کا ارادہ ہے۔''

وہ بولا۔ ''ہم کل بھی تو ادھر ہی گھوم رہے تھے۔'' پھر اسے یاد آیا اور بولا۔ ''ایک بار ریڈ ایریا کا چکر لگا لیں گے آخر دیکھیں تو کیا سین وہاں چلتے ہیں؟''

دراصل ریڈ ایریا کے علاوہ بھی دیکھنے کو بہت کچھ تھا جو

بھی ٹورسٹ نیویارک آتا ہے تو اس نے صرف ڈاؤن ٹاؤن (منہٹن) ہی آنا ہوتا ہے اور اگر وہ پاکستانی ہے تو منہٹن کے ساتھ ساتھ جیکسن ہائٹ یا کونی آئی لینڈ جاتا ہے۔ وہاں کے پاکستانی بازاروں کا چکر لگا کر اور لذیذ کھانے کھا کے اپنے "نیویارک" کو مکمل طور پر دیکھ لیتا ہے۔

شہباز تیار ہوا اور اپنے استری کیے ہوئے کپڑے پہنے جو سرجی نے کیے تھے۔ سرجی ہمارے ذاتی کام کرنے سے باز نہ آتے تھے۔ پیار اور سختی کے ساتھ ساتھ سب حربے آزما لیے تھے کہ ہمارے ذاتی کام آپ کو نہیں کرنے چاہیں مگر وہ یہی کہتے کہ میں آپ کے احسانوں کے بوجھ تلے دبا ہوا ہوں۔ چاہوں بھی تو میں وہ قرض نہیں اتار سکتا جب آپ دونوں ـــ ایئرپورٹ سے مجھے اپنے اپارٹمنٹ میں لائے تھے۔ ہم دونوں کئی بار کہہ چکے تھے کہ آپ اپنا خرچا دیتے ہیں بلکہ ہمارا اپنا خرچ بھی کم ہو گیا ہے۔ مگر وہ مانتے نہیں۔ یہ سب سن لیتے اور خاموش ہو جایا کرتے تھے مگر اپنی من مانی سے باز نہ آتے تھے۔

ہم تیار ہو کر ہوٹل کے ریسپشن پر آئے تو وہی لڑکا موجود تھا جس نے کل ہمیں کمرے تک پہنچایا تھا۔ اس نے بتایا کہ طارق نے فون کر کے مزید ایک رات کی ادائیگی کر دی ہے۔

اب سرجی وہیں لابی میں کھڑے بلبلا رہے تھے۔ "اب جلدی سے کوئی ناشتا ہونا چاہیے۔ میری تو آنتوں کا قتل ہو رہا ہے۔"

شہباز نے کہا۔ "صبر کریں۔ آپ نے اپنا سیاپا ڈالا ہوا ہے۔"

پھر وہ مجھ سے بولا۔ "وہی کل والے دیسی ریسٹورنٹ چلتے ہیں۔ وہاں حلوا پوری کھاتے ہیں؟"

میرا اپنا ارادہ بھی وہیں جانے کا تھا۔ ویسے کسی اور جگہ ہمیں ناشتا مل بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ اب لنچ کا ٹائم ہونے والا تھا۔ امریکا میں لنچ نہیں کیا جاتا۔ یہ لوگ ڈٹ کر ناشتا کرتے ہیں اور لنچ میں ایک آدھ برگر اور کافی پی کر اپنا پیٹ ہلکا رکھتے ہیں اور پھر شام کو جلدی ڈنر کر کے جلدی سو جاتے ہیں۔ یہ لوگ صبح سویرے اٹھ کر پھر سے کام پر لگ جاتے ہیں۔ شام انہیں اپنے گھر میں گزارنی لازم ہوتی ہے لیکن ویک اینڈ پر یہ ریسٹورنٹس میں ڈرنک اور ڈنر کرتے ہیں۔

ہم دیسی ریسٹورنٹ کی جانب پیدل جا رہے تھے۔ وہی بلند عمارتیں، ٹھنڈ اور لوگوں کے ہجوم بھاگتے پھرتے لوگ تھے۔ ایک جگہ فٹ پاتھ کے ساتھ کھوکے نما دکان پر کافی مل رہی تھی۔ سرجی کو کافی پینے کا شوق چرایا۔ ہم کہتے رہے کہ دیسی ریسٹورنٹ جا کر چائے پی لیں گے تو وہ فرمانے لگے۔ "ٹھیک سے آنکھیں نہیں کھل رہی ہیں۔ کافی کے بغیر تو میرا دن شروع ہی نہیں ہوتا۔"

شہباز نے کہا۔ "کینیڈا میں تو چائے ہی پیتے تھے۔" کہنے لگے۔ "کافی تو میں کین سینٹر میں پی لیتا تھا... وہ بھی ین کے ساتھ۔"

سرجی نے گتے کے گلاس میں صرف اپنے لیے گرم کافی لی کیونکہ ہم دونوں نے انکار کر دیا تھا۔ وہ اب گوروں کی طرح فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے اپنے ہاتھ میں کافی کا مگ پکڑے ہوئے تھے۔ ایک ہلکا سا گھونٹ لیا اور وہیں تھوک دیا۔ پوچھنے پر بتایا۔ "بہت کڑوی ہے، جیسے کھانسی کا سیرپ پی رہے ہوں۔"

وہ ہاتھ میں کافی کا مگ پکڑے اسے کوستے جا رہے تھے کہ سامنے فٹ پاتھ پر میلے کچیلے کپڑے پہنے ایک بھکاری کو کہتے سنا۔ "کیا مجھے ایک کپ کافی پلا سکتے ہیں؟"

لوگ اس کی فرمائش سن کر ان سنی کرتے قریب سے تیزی سے نکل جاتے۔ سرجی کی رگ انسانیت جاگ پڑی۔ کہنے لگے۔ "یہ بے چارہ سب سے بھیک مانگ رہا ہے اور کوئی سنتا ہی نہیں؟" پھر خود ہی سے بولے۔ "انسانیت ختم ہو گئی ہے۔ پاکستان ہوتا تو کوئی نہ کوئی اسے کافی پلا دیتا۔ بے چارے کی آنکھیں میری طرح نہیں کھل رہی ہوں گی۔" یہ کہہ کر اپنے تئیں حاتم طائی بنے اس کے پاس پہنچے اور اپنا کافی کا مگ اس کے آگے بڑھا کر تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "تم یہ کافی پی لو اور میرے لیے دعا بھی کرنا۔"

اب یہ کافی کا مگ اس کے آگے بڑھائے کھڑے تھے اور وہ بھکاری اپنی غصے بھری سرخ آنکھوں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ اب سرجی کے ساتھ ہم بھی پریشان کھڑے تھے۔ سرجی نے اس سے نہایت اپنائیت سے کہا۔ "تم یہ کافی پی سکتے ہو۔"

پہلے تو وہ سرجی کو گھورتا رہا پھر بولا۔ "میں یہ گھٹیا کافی نہیں پیتا!" پھر بولا۔ "اگر پلانی ہی ہے تو اسٹاربکس کی کافی پلاؤ ورنہ دفع ہو جاؤ۔"

سرجی تو کیا ہم بھی اس کی فرمائش اور بدتمیزی پر حیران رہ گئے۔ سرجی پھیکی مسکراہٹ لیے جلدی سے کھسک کر ہماری جانب چلے آئے اور کھسیانے ہو کر کہنے لگے۔

”ہم سے بہتر تو گورے فقیر ہیں جنہوں نے کافی پینے کا بھی ایک اپنا معیار بنایا ہوا ہے۔“ پھر بولے۔ ”میری تو آنکھ پھوٹے جو آئندہ کسی کو کافی پلانے کی آفر کروں۔“

شہباز نے کہا۔ ”جو اس دن ین کو لے چلے تھے؟“

وہ بولے۔ ”میں نے کسی گورے کی بات کی ہے، چینی کی نہیں۔“ پھر آگے ایک ڈسٹ ڈرم میں کافی کا گلاس پھینکتے ہوئے کہا کہ اس بھکاری کی مثال تو ایسے ہی ہے ”آپ میاں منگتے اور باہر کھڑے درویش۔“

سرجی کو اس کا مطلب سمجھانے سے پہلے شہباز نے کہا۔ ”اس کا مطلب میں سمجھاتا ہوں۔“

سرجی بڑے تحمل سے بولے۔ ”جی بسم اللہ! کہیں ہمیں سمجھا ہی نہ دیں؟“

شہباز بولا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ ایک بھکاری نے حاتم طائی کو پیچھے سے (نازیبا لفظ) ٹمس کے لات ماری ہے۔“ اب سرجی کافی اور بھکاری کو بھول کر شہباز کی ایسی تیسی کررہے تھے۔

ہم ناشتے یا دوپہر کے کھانے کے لیے دیسی ریسٹورنٹ کی تنگ سی جگہ پر بیٹھے تھے۔ آج پائے بھی بنے تھے۔ شہباز نے کاؤنٹر کے پیچھے کھڑی لڑکی یا عورت سے میرے اور اپنے لیے چائے اور سرجی کے لیے کافی کا آرڈر دے دیا اور سرجی ایک بار پھر تپ گئے۔ ”میری نیکی کا مذاق اڑایا جارہا ہے۔“

پھر میری جانب چور نظروں سے دیکھ کر بولے۔ ”دوسرے میرا مذاق اڑنے پر بہت خوش نظر آرہے ہیں۔“ میں نے شہباز کو چپ کرایا اور پھر سب بھوکوں نے ڈٹ کر کھانا کھایا۔

چائے پینے کے بعد ہم باہر فٹ پاتھ پر آگئے۔ پھر چلتے چلتے ایک چوراہے پر آکھڑے ہوئے۔ اتنا زیادہ کھانا کھانے کے بعد مجھے سگریٹ کی طلب ہوئی تو جیکٹ کی جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر سگریٹ سلگائی۔ سگریٹ میرے ہونٹوں میں تھی۔ ایک ہاتھ سے اپنا بیگ پکڑا تھا اور دوسرے ہاتھ سے سگریٹ کا پیکٹ جیکٹ کی جیب میں ڈال رہا تھا کہ اچھا لباس پہنے ایک امریکی گورا میرے پاس سے گزرتے ہوئے رکا اور اپنے دائیں ہاتھ سے سگریٹ میرے ہونٹوں کے بیچ سے کھینچ لی۔ یہ سب اتنی سرعت سے ہوا کہ پہلے تو مجھے سمجھ نہ آئی کہ ہوا کیا ہے؟ پھر وہ دوڑ کر چند گز دور جا کھڑا ہوا اور انگلیوں سے فتح کا نشان بنا کر فٹ پاتھ پر ڈانس کرنے لگا۔ میں حیرت سے اسے ناچتا دیکھ رہا تھا۔ وہ چاہتا تو سگریٹ مانگ بھی سکتا تھا۔ میں ذرا سا خوف زدہ بھی ہوگیا تھا۔ سرجی اور شہباز دونوں حیرت اور اندیشوں میں ڈوبے دیکھ رہے تھے۔ پھر اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور کش لیتا ہوا چلا گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آیا یہ ذہنی مریض ہے یا ہماری رنگت دیکھ کر ہمیں تنگ کررہا ہے۔ مجرم تو وہ کسی طرح سے نہ لگتا تھا اگر ہوتا تو بیگ لے اڑتا۔ ہم کچھ دیر گنگ کھڑے رہے۔

یہ مینہٹن تھا۔ یہاں کچھ بھی ہونا ممکن ہے۔ اب تو یہاں امن آگیا ہے مگر اسی اور نوے کی دہائی میں یہ دنیا کا خطرناک علاقہ تھا۔ یہاں چوری، ڈکیتی، گاڑیوں کی چوری اور قتل ایک عام سی بات تھی۔ گن دکھا کر لوٹنا تو ایک معمول تھا۔ کوئی نیویارک سٹی کے کچھ علاقوں میں اگر جاتا تو اسے سمجھا دیا جاتا یا وہ خود جانتا تھا کہ جیب میں دس بیس ڈالر رکھنے ضروری ہیں۔ ورنہ اگر کوئی گن.... دکھا کر آپ سے مانگے اور آپ مسکین صورت بنا کر کہیں ”تلاشی لے لو، میرے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔“ تو آپ گئے زندگی سے۔ وہ چور گولی بھی مار سکتا ہے یا آپ کا جبڑا بھی توڑ سکتا ہے۔ اب بھی کچھ مخصوص علاقوں میں لوگ یا تو جاتے نہیں اور اگر کسی مجبوری سے چلے بھی جائیں تو کچھ نہ کچھ ڈالر دینے کے لیے اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔

انیس سو نوے کے اوائل تک نیویارک ڈرگ اور اسلحہ مافیا کا گڑھ تھا۔ ہر تین سیکنڈ میں ڈکیتی ہوتی تھی اور ہر دو سیکنڈ میں گاڑی چھینی جاتی تھی۔ سال میں ڈھائی تین ہزار قتل ہوتے تھے اور زیادہ تر گولی لگنے سے لوگ مرتے تھے۔ منشیات چوراہوں پر بکتی تھی۔ لوٹ مار کا بازار گرم تھا۔ میکسیکو کا پابلو اسکوبار اور اس جیسے کئی ڈان چیفس، ٹنوں کے حساب سے منشیات امریکا بھیجتے تھے۔ انہی مافیا چیفس کے مقامی گروہ اتنی طاقت پکڑ چکے تھے کہ پولیس بے بس ہوگئی تھی۔ دن میں دس کے قریب قتل ہوتے تھے اور آدھے ڈرگ ڈیلرز کی آپس کی لڑائی میں مارے جاتے۔ بہت سے ایسے بھی ہوتے جو کسی اندھی گولی کا نشانہ بن جاتے تھے۔ مینہٹن میں جسم فروشی تو اب بھی کھلے عام ہوتی ہے مگر ان دنوں ایک وبا بن گئی تھی۔ سڑک کنارے کھڑے کسی مسکراتے ہوئے بندے سے لوگ بات کرتے۔ وہ سامنے اشارہ کرتا اور کچھ چہرے میک اپ کی تہوں میں نمودار ہوتے۔ کوئی ٹیکسی میں بٹھا کر لے جاتا یا پھر وہ خود کچھ پیسے

لے کر آپ کو جگہ بھی مہیا کر دیتے۔

اگر مجرم پولیس کے ہاتھوں پکڑے جاتے تو جیلوں میں قتل ہو جاتے یا پھر وہاں ہی کسی کو مار دیتے۔ جیلوں میں بیٹھ کر یہ اپنے گینگ چلایا کرتے تھے۔ لوگ ان سے خوف زدہ ہوتے اور کوئی ان کے خلاف آواز بھی نہ اٹھا سکتا تھا۔ مافیا کے چیفس سیاست دانوں، ججوں اور حکومتی عہدے داروں کو ہاتھ میں رکھتے۔ کوئی ان کے آگے انکار نہ کر سکتا تھا۔ پڑھنے والوں کے لیے یہ باتیں انوکھی نہ ہوں کیونکہ یہاں یہ انہونی پاکستان میں بھی سالوں چلتی رہی۔ نیویارک میں مجرم سیاست میں تو نہ آئے تھے مگر سیاست کو اپنے گھر کی باندی بنا چکے تھے۔

اٹلی اور میکسیکو کے لوگ ان جرائم میں ملوث ہوتے تھے۔ ننگی فلمیں دکھانے کے چھوٹے چھوٹے اڈے بن گئے تھے۔ جرائم تو اب بھی ہیں مگر اس دور کی باتیں جب سنتے ہیں یا پڑھتے ہیں تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

پھر ایک شخص اس شہر کا میئر بنا۔ اناٹیلین نژاد گیانی نے اس شہر کا منظر بہت حد تک بدل کے رکھ دیا۔ 1994ء میں یہ میئر بنا اور 2001ء تک اسی عہدے پر رہا۔ اس نے جرائم پر قابو پانے کے لیے بہت سے جرائم پیشہ افراد کو پولیس میں بھرتی کر لیا اور انہی کے ہاتھوں دوسرے مجرموں کی بیخ کنی کی۔ یہ پولیس والے ساری وارداتیں اور ان کے طریقہ کار جانتے تھے اس لیے بہ آسانی انہی کے ہاتھوں مافیا گروہوں کا خاتمہ ہو گیا۔ میں نے ایک کتاب کا مطالعہ کیا جس میں بتایا گیا تھا کہ کس طرح ایک منظم پلان کے تحت یہاں جرائم میں کمی کی گئی تو میں دنگ رہ گیا۔ اگر نیت ہو تو حکومت کے پاس بہت وسائل ہوتے ہیں۔ قانون کی طاقت کے آگے کوئی سر نہیں ہلا سکتا۔ اس کا مظاہرہ نیویارک سٹی میں ملتا ہے۔ یہاں کے لوگ ایک طرح سے غلامی کے عادی ہو گئے تھے اور اب آزادی ملی ہے تو انہیں معلوم ہوا کہ امن کتنی بڑی نعمت ہے، وہ لوگ بدامنی کو اپنا نصیب سمجھ کر ان گینگ وار کے لوگوں کے آگے ہار مان کر انہیں اپنا نجات دہندہ مان چکے تھے۔

یہ سب معلومات میں نے بعد میں لیں اور جب ہم اس دن مین ہٹن میں گھوم رہے تھے تو طارق کی ایک وارننگ کے علاوہ میں کچھ زیادہ نہ جانتا تھا۔

اب ہم تینوں ذرا محتاط ہو چکے تھے۔ میں جب بھی کسی اور بڑے شہر کے ڈاؤن ٹاؤن میں گیا تو سیاحوں کے علاوہ کاروبار کرنے والے لوگ ایک ہی طرح یا نسل کے لگے، مگر مین ہٹن میں سیاح کے ساتھ ساتھ کام کرنے والے مختلف النسل لوگ تھے۔ فٹ پاتھوں پر ایک رش چل رہا تھا اور اوپر بلند عمارتوں نے اپنا سایہ کیا ہوا تھا۔ جس وقت سے میرے ہونٹوں سے ایک راہ گیر نے سگریٹ کھینچا تھا، اسی وقت سے ہمیں دھڑکا سا لگا تھا۔ کوئی تیزی سے ہمارے قریب سے بھی گزرتا تو ہم چونک جاتے۔ کسی کا کندھا بھی ہمیں چھوتا تو ہم دہل جاتے۔ کسی نے آہستہ سے اپنے آگے چلتے سرجی کو ہاتھ سے ایک جانب ہٹایا تو وہ اچھل کر رہ گئے۔ ان کے منہ سے خوف زدہ سی آوازیں نکلیں تو ہم دونوں ہنس پڑے۔ ہمیں ہنستا دیکھ کر وہ ناراض ہو کر بولے۔ ”وہ تو سمجھتے ہیں کہ ہم تو آٹے کا چراغ ہیں مگر آپ دونوں کیا اپنے آپ کو رستم ہند سمجھتے ہیں؟“

شہباز بولا۔ ”مٹی کا چراغ تو سنا تھا مگر آٹے کا چراغ کیا ہوتا ہے؟“

سرجی اکڑ گئے۔ ”میں نہیں بتاتا۔ مجھے اپنا استاد سمجھا ہوا ہے تو کوئی عزت و آبرو بھی تو ہونی چاہیے۔“

شہباز بولا۔ ”میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کی آبرو پر کبھی کوئی آنچ نہ آنے دوں گا، بس یہی بتا دیں کہ یہ چراغ کہاں سے ملتا ہے۔“

بولے۔ ”مطلب یہ تھا کہ ہم تو سہمے رہتے ہیں اور آپ کون سے ٹرمینیٹر ہیں۔“

ہمارے آس پاس دیسیوں کی دکانیں تھیں۔ کئی چھوٹی اور کئی بہت ہی چھوٹی دکانیں۔ فٹ پاتھ کے ساتھ بنے کاؤنٹر کے پیچھے یہ دیسی کھڑے اپنا سودا بیچتے تھے۔ ہر چوک میں ٹھیلے لگے تھے جہاں توؤں پر گرم روٹیاں اور تکے بن رہے تھے اور بک رہے تھے۔ حلال ہاٹ ڈاگ بھی دستیاب تھے۔ سنا تھا کہ شام سے پہلے کوئی پاکستانی بریانی بھی لگاتا ہے اور ایک گھنٹے میں اپنا سودا بیچ کر چلا جاتا ہے۔ ہمیں بھوک نہ تھی اور ارادہ یہ باندھ لیا کہ شام کا کھانا انہی ریڑھیوں سے کھائیں گے۔

پرفیوم کی دکانیں کچھ بڑی سائز کی تھیں۔ ہر برانڈ کا پرفیوم رکھا تھا۔ یہ دکانیں زیادہ تر بنگالیوں کی تھیں۔ مجھے حیرت ہوئی کہ جو پرفیوم کسی عام اسٹور پر اگر پچاس ڈالر کا ہے تو یہاں بیس یا پچیس کا مل رہا تھا۔ شہباز ایک پرفیوم کو ہاتھ میں لے کر کہنے لگا۔ ”نقلی ہوگا؟“

بنگالی دکاندار اردو میں بولا۔ ”اگر نقلی ہوا تو ایسے دس

پرفیوم کی قیمت ادا کروں گا۔“

اس کی سلیس اردو سن کر ہم شرمندہ ہو گئے۔ ہم لوگ تھوک کے حساب سے پرفیوم خریدتے ہیں اور ہم یہاں کم منافع پر بیچ کر اپنی روزی روٹی کما لیتے ہیں۔ ایک کھوکھے کا کرایہ بھی ہزاروں ڈالر میں ہے مگر یہاں اتنے زیادہ سیاح آتے ہیں کہ ان کو اتنے مہنگے کرائے ادا کرنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی۔ میں نے ایک زنانہ پرفیوم خرید لیا۔ شہباز اور سرجی پیچھے پڑ گئے کہ کس کے لیے خریدا ہے؟ میں انجان بنا رہا مگر آخرکار وہ صحیح اندازے پر پہنچے کہ نسرین کے لیے لیا ہوگا۔

دیسیوں کی زیادہ تر دکانیں گارمنٹس، مصنوعی جیولری، سوٹ کیس، بیگ اور اسی طرح کے سامان کی تھیں۔ کئی مقامات پر جہاں فٹ پاتھ چوڑے تھے، وہاں ریڑھیاں ایک لائن میں لگی تھیں اور دکاندار میکسیکو اور دیسی تھے۔ ہر ایک نے ایک ہی طرح کا سامان لگایا ہوا تھا جس میں زیادہ تر ٹی شرٹس اور ٹوپیاں، مفلر، سینڈل دستانے اور کچھ مختلف ضرورتوں کا سودا بیچا جا رہا تھا۔ ہم کسی نہ کسی ٹھیلے کے پاس رکتے، کچھ اٹھا کر دیکھتے اور دکان دار کے متوجہ ہونے پر کھسک لیتے۔

سیاہ فام لوگ فٹ پاتھ پر چادریں بچھا کر نئی نئی فلموں کی ڈی وی ڈیز بیچ رہے تھے۔ فلم سینما میں لگی تھی اور اس کی کاپی دو دو ڈالر میں بیچ رہے تھے۔ یہ دراصل سینما میں اپنے کیمرے سے شوٹ کرتے ہیں اور پھر اس کی کاپیاں تیار کر کے اگلے روز انہیں بیچنا شروع کر دیتے ہیں۔ ہم تینوں ایک چادر کے گرد کھڑے تھے جہاں کئی ایک ڈی وی ڈیز رکھی تھیں۔ بیچنے والا دراز قد سیاہ فام تھا۔ وہ دو ڈالر کی آوازیں لگا رہا تھا اور ساتھ ہی خوف زدہ نظروں سے اردگرد بھی دیکھے جا رہا تھا۔ کچھ آگے بھی اسی قسم کا کاروبار ہو رہا تھا۔ میں نے ایک ڈی وی ڈی اپنے ہاتھ میں پکڑی تھی کہ اچانک اس کالے نے میرے ہاتھ سے ڈی وی ڈی چھینی چادر پر پھینکی، پھر چادر کو لپیٹا اور دوڑ لگا دی۔ ہم تینوں حیران کھڑے تھے کہ اتنے میں دیکھا کہ سبھی یہی کاروبار کرنے والے اپنے تھیلے کندھے پر رکھے دوڑے چلے جا رہے ہیں۔ اتنے میں کچھ پولیس والے دوڑتے ہوئے آئے اور ہمارے پاس سے گزر کر ان کا پیچھا کرنے لگے۔ پھر یہ عقدہ کھلا کہ یہ کاپی رائٹ کی خلاف ورزی تھی۔ پورا دن یہاں بلی چوہے کا کھیل چلتا رہتا ہے۔

کچھ ہی دیر میں ہمیں معلوم ہو گیا کہ یہاں قانونی اور غیر قانونی کاروبار، دونوں ساتھ ساتھ چلتے رہتے ہیں۔ ہم چلتے ہوئے آگے آئے تو ایک سیاہ فام بوری میں کچھ چیزیں لیے کھڑا تھا۔ مجھے اس نے روکا اور بوری سے ایک ڈبا نکالا۔ ڈبے میں نیا ہیئر ڈرائر تھا۔ مجھ سے پانچ ڈالر پر بیچنا چاہتا تھا۔ مجھے اس کی ضرورت نہ تھی۔ میں نے انکار کیا تو وہ دو ڈالر پر آ گیا۔ مارکیٹ میں یہ پندرہ بیس ڈالر سے کم کا نہ تھا۔ بڑی مشکل سے اس سے جان چھڑائی۔ اب ہر چند قدم بعد اسی قسم کے لوگ آگے بڑھ کر ہمیں روک لیتے تھے۔

ایسی چیزیں یہ لوگ چرایا کرتے ہیں یا رات کو کوئی دکان توڑی اور مال غائب کر دیا۔ بعد کے سالوں میں یہ بھی دیکھا اور سنا کہ آپ کسی کو اپنی پسند کی چیز بتا دیں یا دکھا دیں تو ایک دو دن بعد آپ کو مل جاتی ہے اور یہ بھی سنا کہ کئی بار انڈر کور پولیس والے غیر قانونی اشیاء خریدنے والوں کو بھی پھنسا دیتے ہیں۔ اسی لیے پڑھنے والا یہ نہ سمجھے کہ چوری کی سستی چیزیں خریدنا تو فائدہ بخش سودا ہے۔ یہ جب وبال جان بنے تو پیچھا نہیں چھوڑتا۔

ایک ہجوم رواں تھا۔ شور ایسا مچا تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ ایک میلہ لگا تھا جس میں ہر ایک اکیلا نظر آتا تھا۔ سرجی اس ماحول سے خاصے متاثر نظر آ رہے تھے۔ کہنے لگے۔ ”یہ مقام تو ماشاء اللہ آدمی کا جنگل اور آدمی کا بن ہے۔“ یہ کہہ کے وہ مجھے پھنسا گئے۔ میں کیں تو بتایا۔ ”اس کا مطلب ہے بہت رونق والی جگہ۔ ماشاء اللہ۔“ پھر کہنے لگے۔ ”دل چاہتا ہے کہ اس رونق والی جگہ پر پورا دن گھومتا رہوں۔“

ابھی ان کا فقرہ ختم بھی نہ ہوا تھا کہ ایک فائر کی آواز آئی۔ ہم وہیں ٹھٹک گئے۔ چلتے لوگ ایک لمحے کو رکے۔ سب کی نظروں میں خوف اترا اور ہماری طرح سبھی چاروں جانب دیکھنے لگے۔ اسی اثناء میں لگاتار تین اور فائر گونجے اور پھر ایک بھگدڑ مچ گئی۔ جس کا جدھر منہ تھا وہ اسی جانب بھاگ کھڑا ہوا۔ ٹھیلوں والے اپنے ٹھیلوں کے پیچھے دبک گئے۔ ہم بھاگے اور ایک قریبی ریسٹورنٹ میں گھس گئے، جہاں اور بھی لوگ بھاگ کر داخل ہوئے تھے۔ ہم سب ہراساں تھے۔ شہباز کا سانس اکھڑ چکا تھا اور چہرہ زرد تھا۔ چہرے تو سبھی کے زرد تھے اور ہم خوف زدہ ہو کر ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے۔ ”کیا ہوا ہے؟“

جواب کسی کے پاس نہ تھا۔ ہم ریسٹورنٹ کے اندر جمع

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

تھے۔ ایک بھیڑ نے وہاں پناہ لی ہوئی تھی۔ پھر پولیس کی سائرن بجاتی گاڑیاں آگئیں۔ سائرنوں کی کان پڑی آواز متواتر سنائی دے رہی تھی۔ ایک دو لوگوں نے باہر جھانکنے کی کوشش کی مگر باہر کھڑے پولیس والوں نے انہیں اندر رہنے کا کہا۔ کوئی آدھ گھنٹے بعد کچھ لوگ باہر نکلے تو ہم بھی ساتھ باہر نکل آئے۔ کچھ دور سڑک کے پار ایک حصے کو پولیس نے زرد ٹیپ لگا کر بند کیا ہوا تھا۔ ہم نے کچھ جاننے کی کوشش بھی نہ کی کہ کیا ہوا ہے اور جس طرف سے آئے تھے، اسی جانب تیزی سے نکل گئے۔

یہ مینہٹن کا ایک اور روپ تھا جسے ہم نے اپنے سامنے عیاں ہوتے دیکھا تھا۔ یہاں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ 1973ء میں رابرٹ ڈی نیرو کی شہرہ آفاق فلم ٹیکسی ڈرائیور اسی مینہٹن میں شوٹ ہوئی تھی۔ مینہٹن کے ماحول کو اتنی خوب صورتی سے دکھایا گیا تھا کہ دیکھنے والا اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتا ہے۔ مینہٹن کو لکھنے سے پہلے میں نے وہ فلم دوبارہ دیکھی تو مجھے آج سے چالیس سال پہلے کا ماحول نظر آیا۔ جسم فروشی اور جرائم پر مافیا کا کنٹرول بڑی خوب صورتی سے دکھایا گیا ہے۔ اس سے پہلے گاڈ فادر پارٹ ون اور پارٹ ٹو دیکھ کر مجھے معلوم ہوا کہ کس طرح سے یہاں زندگی اور جرائم اکٹھے چل رہے تھے۔ ماریو پزو خود مینہٹن میں پیدا ہوا اور وہیں پلا بڑا۔ پھر اس نے گاڈ فادر لکھی تو ایک تہلکہ مچ گیا۔ اپچینو نے گاڈ فادر میں اپنا کردار ادا کر کے اپنے آپ کو امر کر لیا۔

ہم تینوں اب مینہٹن کے فٹ پاتھوں پر ذرا خاموش ہو کر چلنے لگے۔ ہمارے ساتھ ایک دو واقعات آگے پیچھے ہوگئے تو مجھے ایسا لگا تھا کہ یہاں کے سارے جرائم پیشہ ہماری ٹوہ میں لگ چکے ہیں۔ اب ہم خاصے چوکنے ہو کر چل رہے تھے۔ کوئی بھی انہونی ہو سکتی تھی۔ سرجی اب اپنی چوکڑیاں بھول چکے تھے۔ کہنے لگے۔ ”لگتا ہے نیویارک سے اپنا تو آب و دانہ اٹھ چکا ہے۔“

شہباز بولا۔ ”ندیم بھائی کو آوارہ گردی کا شوق ہے۔ ہماری جان کو بھی داؤ پر لگا دیا ہے۔“

جواب بھی سرجی نے دیا۔ ”ندیم بھائی کی مثال تو ایسے ہی ہے جیسے خدائی خوار، گدھے سوار۔“

گدھے کا نام سن کر شہباز کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا۔ ”یہ گدھا کس کو بولا؟“

سرجی کہنے لگے۔ ”میں کسی بھی جانور کا نام لوں تو آپ کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں۔ آپ کے Confidence کی تو داد دینی پڑے گی۔“

شہباز کی تسلی نہیں ہو رہی تھی۔ اب ہم فٹ پاتھ کے بیچ کھڑے تھے اور میرے ساتھ شہباز بھی سرجی سے ان کی کہی مثل کا مطلب پوچھ رہا تھا۔ سرجی اپنی مثالی ضد پر اڑ گئے۔ اتنے میں سڑک کے پار ایک بلند عمارت کے نیچے شیشوں کے آفس کے سامنے دو لڑکیاں سیاہ رنگ کا اسکرٹ پہنے ایک کالے سوٹ میں ملبوس اسمارٹ لڑکے کے ساتھ کچھ شوٹ کروا رہی تھیں۔ ایک کیمرا مین اور کچھ دوسرا اسٹاف انہیں ہدایات دے رہا تھا۔ ان تینوں نے کالے چشمے پہنے ہوئے تھے۔ سرجی اس جانب بھاگنے لگے تو شہباز نے کالر سے پکڑ کر انہیں کھینچ لیا۔ شہباز نے کہا۔ ”پہلے مطلب بتاؤ، پھر چھوڑوں گا۔“

یہ کہتے ہوئے وہ سڑک پار کرنے کے لیے بھاگے۔ ”اس کا مطلب ہے کہ آوارہ گرد ہمیشہ رسوا ہوتا ہے۔“

سرجی نے گاڑیوں کی پروا نہ کی جو سڑک پر چل رہی تھی۔ ایک دو ہارن بھی ان پر بجے مگر وہ پار کھڑے ہمیں بلا رہے تھے۔ ہم بھی سڑک کراس کر کے شوٹنگ کے مقام پر پہنچ گئے۔ سنہری بال، گورا رنگ اور دراز قد اداکار کبھی اپنا چشمہ اتارتا اور پھر خلاؤں میں دیکھتا اور لڑکیاں اس کے آگے پیچھے ایک خاص انداز سے چل رہی تھیں جیسے کسی ریمپ پر چل رہی ہوں۔ معلوم ہوا کہ وہ کسی اشتہاری فلم کی شوٹنگ ہے۔ آتے جاتے لوگ ان کی جانب متوجہ ہوئے بغیر گزر رہے تھے اور صرف ہم تینوں اس شوٹنگ سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ لڑکیاں ایسی ہی تھیں جیسے اشتہاری فلموں کی ہوتی ہیں۔ اسمارٹ، خوب صورت اور اس کے علاوہ بھی سب کچھ ان میں تھا۔ ڈائریکٹر سیاہ فام تھا اور بار بار ری ٹیک لے رہا تھا۔ ہم سرجی کو کھینچ رہے تھے مگر وہ اپنی جگہ چٹان کی طرح جمے، بار بار یہی کہے چلے جا رہے تھے۔ ”ماشاء اللہ! کتنی خوب صورت لڑکیاں ہیں۔ آفت کی پرکالہ لگ رہی ہیں۔“

مینہٹن کئی ایک چیزوں کے بارے میں مشہور ہے۔ وال اسٹریٹ، دنیا کا سب سے بڑا بزنس کا مرکز یہیں ہے۔ اقوام متحدہ کے دفاتر یہیں ہیں جو مجھے طارق دکھلا چکا تھا۔ مینہٹن میں دنیا کی بڑی بڑی ملٹی بلین کمپنیوں کے دفاتر ہیں اور پھر فلم انڈسٹری میں کام کے خواہش مند یہاں اپنے ڈیرے لگاتے ہیں۔ کوئی کمرا کرائے پر لے کر ہر روز کسی اشتہاری کمپنی کے چکر لگاتے ہیں۔ کسی فیشن میگزین کے دفتر

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

میں کسی سے مل رہے ہوتے ہیں۔ کوئی کسی فوٹوگرافر کو گھیرے بیٹھا ہوتا ہے۔ کئی لوگ اپنی ڈاکومینٹری فلمیں بنا کر کسی ٹی وی چینل کے دفتر کے چکر لگاتے ہیں۔ پھر انہی میں سے کوئی کلک کر گیا تو راتوں رات اسٹار بن جاتا ہے۔ ہالی ووڈ جانے کے راستے مینہٹن سے کھلتے ہیں۔ کئی بڑے بڑے اداکار سالوں مینہٹن کی خاک چھانتے رہے اور آج ان کا ڈنکا پوری دنیا میں بج رہا ہے۔ یہ ایک علیحدہ موضوع ہے جسے میں یہاں بیان کرنے سے قاصر ہوں۔

چھٹی کا وقت ہوا چاہتا تھا اور یہ ہمیں ایسے معلوم ہوا کہ عمارتوں سے لمبے کالے کوٹ پہنے لوگ، اپنے ہاتھوں میں بریف کیس تھامے نکل رہے تھے۔ خواتین بھی دفتری لباس میں نکل کر سب وے کی جانب بھاگی چلی جارہی تھیں۔ ہم بھی فٹ پاتھ پر انہی سے بچ بچا کر یا پھر کسی سے "ٹکرا" کر یہ رونق میلہ دیکھ رہے تھے۔ ہمارے علاوہ ہر کوئی جلدی میں تھا۔ ہم بھی خوش تھے کہ پچھلے دو گھنٹے سے کوئی واقعہ رونما نہ ہوا تھا۔

ہم ایک چوک میں کھڑے تھے۔ سیاحوں کے ہجوم سڑک پار کر رہے تھے۔ ہر ایک اپنی موج مستی میں تھا۔ ہم بھی ماحول کے رنگ میں رنگے گھوم پھر رہے تھے کہ اتنے میں ایک بوڑھا آدمی جس کے بال بکھرے تھے، آنکھوں میں وحشت تھی۔ میلی پینٹ پر میلی جیکٹ پہنی ہوئی تھی۔ ایک پرانا بیگ اپنے کندھے سے لٹکائے میرے سامنے آ کھڑا ہوا۔ میں نے اس سے بچ کر نکلنا چاہا تو وہ کھسک کر پھر میرے سامنے آ گیا۔ سرجی اور شہباز میرے قریب ہی فق زدہ چہرے لیے کھڑے یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ اس سے پہلے میں دوڑ پڑتا کہ اس نے التجائی انداز میں کہا۔ "کیا آپ لکھ سکتے ہیں؟"

شہباز نے مجھے متنبہ کیا۔ "جان چھڑاؤ اور نکلو۔ یہ کوئی نیا سیاپا ڈالے گا۔" میں نے کنی کترا کر نکلنا چاہا تو اس نے میرا بازو تھام لیا۔

اب وہ مضبوطی سے پکڑے یہی کہے جارہا تھا۔ "کیا آپ لکھ سکتے ہیں؟"

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا تو مجھے بے بسی نظر آئی۔ اس کی آنکھیں ایسے تھیں کہ جیسے مجھے مدد کے لیے پکار رہی ہوں۔ وہ ویران کھنڈرات تھے جو مجھے تکے جارہے تھے۔ میں چاہتے ہوئے بھی اپنا بازو نہ چھڑا سکا۔ اس کے چہرے پر جو کرب اور اذیت تھی وہ مجھے مارے جارہی تھی۔

ہم فٹ پاتھ کے بیچ لوگوں کا راستہ روکے کھڑے تھے۔ میں اسے لیے سائیڈ پر ایک بلند عمارت کے ستون تلے آ کھڑا ہوا۔ وہ متواتر ایک ہی بات کہے چلا جارہا تھا۔ "کیا آپ لکھ سکتے ہیں؟"

میں نے جواب دیا۔ "ہاں میں لکھ سکتا ہوں۔"

یہ سن کر اس نے میرا بازو چھوڑا اور کہنے لگا۔ "مجھے اپنی بیٹی کو خط لکھنا ہے لیکن میں لکھنا نہیں جانتا۔" پھر گڑگڑا کر بولا۔ "میری مدد کرو۔ گاڈ کی رحمت تم پر نازل ہوگی۔"

اب میں الجھن میں تھا کہ یہ کیا لکھوانا چاہتا ہے اور اتنا مجبور اور لاچار کیوں ہے۔ پھر میں نے اس سے پوچھا۔ "ٹھیک ہے میں لکھ دیتا ہوں۔ کاغذ اور پین ہے؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ اب شہباز کی طرح سرجی بھی مجھے گھور رہے تھے۔ میں نے ان کی کوئی پروا نہ کی۔ میں ستون سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور وہ بھی میرے ساتھ بیٹھا مسلسل کچھ بولے جارہا تھا۔ اس کے کپڑوں سے عجیب سی بدبو آرہی تھی۔ میں نے اپنے بیک پیک سے اپنی ڈائری نکالی، دو صفحے پھاڑے اور انہیں ڈائری پر رکھا اور پھر پین نکال کر اس سے کہا۔ "اب بتاؤ کس کو اور کیا لکھنا ہے۔"

وہ اور زیادہ میرے قریب کھسک آیا اور اب سرگوشی میں خط لکھوانے لگا۔

"میری پیاری بیٹی کیتھی۔ جب سے تم گئی ہو، اسی دن سے تمہیں ڈھونڈ رہا ہوں۔ تم کو جانے سے پہلے یہ تو سوچنا چاہیے تھا کہ میں تمہارے بغیر کیسے رہ سکوں گا۔ تم تو اتنے چپکے سے چلی گئیں کہ مجھے پتا ہی نہ چل سکا۔ تمہیں تو معلوم تھا کہ تمہاری جدائی میں میرا کیا حال ہوگا مگر تم پھر بھی اپنے باپ کو اکیلا چھوڑ گئیں میری پیاری بیٹی! تمہیں تو یہ بھی معلوم نہیں کہ جب تمہاری ماں مری تھی تو میں نے کس طرح تمہیں پالا تھا۔ تمہیں اسکول چھوڑنے جاتا۔ تمہارا کھانا میں تیار کرتا تھا۔ تمہارے کپڑے میں اپنے ہاتھوں سے خود دھوتا۔ ہر صبح میں تمہیں تیار کرتا۔ تمہارا ہنستا چہرہ دیکھ کر میں بھی خوش ہو جاتا۔ تم جب اداس ہوتیں تو میں بھی اداس ہو جاتا۔ میں نے اپنی زندگی تم کو دے دی تھی مگر میری پیاری بیٹی! پھر بھی تم اپنے باپ کو تنہا کر گئی۔ تمہیں یاد ہے کہ جب تم نے اسکول سے گریجویشن کی تھی۔ ہم دونوں کتنے خوش تھے۔ اس رات ہم نے ڈنر بھی باہر کیا تھا۔ تمہارے نمبر اچھے تھے اور تمہیں کولمبیا یونیورسٹی جانے کا شوق تھا۔ میرے پاس اتنے پیسے نہ تھے کہ میں تمہاری فیس دے سکتا۔ پھر میں نے اپنا فلیٹ بیچ

ڈالا کہ میری بیٹی کے خواب پورے ہوں۔ تم نے مجھ سے کہا تھا کہ آپ جیسا باپ دنیا میں کسی بیٹی کا نہ ہوگا لیکن میری پیاری بیٹی پھر بھی تم اپنے باپ کو اکیلے چھوڑ کر چلی گئیں۔ تم کو وہ دن یاد ہے جب یونیورسٹی کے دوسرے سمسٹر میں تم نے بہت اچھے گریڈ لیے تھے۔ تمہاری کونسلر نے مجھے بلایا تھا کہ یہ لڑکی بزنس مینجمنٹ میں بہت آگے جائے گی۔ یاد ہے میں رو پڑا تھا اور تم نے اپنے ہاتھوں سے میرے آنسو صاف کیے تھے۔ یاد ہے جب تم میرے آنسو صاف کر رہی تھیں تو میں زیادہ رو پڑا تھا۔ تم نے پوچھا تھا کہ میں کیوں رو رہا ہوں، پر میں نے تمہیں یہ نہیں بتایا تھا کہ مجھے تمہاری ماں یاد آ رہی تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ تم بھی میری طرح اداس ہو جاؤ۔ میری پیاری بیٹی میں کس طرح سے تمہارا خیال کرتا تھا پھر بھی تم مجھے چھوڑ کر چلی گئیں؟ میری پیاری بیٹی! آپ باپ کو تنہا مت کرو یا تم میرے پاس آ جاؤ یا مجھے اپنے پاس بلوالو۔ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ تمہارا باپ بوڑھا ہو گیا ہے۔ تھک گیا ہے تمہیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے۔ مجھ پر ترس کھا کر واپس آ جاؤ۔''

اس بوڑھے نے مجھ سے اور بھی بہت کچھ لکھوایا مگر باتیں یہی تھیں۔ وہ اپنے الفاظوں کو دہرا رہا تھا۔ میرے دونوں دوست اس کی باتیں ایک سکتے کی کیفیت میں میری طرح سن رہے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس کی بیٹی کتنی خود غرض ہے کہ اپنے اتنے شفیق باپ کو چھوڑ کر چلی گئی۔ میں مغرب کی مادہ پرستی کو دل میں کوس رہا تھا، جہاں بچے جیسے ہی خود مختار ہوتے ہیں تو ماں باپ کو چھوڑ کر اپنی زندگی اپنے ڈھنگ سے گزارنے لگتے ہیں۔ مجھے مغرب سے نفرت محسوس ہو رہی تھی۔ مجھے گھن آنے لگی۔ خط ختم ہو چکا تھا مگر وہ بوڑھا اپنی الجھی آنکھوں اور لڑکھڑاتی زبان سے بولے چلا جا رہا تھا۔ پھر میں نے خط اس کے حوالے کیا۔ اس نے تشکر بھری نم آنکھوں سے وہ خط لیا۔ اپنے بوسیدہ بیگ کو کھولا۔ اس کے اندر ہاتھ ڈال کر بہت سے پھٹے پرانے کاغذ نکالے۔ اور مجھ سے لکھوایا خط اس میں شامل کر کے وہ تمام کاغذ دوبارہ بیگ میں ڈالے۔ زپ لگائی اور میرا شکریہ ادا کیا۔

میں نے پوچھا۔ ''اس کو پوسٹ نہیں کرتا؟''

وہ خاموش رہا۔

میں نے پوچھا۔ ''کیا اس کا ایڈریس ہے؟''

وہ پھٹی پھٹی نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے پوچھا۔ ''تمہاری بیٹی کس اسٹیٹ میں ہے؟''

اس کی آنکھوں میں پانی تیرنے لگا۔ وہ اٹھا، اپنا بیگ کاندھے پر رکھا اور یہ کہتا ہوا چل پڑا۔ ''وہ مر گئی ہے۔'' پھر وہ ہجوم کی نذر ہو گیا۔ وہ بہت سے راہگیروں سے ایسے معلوم نہیں کتنے خط لکھوا چکا تھا اور سب کے لکھے خط اپنے بیگ میں ڈال کر جمع کرتا رہتا تھا۔

وہ جا چکا تھا اور میں اسی پتھر کے ستون کے ساتھ پتھر بن چکا تھا۔ میرے دوست دیوار سے ٹیک لگائے خاموش بیٹھے تھے۔ میں دکھ میں دہک رہا تھا۔ مجھے اپنی بیٹی قندیل یاد آنے لگی تو میں رو پڑا۔ مجھے چپ کرانے والے میرے ساتھ تھے۔ میری بیٹی سلامت تھی۔ میں تو اس سے دوری پر رویا تھا۔ وہ تو اپنی بیٹی کے کئی لاشے اپنے بیگ میں رکھے منہٹن کی سڑکوں پر اپنے آپ کو گھسیٹ رہا تھا۔ وہ بھی ایک دن مر جاتا یا کسی گاڑی کے نیچے آ کر کچلا جاتا اور پھر سٹی والے اس کی کئی لاشوں کو تابوت میں بند کر کے کہیں گاڑ آتے اور ساتھ ایک داستان بھی دفن ہو جاتی۔

وہ چلا گیا اور اس جیسے بہت سے لوگ نظر آنے لگے۔ پھر میں نے اس قسم کے مختلف کردار اپنے اردگرد دیکھے جو اپنے مسائل اور مصائب میں گھرے مجھے چلتے پھرتے نظر آئے۔ شام ہوتے ہی منہٹن ایک نیا رنگ و روپ دھر لیتا ہے۔ نفسیاتی مریض اپنے پھٹے پرانے اور بوسیدہ کپڑوں میں نظر آتے ہیں۔ یہ بے گھر لوگ ہوتے ہیں۔ رات سڑک کنارے کہیں نہ کہیں بسر کرتے ہیں۔ دن میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ ایک ایسا شخص ملا جو روک روک کر کہتا تھا ''کوئی ہے جو میری جان بچائے۔''

جب کوئی رک کر پوچھتا تو کہتا تھا۔ ''کیا مجھے ایک برگر بھوک مٹانے کے لیے دلا سکتے ہو۔''

ایسے لوگوں کو دیکھ کر یقین نہیں آتا تھا کہ میں دنیا کے امیر ترین ملک کے سب سے بڑے شہر کے سب سے بڑے اور امیر علاقے میں گھوم رہا ہوں۔ ایک جانب چمکتی دمکتی زندگی تھی اور ساتھ ساتھ غربت اور مفلسی بھی چل رہی تھی۔

منہٹن میں میرا تیسرا دن تھا اور تین دنوں نے مجھے عجیب و غریب تجربات سے روشناس کیا تھا۔

میں اٹھا تو خاموش تھا۔ میرے دوست میرا دل بہلانے لگے۔ سرجی مجھے خوش کرنے کے لیے عجیب و غریب حرکتیں کر رہے تھے۔ میں بھی مسکرا دیا۔ میرا ورد پھر منہٹن

کے شور شرابے میں کہیں دفن ہو گیا اور زندگی ہمیشہ کی طرح اپنے معمول کے مطابق چل پڑی۔

اب شام اتر آئی تھی۔ عمارتیں جگمگا رہی تھیں۔ شور اتنا تھا کہ کانوں پڑی آواز بھی سنائی نہ دیتی تھی۔ سردی تھی مگر ستاتی نہ تھی۔ سرجی بولے۔ ''بھوک لگ رہی ہے۔ کچھ اہتمام ہونا چاہیے؟''

شہباز بھی بھوک سے تلملا رہا تھا۔ رات کی سیاہی اس بے تحاشا روشنیوں کے سامنے بے بس نظر آتی تھی۔ ہم اب ٹائم اسکوائر کے اردگرد کہیں تھے۔ ہمیں فٹ پاتھوں پر ٹھیلے لگے نظر آرہے تھے اور ٹورسٹ کھڑے کچھ نہ کچھ کھا رہے تھے۔ کئی ایک ٹھیلوں پر حلال لکھا تھا۔ کچھ پاکستانی بھی اپنے ٹھیلے لگائے کھڑے تھے۔ کچھ یمنی تھے اور کچھ البانوی بھی حلال بیچ رہے تھے۔

ہم ایک یمنی کے ٹھیلے پر رکے۔ وہاں بڑے بڑے حروف میں حلال لکھا تھا۔ ایک شخص توے پر گوشت فرائی کرتا اور روٹیاں اسی پر گرم کر رہا تھا۔ گوشت کو روٹیوں پر ڈالتا اور ساتھ کچھ سلاد اور چٹنی ڈال کر ان روٹیوں کو لپیٹ دیتا۔ چار ڈالر میں ڈنر تیار ہو جاتا۔ میں نے حلال کا پوچھا اور سرجی نے حلال کو سونگھا۔ سب کی تسلی ہوئی تو ہم نے تین ڈنر آرڈر کیے اور وہیں ساتھ ایک عمارت کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئے۔ یہاں ایسے محسوس ہو رہا تھا کہ پاکستان کے کسی شہر میں فٹ پاتھ کا کھانا کھا رہے ہوں۔ مجھے کسی ہوٹل میں بیٹھنے سے یہی بہتر لگتا تھا کہ ٹھیلوں پر سے کھانا کھاؤں۔ اس طرح سے مختلف قسم کے لوگوں کو دیکھنے کا مشاہدہ ہوتا ہے اور ساتھ ایک نئے ماحول اور فضا میں بیٹھ کر کھانا بھی ایک دلچسپ تجربہ ہوتا ہے۔ ہم سیڑھیوں پر بیٹھے تھے اور ہمارے سامنے لوگوں کے غول گزر رہے تھے۔ ریڑھی والے نے ہمارے ہاتھوں پر کسی فقیر کی خیرات کی طرح دو روٹیاں اور اس پر رکھا فرائی گوشت رکھ دیا۔ ساتھ ہم نے کوک کے ٹن پیک بھی منگوا لیے۔ اب نیویارک کے ڈاؤن ٹاؤن کے قدرے اندھیرے فٹ پاتھ کی سیڑھیوں پر ہم بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ کھانا اتنا لذیذ تھا کہ ہم کھاتے ہوئے اس کی تعریفیں بھی کرتے جا رہے تھے۔

یہاں مختلف ملکوں اور خطوں کے لوگ اپنے ٹھیلے لگاتے ہیں۔ ان کو فوڈ کارٹ بولا جاتا ہے۔ میکسیکو، اٹالین کے علاوہ حلال کارٹس بھی بہت زیادہ تعداد میں ہیں۔ حلال کارٹس پر غیر ملکی سیاحوں کی لائنیں لگی ہوتی ہیں۔ ان کو شاید یہ معلوم نہ ہو کہ حلال سے مقصد مسلمانوں کی حلال فوڈ ہے۔ یہ لوگ اسے کوئی برانڈ سمجھتے ہیں۔ اکثر حلال کارٹس کا کھانا بہت لذیذ ہوتا ہے۔ گوروں کو اس لیے بھی پسند آتا ہے کیونکہ اس میں مرچیں ذرا تیز ہوتی ہیں۔ غیر ملکی گورے یہ سمجھتے ہیں کہ حلال فوڈ کسی چینی فوڈ کا نام ہے جس طرح کے ایف سی ہے۔ کھانا تازہ، سستا اور مزیدار ہوتا ہے۔ بہت سے گورے بریانی بریانی کرتے اس کی کارٹس ڈھونڈ رہے ہوتے ہیں۔ بہت سی باتیں مجھے آئندہ کے نیویارک کے ٹرپس سے معلوم ہوئیں۔ میں پانچ چھ بار بعد میں یہاں آیا۔ ٹائم اسکوائر کے مہنگے میریٹ میں ٹھہرا اور انٹر کانٹی نینٹل میں بھی رہا مگر اکثر کھانا انہی کارٹس سے کھاتا تھا۔ اسی طرح معلوم ہوا کہ سینکڑوں ٹورسٹ حلال فوڈ کے لیے سکس اونیو کی جانب چلے آتے ہیں۔ اب تو ہم سردیوں میں آئے تھے۔ پھر میں مختلف موسموں میں آیا لیکن جو رش گرمیوں میں دیکھا وہ سردیوں میں نظر نہ آیا۔ آدمی پر آدمی گر رہا ہوتا۔ ہزاروں ٹورسٹ گھومتے پھرتے نظر آتے۔ وہ سیاحتی بسوں میں بیٹھے ڈاؤن ٹاؤن کے نظارے کر رہے ہوتے اور جب بھوک لگتی تو حلال کارٹس کی جانب لپکتے ہیں۔

ہم کھانا کھا کر نڈھال ہو چکے تھے۔ شہباز اور سرجی ست پڑتے نظر آرہے تھے۔ رات کے دس بج رہے تھے۔ میں نے پوچھا۔ ''اب کیا پروگرام ہے؟ کہاں جانا ہے؟''

شہباز بولا۔ ''تھک گئے ہیں، ہوٹل چلتے ہیں اور راستے میں ٹائم اسکوائر کی رونق بھی دیکھ لیں گے۔''

سرجی بولے۔ ''جو آپ کا پوگرام (پروگرام) ہوگا وہی میرا ہوگا۔''

بھرے پیٹ میں دونوں سعادت مند بن چکے تھے۔ جب میں نے کہا۔ ''ریڈ ایریا نہیں دیکھنا؟''

سرجی فوراً بولے۔ ''یہی تو کہہ رہا تھا۔ وہاں کا چکر لگانا ضروری ہے۔''

شہباز نے بھی ہاں میں ہاں ملائی اور بولا۔ ''ایک بار جانے سے گناہ بھی نہیں ہوتا، بار بار جانا گناہ ہوتا ہے۔''

میں ان دنوں گناہ اور ثواب کا نہیں سوچ رہا تھا۔ اس پر بہت کم غور کرتا تھا۔ اس لیے میں ان کے ساتھ جانے پر تیار ہو گیا۔ یوں بھی مجھے ایک بار وہ جگہ اس لیے دیکھنی تھی کہ اگر کبھی سفرنامہ لکھوں تو کچھ مشاہدہ تو میرے پاس آنکھوں دیکھا ہو۔

میں نے انہیں چھیڑتے ہوئے کہا۔ ''اگر نہیں چلنا تو

URDUSOFTBOOKS.COM
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

ہوٹل چلتے ہیں۔"

سرجی جل کر بولے۔ "ندیم تو آنکھوں کا اندھا ہے اور نام رکھا ہے نین سکھ۔"

اب میں نے سرجی کو گردن سے پکڑ لیا اور کہا۔ "تب تک نہ چھوڑوں گا جب تک اس کا مطلب نہیں بتاؤ گے۔"

کہنے لگے۔ "اس کا مطلب ہے کہ بہت باکردار انسان ہے۔"

شہباز نے بھی ان کے بازو مروڑ لیے اور کہا۔ "سرجی جھوٹ بول رہے ہو، سچ سچ بتاؤ؟"

سرجی اٹک اٹک کر بولے۔ "میں تو مذاق کر رہا تھا اس کہاوت کا مطلب ...... دراصل ہے تو بے شرم مگر اپنے آپ کو باکردار پیش کرتا ہے۔"

میں نے گردن چھوڑ دی۔ دراصل وہ کوئی جھوٹ بھی نہیں کہہ رہے تھے مگر ایسا بھی نہ تھا کہ وہ مکمل سچ بول رہے تھے۔ میں بھی دراصل ان کے کندھے پر بندوق رکھ کر چلانا چاہتا تھا لیکن سرجی نے تاڑ لیا تھا کیونکہ مجھے وہاں کے ماحول اور لوگوں کا مشاہدہ کرنا تھا۔

دنیا کے ہر بڑے شہر میں ایک ریڈ لائٹ ایریا ضرور ہوتا ہے، جہاں شرفا جانے سے گھبراتے ہیں۔ شہر کی ایک جگہ مخصوص ہوتی ہے جہاں رات کو زندگی جاگتی ہے۔ مینہٹن میں مرے ہلز اور مڈٹاؤن کا علاقہ تو سو سال سے اسی لیے مشہور ہے۔ ٹائم اسکوائر کی رنگینیوں کے باہر، رات کو یہ دھندا شروع ہو جاتا ہے۔ ہم تینوں کے قدم انہی علاقوں کی جانب رواں تھے۔ سرجی کو تو جیسے پر لگ گئے تھے اور ہم سے دس قدم آگے بھاگے جا رہے تھے۔ یہ نہیں کہ وہ کسی غرض سے جا رہے تھے۔ انہیں بھی میری طرح نیویارک کا یہ رخ دیکھنے کا اشتیاق تھا۔

میں جان بوجھ کر ان اسٹریٹ اور اوینو کا نام نہیں لکھ رہا جہاں یہ کاروبار چلتا ہے مگر ہم اب اسی کے آس پاس کھڑے تھے۔ میں نے اپنے ساتھ ان دونوں کو متنبہ کر دیا تھا کہ کسی کے اشارے پر نہ تو رکنا ہے اور نہ ہی کوئی بات کرنی ہے۔ بس ایک نظر دیکھ کر آگے بڑھتے جانا ہے۔ ہر رنگ اور نسل کی اسکارٹ چوکوں اور فٹ پاتھوں پر کھڑی تھیں۔ یہ دور ہی سے پہچانی جاتی تھیں۔ لمبے اور اونچی ایڑی کے شوز، چھوٹا سا اسکرٹ اور ٹانگوں پر اسکن ٹائٹ تھرمل چڑھائے سب سے بے نیاز کھڑی تھیں۔ گہرا میک اپ اور سر پر کسی نے کیپ رکھی تھی اور کسی نے وگ چڑھا رکھی تھی۔

وہ غولوں کی صورت میں کھڑی تھیں۔ ہر ایک کے ہاتھ میں سگریٹ تھا۔ گہرا میک اپ اور آنکھوں میں وحشت تھی۔ بیس سے ساٹھ سال کی عمر کو پہنچتی خواتین مصنوعی مسکراہٹ سجائے کھڑی نظر آ رہی تھیں۔ کوئی دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ کوئی کسی چبوترے پر بیٹھی گاہک کا انتظار کر رہی تھی۔ بے رنگ اور بے رونق چہروں پر کوئی خوشی نہ تھی۔ اکثر آنکھیں کھلی اور بے تاثر تھیں۔ کبھی کوئی گاڑی یا کیب کسی کے قریب آ رکتی۔ دروازہ کھلتا، کسی کو اشارہ ملتا اور وہ گاڑی میں پُرامید ہو کر بیٹھ جاتی پھر گاڑی فراٹے بھرتی نکل جاتی۔

میں حیرت اور صدمے سے دوچار یہ مناظر دیکھ رہا تھا۔ میں کوئی فلاسفر یا دانش ور نہ تھا جو ان کی سائیکی پڑھنے آیا تھا۔ مجھے ان سے گھن نہیں آ رہی تھی بلکہ ترس آ رہا تھا۔ کئی ایک مرد کھڑے تھے جو ہمیں البم دکھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ سرجی کہنے لگے۔ "یہ لڑکیاں کس بے شرمی سے اپنی آبرو بیچ رہی ہیں۔"

میں نے سرجی کو کوئی جواب نہ دیا۔ شہباز ایک جگہ رک کر ایک خوب صورت لڑکی کو دیکھنے لگا جو دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ شہباز کو رکتا دیکھا تو اُمید بھری نظروں سے اس کی جانب دیکھنے لگی۔ سرجی شہباز سے بولے۔ "یہ حرکتیں مت کرو۔ آبرو جا کے نہیں آتی۔"

ہم اس طرح ڈیپرس تھے کہ سرجی سے ان کے محاوروں کے مطلب بھی نہیں پوچھ سکے۔

میں نے بعد میں ریڈ ایریا کے بارے میں بہت مطالعہ کیا تاکہ آپ تک مستند معلومات پہنچا سکوں۔ کئی ایک تو اپنے طور پر دھندا کرتی ہیں۔ ہائی کلاس اسکارٹ کمپنیوں کی ملازم ہوتی ہیں۔ ضرورت مند ان کمپنیوں کو فون کرتے ہیں اور جہاں جانا ہو وہیں پہنچا دیتے ہیں۔ زیادہ تر دن میں کسی ریسٹورنٹ یا ریٹیل شاپ پر کام کرتی ہیں۔ اکثر دوسری اسٹیٹس سے آ کر نیویارک کو اپنا مسکن بنا لیتی ہیں۔ زیادہ تر اسکول یا کالج سے گریجویٹ ہوتی ہیں۔ اکثر ہیروئن کے نشے کی عادی بن جاتی ہیں اور پھر اپنے نشے کا خرچا پورا کرنے کے لیے آتے جاتے لوگوں کو سوالیہ نظروں سے دیکھتی ہیں۔ جب عمر ڈھل جاتی ہے تو پھر عبرت کا نشان بنی کھڑی رہ جاتی ہیں۔ چہرہ جھریوں سے بھر جاتا ہے، جس پر میک اپ بھی نہیں ٹکتا۔ ہائی اسکارٹ رکھنے والی کمپنیاں زیادہ چارج کرتی ہیں اور ساتھ میں ایڈز سے پاک ہونے کا سرٹیفکیٹ بھی مہیا کرتی ہیں۔ اپنے کلائنٹ کو انٹرٹینمنٹ کی

رسید بھی دیتی ہیں اور وہ کلائنٹ اسے سفری خرچوں میں ڈال کر ٹیکس کی چھوٹ لے لیتا ہے۔ یہ بھی سنا ہے کہ اکثر کمپنیاں ایڈز کا غلط سرٹیفکیٹ بھی دے دیتی ہیں۔ ایڈز کی میڈیسن بنانے والی بڑی بڑی فارما انڈسٹری ان کمپنیوں کی پشت پر ہوتی ہیں۔

ایک بڑی عمر کی جسم فروش عورت کا میں انٹرویو پڑھ رہا تھا کہ وہ اگلی کرسمس پارٹی کے لیے پیسے اس طریقے سے جمع کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ بتا رہی تھی کہ پچھلی بار میرے بچے کرسمس کی پارٹی نہیں منا سکے تھے۔ ایک بندے نے اپنے تاثرات بتائے کہ میں آج بھی بہت شرمندگی محسوس کر رہا ہوں کہ سینٹرل پارک میں ایک بوڑھی خاتون میرے پاس آئی۔ میں۔۔۔ بزرگ سمجھ کر پیش آیا۔ وہ کہنے لگی کہ دس ڈالر مجھے دو اور میرے اپارٹمنٹ چلو۔ وہ کہہ رہا تھا کہ میں نے طیش میں آ کر اس کی خوب بے عزتی کی۔

جب میں اس کو بے عزت کر رہا تھا تو دنیا کے تمام دکھ اس کی آنکھوں میں سمٹ آئے تھے۔ اس کی آنکھیں گیلی ہو گئیں اور وہ خاموشی سے سر جھکا کر چلی گئی۔

وہ شخص بتا رہا تھا کہ مجھے رنج اس بات کا ہے کہ میں نے اس کو دس ڈالر ایسے ہی کیوں نہ دے دیے؟ سٹی بینک کے ایک بڑے عہدے پر فائز ملازم نے اپنی جاب کو خیر آباد کہہ دیا اور ان کی دکھوں بھری کہانیوں کی تلاش میں برونکس کے علاقے میں اپنا کیمرا لیے ہر وقت گھومتا رہتا تھا۔ اس نے کئی ایک کہانیاں ڈھونڈ لیں۔ برونکس میں ستم زدہ ان غریب عورتوں کو دس ڈالر دے کر ان کی تصویر لیتا اور ان کے گھر یا کباڑ خانے جاتا رہا۔ ان عورتوں کی حالت زار دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ویران اور برباد چہرے، آنکھوں میں گہری اداسیاں، سب ہی نشے کی لت میں مبتلا تھیں۔ اکثر کو ایڈز لگ چکی تھی اور علاج کوئی نہ تھا۔ گھر کیا تھا کہ دیکھ کر رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔ ٹوٹا پھوٹا کمرا، زمین پر بچھا میٹرس۔ ساتھ میں کوئی ایک پرانی سی ڈریسنگ ٹیبل اور ان پر سجایا گیا میک اپ کا بوسیدہ سامان۔ اپنے آپ کو سجانے کی ناکام کوشش میں یہ لڑکیاں اور عورتیں جیسے اب مدد کے لیے کسی کو پکار رہی ہوں۔ جسم تھک کر ہار چکے تھے اور انہیں معلوم تھا کہ اب یہاں کوئی نہیں آئے گا۔ اک بے بسی اور لاچارگی ان کی آنکھوں سے جھلکتی تھی۔

ساحر لدھیانوی نے کہا تھا

یہ کوچے یہ نیلام گھر دلکشی کے
یہ لٹتے ہوئے کارواں زندگی کے
کہاں ہیں کہاں ہیں محافظ خودی کے
ثناخوان تقدیس مشرق کہاں ہیں؟

یہاں تقدیس تو مشرق کی ہے مگر میں نے دکھ درد مغرب کا دیکھا تھا۔ عورت تو ماں ہے، بہن ہے، بیٹی ہے اور پھر شریک حیات ہے مگر میں ان کو آج کیا نام دوں؟ کون سا رشتہ ان کے لیے بچ گیا ہے؟ میں نے انہیں خوشی خوشی بکتے بھی دیکھا اور گھٹ گھٹ کر مرتے بھی۔ ان میں بہت سی ایسی تھیں جنہیں کم عمری میں درندگی کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ بہت سی تو نہ چاہتے ہوئے بھی اس راستے پر چل نکلی تھیں۔ یہاں جو ایک بار آ گیا تو تمام عمر کے لیے قید ہو گیا۔

بالی ووڈ میں اس موضوع پر کئی ایک لاجواب فلمیں بنی ہیں۔ جولیا رابرٹس کی "پریٹی وومن" اپنی کلاس کی شاندار فلم تھی اور بھی کئی فلمیں بنیں۔ اگر میں ان فلموں کو لے کر بیٹھ جاؤں تو اپنے سفرنامے سے ہٹ جاؤں گا۔ یہ ایک دردناک موضوع ہے اور اگر ایک بار مجھ سے چھڑ گیا تو کئی صفحے کالے ہو جائیں گے اور میری بات ختم نہ ہوگی۔ اسی لیے سرجی کی طرف چلتے ہیں جو اپنی نادانی میں ایک لڑکی کے چنگل میں پھنسے کھڑے ہمیں مدد کے لیے پکار رہے تھے۔

ہوا یہ تھا کہ اپنے سرجی کسی سوچ میں بہتے چلے جا رہے تھے۔ فٹ پاتھ پر ایک لڑکی کھڑی تھی۔ سر پر سرخ رنگ کی براؤن ہیٹ، چیتھڑے جیسی کالی اسکرٹ اور کالی ہی لیدر کی جیکٹ پہنے تھی۔ اونچی ہیل والے جوتے اور کالے رنگ کا تھرل سفید ٹانگوں پر چڑھایا تھا۔ تھرل میں اس کی سفید ٹانگوں کا رنگ اور زیادہ نکھر آیا تھا۔ ہونٹوں میں سگریٹ دبائے وہ دھوئیں چھوڑ رہی تھی۔ قد کاٹھ میں وہ سرجی سے شاید ڈیڑھ فٹ بلند ہوگی اور وزن میں دوگنا تھی۔ سرجی نے جب ایک بار اسے بغور دیکھا تو اس نے آنکھ مار دی۔ وہ آنکھ شاید سرجی کو تیر کی طرح لگی اور اس کے عین سامنے، اپنے لمبے کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر، مؤدب ہو کر ایسے کھڑے ہو گئے جیسے اونچائی پر رکھا کوئی مجسمہ دیکھ رہے ہوں اور مجسمے کے خدوخال بھی۔ سرجی تو اتر سے معلوم نہیں اس کا میک اپ زدہ چہرہ دیکھ رہے تھے یا کچھ اور مگر اس بدمعاش لڑکی نے سرجی کو کوٹ کے کالر سے پکڑ کر اپنی جانب گھسیٹ لیا۔ سرجی پہلے تو ہلکا سا مسکرائے اور پھر جب مضبوط گرفت محسوس کی تو جال میں پھنسے بٹیر کی طرح پھڑ پھڑانے لگے۔ پھر میں نے یہ بھی سنا کہ وہ لگاتار کچھ قسمیں بھی

کھا رہے تھے۔ میں اور شہباز اس کی جانب لپکے۔ اس لڑکی نے سیدھے ہاتھ میں سگریٹ پکڑا تھا اور الٹے ہاتھ کے بازو کو سرجی کی گردن کے گرد لپیٹا ہوا تھا۔ ان کے تڑپنے سے ٹوپی کا پھندنا بھی پھڑ پھڑاتا تھا۔

میں نے لڑکی سے پوچھا۔ ''اسے کیوں پکڑا ہوا ہے؟''

وہ بولی۔ ''یہ گڈا تو اب میرے ساتھ جائے گا۔''

ہم اس ناگہانی صورتِ حال سے پریشان ہو اٹھے۔ میں نے کہا۔ ''مگر یہ تو نہیں جانا چاہتا۔ اس کو دیکھو کس طرح سے کانپ رہا ہے۔''

وہ ہنستے ہوئے کہنے لگی۔ ''اس گڈے کو تو میں لے جاؤں گی اور ایک ڈالر بھی نہ لوں گی۔''

یہ سن کر سرجی زیادہ پھڑ پھڑائے اور اس کے چنگل سے نکلنے کے لیے اپنی بھرپور طاقت لگانے لگے مگر اس کی آہنی گرفت اتنی سخت تھی کہ وہ ہل بھی نہ سکتے تھے۔ شہباز انہیں چھڑوانے کے لیے آگے بڑھا مگر میں نے اسے روک کر کہا۔ ''لڑکی کو ہاتھ مت لگانا اور اگر اس نے پولیس بلالی تو تمہیں پکڑ کر لے جائے گی۔''

شہباز خوف زدہ ہو کر اپنے قدموں پر جم گیا۔ میں نے اس لڑکی سے مذاکرات شروع کیے اور کہا۔ ''یہ تو جرنلسٹ ہے۔ ریڈ ایریا کے بارے میں اپنا تھیسس لکھ رہا ہے۔ تم سے شاید کچھ پوچھنا چاہتا ہو۔''

جرنلسٹ کا سن کر اس نے سرجی کو غور سے دیکھا اور معلوم نہیں کیوں کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ پھر میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ ایسا آدمی نہیں ہے، جیسا تم سمجھ رہی ہو۔''

وہ نہ مانی اور ہنستے ہوئے اپنی ضد پر اڑی رہی۔ پھر میں نے دس ڈالر کا نوٹ اس کی جانب بڑھایا تو اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس نے دس ڈالر کا نوٹ میرے ہاتھ سے جھپٹا اور سرجی کو چھوڑ دیا۔

اب سرجی گہری گہری سانسیں لیتے ہوئے کھڑے تھے۔ شہباز نے ان کو بازو سے پکڑا اور گھسیٹتے ہوئے دور لے گیا۔ وہ لڑکی اب قہقہے لگا رہی تھی۔ ہم نے اس کے ہنسنے کی پروا نہ کی اور تیزی سے سرجی کو تھامے دوڑنے لگے۔ ہم نے سانس تب لیا جب اس علاقے سے باہر نکل آئے۔

اب ہم دونوں سرجی کو گھور رہے تھے اور وہ شرمندہ سے کھڑے اپنی صفائیاں دے رہے تھے۔ میں نے پوچھا۔ ''آخر آپ نے ایسی حرکت کیا کی کہ وہ آپ پر مر مٹی؟''

کہنے لگے۔ ''میں تو بس آنکھیں سینک رہا تھا کہ اس نے مجھے دبوچ لیا۔''

شہباز بگڑ کر بولا۔ ''کیا وہ آتش دان تھی کہ تم اس پر سینکنا شروع ہو گئے۔''

کہنے لگے۔ ''آتش دان تو نہ تھی پر آتش کا پرکالا تو تھی۔''

میں نے ہنس کر پوچھا۔ ''مگر سینک کیا رہے تھے؟''

سرجی اب نظریں جھکا کر شرمندہ کھڑے رہے تھے، کہنے لگے۔ ''میں نے بس یہ سوچا کہ نظر بھر کر ایک بار دیکھ لوں کہ بے چاری اداس کیوں کھڑی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''تو پھر اس کے ساتھ چلے جاتے اور وہ بھی مفت میں۔''

کہنے لگے۔ ''آپ بھی مجھے آٹھ اٹھارہ کرنے لگے ہیں۔''

شہباز بولا۔ ''اب ایک اور سیاپا۔ دس ڈالر ندیم بھائی نے دیے ہیں اور تم کون سے اٹھارہ ڈالر کو روئے چلے جا رہے ہو؟''

کہنے لگے۔ ''میرا مطلب ہے، ایک تو میں اس مصیبت سے بمشکل نکلا ہوں اور آپ بھی مجھے پریشان کر رہے ہیں۔''

میں نے اپنا سر پکڑ لیا اور شہباز سے کہا۔ ''یہ اپنی حرکتوں سے تو نہیں پر اپنے محاوروں سے ہمیں ضرور مروا دیں گے۔''

سرجی باز نہ آئے اور بولے۔ ''اردو ہمیشہ سلیس بولنی چاہیے۔ آپ لوگوں نے اس زبان کا ستیاناس کر کے رکھ دیا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''اب اگر کوئی مشکل لفظ بولا تو آپ کو پکڑ کر اس کے حوالے کر آئیں گے۔''

وہ خفا ہو کر کہنے لگے۔ ''ہم اپنے حال میں گرفتار ہیں اور آپ کو اٹکھیلیاں ہو رہی ہیں۔''

شہباز بولا۔ ''سرجی بہت ہو گیا۔ اب آپ سے کوئی رعایت نہ ہوگی۔ آپ نے تو ہمارے کان پکا دیے۔''

آخر میں وہ یہ بول کر چل پڑے۔ ''آپ ہی بی بی، آپ ہی باندی۔''

اس سے پہلے کہ انہیں ہم اپنی گرفت میں لیتے وہ اپنے

لمبے کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے تیزی سے آگے بڑھ گئے۔

ہوٹل پہنچے تو رات کا ایک بج چکا تھا۔ ہم پورے دن کی تھکن سے بے حال تھے۔ سرجی اب خاموشی سے زیادہ ناراض نظر آتے تھے۔ میں نے ایک سائیڈ پر انہیں کر کے پوچھا۔ ''یہ باندی والا کیا معاملہ تھا۔'' دراصل مجھے اپنے لیے اس کے معنی چاہیے تھے۔ وہ سمجھانے کے انداز میں بولے۔

''آپ ہی کے رحم وکرم پر ہیں۔''

میں اتنا تھک چکا تھا کہ کپڑے تبدیل کیے بغیر بستر پر لیٹ گیا۔ سرجی کہتے رہے کہ کپڑے تو تبدیل کرلو مگر مجھ سے ہلا بھی نہ جاتا تھا۔ اب وہ بڑبڑاتے ہوئے میرے کل کے لیے کپڑے استری کرنے لگے۔ اب مجھ میں انہیں روکنے کی ہمت نہ تھی۔ میرے سونے سے پہلے شہباز کے خراٹوں سے کمرا گونجنے لگا۔

رات کا معلوم نہیں کون سا پہر تھا کہ میں اٹھ بیٹھا۔ شہباز کے خراٹے تھے اور سرجی کے منہ سے سیٹیاں نکل رہی تھیں۔ ٹائم دیکھا تو ابھی صبح کے ساڑھے چار بجے تھے۔ کچھ بے چینی محسوس ہوئی تو اپنی جیکٹ پہنی، ٹوپی سر پر رکھی اور لفٹ سے نیچے لابی میں آگیا۔ وہاں کچھ لڑکیاں ناشتے کے لیے کافی تیار کررہی تھیں۔ ابلے انڈے ایک ٹوکری میں رکھے چلی آرہی تھیں۔ ٹین بند فروٹ بھی نکال کر سجایا ہوا تھا بسکٹ، ڈبل روٹیاں، مکھن کے علاوہ بھی بہت کچھ سلیقے سے ترتیب دے رہی تھیں۔ گڈ مارننگ کا تبادلہ ہوا اور میں دروازہ کھول کر باہر آ کھڑا ہوا۔

یہ وہ وقت تھا جب پاکستان میں رمضان شریف کے مہینے میں سحری سے پہلے جاگا جاتا تھا۔ جب صبح کی روشنی آسمان پر نہیں پھیلی ہوتی تھی اور وہ تاریکی سے نکلنے کی کوشش میں ہوتا تھا۔ اس رات جب میں ہوٹل سے باہر کھڑا تھا تو مجھے پاکستان میں گزرے رمضان شریف کی صبحیں یاد آگئیں۔ زمین اللہ کی اور اس پر تنا آسمان بھی اسی کا بنایا ہوا۔ یہ کائنات اور اس کے زمین جیسے اربوں سیارے اس کے تخلیق کیے ہوئے تو پھر آسمان کا رنگ بھی ویسا تھا جیسے پاکستان میں ہوتا تھا۔

میں چھوٹا تھا تو گھر کے واحد کمرے میں ماں کے ساتھ ہوتا تھا۔ کمرے میں روشن دان تھے اور رمضان کی راتوں کی سحری کے وقت انہی روشندانوں سے ایک آواز کا میں منتظر رہتا۔ ''اٹھو دین دارو، وقت ہے سحور دا، لقمہ کھاؤ نور دا، کم کرو حضور دا...... اٹھو دیندارو......'' یہ آواز سننے کے لیے میں اپنی ماں سے کہتا کہ مجھے اٹھا دیا کرو۔ ماں مجھے جگا دیتی، میں سنتا اور کوئی خوشی سی میرے تن من میں بھر جاتی۔ میں ماں سے پوچھتا کہ یہ کون گلی میں رات کو آکر یہ آواز لگاتا ہے تو وہ کہتیں کہ آسمان سے فرشتہ ہماری گلی میں اترتا ہے اور ہمیں جگا کر واپس آسمانوں کی جانب پرواز کر لیتا ہے۔

جب دن نکلتا تو میں روشن دان کے نیچے گلی میں بہت دیر یہ سوچ کر گھومتا رہتا کہ اس مٹی پر فرشتے کے قدم پڑے ہوں گے اور میں دن میں با آواز بلند لوگوں کو سحری کے لیے وہی کلمات ادا کر کے بلند کرتا تو لوگ ایک چھوٹے بچے کی اس حرکت کو مسکرا کر دیکھ کر قریب سے گزر جاتے تھے۔

جب میں کچھ بڑا ہوا تو معلوم ہوا کہ یہ منادی وہ انسان کرتے ہیں جو دراصل ہوتے تو فرشتے ہیں مگر زمین پر انسانوں کے روپ میں پھرتے ہیں۔ میں پھر اپنے دوست فضل (جس کے ساتھ میں نے لاہور کا سفر کیا تھا) کے ساتھ رمضان کی راتوں کو اٹھ کر سحری کے لیے لوگوں کو اٹھانے کی منادی کرنے لگا تھا۔

فضل کا گھر ہماری پچھلی گلی میں تھا۔ میں تین بجے رات اٹھ کر فضل کے گھر پر دستک دیتا، وہ آنکھیں ملتا دروازے پر آتا، ہر وقت کہتا کہ ابھی تو بہت ٹائم رہتا ہے۔ مجھے بھی معلوم ہوتا تھا کہ بہت وقت سحری ہونے میں رہتا ہے۔ ایک بار ہم سنسان اور تاریک گلی میں منادی کرتے ہوئے چلے جارہے تھے کہ کسی نے چھت سے ہم پر پانی پھینک دیا تھا اور ایک کرخت آواز لگائی تھی۔ ''ابھی تو سحری میں بہت وقت رہتا ہے۔ تم لوگوں کی نیند خراب کررہے ہو۔'' یہ ایسی راتیں تھیں جو میں آج اپنے ہوٹل سے باہر کھڑا دیکھ رہا تھا اور محسوس کررہا تھا۔

ہم منادی کر کے مُدی دودھ والی کی دکان پر چھوٹی چھوٹی بالٹیاں لے کر جاتے، وہ مکھن بنا رہا ہوتا اور اسی طرح کی نیم تاریکی میں بہت سے لوگ خاموشی سے مکھن بنتا دیکھتے۔ پھر وہ بالٹیوں میں کچی لسی بھر کر اس پر ہمارے حصے کا مکھن رکھ دیا کرتا تھا۔ گھر آکر میں روٹی اور مکھن سے سحری کرتا اور پھر نماز پڑھ کر سوجاتا تھا۔ معلوم نہیں مجھے اس رات پاکستان میں رمضان شریف کی راتیں کیوں یاد آرہی تھیں یا موسم ویسا تھا یا آسمان کا رنگ وہی تھا۔ کچھ یکساں تھا کہ میں مسحور کھڑا رہا اور یادوں کے دریا میں بہتا رہا۔

کسی بھی انسان کا بچپن اس کے لیے ہمیشہ ایک سہانی یاد کی مانند ہوتا ہے۔ یہ یادیں اس کی زندگی سے جڑ جاتی ہیں، جتنے بڑے مقام پر پہنچ جاتے مگر اکثر تنہائی میں ان یادوں کو دوبارہ سے کھول کر مسکرانے لگتا ہے۔ زندگی حسین لگنے لگتی ہے۔ میں آج اللہ کے کرم سے اچھے مقام پر ہوں مگر مجھے وہ دن نہیں بھولتے جب ایک روپیا بھی مجھے دنیا کا امیر ترین انسان بنا دیتا تھا۔ ایک خوشی کی لہر میرے اندر دوڑتی رہتی جب تک وہ ایک روپیا میرے پاس رہتا، میں اسے خرچ کرنے کے منصوبے بناتا رہتا۔ میری خوشی کچھ پکوڑے کھا کر یا کچھ ٹافیاں لے کر دگنی ہو جاتی۔ کچھ مٹھائی مل جاتی تو اس کا ذائقہ دنوں تک زبان پر رہتا۔ دن میں کئی بار اپنے خزانے کے سکے گنتا اور گن کر شہنشاہ بن جاتا تھا۔ چال میں خود اعتمادی آجاتی اور اکڑ کر چلتا تھا۔ آج اتنا کچھ ہے مگر وہ خوشی اور شادمانی نہیں ملتی جو بچپن میں تھوڑے سے پیسوں سے مل جاتی تھی۔ زندگی عجیب انداز میں آگے بڑھتی رہتی ہے۔ انسان بہت کچھ پا کر بھی یہ محسوس کرتا ہے کہ کوئی کمی ہے۔ بچپن میں بہت سی کمیاں ہوتی تھیں مگر محسوس یہی ہوتا تھا کہ سب کچھ ہے۔ میرے بچپن کے دنوں میں روزوں اور عید کے دنوں کی بہت اہمیت ہے جن کو میں آج بہت شدت سے یاد کر رہا تھا۔

روزوں کا آخری ہفتہ مجھے دنیا سے بے گانہ کر دیتا تھا۔ عید کی تیاریاں میرے چھوٹے سے شہر ڈیرہ اسماعیل خان میں عروج پر پہنچ جاتی تھیں۔ مٹھائیوں کی دکانیں رنگا رنگ تھالوں سے سج جاتیں۔ خیاری اور جوتوں کی دکانوں کے منظر نکھر آتے۔ آسمان خوشیوں اور مسرتوں کی بارش برساتا اور میں اسے اپنے اندر جذب کرتا رہتا۔ فضا بدل جاتی۔ نئے کپڑوں سے بنا شلوار قمیص کا ایک جوڑا اور نئی جوتی میرے لیے کیا بلکہ سب کے لیے.... خاص اہمیت حاصل کر لیتی تھی۔ ہم دوست ہر ایک کو اپنے نئے کپڑے دکھلاتے اور پھر میں اسے کسی لوہے کے ٹرنک کے کونے میں رکھ کر تا دیر اسے تکتے رہتا۔ نئی بنیان کو میں پلاسٹک کے لفافے سے باہر نہ نکالتا تھا کہ کہیں میلی نہ ہو جائے۔ نیا رومال میرے لیے کسی بادشاہ کے تاج سے زیادہ قیمتی ہوتا۔ ماں باپ سے ضد کر کے ایک بٹوا بھی خرید لیتا تھا۔ جسے اپنے تکیے تلے رکھ کر چین سے سو جاتا تھا۔ گو وہ خالی ہوتا مگر محسوس ایسے ہوتا کہ قارون کا خزانہ اس میں بند ہے۔ جیسے جیسے عید کا دن قریب آتا جاتا ایسے ہی رگوں میں خون کی رفتار بڑھ جاتی تھی۔ میں لوگوں کے چہرے دیکھتا کہ کون کتنا خوش ہے۔ مجھے سارا جہاں خوشیوں میں نہایا لگتا۔ گلی اور بازار میں ہر ملنے والے سے میرا ایک ہی سوال ہوتا کہ عید پر کون سے رنگ کے کپڑے بنوائے ہیں؟ پھر خیالوں خیالوں میں ان لوگوں کی فہرست بناتا جہاں سے عیدی وصول ہونے کی امید ہوتی۔ ان باثروت لوگوں سے خیالوں میں وصول کی ہوئی عیدی گنتا اور کاغذ کے اتنے ہی نقلی نوٹ کاپی سے پھاڑ کر اپنے بٹوے میں رکھ کر صبح شام انہیں گنا کرتا تھا۔ میں بہت امیر ہو جاتا کہ میرا بٹوا کاغذی نوٹوں سے بھرا ہوتا تھا۔ میں اپنے حصے کی عیدی عید سے پہلے وصول کر کے خوش باش ہو کر گلیوں میں دوڑتا پھرتا۔

پھر آخری روزہ ہوتا اور اُمید ہوتی کہ کل عید کا دن طلوع ہوگا۔ عصر کی نماز پڑھ کر ہم گھر کے تمام بچے چھت پر چڑھ جاتے اور سورج ڈوبنے کا انتظار کرتے۔ سورج ڈوبنے لگتا اور ہماری نگاہیں آسمان میں اپنے چاند کو تلاش کر رہی ہوتیں۔ ہر ایک کوئی نہ کوئی چاند دیکھ لیتا جو کوئی دوسرا کبھی دیکھ نہ پاتا تھا۔ ہم آسمان کے شمال مغربی کونے میں ایک دوسرے کو اپنا اپنا چاند دکھلانے کے جتن کرتے جو ہمارے علاوہ کسی اور کو نظر نہ آتا تھا۔ ایک شور شرابہ ہر چھت پر برپا ہوتا اگر سب مل کر کوئی ایک چاند تلاش کر لیتے تو خوشیاں سنبھالے نہیں سنبھلتی تھیں۔ مبارک بادیں بانٹی جاتیں اور وصول کی جاتیں، بھاگے بھاگے محلے کی مسجد میں شام کی نماز پڑھنے جاتے اور اکثر وہ ہو چکی ہوتی تھی۔ اس کے بعد کا ایک نم ناک مرحلہ بھی ہمیں دیکھنا اور سننا ہوتا جب مسجد کے مولوی صاحب لاؤڈ اسپیکر پر ایک طرح کا مرثیہ پڑھتے ”الوداع الوداع ماہِ رمضان“ ہم سب کی آنکھوں میں آنسو ہوتے۔ سب لوگ غمگین ہو جاتے۔ میں بھی درد میں گھر جاتا۔ مولوی صاحب یہ ”مرثیہ“ ختم کرتے تو ہمارے آنسو تھم جاتے اور عید کی خوشی ایک چمک کی صورت پھر سے آنکھوں میں عود کر آجاتی۔ میں چھلانگیں مارتا، دوڑتا ہوا گھر پہنچتا جہاں بڑی بہن سب کے عید والے نئے کپڑے استری کر رہی ہوتی۔ وہ انہیں سجا کر کھونٹی پر لٹکا دیتیں۔ میں رات دیر تک جاگنا چاہتا مگر ماں عشاء کی نماز کے بعد تھپک تھپک کر جلد سلا دیتیں کہ کل عید ہے، میں بھی جلدی اس خیال سے اپنے بٹوے کو تکیے تلے رکھ کر جلدی سو جاتا کیونکہ کل عید نے مجھے جگانا ہوتا تھا۔ بچپن رخصت ہوا تو ایسی عیدیں بھی چلی گئیں۔ بچپن ختم ہوا تو ساری مسرتیں بھی تمام

ہوئیں۔ بچپن ختم ہوا تو سارے خواب بھی آنا بند ہو گئے ؛ بچپن ختم ہوا تو سب تعبیریں بھی الٹی نکلنے لگیں اور بچپن ختم ہوا تو ساری دنیا روٹھ گئی۔

ہوٹل کے باہر ابھی اندھیرا تھا اور سب روشنیاں رات بھر جل جل کر تھکی ہوئی لگ رہی تھیں۔ سڑکیں ویران پڑی تھیں۔ زیر زمین بھاپ کے پائپوں سے دھواں مین ہولوں سے باہر نکل کر فضا میں پھیل رہا تھا جس سے ماحول دھواں دھار ہو گیا تھا۔ سردی میں سختی تھی اور میں اپنے دونوں ہاتھ بغلوں میں دبائے ہوئے تھا۔ اپنے بچپن کے خیالوں کو لیے میں ٹائم اسکوائر کی جانب چل پڑا۔ سڑکیں ویران تھیں۔ امریکا میں پہلی شفٹ سات بجے شروع ہوتی ہے اور کچھ دیر بعد ایک ہجوم نے یہاں دھاوا بول دینا تھا۔ اس وقت یقین بھی نہ آتا تھا کہ جو جگہ اس وقت بے آباد اور ویران پڑی ہے، کچھ دیر میں یہاں گاڑیوں اور انسانوں کا سمندر نظر آنے لگے گا۔

میں بے فکر ہو کر چل رہا تھا۔ آگے ایک چوک آیا تو میرے نتھنوں میں تازہ کافی اور ڈونٹ کی خوشبو ٹکرائی۔ دیکھا تو ایک کافی شاپ کھلی تھی اور کچھ لوگ اس کے سامنے کھڑے اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس شاپ پر علی الصباح تازہ ڈونٹ بنتے ہیں اور شوقین دور سے لینے آتے ہیں۔ یہ مینہٹن کے مشہور ڈونٹس ہیں۔ یہاں کی کافی بھی اس علاقے میں بہت شہرت رکھتی تھی مگر مجھے یہ سب اس وقت معلوم نہ تھا۔ اس اندھیرے اور سردی میں گرم بھاپ اڑاتی کافی کی مہک ہر جانب پھیلی تھی۔ ساتھ ڈونٹ کی خوشبو پوری فضا... کو معطر کیے ہوئے تھی۔ ارد گرد دنیا کی بلند ترین عمارتیں روشنیوں میں تنہائی خاموش کھڑی نظر آرہی تھیں۔ میں بھی اس کافی شاپ میں گھس گیا۔ کچھ لوگ پیک کرا کے لے جا رہے تھے اور کچھ میزوں کے گرد کرسیوں پر بیٹھے گرم کافی پی رہے تھے۔ ایک کاؤنٹر کے پیچھے نئی نکور لڑکیاں چابک دستی سے سب کو نمٹا رہی تھیں۔ اندر کا ماحول گرم تھا اور سکون دے رہا تھا۔

میں نے کاؤنٹر سے بلیک کافی کے ساتھ دو گرم ڈونٹ خریدے۔ گو میں کافی کا شوقین کبھی نہیں رہا مگر اس ماحول میں اس سے لطف اندوز نہ ہونا بھی نری بدذوقی تھی۔ کافی اور ڈونٹس لے کر ایک خالی میز کے ساتھ رکھی کرسی پر جا بیٹھا۔ لوگ چلے آرہے تھے جیسے پاکستان میں کسی دور میں لوگ صبح کی اذانوں سے پہلے بیکریوں سے ڈبل روٹیاں اور انڈے لینے سردیوں میں نکلا کرتے تھے۔ میں گرم کافی پی کر ماحول کی تمازت اپنے اندر اتار رہا تھا۔ آج ہمیں مینہٹن سے واپس چلے جانا تھا۔ سرجی اور شہباز کل واپس ٹورنٹو جا رہے تھے۔ ہیوسال کو جوائن کرنے میں ایک ہفتہ رہتا تھا۔ مجھے دو تین دن بعد ٹورنٹو کے لیے نکلنا تھا۔ ہم تینوں نے نیویارک کے ڈاؤن ٹاؤن کو تین دن میں اچھا خاصا دیکھ لیا تھا۔ سیر سپاٹے کے لیے آئے لوگ یہاں تین دن سے زیادہ گزار بھی نہیں سکتے۔ زیادہ دیر رکنا بھی نہیں چاہیے کیونکہ کھڑا پانی بھی گدلا ہو جاتا ہے۔ یہ بہت بڑی دنیا ہے۔ ایک مقام پر رک کر آپ اور بہت کچھ دیکھنے سے رہ جاتے ہیں۔

میں اپنے ہوٹل کی جانب واپس جا رہا تھا مینہٹن ابھی اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا مگر پھر بھی جاگ رہا تھا۔ لابی میں ورکر اپنے کام میں جتے تھے۔ کمرے میں شہباز خراٹے لے رہا تھا اور سرجی کی سیٹیاں تال دے رہی تھیں۔ میں نے جیکٹ اتاری، ٹوپی نائٹ ٹیبل پر رکھی اور رضائی اوڑھ کر پھر سو گیا۔

کچھ دیر بعد سرجی نے جگایا اور کہنے لگے۔ ”لابی میں جا کر ناشتا نہیں کرنا؟“

میں یہ کہہ کر پھر سو گیا۔ ”میں آپ لوگوں کے جاگنے سے پہلے ناشتا کر آیا ہوں۔ آپ لوگ جاؤ۔ مجھے ابھی کچھ دیر اور سونا ہے۔“

میں گیارہ بجے جاگا تو دیکھا کہ دونوں ایک دوسرے کو کتاہٹ سے دیکھ رہے ہیں۔ بارہ بجے ہوٹل کا کمرا خالی کرنا تھا۔ میں شاور لے کر باہر نکلا تو دونوں نے اپنے چھوٹے بیگ تیار کر رکھے تھے۔

شہباز نے کہا۔ ”ندیم بھائی! آپ بھی ہمارے ساتھ ٹورنٹو چلیں۔ اب ہمیں ایک دوسرے کی عادت سی ہو گئی ہے۔“

سرجی نے بھی یہی کہا۔ ”میں نے کہا چلا تو جاؤں لیکن طارق خفا ہو جائے گا۔ میں اتنے دن آپ لوگوں کے ہمراہ رہا ہوں اس کا تمنا بھابی بھی گلہ کر رہی تھیں۔ بس دو تین دن میں آجاؤں گا۔“ یہ کہتے ہوئے اندر سے میرا دل بھی اداس تھا۔ چار مہینوں میں ہم تینوں دوستی کے رشتے میں بندھ چکے تھے۔ ایک دوسرے کو سمجھنے لگ گئے تھے۔ سرجی دانستگی اور کبھی نادانستگی سے اپنی باتوں اور حرکتوں سے ہمیں محظوظ کرتے رہتے تو لیکن ہمیں آج تک یہ معلوم نہ ہوسکا کہ وہ کب ہمیں خوش کرنے کے لیے ایسی حرکتیں کرتے ہیں اور

URDUSOFTBOOKS.COM

کب ان سی سرزد ہو جاتی ہیں۔ ہمیں بھی کوئی پروا نہیں تھی کیونکہ سرجی کے خلوص کو ہم سمجھ چکے تھے۔ ہم میں سے بھی کوئی اداس ہوتا تو انہیں سمجھ میں نہ آتا کہ کس طرح سے ہمیں ہنسا سکیں۔ میں آج دل پر ہاتھ رکھ کر کہہ سکتا ہوں کہ میرے ساتھ خاص کر ان کا رویہ بہت مخلصانہ ہوتا تھا۔ میرے روکنے کے باوجود میرے بہت سے کام کر دیا کرتے تھے۔

میں ایک بار ان پر غصے ہوا جب انہیں اپنے جوتے صاف کرتے دیکھا۔ میں نے ٹھیک ٹھاک ان سے لڑائی کی تھی اور آخر ان سے وعدہ لیا کہ وہ ایسا پھر کبھی نہیں کریں گے۔ میں بھی ان کا بہت خیال رکھتا تھا اور بعد میں ان کی بھی ہیوسٹن میں جاب کروادی تھی۔

بارہ بجے ہم نے کمرا چھوڑ دیا۔ ایک دوسرے سے گلے ملے۔ سرجی جاتے جاتے یہی کہہ رہے تھے کہ تین دن سے زیادہ نیویارک میں نہیں ٹھہرنا ہمارا انہیں تو معصوم نسرین کا خیال ہی کرلو۔ پھر وہ اپنی راہ چلے گئے اور میں ویلی اسٹریم ٹرین سے چل دیا۔ تمنا بھابی کو فون کر دیا تھا کہ مجھے اسٹیشن سے پک کرلیں۔

یہاں کا موسم بنتے بنتے بگڑنے لگتا ہے۔ آج پھر کڑاکے کی سردی تھی۔ آسمان ٹھٹھرا ہوا تھا اور برف گرنے کے امکانات تھے۔

تمنا بھابی نے مجھے ویلی اسٹریم ٹرین اسٹیشن سے پک کیا اور شکایت کرنے لگیں۔ "تم آئے اور پھر دوستوں کے ساتھ گھومنے چلے گئے۔ شہروز بھی تمہارا بار بار پوچھتا رہتا ہے۔"

شہروز کا سنا تو میں کہنے لگا۔ "بھابی! اسے ایک میٹرس دلا دیں، جہاں وہ جتنی دل چاہے چھلانگیں لگائے۔ میرا تو اس نے بھرکس نکال دیا ہے۔"

یہ سن کر ان کا ہنستے ہنستے برا حال ہوگیا۔ مجھے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ اس میں اتنا زیادہ ہنسنے کی وجہ کیا ہے؟

مجھ سے تمنا بھابی پوچھ رہی تھیں کہ میں مین ہیٹن میں کیا کرتا رہا۔ میں نے ریڈ ایریا چھوڑ کر سب بتا دیا تو کہنے لگیں۔ "مائی گاڈ! اتنا تو میں نے اس کے بارے میں سنا بھی نہیں اور تم یہ سب کر آئے ہو؟" وہ حیرت سے مجھے دیکھ رہی تھیں۔ پھر کہنے لگیں۔ "مجھے خدشہ ہے کہ تم جاب بھی ٹھیک سے نہ کر پاؤ گے۔" پھر گاڑی میں پیچھے بے بی سیٹ میں روتے ارشیان کو چپ کرایا اور نصیحت کرنے لگیں۔ "مجھے ڈر ہے کہ گھومنے کے شوق میں جاب سے زیادہ چھٹیاں نہ کرنے لگو۔ یہ لوگ نکالنے میں دیر نہیں کرتے۔"

مجھے تھکاوٹ ہو رہی تھی اور میں ان کی باتوں پر سر ہلاتا جا رہا تھا۔ ان کی نصیحتیں تب ختم ہوئیں جب ہم گھر پہنچے۔ مجھے تھکاوٹ محسوس ہو رہی تھی اور میں سیدھا تہ خانے میں جا کر بستر پر لیٹ گیا۔ جہاں مشین کی آواز ہمیشہ کی طرح گونج رہی تھی۔

میری آنکھ تب کھلی جب چھت سے دھم دھم کی آوازیں آنا شروع ہوئیں۔ ٹائم دیکھا تو ساڑھے تین بجے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ شہروز اسکول سے واپس آگیا ہے۔ میں نے نیچے بنے باتھ روم میں غسل کیا۔ جب اوپر آیا تو شہروز چاچا چاچا کہتا مجھ سے لپٹ گیا۔ مجھے اس پر بہت پیار آیا۔ اس سے کہا۔ "شہروز! ماشاءاللہ تم بہت پیارے اور اچھے بچے ہو۔"

یہ سن کر وہ حیرت سے بولا۔ "اچھا؟"

اور پھر ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہونے کی تیاری کرنے لگا تو میں نے اسے پکڑ لیا اور کہا۔ "واقعی تم سے اچھا بچہ میں نے کہیں نہیں دیکھا بلکہ ابھی پیدا بھی نہیں ہوا ہوگا۔"

تمنا بھابی کچن میں کھڑی کچھ بنا رہی تھیں، وہ ہنس کر بولیں۔ "جتنا ہی اسے مسکا لگالو، یہ بھی یقین نہیں کرے گا۔"

تمنا بھابی نے مجھے چائے بنا کر دی اور میں نے کچن کے کاؤنٹر پر کھڑے کھڑے پی لی۔ صوفے پر آرام سے بیٹھ کر میں چائے پینے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا، جہاں ہر وقت یہ خدشہ رہے کہ شہروز کہیں سے بھی پرواز کرتا ہوا مجھ پر لینڈ کرسکتا ہے۔

طارق کو چھ بجے اپنی فارمیسی سے واپس آنا تھا۔ اس کا فون آیا تھا کہ ہم آج رات جیکسن ہائٹ چلیں گے۔ اس کے کچھ دوستوں نے وہاں کسی پاکستانی ہوٹل میں ڈنر کی دعوت دی ہوئی تھی۔ جیکسن ہائٹ دراصل نیویارک میں پاکستانی بازار ہے۔ میں نے نام تو بہت سنا تھا اور آج اسے دیکھنے اور پرکھنے کا موقع بھی مل رہا تھا۔

میں نے نیویارک آنے سے پہلے نسرین سے وعدہ کیا تھا کہ وہاں پہنچ کر اسے فون کروں گا۔ یہاں آتے ہی ٹائم ہی نہ ملا تھا کہ فون کرسکتا۔ مین ہیٹن میں سرجی نے ایک دو بار چپکے سے مجھے کہا تھا۔ "اس معصوم کو ایک بار فون کرلوں۔" مگر اتنے مصروف رہے کہ بات کرنے کا موقع ہی نہ ملا تھا۔ سوچا کہ ابھی طارق کے آنے میں کچھ وقت ہے تو کیوں نہ اسے فون کرلوں۔ میں نے کارڈلیس فون اٹھایا اور باہر

URDU SOFT BOOKS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

ڈیک پر آبیٹھا۔ میں اس سے ایک فاصلہ بھی رکھنا چاہتا تھا مگر رکھ نہ پا رہا تھا۔ میری کیفیت میری اپنی سمجھ سے باہر تھی۔

اس نے دوسری بیل پر فون اٹھا لیا۔ ہیلو سنتے ہی وہ گلے شکوے لے بیٹھی کہنے لگی۔ ”اتنے دنوں سے فون نہیں کیا اور نہ اپنا نمبر دے گئے۔ کم از کم اپنی خیریت کی اطلاع تو دے دیتے۔“

میں نے اپنی مصروفیات بتائیں تو زیادہ پھٹ پڑی۔ کہنے لگی۔ ”میں ہر روز تمہارے فون کا انتظار کرتی تھی۔ باہر سے آتی تو میسج چیک کرتی مگر تمہارا اتا پتا بھی نہیں چل رہا تھا اور تم وہاں مزے میں سیر سپاٹے کر رہے ہو۔“

میں نے پوچھا۔ ”کین سینٹر میں سب کیسے ہیں؟ کسی کی جاب ہوئی؟“

”میں نے سینٹر جانا چھوڑ دیا ہے۔“

میں نے حیرت سے پوچھا۔ ”وہ کیوں۔ تمہارا کورس بھی ابھی پورا نہیں ہوا۔ چند دن ہی تو رہ گئے تھے اور اُمید تو تھی کہ تمہیں OpCo مل جاتا۔“

کہنے لگی۔ ”تمہارے نیویارک جانے کے دوسرے دن بعد گئی تھی۔ مارک مجھے تنگ کر رہا تھا کہ اب عدیم تو یہاں کبھی نہیں آئے گا۔ بس مجھے تم یاد آنے لگے اور آنسو میری آنکھوں سے بہنے لگے۔ پھر اشوک نے اپنے دفتر میں مجھے بٹھایا۔ میں بہت روئی کہ میرا دوست ہمیشہ کے لیے چلا گیا ہے۔“ اس کے بعد اس کی آواز بھرا گئی تھی۔ پوچھنے لگی۔ ”تم کب آرہے ہو؟“

میں نے جب یہ بتایا کہ دو تین دن بعد آرہا ہوں تو کہنے لگی۔ ”کیا مجھ سے آتے ہی مل سکتے ہو؟“ وہ پھر رونے لگی۔ ”میں بہت پریشان ہوں۔ میں کس سے بات کروں؟ ملو گے ناں؟“

میں نے کہا کہ آکر فون کروں گا۔ آنے کے اگلے دن شاید مل لیں۔ میں نے اس کے بیٹے سعد کے بارے میں پوچھا تو کھل اٹھی۔ مجھے بھول کر اس کی ممتا جاگ گئی۔ پھر اس کے بارے میں بتانے لگی۔ اس کے گریڈ سنانے لگی۔ ٹیچر کے ساتھ میٹنگ کی روئیداد بتانے لگی۔ مجھے اس کا یہ روپ زیادہ بھلا لگا۔ ایک ماں اپنے بیٹے کی باتیں کر کے وہ سب کچھ بھول گئی تھی جو وہ مجھے ابھی فون پر بیان کر رہی تھی۔ لگا کہ ممتا جیت گئی اور باقی سب کچھ ہار گیا ہے۔ میں اپنی ایسی ہار چاہتا تھا مگر ایک عام مرد کی طرح یا انسان کی طرح خود پسند بن کر ایک دم اپنے آپ کی یہ درگت بنتے اچھا نہیں لگا تھا۔ ہر انسان دوستی ہو یا محبت، دونوں میں سامنے والے سے زیادہ توجہ کی امید رکھتا ہے۔ ہر ایک اس معاملے میں خود غرض بن جاتا ہے۔ گو میرے دل میں ایسی کوئی بات نہ تھی اور میں اس دوستی کو کوئی اور رخ نہیں دے سکتا تھا۔ نہ ہی میں کوئی اور رخ دینا چاہتا تھا۔

فون بند ہو گیا تھا۔ میں ڈیک پر بہت دیر بیٹھا رہا۔ یہی سوچتا رہا کہ وہ کہیں زیادہ آگے نہ بڑھ جائے۔ دوستی کی حد تک تو ٹھیک تھا اور دوستوں کے آپس میں ملنے کا میں جواز بنا سکتا تھا مگر اگر یہ معاملہ آگے جا کر کچھ اور رخ اختیار کر گیا تو پھر کیا ہوگا؟ میں کوئی رومانٹک انسان نہ تھا کہ اس کے آگے جھوٹ بول کر اپنا وقت گزارتا۔ میں ایک ارادے کے بیچ پھنسا کھڑا تھا۔ کتنی دیر بیٹھا رہتا کہ تمنا بھابی نے ڈور وال پر دستک دے کر مجھے اندر بلا لیا۔

پہلے تو وہ مجھے شاکی نظروں سے دیکھتی رہیں اور پھر پوچھا۔ ”کہاں فون کر رہے تھے؟“

”رحمۃ للعالمین“

قائداعظم ؒ کی ایک نادر تحریر

قائداعظمؒ نے رحمۃ للعالمین کے نام سے ایک مضمون تحریر کیا تھا۔ لاہور کے ایک وکیل سید سرور شاہ گیلانی نے قائداعظمؒ کی یہ تحریر ایک پمفلٹ کی صورت میں شائع کی تھی۔ یہ پمفلٹ سینٹرل لائبریری میں آج بھی محفوظ ہے۔ قائداعظم لکھتے ہیں ”جس طرح نبیؐ نے آج سے تیرہ سو سال پہلے چند قوانین الٰہی کی تاثیر سے عربوں کی مردہ قوم کو زندگی کے بلند ترین مقام پر پہنچا دیا تھا، اسی طرح آج ان قوانین کی برکت سے غلام ہندوستان کی قسمت بدلی جا سکتی ہے۔ اسلامی قوانین سے آج بھی نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا بھر کے مسائل کو حل کیا جا سکتا ہے۔ حضورؐ کی تعلیمات نے زندگی کے ہر شعبے میں ایک انقلاب برپا کر دیا اور روحانی، سماجی، سیاسی اور اقتصادی پستیوں کو چشم زدن میں بلندیوں سے آشنا کر دیا۔ آج بھی ہمیں حضورؐ کی تعلیم پکار پکار کر اپنی طرف بلا رہی ہے۔ کاش کہ ہم اس کی آواز کو سن سکیں۔

(بحوالہ: ”بانی پاکستان کا تصور پاکستان“ از محمد آصف بھلی)

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

میں نے کہا۔ ”ایک دوست کو ٹورنٹو فون کیا ہے۔“

وہ سوال جواب کرنے لگیں کہ اندر بیٹھ کر بھی تو بات کر سکتے تھے؟

میں نے کہا۔ ”وہاں تمہارا بیٹا کسی سے بات کرنے دیتا تو پھر کرتا ناں؟“

وہ تیکھی نظروں سے مجھے متواتر گھورتی چلی جا رہی تھیں اور بولیں۔ ”اس کو نسرین کا کہہ دیتے تو شاید تنگ نہ کرتا۔“

میں اب کیا کہتا اس لیے خاموش رہا۔ وہ کہنے لگیں۔ ”میں نے بیڈ روم میں رکھے دوسرے سیٹ سے تمہاری باتیں سن لی ہیں۔“ پھر مجھے گھورتی ہوئی بولیں۔ ”میں نے تم نے طارق کو فون کرنے کے لیے ریسیور اٹھایا تو معلوم ہوا کہ......“ پھر وہ میرے جواب کا اب انتظار کر رہی تھیں۔

میں نے سب باتیں انہیں سچ سچ بتا دیں۔ انہوں نے کہا۔ ”تم نے ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔ کوئی چکر نہ چلا لینا۔ ورنہ تمہارا تو برا ہوگا ہی ہوگا اور بہت سے لوگوں کے ساتھ بھی برا ہو جائے گا۔“ پھر بولیں۔ ”مجھے معلوم ہے کہ تم ذمہ دار اور سنجیدہ انسان ہو مگر مرد کو پھسلتے دیر نہیں لگتی۔ بس ذرا دھیان سے رہنا۔“

میں نے کہا۔ ”بات میں بھی نہیں بڑھانا چاہتا اور مجھے بھی اپنے حالات کا اندازہ ہے مگر اسے بھی مدد کی ضرورت ہے اور اگر اس کی جگہ کوئی مرد ہوتا تو تب بھی کیا میں اس کی مدد نہ کرتا؟“

یہ سن کر وہ چپ ہو گئیں۔ پھر کہنے لگیں۔ ”اس کی باتوں اور لہجے سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ غلط لڑکی نہیں ہے وہ تم پر بہت زیادہ بھروسا کرنے لگی ہے۔“ پھر ہنس کر بولیں۔ ”مجھے تو حیرت ہے کہ تم کو وہ لڑکی پسند کیسے کرنے لگی۔“ پھر سنجیدگی سے کہا۔ ”تم ذہین انسان ہو۔ اچھا برا سمجھتے ہو اور مجھے اُمید ہے کہ تم کچھ غلط نہ کرو گے۔“

میں نے ہنس کر کہا۔ ”اگر اپنا خطبہ ختم کر لیا ہے تو ایک کپ چائے اور بنا دو۔ تم نے تو سر میں درد کر دیا ہے۔“

طارق آیا تو چھینکوں کے درمیان مجھ سے لڑنے لگا۔

میں نے کہا۔ ”کیا پوچھو گے نہیں منہٹن میں کہاں کہاں گیا؟“

چھینک مار کر بولا۔ ”منہٹن میں منہٹن ہی گئے ہوگے۔ چاند پر تو نہیں گئے تھے۔“ پھر سرخ آنکھوں سے مجھے دیکھ کر کہنے لگا۔ ”میوزیم گھومتے رہے ہو؟“

میں نے ایسے ہی جھوٹ بولا۔ ”ہاں سارے میوزیم گھوم آیا ہوں۔“

میں سمجھا کہ میرے جواب پر وہ مجھے کوسے گا مگر وہ اور زور سے چھینکنے لگا۔ پھر فارغ ہوا تو بولا۔ ”ابھی جیکسن ہائٹ جانا ہے۔ دوستوں نے رات کا کھانا رکھا ہے۔“

میں نے پوچھا۔ ”کیا سب چلیں گے؟“

وہ باتھ روم کے تولیے سے ناک صاف کرتے ہوئے بولا۔ ”نہیں! صرف ہم دونوں۔“ پھر میری جانب دیکھتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔ ”تمہارے سر کے جنگلی بال بھی وہیں سے کٹوا لیں گے۔“

میں پھر اس سے مخاطب ہوا۔ ”اپنی الرجی کا علاج کیوں نہیں کرواتے؟“

ایک زوردار چھینک کے بعد بولا۔ ”یہ الرجی نیویارک چھوڑنے پر ہی ختم ہوگی۔“

پھر چار سال بعد اس نے نیویارک چھوڑ دیا تھا اور اب پاکستان میں اس سے زیادہ زوردار چھینکیں مارتا پایا جاتا ہے۔ وہ اسلام آباد میں رہتا ہے اور میرے پاکستان کے پچھلے ٹرپ پر ہم دامن کوہ کے اوپر منال ریسٹورنٹ میں بیٹھے تھے اور وہ ہمیشہ کی طرح ایک تولیہ لیے بیٹھا چھینک رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ”ابھی تک الرجی ہے۔“ تو غصے ہو گیا اور بولا۔ ”تم میری الرجی کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو؟“ پھر ایک زوردار چھینک آس پاس کے لوگوں نے سنی اور وہ مجھ سے کہنے لگا۔ ”تم اپنے آپ کو بہت زیادہ اسمارٹ سمجھتے ہو میں بھی امریکا میں رہا ہوں۔ وہاں برف ہٹائی، کالنگ کارڈ بیچے، کوئی پھولوں کی ریزہ بھی نہیں لگا تا تھا۔“ وہ بولتا رہا اور ہم سب دوست ہنس ہنس کر دوہرے ہو رہے تھے۔

مجھے کینیڈا آئے ہوئے چار ماہ ہو چکے تھے اور ابھی تک بالوں کی کٹنگ نہیں کروائی تھی پھر جیکسن ہائٹ دیکھنے کی بھی ایک اپنی کشش تھی۔

جیکسن ہائٹ کا نام ان پاکستانیوں سے سن رکھا تھا جو نیویارک سے پاکستان آتے تھے۔ میں جب یہ پوچھتا۔ ”کیا وہاں پاکستانی ریسٹورنٹس اور شاپس بھی ہوتی ہیں؟“ تو مجھے ہر ایک یہی کہتا۔ ”جیکسن ہائٹ تو چھوٹا پاکستان ہے۔“ اگر وہاں چلے جاؤ تو محسوس ہی نہیں ہوتا کہ آپ امریکا میں ہیں یا پاکستان میں۔ انڈیا والے اسے چھوٹا انڈیا کہتے ہیں۔ ٹورنٹو کی جیرارڈ اسٹریٹ میں دیکھ چکا تھا جہاں پورا بازار دیسیوں کا ہے۔ مگر سب یہی کہتے کہ جیکسن ہائٹ سے بڑا

دیسی بازار پورے نارتھ امریکا میں نہیں ہے۔ یہی وجہ تھی کہ میں یہاں جانا چاہتا تھا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ امریکا میں پاکستانی کس طرح سے دکانیں اور ریسٹورنٹ چلاتے ہیں اور وہاں لوگ کس ماحول اور کیفیت میں آتے ہیں۔

جیکسن ہائیٹ نیویارک کے علاقے کوینز میں واقع ہے۔ ایسا سمجھیں کہ کوینز اور مینہٹن کے بیچ میں ہے۔ دیسیوں کا ایک اور بازار نیویارک میں کونی آئی لینڈ بھی ہے مگر میں اب جیکسن ہائیٹ جارہا تھا۔ طارق نے بتایا کہ آدھے گھنٹے کی ڈرائیو پر ہے۔ ہم کچھ وقت پہلے ہی گھر سے نکل گئے کیونکہ طارق نے مجھ سے کہا تھا کہ ڈنر سے پہلے تم بازار دیکھ لو۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ میں بقول اس کے ان فضول کاموں میں اپنی ٹانگ ضرور اڑاتا ہوں۔

ہم گاڑی میں جارہے تھے۔ موسم قدرے سرد ہونا شروع ہوگیا تھا۔ پچھلے دنوں ہماری خوش قسمتی سے موسم نے ہمیں ستایا نہ تھا اور ہم آرام سے مینہٹن گھومتے رہے تھے۔ سر جی اور شہباز چلے گئے تو موسموں کے تیور بھی بدلنے لگے تھے۔ طارق نے بتایا کہ جیکسن ہائیٹ پہلی جنگ عظیم کے دنوں میں آباد ہونا شروع ہوا تھا۔ مینہٹن رہنے کے لیے بہت مہنگا ہوگیا تھا تو اس کی ڈیولپمنٹ شروع ہوئی تھی۔ اپنی بات آگے بڑھاتے ہوئے میری معلومات میں اضافہ کررہا تھا سب سے پہلے آٹھ آٹھ منزلہ اپارٹمنٹ بلڈنگز پارکوں کے اردگرد بنائی گئیں تو اسے سٹی آف گارڈن کہا جانے لگا۔ جو لوگ یورپ سے یہاں آئے تھے وہ ادھر آبسے۔ 1940ء تک یہاں یہودیوں کو بسنے کی اجازت نہ تھی اور سیاہ فام تو یہاں 1968ء تک بھی نہ آسکتے تھے۔

میں حیران تھا کہ اسے تاریخ سے اتنی دل چسپی کیسے ہوگئی ہے۔ اسے تو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ مجسمہ آزادی فرانسیسیوں نے امریکا کو تحفے میں دیا تھا۔ میں اس کی معلومات پر ششدر تھا اور آخر یہ پوچھ ہی لیا۔ ”تم کو یہ سب کس نے بتایا ہے۔ تمہیں تو یہ تک پتا نہیں تھا کہ تمہارا گھر کب بنا تھا۔“

گاڑی کے اسٹیئرنگ موڑتے ہوئے ہنس کر بولا۔ ”تم نے اپنی ڈائری میں جو نوٹس لکھے تھے، وہی آج دیکھ رہا تھا۔“

میں نے کہا۔ ”اچھا یہ بتاؤ اور میں نے کیا لکھا تھا۔“

کہنے لگا۔ ”یہی یاد رہا جو بتایا ہے۔“ پھر بولا۔ ”تمہارا دماغ تو خراب نہیں۔ تمہیں کیا پڑی ہے کہ یہ معلوم کرو کہ کب آباد ہوا اور کیوں آباد ہوا۔“ پھر پریشانی میں سر ہلا کر بولا۔ ”مجھے تو فکر ہے کہ تم اپنی پڑھائی اور جاب کیسے کرو گے؟ جبکہ تمہارے شوق ایسے ہیں نہ تم کو ان کا فائدہ ہے نہ کسی اور کو۔“ پھر وہ ہمیشہ کی طرح کہنے لگا۔ ”تم کو کیا معلوم کہ یہاں کتنی محنت کی جاتی ہے۔ میں نے برف ہٹائی ہے، کالنگ کارڈز بیچے ہیں، کوئی چھوٹے نہیں بیچتا رہا۔“ مجھے ایسا لگتا تھا کہ اسے شروع کے دنوں کی صرف یہی تین چار باتیں یاد ہیں۔ میں اسے چھیڑنے کا ارادہ کرتا مگر خاموش ہو رہتا۔ یہ نہیں کہ میں اس کے غصے سے ڈرتا تھا بلکہ اس لیے کہ جب بھی اس کو ذرا تنگ کیا تو چھینکیں مارنے لگتا تھا۔

طارق اور تمنا بھابی کو یہی فکر رہتی تھی کہ کینیڈا، امریکا میں اپنے آپ کو بسانے کے لیے رات دن کی سخت جدوجہد کی ضرورت ہوتی ہے اور میرا دھیان کہیں اور لگا ہوا ہے۔ وہ کبھی کبھار مجھے شک بھری نظروں سے دیکھتے کہ میں اس ماحول میں چل بھی سکوں گا کہ نہیں مگر میں اپنے آپ کو اچھی طرح سمجھتا تھا کہ کسی بھی راستے پر میں سیدھی نظر رکھ کر نہیں چل سکتا تھا۔ میری نظریں آس پاس بھٹکتی ہی رہتی تھیں۔ میں سرسری طور پر کہیں سے بھی نہ گزرنا چاہتا تھا۔ کوئی بھی جگہ دیکھی تو آکر اس کی تاریخ کھنگالی اور پھر سے اسے دیکھنے پہنچ گیا۔ میرے بچے پہلے تو مجھ سے نالاں رہتے تھے کہ میں اپنا وقت برباد کرتا ہوں مگر وقت کے ساتھ وہ بھی عادی ہوگئے اور تو اور ان کو بھی میں نے اب اپنی طرح کا بنا لیا۔

میں نے طارق کو اپنے بقیہ نوٹس سے بتایا کہ جیکسن ہائیٹ میں پچپن فیصد ہسپنک رہتے ہیں جو میکسیکو، السلواڈور اور جنوبی امریکا کے دوسرے ملکوں سے آکر یہاں آباد ہوئے ہیں اور 23 فیصد ایشیائی باشندے رہتے ہیں جبکہ گورے صرف بیس فیصد ہیں۔ ساٹھ کی دہائی میں پہلے جنوبی امریکا کے لوگ یہاں آکر بسنا شروع ہوئے اور اسی کی دہائی کے آخر میں ایشیائی لوگ آنا شروع ہوئے تھے۔ پاکستانی بھی ساٹھ ہی کی دہائی میں امریکا آنے لگے۔ پہلے یہ انگلستان جایا کرتے تھے کیونکہ وہ قریب تھا۔ امریکا ایک دور دراز ملک تصور کیا جاتا تھا۔ جیسے جیسے ہسپانک اور ایشیائی یہاں گھسنے لگے تو گورے ہمیشہ کی طرح یہاں سے مضافات کی جانب کھسکنے لگے۔ ستر کی دہائی میں تو ہسپانک اور ایشیائی لوگوں کا سیلاب امڈ آیا۔ یہاں اپنا کاروبار شروع کرنے

لگے اور آج نارتھ امریکا کا سب سے بڑا دیسی بازار بنا ہوا ہے۔

جیکسن ہائیٹ کی وجہ شہرت ایک اور بھی رہی ہے اور اب بھی ہے کہ یہ ہم جنس پرستوں کا گڑھ 1930ء سے رہا ہے۔ ہر سال ان کی پریڈ بھی ہوتی ہے۔ کانوں میں بالیاں اور چہرے پر عجیب وغریب رنگ بھرے یہ ہر سال یہاں اپنی ''بسنت'' مناتے ہیں۔ 1956ء میں بنی الفریڈ ہچکاک کی مشہور فلم The Wrong Man کی بیشتر شوٹنگ یہیں جیکسن ہائیٹ میں ہوئی تھی۔

میں اسے یہ سب بتا رہا تھا مگر اس کا دماغ کہیں اور لگا ہوا تھا۔ میں چپ نہ ہوا تو جھنجھنا کر بولا۔ ''اپنی یہ بک بک بند کرو اور بتاؤ کہ ڈیرہ کیسا ہے؟'' اس کے بعد جیکسن ہائیٹ پر پہنچتے پہنچتے اپنے شہر ڈیرہ اسماعیل خان کی باتیں ہوتی رہیں۔

اترے تو پوچھا۔ ''تمہاری واپسی کب ہے؟''

میں نے کہا۔ ''پرسوں جا رہا ہوں۔''

وہ کچھ سوچ کر بولا۔ ''میں کل جلدی آ جاؤں گا۔ تمہیں اٹلانٹک سٹی کا چکر لگوا آتا ہوں۔''

میرے استفسار پر کہنے لگا۔ ''یہاں سے دو گھنٹے کی ڈرائیو پر ہے۔''

میں نے کہا۔ ''کوئی میوزیم ہے وہاں پر؟''

وہ غصے میں سر جھٹک کر بولا۔ ''میوزیم نہیں، کیسینو ہیں اور بڑی رونق والی جگہ ہے۔'' یہ کہہ کر وہ بہت دیر زیر لب کچھ بڑبڑاتا رہا۔

اتنے میں ہم جیکسن ہائیٹ میں گاڑی پارک کر رہے تھے۔ کچھ اور دیکھنے سے پہلے مجھے پکڑ کر ایک حجام کی دکان میں لے آیا اور شیشے کے سامنے ایک کرسی پر بٹھا دیا اور خود چھینکنے لگا۔ ایک بڑا تولیہ وہ ہر وقت ہاتھ میں پکڑے ہوتا تھا وہ اس سے اپنی ناک صاف کرنے لگا۔

حجام سے میں کٹنگ کروا کر اٹھا تو اپنے آپ کو بدلا ہوا پایا۔ پہلے سے تھوڑا سا مہذب لگ رہا تھا۔ طارق نے مجھے کچھ اچھے حلیے میں دیکھا تو ہلکا سا مسکرایا اور پھر بولا۔ ''تم تو کینیڈا آ کر اپنے آپ کو ملنگ بنا بیٹھے تھے شکر ہے کہ کچھ شکل تو نکلی تمہاری۔''

باہر نکلے تو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے میں پاکستان میں کہیں گھوم رہا ہوں۔ عورتیں بچوں سمیت قومی لباس میں ملبوس نظر آ رہی تھیں۔ دکانوں سے لوگ نکل رہے تھے۔ یا پھر داخل ہو رہے تھے۔ کئی ایک نوجوان ٹولیوں میں باہر کھڑے گپیں ہانک رہے تھے۔ سب نے سردی سے بچاؤ کے لیے اپنے آپ کو لپیٹا ہوا تھا۔ ان کے قہقہے گونج رہے تھے۔ ایک بارلیش بزرگ ہاتھ میں تسبیح پکڑے شاید مسجد سے آ رہے تھے یا جا رہے تھے۔ میں دکانوں میں جھانکنے لگا۔ وہاں انڈین اور پاکستانی ریسٹورنٹ تھے۔ منی چینجر، بوتیک، اردو کی کتابوں کی دکانیں، سیلون، گروسری اسٹورز، حلال میٹ، ٹریولنگ ایجنٹس اور ویڈیو شاپس تھیں۔ جیولری کی دکانیں بہت تھیں جن کو پاکستانی یا انڈین چلا رہے تھے۔ سردیوں کی وجہ سے وہ رش نہ تھا جو گرمیوں میں ہوتا ہے۔ طارق بتلا رہا تھا کہ گرمیوں میں یہاں ایک میلہ لگا ہوتا ہے۔ فٹ پاتھ تک ٹھیلے لگے ہوتے ہیں۔ سموسے، دہی بڑے، چاٹ بک رہی ہوتی ہے۔ لوگ دور دور سے کھانا کھانے اور گھومنے کے لیے آتے ہیں۔ لگے ہاتھوں پورے ہفتے کی گروسری بھی کر جاتے ہیں۔

پاکستان کا اعلیٰ کوالٹی کا چاول آپ کو پاکستان میں نہیں مل سکتا مگر یہاں مل جاتا ہے۔ گروسری کے اسٹور بھرے پڑے تھے۔ ہندو پاک کی کیا چیز ہے جو دستیاب نہ ہو۔ پنساری کا سارا سامان اچھی پیکنگ میں یہاں دستیاب تھا۔ مصالحہ جات کی بھرمار تھی اور خواتین کی توجہ کا مرکز بھی یہی دکانیں تھیں۔ دنیا کا خالص دیسی گھی آپ کو لندن یا امریکا میں ہی ملتا ہے۔ اس کی خوشبو اس کا ڈھکن کھولتے ہی ہر جانب پھیل جاتی ہے۔ دنیا کا بہترین کوالٹی کا شہد بھی آپ کو یہاں ہی مل سکتا ہے۔ کوئی عام کام کرنے والا آدھے گھنٹے کی کمائی پر پوری شہد کی بوتل خرید سکتا ہے اور ایک گھنٹے کی کمائی پر ایک کلو دیسی گھی خرید لے۔

پاکستان میں رہنے والوں اور یہاں کے لوگوں کی زندگی میں فرق یہ ہے کہ امریکا یا کینیڈا میں اگر آپ مہینے کا دو ہزار کماتے ہیں تو تین سو ڈالر میں آپ ایک فیملی کی اچھی گروسری کر لیتے ہیں۔ دو سو ڈالر میں آپ گیس اور بجلی کا بے تحاشا استعمال کر لیں۔ ڈیڑھ سو ڈالر میں گاڑی کا پیٹرول اور کچھ باقی خرچے مگر اپارٹمنٹ کا کرایہ زیادہ ہوتا ہے جو ایک ہزار سے دو ہزار کے بیچ ہو سکتا ہے۔ اگر گھر میں دو کمانے والے ہوں تو بچت ہو جاتی ہے اور یہ بچت ہر دوسرے سال پاکستان جانے کے ٹرپ، تحفے تحائف اور اپنی شان و شوکت دکھانے میں صرف کر کے پھر سے خالی ہاتھ واپس آ کر اپنے کاموں میں لگ جاتے ہیں۔ ڈاکٹر پندرہ بیس ہزار ڈالر بنا

لیتا ہے۔ دوسرے پروفیشن جاب والے آٹھ سے دس ہزار ڈالر آسانی سے کما لیتے ہیں۔ آج کل تو پاکستان میں بھی اچھی تنخواہ مل جاتی ہے مگر فرق سکون کے احساس کا ہے۔ یہاں آپ کو کھانے پینے، مہنگائی، میڈیکل اور بچوں کی تعلیم کی فکر وہ نہیں ہوتی جو پاکستان میں ہوتی ہے۔ گیس یا بجلی شاید ہی کبھی ایک لمحے کے لیے پورے سال میں ایک بار چلی جائے۔ ضروریاتِ زندگی کی ہر چیز آپ کی دسترس میں ہے، چاہے آپ کم کما رہے ہیں یا زیادہ۔ جو اچھا کما لیتے ہیں ان میں اور جو کم کماتے ہیں ان میں فرق صرف ان کی گاڑیوں اور گھروں سے معلوم ہوتا ہے۔ ورنہ کھانے پینے اور اسکولوں میں وہ تمام ایک ہی مقام پر کم وبیش رہتے ہیں۔ انسانوں کے طرزِ زندگی میں کوئی بہت بڑا فرق نہیں کہ کوئی کسی کے سامنے دبکا رہے کہ آپ اس سے زیادہ دولت مند ہیں۔ دب کر صرف اس وقت رہے گا جب آپ کسی امیر کے ملازم ہوں گے۔

یہاں کوئی بھی کسی کو اپنی شان وشوکت سے متاثر نہیں کرسکتا۔ کوئی گاڑی یا بڑے گھر کو دیکھ کر دوسرے سے زیادہ متاثر نہیں ہوتا۔ معیارِ زندگی میں کوئی زیادہ فرق نہیں۔ مالک ہو یا ملازم، دونوں کم وبیش ایک ہی طرح سے کھاتے ہیں، ایک ہی طرح کا رہتے ہیں۔ گاڑیوں میں کچھ فرق ہو سکتا ہے مگر اس کی پرواہ کوئی نہیں کرتا۔ آپ محنت کرنے والے ہیں تو یہ ملک آپ کی عزتِ نفس کو نہیں کچلتے۔ نہ تو کسی کے لیے ٹریفک کا روٹ لگے گا اور نہ ہی کوئی گارڈ لیے گھومے گا اگر کہیں لائن لگی ہے تو تمام کھڑے ہیں۔ کوئی امیر اور غریب کا فرق نہیں ہوتا۔ کوئی آپ کو دھکیل کر پیچھے نہیں کرسکتا بلکہ اس کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ آپ کو کسی کو بھی جھک کر سلام نہیں کرنا پڑتا۔ کل میں انٹرنیٹ پر اپنی یہ تحریر لکھتے ہوئے دیکھ رہا تھا کہ ٹرمپ کے پریس سیکریٹری ایپل اسٹور پر خود آ کر ایک ڈیوائس خرید رہا تھا اور ایک خاتون اس کی بے عزتی کر رہی تھی کہ تم لوگ امریکا کا چہرہ بگاڑ رہے ہو۔ وہ مسکرا کر سنتا رہا اور پھر تیزی سے باہر نکل گیا۔ انسان کم کھا کر زندگی بسر کرلیتا ہے مگر کم ظرف کے ہاتھوں کچل کر نہیں رہ سکتا۔

اگر کوئی امریکا یا دوسرے مغربی ممالک میں رہ کر پاکستان میں نہیں بس سکتا، تو وجہ ایک ہی ہے کہ آپ ہر جگہ کسی کے محتاج نہیں ہوتے۔ آپ سے کوئی رشوت نہیں لے سکتا۔ آپ کا کام قانون کے مطابق ہے تو آپ کو کوئی فکر نہیں۔ فون کریں اور کام ہوگیا۔ میں نے آج تک بجلی اور گیس کا کوئی محکمہ نہیں دیکھا۔ ہم جب پاکستان میں آتے ہیں تو لوگوں سے ہوتی زیادتی کو زیادہ محسوس کرتے ہیں۔

اب سیاسی حالات تبدیل ہوئے ہیں تو مسلمانوں میں ایک خوف بھر آیا ہے۔

ہم پاکستان کے لوگوں کو عزتِ نفس دے دیں تو وہ دوسروں سے کم سطح کی زندگی پر بخوشی رہ لیں گے مگر جب اپنے لیے ایک اور قانون اور بڑے کے لیے دوسرا قانون دیکھیں گے تو ان کا خون کھولنے لگے گا۔ میں اتنا گھومنے اور زندگی کا تجربہ پانے پر یہ سمجھ پایا ہوں کہ انصاف کے بغیر معاشرہ گندگی کا ڈھیر ہے۔

میں جب آج یہ سفرنامہ کاغذ پر اتار رہا ہوں تو ایک اہم بات بتاتا چلوں کہ کئی چیزوں اور واقعات کو ہم اپنے لیے تباہی سمجھ رہے ہوتے ہیں مگر بہت سی چیزوں میں سے اچھے پہلو بھی نکل آتے ہیں۔ چند ماہ پہلے ٹرمپ امریکا کا صدر بنا تو ایک خوف ساری دنیا کے مسلمانوں کے بیچ پھیل گیا کہ اب ان کا کیا بنے گا۔ میری رائے ذرا مختلف تھی۔ میں یہی کہتا تھا کہ اس سے مسلمانوں کے خلاف جو رقابت مغرب میں پھیل رہی تھی وہ رک جائے گی۔ میرا اندازہ چار ماہ میں سچ ثابت ہونے لگا ہے۔ کچھ سال پہلے ایک مسلمان مسافر امریکا میں مقامی پرواز کے دوران جہاز میں نماز پڑھنے لگا تو کھلبلی مچ گئی تھی۔ جہاز کو واپس اتار لیا گیا تھا مگر اب میں نے دیکھا کہ ڈیلاس اور ہوسٹن کے ائرپورٹ پر مسلمان باجماعت نماز پڑھ رہے ہیں اور امریکن ان کی تصویریں بنا رہے ہیں۔ کوئی گورا مجھ سے اب ملتا ہے تو یہی کہتا ہے کہ ہمیں افسوس ہے کہ آپ پر مشکل وقت ہے مگر ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ اب آپ کو حقارت سے نہیں ہمدردی سے دیکھا جانے لگا ہے۔ آپ کو ظالم نہیں مظلوم سمجھنے لگے ہیں۔ آپ کے حق میں لوگ سڑکوں پر نکل رہے ہیں۔ آج کینیڈا میں اسلام فوبیا کے خلاف بل پیش ہوا ہے۔ کیا ٹرمپ کے آنے سے پہلے ایسا ہو سکتا تھا؟ میرے خیال میں کبھی نہیں۔ ٹرمپ نے مسلمان ممالک کے خلاف ویزے کے کچھ اعلانات کیے تو ایک فیڈرل جج نے صدارتی حکم اڑا کر رکھ دیا۔ یہاں کے ادارے ریاست کے تابع ہیں، ہماری طرح حکومتوں کے نہیں۔ اب یہاں کے لوگ انسانوں میں ایسی تفریق پر احتجاج کرتے ہیں۔ یہ ہے اصلی جمہوریت۔

آج کے دن تک میں نے ایسا ہوتا محسوس کیا ہے، کل کچھ

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

انہونی ہو جائے تو اور بات ہے۔

میں جیکسن ہائیٹ سے کہاں آ نکلا ہوں؟ مگر مجھے یہ سب کہنا تھا کیونکہ میں بھی پاکستان، مسلمانوں کے لیے اور سب انسانوں کے لیے ایک دل رکھتا ہوں۔ اگر کچھ لوگ مجھے پڑھتے ہیں تو ان تک کوئی بات پہنچانا بھی میرا فرض ہے۔ چلیں دوبارہ جیکسن ہائیٹ کی طرف آتے ہیں جہاں طارق میرے پیچھے پیچھے بے دلی سے دکانوں میں گھومتا پھر رہا تھا۔

ایک سکھ سلے سلائے کپڑے بیچ رہا تھا جیسے امرتسر میں بیٹھا ہو۔ شوکیس میں چاندی کی جیولری سجائی ہوئی تھی۔ میں بے خیالی میں داخل ہوا تو اس نے مجھے دھر لیا۔ مجھے جیولری دکھلا رہا تھا۔ انڈیا میں جیولری کا کام شاید اچھا ہوتا ہوگا کیونکہ وہ بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ وہی انداز، وہی مول تول اور وہی لہجہ۔ مجھے اچھا لگ رہا تھا کہ جیسے میں پاکستان میں کسی دکاندار سے محو گفتگو ہوں۔ یہاں وہ پنجابی بولیں یا ہندی مگر ہم کو سکھ نجانے کیوں اپنے قریب محسوس ہوتے ہیں۔ وہ بھی پاکستانیوں سے بہت محبت سے پیش آتے ہیں۔ ہم ان سے یا وہ ہم سے کبھی بھی سیاست پر بات نہیں کرتے۔ سکھ تو پھر بھی کچھ نہ کچھ کہہ جاتے ہیں مگر انڈیا کا ہندو کبھی بات نہیں کرتا۔ مجھے اس سے کچھ لینا دینا نہ تھا۔ اس نے میرے تاثرات دیکھ لیے تھے، اسی لیے جیولری دوبارہ شوکیس میں رکھ کے کچھ اور باتیں کرنے لگا۔

وہاں سے نکلے تو ایک بک شاپ میں جا گھسے۔ طارق کہنے لگا کہ میں پہلی بار کتابوں کی دکان میں آیا ہوں۔ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا پاکستان میں بھی وہ کتابوں سے دور بھاگتا رہا تھا۔ کہنے لگا۔ ”پتا نہیں، اتنی موٹی کتابیں لوگ کس طرح سے پڑھ لیتے ہے۔“

میں نے کہا۔ ”تم نے شاید یہ سنا نہیں ہے کہ کتابوں سے اچھا کوئی دوست نہیں ہوتا۔“

جواب میں وہ بولا۔ ”یہ تم ان لوگوں کی بات کر رہے ہو جن کو کبھی کوئی اچھا دوست نہیں ملتا۔“

میں نے بھی بحث باندھ لی اور کہا۔ ”میرے دوست بھی اچھے ہیں اور کتابیں بھی پڑھتا ہوں۔“

میری بات پر جھلا کر بولا۔ ”تم تو اپنے آپ کو فلاسفر سمجھتے ہو۔ یہ امریکا ہے امریکا۔ یہاں محنت کرنی پڑتی ہے کتابیں پڑھنے سے کچھ نہیں ملتا۔ مجھے دیکھوں میں نے برف، کالنگ کارڈز۔ چھولے بیچے ہیں۔“

یہاں دکان میں زیادہ تر مذہبی کتابیں تھیں۔ قرآن پاک اور احادیث کی لاتعداد کتابیں موجود تھیں۔ کئی ایک تفاسیر کے علاوہ اردو ادب سے متعلق بہت کتابیں یہاں تھیں۔ ایک بڑا حصہ ان کتابوں کا تھا جس میں بچوں کو اردو سکھائی جاتی تھی۔ دکاندار کہنے لگا کہ ہر پاکستانی ماں باپ کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کے بچے اردو لکھنا اور پڑھنا سیکھ جائیں۔ وہ یہ کتابیں لے جاتے ہیں۔ پوری محنت کرتے ہیں اور آخر میں تھک ہار کر اپنے ہتھیار پھینک دیتے ہیں۔ یہاں کے بچے اردو بول تو لیتے ہیں مگر لکھ نہیں سکتے۔ طارق نے کہا۔ اس کی بیسمنٹ میں اردو سیکھنے کی بہت سی کتابیں موجود ہیں مگر بچوں کے پاس اتنا وقت ہی نہیں ہوتا کہ اس کی جانب راغب ہوں۔ کلاس کا ہوم ورک اور قاری صاحب سے قرآن پڑھنے میں ان کا سارا وقت بیت جاتا ہے۔ بچے خود بھی اردو لکھنے پڑھنے میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے۔ اس پر ان بچوں کے والدین اندر ہی اندر کڑھتے رہتے ہیں۔

ایک اور مسئلہ جو یہاں کے والدین کو درپیش ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ زیادہ تر بچے آپس میں انگلش میں بات کرتے ہیں۔ لاکھ انہیں روکیں مگر پھر بھی اکیلے ہوں گے تو خود بخود انگلش میں بات کرنا شروع ہو جائیں گے۔ ماں باپ کے ساتھ تو ٹوٹی پھوٹی اردو میں باتیں کر لیں گے مگر آپس میں پھر وہی انگریزی۔ میں نے اس کا یہ علاج نکالا کہ ہر سال انہیں پاکستان لے جانے لگا تاکہ ان کی اردو ٹھیک ہو جائے اور رشتہ داروں سے جان پہچان بھی ہوتی رہے۔ یہ تو بھلا ہو فیس بک اور واٹس اپ کا کہ سب رشتہ دار ایک دوسرے کے قریب آ گئے مگر اردو اس لیے زیادہ نہ سیکھ سکے کہ پاکستان میں سب اپنی انگلش ٹھیک کرانے کے لیے ان سے اسی زبان میں بات کرتے ہیں۔ وہاں ایک نیا ڈراما یہ شروع ہو جاتا ہے کہ ہم بچوں کی اردو ٹھیک کروانے میں لگے ہوتے ہیں اور وہاں کے بچے اپنی انگریزی میں مہارت پیدا کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ ایک بہت بڑا سوشل مسئلہ والدین کے لیے پیدا ہو گیا ہے۔ وہ درمیان میں پھنسے کھڑے ہیں۔ پاکستان واپس جا نہیں سکتے اور امریکا یا کینیڈا چھوڑ نہیں پاتے۔ بچے ایک بار بڑے ہو جائیں تو امریکا یا کینیڈا چھوڑنا پھر ان کے لیے بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ کینیڈا میں ایک جمیل صاحب ہوا کرتے ہیں۔ ان کے ساتھ تو ایک انتہائی عجیب واقعہ ہوا۔

(جاری ہے)

پیام بر

خالد قریشی

کبوتر بازی ایک ایسا شوق ہے جس کو برصغیر میں اہمیت حاصل ہے۔ بعض کبوتر باز فضا میں اڑتے کبوتروں کی خاص خوبی اتنی تفصیل سے بتاتے ہیں کہ سننے والا حیران رہ جاتا ہے۔ ایسے ہی شوقینوں کے لیے یہ تحریر ایک تحفہ ہے۔

کبوتر کے اقسام پر مختصری تحریر

"واسطہ اے رب دا تو جائیں وی کبوترا"

ہمارے بچپن میں فلم "دِلا بھٹی" کا یہ گیت نہایت مقبول ہوا۔ کبوتر کی کارکردگی نے فلم بینوں کے دل موہ لیے۔ فلم دیکھنے کے بعد ہمیں بھی کبوتر رکھنے کا شوق چرایا اور ہم

والد صاحب کے ہمراہ پرندوں کی مارکیٹ کی طرف چل دیے۔ جہاں پرندوں کی متعدد دکانیں اور ان کی مختلف اقسام کے علاوہ ان کی خوراک بھی دستیاب تھی۔ کافی پرانی بات ہے لیکن ہمارے دماغ میں ایسے منقش ہے

جیسے کل کی بات ہو۔ مارکیٹ کے درمیان کبوتروں کی نہایت خستہ حالت برمبنی دکان تھی جس کے بوڑھے مالک کا نام محمد خان تھا۔ طبیعت کے لحاظ سے محمد خان نہایت خودغرض، چالاک اور اکھڑ مزاج واقع ہوا تھا لیکن اس کی دکان میں نہایت گراں قدر پرندوں کی وسیع اقسام پائی جاتی تھیں۔ ہم چونکہ والد صاحب کے ہمراہ تھے۔ اس لیے ہمیں محمد خان کی اکھڑ مزاجی یا پھر گراں فروشی کی رتی برابر بھی پروانہیں تھی۔ اس لیے نہایت دھڑلے کے ساتھ والد صاحب کے ساتھ دکان میں داخل ہوئے اور کبوتروں کے پنجروں کے درمیان میں بند اس جوڑی پر اپنا ہاتھ رکھ دیا جو محمد خان کی دکان کی سب سے مہنگی اور اعلیٰ نسل کی حامل جوڑی کا اعتبار رکھتی تھی۔ وہ کاغذی نسل کی خوب صورت جوڑی تھی۔ جس کا رنگ دودھ کی طرح سفید، آنکھیں نیلی اور قد کاٹھ کافی بڑا تھا۔ حسب توقع جوڑی کی قیمت بھی نسل کے لحاظ اور محمد خان کی فطرت کو مدنظر رکھتے ہوئے کافی زیادہ تھی۔ والد صاحب نے بھاؤ تاؤ کرنے کے بعد جوڑی خرید لی اور ہم اسے ٹوکری میں بند کرنے کے بعد خوشی خوشی گھر لے آئے۔

فلم ''دلا بھٹی'' میں صبیحہ خانم نے کبوتر کو جس انداز میں پیغام رسانی کے لیے استعمال کیا ہم بھی کچھ ویسا ہی تجربہ کرنا چاہتے تھے لیکن گھر میں قدم رکھنے کے فوراً بعد والد صاحب نے کبوتروں کی جوڑی کے پروں کو قینچی کے ذریعے کاٹ دیا۔ سو ہمیں اپنی امیدوں پر پانی پھرتا دکھائی دینے لگا۔

پر کٹا ہوا کبوتر پیغام رسانی کے لیے ناموزوں تھا لیکن ہم کبوتر بازی کے چیدہ چیدہ اصولوں اور کبوتروں کی صحت وحفاظت سے متعلق کافی سے زیادہ معلومات بخوبی رکھتے تھے۔ قینچی سے کٹنے والے پر اس وقت تک دوبارہ نہیں آسکتے جب تک انہیں کھینچ کر باہر نہ نکال دیا جائے۔ قینچی سے کٹنے کے بعد ان کی نشوونما پانے والی نوکیں ختم ہوکر رہ جاتی ہیں اگر ان تباہ شدہ کلیوں کو تلف نہ کیا جائے۔ کبوتر سال بھر تک پرواز کے قابل نہیں ہو پاتا۔ کبوتروں کے علاوہ بھی تمام پرندے سال کے آخر میں یا پھر شروعات کے دوران اپنے پروں کے جھڑنے کا آغاز کرتے ہیں۔ پر گرانے کے اس عمل کو گریز کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔ یہ ایام ان کے آرام کے دنوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ان کی مکمل سال کی صحت وچستی و چالاکی کا دارومدار انہی چند ایام پر منحصر ہوتا ہے۔ کبوتروں کے شوقین ان ایام کے دوران اپنے کبوتروں کے آرام وصحت کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ ان کی خاطر و مدارت بادام، اخروٹ اور مکئی کے دانوں سے کی جاتی ہے۔ پروں کو قینچی کے ساتھ کاٹ دیا جاتا ہے اور جوڑیوں والے کبوتروں کو ماداؤں سے علیحدہ کردیا جاتا ہے تاکہ وہ آرام کے ان دنوں میں محنت ومشقت سے دور رہ سکیں اور آنے والے ایام میں اڑان وسیان میں قابلِ تعریف کارکردگی دکھا سکیں۔

ہم نے بھی کبوتروں کی انہی اڑان وسیان کی صلاحیتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنی کبوتروں کی جوڑی کے قینچی کے ساتھ کٹے ہوئے پر کھینچ کر باہر نکال دیے اور پھر نئی کلیوں کے واپس آنے کا انتظار کرنے لگے لیکن نئی کلیوں کے نمودار ہونے سے پہلے ہی کبوتروں کی جوڑی نے انڈے دے دیے اور نہایت محنت ومشقت کے ساتھ انڈے سینے لگی۔ کبوتروں کے انڈوں سے بچے بائیس دن کے اندر باہر نکل آتے ہیں۔ انہیں ماں باپ سے علیحدہ ہونے کے لیے تیس سے پینتیس دن کا عرصہ درکار ہوتا ہے۔

ہمارے گھر میں خوراک کی فراوانی تھی۔ کبوتروں کی جوڑی کو جوار اور باجرے کے علاوہ گھر میں بچ جانے والے چاول اور مزید لوازمات بھی میسر آجاتے تھے۔ اس لیے خوراک کی زیادتی کی وجہ سے جوڑی خوب صحت مند دکھائی دینے لگی۔ نئے پروں کے آنے کا عرصہ مہینے کے آخر تک محیط ہوتا ہے۔ جوڑی نے بائیس دنوں کے دوران بچے نکال دیے اور چھبیسویں دن نر کبوتر مختصر کلیوں کے ساتھ فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا۔ مادہ کبوتری نہایت تندہی کے ساتھ بچوں کو پالنے میں مصروف تھی۔ نر کبوتر اکیلا بچے نہیں پالتا لیکن مادہ بخوشی پال لیتی ہے۔

ہم نے شکر ادا کیا کہ مادہ کبوتر فرار نہیں ہونے پائی تھی ورنہ بچوں کی جان کے لالے پڑ جاتے۔ اب ہمیں نر کے متعلق فکر لاحق ہوئی۔ اس کا یوں بے وفائی کر جانا ہمیں ایک آنکھ نہیں بھایا تھا۔ ہماری پریشانی کو مدنظر رکھتے ہوئے والد صاحب نے ہمیں ہمراہ لیا اور دوسرے دن محمد خان کی دکان کی جانب چل دیے۔ دکان میں قدم رکھتے ہی ہماری نظر انتخاب جس سفید نسل کے کاغذی کبوتر پر پڑی۔ آپ یقین جانیے گا کہ وہ ہی کبوتر تھا جو

چند دن قبل ہمارے گھر سے فرار ہوا تھا۔ ہم نے کبوتر کی بابت جب محمد خان سے دریافت کیا تب اس نے نہایت ڈھٹائی کے ساتھ مسکراتے ہوئے ہمیں بتایا کہ کاغذی کبوتروں میں یہ صلاحیت یا خوبی پائی جاتی ہے کہ وہ سالوں کے عرصے کو نظر انداز کرتے ہوئے واپس اپنی جائے پیدائش والی جگہ پر آنے کی طاقت رکھتے ہیں۔ اس نے نہایت ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہمیں آفر کی کہ اگر اسے خریدنا ہے تو پہلے والے معاوضے سے کچھ زیادہ ادا کرنا ہوگا۔

وہ اس بات کو نہایت آسانی کے ساتھ جانچنے میں کامیاب ہوگیا تھا کہ کچھ دن قبل کبوتر بچے نکالنے کے بعد فرار ہوا تھا۔ ہماری مجبوری سے فائدہ اٹھانے کے لیے اس نے کبوتر کی قیمت میں اضافہ کردیا تھا۔ مرتے کیا نہ کرتے۔ مجبوراً ہمیں رقم ادا کرکے کبوتر کو ہمراہ لانا پڑا۔

گھر میں داخل ہونے کے بعد والد صاحب نے ہمیں تنبیہ کی کہ اب کبوتر کو صحن میں کھلا چھوڑنے سے چند عرصے کے لیے پرہیز کیا جائے۔ ورنہ سیان شدہ کبوتر کو ہمیں اگلی دفعہ پھر محمد خان کی دکان سے مزید رقم کے اضافے کے ساتھ خریدنا ہوگا۔

ہم نے والد صاحب کی ہدایات پر عمل کرنے کے متعلق دل میں پکا عہد کیا اور کبوتروں کی جوڑی کو کاٹھ کباڑ سے بھرے کمرے میں بند کردیا۔ کمرے کے باہر کی طرف کشادہ کھڑکی موجود تھی جس کے باہر کی جانب جالی لگی ہوئی تھی۔ کبوتروں کی جوڑی جالی کے پاس بیٹھ کر حسرت بھری نگاہوں کے ساتھ باہر آسمان کو گھورتی رہتی تھی۔ صبح و شام انہیں دانہ میسر آجاتا تھا۔ اس لیے وہ خوراک کے متعلق مطمئن تھے لیکن آزاد فضاؤں میں پرواز کرنا ان کے لیے ممکن نہیں رہا تھا۔

سوا مہینے کے دوران بچے بڑے ہوگئے۔ تب ہمارے دماغ میں ایک دفعہ پھر سرکشی کا بھوت سر ابھارنے لگا۔ ہم نے جوڑی کے پر کاٹ دیئے اور انہیں بچوں کے ساتھ صحن میں کھلا چھوڑ دیا۔ ہمارے صحن کے ایک طرف دیوار کے قریب انگوروں کی بیل لگی ہوئی تھی جو دیوار کے ساتھ چڑھتی ہوئی چھت کے اوپر چلی گئی تھی۔ شام کے قریب جب ہم نے کبوتروں کو بند کرنے کے لیے انہیں کمرے کی طرف دھکیلنے کی کوششیں کیں تب نر کبوتر اڑیل بھینسے کی طرح اپنی جگہ پر جم کر کھڑا ہوگیا۔

ہم نے آگے بڑھ کر اسے پکڑنے کی کوششیں کیں۔ تب اس نے یکلخت چھلانگ لگائی اور کٹے ہوئے پروں کے ساتھ انگوروں کی بیل پر چڑھ گیا۔ ہم نے جھپٹا مار کر اسے دم کے پاس سے تھامنا چاہا لیکن اتنی دیر میں وہ کافی اوپر جاچکا تھا۔ منڈیر کے پاس پہنچنے کے بعد اس نے تنقیدی نگاہوں کے ساتھ ارد گرد کا جائزہ لیا اور یکدم کٹے ہوئے پروں کے ساتھ نیچے کی طرف اڑتا چلا گیا۔ ہم نے چھت پر چڑھ کر حیرت بھری نگاہوں کے ساتھ اسے نیچے پرواز کرتے ہوئے دیکھا۔ کلیوں کے کٹے ہونے کی بدولت اسے مختصر عرصے کے لیے اپنے آپ کو سنبھالنے میں دقت ضرور پیش آئی لیکن ہمارے گھر کی چھت چونکہ اونچائی پر واقع تھی۔ اس لیے اسے تیزی کے ساتھ نیچے جانے کے بعد اوپر اٹھنے میں چنداں دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے معقول اونچائی تک رسائی حاصل کی۔ پھر تیر کی مانند محمد خان کی دکان کی طرف اڑتا چلا گیا اور ہم ناکام و نامراد واپس صحن کی طرف چلے آئے۔ صحن میں بقایا بچ جانے والے تینوں کبوتر ہمارے منتظر تھے۔ ہم نے انہیں اسٹور میں بند کیا اور دوسرے دن فرار ہونے والے نر کبوتر کی مادہ کو ٹوکری میں بند کرنے کے بعد محمد خان کی دکان کی طرف چل دیئے۔ حسبِ توقع ہمارے گھر سے فرار ہونے والا کبوتر دکان میں موجود پنجرے میں قید دکھائی دیا۔

محمد خان نے ہماری طرف دیکھتے ہوئے مونچھوں کو تاؤ دیا۔ پھر کبوتر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''اب کی دفعہ اس کی قیمت میں مزید اضافہ ہوگیا ہے۔ اس کی وفاداری کو مدنظر رکھتے ہوئے قیمت نہایت کم ہے لیکن چونکہ تم میرے مستقل گاہک ہو اس لیے میں اس سے زیادہ کا مطالبہ نہیں کروں گا۔''

ہم نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے ہاتھوں میں تھامی ہوئی ٹوکری اسے پکڑا دی اور کہا۔ ''ہمیں کبوتر نہیں چاہیے، ہم اس کبوتری کو بھی فروخت کرنا چاہتے ہیں۔''

محمد خان طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''اتنی جلدی دلبرداشتہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں مانتا ہوں کہ سیان کے لحاظ سے کبوتروں کی یہ جوڑی بے مثال ہے لیکن میرے اندازے کے مطابق تم ان سے بچے لے چکے ہو اگر ان پر تھوڑی سی محنت کرو، تو بڑے ہونے کے بعد ماں باپ کا نعم البدل ثابت ہوں گے۔''

ہم نے اثبات میں سر ہلایا اور کبوتری کو اونے پونے داموں فروخت کرنے کے بعد خالی ٹوکری کے ہمراہ گھر چلے آئے۔

کبوتر بازی کی زبان میں سیان سے مراد کبوتروں کی وفاداری ہے۔ کبوتر انسانوں کا وفادار نہیں ہوتا۔ وہ صرف اپنی رہائش گاہ کے معاملے میں انتہا پسند ہوتا ہے۔ آپ اسے گھر سے یا پھر کچھ دور سے چھوڑ دیں۔ تب وہ واپس گھر کی جانب آنے کی کوشش کرے گا۔ جیسے محمد خان والے کبوتر نے کیا۔ چٹھی لے جانا یا پھر لانا اس کے کارناموں میں شمار نہیں کیا جاسکتا۔ یہ سب کہانیوں پر مشتمل باتیں ہیں جن کا حقیقت کے ساتھ اس کے علاوہ مزید تعلق نہیں کہ رسد و رسائل کے دور سے پہلے اسے فوج میں پیغام رسانی کے لیے نہایت معتبر طریقے سے استعمال کیا جاتا تھا۔ یہ تب کی بات ہے جب وائرلیس کا رواج نہیں تھا۔ پیغام رسانی کے لیے فوجی حکام کو ایسا پرندہ درکار تھا جو بغیر تھکے نہیں رکے طویل مسافت طے کرتے ہوئے نہایت تیز رفتاری کے ساتھ پیغام کو بارڈر سے فوجی ہیڈ کوارٹر منتقل کردے۔ کسی بھی پرندے میں ایسی صلاحیت دستیاب نہیں تھی سوائے کبوتر کے۔ لیکن عام کبوتر کا عرصہ مسافت طویل ہونے کے باعث اسے پیغام رسانی کے لیے استعمال کرنا ممکن نہیں تھا۔ جنگلی کبوتر میں ایسی صلاحیت موجود تھی لیکن انہیں سدھانا ناممکن تھا۔ فوجی حکام نے جنگل کے درمیان واقع ایسے خشک اور متروک شدہ کنویں کا انتخاب کیا جہاں جنگلی کبوتروں کا انتہائی کثیر تعداد پر مشتمل غول رہائش پذیر تھا۔ فوجیوں نے کنویں کے منہ کو جال کے ذریعے بند کرنے کے بعد جنگلی کبوتروں کے درمیان اپنی ایسی کبوتریاں چھوڑ دیں جن کا تعلق کنویں سے نہیں تھا اور وہ فوجیوں کی تربیت یافتہ سیان شدہ کبوتریاں تھیں۔ ان کا مقصد جنگلی اور پالتو کبوتروں کو اس سے ایسی نسل کی دستیابی تھا جن میں جنگلی کبوتروں کی خصلت وخوبیاں کثیر تعداد میں موجود ہوں۔ کافی عرصے کے انتظار کے بعد جب متعلقہ حکام نے کنویں کا رخ کیا تب انہیں یہ جان کر حیرت کا شدید جھٹکا لگا کہ جنگلی کبوتروں نے ان کی منتخب کردہ کبوتریوں کی جانب آنکھ اٹھا کر دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔ وہ انہیں اپنی جنس سے باہر تصور کرتے ہوئے ان کے قریب جانے کے لیے تیار نہیں تھے۔ مجبوراً متعلقہ حکام نے کنویں میں گھس کر جنگلی کبوتروں کے گھونسلوں میں سے چند جنگلی کبوتروں کے بچے اور تازہ انڈے اٹھانے کے بعد ہیڈ کوارٹر کا رخ کیا۔ ان انڈوں اور بچوں کے کراس سے ایک ایسی نسل کا قیام ہوا جسے بعد میں قاصد، ریسر یا پھر ہومرز کبوتروں کا نام دیا گیا۔ اس کبوتر کی تیز رفتاری کا یہ عالم تھا کہ پہاڑی علاقے میں موجود جنگلی باز اور شکرے بھی اس کی رفتار کا مقابلہ نہیں کرپاتے۔ عام کبوتر کی رفتار اسّی سے اٹھاسی کلومیٹر فی گھنٹا ریکارڈ کی گئی ہے لیکن قاصد، ریسر اور ہومرز کی حد رفتار ایک سو پچاس کلومیٹر فی گھنٹا سے تجاوز کرتی ہے۔ ایک سو تیس سے پینتیس کلومیٹر فی گھنٹا ان کبوتروں کی عام رفتار ریکارڈ کی گئی ہے۔ جنگ کے دوران بارڈر پر اسلحے اور فوجی جوانوں کی ضرورت پڑتی رہتی تھی۔ وہاں پیغام رسانی کے لیے ان کبوتروں کا استعمال عام کردیا گیا۔ قاصد کبوتروں کے پاؤں میں لوہے کا ایک ایسا رنگ موجود ہوتا تھا۔ جسے Messege Tube کا نام دیا جاتا تھا۔ اس ٹیوب میں کاغذ پر مشتمل پیغام باآسانی سما جاتا تھا۔ پاؤں میں موجود رنگ پر ہیڈ کوارٹر کا رینک نمبر کنداں ہوتا تھا۔ بارڈر سے آزاد ہونے کے فوراً بعد یہ قاصد کبوتر اپنی رہائش گاہ کی طرف پرواز کرتا تھا۔ اسے مطلوبہ مقام تک پہنچنے کے لیے چند گھنٹے درکار ہوتے تھے۔ ہیڈ کوارٹر میں اترنے کے بعد وہ اپنے ڈبے میں گھس کر غوں غوں کرتے ہوئے اپنی آمد سے متعلقہ افراد کو باخبر کرتا تھا۔ متعلقہ افراد اس کے پاؤں میں موجود Messege Tube میں بند پیغام کو پڑھنے کے بعد کارروائی کرتے ہوئے مطلوبہ سامان بھجوانے کا بندوبست شروع کردیتے تھے۔

یہ وہ مختصر جنگی خدمات تھیں جو عرصہ دراز پہلے قاصد کبوتروں کی انجام دہی سے تشبیہ دی جاتی تھیں۔ جواب صرف کتابوں میں دفن ہو کر رہ گئی ہیں۔ لیکن کھیل کے لحاظ سے آج بھی زندہ و جاویداں ہیں۔ قاصد کبوتروں کا ٹورنامنٹ پاکستان کے مختلف شہروں میں منعقد کیا جاتا ہے۔ اس ٹورنامنٹ میں شرکت کے لیے ہر کبوتر باز کو مخصوص فیس کی ادائیگی رقم کی صورت میں کرنا ہوتی ہے۔ جیتنے والے کبوتر کو سونے کا رنگ پہنایا جاتا ہے۔ جو یقیناً اس کے کسی بھی کام کا نہ ہونے کے باوجود بھی بہت بڑے اعزاز سے کم ثابت نہیں ہوتا ہوگا۔ کھیل کی شروعات کے

دوران تمام کبوتروں کے پاؤں میں ربڑ کی ایک چپ پہنا دی جاتی ہے جس میں روانگی کا وقت درج کردیا جاتا ہے۔ کبوتر کی پرواز کی کمی بیشی کا تعین یہی چپ کرتی ہے۔ کھیل کی شروعات کے دوران تمام کبوتروں کو پنجروں میں بند کرنے کے بعد شہر سے باہر بارڈر کے قریب منتقل کردیا جاتا ہے۔ ٹورنامنٹ میں حصہ لینے والے کبوتروں کا نام و پتا فہرست میں درج ہوتا ہے اور تمام ممبرز کی رہائش گاہ پر ٹورنامنٹ کے سرکردہ افراد یا پھر ان کے ارکان ہاتھوں میں موبائل تھامے براجمان ہوتے ہیں۔ انہیں کبوتروں کی پرواز سے مطلع کردیا جاتا ہے۔ بعدازاں جو کبوتر اپنے جائے مقام تک پہنچنے میں کامیاب ہوتا ہے اس کے پاؤں میں موجود چپ کے ذریعے فاصلے اور وقت کا تعین کرنے کے بعد پہلی اور دوسری پوزیشن کے لیے کبوتروں کو منتخب کیا جاتا ہے۔ کوئٹہ شہر کا نہایت اہمیت کا حامل ضلع چمن جو کوئٹہ سے کم و بیش ایک سو بیس کلومیٹر کی مسافت پر افغان بارڈر کے قریب واقع ہے اس کا شہر نہایت پرپیچ راستوں پر مشتمل دشوار گزار پہاڑوں سے ہٹ کر بنایا گیا ہے۔ یہاں زمانہ قدیم کی طویل ترین سرنگ واقع ہے جسے شیلا باغ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ سرنگ کم و بیش چار کلومیٹر لمبی ہے۔ جسے انگریز انجینئر کی سرپرستی میں بنایا گیا۔ اس کی بیوی کا نام شیلا تھا۔ اس لیے سرنگ کا نام اس کی بیوی کے نام پر شیلا باغ رکھا گیا۔

بہرکیف گزشتہ سال مارچ کے اوائل میں جب ٹورنامنٹ کا آغاز ہوا تب چمن کے بارڈر سے کبوتروں کو چھوڑنے کا فیصلہ کیا گیا۔ پہاڑ در پہاڑی سلسلے کے اس علاقے کو عبور کرنا عام کبوتروں کے بس کی بات نہیں تھی لیکن قاصد کبوتروں نے ممکن کر دکھایا۔ صبح نو بجے کے قریب کبوتروں کو چمن شہر کے باہر سے آزاد کیا گیا۔ وہ لوہے کے پنجروں میں مقید تھے۔ یہ پنجرے ڈاٹسن کے پچھلے حصے میں نصب کیے گئے تھے۔ آزاد ہوتے ہی کبوتروں نے طویل راؤنڈ چمن شہر کے گرد لگایا۔ پھر دشوار گزار پہاڑی علاقے کا رخ کرتے ہوئے نگاہوں کے سامنے سے اوجھل ہو گئے اور ہم عالم لاشعوری میں فوجی جوانوں کو بارڈر پر جنگ لڑتے ہوئے دیکھنے لگے۔ جس کا تذکرہ کتابوں میں بھی ہے اور فوجی چھاؤنی کی ایک قبر پر لگے کتبے میں بھی درج ہے۔ ماحول توپوں کی گھن گرج اور بندوقوں کی فائرنگ کی آواز سے گونج رہا تھا۔ تلوارزنی کا سلسلہ عروج پر تھا۔ ان سب باتوں سے ہٹ کر ایک فوجی جوان میدان جنگ سے کچھ دور خیمے میں بیٹھا پیغام تحریر کرنے میں مصروف تھا۔ اس کے ہاتھوں میں قلم دوات موجود تھی اور خیمے کے ایک طرف لکڑی کے پنجرے میں چند کبوتر بند تھے۔ پیغام لکھتے ہوئے اس بات کا خیال رکھنا اشد ضروری خیال کیا جاتا تھا کہ تحریر کا مضمون مختصر لیکن مقصد نمایاں ہونا چاہیے۔ فوجی جوان چھوٹی سی پرچی پر لکھنے میں مگن تھا۔ بارڈر پر مزید اسلحے اور فوجی جوانوں کی نفری دستیاب ہے۔ فوری انتظام کیا جائے۔ تحریر کو مکمل کرنے کے بعد فوجی جوان نے لکڑی کے پنجرے میں سے سرمئی رنگ کا ریسر کبوتر باہر نکالا اور اس کی میسج ٹیوب میں پیغام بند کرنے کے بعد اسے خیمے سے باہر نکال کر آزاد کردیا۔ دوپہر کے تین بجنے والے تھے اور آسمان بادلوں کے گھیرے میں تھا۔ شنید میں تھا کہ ریسر کبوتر ایک ڈیڑھ گھنٹے کی پرواز کے بعد فوجی ہیڈ کوارٹر پہنچنے میں کامیاب ہوجائے گا۔ دور افق پر بجلی چمکی ایسا معلوم ہوا جیسے وہاں لاکھوں انار پھوٹ پڑے ہوں۔ موسم کے تیور خطرناک تھے۔ ریسر کبوتر نے ایک لمبا چکر میدان جنگ کے اوپر لگایا۔ پھر سمت کا تعین کرنے کے بعد گولی کی رفتار کی مانند فوجی ہیڈ کوارٹر کی جانب پرواز شروع کردی۔ فوجی ہیڈ کوارٹر میدان جنگ سے ایک سو اسی کلومیٹر دور پہاڑی علاقے کے اختتام پر وقوع پذیر تھا۔ میدان جنگ اور فوجی ہیڈ کوارٹر کے درمیان میں ایک ایسا پہاڑی علاقہ پایا جاتا تھا جہاں شکاری پرندوں کی بھرمار تھی۔ مارچ کے مہینے میں ان پرندوں کی بریڈنگ کا سلسلہ عروج پر ہوتا ہے۔ ان دنوں انہیں خوراک کی اشد ضرورت ہوتی ہے اور ان علاقہ جات میں ان ایام کے دوران چڑیا بھی پر نہیں مار سکتی۔ ریسر کبوتر کو اس علاقہ ممنوعہ کے درمیان میں پرواز کرتے ہوئے شہر کی جانب سفر کرنا تھا۔ موسم بھی سازگار نہیں تھا اگر بارش برسنے لگتی تب ان چٹیل چٹانوں کے درمیان چھپنے کی جگہ موجود نہیں تھی۔ کبوتر نے ان اونچی نیچی نکیلی چٹانوں کے درمیان پرواز کا آغاز کردیا۔ اس کا ننھا دل بے تحاشا دھڑک رہا تھا۔ وہ ان چٹانوں کے درمیان آج سے پہلے متعدد بار سفر کر چکا تھا لیکن ان دنوں باز اور شکرے کی بریڈنگ کا سیزن نہیں ہوتا تھا۔ ایک باہر کو نکلی

اونچی چٹان کے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے جنگلی شکرے کی مختصر جھلک دیکھی۔ شکرے کے پروں کا رنگ اس کے رنگ سے مشابہت رکھتا، گہرا سرمئی تھا اور سر کے قریب کا حصہ گہرے سیاہ رنگ پر مشتمل تھا۔ کبوتر نے اپنی رفتار میں مزید اضافہ کیا۔ اسے اپنے اردگرد کے ماحول کی قطعی پرواہ نہیں تھی۔ وہ تیز رفتاری کے ساتھ تمام اگلے پچھلے ریکارڈ توڑتا ہوا چٹانوں کے درمیان آگے کی طرف بڑھنے لگا۔ پیچھے کی طرف دیکھنا فضول تھا۔ وہ اس بات سے باخوبی آگاہی رکھتا تھا کہ اس کی مختصر جھلک دیکھنے کے بعد شکرا اس کے پیچھے شکار کی نیت سے پرواز کر چکا ہوگا۔ تھوڑا آگے جانے کے بعد اسے اپنے پیچھے شکرے کے چلانے کی آواز سنائی دی۔ یہ اس بات کی نشاندہی تھی کہ اس نے حملے کا آغاز کر دیا تھا۔ بجلی زور کے ساتھ چمکی اور موسلا دھار بارش کا آغاز ہو گیا۔ پانی چھاجوں برسنے لگا۔ اس کے پر گیلے ہو کر بھاری ہونے لگے اور رفتار میں کمی واقع ہونے لگی۔ عام حالات میں ریسر کبوتر کے لیے باز یا شکرے کا مقابلہ کرنا چنداں مشکل نہیں ہوتا لیکن غیر معمولی حالات کے دوران اور گھبراہٹ کے عالم میں یہ تیزی و طراری ماند پڑ جاتی ہے۔ ایسے حالات کے دوران اسے شکار کرنا قطعی مشکل نہیں ہوتا۔ مستزاد یہ کہ طوفانی بارش کی وجہ سے اس کے پر بھی تیزی کے ساتھ گیلے ہوتے چلے جا رہے تھے۔ زندگی اور موت کے درمیان فاصلہ تیزی کے ساتھ کم ہونے لگا۔ اسے موت سر پر منڈلاتی دکھائی دینے لگی۔ پہاڑیوں میں واقع ایک غار میں دبکے فوجی ابر آلود آسمان پر یہ کشمکش دیکھ رہے تھے کہ شکرے کے چلانے کی آواز سے ماحول دوبارہ گونجا۔ آواز نہایت قریب سے سنائی دی تھی۔ کبوتر نے اونچے نیچے ہوتے پروں کی رفتار کو تیز کرنے کی کوشش کی لیکن اسے کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ چٹانوں کا طویل سلسلہ ختم ہونے لگا تھا اور اسے سامنے کی طرف میدانی علاقہ نمودار ہوتا دکھائی دینے لگا تھا۔ اچانک ہی چٹانوں کے ختم ہونے والے سلسلے کے دوسری جانب سے مزید ایک شکرا نمودار ہوا۔ ریسر کبوتر نے اپنی طوفانی رفتار کو کم کرنے کی لاکھ کوشش کی لیکن اس کی حد رفتار ممکن حدوں کو عبور کر چکی تھی۔ اب اس کے لیے رکنا ممکن نہیں تھا۔ وہ پوری طاقت کے ساتھ سامنے سے آتے ہوئے شکرے کے ساتھ ٹکرایا اور شکرے نے اسے کمر کے پاس سے تھام لیا۔ اس کے نوکیلے پنجے کبوتر کی کمر میں گھستے چلے گئے۔

کبوتر نے نڈھال ہو کر جدوجہد کا سلسلہ ترک کر دیا اور اپنے آپ کو خدا کے حوالے کرنے کے بعد پروں کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ ماحول ایک دفعہ پھر شکرے کے چلانے کی آواز سے گونجا۔ یہ اس شکرے کی آواز تھی جس نے چٹانی علاقے کی شروعات سے کبوتر پر حملے کا آغاز کیا تھا۔ درحقیقت کبوتر پر حق اس کا بنتا تھا لیکن شکار کو ہتھیا اس شکرے نے لیا تھا جس نے رتی برابر بھی جدوجہد میں حصہ لینے کی کوشش نہیں کی تھی اور بغیر کسی مشکل کے شکار ہتھیانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ پہلے شکرے نے احتجاج کرتے ہوئے دوسرے شکرے پر حملہ کر دیا۔ گھمسان جنگ کا آغاز ہوا۔ شکرے کے پنجوں سے کبوتر چھوٹ کر نیچے گہرائیوں کی طرف گرتا چلا گیا۔ زمین پر گرنے سے پہلے اس نے تیزی سے کم ہوتے ہوئے حواسوں کو مجتمع کیا اور بند ہوتے ہوئے پروں کو یکدم کھول دیا۔ اس کے بعد پرواز کا دوبارہ آغاز کر دیا۔ پہاڑی علاقے کے ختم ہونے کے بعد میدانی علاقہ شروع ہو گیا۔ بارش یکلخت تھم گئی اور سورج نے نمودار ہونے کے بعد ماحول کو روشن کر دیا۔ کبوتر کو اپنی کمر کے پاس تکلیف کا شدید احساس ہو رہا تھا لیکن میدانی علاقوں کے بیچوں بیچ اترنا ممکن نہیں تھا۔ شکرا اس پر دوبارہ حملہ کر سکتا تھا۔ اس کے پروں میں اڑنے کی طاقت زائل ہوتی چلی جا رہی تھی لیکن اس نے ہمت نہ ہاری اور ہیڈ کوارٹر کی جانب اڑان جاری رکھی۔ فوجی ہیڈ کوارٹر فوجی چھاؤنی کے درمیان درختوں کے جھنڈ میں واقع تھا۔ ہیڈ کوارٹر کے پاس پہنچنے کے بعد اس کی ہمت جواب دے گئی اور وہ ہیڈ کوارٹر کے برآمدے میں بنے قاصد کبوتروں کے ڈبوں کے سامنے پہنچنے کے بعد بے دم ہو کر زمین پر گر گیا۔ ڈیوٹی پر مامور اردلی نے جب اسے اٹھایا تب وہ آخری سانسیں لے رہا تھا۔ اردلی نے برآمدے میں رکھے ہوئے گھڑے میں سے پانی نکالا اور اس کے منہ میں ٹپکانے کی کوششیں کیں۔ تب کبوتر نے اس کے ہاتھوں میں ہی دم توڑ دیا۔

اردلی نے حکام اعلیٰ کو کبوتر کی موت سے آگاہ کیا۔ حکام اعلیٰ نے اس کے پاؤں میں موجود میسج ٹیوب میں سے پیغام باہر نکال کر پڑھا اور بارڈر کی جانب اسلحہ اور فوجی جوان بھجوانے کا حکم دیا۔ بعد ازاں کبوتر کو نہایت عزت و احترام اور انتہائی پروٹوکول کے ساتھ فوجی ہیڈ

کوارٹر میں بنے سرسبز لان کے درمیان دفن کر دیا گیا۔ اس کی مختصر قبر پر جان لیوا جدوجہد کی کہانی آج بھی تحریر و تفصیل ہے۔

ہم سر کو جھٹکتے ہوئے حقیقت کی دنیا میں واپس آ گئے۔ کبوتر کوئٹہ شہر کی جانب پرواز کر چکے تھے۔ خوجک کا پہاڑی سلسلہ باز اور شکروں کی نہایت وسیع ترین آماجگاہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ مارچ کے اوائل کے دن تھے۔ ان کی بریڈنگ کے اہم ترین دن۔ ان دنوں کے دوران انہیں خوراک کی اشد ضرورت ہوتی ہے اور کبوتر کا گوشت ان کا من پسند کھانا ہوتا ہے۔ ٹورنامنٹ میں ہمارے تین کبوتر شامل پرواز تھے۔ ایک قاصد اور دو ہومرز کبوتر۔ قاصد پہلے دو دفعہ خوجک کے دشوار گزار راستوں پر سفر کرتے ہوئے اپنی رہائش گاہ تک بخیر و عافیت پہنچنے میں کامیاب ہو چکا تھا لیکن دونوں ہومرز کبوتروں کی ٹورنامنٹ میں پہلی دفعہ شرکت ہوئی تھی اور ہمیں خطرہ تھا کہ نہ جانے وہ شہر پہنچنے میں کامیاب ہوں گے یا پھر نہیں۔ ان دونوں کی عمر چھ سے سات مہینوں کے درمیان تھی اور وہ شہر کے مختلف مقامات سے خیر و عافیت واپس گھر آ چکے تھے۔ ہم نے ایک طرف کھڑی اپنی پوٹھوہار جیپ کا دروازہ کھولا اور اندر بیٹھنے کے بعد شہر کی جانب روانہ ہو گئے۔ چمن سے کوئٹہ تک کا سفر دو گھنٹے پر محیط تھا۔ مزید آدھا گھنٹا ہمیں ٹریفک کے اژدحام میں پھنس کر گزارنا پڑا۔ ڈھائی گھنٹے کے بعد جب ہم نے گھر میں قدم رکھا تب ہمارا قاصد کبوتر گھر آ چکا تھا۔ اس نے ایک سو بیس کلومیٹر کا یہ فاصلہ صرف پون گھنٹے میں طے کر کے اور ٹورنامنٹ میں پہلا نمبر لے کر ہمیں ورطۂ حیرت میں مبتلا کر دیا تھا۔ باقی کے دونوں کبوتروں کا انتظار کیا جا رہا تھا۔ وہ دو گھنٹے کے طویل انتظار کے بعد چھت پر اترے۔ اپنی مختصر عمر اور محدود تجربے کی بدولت انہوں نے اس بات کی نشاندہی کر دی تھی کہ اگلے چند سیزنوں کے دوران وہ پوزیشن ہولڈر کا رنگ حاصل کرنے میں ضرور کامیاب ہوں گے۔ پہلی پوزیشن لینے والے ہمارے قاصد کبوتر کی رنگت سرمئی تھی۔ اس کی شکل و صورت جنگلی کبوتروں سے مشابہت رکھتی تھی۔ چونچ بھی جوسر کے بالکل متوازی تھی۔ آنکھیں نیلی اور ان کی رنگت سفید تھی۔ جسے کالے رنگ کی لکیر نمایاں کرتی تھی۔ جسامت درمیانی، پروں کی لمبائی مناسب اور دم چھوٹی تھی۔ یہ وہی خصوصیات ہیں جو اسے اپنی نسل میں معتبر درجے کا اختیار دیتی ہیں۔ اس نسل کی دستیابی اب ممکن نہیں رہی۔ کچھ ملتی جلتی نسلیں دوست احباب کی چھتوں پر موجود ہیں لیکن ان میں زیادہ تر کراس ہیں۔ یعنی ان میں جنگلی کبوتروں کی خصلت محدود پیمانے پر پائی جاتی ہیں۔ ہمیں موجودہ نسل نہایت قریبی دوست کی چھت سے دستیاب ہوئی تھی۔ اس دوست کا تعلق فوج کے کسی شعبے سے تھا۔ اس کی چھت پر قاصد کبوتروں کی مختلف اقسام موجود تھیں جن میں ڈان فیس، جرمن بیوٹی۔ بلوچستان کی مخصوص گوراشائی نسل اور فینسی کبوتروں کی گراں قدر اقسام دستیاب تھیں۔ اس نسل جس کی ہم بات کر رہے ہیں اس کی دستیابی اسے انڈوں کی صورت میں ہوئی تھی۔ اب یہ کہنا ممکن نہیں تھا کہ اس نے یہ انڈے اجازت طلب کر کے لیے تھے یا پھر نظر بچا کر۔ جو بھی تھا نسل نایاب تھی۔ انڈوں کی بات سے ہمیں اپنے بچپن کا ایک واقعہ یاد آ رہا ہے۔

محمد خان کی دکان میں کبوتروں کی ایسی نسل ایران سے اسمگل ہو کر آئی جس میں سفید اور کالے رنگ کے علاوہ مزید دو رنگ نمایاں تھے۔ سینے کا کچھ حصہ سفید اور کالا تھا، سر گرے رنگ کا پروں کی آخری چھ کلیاں سیاہ تھیں جب کہ کمر اور دم سرخ رنگ پر مشتمل تھی۔ چونکہ نسل ان دنوں نایاب تھی اس لیے قیمت بھی انتہائی ناموزوں تھی۔ ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ اس جوڑی کی قیمت چالیس روپے متعین ہوئی تھی۔ محمد خان ویسے ہی گراں فروشی میں تمام دکانداروں کے لحاظ سے صف اوّل کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ نسل بھی ایسی تھی جو اس کی دکان کے علاوہ کسی اور دکان پر موجود نہیں تھی۔ سو وہ منہ پھاڑ کر قیمت بتانے میں ذرا بھی تامل کا اظہار نہیں کر رہا تھا۔ چالیس روپے ان دنوں کافی بڑی رقم کی حیثیت اختیار رکھتی تھی۔ ہماری جیبوں میں لے دے کر صرف پانچ روپے موجود تھے۔ اس رقم کے بھی ہم بلا غیر شرکت مالک نہیں تھے۔ بلکہ ہمارے ساتھ دو حصے دار مزید بھی پائے جاتے تھے۔ ایک ہمارا چھوٹا بھائی۔ دوسرا قریبی دوست وہ دونوں بضد تھے کہ پانچ روپے کی محدود رقم کے باوجود بھی ہمیں یہ نایاب نسل خریدنی چاہیے اور ہم یہ سوچنے میں مصروف تھے کہ وہ کون سا لائحہ عمل اختیار کیا جائے جس کی بدولت ہم پانچ روپے خرچ کر کے

کبوتروں کی جوڑی کے مالک بن سکیں۔ ہمیں دور دور تک کوئی ایسی تدبیر دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ چالیس روپے جیسی خطیر رقم کا بندوبست کرنا ہمارے اختیار سے باہر تھا۔ ہم نے حسرت بھری نگاہوں کے ساتھ جوڑی کی طرف دیکھا۔ نایاب نسل کو پروٹوکول دینے کے لیے اسے جس پنجرے میں بند کیا گیا تھا وہ عام پنجروں کے لحاظ سے کافی بڑا اور صاف ستھرا تھا۔ اس پنجرے میں کبوتروں کی جوڑی آرام و سکون سے گھوم پھر سکتی تھی۔ ہم نے دیکھا کہ نر کبوتر مادہ کو پنجرے کے درمیان میں دوڑ لگا رہا تھا۔ یہ اس بات کی نشاندہی تھی کہ مادہ ایک دو دن میں انڈے دینے والی ہے۔ ایسی حالت کے دوران نر کبوتر کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ مادہ کو آوارہ گردی نہ کرنے دے۔ وہ اسے بھاگ دوڑ کرنے کے بعد گھونسلے تک محدود کرنے کی کوششیں کرتا ہے چونکہ پنجرے میں گھونسلے کی سہولت میسر نہیں تھی۔ اس لیے وہ مادہ کو مستقل دوڑ دیے جا رہا تھا۔ ہمارا چھوٹا بھائی اور قریبی دوست دونوں بضد تھے کہ ایسی نایاب جوڑی کو ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہیے۔ ہم نے انہیں دلاسہ دیتے ہوئے بتایا کہ جوڑی کو خریدنا ہمارے اختیار سے باہر ہے لیکن ہم ایک جوا کھیلنے کی کوشش ضرور کر سکتے ہیں۔ دونوں حضرات نے نہ سمجھنے والی نگاہوں کے ساتھ ہماری جانب دیکھا۔ تب ہم نے دونوں کو ہاتھوں کے پاس سے تھاما اور محمد خان کے سامنے لا کھڑا کیا۔ محمد خان نے استفہامیہ نگاہوں سے ہم تینوں کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا چاہیے؟“

ہم نے کبوتروں کی جوڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اس جوڑی کے انڈے۔“

محمد خان حیرت بھرے لہجے میں بولا۔ ”انہوں نے انڈے نہیں دیئے۔“

ہم نے دانشمندانہ انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”کل یا پرسوں تک دے دے گی۔ ہم جوڑی خریدنے کی حیثیت نہیں رکھتے لیکن انڈے خرید سکتے ہیں۔“

محمد خان بولا۔ ”تو نکالو ایک روپیا اگر جوڑی بکی نہیں تو دو تین دنوں کے بعد آ کر لے جانا۔“

ہم نے فوراً روپیا اس کے ہاتھ میں تھما دیا اور بجھے دل کے ساتھ نہایت جوش و خروش کے عالم میں دعا مانگتے ہوئے گھر چلے آئے کہ جوڑی تین چار دنوں تک بکنے نہ پائے۔ نہ جانے ہماری دعاؤں میں اثر تھا یا پھر محمد خان کی نیت میں کھوٹ تھا۔ ایک ہفتے تک جوڑی بکنے نہیں پائی اور اس نے لکڑی کے پنجرے میں ہی انڈے دے دیئے۔

حسبِ وعدہ محمد خان نے نہایت احتیاط کے ساتھ انڈے ہمارے حوالے کر دیئے۔ ہم نے انڈوں کو چھوٹے سے ڈبے کے اندر رکھی ہوئی روئی میں رکھا اور اپنے ہمراہ گھر لے آئے۔ ہمارے گھر میں کبوتروں کی ایک ایسی جوڑی موجود تھی۔ جس نے حال ہی میں انڈے دیئے تھے۔ ہم نے اس کے انڈے ہٹانے کے بعد محمد خان والے انڈے نیچے رکھ دیئے۔ آپ یقین کریں گے پورے بائیس دنوں کے بعد جوڑی نے بچے نکال دیئے۔ ایک ڈیڑھ مہینے کے بعد جب بچے اڑنے کے قابل ہوئے تب حیرت انگیز طور پر وہ اپنے ماں باپ سے مشابہت رکھتے تھے۔ یعنی وہ کراس نہیں ہوئے تھے۔

قاصد کبوتروں کے علاوہ پاکستان میں مقبول ترین ایک اور نسل لاہوری کبوتروں کی نسل ہے۔ لاہوری کبوتروں کی بازی قاصد کبوتروں کے ٹورنامنٹ سے صرف اس لحاظ سے مختلف ہوتی ہے کہ اس میں چھوڑے جانے والے کبوتروں میں جیت کا اختیار اس کبوتر کو حاصل ہوتا ہے جو سب سے آخر میں چھت پر اتر کر اپنی حیثیت کو نمایاں کرے۔ لاہوری کبوتروں کی بازی میں فاصلے کے تعین کی کوئی حیثیت نہیں پائی جاتی۔ جیت کا اختیار گھنٹوں کی زیادہ طوالت کو مدنظر رکھتے ہوئے کیا جاتا ہے۔ بازی میں حصہ لینے والے ممبرز کے کبوتروں کا حدود اربعہ اور کیفیت کا اندراج بازی کے منصف کے پاس موجود ہوتا ہے۔ بازی میں منصف کا پہلا کام ممبرز کے گھر جا کر اس کے کبوتروں کو چیک کرنا اور لسٹ کے مطابق ان کی کیفیت میں ردوبدل کرنا ہے۔ پھر اپنے مقررہ وقت پر انہیں اڑانا اور پانچ منٹ اڑنے کا وقت دینا ہے۔ ان اوقات کے دوران وہ کبوتروں کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کی رپورٹ مرتب کرتا ہے۔ ہر ممبرز کی چھت پر منصف کے آدمی موجود ہوتے ہیں۔ مقررہ اوقات پر کبوتر بازی کے لیے کبوتر چھوڑنا پھر ان کے واپس اترنے کے اوقات پر نظر رکھنا ان کے فرائض میں شامل ہوتا ہے۔ لاہور میں قیام کے دوران ہماری نظر انتخاب ایسی نایاب سلیٹی نسل پر پڑی جسے فاختہ ٹائپ

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

سلیٹی کبوتر کے نام سے مخاطب کیا جاتا ہے۔ ہمارے خیال میں چند گھروں کے علاوہ یہ کبوتر اب کسی کے پاس اصل حالت میں موجود نہیں ہوں گے۔ استاد عبدالرشید گنگا آئسکریم فیکٹری والوں کے پاس سلیٹی کبوتروں کا ایک جوڑا اصل حالت میں موجود تھا جنہیں وہ بہت کم لوگوں کو دکھاتے تھے۔ سلیٹی کبوتر سے منسوب ایک دلچسپ واقعہ بتاتا چلوں۔

ایک روز ہم اپنی چھت پر بیٹھے کبوتروں کو روٹی اور بھورے ڈال رہے تھے کہ ایک سلیٹی کبوتر کا بچہ ہمارے گھر کے سامنے لگے ٹاور کی سب سے اونچی تار پر آکر بیٹھ گیا۔ یہ بچہ سارا دن تار پر بیٹھ کر اڑتا رہا اور پھر واپس آکر تار پر بیٹھ جاتا۔ رات ہوگئی لیکن وہ تار سے آگے مزید کہیں نہیں گیا۔ اگلے دن بھی بچہ یہی کچھ کرتا رہا۔ وہ اڑ کر دور چلا جاتا اور کچھ دیر بعد واپس آکر تار پر بیٹھ جاتا۔ ہم اس کی حرکات کا بغور مشاہدہ کر رہے تھے۔ دو تین دن وہ بچہ ایسا ہی کرتا رہا۔ تار کے نیچے گندے پانی کا ایک جوہڑ تھا جس کے گرد محلے والوں نے بھینسیں باندھ رکھی تھیں۔ یہ بچہ دوپہر کو جوہڑ کے پاس نیچے اتر کر پانی پیتا تھا اور دانہ کی جگہ کنکریاں چن کر واپس تار پر جا بیٹھتا تھا۔ ہم سارا دن اس بچے کی تاک میں رہتے تھے لیکن وہ اتنا تیز و چالاک واقع ہوا تھا کہ ہمیں پاؤں یا ہاتھ ہلانے کی مہلت نہیں دیتا تھا اور پھرتی کے ساتھ اڑ کر تار پر جا بیٹھتا تھا۔ آخر کار تیسرے دن جب یہ بچہ بھوک سے نڈھال ہو گیا۔ تب ہم نے ایک پڑیا میں بہت سا باجرہ لے کر جوہڑ کے کنارے بکھیر دیا اور جالی کا ایک چھکو بنا کر اس کے نیچے لکڑی پھنسا دی۔ لکڑی کے ساتھ لمبی رسی باندھ کر ہم رسی کا آخری سرا تھامے چھپڑ سے کافی دور بھینسوں کے قریب بیٹھ گئے۔ پہلے تو کبوتر کا بچہ دانہ کی طرف آنے سے ہچکچاتا رہا لیکن جب اس نے ایک دو دانے باجرے کے اٹھائے تب بھوک نے اس پر ایسا غلبہ پایا کہ وہ اندھا دھند باجرہ کھانے لگا اور ہماری طرف سے اس کی توجہ ہٹ گئی جس پر ہم نے چھکو کی رسی کھینچ لی چھکو دھڑام سے نیچے گرا اور کبوتر کا بچہ چھکو کے اندر قید ہو کر رہ گیا۔ ہم اسے لے کر گھر آئے اور اس کے پر باندھ کر اسے گھر کے صحن میں کھلا چھوڑ دیا۔ اگلے دن ہمارے چھوٹے بھائی نے ہماری عدم موجودگی کے دوران اس کے پر کھول دیئے۔ سلیٹی پٹھا اڑ کر دوبارہ اسی تار پر جا بیٹھا جہاں سے

برطانوی سیاستدان راب بٹلر کی بہن آئرس پورٹال نے بتایا۔ ''نظام ایک گنجی مرغابی کی طرح سادہ لوح بن چکا تھا اور اس کی سینئر ترین اہلیہ بھی بہکی بہکی باتیں کرنے لگی تھیں۔'' آئرس پورٹال برصغیر کی تقسیم سے پہلے حیدرآباد میں دربار دکن سے وابستہ تھی۔ اس نے مزید انکشاف کیا کہ ''جب 1947ء میں حیدرآباد میں انقلاب آیا تو ہمیں معلوم ہوا کہ جیسے ہم اب ہندوستان میں نہیں، فرانس میں رہ رہے ہوں۔ تمام اختیارات مسلمان افسروں کے ہاتھ میں تھے۔ وہ دولت پانی کی طرح بہاتے تھے۔ بڑے عیاش اور بہت ہی غیر ذمہ دار جاگیرداروں کا سا رویہ تھا ان کا۔ ان کی طرز بود و باش بھی لکھ لٹ رئیسوں جیسی تھی لیکن دوسری طرف یہ بھی تھا کہ ان کے عادات و اطوار بڑے شائستہ، گفتگو کے آداب نہایت سلجھے ہوئے اور رکھ رکھاؤ غضب کا تھا۔ وہ ہمیں شکار پر ساتھ لے جاتے تو اثنائے راہ انگلستان ہی کا ذکر کرتے رہتے یا پھر کنیز اور پیرس کی داستانیں سناتے رہتے حالانکہ ان کا اپنا حیدرآباد اس دور میں قرونِ وسطیٰ کے سے دور سے گزر رہا تھا۔ جن دیہاتوں سے ہمارا گزر ہوتا ان کی حالت زار دیدنی اور قابلِ رحم ہوتی۔ آپ یہ سوچے بغیر نہیں رہ سکتے تھے کہ انگلستان اور فرانسیسی بنیادوں پر تعمیر کیا ہوا یہ خیالی محل کسی بھی وقت دھڑام سے نیچے آگرے گا۔''

مرسلہ: شعیب مرزا۔ کراچی

فراق گورکھپوری لکھتے ہیں ایک بار ڈاکٹر عبدالعلیم کی وضع قطع دیکھ کر شرارتاً میں نے مجاز سے کہا: ''معلوم ہوتا ہے ڈاکٹر علیم کو موسیقی سے خاص شغف ہے۔'' مجاز نے نہایت سنجیدگی سے صرف اتنا کہا: ''ماہر ہیں!''

مرسلہ: احسن عابدی۔ کراچی

حیدرآباد میں ترقی پسند ادیبوں کی کانفرنس تھی۔ ملک راج آنند کی تقریر تھی کہ ختم ہونے ہی میں نہیں آتی تھی۔ تقریر پر از معلومات تھی لیکن کچھ لوگ بور ہو رہے تھے جن میں مجاز بھی تھے۔ جب ملک راج آنند ڈیڑھ پونے دو گھنٹے سے زیادہ بول چکے اور آثار ایسے کہ شاید ابھی اتنی ہی دیر اور بولنے والے تھے تو مجاز نے صرف اتنا کہا: ''بڑا قابل آدمی معلوم ہوتا ہے۔'' جس نے سنا دل ہی دل میں لوٹ پوٹ ہو گیا۔

مرسلہ: نوازش علی۔ کراچی

ہم نے اسے بمشکل تمام پکڑا تھا۔ ہم چھوٹے بھائی پر بہت ناراض ہوئے کہ ہم نے اتنی جدوجہد کے بعد اسے پکڑا تھا اور آپ نے اسے پھر وہیں پہنچا دیا۔ چھوٹا بھائی شرمسار نگاہوں سے ہماری طرف دیکھنے لگا۔ ہم نے اس کے کاندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسے دلاسہ دیا اور کہا۔

''خیر کوئی بات نہیں۔ شام کو جب وہ جوہڑ کے کنارے اترے گا تو ہم دوبارہ اسے پکڑنے کی کوشش کریں گے۔''

اب اگر آپ یقین جانیں کہ شام کو جب ہم اسے پکڑنے کا ساز و سامان لے کر جوہڑ کے قریب پہنچے تو بچہ تارے سے غائب تھا۔ ہم نے اسے اردگرد کافی تلاش کیا لیکن وہ کہیں نظر نہیں آیا۔ تھک ہار کر جب ہم مغرب کے وقت گھر واپس آئے تو دیکھا کہ یہ بچہ برآمدے میں کھڈے کے سامنے بیٹھا ہے۔ اس کے بعد سے لے کر جب تک وہ ہمارے پاس رہا اس نے اپنے گھر کے سوا کہیں اور پنجہ نہ لگایا۔ یہ نسل آج کل نایاب ہے۔ اس نسل میں اے کلاس کبوتر کا سراپا یوں ہے۔ گردن پتلی اور لمبی، چونچ خاکی، ٹانگیں اونچی، سینے کی ہڈی مضبوط، جوڑ بندھوں، دم چھوٹی اور پلہ دم تک نمایاں۔

فاختائی سلیٹی کبوتروں کی ہم پلہ نسل ہیرا لعل کبوتروں کی ہے۔ یہ کبوتر دلاور خان کے گھر کے بتائے جاتے ہیں۔ بنیادی طور پر یہ قصوری کبوتر ہیں لیکن عرصہ چالیس سال سے خان دلاور خان صاحب کے پاس چلے آرہے ہیں۔ یہ کبوتر گہرے گلسرے، کلامے اور سلائی دار یعنی سلارے کبوتر ہوتے ہیں۔ ان کا نام ہیرا لعل جس مناسبت سے رکھا گیا اس کا واقعہ کچھ یوں ہے کہ خان صاحب کے پاس تقریباً پینتیس سال قبل اس نسل کے دو پٹھے بازی کی تیاریوں کے مراحل میں تھے۔ یعنی انہیں پھرتیں دی جارہی تھیں۔ ایک روز خان صاحب کے چھوٹے بھائی بشیر خان نے صبح کبوتر اڑائے تو اس نسل کا ایک پٹھا تقریباً سخت گرمی میں چار بج کر کچھ منٹ پر پرواز کر کے گھر آیا۔ جب بشیر خان نے اسے پکڑ کر دیکھا تو اس کے گلے میں ریشے کی کیس موجود تھی۔ یعنی اس کا گلا پکا ہوا تھا۔ جس پر انہوں نے بیماری کے متعلق دلاور خان کو بتایا تو انہوں نے کہا کہ اسے اڑانا بند کردو۔ جب تک اس کا گلا ٹھیک نہ ہوجائے۔ لیکن اگلے روز جب بشیر خان اور ان کے ملازم صبح کبوتروں کو اڑانے کے لیے فریم سے باہر نکالنے لگے تو وہ بیمار پٹھا غیر ارادی طور پر باہر نکل کر اڑ گیا اور تھوڑی ہی دیر میں بلندی پر چلا گیا۔ دلاور خان جب دوپہر کو تین بجے گھر آئے تو دیکھا کہ بشیر خان اور ان کا ملازم چارپائی پر لیٹے ہوئے آسمان کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ دلاور خان کے پوچھنے پر دونوں نے بتایا کہ خراب گلے والا پٹھا صبح غلطی سے نکل کر اڑ گیا ہے اور ابھی تک دکھائی نہیں دیا۔ اس پٹھے کی بہادری دیکھئے کہ وہ شام ساڑھے پانچ بجے چھت پر اترا لیکن اپنے کھڈے پر بیٹھتے بیٹھتے نیچے اسکول کی بلڈنگ میں گر گیا۔ خان صاحب کا ملازم بھاگ کر نیچے گیا تو دیکھا کہ کبوتر نیچے مرا ہوا پڑا ہے۔ وہ اسی طرح کبوتر کو اٹھا کر اوپر لے آیا اس کی آنکھوں میں آنسو تھے جس پر دلاور خان نے کہا کہ یہ کبوتر نہیں بلکہ ہیرا اور لعل ہے۔ تب سے اس نسل کا نام ہیرا لعل پڑ گیا۔

ہیرا لعل کبوتروں کے بعد جان محمد صاحب کے جونسرے کبوتر اہمیت کا اختیار رکھتے ہیں۔ ہم نے جان صاحب سے بہتر جونسرے کبوتر کہیں نہیں دیکھے ہیں۔ یہ کبوتر فرانسیسی کبوتر ہیں کیونکہ جان محمد صاحب کا خاندان ٹیپو سلطان کے دور حکومت میں فرانس سے ہجرت کر کے موجودہ بھارت کے شہر میسور میں آکر آباد ہوا تھا۔ جس طرح ایسٹ انڈیا کمپنی نے تجارت کے لیے بمبئی کو اپنا مسکن بنایا۔ اس طرح جان صاحب کے خاندان نے میسور کو اپنا مرکز بنایا۔ جان صاحب کا اصل نام جان گبریل تھا۔ جب انہوں نے اسلام قبول کیا تو ان کا نام جان محمد رکھا گیا۔ جان صاحب کا خاندان فرانس سے ہجرت کے وقت اپنے ساتھ کبوتر لایا تھا۔ یہی وہ جونسرے کبوتر تھے جو بعد میں جان صاحب کے جونسرے کبوتر کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان کبوتروں کی گردن پر سبز اور موٹے جوں ہوتے ہیں۔ سر فلیٹ ہوتا ہے، چونچ لمبی، موٹی دم، دم کے بائیں طرف آخر میں تقریباً ایک انچ سیاہ دھبا ہوتا ہے۔ چھاتی چوڑی، ٹانگیں لمبی۔ یعنی کھڑی گوڈی، ناخن اتنے لمبے کہ دو دو بل کھا جاتے تھے۔ آنکھیں ایسی شفاف جیسے خوب صورت جواہرات کے ٹکڑے۔ یہ نسل اب تقریباً ختم ہوچکی ہے۔

کبوتروں کی نسل کے افق پر چمکتا ہوا ایک دلچسپ نام پینتیس والے کبوتروں کا ہے۔ ان کی کہانی کچھ یوں ہے کہ سیالکوٹ کا ایک شخص مراد تقسیم پاک و ہند سے قبل جموں کے ایک راجا ہری چند کے ہاں ملازم تھا جس نے

بہت اعلیٰ نسل کے کبوتر پالے ہوئے تھے۔ مراد ایک مرتبہ راجا کی منت سماجت کر کے اس سے کبوتروں کا ایک جوڑا سیالکوٹ لے آیا اور یہاں لا کر جب اس نے جوڑے سے بچے نکلوائے تو انہوں نے اڑان و سیان میں لوگوں کو ششدر کر دیا جس پر سیالکوٹ کے یونس شاہ نے اس وقت پینتیس روپے دے کر مراد سے یہ جوڑا خرید لیا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے، جن دنوں سرکاری ملازمین کی تنخواہ پینتیس چالیس روپے ہوا کرتی تھی۔ اس طرح اس نسل کا نام پینتیس والے کبوتر پڑ گیا۔ یہ کبوتر پھانٹے دار اور جونسرے ہوتے ہیں۔ ان کے پروں پر ایک سیاہ ٹیڈ پر کالا پر اور دم میں کہیں کوئی معمولی کالی لس ہوتی تھی۔ ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ لاہور کے بڑے بڑے نامور کھلاڑی ان کبوتروں کے دیوانے تھے۔ ہر چھٹی کے روز لاہور سے کھلاڑی ٹولیوں کی شکل میں سیالکوٹ کبوتر خریدنے جایا کرتے تھے اور سیالکوٹ ایک عرصہ کبوتروں کی بہت بڑی منڈی بنا رہا جیسے کہ آج کل قصور ہے۔

ایک مزید عجیب و غریب فطرت کی حامل نسل کھوکھے والے کبوتروں کی شمار کی جاتی ہے۔ یہ نسل سیان کے معاملے میں انتہا پسند واقع ہوئی ہے لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ یہ اپنے گھر کی چھت یا پھر علاقے کے وفادار نہیں ہوتے۔ بلکہ کھوکھے کے مخصوص رنگ پر نیچے اترتے اور اوپر چڑھتے ہیں۔ ان کا کھوکھا جو کہ لوہے یا پھر لکڑی کے پنجرے پر مشتمل ہوتا ہے اسے اگر آپ بیچ سڑک میں کھڑا کر دیں تب یہ کبوتر سڑک کے بیچوں بیچ اترنے کی کوششیں کریں گے۔ پنجرے کے نیچے پہیے لگے ہوئے ہوتے ہیں۔ اسے آپ گھسیٹ کر کہیں بھی لے جا سکتے ہیں۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ پنجرہ یا کھوکھا جہاں کہیں بھی ہوگا کبوتر وہیں اتریں گے۔ یہ کہنا بھی درست نہیں ہے کہ ان کی قابلِ تعریف سیان میں پنجرے کے رنگ کا عمل دخل ہوتا ہے۔ سیالکوٹ کے دورے کے دوران میں نے کبوتروں کی ایک منڈی میں کھوکھے والے کبوتروں کے پنجرے پڑے دیکھے۔ ان سب کا رنگ پیلا تھا۔ کبوتر پرواز کے بعد نا صرف اپنے پنجروں کے پاس اترتے بلکہ اترنے کے بعد لائن میں رکھے پنجروں میں تمیز کرنے کے بعد اپنے مخصوص پنجرے کا رخ کرتے۔ پنجرے میں بھی ان کی نشست مخصوص ہوتی تھی۔ وہ اپنی منتخب کردہ لکڑی کے علاوہ دوسری لکڑی کی جانب رخ نہیں کرتے تھے۔ ان چند خاص نسلوں کے علاوہ دو مزید نسلیں لکا اور لوٹن کبوتروں کی بھی ہیں۔ یہ نسلیں اس لحاظ سے قابل ذکر نہیں ہیں کہ ان کا شمار فینسی کبوتروں میں کیا جاتا ہے۔ اڑان و سیان کے معاملے میں کوئی قابلِ تعریف بات اس نسل سے شخص دکھائی نہیں دیتی۔ شہنشاہ شاہ جہاں کو لکا کبوتروں کے ساتھ گہرا لگاؤ تھا۔ اس نے محل کا ایک حصہ ان کے لیے مختص کر رکھا تھا۔ جہاں فواروں کی بھرمار تھی۔ ان فواروں کے درمیان یہ خوب صورت اور دلکش کبوتر کھلے پھرتے تھے۔ لکا کبوتر کی اڑان مخصوص اور کم ہوتی ہے۔ اس لیے اسے بازیوں میں استعمال نہیں کیا جاتا۔ خوب صورتی کی حد تک یہ نسل محدود ہوتی ہے۔ محمد خان والی کاغذی نسل کی کارکردگی کا مشاہدہ ہمارا آنکھوں دیکھا حال ہے۔ وہ نا سمجھی کے دن تھے۔ ہم نے کاغذی نسل کی مادہ جب محمد رمضان کو واپس کی۔ تب دکان سے باہر جاتے ہوئے اس کے ساتھ مختصر معاہدہ کیا کہ اگر ہم جوڑی کے بچوں کو جو ہمارے گھر میں موجود تھے۔ دکان میں چھوڑ جائیں اور وہ فروخت ہونے کے بعد واپس ہمارے گھر آئیں۔ تب رقم کا کیا حساب کتاب ہو سکتا ہے محمد خان نے اپنی داڑھی کھجاتے ہوئے چند لمحے سوچتے رہنے کے بعد جواب دیا۔

”رقم میں تیسرا حصہ میرا ہوگا۔ باقی جو بچ گیا وہ تمہارا۔“ اگر منظور ہے تو کل کبوتروں کو دکان پر لے آنا۔ میں ان کے لیے پنجرہ مخصوص کر دوں گا۔ ہم نے چند لمحات کی پس و پیش کے بعد معاملے کا اختتام اس بات پر کر دیا کہ جوڑی کی فروخت سے حاصل ہونے والی رقم کا آدھا حصہ ہمارا ہوگا اور آدھا محمد خان کا۔ اگر دکان کے نامناسب ماحول کی بدولت کبوتر کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ تب محمد خان کو اس کا مرا ہوا وجود ہمیں دکھانا ضروری ہوگا۔ بصورت دیگر اسے مکمل رقم ادا کرنا ہوگی۔ معاہدہ نامہ دونوں فریقوں کے باہمی اتفاق کے ساتھ پایا اور اس معاہدے کی بدولت تقریباً تین سے چار مہینے کاغذی نسل کے بچوں پر مشتمل جوڑی کو بخوبی استعمال کیا گیا۔ بعد ازاں وہ جوڑی کہاں گئی ان کے متعلق کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ ایک دن فروخت کے بعد واپس نہیں آئی۔ ہمارے اندازے کے مطابق انہیں بارڈر کے مخالف جانب اسمگل کر دیا گیا ہوگا۔

☆☆☆

URDUSOFTBOOKS.COM

قسط:6

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

ناسور

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

وہ ایک سیدھا سادہ معصوم فطرت نوجوان تھا اور اس کے گرد سازشی ذہنیت والوں کا انبوہ تھا۔ ایسے سازشیوں کے لیے وہ ترنوالہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ان کے پھیلائے ہوئے تارعنکبوت میں پھنسا چلا جارہا تھا کہ اسے احساس ہوا کہ اب مفر کی کوئی راہ نہیں ہے۔ اسے بھی ان کا جواب دینے کے لیے خم ٹھونکنا ضروری ہے اور پھر اس نے کمر کس لی۔ انہی کے لہجے میں انہیں جواب دینے کی کوشش کی۔

ایک ایسی طویل کہانی جس کا ہر باب ایک نئی کہانی ہے

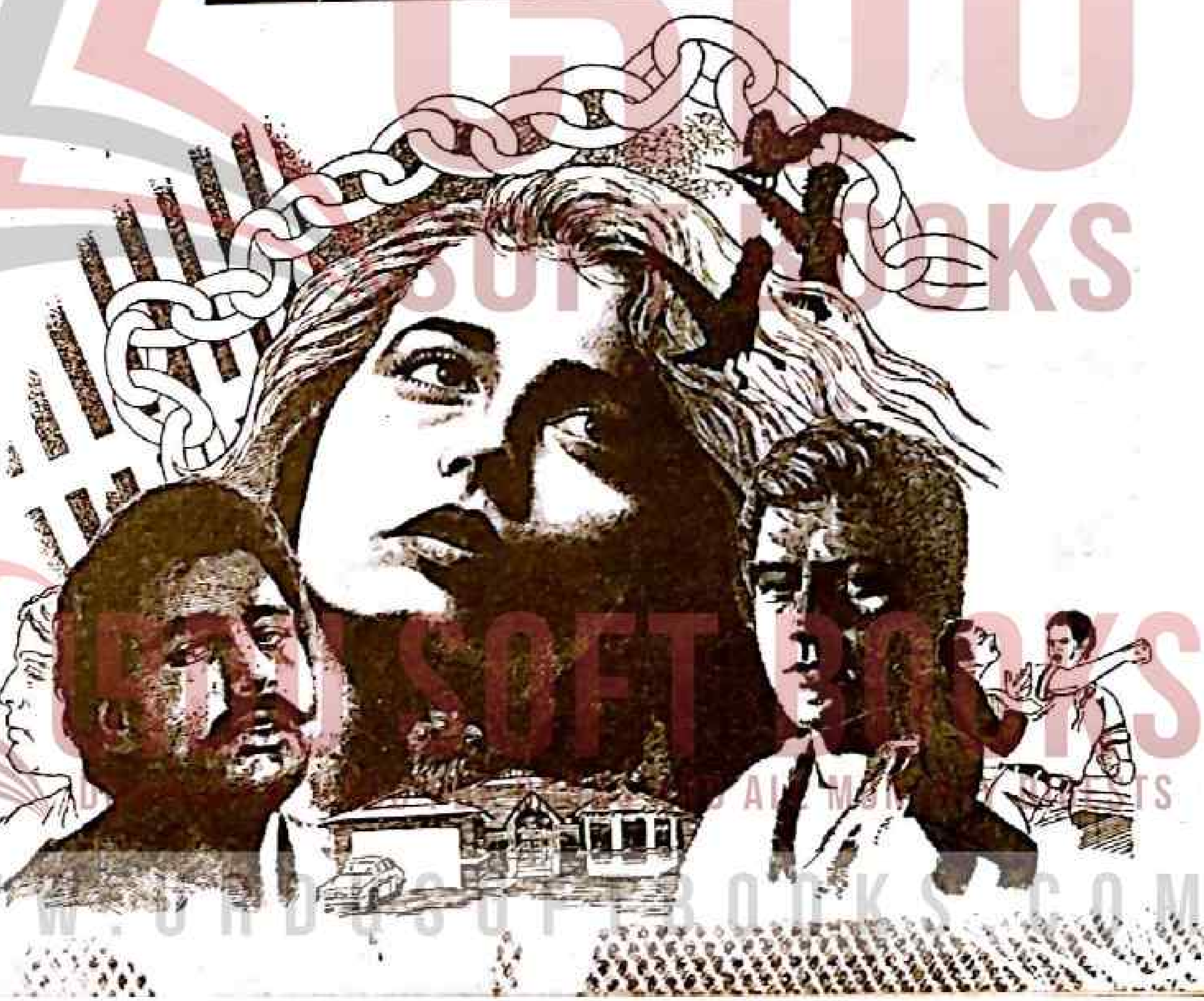

URDUSOFTBOOKS.COM

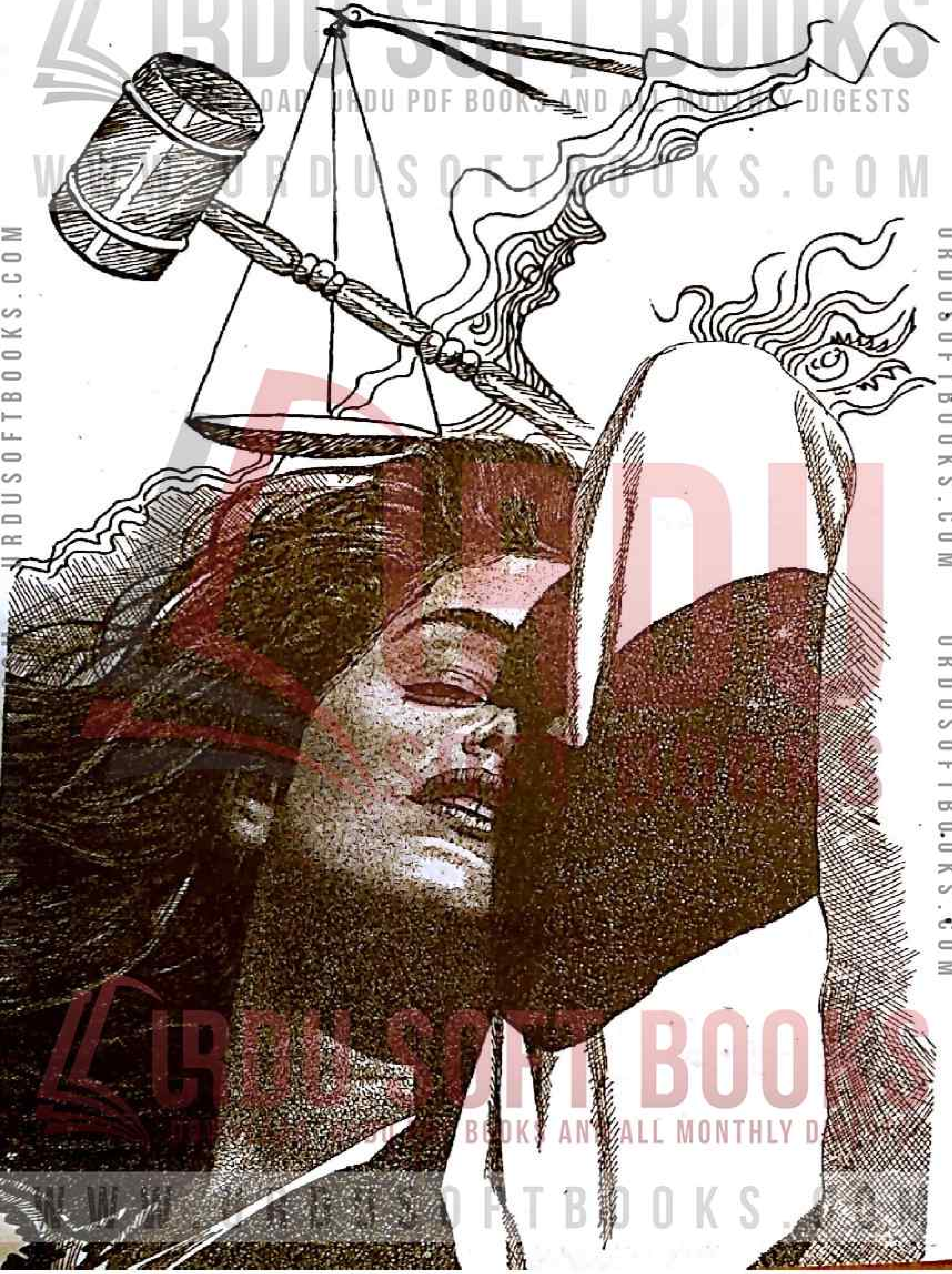

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

(گزشتہ اقساط کا خلاصہ)

رانا بشیر کی بیوی کا قتل ہوگیا تھا اور الزام آیا تھا احمد حسین پر۔ اس جرم میں اسے پھانسی ہوگئی۔ احمد حسین کا بیٹا نعمان ایڈووکیٹ زنیرہ کے ساتھ مل کر اصل قاتل کو ڈھونڈنے کی کوشش کرنے لگا۔ اسی دوران رانا بشیر اپنی بیٹی کے ساتھ نعمان کے دروازے پر پہنچا۔ وہ معافی مانگنے آیا تھا کیونکہ اب اسے بھی لگ رہا تھا کہ قاتل کوئی اور ہے۔ نعمان ایک لاری اڈے کی یونین میں نائب ضلعی صدر بن گیا تھا۔ کچھ لوگ چاہتے تھے کہ یہ اڈا ختم ہوجائے اور اس کی زمین پر عمارت بنا کر فروخت کی جائے۔ اس سلسلے میں کچھ لوگ تندہی سے کام کررہے تھے لیکن ان کی چال نعمان انہی پر الٹ دیتا۔ ابھی وہ اس مسئلے پر غور کرہی رہا تھا کہ رانا بشیر کی بیٹی نے اسے ایک ڈائری دی جو مقتولہ کی تھی جس سے اندازہ ہورہا تھا کہ قاتل کوئی اور ہے۔ نعمان ان دونوں مسئلوں پر کام کرہی رہا تھا کہ ایک دن اس کے بھائی فہیم نے اس سے کہا کہ میں آپ سے ایک ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ بولا کہ ہم ایک جوان بہن کے بھائی بھی ہیں اس کے لیے کچھ سوچنا چاہیے پھر اس نے کہا کہ میں نے بہنا کو اکثر رات میں کسی سے فون پر بات کرتے دیکھا ہے۔ باتوں سے لگا کہ وہ کسی کو پسند کرنے لگی ہے۔ فہیم کے جانے کے بعد میں سوچ میں ڈوب گیا تھا کہ فرحانہ کا میسیج آگیا کہ اسے ڈائری کا پارٹ ٹول گیا ہے۔ اگلے دن زنیرہ کے ساتھ میں فرحانہ کے گھر گیا تو ڈائری کے واقعات سنے جس نے رفعت قتل کے واقعے کو مزید الجھا دیا تھا۔ اس دن میں اڈے پر بیٹھا تھا کہ کچھ لوگ آگئے۔ ان میں عزیر خان بھی تھا جس کو اختر کی بہن ثوبیہ کی گمشدگی کا ذمے دار سمجھا جارہا تھا۔ میں نے عزیر خان سے کہا کہ آپ سے مل کر خوشی ہوئی ہے۔ میں خود بھی چاہتا ہوں کہ کاروباری حضرات کو بھی سہولت ملے لیکن میں چاہتا ہوں کہ یہ معاہدہ پارٹنرشپ پر ہو لیکن ان لوگوں نے منع کردیا۔ ان کے جانے کے بعد میں سستا رہا تھا کہ کالیا کا فون آگیا۔ اس نے بتایا کہ عارف مچھندر جیل سے فرار ہوتے ہوئے مارا گیا۔ یہ خبر سنتے ہی میں الجھ گیا۔ گڈز ٹرانسپورٹ کی گاڑیاں آنی شروع ہوگئی تھیں۔ سدو بھائی نے اطلاع دی تھی کہ گڈز کی آڑ میں منشیات کا کاروبار ہوتا تھا۔ سدو کو رخصت کرکے میں بیٹھا ہی تھا کہ کالیا آگیا۔ اس نے بتایا کہ میری ضمانت منسوخ ہوچکی ہے اور مجھے گرفتار کرنے کے لیے ایس ایچ او دلاور خان آرہا ہے۔ میں اس کے ساتھ باہر نکلا اور اس کی بائیک پر بیٹھ کر روانہ ہوگیا۔ کالیا کے اڈے پر پہنچا تھا کہ بہن کا فون آگیا۔ اس نے بتایا کہ پولیس گھر پر آئی تھی اور فہیم کو لے گئی ہے۔ مجبوراً میں نے گرفتاری دے دی۔ وہاں مجھ پر تشدد بھی ہوا۔ حوالات میں بیٹھا تھا کہ ایک سپاہی نے آکر ایک اخبار دیا۔ اخبار میں چھپی خبر دیکھ کر میں پریشان ہوا تھا۔

(اب آگے پڑھیں)

اس خبر کو پڑھ کر میری آنکھوں تلے اندھیرا چھاتا چلا گیا تھا۔

میرے پورے وجود میں اینٹھن سی ہونے لگی۔ جسم کا رواں رواں لرز رہا تھا، یوں لگتا تھا جیسے سب کچھ ختم ہونے لگا ہو۔ میری جنگ، میرا کاز، میرا مقصد اور میری اب تک کی تگ و دو، ساری محنت اکارت جانے لگی تھی۔ ساتھ ہی ایک پچھتاوے کا ناگ تھا جو مجھے اپنی لپیٹ میں لینے لگا تھا کہ کاش!

ہاں، کاش! کہ اب یہی تو ایک لفظ میرے پچھتاوؤں کی پٹاری میں باقی رہ گیا تھا کہ کاش! میں اس روز اپنے یار کالیا کی بات مان لیتا، اس کا مشورہ خاطر میں لے آتا۔ میں کیوں ایڈووکیٹ زنیرہ کی باتوں میں آگیا، خود کو تو مصیبت میں پھنسایا ہی تھا ساتھ میں وہ بے چاری بھی، آہ۔

بہت ظلم ہوگیا تھا اس غریب کے ساتھ۔ اسے میرا ساتھ دینے کی پاداش میں کس قدر بھاری قیمت چکانا پڑی تھی۔

اخبار کی وہ چیختی چلاتی خبر یہ تھی کہ ایڈووکیٹ زنیرہ کل رات کار کے حادثے میں شدید زخمی ہوئی تھی۔

نیچے اس سرخی کی تفصیل تھی جس کے مطابق، ٹرک ڈرائیور فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا تھا اور ٹرک کو مشتعل افراد نے وہیں آگ لگادی تھی جبکہ زنیرہ کو فوری طور پر قریبی اسپتال میں پہنچایا گیا تھا جہاں ڈاکٹرز اس کی زندگی بچانے کی اپنی سی کوششوں میں مصروف تھے۔"

اخبار جس سنتری نے لاکر میرے سامنے پھینکا تھا، وہ اسے اسی راشی پولیس انسپکٹر راجا دلاور نے ہی مجھے پڑھوانے کے لیے بھیجا تھا۔ وہ اس طرح اپنی فرعونی طاقت اور میری کم مائیگی کا فرق واضح کرکے میرے حوصلے کے بادبانوں کے چیتھڑے اڑانا چاہتا تھا، تاکہ میں اس کی بات مان لوں، اس کے خودساختہ بیان والے پکے کاغذ پر دستخط کردوں اور پھر یہ ارضی ناخدا اپنی اس فتح کا جشن میری شکستہ قبر پر رقصِ ابلیس کی صورت مناتے ہوئے ببانگ دہل اعلان کریں۔

"دیکھ لو، اب تک کس نے ہمارا کچھ بگاڑا ہے۔ جس نے بگاڑا، اس کی اپنی حالت اس قدر بگڑ گئی کہ وہ ہمارے آگے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہوگیا ہے۔ ہے اور کسی میں جرأت ہم ارضی ناخداؤں سے ٹکرانے کی؟ ہے تو سامنے آئے وہ، اسے بھی

ہم چھٹی کا دودھ یاد دلا دیں گے۔ ہاہا...... ہاہاہا...... ہاہا......"

"ہاہا...... ہاہا......" میرے حلق سے بھی قہقہہ خارج ہو گیا میں بھی ہنسنے لگا۔ زنجیرہ والی خبر کا اخبار میرے ہاتھوں سے چھوٹ کر لاک اپ کی ننگی اینٹوں والے سیلن زدہ فرش پر بکھر گیا۔

"بے چارہ پاگل ہو گیا ہے۔" ایک سنتری نے میرے مخبوط الحواس ہونے پر استہزائیہ تبصرہ کیا اور جو اس منحوس خبر والی اخبار لایا تھا وہ بھی اسی کے لہجے میں بولا۔

"اڑے نہیں یار، بابر! یہ پاگل نہیں ہوا ہے...... یہ واقعی خوشی کے مارے قہقہے لگا رہا ہے کہ اب وہ ایک فیصلہ کرنے میں آزاد ہے۔"

"یعنی تمہارا مطلب ہے کہ اب اس کے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے کہ وہ ہمارے صاحب کی بات مان لے اور اپنی کٹی کروالے۔" پہلے والے نے بدستور طنزیہ لہجے میں کہا۔

دونوں آپس میں یہ باتیں کرتے ہوئے خبیثانہ انداز میں کھی کھی کرنے لگے اور پھر اچانک جیسے ان کی ہنسی کو بریک لگ گئی۔

کوریڈور میں بھاری بوٹوں کی دھمک ابھری۔ میں نے اپنا سر اکھڑے پلستر والی دیوار سے ٹکا دیا تھا اور آنکھیں موند لی تھیں۔ میں ہنس بھی رہا تھا اور روتا بھی جاتا۔ عجیب کیفیت ہو رہی تھی میرے دل و دماغ کی، یوں لگتا تھا اگر یہ کیفیت اسی طرح رہی تو میرا نروس بریک ڈاؤن نہ ہو جائے۔

"ٹخ...... ٹخ......"

اچانک کسی نے سلاخوں پر ہلکے سے ڈنڈا بجایا۔ میں نے اسی طرح اپنا سر دیوار سے ٹکائے ہوئے دروازے کی طرف گردن موڑ کر دیکھا تو وہاں وہی خبیث ابن خبیث کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں سیاہ رول تھا، جسے اس نے ایک ہاتھ سے سلاخوں پر ٹکا رکھا تھا۔

"اوئے...... تیس مار خاں! خبر پڑھ لی تو نے؟"

مایوسیوں کی اتھاہ گہرائیوں اور کم مائیگی کے جاں گسل احساس نے مجھے جیسے اس قدر شکستہ انسان بنا ڈالا تھا کہ میں ٹوٹ کر رہ گیا تھا اور اب جیسے بکھرنے کے عمل سے گزر رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں اب ہر قسم کی حسیات سے "بے حس" ہو چکا تھا۔ بس! ایک شکستہ سی مردہ لاش کی تفسیر بنا رہ گیا تھا، کچھ اسی انداز میں، میں نے اس کی طرف دیکھا تھا۔

اخبار میرے سامنے سیلن زدہ فرش پر پڑا پھڑ پھڑا رہا تھا۔ آخری نگاہیں اپنی میں نے اسی پر ٹکا دی تھیں اور اسے میرا جواب سمجھ کر راجا دلاور بولا۔

"نکل گئے اب تمہارے سارے کس بل؟ یا ابھی کچھ باقی ہے؟"

میں اب بھی چپ رہا تو وہ وہاں کھڑے ہوئے ان دونوں "شرارتی" سنتریوں کی طرف دیکھ کر تحکمانہ لہجے میں بولا۔

"اوئے...... اسے ٹھنڈا پانی شانی پلاؤ...... لگتا ہے...... زیادہ ڈوز لگ گئی اسے...... ذرا احتیاط نال......"

"آپ کا خیال بالکل ٹھیک ہے سرکار! یہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی خبر پڑھنے کے بعد پاگلوں کی طرح قہقہے بھی لگا رہا تھا۔"

دوسرے نے بھی طنزیہ لقمہ دیا۔

"غفورا صحیح کہہ رہا ہے سرکار! ہم تو ڈر ہی گئے تھے کہ کہیں اس پر کسی بھوت پریت کا سایہ تو نہیں پڑ گیا۔"

"اچھا......!" انسپکٹر راجا دلاور کے منہ سے استہزائیہ برآمد ہوا۔ اس نے دانستہ "اچھا" کا طول دیا تھا۔

"چلو اوئے! اسے ذرا ٹھنڈا ٹھنڈا پلا کر میرے کمرے میں تو لاؤ۔" یہ کہہ کر وہ لوٹ گیا۔

مجھے واقعی ٹھنڈا پانی پینے کو دیا گیا۔ اس کے بعد انہی دونوں سنتریوں نے مجھے اس فرعون صفت انسپکٹر کے روبرو پیش کر دیا۔

اب وہاں میرے اور اس کے سوا اور کوئی بھی نہ تھا۔ میں جیسے خالی الذہنی کی حالت میں کھڑا تھا اور وہ اپنی اونچی پشت گاہ اور اپنے وجود کی طرح بھاری بھرکم کرسی کے ساتھ پشت ٹکائے، دونوں ٹانگیں میز پر رکھے، میری طرف خرانٹ نظروں سے گھورے جا رہا تھا۔ رول اس کے ہاتھ میں تھا۔

"آج تیری آخری پیشی ہونا تھی کورٹ میں۔ تجھ پر فرد جرم بھی عائد ہو جانا تھی آج ہی...... لیکن اس افسوسناک حادثے کی وجہ سے ہوسکتا ہے کہ پیشی ملتوی ہو جائے، ہماری بھی یہی کوشش ہوگی۔"

اس نے مجھ سے یوں کہا جیسے یہ اب مجھ پر کوئی بہت بڑا احسان کرنے والا ہو۔

"اگر ایسا ہو جاتا ہے تو یہ تمہارے لیے اچھا ہی ہوگا، نومی میاں! تمہیں ہمارے ساتھ اب خفیہ معاملہ داری طے کرنے کا موقع مل جائے گا، تاہم ابھی کچھ پتا نہیں، بہرحال، تو پھر...... کیا کہتے ہو اب؟"

اس نے آخر میں میرا عندیہ لینا چاہا۔ میں سوچتا سا بن کر بظاہر گم صم خاموش کھڑا رہا۔ کمرے کی چھت پر لگا پنکھا درمیانی رفتار سے چل رہا تھا۔ کمرے کی محدود اور گھٹی ہوئی فضا میں صرف اس کے چلنے کی ہلکی "گھوں..... گھوں" ابھر رہی تھی یا پھر ہمارے سانسوں کی ہموار بازگشت۔

کئی ثانیے اسی طرح خاموشی سے بیتتے چلے گئے۔

"ہم..... لگتا ہے اب بھی تمہارے دماغ میں کوئی ٹیڑھ باقی ہے۔"

مجھے خاموش پا کر اس نے ایک ہمکاری خارج کرتے ہوئے کہا۔ "مگر یاد رکھو..... تمہارے پاس اب واقعی ہماری بات ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں بچا ہے۔ اب بھی تمہارے دماغ میں کوئی خوش فہمی ہے تو....."

"انسپکٹر؟"

دفعتاً ہی میں نے اس کی بات کاٹ کر جیسے مشینی انداز میں کہا۔ "مجھے سوچنے کا وقت دے سکتے ہو؟"

"ہاں..... ضرور..... ضرور....." وہ میری بات پر یک دم کرسی پر سیدھے ہو کر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"مگر..... یاد رکھنا یہ بات کہ اب تمہارے پاس یہ واقعی آخری موقع ہے، دیکھتے ہیں تم اس سے کس طرح فائدہ اٹھاتے ہو؟"

"میں اس سے ضرور فائدہ اٹھانے کی کوشش کروں گا انسپکٹر.....!" میں نے کہا۔

"گڈ!"

اس کے بعد میز پر لگی گھنٹی بجا کر اس نے انہی دونوں سنتریوں کو اندر بلایا اور مجھے واپس لے جانے کا حکم دیا۔

تھوڑی دیر بعد میں پھر اسی منحوس لاک اپ کے سیلے سیلے ماحول میں محبوس سا بیٹھا تھا۔ وقت دبے پاؤں گزرتا جارہا تھا۔ میرا دماغ سرِ دست مفلوج سا ہو رہا تھا، گویا سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں سے ماؤف ہو رہا تھا۔ کسی بھاری سِل کی طرح سرکتے سرکتے یہ وقت بھی دوپہر اور پھر سہ پہر سے شام میں ڈھلنے لگا تو مجھے کچھ عقل و خرد کا یارا ہونے لگا۔

بھوک پیاس کو تو میں بھلا ہی چکا تھا۔ تاہم زندہ رہنے اور دماغ چلانے کے لیے تو آب و دانہ بھی ضروری تھا، سو رات کو ملنے والی پتلی دال اور روٹی سے میں نے پیٹ کا جہنم بھرا اور اپنے بجھے بجھے دل و دماغ کو نئے سرے سے ان مصلوب حالات کے لیے تیار کرنے لگا۔

ایک خیال آیا اس راشی افسر کی بات مان لوں اور اپنی ہار بھی..... کیس ختم کر دیا جائے گا اور میں اپنے دونوں ہاتھ اس کے آگے جوڑ کر چلتا بنوں کہ..... "بھائی! افسر صاحب! تم جیتے اور میں ہارا، مجھ میں اب لڑنے کی سکت نہیں رہی ہے۔ میں یہ جنگ ختم کر کے اور اپنے بے گناہ پھانسی پر چڑھے باپ سے کیا گیا وعدہ بھلا کر یہاں سے جا رہا ہوں، اس پچھتاوے کے ساتھ کہ افسوس اب تک میں نے بھاڑ ہی جھونکا، اب مزید جھونکنے کی سکت نہیں رہی مجھ میں، بخشو میری جان..... خدا حافظ!"

پھر خیال آتا کہ کیا واقعی ایسا ہو جاتا؟ میں ایک قید سے رہائی پا لیتا تو دوسری قید میں چلا جاتا..... ہاں! میرے جیسے انسان کے لیے تو ضمیر کا قیدی بننا بھی باعثِ آزار ہی ہوتا، یہ میرے لیے عمر قید کا درجہ رکھتی اور پھر باپ کا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے رہتا، مجھے کچوکے لگاتا۔

"واہ..... نومی بیٹا! میں نے تو تم پر فخر کرتے ہوئے ہی تم سے یہ وعدہ لیا تھا کہ جن لوگوں نے میری شرافت کا جنازہ نکال کر میرے خاندان پر ایک خونی قاتل کا دھبا لگایا ہے تم نے ہی اسے دھونا ہے ورنہ کیا تم اس کلنک کے ساتھ زندہ رہ پاؤ گے؟"

پھر ایڈووکیٹ زنیرہ ...... کا چہرہ ابھرا۔ "میں نے تمہاری خاطر کیا کچھ نہیں کیا، یہاں تک کہ تمہارے خطرناک دشمنوں کی نظروں میں آ کر ایک خوفناک حادثے سے دوچار کر دی گئی اور تم نے اس طرح ہار مان لی، کیوں؟ تم نے اس طرح میرے آدرش کو بھی نقصان پہنچایا اور میرے اعتماد کو بھی ٹھیس پہنچائی، میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔"

پھر انور شاہ کا چہرہ ابھرتا۔ "برخوردار! یہ کیا کیا تو نے؟ بس، اتنا ہی دم تھا تیرے اندر..... تو میرے بہادر یار غلام حسین کا نطفہ نہیں ہو سکتا..... ہرگز نہیں....."

پھر فوزیہ..... وہ کیا کہتی، یہی کہ میں اتنا ہی بزدل ہوں تو محبت کا اتنا بڑا میدان کیسے سر کرو گے، تم تو اپنے باپ کے وعدے کا بھی پاس نہ کر سکے، میرے وعدے کا کیا پاس کرو گے؟"

"ہاں! ایک اور کردار بھی تو..... میرا یار اور وفادار دوست، شیراز عرف کالیا! اس نے تو میرے گریبان میں ہی ہاتھ ڈال دینا تھا۔"

"ابے لے جگری! تو نے تو میری ناک کٹوا دی اس راشی افسر کی بات مان کر تیری خاطر ہی تو میں اپنی جان خطرے میں ڈال کر اس بڑی جنگ میں کودا تھا اور اب تو!"

نعیم اور عاصمہ کے چہرے بھی ابھرے تھے اور میں ان کے سامنے مجرموں کی طرح اپنا سر جھکائے کھڑا تھا۔

ان پُرسوچ اور غیر صوتی آوازوں سے میرا دماغ پھٹنے لگا۔ میں نے سر جھٹک کر ان خیالات کو ذہن سے جھٹکا اور ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے اپنے اعصاب کو پُرسکون کرنے کی سعی چاہی تو مجھے سب سے پہلے ایڈووکیٹ زنیرہ کا خیال آیا۔

پتا نہیں وہ بے چاری کس حال میں ہوگی؟ زندگی اور موت کی کشمکش میں کسی اسپتال کے آئی سی یو میں...... وینٹیلیٹر پر...... جہاں ڈاکٹروں کی پوری ٹیم اس کی جان بچانے کے لیے کوشاں ہوں گے۔

مجھے کاش اس کا حال تو معلوم ہوجاتا۔ وہ بے چاری تھی کس حال میں، زندہ بھی تھی یا...... اف، کیسے کیسے بھیانک خیالات و تصورات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا میرا دل و دماغ...... مجھے ان سے چھٹکارا پا کر ہی کچھ سوچنا تھا۔

تب میں نے سارے خیالات کو اپنے دل و دماغ سے جھٹکا اور بالآخر ایک پکا فیصلہ کر ڈالا کہ چاہے کچھ بھی ہوجائے میں اس خبیث کی بات ہرگز نہیں مانوں گا۔

میں اپنے پاؤں پہ کلہاڑی نہیں ماروں گا۔ حالات چاہے جیسے بھی ہوں میں نے ان کے آگے سپر نہیں ڈالنی۔ میرا اس خودساختہ بیان پر اپنے دستخط کرنے کا مطلب یہی تھا کہ میں دشمنوں کے گلے کا پھندا اپنے گلے میں ڈال دوں۔ پھر میں پھنس جاؤں اور وہ آزاد ہوجائیں۔ اس کے بعد مزید آسانی سے گل کھلاتے پھریں۔

اس کے بعد مجھے کیا کرنا تھا یہ مرحلہ وار میرے ذہن میں تھا جو پیش آیندہ حالات پر ہی منحصر ہوتا۔

صحیح اور درست فیصلے کرنا بھی کس قدر ذہنی سکون کا باعث ہوتے ہیں اس کا اندازہ مجھے ہو رہا تھا، یہی سبب تھا کہ ایک مستحسن فیصلہ کرنے کے بعد میں خود کو کافی حد تک ہلکا اور پُرسکون محسوس کررہا تھا۔

میں اب تک اپنی عقل اور فہم و فراست کے بل بوتے پر ہی اپنے دشمنوں اور مخالفین پر قابو پاتا آیا تھا اور مجھے اس میں خاطر خواہ کامیابیاں ہی ملی تھیں تو پھر اب اپنی اس روش کو میں کیوں ترک کرتا، ہاں اگر اس میں موقع اور حالات کے مطابق کالیا جیسے لوگوں کا بھی تھوڑا بہت "تڑکا" لگتا رہتا تھا تو کوئی برا نہیں تھا۔

اب میں اپنے دل میں یہی دعا مانگنے لگا کہ میری آج والی پیشی ملتوی نہ ہو، مجھے کورٹ میں جج صاحب کے پاس پیش کردیا جائے اور پھر میں پھٹ پڑوں گا، چپ نہیں رہوں گا، آخر کو کورٹ میں ملزم کو بھی تو اپنی صفائی پیش کرنے کا موقع دیا جاتا ہی ہے۔ تو میں کیوں نہ اس سے فائدہ اٹھاؤں۔

یہ میرا دوسرا فیصلہ تھا۔ میں اس سے بھی مطمئن تھا آگے جو تقدیر کو منظور۔

وہی ہوا، میری پیشی ملتوی نہیں ہوئی تھی۔ پریزن وین میں سوار کروانے سے پہلے راجا دلاور نے مجھ سے ایک بار پھر دستخط کرنے کے لیے کہا تو میں بولا۔ "انسپکٹر! میں نے تو ابھی چند منٹوں پہلے ہی تم سے اس بارے میں کچھ سوچنے کا وقت مانگا تھا مگر وہ وقت مجھے نہ مل سکا۔"

"سوچنا کیا ہے، بس! دستخط کردو اب اپنے اور مکتی پالو...... ایک ہی پیشی میں معاملہ نمٹ جائے گا۔"

"میں ابھی یہ نہیں کرسکتا۔" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا اور وہ بری طرح بھنّا گیا۔ پھر اسی لہجے میں بولا۔

"تو پھر موت تمہارا مقدر ہوگی۔"

"زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔"

"تمہارا بھائی اور جوان بہن؟"

"ان کا اللہ مالک ہے۔"

"جہنم میں جاؤ۔" وہ جھلا گیا۔

"یہ تمہارا مقدر ہے۔"

میں نے کہا اور پریزن وین میں سوار ہوگیا۔

مجھے کورٹ میں پیش کردیا گیا۔ وہاں کالیا بھی آیا ہوا تھا، میرا بھائی نعیم بھی اور چاچا انور شاہ کے علاوہ عطا محمد بھی تھا۔ عاصمہ بہن کو بھی میں نے دیکھا تھا۔ وہ سب پریشان اور فکر مند تھے۔ یہاں اپنے تمام بہی خواہوں کو دیکھ کر میرا حوصلہ بلند ہونے لگا۔

میری باری آئی اور مجھے ملزموں والے کٹہرے میں کھڑا کرکے جج صاحب کے سامنے پیش کردیا گیا۔ استغاثہ وکیل ایک بھاری جسم اور پکی عمر کا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک فائل دبی نظر آرہی تھی۔

اسے شاید پہلے ہی سے "ڈکٹیشن" دے رکھی تھی۔ وکیل استغاثہ نے میرے چہرے پر ایک طنزیہ نگاہ ڈالی۔

جج صاحب کے سامنے ایک فائل پہلے سے ہی کھلی ہوئی تھی۔ اس کے بعد وہ میری طرف دیکھ کر بارعب آواز میں بولے۔

"تمہاری وکیلِ صفائی مس زنیرہ حادثے کا شکار ہوچکی

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

ہے۔ اس لیے یہ پیشی غیر معینہ مدت کے لیے ملتوی ہو سکتی تھی مگر اس کے لیے ضروری تھا کہ تمہیں آج ہی کے دن عدالت میں پیش کر کے پوچھا جائے کہ تم اب اپنے لیے کوئی دوسرا وکیل کرنا چاہو گے یا پھر ادھر ہی کسی پی پی (پبلک پراسیکیوٹر) کا بندوبست کر دیا جائے؟''

میں نے جواب میں نہایت احترام سے جج صاحب سے کہا۔

''جج صاحب! سب سے پہلے تو میں عدالت کے اس انصاف کے مروجہ اصول کو بے حد قدر و تحسین کی نظر سے دیکھتے ہوئے تہ دل سے مشکور ہوں کہ مجھے اس طرح یہاں بولنے کا موقع فراہم کیا گیا۔''

میں رکا، جج صاحب کی پُرغور نظریں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ میں نے اسی طرح ٹھہرے ٹھہرے اور پرسکون لہجے میں مزید کہا۔

''یور آنر! میں اب کون سا وکیل کروں؟ کیونکہ مجھے یقین ہے کہ جج کو منانے کی خاطر اس کی کار کو بھی حادثے کی نذر کر دیا جائے گا یا پھر کسی اور طریقے سے!''

''آبجیکشن یور آنر!'' وکیل استغاثہ جو کچھ دیر پہلے اپنے تئیں میری متوقع بے بسی پر میری طرف طنزیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ چیخ پڑا۔

''آبجیکشن اوور رول!'' جج صاحب نے استغاثہ کی طرف سرزنشی نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔

''ابھی باقاعدہ جرح کا آغاز نہیں ہوا ہے، لہٰذا ملزم کو بولنے دیا جائے۔''

کہتے ہوئے جج صاحب نے گمبھیر نظروں سے میری جانب دیکھا۔ وہ شاید میری ذومعنی بات کا اشارہ سمجھ گیا تھا۔ میں نے اس کی مستفسرانہ نظروں کا مطلب سمجھتے ہوئے ہولے سے اپنے سر کو احترام سے خم دیتے ہوئے جج صاحب سے کہا۔

''تھینکس یور آنر! میں یہاں کوئی فلمی یا جذباتی باتیں کر کے معزز عدالت کا قیمتی وقت ہرگز برباد نہیں کرنا چاہتا۔ بس! معزز عدالت سے صرف ایک ہی استدعا کروں گا کہ میں ایک پڑھا لکھا اور ڈگری یافتہ ایک سائنس گریجویٹ ہوں کیا، اتنا ضرور جانتا ہوں کہ اس قسم کے بعض مخصوص حالات میں ایک ملزم کو بھی بغیر کسی وکیل صفائی کے اپنی صفائی اور اپنا موقف پیش کرنے کا موقع دیا جاتا ہے، باقی آخری فیصلہ معزز عدالت کا ہی مستحسن قرار پاتا ہے۔''

میں رک گیا۔

''یہ عدالت ملزم کو اپنی صفائی کا موقع پیش کرنے کی اجازت دیتی ہے، لہٰذا جرح کا آغاز کیا جائے۔'' جج صاحب کی آواز بھری عدالت میں گونجی تھی اور وکیل استغاثہ کا چہرہ جو تھوڑی دیر پہلے مجھے عدالت میں یوں ''لنڈورا'' سمجھ کر طنز کے زہر میں بجھا ہوا نظر آ رہا تھا اب میری جچی تلی گفتگو اور باتوں کے ''ٹریک'' کا اندازہ کر کے اور جج صاحب کی بات پر، دھواں دھواں ہونے لگا تھا۔

وہ اپنی جگہ ایک جغادری وکیل سہی مگر جان گیا تھا کہ کم میں بھی نہیں تھا اور نہ ہی تر نوالہ، مجھ سے جرح کرنے سے پہلے اس نے جج صاحب سے مخاطب ہو کر کہا۔

''یور آنر! اب بھلا میں ایک مجرم سے کیا جرح کروں؟ جس کا موقف ہی سوائے اپنے حق میں دلائل دینے کے اور کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔''

''تو پھر کیا ایک وکیل اپنے موکل کی حمایت میں سارا زور نہیں لگاتا۔'' میں نے استغاثہ کی طرف دیکھ کر ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ کمرۂ عدالت میں بھنبھناہٹ گونجیں۔

''آرڈر..... آرڈر۔'' جج نے ہتھوڑی مار کر حاضرین عدالت کو خاموش کرایا اور استغاثہ کی طرف دیکھ کر اسے پھر سرزنش کرتے ہوئے کہا۔

''آپ برائے کرام، عدالت کا وقت ضائع کیے بغیر جرح شروع کریں۔''

استغاثہ اس بات پر بولا گیا پھر سخت نظروں سے مجھے گھورتے ہوئے دیکھا اور تند انداز میں سوال کیا۔

''ابھی تھوڑی دیر پہلے جج صاحب نے تم سے اپنا دوسرا وکیل ہائر کرنے کا کہا تھا مگر تم نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ دوسرے وکیل کے ساتھ بھی یہی حادثہ ہو سکتا ہے کیا تم قانون کو اتنا ہی اندھا سمجھتے ہو کہ وہ بار بار ہونے والے ایک ہی حادثے کو سچ تسلیم کر لے گا؟''

وہ اپنی بار بار زک کا بدلہ لینے کی خاطر مجھے بھی جج صاحب سے سرزنش لینے پر تلا بیٹھا تھا مگر اسے کیا پتا تھا کہ اس نے مجھے خود ہی ایک ایسی بات کہنے کا موقع فراہم کر دیا تھا جو میں کسی سوال کے جواب میں ہی زیادہ بہتر طور پر دے سکتا تھا۔ لہٰذا نہایت تحمل سے بولا۔

''میں نے اب تک کے پیش آمدہ حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے ہی یہ بات کہی تھی۔ اس کی ٹھوس دلیل، میرے اب تک کے مرحلہ وار حالات سے واضح ہو سکتی ہے اگر معزز عدالت مجھے تھوڑا کہنے کا وقت دے۔''

"ہرگز نہیں، مختصراً لفظوں میں بیان کرو جو کہنا ہے تم نے۔" کرائے کے اس وکیل نے مجھے جھڑکنے کے انداز میں کہا تو میں نے اس کے اس رویے پر فوراً اعتراض اٹھا دیا۔

"آبجیکشن اسٹینڈ!"

جج صاحب نے میرے اعتراض کو گردانتے ہوئے مجھے بولنے کی اجازت دے دی اور وکیل استغاثہ بے بسی سے دانت پیس کر رہ گیا۔

میں نے اپنے پہلے کیس کی روداد سے کہنا شروع کیا۔

"منشی دادن والے کیس میں انسپکٹر راجا دلاور کو نوکری سے نکال دیا گیا تھا مگر کچھ ہی عرصے بعد وہ بحال ہو گیا۔ پھر جب میں کیس اپنے مخالفین کے خلاف جیتنے لگا تو عارف مچھندر کو انسپکٹر راجا دلاور ہی کی کسٹڈی میں فرار کی آڑ میں مروا دیا گیا تاکہ یہ ثبوت بھی نہ رہے۔ اگرچہ خصوصی تفتیشی ٹیم میری مدد سے منشی دادن خان کے قاتل تک پہنچنے ہی والی تھی۔ اس دوران میری ضمانت منسوخ کر دی گئی اور میں لاک اپ کر دیا گیا، اب اس بات کا ثبوت میرے پاس نہیں ہے کہ انسپکٹر راجا دلاور نے مجھ پر تشدد کرتے ہوئے، اپنی مرضی کے ایک بیان پر دستخط کرنے کے لیے زور دیا بہ صورت دیگر مجھے بھی عارف مچھندر کی طرح ایک طرف ہلاک کرنے اور دوسری جانب میرے چھوٹے بھائی اور جوان بہن کے سلسلے میں انتہائی شرمناک دھمکی دی، تاہم میں یہ بات معزز عدالت کے علم میں ضرور لانا چاہتا ہوں کہ اگر ایسا کوئی بیان آ بھی جائے جو میں مجبور ہو کر دے ڈالوں تو میں کورٹ میں پیش ہونے کے بعد میں اس سے یکسر مکر جاؤں گا، اس لیے میری یہ بات ریکارڈ میں رہے۔

اب میری وکیلِ صفائی ایڈووکیٹ زنیرہ کو جواب تک میرے سلسلے میں بہت سے حقائق سے پردہ ہٹانے والی تھی، ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اس کی کار کا حادثہ کروا دیا گیا۔

جج صاحب! میں ایک شریف، پڑھا لکھا اور متوسط گھرانے سے تعلق رکھتا ہوں، پورا محلہ اس کی بات کی گواہی دے سکتا ہے لیکن بات پھر وہی کہ عدالت کو ٹھوس ثبوت چاہیے ہوتے ہیں مگر عدالت آخر کو وکیلوں کے ٹھوس دلائل پر بھی تو فیصلے صادر کرتی ہے لیکن اگر معزز عدالت کا فیصلہ ہو گا کہ میں ایک وکیل ہائر کروں تو وہ میں کر لوں گا لیکن بات پھر وہی آ جاتی ہے لیکن میں ایک درخواست ضرور کرنا چاہوں گا کہ مجھے کم از کم انسپکٹر راجا دلاور کی کسٹڈی سے ہٹا کر پہلے والی تفتیشی ٹیم کے

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

جولائی کے
گرم موسم کا
تر و تازہ شمارہ

بنیادی خرابی
دہشت و سیاست کے پیچ و خم سے گزرتے وحشت انگیز کھیل کا سنسنی خیز احوال...... ایچ اقبال کے قلم کا کمال

انگارے
دشمنوں کے شکنجے میں آہنی اعصاب کے مالک چیمپئن کا امتحان۔ محبت اور جنگ کی فضا میں آگے بڑھتا طاہر جاوید مغل کے یادگار سلسلے کی ایک اور کڑی

آوارہ گرد
چلچلاتی دھوپ میں ہر دم ایک نئی مصیبت سے برسرِ پیکار نوجوان کی سرگزشت...... عبدالرب بھٹی کی سلسلے وار کہانی

سرورق کے رنگ
اسماء قادری اور روبینہ رشید کی سنسنی خیز و ولولہ انگیز کاوشیں......

ان کے علاوہ
مظہر امام، تنویر ریاض، سلیم انور، کبیر عباسی، جمال دستی، تسکین رضا اور عکسیں فاطمہ کی طبع زاد و ترجمہ کہانیاں

چمن نکتہ چینی
آپ کے تبصرے... مشورے... شکایتیں... اور نئی دلچسپ باتیں... کتھا میں

سپرد کردیا جائے بلکہ انصاف کا تقاضا تو یہی ہوگا کہ میری ضمانت کو کالعدم قرار دینے کی بجائے اس کا حکم بحال رکھا جائے، کیونکہ ابھی تک مقتول دادن خان کا قتل مجھ پر ثابت نہیں ہوسکا ہے اور محض شک کی بنا پر مجھے گرفتار کرلیا گیا ہے۔ اس پر مستزاد مقتول دادن خان کے قتل کے الزام میں مطلوبہ مجرم عارف گھمندر کا بھی پولیس کی کسٹڈی میں قتل ہو چکا ہے۔ یہ کیس بھی اپنی جگہ حل طلب ہے۔ بس جج صاحب! مجھے اور کچھ نہیں کہنا ہے۔"

میں یہ سب کہہ کر خاموش ہوگیا۔ جج کے دو تین بار سختی سے ٹوکنے کے بعد وکیل استغاثہ کو درمیان میں کچھ بولنے کی ہمت ہی نہ ہوسکی، اس کی ایک اور وجہ بھی تھی کہ میں نے جن حقائق اور ٹھوس شواہد کی روشنی میں اپنا موقف بغیر کسی وکیل صفائی کے جج صاحب کے سامنے پیش کیا تھا۔ اس کی رو میں فاضل وکیل کے پاس کچھ کہنے کو بچا بھی کیا رہ گیا تھا، تاہم پھر بھی اس نے عادتاً کچھ نہ کچھ لنگڑی لولی تاویلوں اور ہیر پھیر سے کام لیتے ہوئے میرے موقف کو باطل اور لغو قرار دینے کی کوشش چاہی تھی مگر بے سود۔

جج صاحب نے ابھی اپنے آخری فیصلے کو تو محفوظ رکھا، تاہم مجھے فوراً انسپکٹر راجا دلاور کی کسٹڈی سے ہٹا کر عدالتی کمیشن کے سپرد کرنے کا حکم جاری کردیا۔ ساتھ ہی انسپکٹر راجا دلاور کی تنزلی اور پھر بحالی پر بھی ایک تحقیقی ٹیم تشکیل دینے کا حکم دیتے ہوئے اسے اس سلسلے میں 'وارننگ' اور تحریری نوٹس بھی جاری کردیا کہ چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر عارف گھمندر کے فرار اور پولیس کسٹڈی میں ہلاکت پر رپورٹ پیش کرے بہ صورت دیگر اسے معطل کرکے کوارٹر گھاٹ کردیا جائے گا۔"

بے شک میری ضمانت نہیں ہوئی تھی لیکن میری یہی فتح کیا کم تھی کہ میں نے خود ہی اپنا مقدمہ لڑا تھا اور اس راشی افسر کو شکست دی تھی اور جو مجھے کسی بڑی مصیبت میں ڈالنے کے لیے دھمکا رہا تھا وہ خود پھنس گیا تھا۔

مجھے عدالتی عملے کے حوالے کردیا گیا تھا۔ بھائی فہیم، چاچا انور شاہ اور عطا محمد صاحب نے مجھے باری باری گلے لگا کر مبارک باد دی تھی، عاصمہ بہنا بھی مجھ سے مل کر رو دی تھی۔ میں نے اس کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرا اور پیار بھرے لہجے میں اس سے بولا۔

"میری بہنا! اپنے آنسو پونچھ ڈالو، کیا تم یہ چاہتی ہو کہ تمہارا بھیا کمزور ہو کر ان بھیڑیا صفت لوگوں کے آگے ہار مان لے، جنہوں نے ہمارے باپ کو ایک گھناؤنی سازش کا شکار بنایا اور اس کے خاندان پر ایک خونی قاتل کا بٹا لگایا؟"

"نہیں بھیا! ہرگز نہیں...... میں بھلا یہ کیوں چاہوں گی؟" وہ یک دم تڑپ کر بولی۔

"تو بس! پھر اپنے بھائی کے لیے دعائیں کرتی رہا کرو۔ میں بہت جلد بابا جان سے کیا ہوا وعدہ پورا کرنے والا ہوں۔"

اس کے بعد فہیم کی طرف متوجہ ہوا اور اس کے کاندھے کو تھپک کر بولا۔

"فہیم! میرے بھائی! میں جب تک یہاں ہوں، عاصمہ کی ذمے داری اور اس کی حفاظت تم نے اپنی جان سے بڑھ کر کرنا ہوگی، وعدہ کرتے ہو ناں مجھ سے؟"

"بھائی جان! آپ کیوں فکر کرتے ہو؟ اللہ آپ کا سایہ ہم پر سلامت رکھے آپ ضرور باعزت بری ہوکر گھر آئیں گے۔" فہیم مستحکم لہجے میں بولا۔

عطا محمد نے مجھے یہ خوش آیند خبر بھی دی تھی کہ عدالتی کمیشن کے پاس مجھے تین دن سے زیادہ نہیں رکھا جاسکتا، عدالت کو اس سلسلے میں تمہاری ضمانت کے لیے جلد فیصلہ کرنا پڑے گا جو بغیر کسی پیشی کے بھی ممکن ہوسکتا ہے۔

کالیا سب سے آخر میں مجھ سے ملا۔ وہ خوش بھی تھا اور فکر مند بھی۔ کورٹ کی عمارت کی باؤنڈری کے اندر ہی مجھے رکھا گیا تھا جہاں ایک الگ کمرے میں میری ان لوگوں سے ملاقاتیں ہوئی تھیں۔ چاچا انور شاہ سے میں نے کہا تھا کہ وہ مجھے فوراً ایڈووکیٹ زنیرہ سے متعلق آگاہ کریں کہ وہ بے چاری کس حال میں تھی؟ کہ اس کی پوری پوری مدد بھی کرے اور اسے اکیلا نہ چھوڑیں۔

چاچا انور شاہ بولا۔

"خدا کرے وہ بچ گئی ہو، میں ابھی اس کی خیریت دریافت کرنے جاؤں گا اور تم فکر نہ کرو میں اس نیک خاتون کی پوری مدد کروں گا۔"

"میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔" عطا محمد صاحب فوراً بولے۔ "ایسا کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ ہماری مدد کرے اور ہم اسے اس حال میں اکیلا چھوڑ دیں، اللہ اس کی خیر فرمائے۔"

پھر وہ مجھ سے دوبارہ مخاطب ہوکر ازراہ تشفی بولے۔

"تم فکر نہ کرنا نعمان میاں! یہ ہماری فتح ہے۔ تم بہت جلد ایک بار پھر باعزت رہا ہوکر ہمارے درمیان میں ہوگے۔"

"انشاء اللہ!" انور شاہ نے دعائیہ کہا۔ اس کے بعد یہ

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

دونوں مجھے تسلیاں دے کر چلے گئے۔ فہیم اور عاصمہ بھی مجھ سے رخصت ہو گئے اور آخر میں کالیا اندر داخل ہوا۔

وہ اپنے اسی مخصوص گیٹ اپ میں تھا۔ قد وقامت میں وہ تقریباً میرا ہم قد ہی تھا۔ صحت البتہ مجھ سے زیادہ اچھی تھی۔ اس نے معمولی سا جیکٹ نما ہلکے سیاہ رنگ کا "اپر" پہن رکھا تھا جو عموماً بائیک سوار پہنتے ہیں۔ ٹائٹ جینز کا رنگ بھی ایسا ہی تھا، مفلر ٹائپ رومال اس نے گلے کے گرد یونہی لپیٹ رکھا تھا۔ پیروں میں جوگر تھے۔

وہ میرے سامنے ایک کرسی پر ذرا آگے جھک کر بیٹھ گیا اور نجانے کیا سوچتا بن گیا۔

میں اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور پھر اسی لہجے میں بولا۔

"کیوں میرے یار! ناراض ہے مجھ سے ناں؟"

اس کا سر جھکا ہوا تھا، دونوں ہاتھوں کے پنجے ایک دوسرے کے ساتھ پھنسے ہوئے تھے۔ اس نے میری جانب سر اٹھا کر بالکل نہیں دیکھا تھا۔ جواب میں پہلے اس نے جھکے جھکے اپنے سر کو ہولے سے جھٹکا اور پھر سر اٹھا کر کھڑا ہو گیا۔ میں بھی ہنوز کھڑا ہوا ہی تھا۔ وہ چند قدم میری جانب بڑھا۔ ہم دونوں پورے قد وقامت کے ساتھ ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے۔ نظریں ایک دوسرے کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

اس کے ہونٹ لرز رہے تھے۔ آنکھوں میں کچھ برہمی اور اس سے زیادہ دوستانہ انداز کا پیار بھی جھلک رہا تھا۔ وہ بہت ہولے سے بولا۔ "یار جگری! تو نے میرا مشورہ ٹھکرا کر ٹھیک تو نہیں کیا تھا، پر تیرا مزاج اور تیری فطرت دیکھتا ہوں تو یہ بھی خیال آتا ہے کہ غلط تو بھی اپنی جگہ نہیں ہے۔"

"یہ درست ہے کہ میں تیرا مشورہ نہ مان کر پچھتایا بھی بہت تھا یار!" میں نے اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ میری بات پر تھوڑا چونکا تھا۔

"ہاں یار! اس رذیل راشی پولیس افسر نے کم نہیں کی تھی میرے ساتھ اور اب اس بے چاری ایڈووکیٹ زنیرہ کی بھی اپنی زندگی داؤ پر لگ گئی ہے، مجھے نہیں پتا وہ بے چاری اب کس حال میں ہوگی۔"

"از خود گرفتاری کا غلط مشورہ اسی نے ہی تو تجھے دیا تھا۔" وہ یکدم بولا۔ "کیا کر سکتی تھی وہ...... سوائے اپنی جان!"

"خدا کرے اسے کچھ نہ ہو۔" میرے ہونٹوں سے بے اختیار زنیرہ کے لیے دعائیہ کلمات ادا ہوئے۔

"مجھے لگتا ہے شاید تم دونوں کو اپنے دشمنوں کی خطرناکی، ان کے اثر ورسوخ اور طاقت کا اتنا اندازہ نہیں جتنا مجھے ہے۔" کالیا نے کہا۔

"مجھے تو ڈر لگنے لگا ہے کہ آج تیری ضد کے آگے اس وکیلہ کے ساتھ یہ ہوا ہے، کل کلاں...... تمہارا چھوٹا بھائی فہیم اور بہن بھی ہے۔"

"میں اپنے دشمنوں کے خلاف قانونی جنگ جیتنے والا ہوں اب۔" میں نے اپنے لہجے کو مضبوط بنانے کی کوشش چاہی تھی۔ "بس ذرا زنیرہ کی خیر خیریت کا حال مجھے معلوم ہو جائے۔"

"تمہاری اسی خود فریبیوں اور خوش فہمیوں سے مجھے ڈر لگتا ہے توبی!" وہ بولا۔

"میں یہاں سرکاری عمارت میں کھڑا ہوں اب تجھ سے کیا کہوں مگر تم نہیں جانتے ہو کہ راجا دلاور جیسے نجانے کتنے زرخرید اور راتب خور افسران کے آگے قطار کی صورت ہاتھ باندھے کھڑے ہوتے ہیں۔ یہ عدالتیں، کورٹ، کچہریاں اور تھانے بھی ان مافیائی اور ارضی ناخداؤں کا کچھ نہیں بگاڑ پاتے۔"

"اب اتنی بھی اندھیر نہیں مچی ہوئی ہے میرے یار! تھوڑے دن گزرنے تو دے۔" میں نے کہا جبکہ اس کی بات میرا اندر رد بھی کرنے کی جرأت نہ کر سکا تھا۔

"اندھیر مچی ہوئی ہے میرے جگری!" وہ بولا۔

"طریقے، انداز اور واقعات بدل جاتے ہیں مگر ہوتا وہی ہے جو ظالم چاہتا ہے اور مظلوم بھگتا ہے۔"

مجھے اس کے لہجے میں ہمیشہ برسوں کا تجربہ بولتا محسوس ہوتا تھا۔ میں چپ رہا، وہ آگے بولا۔

"جگری! اسی لیے کہتا ہوں کہ تمہیں بھی اپنا انداز بدلنا پڑے گا۔ اس سے آگے میں کیا کہوں۔"

وہ دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں نے موضوع بدلا اور اس سے کہا۔

"یار! باقی دیکھا جائے گا بعد میں، تو ایک کام کر لے، فہیم اور عاصمہ بہنا کا خیال رکھنا اور اس وکیلہ کا بھی خدا کرے اسپتال میں اس کی جان، ڈاکٹر بچانے میں کامیاب ہو جائیں، تو زنیرہ کی اس وقت تک رکھوالی کرے گا، جب تک میں باہر نہ آ جاؤں، وگرنہ دشمن اسے وہاں بھی ختم کرنا چاہیں گے۔"

"تو اس کی فکر نہ کر...... میں آج ہی اس وکیلہ کے لیے اپنے تین لڑکے مختلف بھیس میں اس کی نگرانی کے لیے

چھوڑے دیتا ہوں جبکہ نعیم اور عاصمہ بہن کی حفاظت کے لیے میں خود......"

"نہیں......" میں نے فوراً اس کی بات کاٹی۔ "تو خود زنیرہ کی ڈیوٹی سنبھالے گا اور مجھے جلد ہی سب سے پہلے اس کی خیریت کی اطلاع دے گا۔ اس وقت سب سے زیادہ خطرہ اسی کی جان کو ہے۔"

"اچھا ٹھیک ہے، میں چلوں پھر؟" اس نے رخصت ہونے کے انداز میں کہا۔

"ایک بات اور......" میں نے کہا۔ وہ میری طرف مستفسرانہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

"تو ایک اہم کام اور انجام دے گا، کسی طرح اس ٹرک کا نمبر اور اس کی معلومات حاصل کرے گا۔ وہ ٹرک یقیناً متعلقہ تھانے کی حدود اور کسٹڈی میں ہی ہوگا اب تک۔"

وہ مسکرایا اور اسی انداز میں ہولے سے اپنے سر کو خفیف جنبش دیتے ہوئے بولا۔

"پھر وہی جاسوسی...... تجھے تو شرلاک ہومز یا جیمس بانڈ جیسی شے ہونا چاہیے تھا جگری...... اخیر، اچھا آئیڈیا ہے، چلے گا۔"

اس کے بعد وہ میرے گلے لگا اور چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد میں لوہے کے پایوں والے بیڈ پر پاؤں پھیلائے بیٹھ گیا۔

وقت گزرتا رہا اور میرا دماغ مختلف خیالات کی آماجگاہ بنا رہا۔

وہی ہوا جیسا عطا محمد نے کہا تھا۔ دو دنوں بعد از خود میری ضمانت ہوگئی۔ اسی دوران مجھے یہ جانفزا اطلاع بھی مل چکی تھی کہ زنیرہ بچ گئی تھی اور وہ ہوش میں بھی آگئی تھی۔

میں نے خدا کا شکر ادا کیا، آزادی پاتے ہی میں اپنے اندر ایک نئی توانائی محسوس کرنے لگا تھا۔

میرا اسیل فون مجھے مل چکا تھا۔ اس میں مسڈ کالوں اور ایس ایم ایس کی بھرمار تھی، جن میں فوزیہ کے علاوہ، فرحانہ کی کالیں اور ایس ایم ایس شامل تھے۔ ابھی میں نے ان پر کوئی توجہ نہ دی۔

سب سے پہلے میں کالیا کے ساتھ بائیک پر سوار ہوکر زنیرہ سے ملنے اسپتال پہنچا۔

اس کے ایکسیڈنٹ کی رپورٹ اس ٹرک ڈرائیور کے خلاف کروادی گئی تھی۔ کالیا نے اس ٹرک کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کرلی تھیں۔ اس کی تفصیل وغیرہ میں نے بعد کے لیے اٹھا رکھی تھیں، سب سے پہلے میں زنیرہ کی خیریت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر تسلی کرنا چاہتا تھا۔ وہاں پہنچا تو خالہ نجو وہاں پہلے سے ہی موجود تھیں، وہی بے چاری یہاں زنیرہ کے پاس اسپتال میں سارا دن رہتی تھیں۔

زنیرہ کو اب آئی سی یو سے اسپیشل روم میں شفٹ کردیا گیا تھا۔ ڈاکٹروں کے مطابق اس کے دماغ میں چوٹ آئی تھی اور الٹے ہاتھ کے بازو میں فریکچر ہوگیا تھا۔ دماغی چوٹ کی وجہ سے اس کی حالت شروع میں خاصی تشویش ناک تھی مگر اب وہ خطرے سے باہر تھی۔ سی ٹی اسکیننگ کی آخری رپورٹ بتا رہی تھی کہ دماغ میں جو آخری "کلوٹ" (clot) تھا وہ بھی ری موو کردیا گیا تھا۔ تاہم ابھی اسے ایک ماہ کے بیڈ ریسٹ کی ضرورت تھی۔

وہ ہوش میں آچکی تھی مگر جب میں کمرے میں داخل ہوا تو اس کی آنکھیں بند تھیں۔ خالہ نجو اس کی تیمارداری میں وہاں مسلسل موجود تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ مغموم سی ہوگئی، میں نے سر کے ہلکے اشارے سے انہیں سلام کیا اور بیڈ پر پڑی زنیرہ کو دکھ بھری نظروں سے دیکھنے لگا۔

جو چہرہ کبھی کھلا کھلا رہتا تھا، اب اس کی رنگت پیلی پڑی ہوئی تھی۔ ایک ڈرپ اسٹینڈ اس کے بیڈ کے کنارے رکھا گیا تھا۔ بچی ہوئی خالی ڈرپ بتارہی تھی کہ اسے ایک خوراک مل چکی تھی۔ خالہ نجو کے مطابق ڈاکٹرز راؤنڈ کرکے جاچکے تھے۔ بعد میں ایک نرس نے آکر ان کے آرڈر فالو کیے تھے۔

گویا اب میں زنیرہ سے باتیں کرسکتا تھا جبکہ مجھے تلقین کی گئی تھی کہ میں مریضہ سے زیادہ باتیں نہ کروں۔

میں آہستگی سے زنیرہ کے قریب بیڈ پر بیٹھ گیا۔ اس نے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا۔ اس کے لب متحرک ہوئے، آنکھوں میں اس کی مردنی سی چھائی ہوئی تھی۔ میں سوچنے لگا میرا اس سے کیا رشتہ تھا؟ ایک مؤکل اور ایک وکیل کا یا پھر اس سے آگے کا بھی؟ یعنی دوستی کا...... چاہے کچھ بھی سہی اس نے میرا ساتھ دیا تھا میرے دیرینہ عزم میں میرے ساتھ تھی، یہاں تک کہ اپنی جان بھی خطرے میں ڈال دی تھی۔ بے شک میں ایک کلائنٹ کی حیثیت سے اسے اس کی فیس بھی دیتا رہا تھا اور اکثر اس نے مجھے ایسا کرنے سے منع بھی کیا تھا مگر میں نہیں مانتا تھا، دوستی اپنی جگہ اس کا پیشہ اپنی جگہ۔ میرے لیے یہی کافی تھا کہ وہ تہہ دل اور صدق نیت سے میرا کیس لڑ رہی تھی۔

"ن...... نومی!"

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

اس کے تھرکتے لبوں سے نحیف سی آواز ابھری اور میں اس پر تھوڑا سا جھک گیا۔

"زنیرہ! کیسی ہو اب تم؟" میں نے اپنے اندر کے اشک بار غبار کو پینے کی کوشش کرتے ہوئے اسے دھیرے سے کہا۔

"ٹھیک..... ٹھیک ہی ہوں..... تم یہاں..... مم..... میرا مطلب ہے، تمہیں رہائی مل گئی؟"

یہ کہتے ہوئے اس کے نرم لبوں پر آسودہ سی مسکراہٹ ابھری تھی۔

"ہاں! یہ سب تمہاری کوششوں کا نتیجہ ہے زنیرہ! مگر مجھے بہت دکھ ہوا ہے، تمہارے ساتھ یہ سب کچھ ہوا۔" میں نے کہا اور فرطِ جذبات تلے میں نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ اس میں مجھے ہلکی سی لرزش کا صاف احساس ہوا تھا۔

"بس! ایک حادثہ ہوا تھا میرے ساتھ..... اور۔"

"نہیں، زنیرہ! یہ حادثہ نہیں تھا۔" میں نے فوراً کہا۔ "یہ ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت ہوا تھا۔" یہ کہتے ہوئے میرے اندر غیض کا ایک ابال سا اٹھا تھا اور میری چشمِ تصور میں، سیٹھ ستار وغیرہ کی مکروہ صورتیں گردش کرنے لگیں اور پھر میں نے اسی لہجے میں اس سے کہا۔

"تم دیکھنا میں ان کا کیا حشر کرنے والا ہوں۔"

"نہیں..... ٹیک اٹ ایزی! قانون کو ہاتھ میں مت لینا نومی!"

وہ یک دم بولی تھی۔ میں نے دیکھا اس کا سانس پھولنے لگا تھا۔ میں نے اس سے باتوں کا سلسلہ موقوف کیا اور اسے آرام کی ہدایت کی۔ وہ شاید سکون آور دوائیوں کے زیرِ اثر تھی اسی لیے اس پر غنودگی سی طاری ہونے لگی۔

میں اس کے پاس سے اٹھ کھڑا ہوا۔ نجو خالہ کھڑی ہوئی تھیں اور میرے قریب کالیا خاموش کھڑا تھا۔

میں نے نجو خالہ سے مخاطب ہو کر کہا۔ "خالہ! کسی بھی شے یا مدد کی ضرورت ہو تو مجھے آپ نے بتانا ہے۔ میں آپ کو تین نمبر نوٹ کروا رہا ہوں۔ ایک میرا ہے اور ایک میرے اس دوست کالیا کا ہے۔" میں نے اپنے ساتھ کھڑے کالیا کے کاندھے پر ہاتھ دھرا اور آگے بولا۔

"تیسرا نمبر چاچا انور شاہ کا لیکن سب سے پہلے آپ کو مجھے کال کرنا ہے، میں نہ مل سکوں تو کالیا کا نمبر ٹرائی کیجیے گا۔ اس کے بعد چاچا انور شاہ کا..... آپ سمجھ گئیں میری بات یا میں دوبارہ سے دہراؤں؟" میں نے احتیاط کے پیشِ نظر ان سے کہا تو وہ فوراً بولیں۔

"نہیں بیٹا! میں سمجھ گئی ہوں۔"

"اور ایک بات کا خاص خیال بھی رکھیے گا۔ حالات سے آپ اچھی طرح آگاہ ہی ہیں۔ زنیرہ کی جان کو یہاں بھی خطرہ ہے۔ کسی بھی قسم کے ذرا سے بھی شبے کو در خورِ اعتنا سمجھیے گا اور فوراً مجھے اس کے بارے میں آگاہ کرنا ہوگا، چاہے رات کا کوئی بھی پہر ہو اور خود بھی آپ از حد محتاط رہیے گا۔"

"جی بیٹا! اللہ خیر کرے گا، میں محتاط رہوں گی۔" انہوں نے جواب دیا۔ ان کے ایک ہاتھ میں تسبیح تھی۔ ان کی کرسی کی پشت گاہ پر مصلہ بھی دھرا نظر آ رہا تھا۔ میں نے آخر میں انہیں دعا کے لیے کہا اور پھر کالیا کے ساتھ وہاں سے رخصت ہو گیا۔

☆.....☆

میں اور کالیا اسپیشل وارڈ کے روم سے باہر آ گئے۔ میں نے پہلے اسپتال کی کینٹین کا رخ کیا اور ایک کونے والی میز کا انتخاب کر کے ہم دونوں بیٹھ گئے، میں نے ویٹر کو چائے لانے کا کہہ دیا تھا۔

ہمارے پاس بائیک تھی جو کالیا کی تھی، میری مہران کار فی الحال چاچا انور شاہ کے استعمال میں تھی اور لاری اڈے میں کھڑی تھی۔

"لگتا ہے جگری! تم کچھ کرنے کے خیال سے یہاں آ بیٹھے ہو؟" کالیا نے ایک نظر کینٹین ہال پر ڈالنے کے بعد مجھ سے کہا۔

لوگ زیادہ نہیں تھے، یہاں عموماً مریضوں کے ری لیٹیو ہی آیا کرتے تھے۔ ہم نے اپنا لہجہ ذرا دھیما کر رکھا تھا۔

"ایک منٹ کالیا! ابھی باتیں کرتے ہیں، میں پہلے ذرا ان کالوں اور میسجز کے جواب دے دوں۔" میں نے اپنا سیل فون ہاتھ میں لیتے ہوئے اس سے کہا اور اس نے مسکرا کر اپنی جیب میں ہاتھ ڈال دیا۔ وہ تب تک سگریٹ سے شغل کرنا چاہتا تھا۔

میں نے سب سے پہلے فرحانہ کے سیل کا نمبر پنچ کیا۔ میری گرفتاری کے بعد اس کا اور میرا وہ والا معاملہ درمیان میں ہی رہ گیا تھا۔ جب وہ کچھ دن پہلے ہی میرے پاس لاری اڈے والے دفتر آئی تھی اور ساتھ ہی مجھے ایک تصویر بھی دکھائی تھی، جو اس نے اپنے گھر کی تلاشی کے دوران برآمد کی تھی۔ وہ ایک پوسٹ کارڈ سائز کی رنگین تصویر تھی۔ جس میں چار افراد تھے۔ ایک تو فرحانہ کے باپ رانا بشیر کی تصویر تھی۔ باقی تین

افراد جو تصویر میں تھے وہ میرے لیے اجنبی تھے۔ ایک خاتون تھیں، ایک ادھیڑ عمر کا آدمی اور چوتھا نوجوان تھا۔ اسی نوجوان کے گلے میں وہی ٹائی پن لگی ہوئی جو میں نے تصویر میں دیکھی تھی یہ فرحانہ کے ہاتھ لگی تھی، ٹائی پن بالکل وہی تھی جو فرحانہ کی مقتولہ ماں رفعت خانم کے کمرے سے برآمد ہوئی تھی۔

میں نے اس سلسلے میں فرحانہ کو یہی ہدایت دی تھی کہ ضرور اس نوجوان اور تصویر میں موجود باقی دو افراد کے بارے میں اس کا باپ رانا بشیر جانتا ہوگا۔ یہی سبب تھا کہ میں نے فرحانہ کو اس سلسلے میں یہ خاص ہدایت کی تھی کہ وہ ابھی اس تصویر اور ٹائی پن کا ذکر اپنے باپ کے سامنے مت چھیڑے، بلکہ جب میں وہاں آؤں تو تب وہ اس کا ذکر کرے، میں درحقیقت اس اہم انکشاف پر اس کے باپ رانا بشیر کے چہرے کے تاثرات نوٹ کرنا چاہتا تھا۔ اگرچہ میرا مقصد سمجھ کر فرحانہ پر کچھ بدمزگی سی طاری ہوئی تھی کہ میں اس کے باپ پر بھی شبہ کیے ہوئے تھا۔ تاہم مجھے اس کی پروا بھی نہیں تھی مگر فرحانہ سے وہی کچھ کہا تھا جو میں چاہتا تھا۔ نجانے اب اس نے کیا کیا تھا، یہ میں نہیں جانتا تھا۔

بہرکیف! فرحانہ سے رابطہ ہوتے ہی میری آواز اور نمبر پہچان کر وہ گویا چھوٹتے ہی بولی۔

''آ...... آپ خیریت سے تو ہیں ناں، نعمان صاحب؟ کہاں سے بول رہے ہیں؟ کیا جیل سے؟ میں نے اخبار میں پڑھا تو تھا آپ کے بارے میں!''

''میں لاک اپ میں تھا اور میں نے اپنی از خود گرفتاری پیش کر رکھی تھی اور اب اللہ کے فضل سے ضمانت پر رہا ہو گیا ہوں۔'' میں نے دھیمے لہجے اور پورے سکون سے بتایا۔

''ہاں! مجھے تمہارے دوست شیراز عرف کالیا نے بتایا تھا۔'' وہ بولی۔ ''تم سے رابطہ نہ ہونے پر میں نے اسی سے ہی فون پر بات کی تھی۔''

میں نے کالیا کی طرف دیکھا۔ وہ خوش فکری سے میرے سامنے والی کرسی پر سگریٹ کے کش لگانے میں مصروف تھا۔ مجھے اپنی طرف دیکھتا پا کر اس نے آنکھ ماری تھی۔

''آپ نے اس تصویر والے واقعے کا کیا کیا؟'' میں نے فوراً مطلب کی بات پر آتے ہوئے، دھڑکتے دل سے پوچھا۔

''میں نے آپ کی ہدایت پر حرف بہ حرف عمل کرتے ہوئے، ابھی تک پاپا سے اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کی ہے۔'' اس نے گویا مجھے مژدہ جانفزا سنایا۔

''گڈ! فرحانہ صاحبہ! یہ آپ نے بہت اچھا کیا۔ اب بس میں لاک اپ سے باہر آگیا ہوں اور بہت جلد آپ کے ہاں آؤں گا پروگرام بنا کر تب ہی آپ یہ ٹاپک چھیڑیے گا اپنے پاپا کے سامنے۔''

''کیا آپ کو پاپا پر بھی کسی قسم کا شبہ ہے؟'' بالآخر اس نے وہی سوال کر ڈالا تھا جس کی مجھے بھی توقع تھی اسی لیے میں اس کا پہلے ہی کوئی ایسا جواب سوچ بیٹھا تھا تاکہ فرحانہ بھی ناراض نہ ہو۔ لہٰذا ایک گہری سانس خارج کر کے بولا۔

''دیکھیے فرحانہ صاحبہ! پہلی بات تو یہ ہے کہ مجھے خوشی ہوئی ہے کہ آپ واقعی اپنی مما کے اصل قاتلوں کو بے نقاب کرنے کے لیے سنجیدہ ہیں، ساتھ ہی آپ ایک پڑھی لکھی اور سمجھدار خاتون بھی ہیں جس طرح پولیس والے ایسی کسی واردات میں سب سے پہلے گھر کے مکینوں پر ہی شبہ کرتے ہیں اور اسی شبے کے ایندھن سے اپنی تفتیش کی گاڑی چلاتے ہیں تو یہ سب کرنا محض ایک مجبوری کے تحت لازمی بھی ہوتا ہے مگر اکثر ایسا ہوتا ہے کہ گھر کے کسی مکین کو 'یوز' بھی کیا جاتا ہے۔ رہی بات میرا آپ کے پاپا پر شک کرنے کی تو اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ کہیں آپ کے پاپا کو قاتل نے نادانستگی میں استعمال تو نہیں کیا، جس کا انہیں خود بھی اندازہ نہ ہو سکا ہو اور کوئی بات نہیں میرے دل میں۔''

''ٹھیک ہے، میں سمجھ رہی ہوں آپ کی بات۔'' فرحانہ نے غیر دلچسپی سے کہا اور اصل بات کی طرف آتے ہوئے بولی۔

''تو پھر اب آپ کب آ رہے ہیں؟''

''آنا تو میں نے ایڈووکیٹ زنیرہ کے ساتھ ہی تھا مگر وہ بے چاری۔''

''ہاں! مجھے معلوم ہے مگر اب آپ ہی آجائیں۔''

''جی ہاں! اب تو یہی کرنا پڑے گا۔ میں بہت جلد آپ سے دوبارہ رابطہ کر کے آئندہ کا پروگرام بتاتا ہوں۔'' میں نے آخر میں کہا اور اس کے بعد رابطہ منقطع کر دیا۔

فوزیہ سے ابھی میں رابطہ نہیں کرنا چاہتا تھا، اول تو اسے خود ہی اب تک میری خیر خیریت کے بارے میں اپنے باپ عطا محمد سے ہی پتا لگ چکا ہوگا، دوسرے یہ کہ فوزیہ سے میں خاص وقت اور موقع محل کے مطابق ہی گفتگو کیا کرتا تھا جو میں نے بعد کے لیے اٹھا لیا۔

''تمہارا خیال غلط نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

فرحانہ سے گفتگو کرنے کے بعد میں کالیا کی بات کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔

"دشمنوں نے ہمیں ایڈووکیٹ زنیرہ کی صورت میں بہت گہرا زخم پہنچایا ہے۔ ہمارا اس کے جواب میں انہیں بھی ایسا ہی گہرا زخم پہنچانا اب از بس ضروری ہو گیا ہے۔"

"اڑے لے! جگری! تو نے تو میرے منہ کی بات چھین لی۔" کالیا خوش ہو کر بولا۔

میں نے کہا۔ "کالیا! تم نے ایک دن مجھ سے کہا تھا نا کہ ایسے کو تیسا، میں سیٹھ ستار جیسے کاروباری لوگوں کی فطرت سے خوب واقف ہوں، جو اپنی اولاد سے زیادہ اپنے مال پر مرتے ہیں، ان کی املاک کو نقصان پہنچاؤ تو یہ ان کے لیے اپنی اولاد کے مرنے سے بھی بڑا غم ہوتا ہے، اپنے مال و منال کی تباہی پر یہ تھرا اٹھتے ہیں۔ خیر..... جگری! وقت کے ساتھ ساتھ تجھے میری باتیں سمجھ میں آجائیں گی، فقط اس بات سے ڈرتا ہوں کہ کہیں دیر نہ ہو جائے۔"

میں نے کالیا کے الفاظ اس کے سامنے دہرا دیے تو وہ مسرت آمیز حیرت سے بولا۔

"اڑے واہ جگری! تو نے میرا یہ سبق کسی کتابی نصاب کی طرح یاد رکھا ہوا ہے۔"

"ہاں، کالیا! تم بھی میری طرح حالات کی بھٹی میں سلگتے رہے ہو اور کندن بن چکے ہو جبکہ میں ابھی شاید کندن بننے کے عمل سے گزر رہا ہوں۔ میرا تجربہ تم سے کم ہے اور تم اس میں بلاشبہ ایک استاد کا درجہ رکھتے ہو۔"

"شکر ہے خدا کا جگری! کہ تو نے بھی زمانے کی چال کو سمجھا ہے۔ تو پھر تیار ہو جا! آج سیٹھ ستار کو ایسی ضرب لگاتے ہیں کہ اس کی سات پشتیں تک یاد رکھیں گی۔ میں اس کے مال سے بھرے گوداموں کو آگ لگا دوں گا اور اس کی کوٹھی میں بھی پیٹرول اور آوان کے بم پھینک کر خاکستر کر ڈالوں گا، تو گھر جا کے آرام سے بیٹھ۔"

وہ شاید میری شہ ملتے ہی یک دم جوش میں آگیا تھا۔ میں نے کہا۔

"نہیں کالیا! میں تمہارے ساتھ رہوں گا لیکن خیال رہے اس میں کسی کی جان کو خطرہ لاحق نہیں ہونا چاہیے۔"

"بےفکر رہ میرے جگری! یہ کالیا برا ضرور ہے لیکن صرف بروں کے لیے برا ہے، شریفوں کا دوست ہے اور آج تک کسی بےگناہ کی اس حلال جنے نے جان نہیں لی ہے۔"

اس دوران ویٹر چائے کے دو کپ رکھ کر چلتا بنا۔ ہم دونوں چائے پینے لگے۔

"چائے ختم کرو! ہمیں اسی وقت ملیر گوٹھ جانا ہے۔" میں نے کہا۔

"میں تیار ہوں مگر ملیر گوٹھ کیا کرنا ہے؟"

"وہاں میں نے ایک اور بڑے ہاتھی کی سونڈ میں گھسنے کے لیے ایک چیونٹی تیار کر رکھی ہے۔"

"اور..... چیونٹی کا نام سائیں داد ہے۔" کالیا مسکرایا۔

(میں نے اسے سائیں داد کے بارے میں بتا رکھا تھا)

ہم دونوں چائے ختم کرکے باہر آگئے۔ بائیک پر سوار ہوئے اور ملیر گوٹھ کی طرف روانہ ہو گئے۔ آدھے پونے گھنٹے میں ہم ملیر گوٹھ میں تھے۔ گھر کی بجائے ہم نے سائیں داد کے باڑے کا رخ کیا تھا، حسب توقع مجھے وہ وہیں مل گیا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ خوشی سے کھل اٹھا اور بڑی گرمجوشی کے ساتھ میرے ساتھ اٹھ کر بغل گیر ہوا اور کالیا سے بھی اسی پرتپاک انداز میں ملا۔

یہ دونوں پہلی بار ہی ایک دوسرے کے روبرو ہوئے تھے۔

میں اکیلا ہوتا تو سائیں داد کے ساتھ سندھی میں ہی بات کیا کرتا تھا مگر چونکہ کالیا سندھی سے نابلد تھا اسی لیے میں سائیں داد سے اردو میں ہی مخاطب ہوا تھا تاکہ یہی سلسلہ چلتا رہے اور کالیا بھی ہماری گفتگو میں شامل ہو سکے۔

"یہ میرا جگری یار شیراز عرف کالیا ہے۔ جیسا تو ہے میرا جگری یار!" میں نے مسکراتے ہوئے سائیں داد کی طرف دیکھ کر کہا تو اس نے بھی جوابی مسکراہٹ کے ساتھ ایک نظر کالیا پر ڈالتے ہوئے مجھ سے کہا۔

"بابر سائیں! تیرا جگری یار ہمارا بھی جگری ہوا آگے بولو۔"

"اور یہ ہے سائیں داد! اس کے بارے میں تمہیں غائبانہ بتاتا رہا ہوں جیسا تو ایسا یہ ہے، یعنی یاروں کا یار..... یار ویس۔" میں نے کالیا سے بھی اس کا اسی طرح تعارف کراتے ہوئے کہا تو کالیا اپنی مخصوص مسکراہٹ اور اسی طرح کے لہجے میں بولا۔

"بہت سچا اور کھرا یار لگتا ہے اپنا سائیں داد! اس کے ساتھ بھی بہت اچھی گزرے گی۔"

"بالکل سائیں! بیٹھو آرام سے۔" سائیں داد نے دوستانہ انداز میں کہا اور ایک ملازم ٹائپ نو عمر چھوکرے کو آواز دی۔

"جا اندر جا کر پیڑوں کی لسی لے آ اور سن ایک تھال تازہ کھوئے کا بھی لیتے آنا..... بکڑا (جلدی)۔"

چھوکرا باڑے کے اندرونی گوشے کی طرف چلا گیا۔ سائیں داد نے ہمیں قریب دھرے دو سرکنڈوں کے مونڈھوں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

میں نے مسکرا کر سائیں داد کی طرف دیکھا اور کہا۔ "یار! تو ہمیں اتنی خالص خوراکیں کھلا کر کہیں ہمارا پیٹ ہی نہ خراب کر ڈالے، ہم شہری لوگ ہیں ہمارے معدے مصنوعی پکوان کھانے کے ہی عادی ہیں۔"

"اڑے کچھ نہیں ہوتا..... عیش کرو۔" وہ ہنسا۔ "اور بتا یارا! سب خیریت ہے ناں؟"

میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور ایک نگاہ اپنے قریب بیٹھے کالیا پر ڈالی، پھر دھیمے دھیمے لہجے میں اسے اب تک کی ساری صورت حالات سے آگاہ کر دیا۔ اس کا چہرہ ایک دم بجھ سا گیا۔ اثنائے راہ..... وہ چھوکرا اپنے ہاتھ میں ایک بڑا سا تھال اٹھائے آگیا۔ تھال خاصا بڑا اور اسٹیل کا تھا، اس پر سلور کا جگ اور دو بڑے جست کے گلاس رکھے ہوئے تھے۔ ایک تام چینی کی پلیٹ میں ہلکے براؤن رنگ کا کھویا بھی رکھا ہوا تھا اور ساتھ میں دو چھوٹے چمچ تھے۔

اسے دیکھتے ہی سائیں داد نے ایک پلاسٹک کی میز ہمارے قریب کھسکا دی تھی اور چھوکرے نے اس پر وہ اسٹیل کا تھال رکھ دیا۔

"تو چل بابا اندر..... ضرورت پڑی تو آواز دے دوں گا۔" سائیں داد نے چھوکرے سے کہا اور وہ الٹے پاؤں اندر لوٹ گیا۔

اس نے ہمارے لیے لسی کے دو گلاس بھرے اور جن میں برف کی ٹکڑیاں پہلے ہی سے موجود تھیں۔ نجانے کیا قدرتی بات تھی کہ سلور کے گلاس میں لسی کا الگ ہی ذائقہ محسوس ہوتا تھا۔

لسی پینے اور تھوڑا کھویا کھانے کے بعد ہم کچھ سیر ہوئے تو میں نے اپنا اسمارٹ فون نکال کر سائیں داد کو ان تینوں کی تصاویر دکھائیں اور کہا۔ "انہیں پہچانو اور مجھے بتاؤ یہ کون ہیں۔"

سائیں داد نے سیل میرے ہاتھ سے لیا اور اس میں عزیر خان اور اس کے دونوں دوستوں شاہ نواز اور بشیر خان کی تصاویر دیکھنے لگا اور فوراً عزیر خان کی تصویر پر اپنی انگلی کا اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے بولا۔

"یہ تو سائیں وڈے کا بیٹا عزیر خان ہے، باقی یہ دونوں اس کے شاید دوست ہیں، کبھی دیکھے نہیں اس کے ساتھ۔"

"یہی تینوں ہی تو میرے پاس آئے تھے کچھ دن پہلے۔" میں نے اسے قدرے صراحت سے آگاہ کرنا چاہا۔

"ہمارے لاری اڈے میں یہ لوگ اپنی گڈز کمپنی قائم کرنا چاہتے تھے۔ یہ ٹھیکے پر کام کرنا چاہتے تھے مگر میں پارٹنر شپ چاہتا تھا ان کے ساتھ لیکن انہیں یہ ابھی منظور نہ تھا، تاہم منہ مانگے داموں انہیں ٹھیکا دینا پڑا۔ بعد میں مجھے پتا چلا کہ عزیر خان، حاجی مہران خان کا لاڈلا بیٹا تھا۔"

"اچھا!" سائیں داد پُرسوچ انداز میں بولا۔

"مگر خیال رہے، کہیں یہ تمہارے ٹھکانے پر کوئی غلط دھندا نہ کریں اور مجھے تو یہی لگتا ہے کہ تمہاری لاری اڈے والی زمین ہتھیانے کی سازش ناکام جاتے ہی کہیں ان بلڈر مافیا نے نئی سازش تو نہیں کر ڈالی ہے۔"

"یہی خدشہ میرے ذہن میں بھی ہے اور اسی لیے میں یہاں آیا ہوں تمہارے پاس۔"

"میرے لائق جو خدمت کہو گے کروں گا۔" سائیں داد فوراً روایتی انداز میں اپنے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

ہم اس کے باڑے کے باہر ہی بیٹھے تھے۔ ہمارے سروں پر پھونس کا بڑا سا چھپرا تھا۔ ہماری بائیک اور ایک دودھ ڈھونے والی سوزوکی سامنے کھڑی تھی، اس کے بعد ایک کچا سا راستہ قوس کی صورت میں اندر گوٹھ کی آبادی کی طرف چلا جاتا تھا۔ اسی راستے پر اچانک ایک نیلے میرون کلر کی ہنڈا کار نمودار ہوئی۔ یہ خالصتاً گوٹھ کا ماحول تھا ایسی کسی کار کا یہاں نظر آنا اپنی توجہ ضرور مبذول کرانے کا باعث بنتی تھی۔

ہم بھی ذرا دیر کے لیے باتیں چھوڑ کر اسی طرف دیکھنے لگے۔ کار مناسب رفتار سے اسی کچے راستے پر دوڑی چلی آرہی تھی جو ہمارے سامنے سے گزر کر قوس کی شکل میں آبادی کی طرف چلا جاتا تھا۔ پھر اچانک ہی میں چونک پڑا اور میرا دل یکبارگی تیزی سے دھڑکنے لگا۔ میرے لیے اس میں ایک ہی شخص شناسا تھا جو ڈرائیور کے برابر والی سیٹ پر براجمان تھا۔ اسے میں کیسے بھول سکتا تھا۔ اس وحشی اور بے رحم انسان کو تو میں لاکھوں کے ہجوم میں بھی پہچان سکتا تھا۔

یہ بلیو مون کا سیٹھ ستار تھا جبکہ اس کے عقبی سیٹ میں دو افراد اور بھی براجمان تھے، ایک تو گن مین ہی لگتا تھا، جس کے ساتھ مجھے گن بھی تھمی ہوئی اس کی نال کار کی کھڑکی سے صاف جھلک کی صورت نظر آتی تھی۔

البتہ اس کے ہمراہ بیٹھا ہوا آدمی قدرے بھاری جثے کا

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

بالکل نظر آتا تھا۔ اس کا چہرہ البتہ لمبوترا تھا، اس نے ٹوپی پہن رکھی تھی۔ چہرے پر رعونت کے تاثرات تھے۔ یہ میرے لیے اجنبی ہی تھا۔

میں نے فوراً کچھ سوچ کر اپنا چہرہ چھپا کر دوسری طرف کر لیا تھا، یہی کام کالیا نے بھی کیا تھا، وہ بھی اسی طرف متوجہ تھا۔

''یہ دونوں یہاں...... شاید اپنے گرو گھنٹال مہران خان سے ملنے آئے ہیں۔''

کار کے، دھول اڑاتے راستے پر، نظروں سے اوجھل ہونے کے بعد کالیا نے دبا دبا تبصرہ کیا تو میں نے قدرے چونک کر اس سے پوچھا۔

''دونوں کون؟ مجھے تو اس میں شناسا آدمی صرف سیٹھ ستار ہی نظر آیا تھا!''

''ہاں، جگری! تمہارے لیے سیٹھ ستار ہی شناسا ہے مگر لاڈلہ سائیں نہیں۔'' وہ بولا۔

''عقبی سیٹ پر جو شخص گن مین کے ساتھ بیٹھا تھا وہ لاڈلہ سائیں تھا۔''

''اوہ......'' میں کچھ بے چین سا ہو گیا۔ سائیں داد نے مجھ سے کہا۔

''تم کیوں پریشان ہوتے ہو؟ میرا خیال ہے ان کی نگاہ تم پر نہیں پڑی تھی۔''

''یہ بات نہیں سائیں دادا!'' میں نے کچھ سوچنے کے دوران کہا۔ ''میں دراصل کچھ اور چاہ رہا تھا۔''

''کیا ادھر ہی ان سے بھڑ جائیں...... بول جگری؟'' کالیا مسکرا کر بولا۔

''نہیں۔'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں تھوڑی جاسوسی کرنا چاہتا ہوں۔''

پھر سائیں داد کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''سائیں دادا! ہم تیرے پاس ابھی تھوڑی دیر میں آتے ہیں۔'' پھر اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے میں نے کالیا سے کہا۔

''اٹھو کالیا!''

اس نے فوراً اپنی سیٹ چھوڑ دی اور سائیں داد بھی کھڑا ہو گیا۔ اس کے چہرے پر گہری تفکیر چھا گئی تھی۔ پھر بولا۔

''جو بھی کرنا ہے ذرا احتیاط رہ کر کرنا...... میری مدد کی ضرورت ہو تو بتاؤ؟''

''ضرور بتائیں گے، بلکہ ہم تو آئے ہی تیرے پاس اسی لیے تھے خیر آتے ہیں دوبارہ تیرے پاس۔''

اس کے بعد میں اور کالیا بائیک میں سوار ہو گئے۔ اس بار بائیک میں چلا رہا تھا۔ کیونکہ کالیا کو وڈیرے حاجی مہران خان کی حویلی کا پتا نہیں تھا، جبکہ میں پہلے ایک بار یہاں سائیں داد کی مدد سے ہی آ چکا تھا اور مجھے حویلی تک جانے کے محفوظ راستوں کا معلوم تھا۔

وہ کار جس راستے سے گئی تھی میں وہ راستہ چھوڑ کر نسبتاً تنگ اور ناہموار ٹیڑھے میڑھے راستے پر ہو لیا تھا۔

''جگری! ذہن میں رہے کہ ہم کسی بھیس میں نہیں ہیں اس وقت......'' پیچھے سے کالیا نے میرے کان میں کہا تو میں نے محض اپنے سر کو اثباتی جنبش دینے پر اکتفا کیا تھا، مگر کالیا کی تسلی نہیں ہوئی، دوبارہ بولا۔

''اگر ایسا کچھ ہو گیا تو اس کا اثر ہمارے دوست سائیں داد پر پڑے گا، جو اس وقت ہمارے لیے بہت اہم ہے۔''

''یہ سب باتیں میرے ذہن میں ہیں یار!'' میں نے کہا۔

''اچھا میرے یار! ناراض کیوں ہوتا ہے۔'' کالیا مسکرا کر بولا۔

جیسے ہی مجھے اندازہ ہوا کہ ہم حویلی کے قریب تر فاصلے پر پہنچ چکے ہیں تو میں نے بائیک راستے سے ہٹا کر جھنجیوں کے جھنڈ کی طرف موڑ لی اور وہیں روک دی۔ ہم دونوں اترے، بائیک کو میں نے ایک درخت کے ساتھ ٹکا دی اس کے بعد ہم دونوں آگے بڑھے، پھر جھنڈ کے عقب سے ہی میں نے حویلی کا دیوہیکل چوبی دروازہ دیکھا جو کھلا پڑا تھا۔ وہ کار شاید ابھی ابھی اندر داخل ہوئی تھی۔

وہاں دو گن مین کھڑے تھے۔ ایک گیٹ کو بند کر رہا تھا۔ میں ہونٹ بھینچے کچھ سوچتا رہا۔

''تو کرنا کیا چاہتا ہے جگری؟''

مجھے گہری سوچ میں پا کر کالیا نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

''بتایا ناں...... جاسوسی۔''

''مگر یہ کام یہاں چھپ کے بیٹھے رہنے سے نہیں ہوگا۔''

''ہاں! اسی لیے میں اندر جانے کا ارادہ کر رہا ہوں۔''

''کیا......؟'' وہ چونک کر قدرے اونچی آواز میں بولا۔

''شش...... شی...... آہستہ میرے یار! ہم اس وقت خطرے کی چوٹی پر ہیں۔'' میں نے ٹوکا۔ وہ بولا۔

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

"تو اندر کیسے جائے گا؟ دھر لیا گیا تو سمجھو گیا۔" وہ پریشانی سے بولا۔

"میں یہاں پہلی بار نہیں آیا...... اب تو ادھر ہی رک اور اپنے سیل فون کو سائلنٹ کر کے اسے وائبریٹ پر لگا دے، میں بھی یہی کرتا ہوں۔"

"یار جگری! اپنا خیال رکھنا۔" وہ بولا۔

"فکرمت کر صرف دعا کر...... میں جلد ہی تجھ سے ادھر ملتا ہوں آکر مگر سیل فون پر توجہ رکھنا، ہم مسلسل رابطے میں رہیں گے۔" میں نے کہا اور اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ جب میں جانے لگا تو اس نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا، میں رک گیا وہ بولا۔

"جگری! ذرا سا بھی خطرہ محسوس کرے یا اندر میری ضرورت ہو تو مجھے بتانا ضرور...... میں کسی بھی خطرے کی پروا کیے بغیر اندر کود پڑوں گا۔"

میں نے مسکرا کر اس کا کاندھا تھپتھپایا اور پھر ایک طرف کو بڑھ گیا۔

میں حویلی کی طرف بڑھنے کی بجائے اس طرف کو لپکا تھا جدھر ساریوں سے (چاولوں کی فصل سے) لدا ہوا ایک ٹرالی ٹریکٹر کھڑا تھا۔ اس کا رخ حویلی کے گیٹ کی طرف ہی تھا۔

وہاں ایک اجرک پوش آدمی کھڑا ٹریکٹر کے انجن پر جھکا ہوا تھا، اس میں شاید کوئی خرابی ہوگئی تھی، وہ اسے ٹھیک کرنے میں معروف تھا۔

"اڑے او...... لکھا! گیٹ بند کروں یا آرہا تو؟"

اچانک قریب کھڑے ایک گن مین نے اسے پکارا۔ میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا۔ گویا یہ ٹریکٹر کچھ دیر میں اندر ہی لے جایا جانے والا تھا۔

"ہاں! بابا، بس، تھوڑی خرابی ہوگئی ہے، ابھی آتا ہوں، گیٹ کھلا رہنے دے۔" اس اجرک پوش آدمی نے کہا جو ٹریکٹر کا ڈرائیور ہی تھا۔

"اچھا...... اچھا، جلدی نمٹا کام......" گن مین نے کہا اور اپنی جیب سے بیڑیوں کا ایک کاغذی مٹھا نکال کر اس میں سے ایک بیڑی نکالی اور ماچس سے سلگانے میں معروف ہوگیا۔

میں نے اردگرد نظریں دوڑائیں۔ وہاں سناٹا تھا۔ اس کے بعد میں جھکے جھکے انداز میں چلتا ہوا، ان کی نظروں سے بچتا بچاتا ٹرالی کے قریب سرک آیا۔

اسی وقت مجھے ٹریکٹر کے لبوترے حصے کا بونٹ بند کرنے کی آواز سنائی دی۔ شاید ڈرائیور نے خرابی دور کرلی تھی۔ میں حرکت میں آیا اور ایک نگاہ احتیاطاً گردوپیش میں ڈالنے کے بعد ٹرالی کے عقب سے اس میں سوار ہوگیا اور ساریوں کے اندر جا گھسا۔

میں جانتا تھا کہ میں جو کرنے جارہا تھا وہ میرے لیے کس قدر خطرناک بھی ہوسکتا تھا لیکن اگر میں کامیاب ہوجاتا تو میری یہ مہم سودمند بھی ثابت ہوسکتی تھی۔ میں کٹی ہوئی فصلوں کے اندر اچھی طرح گھس کر اس میں یوں سما گیا کہ مجھ پر کسی کی نظر بھی نہ پڑے۔ اسی وقت ٹریکٹر کے انجن کے اسٹارٹ ہونے کی آواز ابھری اور پھر وہ ایک دم حرکت میں آیا۔ مجھے ایک جھٹکا لگا۔ ٹریکٹر روانہ ہوا اور پھر دھیمی دھیمی رفتار سے چلتا ہوا، گیٹ کے اندر داخل ہونے لگا۔ میں نے ننھے منے رخنوں سے باہر بھی نگاہ رکھی ہوئی تھی۔

یہاں اب میری پہلی کوشش یہی تھی کہ ٹریکٹر کے رکتے ہی میں احتیاط کا مظاہرہ کرتے ہوئے کسی کی نظروں میں آئے بغیر نیچے اتر جاتا۔

جلد ہی ٹریکٹر حویلی کے وسیع وعریض احاطے کے ایک کونے میں رک گیا۔ اس کا انجن بند ہوا اور میں نے دھڑکتے دل سے اس طرف دیکھا جہاں ٹریکٹر سے اجرک پوش ڈرائیور انجن بند کر کے نیچے اتر رہا تھا۔ میں نے گیٹ کی سمت دیکھا، وہ دونوں اسلحہ پوش محافظ گیٹ بند کر کے بیٹھ گئے تھے۔

انہیں آپس میں باتوں میں مشغول دیکھ کر اور ڈرائیور پر ایک نگاہ ڈالنے کے بعد میں بغیر کوئی سرسراہٹ پیدا کیے، دوسری طرف سے نیچے اتر گیا۔

اس دوران میں نے اس بات کا خیال رکھا تھا کہ میں ٹرالی سے اترتے ہی فوری طور پر اسی جگہ کا رخ کروں جہاں جلد ہی مجھے چھپنے کا کوئی گوشہ میسر آجائے۔

یہ اوطاق کی داہنی سمت والی جگہ کا حصہ تھا، آگے اس کے پھونس کا چھپر لگا ہوا تھا۔ حویلی کی اصل عمارت کا مرکزی دروازہ اوطاق کی دوسری سمت میں تھا۔ نیلے رنگ کی وہ کار اوطاق کے باہر ہی کھڑی تھی اور اندازہ ہوتا تھا کہ یہ لوگ ابھی اندر اوطاق میں ہی تھے۔

شام ڈھلنے لگی تھی اور اس طرح کے دور افتادہ علاقوں میں یوں بھی سر بام اترتی شام پر رات کا گمان ہونے لگتا تھا۔ اندھیارے جھک آئے تھے۔ کسی بھی قسم کی پیش قدمی سے پہلے میں نے اوطاق کے اریب قریب کا جائزہ لیا جہاں میں

چھپ کر اپنی اس خطرناک مہم کو منطقی انجام تک پہنچانے کی کوشش کرتا۔

مجھے اوطاق کے سامنے کے رخ پر نظر آنے والی دیوار کے قریب ہی کچھ ریختہ سا پھیلا دکھائی دیا جو مختلف ٹھیکریوں کی صورت میں بکھرا ہوا تھا، میں نے اسی طرف کا رخ کیا اور دبک کر بیٹھ رہا۔ چھپنے کی یہ جگہ کچھ ایسے رخ پر تھی کہ یہاں سے بیک وقت اوطاق اور حویلی کا مرکزی دروازہ صاف نظر آتا تھا۔ چنانچہ ابھی مجھے وہاں دبکے بیٹھے چند ہی سیکنڈ ہوئے تھے کہ میں نے حویلی کے دروازے سے ایک لمبے تڑنگے شخص کو باہر نکلتے دیکھا۔

وسیع احاطے کی بتیاں جلادی گئی تھیں اور اب وہاں روشنی پھیل گئی تھی۔ وہ آدمی جو اپنے بھاری بھرکم جثے سے کوئی رعب دار اور غصے والی شخصیت ہی دکھائی دیتا تھا، اپنے دو عدد اسلحہ پوش حواریوں کے ساتھ بڑے کروفر سے قدم اٹھاتا ہوا اوطاق کی جانب بڑھ رہا تھا۔ اس نے ہلکے براؤن رنگ کا بیش قیمت منقف شلوار سوٹ زیب تن کر رکھا تھا۔ مونچھیں خاصی بڑی اور گھنی تھیں، چہرہ بھاری تھا اور اس پر گھنی داڑھی ابھری ہوئی تھی۔ جنہیں وسمہ کیا ہوا تھا۔ آنکھوں کی بھنوئیں بھی گھنی تھیں۔ میں یقین سے تو کہہ ہی سکتا تھا کہ یہی جاگیردار وڈیرہ حاجی مہران خان تھا۔ مجھے اس کی عمر کا اندازہ پچاس، پچپن کے اریب قریب ہی ہوسکا تھا۔ وہ یقیناً آنے والے ”مہمانوں“ کے استقبال کے لیے ہی آیا تھا۔

اس کے اندر داخل ہوتے ہی میں نے پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچے اور دائیں بائیں دیکھا۔ گیٹ کی طرف وہ دونوں مسلح چوکیدار فلمی ٹھٹے اور بیڑی پینے میں مشغول تھے جبکہ ٹریکٹر ڈرائیور اپنی ٹرالی کو کسی لیور کی مدد سے الٹا کرنے میں مصروف تھا۔

حاجی مہران کے ساتھ آنے والے دونوں حواری اس کے پیچھے ہی اوطاق کے اندر چلے گئے تھے۔ میں نے میدان قدرے صاف پاتے ہی اوطاق کی دیوار سے لگے ہوئے اس طرف کھسک آیا جدھر کھڑکی تھی۔ کھڑکی دیکھ کر میری آنکھیں چمک اٹھی تھیں۔ میں نے سب سے پہلے اپنا سیل نکال کر کالیا کو اپنی ”اندر“ کی خیریت کا ایک مختصر ایس ایم ایس کیا اور پھر جب کھڑکی کی جانب بڑھنے لگا تو ایک دم وہیں جم گیا۔

یہاں مجھے ایک قباحت محسوس ہوئی کہ کھڑکی کے دوسرے رخ پر حویلی کے بالاخانے کی منزل کے دریچے صاف دکھائی دیتے تھے۔ ڈر مجھے یہی تھا کہ اگر کسی نے مجھے ان اپری دریچوں سے دیکھ لیا تو میری شامت ہی آجانی تھی۔ تاہم ایک بات تھی کہ یہاں روشنی کم کم ہی پڑ رہی تھی، یعنی نیم اندھیرے کا سماں تھا۔

میں نے یہ رسک لینے کا فیصلہ کیا۔ کیونکہ میں ان تینوں بڑے مافیائی چیفس (مہران خان، سیٹھ ستار اور لاڈلہ سائیں) کی گفتگو ضرور سننا چاہتا تھا، ان کی یہ میٹنگ کسی اہم نوعیت کی اور ان کے جرائم کا پردہ چاک کرتی محسوس ہوتی تھی۔ ممکن تھا کہ میں ثبوت کے طور پر اس سے کوئی قانونی نوعیت کا فائدہ نہیں اٹھا سکتا تھا مگر ان کے آئندہ کے عزائم سے واقفیت بھی کم سودمند بات نہ تھی۔

میں دھیرے دھیرے سرکتا ہوا کھڑکی کی طرف آگیا، کھڑکی کا ایک پٹ کھلا ہوا تھا، یا شاید محض بھڑا ہوا تھا۔ میں نے اپنی ایک آنکھ قریب کر کے اندر جھانکا تو میری ایک آنکھ کے کیمرے میں اندر کشادہ اوطاق کا پورا محل وقوع فوکس ہوگیا۔ فرش سادہ سا تھا اس پر صاف ستھری دری بچھی ہوئی تھی اور اس پر چار پانچ بڑے بڑے سرکنڈوں والے مونڈھے دھرے پڑے تھے۔ جن پر یہ تینوں براجمان تھے۔ درمیان میں ایک مستطیل میز بچھی ہوئی تھی اور اس پر ایک بڑی سی ٹرے پر مختلف لوازمات خورونوش رکھے نظر آتے تھے۔ ٹھنڈے پانی کی بوتلیں بھی تھیں اور کانچ کے دو تین گلاس بھی رکھے تھے۔

”اڑے بابا، سیٹھ صاحب! کمال ہے، تم سے ایک چھوکرا نہیں سنبھل پا رہا ہے۔ چھوکرا بھی ایسا جس کا ایک بھائی اور ایک جوان بہن بھی ہے، یہ تو سب سے آسان شکار ہوتا ہے۔“ یہ حاجی مہران خان تھا۔ اس خبیث کا اشارہ کس طرف تھا اس کا اندازہ میں بہ خوبی کرسکتا تھا۔ تاہم اس شیطان کی بات پر مجھے طیش سے زیادہ تشویش کا بھی احساس ہوا۔ اس نے اپنے روایتی اور مخصوص لہجے میں سیٹھ ستار کو ہی سیٹھ کہہ کر مخاطب کیا تھا۔

”حاجی صاحب! میں تو کب کا اسے ختم کرا چکا ہوتا لیکن بس، کیا بتاؤں! ابتدا میں مجھ سے کچھ غلطیاں ہوگئی تھیں جس کی وجہ سے وہ اتنا پھیلتا چلا گیا کہ اب منہ کو آنے لگا ہے۔“ سیٹھ ستار بولا۔

وہ آپس میں باتیں کرتے جا رہے تھے اور ساتھ ہی سامنے میز پر دھرے لوازمات خورونوش سے بھی چھیڑ چھاڑ میں مصروف تھے۔

”یہ تمہارا لاڈلہ سائیں کس مرض کی دوا ہے؟ آدھے

کراچی کے ایک سے ایک بدمعاش اس کے پیروں تلے کام کرتے ہیں۔" حاجی مہران، سیٹھ ستار کے سیدھے ہاتھ کے مونڈھے پر بیٹھے سائیں لاڈلہ کی طرف دیکھ کر معنی خیز مسکراہٹ سے بولا تو سیٹھ ستار کی بجائے وہی بولا۔

"سائیں مہران صاحب! میرا تو ابھی اس چھوکرے سے واسطہ نہیں پڑا ہے مگر میں نے سنا ہے کہ وہ ہمارے ایک مخالف گروپ استاد بھابھا کے آدمیوں سے مل چکا ہے۔ بس، اس کے ابھی تک زندہ بچے رہنے کی یہی سب سے بڑی وجہ ہے۔"

میں نے سائیں لاڈلہ کی اس بات پر دل ہی دل میں اس پر لعنت بے شمار رسید کی تھیں۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ مجھے اب تک ان مگرمچھوں اور شیطانی ٹولوں سے بچائے رکھنے والی صرف ...ایک ہی ذات پاک تھی جو سب کا پالن ہار تھا۔ میرا اللہ۔

"تمہارے کہنے کا مطلب ہے کہ وہ بے حیثیت سا چھوکرا ایک دم طاقت پکڑ گیا ہے۔" حاجی مہران نے ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو سیٹھ ستار تھوڑا کسمسا کر بولا۔

"ایسی بات تو نہیں ہے کہ وہ ہمارے مقابلے میں طاقت پکڑ گیا ہے۔ بس یوں سمجھیں سائیں کہ ہماری ہی بعض غلطیوں اور اسے اہمیت نہ دینے کی عادتوں نے اسے تھوڑا اپنے قد سے اونچا ضرور کر دیا ہے۔"

"اپنی نااہلیوں کو چھپانے کے لیے تمہیں اور کوئی بات نہیں ملی تھی، سیٹھ ستار؟" حاجی مہران کے لہجے میں ایکا ایکی تحکمانہ قسم کا رعب در آیا تھا۔ جس پر سیٹھ ستار نے ایک جھینپی ہوئی سی مسکراہٹ کے ساتھ اپنے ساتھ بیٹھے لاڈلہ سائیں کی طرف دیکھا تھا۔ وہ شاید اس کا کوئی اشارہ بھانپ کر حاجی مہران سے فوراً مخاطب ہو کر بولا۔

"سائیں بھوتار! ہم سے واقعی دشمن کو کمزور سمجھنے کی غلطی ہو چکی ہے اور اس کا خمیازہ ہمیں بھگتنا پڑ رہا ہے۔ اب ہم اس کے حل کے لیے آپ کے پاس آئے ہیں تاکہ آپ ہماری کچھ مدد کر سکیں۔"

سائیں لاڈلہ نے گویا موضوع ختم کرنے اور نئی بات پر عمل پیرا ہونے کی غرض سے آخر میں کہا تو حاجی مہران کی دھسی کی گھنی بھنوؤں تلے آنکھوں میں ایکا ایکی شکرے جیسی چمک نمودار ہوئی اور پھر وہ اسی لہجے میں بولا۔

"میں تمہاری ناکامیوں سے پہلے ہی آگاہ تھا۔ اسی لیے میں بہت پہلے ترپ کا پتا پھینک چکا ہوں۔" اس کی بات پر سیٹھ ستار اور سائیں لاڈلہ پُرامید سی نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگے جبکہ خود میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

گویا میری اس خطرناک مہم جوئی کا کلائمکس برآمد ہونے والا تھا۔ یہ تینوں بھیڑیے میرے خلاف اپنی گھناؤنی سازشوں کا کوئی نیا تارِ عنکبوت بُننے والے تھے۔ یہی وہ وقت تھا جب میں گویا سراپا سماعت بن گیا۔

حاجی مہران خان کی رعونت بھری کونجیلی آواز ابھری۔ مخاطب سیٹھ ستار ہی تھا۔

"تم ابھی تک ان لوگوں سے لاری اڈے کی زمین تک خالی نہ کروا سکے اور میں نے جو کام وہ زمین ہتھیانے کے بعد کرنا تھا وہ ابھی سے بڑی کامیابی کے ساتھ شروع بھی کر ڈالا ہے۔"

اس کے انکشاف پر سیٹھ ستار کی آنکھیں ایک دم چمک اٹھیں اور پھر وہ اسی لہجے میں ٹوڈی پن سے بولا۔

"واہ سائیں واہ......! کیا کہنے آپ کے......کیا واقعی ایسا ہوا ہے؟"

"ہاں!" اپنی تعریف پر اترانے والی اور پُرغرور مسکراہٹ کے ساتھ حاجی مہران بولا۔

"میرا بیٹا عزیر خان اس چھوکرے نعمان کے اڈے میں اپنا تعرف جمانے میں کامیاب ہو چکا ہے۔ میں نے تمہیں اسی لیے ہی بلایا تھا تاکہ بالمشافہ ملاقات پر تمہیں اپنی اس نئی چال سے آگاہ کر سکوں......اس کے ہمراہ دو دوست اور بھی ہیں اور وہ ان سے کاروباری معاہدہ کرنے میں کامیاب ہو چکا ہے۔"

اس کی بات پر میرا دل مسرت سے دھڑکا۔ اپنی جس چال کا وہ اتنے غرور اور رعونت آمیز فخر سے اظہار کر رہا تھا، نہیں جانتا تھا کہ میں اس کا پہلے ہی بھانڈا پھوڑ چکا تھا اور اب مزید پھوڑنے کے لیے اس وقت اس کی ناک کے نیچے موجود تھا۔ یہ ارضی ناخدا طاقت اور گھمنڈ کے نشے میں ہمیشہ یہ بات بھول جایا کرتے ہیں کہ غرور اللہ کو پسند نہیں اور سانچ کو آنچ نہیں۔ سچ اپنا راستہ خود بناتا ہے اور جھوٹ رسوائیوں کے اندھیاروں میں بھٹکتا رہتا ہے۔

حاجی مہران خان کے اس انکشاف پر لاڈلہ سائیں سے زیادہ سیٹھ ستار کو حیرت آمیز مسرت ہوئی تھی اور وہ غیر یقینی سے انداز میں مہران خان سے بولا۔

"سائیں! یہ تو آپ نے ادھر ہی بیٹھے بیٹھے بڑا میدان مار لیا۔ ہم تو اس ضدی چھوکرے کو ایک انچ بھی لاری اڈے کی

زمین سے نہیں ہلا سکے اور آپ نے اس کے گھر میں سیندھ لگالی۔"

سیٹھ ستار کے مخصوص ٹوڈی پن پر حاجی مہران کا چہرہ فخر سے مزید پھول گیا لیکن میں نے دیکھا کہ لاڈلہ سائیں خاموش تھا۔ اس نے مہران خان کے انکشاف پر کسی خوشی یا چونکنے پن کا اظہار نہیں کیا تھا۔ لہٰذا جب ان دونوں کی لاف گزاف ختم ہوئی تو وہ بولا۔

"کیا آپ لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ راز نعمان پر کبھی افشاں نہیں ہوگا؟"

"ہمیں اس کی اب پروا نہیں رہی۔" حاجی مہران خان نے تسلی سے جواب دیا اور میں اندر سے بری طرح کھٹک گیا۔

"وہ ہمارے بیٹے اور اس کے دوستوں کے ساتھ معاہدہ کر چکا ہے۔ بعد میں پتا بھی چلا تو ہم نے اپنے بیٹے کو سمجھا دیا ہے کہ وہ یہی کہے گا۔ وہ کچھ نہیں جانتا اور اپنے اس کاروبار کی داغ بیل اس نے خود ڈالی ہے۔ ہم سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔"

"پھر تو ٹھیک ہے سائیں! پر پھر بھی آپ اس چال کے پردے میں اب کرنا کیا چاہتے ہیں؟" لاڈلہ سائیں نے۔۔۔ بالآخر وہی سوال کیا جو میرے حلق میں بھی اٹکا ہوا تھا۔ لہٰذا میں پوری توجہ سے ہمہ تن گوش برآواز رہا۔

"ہا۔۔۔۔۔ہا۔۔۔۔۔! لاڈلہ سائیں! بس اب دیکھتے جاؤ، ہم کرتے کیا ہیں۔" حاجی مہران خان نے بدمست سا قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ پھر سیٹھ ستار سے مخاطب ہو کر بولا۔

"سیٹھ! ہم نے جو کام کرنا تھا وہ کر دیا۔ اب تم اپنے حصے کا کام نمٹاؤ اور اس چھوکرے سے جلد جان چھڑاؤ۔"

"بالکل سائیں! یہی تو میں بھی چاہتا ہوں مگر اب معاملہ اور حالات کچھ اور ہو گئے ہیں۔" سیٹھ ستار بولا۔

"کچھ قانونی مسائل آڑے آ گئے ہیں۔ ہم نے تو اسے سلاخوں کے پیچھے ہی ختم کر ڈالنے کا پورا پلان بنا رکھا تھا مگر افسوس کہ یہ چال الٹی ہم پر ہی آن پڑی مگر آپ فکر نہ کریں، میں نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلی ہیں، ابھی میرے ترکش میں بہت سے تیر باقی ہیں جو بہ ہدف ثابت ہو سکتے ہیں۔"

حاجی مہران خان نے اس پر کوئی تبصرہ نہ کیا تو لاڈلہ سائیں جو مجھے کچھ زیادہ ہی ہوشیار اور مکار محسوس ہونے لگا تھا۔ بولا۔

"نعمان اب کوئی عام لڑکا نہیں رہا ہے۔ یہ بات میں اس لیے نہیں کہہ رہا ہوں کہ وہ میرے مخالف گروپ استاد بھابھا کا حلیف بن چکا ہے، بلکہ اس برتے پر کہہ رہا ہوں کہ اب اسے کچھ قانونی تحفظ بھی حاصل ہونے لگا ہے۔ مجھے تو اس بات کا بھی پتا چلا ہے کہ وہ دو ایک اور پیشیوں کے بعد باقاعدہ عدالت سے باعزت بری بھی ہونے والا ہے۔"

"آئی ڈونٹ کیئر۔۔۔۔۔ مسٹر لاڈلہ سائیں!" سیٹھ ستار بڑے زعم سے بولا۔

"میں اسے کسی ایسے گھن چکر میں ڈال دوں گا کہ قانون بھی اس کی کوئی مدد نہیں کر پائے گا اور نہ ہی ہمارا بھی کچھ بگاڑ پائے گا۔ تم نے دیکھا نہیں کہ ایڈووکیٹ زنیرہ کا ہم نے کیا حشر کیا۔ دیکھنے کو محض حادثہ تھا، کون جانتا ہے کہ یہ کارنامہ ہمارا تھا۔"

"شش۔۔۔۔۔ سیٹھ صاحب! آہستہ بولو۔۔۔۔۔ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔" لاڈلہ سائیں محتاط لہجے میں سیٹھ ستار سے بولا۔۔۔۔۔ تو حاجی مہران بولا۔

"اڑے بابا لاڈلہ سائیں! یہ ہماری جاگیر ہے۔ اس کے کان بھی ہم ہیں اور زبان بھی۔"

میں ان کی لاف زنی پر دل ہی دل میں مسکرا رہا تھا۔ لاڈلہ سائیں نے غلط نہیں کہا تھا کہ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں اور میں باہر اوطاق کی کھڑکی سے اپنے کان لگائے ہوئے تھا۔

ابھی یہ لوگ باتوں میں مشغول تھے کہ اچانک میری پشت پر کوئی شے گری۔۔۔۔۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آن اٹکا۔ یہ موقع ہی ایسا تھا کہ ذرا سی بھی آواز یا کھٹکا میرے لیے موت کا ساماں پیدا کر سکتا تھا۔ تاہم میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ کوئی ایسی ویسی بات تو نہیں تھی مگر میں یہ سوچ کر ضرور رہ گیا تھا کہ آخر میری پشت سے کیا شے ٹکرائی تھی؟

میں نے پہلے تو اپنے گرد و پیش نظر ڈال کر اچھی طرح اطمینان کر لیا تھا کہ سر دست کوئی خطرے والی بات نہ تھی مگر جب زمین پر نگاہ پڑی تو چونک پڑا۔ نیم اندھیرے کے باوجود مجھے وہ شے دکھائی دے گئی۔ وہ ایک ڈھیلا تھا، کچے پتھر کا۔ میں یونہی اسے جھک کر دیکھنے لگا اور سر جھٹک کر سیدھا کھڑا ہوا تو میں نے ذرا سر اٹھا کر اوپر دیکھا اور اگلے ہی لمحے میرا دل اچھل کر حلق میں آن اٹکا۔

حویلی کے بالاخانے کے ایک دریچے سے جو عین میرے سر پر ہی تھا، ایک چہرہ مجھے دکھائی دیا۔ وہ چہرہ کسی نوجوان لڑکی کا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ ضرور یہ ڈھیلا اس لڑکی نے مجھے یہاں دیکھ کر پھینکا ہوگا، نیز یہ کہ میری توجہ اپنی طرف چاہی

تھی کیونکہ اگلے ہی لمحے اس نے مجھے اپنے ایک ہاتھ سے اشارہ کیا۔ پہلے تو میں ڈرا کہ یہ اچانک کون سی بلا میرے گلے آن پڑی تھی۔ پہلے تو میں نے یہاں سے فی الفور بھاگ جانے کا سوچا کہ کہیں یہ شور مچا کہ مجھے اس خطرناک جگہ پر پکڑوا ہی نہ دے مگر پھنس تو میں پھر بھی گیا تھا جبکہ اس نے اگر مجھے پکڑوانا ہوتا تو مجھے متوجہ کرنے کے لیے ڈھیلا کیوں پھینکتی؟ وہ مجھے دیکھتے ہی...... ''چور...... چور'' کا شور مچا دیتی۔

میں نے اس کے اشاروں پر غور کیا تو پتا چلا کہ وہ مجھے حویلی کی شرقی رخ والی دیوار کی طرف آنے کا کہہ رہی تھی۔ نجانے یہ کیا معاملہ تھا۔ میرے پاس ابھی اس کی بات ماننے کے سوا کوئی اور چارہ بھی نہ تھا۔ ناچار میں نے بھی اثبات میں اپنا سر ہلا دیا۔

یوں میں چھپتا چھپاتا، جل تو جلال تو صاحب کمال تو آئی بلا کو ٹال تو کا ورد کرتا ہوا، مذکورہ سمت بڑھا تو جلد ہی مجھے اپنے سیدھے ہاتھ پر ایک گلیاری سی نظر آ گئی، جہاں خاصی تاریکی تھی، میں اسی طرف بڑھا اور زیادہ آگے نہ جا سکا کیونکہ یہ بند گلی تھی، اسی کے سرے پر حویلی کی دیوار کے آخر میں ایک دروازہ نظر آیا جو بند تھا۔

میں کچھ اندازہ کرکے اسی کے قریب جا کھڑا ہوا۔ ایک بار پھر میرا جی چاہا کہ موقع تاک کر یہیں سے ہی پلٹ جاؤں مگر جانے کیا بات تھی کہ اس اسرار بھری گتھی کو بھی سلجھانے کا مجھے ایک نامعلوم سا تجسس مجبور کرنے لگا کہ میں آنے والے وقت کا انتظار کروں۔ سو وہ میں کرنے لگا۔

مجھے ادراک ہو چکا تھا کہ اس نوجوان لڑکی نے مجھے اسی دروازے کے پاس آنے کا اشارہ کیا تھا، جو بہت واضح تھا۔ اب خدا جانے اس سنگل پٹ کے دروازے کے پیچھے کوئی کمرا یا حویلی کا کوئی پچھواڑا تھا یا پھر کوئی زینہ اوپر بالا خانے سے نیچے اترتا تھا۔

معاً ہی میں ٹھٹکا...... سنگل پٹ کے دروازے کی جھریاں یک دم روشن ہو گئیں۔ اندر کسی نے بتی جلائی تھی۔ یعنی کوئی آ رہا تھا۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنا شروع ہو گیا۔ یہ خطرہ بالائے جان بھی ثابت ہو سکتا تھا اور وبالِ جان بھی۔

وہ آہٹ خاصی واضح تھی جب کسی کو میں نے دروازے کے پیچھے روشن رخنوں کو تاریک کرتے ہوئے پایا اور اگلے ہی لمحے دروازہ ہلکی سی آہٹ کے ساتھ کھل گیا۔

کہیں قریب ہی حویلی کی اونچی گمر یا احاطے کی دیوار سے لگے بلب کی روشنی کی جھلک میں مجھے دروازے پر ایک بھرپور امنگ والی لڑکی کھڑی نظر آئی۔ اس کے تن شباب آور پر اگرچہ ایک عام سی اوڑھنی نظر آ رہی تھی، جو سر سے کاندھوں تک سرکی ہوئی تھی۔ اس کے عقب میں مجھے ایک زینہ سا اوپر جاتا دکھائی دیا، وہاں روشنی تھی اور اس میں وہ کسی دیوداسی کی طرح کھڑی تھی۔ رنگ گندمی تھا۔ آنکھیں کشادہ اور کجراری تھیں مگر ان میں ایک بے نام سی اداسی کی شام بھی اتری ہوئی سی محسوس ہوتی تھی۔

''اندر آ جاؤ......''

اپنے دلکش انگ اور حسین چہرے سے ہم آہنگ آواز بھی اس کی نقرئی اور سنکھ بجاتی محسوس ہوتی تھی۔

''میں چور نہیں ہوں۔'' میں نے اس کا کہا ماننے کی بجائے بڑی سادگی سے اپنی صفائی پیش کر دی۔

''اندر آ جاؤ بے وقوف! کھلے دروازے سے روشنی گلی میں پڑ رہی ہے، ادھر کسی کو شک ہو جائے گا۔'' وہ مجھے ایک خطاب سے نوازتے ہوئے بولی اور یہ خطاب کچھ غلط بھی نہ تھا۔ ظاہر ہے میں بے وقوف ہی تو تھا جو اس طرح خود کو دوہرے خطرات میں پھنسا بیٹھا تھا۔

مجھے اس پر مہران خان کی بیٹی کا ہی شبہ ہوتا تھا۔ شبہ، مبہم سا ہی سہی مگر اور پھر بھلا میں اس کے بارے میں کیا سمجھتا۔

اب میرے پاس اس کی باتوں یا بالفاظِ دیگر اس کی ہدایتوں کے ماننے کے سوا اور کوئی چارہ نہ رہا تھا۔ میں جیسے بہ قول شاعر کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار کو چلے...... کے مصداق سر اپنا جھکائے دروازے سے اندر داخل ہو گیا، وہ میرے اور قریب آئی تو اس کے حسنِ بے پروا کی نکہت میرے نتھنوں سے ٹکرائی اور ان حالاتِ مخدوشاں میں بھی مجھے ایک خمار مستی سے دوچار کرنے لگی۔ مزید قریب سے اس کے شباب آشتہ وجود کے چھونے پر تو جیسے میرا حلق بھی خشک ہونے لگا۔ نامعلوم کیوں اتنی بڑی حویلی کی یہ جگہ اس قدر تنگ رکھی گئی تھی کہ شاید یہ کوئی چور راستہ تھا۔

اس نے دروازہ بند کر دیا۔ اس پر ایک اور طرہ یہ کیا کہ بتی بھی گل کر دی۔ اب باقی کیا رہ گیا تھا فنا ہونے میں کہ ہر سو گھور تاریکی تھی اور میں تھا، وہ تھی۔ اس کی گرم گرم سانسوں کی مہک سینے کا زیر و بم تک مجھے محسوس اور چھوتا ہوا لگتا تھا۔

''تم کون ہو اور طاق کی کھڑکی سے لگے کیا کر رہے تھے؟''

اس نے ہلکی سرگوشی سے مشابہ آواز میں پوچھا اور میں نے اپنا سر پیٹ ڈالا۔ اس سوال کے لیے اس نے مجھ سے

اتنا کشٹ کروایا تھا تو کیا یہ اتنی ہی بھولی تھی کہ سمجھے ہوئے تھی میں اس سے سچ بول دوں گا؟ اوکھلی میں سر دے ہی چکا تھا اسی لیے جواباً دھیمی آواز میں کہا۔

"میں اندر ان کی باتیں سننے کی کوشش کر رہا تھا۔" نجانے کیسے میرے منہ سے سچ ہی نکل گیا۔

"کیوں؟"

"اندر میرا ایک دشمن بیٹھا تھا جو میرے خلاف کوئی نیا منصوبہ تیار کرنے میں معروف تھا۔" میں نے کہا۔ میں یقین سے کہہ سکتا تھا کہ یہ مشیت ایزدی ہی تھی جو میرے منہ سے بے اختیار اور آپوں آپ سچ اگلوائے جا رہی تھی۔ میں اب گھپ تاریکی کی وجہ سے اس کے تاثرات بھانپنے سے قاصر تھا۔ پھر اس کی ہانپتی ہوئی سی سرگوشی کی آواز ابھری۔

"میں پہلے تمہیں کوئی چور ہی سمجھی تھی مگر جب میں نے تمہیں کوئی حرکت کرنے کی بجائے خاصی دیر تک کھڑکی سے چپکا کان لگائے دیکھتی رہی تو میں اسی وقت یہ بات سمجھ گئی تھی کہ تم چور نہیں ہو سکتے، یہ معاملہ کوئی مخبری کا ہی تھا۔" وہ رکی پھر معنی خیز لہجے میں آگے بولی۔

"کیا تمہارا دشمن مہران خان کا آدمی ہے؟"

اس کے لبوں سے مہران خان کا یوں نام سننے پر مجھے تعجب ہوا اور اپنا یہ خیال مجھے خود ہی جھٹلانا پڑا کہ وہ اس کی بیٹی تھی ورنہ وہ شاید اپنے باپ کا یوں نام نہ لیتی۔ اس پر بھی زیادہ تکیہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔

اب میں شش و پنج میں پڑ گیا کہ اگر میں ایسا کوئی جواب دیتا تو وہ ناراض ہو سکتی تھی۔ کیونکہ بہرحال وہ اسی حویلی کی مکین تھی۔

"مجھے ابھی اس کا اندازہ نہیں ہو سکا ہے۔"

"تو پھر اتنی دیر تک تم کیا سنتے رہے تھے کہ ابھی تک تمہیں یہی اندازہ نہ ہو سکا کہ تمہارا دشمن یہاں حاجی مہران خان جیسے خبیث آدمی کے پاس کیا کرنے آیا تھا؟"

"خبیث انسان؟"

اس کے منہ سے یہ لفظ سن کر میرے ذہن میں ایک جھماکا ہوا۔ وہ اس کی بیٹی نہیں تھی۔ تو پھر کون تھی؟ کیا حاجی مہران خان نے اپنی آستین میں کوئی سانپ پال رکھا تھا؟ اگر ایسا تھا تو پھر اس سانپ کو میں دودھ پلا کر اپنا کام نکال سکتا تھا۔

میں نے اب اپنے لہجے کو ہر قسم کے ابہام سے پاک کر دیا۔ تقدیر میرے لیے اندھیروں میں راہ بنا رہی تھی۔ تاہم اس بار میں نے بھی اسے گویا "شے" دینے کی غرض سے تھوڑا اور سچ بول دیا۔

"ہاں! کچھ اندازہ تو ہوتا ہے کہ میرا دشمن حاجی مہران خان کی پشت پناہی حاصل کرنے کے لیے ہی یہاں آیا تھا اور وہ اس میں کامیاب بھی رہا ہے۔"

"تم میری مدد کرو اور میں تمہاری مدد کروں گی قبول ہے یہ سودا؟"

وہ یک دم بولی اور میں دنگ سا رہ گیا۔ میرے تو یہ سان و گمان میں بھی نہ تھا کہ میں جو یہاں اپنی جان پر کھیل کر مخبری کرنے آیا تھا خود میری مخبری ہو جائے گی۔ سودے بازی کا یہ کھیل میرے لیے جتنا غیر متوقع تھا اتنا ہی سود مند بھی نظر آتا تھا۔ گویا ہم دونوں ہی اپنی اپنی جانوں کو داؤ پر لگائے ہوئے یہ سودا کرنے والے تھے۔

"جلدی فیصلہ کرو، وقت کم ہے۔" اس نے مجھے سوچتا پا کر کہا تو میں نے حامی بھرتے ہوئے کہا۔

"مجھے منظور ہے مگر مجھے تمہارے لیے کیا کرنا ہوگا؟ اور تم میرے لیے کیا کر سکتی ہو؟"

"اس کا ہمیں خود ہی تعین کرنا ہوگا ہم ایک دوسرے کے کس نوعیت کے کام آ سکتے ہیں۔ میں تو کر چکی ہوں اب تم بتاؤ..... میں تمہارے لیے کیا کر سکتی ہوں؟"

اس کی باتوں اور لب و لہجے کے انداز میں ایک زمانہ چشیدہ تجربہ بولتا تھا۔ پہلے میں نے اس سے پوچھ لیا۔

"بتاؤ پہلے تم کہ میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟"

وہ چند ثانیوں کی پرسوچ خاموشی کے بعد بولی۔ "ایک بات یاد رکھنا ہوگی اس سودے بازی کی جان راز پر ہے، ورنہ ہم دونوں کی جانیں باقی نہیں رہیں گی۔"

"میں سمجھ گیا، آگے بولو!" میں نے بات جلد سے جلد آگے بڑھانا چاہی تو وہ فوراً مطلب کی بات پر آتے ہوئے دھیمے دھیمے لہجے میں کہنا شروع ہوئی۔

"تم اپنی وضع قطع سے اس گوٹھ کے رہنے والے نہیں لگتے لیکن چونکہ اب ہم ایک ہی کشتی کے سوار بن چکے ہیں تو، یہ خوبی ایک دوسرے کے کام بھی آ سکتے ہیں۔" اس نے ایک ثانیے کے لیے توقف کیا۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ گاہے بگاہے اوپر اپنا سر اٹھا کر بھی دیکھ لیتی تھی۔ آگے بولی۔

"ایک لڑکا ہے، وہ اسی گوٹھ میں رہتا ہے، ہم دونوں ایک دوسرے کو بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔ ہمارے راز میں وہ بھی شریک ہونے والا ہے۔ اس تک مجھے ایک پیغام پہنچانا

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

ہے، ابھی تو میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ میں کوئی لمبا چوڑا خط لکھوں مگر ایسا بعد میں کروں گی، ابھی پہلے تم اس تک میرا مختصر زبانی کلامی پیغام پہنچاؤ گے، اس کے بعد وہ جو میرے لیے پیغام دے وہ تم مجھے... پہنچانے آؤ گے اور بدلے میں تم کو کوئی اپنا بھی کام مجھے بتاؤ گے...... باقی بعد میں......" وہ رکی تو میں نے پوچھا۔

"وہ پیغام کیا ہے اور وہ لڑکا کون ہے؟ میں اس سے کہاں مل سکتا ہوں؟"

"کہا ناں وہ اسی گوٹھ کا ہی رہنے والا ہے نام اس کا سائیں داد ہے اور وہ......"

"سائیں داد!" بے اختیار میرے منہ سے فرط تیزی سے برآمد ہوا۔

"شش...... شی...... آہستہ!" اس نے ٹوکا اور میرا دل بری طرح دھڑ دھڑانے لگا۔

"کیا تم اسے جانتے ہو؟" اس کے لہجے میں ایک خوشگوار سی حیرت تھی۔ وہ میرے اس طرح جذباتی انداز میں سائیں داد کا نام دہرانے پر یہی اندازہ لگا سکی تھی۔

"بہت اچھی طرح سے!" میں نے یکدم کہا۔ "وہ میرا بہت پرانا اور گہرا دوست ہے۔ کک...... کہیں تم شہزادی تو نہیں ہو، وہی بدنصیب لڑکی، جو سائیں داد کی منگیتر تھیں، جسے وڈیرے حاجی مہران خان نے دولت کے بل پر ا"

"اللہ سائیں رحم!" بے اختیار اس کے منہ سے سسکتے ہوئے یہ الفاظ برآمد ہوئے اور میرا جملہ ادھورا رہ گیا۔

کیسا عجیب اتفاق تھا...... بلکہ میری نیت کی سچائی اور اپنے دوست (سائیں داد) سے کیا گیا ایک وعدہ تھا جو اس روز اس کی دکھ بھری داستان سن کر میں نے اس کے ساتھ صدقِ نیت سے کیا تھا۔ آج وہی وعدہ میرے سامنے ایک "سودے" کی صورت کھڑا تھا۔ یہ سودا نہ بھی ہوتا تو بھی میں اس کی مدد کرتا، تب پھر میں جس قدر مختصر ترین جملوں میں اسے اپنے اور سائیں داد کے بارے میں بتا سکتا تھا بتا دیا۔ میری طرح وہ بھی اس عجیب اتفاق پر گنگ ہو کر رہ گئی تھی۔ پھر بھیگی بھیگی سسکیوں کے ساتھ رو پڑی، تب ہی میں نے اسے حوصلہ دیا۔

"شہزادی بہن! تم میرے دوست کی امانت اور اس سے کیے ہوئے وعدے کا روپ ہو، جسے پورا کرنے کا میں نے پہلے ہی سے بیڑہ اٹھا رکھا تھا۔ اب تم میرا کام چھوڑ دو، وہ میں خود ہی نمٹا لوں گا، تم اپنی جان خطرے میں مت ڈالو۔ مجھے ایک بات بتاؤ۔ کیا تمہارے پاس کوئی سیل فون وغیرہ نہیں ہے؟ کیا تمہیں فون کرنے کی اجازت ہے؟"

"پنجرے میں قید ایک کمزور اور بے بس چڑیا کو صرف دانہ پانی کی اجازت ہوتی ہے۔" وہ ٹوٹے ہوئے چور لہجے میں بولی۔ "لیکن...... نہیں، میں اس بڈھے گدھ کو بھی نہیں چھوڑوں گی جس نے اپنی عیاشی کی خاطر میری زندگی تباہ کر ڈالی۔ میں تمہارے کام بھی آؤں گی اور اس طرح مہران خان کی لٹیا ڈبوؤں گی۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔"

"میں اب چلوں گا۔" میں نے جلدی سے کہا اور آگے بولا۔

"نہیں خیال کہ اب تمہیں سائیں داد کو کوئی پیغام پہنچانے کی ضرورت ہو کیونکہ میں خود ہی اسے سب بتا دوں گا، یقیناً اس عجیب اور خوشگوار اتفاق پر وہ بھی خوش ہوگا۔ پھر بھی کوئی بات ہو تو بتا دو۔"

"کیا کہوں اب میں، بس! یہی پیغام اس تک پہنچا دینا کہ جو کچھ کرنا چاہتے ہو، جلد کر لو، پھر مجھے الزام مت دینا، کیوں کہ اب میں ایسی سونے کے پنجرے والی زندگی سے تنگ آ چکی ہوں اور ایک زندہ لاش کی شکل جی رہی ہوں۔ اسی آس پر کہ سائیں داد ایک دن مجھے اس جہنم سے بھگا لے جائے گا۔"

"انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا شہزادی بہن!" میں نے پورے یقین سے کہا۔ "مگر اب تم ہمت مت ہارنا، اسے تائید ایزدی سمجھو اور مایوسی جیسا گناہ مت کرو۔ چلتا ہوں...... بہت جلد سب ٹھیک ہونے والا ہے۔" یہ کہتے ہوئے میں واپسی کے لیے پلٹا تو وہ بولی۔

"رکو...... اپنا کام نہیں بتاؤ گے؟"

"پھر کبھی سہی لیکن میں تمہیں ایک نمبر نوٹ کرا دیتا ہوں جو میرا ہے، موقع ملے تو بڑی احتیاط سے مجھ سے رابطہ کر لینا، سائیں داد کا بھی نمبر میرے پاس ہے لیکن میں نہیں چاہتا کہ تم ابھی یہاں سے اس سے فون پر رابطہ کرو، ورنہ تمہارے ساتھ وہ غریب بھی مصیبت کا شکار ہو سکتا ہے۔ اس کی ایک جوان شادی شدہ اور بچوں والی بہن ہے بوڑھے ماں باپ ہیں، وہ بے چارہ مجبور ہے مگر اب وہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

یہ کہتے ہوئے میں نے اسے اپنا نمبر ذہن نشین کرا دیا اور پلٹ آیا۔

گیلری میں کہیں سے آتی ہوئی روشنی کا ہلکا عکس پڑ رہا تھا۔ میں اسی کے سہارے چلتا ہوا باہر آیا۔ اوطاق اور اس کے

URDUSOFTBOOKS.COM

اطراف میں سناٹا تھا۔ سیٹھ ستار اور سائیں لاڈلا وغیرہ شاید جا چکے تھے۔ سامنے ٹریکٹر ٹرالی جوں کی توں کھڑی تھی۔ اس کا ڈرائیور غائب تھا۔ ٹرالی خالی کردی گئی تھی۔ ساریوں کے ڈھیر کا پہاڑ بھی ایک طرف کھڑا نظر آرہا تھا جبکہ گیٹ کی طرف اب ایک ہی گن مین نظر آرہا تھا۔

سر دست تو مجھے باہر نکلنے کی کوئی راہ نظر نہیں آرہی تھی، چہ جائیکہ میں ادھر ہی کھڑے ہوکر اس اکلوتے گن مین کے یہاں سے ٹلنے کا انتظار کرتا اور موقع تاک کر یہاں سے رفو چکر ہوجاتا۔

مجھے شہزادی کی وجہ سے کافی دیر ہوگئی تھی اور باہر کھجوروں کے جھنڈ میں کالیا میرا بے چینی سے انتظار کررہا ہوگا کیونکہ میں ابھی تک اسے اپنی خیریت کا میسج نہیں کر پایا تھا، سوائے ایک میسج کے...... میں نے فوراً اسے پہلے ایک خیریت کا مختصر ایس ایم ایس بھیجا۔ اس کا بھی ایس ایم ایس آیا ہوا تھا۔ وہ پریشان تھا میری وجہ سے۔

اچانک میں نے اس اکلوتے گن مین کو اپنی جگہ سے حرکت کرتے دیکھا تو میرا دل خوشی سے دھڑکا مگر دوسرے ہی لمحے مجھے کسی کتے کے زور سے بھونکنے کی آواز سنائی دی اور میرا خون خشک ہوگیا۔ میں یک دم تھوڑا اندر ہوگیا۔ پھر گلیاری کی آڑ میں ہوکر اس طرف جھانکا تو میں سرتاپا جھرجھرا گیا۔ دوسرا گن مین ایک گدھے جتنے السیشن کتے کی زنجیر پکڑے گیٹ کی طرف آرہا تھا اور پہلے والے کو اشارہ کرکے اسے شاید کہیں جانے کے لیے کہہ رہا تھا۔ وہ اپنے سر کو اثبات میں جنبش دیتا ہوا اندر کی طرف چلتا بنا تو اچانک میں نے کتے کو اپنی تھوتھنی کو اس طرف مڑتے دیکھا جہاں میں ''پھنسا'' کھڑا تھا۔ وہ بھونکا، میری روح پرواز کے قریب ہوگئی۔ کتا بے چین ہوگیا اس کم بخت گدھے جتنے جسیم کتے نے یقیناً اجنبی (میری) بو سونگھ لی تھی اور اسی طرف اپنا منحوس تھوتھنا کیے لگاتار بھونکتا چلا گیا تو گن مین ٹھٹکا۔ میرا اب مزید کسی خوش فہمی میں جتلا ہونا، خودکشی کے ہی مترادف ہوتا۔ میں الٹے پیروں پلٹا اور نیم تاریکی میں چلتا چلا گیا۔ کتے کے بھونکنے کی منحوس آوازیں ابھی تک جیسے میری تھکی ہوئی سماعتوں کو چھلنی کیے دے رہی تھیں۔ مجھے پتا تھا کہ یہ گلی نما تنگ راستہ آگے جاکر بند ہوچکا تھا۔ ایک ہی اُمید تھی کہ شہزادی وہ دروازہ بھول یا غلطی سے کھلا چھوڑ گئی ہو لیکن جب میں وہاں پہنچا تو یہ اُمید بھی میری دم توڑ گئی۔

دروازہ اندر سے بند تھا۔ میں خود کو اب جیسے چوہے دان میں پھنسا محسوس کرنے لگا۔ میری بے بس اور دہشت زدہ انداز میں پھیلی ہوئی آنکھیں، سامنے گلی کے اس سرے پر جم کر رہ گئی تھیں، جو نسبتاً زیادہ روشن دکھائی دے رہا تھا۔ دھک ......دھک کرتے دل کے ساتھ میں نے اس روشن حصے میں اسی کتے کا ہیولہ دیکھا، جو اس نازک وقت میں مجھے کسی ایلین سے کم نہیں لگا۔ اس کے ہمراہ وہ گن مین بھی تھا۔ میرے اب پکڑے جانے میں کوئی کسر نہیں رہی تھی۔ ایک جابر جاگیردار کی حویلی میں میرے اس طرح دھر لیے جانے کا مطلب تھا کہ میری لاش تو بعد میں گم کی جاتی پہلے خوب مرمت کے جاں گسل عمل سے مجھے گزارا جاتا۔ اس پر مستزاد میں کالیا کو ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی ''خیریت'' کا میسج بھی کرچکا تھا۔

کتا زور سے بھونکا اور اس نے دیکھتے ہی اپنی بو گیر حس پر کامیابی سے فخر کرتے ہی میری جانب دوڑ...... لگا دی۔ ٹھیک اسی وقت قدرت کو شاید میری حالت زار پر رحم آگیا اور دروازہ کھلا۔

''اندر آجاؤ...... جلدی۔''

یہ شناسا آواز اس وقت مجھے دنیا کی سب سے زیادہ دلکش، بڑی دلفریب اور روح پرور محسوس ہوئی۔ یہ آواز شہزادی کی تھی اور میں ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر غڑاپ سے اس کھلے دروازے کے اندر جا گھسا۔ شہزادی نے فوراً دروازہ بند کیا اور میرا ہاتھ اپنے نرم و نازک ہاتھ میں دبوچ لیا۔ وہ یہاں کے اندھیاروں کی شناسا تھی، میں نہیں، ٹھٹھکنے اور لڑکھڑانے سے بچنے کے لیے ہی اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور اوپر کھینچتی لے گئی۔ کتا اسی دروازے کے قریب آکر غر......غر...... کرنے لگا اور میں تصور میں اسے دروازے کے نیچے والے رخنے میں تھوتھنا مارتے ہوئے دیکھنے لگا۔

تب تک شہزادی مجھے کمال پھرتی سے اوپر لے آئی اور ایک کمرے کے کھلے دروازے سے اندر مجھے ''واڑ'' دیا، گویا دھکا دے دیا، اس سرگوشیانہ ہدایت کے ساتھ کہ میں یہاں سے ہلوں بھی نہیں۔ وہ دروازہ بند کیے پلٹ گئی۔

میں گھٹا ٹوپ تاریکی میں ڈوبے ہوئے اس کمرے میں کسی بت کی طرح بے حس و حرکت کھڑا رہ گیا۔

مشکلیں اتنی مجھ پر آن پڑی کہ آساں ہوگئیں...... چچا غالب نے یہ شعر اسی لیے کہا تھا اور پھر وہ تھوڑا بہت مزاح نگاری کی طرف مائل ہوگئے تھے۔ میرا بھی اس وقت یہی حال ہونے لگا تھا۔ میں یہاں خود کو محفوظ رہنے کے خیال سے اسی طرح گھنٹوں بت بنا کھڑے رہنے کو تیار تھا۔

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

میرے لوٹنے کے باوجود شہزادی کے دل میں یہ خیال اللہ ہی نے ڈالا تھا کہ وہ میری یہاں سے بہ خیریت واپسی کی بھی خبر گیری کرتی رہی تھی اگر وہ میری شناسا یا میں اس کا غائبانہ شناسا نہ نکلتا تو... ہماری یہ اچانک اور حادثاتی ملاقات صرف ''سودے بازی'' تک محدود رہتی تو پھر شاید شہزادی مجھے رخصت کر کے اپنے کمرے میں جا سوتی۔ اس نے کتے کے بھونکنے اور ساتھ ہی خطرے کی بو سونگھ لی تھی اور غالباً کسی دریچے سے یہ سارا منظر تاڑ لیا ہوگا۔

بہرکیف کچھ بھی تھا، دیکھنا اب یہ تھا کہ شہزادی کیسے ان مخدوش حالات کو ہینڈل کرتی ہے؟ یہ بو گیر قسم کے کتے اتنی آسانی سے مطمئن ہونے والے نہیں ہوتے جب تک مشکوک بو کا سراغ نہ پالیتے۔ میں کان دبائے چپکا کھڑا رہا۔ کچھ گھڑ بڑ کی آوازیں سنائی دیتی رہیں اس کے بعد خاموشی چھا گئی، میں یہی سمجھا شاید شہزادی نے معاملہ رفع دفع کرا دیا ہے مگر یہ میری خام خیالی تھی۔ اچانک حویلی میں شور مچ گیا کہ کوئی چور اندر گھس آیا ہے۔ میری روح فنا ہو گئی۔

کہاں تو میں مطمئن تھا کہ چلو یہ معاملہ اب شہزادی کے ہاتھوں میں ہے اور وہ چوں کہ اس حویلی کی ایک مکین کی حیثیت رکھتی تھی اسی لیے کچھ نہ کچھ کرلے گی مگر ایسا شاید نہیں ہوا تھا۔

ایک دم بتیاں جلنا شروع ہو گئی تھیں اور ہاہا کار مچ گئی تھی۔ جس کمرے میں شہزادی مجھے بت بنا چھوڑ کر گئی تھی اس میں ابھی اندھیرا تھا مگر اس کے دروازے کی متوازی جھریوں سے دوسری طرف کی روشنیاں باریک کرنوں کی صورت آتی نظر آ رہی تھیں۔

میرے دماغ میں ابھرا کہ مجھے اب شہزادی کی اُمید چھوڑ کر اپنے بچاؤ کی خود ہی تدبیر کرنی چاہیے تھی کہ کیا خبر وہ خود بھی اس خطرناک صورت حال کے سامنے بے بس ہو چکی ہو۔ لہٰذا اب میرا زیادہ دیر بت بنے رہنا بے سود ہی تھا۔

میں نے حرکت کی اور دروازے کی جھریوں سے مقدور بھر اندر جھانکنے والی روشنی کے سہارے ہی اس کمرے کا جائزہ لیا تو یہ کمرا مجھے کچھ زیادہ بڑا تو نظر نہ آیا، جو خالی ہی تھا، فرنیچر کے نام پر فقط وہاں ایک کاؤچ ٹائپ سنگل صوفہ رکھا ہوا تھا، اس کی بھی حالت کچھ زیادہ تسلی بخش نہ تھی۔

البتہ مجھے اس کے ساتھ ہی ایک کھڑکی ضرور دکھائی دے گئی۔ وہ بند تھی اور شاید حویلی کے کسی اندرونی گوشے میں کھلتی تھی۔

اسی منحوس کتے کے بھونکنے کی کریہہ آواز مجھے سنائی دی۔ وہ ابھی تک مطمئن نہیں ہوا تھا جب تک میری بو تک رسائی نہ حاصل کر لیتا۔ کچھ مرد اور عورتوں کے زور زور سے بولنے کی بھی آوازیں آ رہی تھیں، غور کرنے پر معلوم ہوا کہ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ کتا کسی بلی کو دیکھ کر بدکا تھا جبکہ چند لوگ کسی چور کی آمد کا خدشہ بھی ظاہر کر رہے تھے۔ یہ بھی کہا جا رہا تھا کہ کسی چور کی اتنی جرأت کہاں کہ وہ حاجی مہران خان کی حویلی میں گھسنے کی جرأت کرتا۔ وغیرہ۔

بہرحال میری ڈھنڈیاں پڑ چکی تھی اور میں نے پھر بلا دیر مذکورہ کھڑکی کا رخ کیا اور قریب پہنچ کر اس کے پٹ کو بے آواز ہلانے کی کوشش چاہی تو دونوں ہی چوبی پٹ وا ہوتے چلے گئے۔ میں نے پہلے یہاں سے باہر کی طرف جھانکا۔ یہاں کہیں سے آتی ہوئی روشنی پڑ رہی تھی۔ باقی حصہ خالی تھا۔ لوگوں کے بولنے کی آوازوں کی گونج سنائی دے رہی تھی۔ میں نے پھر ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا اور اس آدم گزار کھڑکی کی چوبی چوکھٹ سے پھنس پھنسا کر دوسری طرف اتر گیا اور اسی وقت مجھے اپنے عقب میں اسی کمرے کے دروازے کے کھلنے کی آواز سنائی دی تھی۔ شکر تھا کہ میں بروقت نکل آیا تھا مگر اب بھی میں اندھیرے میں تھا۔ حویلی کے در و بام اور غلام گردشوں سے میں نا آشنا تھا۔ یہاں بھی مجھے کچھ سجھائی نہ دیتا تھا کہ میں کہاں کا اور کس طرف کا رخ کروں، بجز اس کے کہ جہاں کسی ذی نفس کی موجودی نہ پاؤں اسی جانب کو بڑھ جاؤں اور یہی میں نے کیا بھی۔

میں نے تیزی سے اپنی گردش کرتی آنکھوں سے اطراف میں دیکھا اور مجھے ایک اپنے سیدھے ہاتھ پر ایک راستہ جاتا دکھائی دیا میں اسی طرف کو دبے پاؤں بڑھ گیا۔ اچانک میں نے عقب سے کسی کو کہتے سنا۔

''شاید کوئی جانور گھسا چلا آیا ہوگا کوئی بلی چوہا وغیرہ ...... ایسے ہی اس بدبخت ٹائیگر نے پریشان کیا سب کو۔'' یہ حویلی کی کسی بڑی بوڑھی کی آواز لگتی تھی اور میں نے اسے ڈھیروں دعائیں دے ڈالیں کہ اس نے اپنے کہنہ مشق فہم و ادراک اور تجربے کی بنا پر میری جون ہی بدل ڈالی تھی۔ اس وقت وہ مجھے بلی یا چوہے کے علاوہ کچھ بھی سمجھ لیتی مجھے اعتراض نہ ہوتا۔

اس فرمان کے جاری ہوتے ہی حویلی میں گونجتا ہوا ہم مجھے کم ہوتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ تاہم میں تو ایک قسم کے چوہے دان میں پھنس ہی چکا تھا، یہ الگ بات تھی کہ میں فوری طور پر اس خطرے سے بچ گیا تھا۔

مجھے اب بھی چھپنے کے لیے کسی محفوظ مقام کی ضرورت تھی تاکہ اس پڑنے والی ڈھنڈیاں کا طوفان بدتمیزی تھمے تو میں اپنی مفر کی راہ کا کچھ کر پاؤں۔

تب ہی اچانک میرے ذہن رسا میں ایک خیال بہ سرعت چمکا اگر میں آگے کہیں جاتا تو اس لمبی چوڑی حویلی کی نا آشنا غلام گردشوں اور در و بام میں کہیں کھو جاتا۔ تو کیوں نہ واپس اسی کمرے کا ہی رخ کیا جائے، جہاں شہزادی تھوڑی دیر پہلے ہی مجھے چھوڑ کر گئی تھی۔ اب تو اس کمرے کی تلاشی لینے والے بھی ناکام ہو کر واپس لوٹ چکے ہوں گے۔ یوں بھی وہ کمرا اس راستے سے نزدیک بلکہ ایک طرح سے ملحقہ ہی تھا جس کا دروازہ نیچے چور دروازے کی طرف جانے والے زینے کی طرف تھا۔

یہ سوچ کر میں وہیں سے ہی پلٹا اور اسی کھڑکی کی طرف آیا تو مجھے کچھ لوگوں کے ہیولے اسی طرف ہی آتے ہوئے دکھائی دیے۔ میں نے بھی بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ حرکت کی اور کھلی کھڑکی سے دوبارہ اندر کود گیا۔

میری یہ اسٹریٹیجی خاصی کامیاب ثابت ہوئی، کیونکہ کمرا اب خالی تھا اور اسی طرح ہی تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ میں نے اپنے عقب میں کھڑکی کے پٹ بے آواز انداز میں بند کر دیے۔

اب میں ایک بار پھر بت بنا کھڑا تھا مگر اس بار حالات مختلف تھے۔ شہزادی کے یہاں دوبارہ لوٹنے کی اُمید صفر تھی کیونکہ اس کمرے کی ناکام تلاشی لینے کے بعد اسے بھی پتا چل چکا ہوگا کہ میں یہاں نہیں ملا تھا اور اس نے سکون کا سانس بھی لیا ہوگا مگر وہ حیران آمیز پریشانی کا شکار تو ضرور ہوئی ہوگی۔ آخر میں یہاں نہیں تھا تو پھر کہاں غائب ہو گیا تھا؟ پھر وہ مجھے میری ہی صوابدید پر چھوڑ کر حویلی کے دیگر مکینوں کے ساتھ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی ہوگی کہ اب میں خود ہی اپنی کوشش سے نکل جاؤں گا یہاں سے چاہے مجھے یہاں صبح ہی کیوں نہ ہو جاتی۔

میں نے سب سے پہلے کالیا کو ایک میسج کیا کہ میں ایک مصیبت میں پھنس چکا ہوں مگر فکر کی زیادہ بات نہیں کیونکہ حالات اب بھی میرے قابو میں ہیں۔ وغیرہ۔

میں جانتا تھا کہ اس میسج کے بعد ضرور وہ بے چارہ بھی میری طرف سے فکر و تشویش میں مبتلا ہو گیا ہوگا۔

میں نے مزید تھوڑی دیر اسی طرح بت بن کر گزارا اس کے بعد حرکت میں برکت کے مصداق میں اپنی جگہ سے ہلا اور دبے پاؤں دروازے کی طرف بڑھا۔ اس کے پٹ سے اپنا ایک کان چپکا کر باہر کی سن گن لی اور خاموشی پا کر میں نے دروازے کے ایک پٹ کو آہستگی سے دھکیلا، پھر جتنا گزر سکتا تھا اتنا ہی کھول کر باہر آ گیا اور سیدھا زینے کی طرف بڑھا۔ وہاں گھپ اندھیرا تھا۔ یہاں تک تو میں راہ آشنا ہو ہی چکا تھا، اسی لیے اترتا ہوا نیچے آ گیا۔

اب سنگل پٹ کا وہ دروازہ میرے سامنے تھا جو تاریکی کے باعث نظر تو نہیں آتا تھا مگر میں اسے چھو سکتا تھا۔ اس کے باہر اگر وہی منحوس تھوتھنی والا گدھے کی جسامت کا بوگیر کتا موجود ہوتا تو وہ ایک بار پھر میرے لیے مصیبت کھڑی کر سکتا تھا۔ کوئی بعید نہ تھا کہ وہ باہر حویلی اور ملحقہ اوطاق کے سامنے پھیلے ہوئے وسیع و عریض احاطے میں گشت کر رہا ہو۔ یہاں میں یہ سوچ کر بری طرح شش و پنج کا شکار ہو گیا۔ اسی وقت مجھے اپنے سیل فون کی تھرتھراہٹ محسوس ہوئی۔ میں نے اسے نکال کر دیکھا۔ کالیا کا ایس ایم ایس آیا تھا۔

"ایسی کیا مشکل آن کھڑی ہوئی ہے؟ کچھ تو بتا! کیا میں آؤں اندر مدد کے لیے؟"

میں نے اسی وقت اسے ریپلائی کیا کہ اور مختصراً بتا دیا اور کہا کہ اسے آنے کی ضرورت نہیں۔ میں نے سیل جیب میں رکھا اور ڈرتے ڈرتے سنگل پٹ کا دروازہ آہستگی اور بے آواز کھولا۔ باہر کی خنک ہوا کا جھونکا میرے چہرے سے ٹکرایا اور نجانے خوف سے یا پھر ویسے ہی میرا پورا جسم جھرجھرا سا گیا۔ میں نے اپنا وجود باہر نکالنے سے پہلے فقط اپنی گردن نکالی اور دائیں بائیں دیکھا۔ ہر سو سناٹا تھا۔ اب اس کتے کا اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا کہ وہ کہاں دبکا بیٹھا؟ گن مین کو تو میں کسی نہ کسی طرح جل دے سکتا تھا مگر اس جانور کی اولاد کو جل دینا آسان نہ ہوتا۔ رات ہو چکی تھی۔ کالیا سمیت سائیں داد بھی میری وجہ سے پریشان ہو رہا ہوگا۔ یہ ممکن تھا کہ اس نے کالیا سے یا کالیا نے اس سے ٹیلی فونک رابطہ کر کے موجودہ سچویشن سے آگاہ کر دیا ہو۔ کچھ بھی تھا ابھی تو مجھے اپنی پڑی ہوئی تھی۔

میں نے ہمت کی اور خود کو اس چور دروازے سے باہر کھسکایا اور عقب میں اپنے دروازہ بند کر دیا۔ اب میں اسی گلیاری میں کھڑا تھا جو تاریک تھی۔ تاہم احاطے میں کہیں لگے بلب کی روشنی کی جھلک اس طرف بھی پڑ رہی تھی۔ میں اللہ کا نام لے کر اسی طرف کو بڑھا۔ کتے کا دھڑکا ابھی تک لگا ہوا تھا۔ میں دبے پاؤں اور دھڑکتے دل کے ساتھ ابھی سرے پر پہنچا ہی تھا کہ اچانک وہی کتا ایک بار پھر کسی خوفناک ایلین کی

طرح میرے سامنے آن کھڑا ہوا۔ اس کی آنکھوں میں مجھے عجیب سی چمک محسوس ہوئی، شکاری دانت اس کے جبڑوں سے جھانک رہے تھے اور رج لمبی سی زبان باہر کو لپلپا رہی تھی۔ اس وقت مجھے اس کی صورت بہت ہی کریہہ اور خوفناک لگی۔

میرا سانس سینے میں ہی اٹک کر رہ گیا تھا۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ جتنے معجزے ہونا تھے وہ ہو چکے تھے، جتنا تقدیر نے اب تک میرا ساتھ دینا تھا وہ دے ڈالا تھا۔ مجھے آج پھنسنا تھا سو پھنس گیا۔ بجز اس کے میں واپس پلٹ کر اسی دروازے کی جانب دوڑ لگا دیتا۔ پھر جو ہوتا دیکھا جاتا۔ مگر یہ منحوس کتا اب مجھے اس دروازے تک بھی بھلا کہاں چھوڑتا۔ میرا اور اس کا فاصلہ تو چند فٹ سے بھی کم تھا۔ میرے پلٹنے کی دیر ہوتی اور اس کے جھپٹنے کی۔

ابھی میں اس کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اچانک میں نے کتے کے پاس ہی کوئی شے گرتے ہوئے دیکھی۔ کتے کا دھیان پلٹا۔ وہ شے اس کی دونوں ٹانگوں کے قریب گری تھی۔ وہ اس پر جھک گیا اور اگلے ہی لمحے میں نے دیکھا کہ کتا چپڑ...... چپڑ...... کی پر رغبت...... آواز کے ساتھ اپنے گرے ہوئے اس ٹکڑے کو کھانے میں مشغول ہو گیا۔ وہ گوشت کا کوئی بڑا سا ٹکڑا تھا۔ یا حیرت...... یا پھر کوئی معجزہ ہونے والا تھا۔

ٹھیک اسی وقت میں نے کتے پر کسی انسانی سائے کو جھپٹتے ہوئے دیکھا۔ اس پُراسرار سائے نے نہ صرف کتے کو دبوچ لیا تھا بلکہ اس کے تھوتھنے پر کوئی کپڑا اتنا تو بڑا بھی چڑھا دیا تھا۔ کتا اب بھونکنے اور جھپٹنے سے قاصر رہ گیا تھا، بس ادھر ادھر...... سر مارتا ڈولنے لگا۔ اس کے حلق سے محض...... غر...... غر...... کرنے کی آوازیں خارج ہونے لگیں۔ میں اپنی جگہ ساکت رہ گیا تھا۔ وہ سایہ میری طرف متوجہ ہوا...... میں اسے پہچاننے کی ابھی کوشش میں ہی تھا کہ وہ جیسے مجھے دیکھتے ہی یا تو ہلکی روشنی میں میرے قد و قامت یا پھر اپنے محتاط اندازے سے پہچان گیا اور بولا۔

''جگری...... انکل آ......''

میرے خدا! یہ تو کالیا تھا۔ میرے اندر کوئی خوشی چلائی اور پھر اس کے ساتھ ہو لینے میں، میں نے ایک لمحے کی بھی دیر نہیں لگائی تھی۔ وہ شاید میرے آخری بھیجے گئے ایس ایم ایس پر خود ہی میری مدد کو دوڑا چلا آیا تھا اور یہ اچھا ہی ہوا تھا ورنہ تو میں گیا تھا آج۔

وہ عقبی دیوار سے نقب لگا کر اندر آیا تھا جہاں مجھے ایک شیڈ نظر آ رہا تھا وہاں ایک دو ٹریکٹر ٹرالیاں اور کچھ اناج کی بوریاں اور دیگر ریختہ پھیلا ہوا تھا۔

وہ اس شیڈ کی چھت پر کسی بندر کی طرح چڑھ گیا اور مجھے بھی اس نے بازوؤں کی مدد سے اوپر کھینچ لیا۔ سہارا ہم نے ایک ڈالی پر چڑھ کر لیا تھا۔

وہاں سے ہم جھکے جھکے ہوئے چلتے، دوسری طرف دیوار پھاند گئے اور پھر نہیں رکے۔ ادھر ہی جا کر دم لیا جہاں کھجوروں کے درخت کے پاس ہماری بائیک کھڑی تھی۔ کالیا نے بائیک اسٹارٹ کرنے کی بے وقوفی نہیں کی تھی اور اسے ہینڈل سے پکڑ کر ایسے ہی بھاگنے لگا، میں بھی اس کے پیچھے تھا۔

تھوڑی ہی دیر میں ہم دونوں ہانپتے ہوئے سائیں داد کے باڑے میں پہنچ چکے تھے۔

وہ ہمارا ہی بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔

جب میں نے اسے ساری بات بتائی اور شہزادی سے بھی ''حادثاتی'' ملاقات کے بارے میں بتایا تو سائیں داد کو ایک مغموم سی چپ لگ گئی۔ وہ خوش بھی ہوا تھا اور رو بھی پڑا تھا۔

''حوصلہ کر یار! ہم تیرے ساتھ ہیں ناں اور پھر میں نے تو تجھ سے مدد کا وعدہ بھی کر رکھا ہے۔'' میں نے اسے حوصلہ اور تسلی دی۔ ''یہ سب جو ہوا وہ تقدیر کا ہی لکھا تھا۔ وہ یقیناً تیری اور شہزادی کی مدد کرنا چاہتی ہے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے یار نومی!'' وہ اپنی رنجوری رقت پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

''لیکن لگتا ہے وہ اب بالکل ہی ناامید ہو گئی ہے اور اسے اپنی اب جان کی بھی پروا نہیں رہی، مجھے ڈر ہے کہ...... کہیں وہ خودکشی ہی نہ کر بیٹھے۔''

''اب ایسا نہیں کرے گی وہ......'' میں نے ازراہِ تشفی اس سے کہا۔ ''مجھ سے ملنے اور یہ جاننے کے بعد کہ تم میرے گہرے دوست ہو، اسے یہ سن کر کافی امید اور حوصلہ ہوا تھا۔ میں نے اسے اپنا اور تمہارا نمبر بھی دے دیا تھا کہ وہ تم سے اور گاہے بہ گاہے مجھ سے بھی موقع پاتے ہی رابطے میں رہے، تم ایک کام کرنا سائیں داد......! اگر وہ تمہیں فون کرے یا میسج تو اسے بڑے دھیان اور احتیاط سے ریپلائی کرنا۔ وہ کسی اور کے موبائل سے رابطہ کرنے کی کوشش کرے گی۔''

میری اس بات پر سائیں داد بجائے خوش یا پُراُمید ہونے کے ایک پریشان سا نظر آنے لگا۔ مجھے اس پر حیرت ہوئی اور میں نے پہلے کالیا کے چہرے کی طرف دیکھا تو وہ بھی پُرغور نظروں سے سائیں داد کا ہی چہرہ پڑھنے میں محو تھا۔

''کیا ہوا سائیں داد؟ تم پریشان ہو گئے؟ میں تو سمجھا تھا کہ تمہیں خوشی ہوگی یہ سب سن کر......'' میں نے پھر اس کی طرف دیکھ کر کہا تو وہ بدستور اسی کیفیت میں بولا۔

''مجھے ڈر ہے کہ شہزادی اس طرح خود کو کسی بڑی مشکل میں نہ پھنسا دے کیونکہ اسے کہیں آنے جانے کی اجازت ہے نہ ہی فون وغیرہ استعمال کرنے کی۔ مہران خان نے اس پر کچھ نظروں کے پہرے ضرور بیٹھا رکھے ہوں گے۔ پھر شہزادی بھلا کس کا فون استعمال کر سکتی ہے؟''

''تم غلط سوچ رہے ہو سائیں داد!'' میں نے کہا۔ ''تمہارے اعصاب پر وہ ظالم اور جابر وڈیرہ چھایا ہوا ہے۔''

''سائیں داد اپنی جگہ ٹھیک ہے، جگری!'' کالیا، جو ابھی تک چپ سا تھا، اچانک اس کی تائید میں بولا اور میں قدرے چونک کر اس کا چہرہ تکنے لگا۔ وہ سائیں داد کی طرف دیکھتے ہوئے مجھ سے بولا۔

''سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ شہزادی بہن اس حویلی میں ایک قیدی کی حیثیت سے ہے۔ بہ قول سائیں داد کے وہاں اس پر اس خبیث مہران خان نے چور نظروں کے پہرے بٹھا رکھے ہیں۔ ان حالات میں تو اس بے چاری کا سایہ بھی اس کے ساتھ نہیں، جبکہ وہ خود اس وقت مایوسی کی انتہائی حدوں پر ہے اور اسے اپنی جان کی بھی پروا نہیں، ایسے میں اگر جوش میں آکر اس نے اس طرح کی کوئی حرکت کرنے کی کوشش بھی کی تو وہ کسی بڑی مشکل کا شکار ہو سکتی ہے۔''

زمانہ چشیدہ کالیا...... کے لفظوں میں مجھے ہمیشہ ایک زمانے کا تجربہ بولتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ اس لیے میں اس کی بات کو رد کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا مگر یہاں میں نے اس سے کچھ اختلاف کیا اور کہا۔

''یار کالیا! آخر پھر ایسا کب تک چلے گا؟ کچھ تو ہمت دکھانا ہوگی ان دونوں میں سے کسی کو......! اور اس کی ابتداء شہزادی کر رہی ہے اور پھر ہم کون سا دور ہیں ان دونوں سے۔''

''ہم ان سے دور ہی ہیں جگری!'' کالیا عجیب سے لہجے میں بولا۔

''کیا تم اور سائیں داد بتا سکتے ہو کہ اس وقت شہزادی کیا کر رہی ہے اور کس حال میں ہے؟ وہ کسی سرکاری قید خانے میں نہیں ہے کہ جب چاہا کسی کی مٹھی گرم کی اور جا کے مل لیا اور اس کی خیر خبر لے لی بلکہ وہ بے چاری تو ایک ظالم، جابر اور مطلق العنان جاگیردار کی حویلی میں ہے مگر جگری! تجھے تو

ہماری غذائیں

کیا آپ جانتے ہیں کہ یہ جلد جو آپ کے جسم کو گھیرے ہوئے ہے یہ وہ نہیں ہے جو چھ سات سال قبل تھی بلکہ اب بالکل نئے خلیات کا مجموعہ ہے۔ آپ کی جلد کے نیچے موجود چربی وہ نہیں جو ایک سال قبل تھی۔ اس طرح آپ کے جسم کے اہم حصے خون میں موجود سرخ جسیمہ بھی اپنی زندگی ایک سو بیس دن میں مکمل کر لیتا ہے اور اس کی جگہ ایک نیا سرخ جسیمہ لے لیتا ہے اور آپ کی ہاضمے کی نالی کی اندرونی تہہ بھی ہر تیسرے دن دوبارہ تعمیر کے مراحل سے گزرتی ہے۔ یعنی آپ کے جسم کا ہر ذرہ جو آپ سے جدا ہوتا ہے اس کی جگہ متبادل ذرات پر ہو جاتی ہے۔

مرسلہ: آصف خان۔ راولپنڈی

نہیں لیکن مجھے بلکہ مجھ سے بھی زیادہ اس کربناک اور تلخ حقیقت کا اندازہ سائیں داد کو بھی ہوگا کہ مہران خان جیسے جاگیردار، اپنی ناک پر کبھی تک نہیں بیٹھنے دیتے، جہاں اپنی ناک اونچی کی بات آتی ہے تو ان جیسے لوگ رات کی لرزتی اور سسکتی ہوئی خاموشیوں میں خواہ اپنی بیٹی ہی کیوں نہ ہو، رازداری سے قصہ پاک کر کے وہیں دفنا دیا کرتے ہیں اور کسی کو سوال کرنے کی جرأت نہیں ہوتی، قانون تو خود ان کی اوطاقوں میں پانی بھرتا ہے اور بھنے تیتروں کے سالم پھور بغیر ڈکار لیے کھا کے اپنی وردیوں کی بیلٹ تھوڑی اور ڈھیلی کر کے وہاں سے اٹھتا ہے۔'' کالیا اتنا کہہ کر خاموش ہوا۔ میں اس کی گفتگو پر گنگ سا تھا اور سائیں داد بڑی گہری نظروں سے کالیا کا چہرہ تکے جا رہا تھا، پھر جیسے الفاظ تلاشتے ہوئے فرطِ جوش سے مجھ سے بولا۔

''قسم مولا کی...... تومی! تو دوستی کے معاملے میں بڑا خوش نصیب ہے جو تجھے کالیا جیسا سچا، جاں نثار اور جہاندیدہ دوست ملا ہے۔ اس کی ایک ایک بات جو ابھی اس نے کہی ہے وہ سولہ آنے درست ہے۔ جس خدشے کو میں تیرے سامنے پوری تفصیل سے بیان کرتا جا رہا تھا اس نے وہ چند لفظوں میں بتا ڈالی...... کیا تو اب بھی نہیں سمجھا میری بات یار تومی؟''

''مجھے تم دونوں سے اختلاف ہی کب رہا ہے یارو؟''

میں نے اپنی نظریں ان کے روبرو کرتے ہوئے کہا۔ ''اور کالیا سے تو میں خود رہنمائی لیتا رہا ہوں۔ میں یہ سمجھ رہا ہوں کہ شہزادی اس وقت کہاں اور کس حال میں ہے لیکن کچھ حاصل کرنے کے لیے رسک بھی لینا پڑتا ہے۔ شاید عام حالات میں یہ بات نہ کہتا مگر میں چونکہ خود شہزادی سے مل کر آرہا ہوں۔ بقول سائیں داد کے، وہ ایک سیدھی سادی اور ڈرپوک سی عام دیہاتی لڑکی ہے مگر اب وہ والی بات اس میں نہیں رہی ہے۔ ہر روز جینے اور مرنے والا انسان وقت اور حالات سے بہت کچھ نہ صرف سیکھ لیتا ہے بلکہ اس میں دلیری بھی آجاتی ہے۔ شہزادی مایوسیوں اور ناامیدوں کے بھنور سے گزر رہی ہے۔ اس بے چاری کا ستا ہوا چہرہ، دل آزاردہ آنکھیں بتا رہی تھیں مجھے کہ اگر زیادہ دیر ایسا کچھ چلا تو خدانہ کرے، کہیں وہ اپنے آپ کو ہی نقصان نہ پہنچا دے۔ اسی لیے میں اسے اُمید کا ایک چراغ تھما آیا ہوں۔''

میں نے اپنی بات ختم کی تو میری بات پر شاید صاد کرتے ہوئے وہ دونوں بھی خاموش رہے۔ تھوڑی دیر مزید وہاں بیٹھنے اور چند اہم امور پر گفت و شنید کے بعد میں اور کالیا، سائیں داد سے رخصت ہو کے واپس ہو لیے۔

میرا ارادہ رانا بشیر کے ہاں جانے کا تھا۔ میں نے کالیا کی بائیک کے پیچھے بیٹھے بیٹھے، اپنی رسٹ واچ میں ٹائم دیکھا۔ رات کے دس بجنے والے تھے۔ اگر میں اس وقت بھی رانا بشیر کے گھر کا رخ کرتا تو اس کی طارق روڈ والی رہائش گاہ تک پہنچتے پہنچتے مجھے گیارہ تو بج ہی جانے تھے۔ ملنا بھی ضروری تھا۔ میں نے فرحانہ کو فون کھڑکا دیا۔ دوسری رنگ بجتے ہی دوسری جانب سے اس کی مترنم آواز ابھری۔

''ہیلو نعمان صاحب! آپ کہاں رہ گئے؟ آپ نے تو آج آنا تھا ہمارے ہاں؟''

''میں نے اسی لیے ہی فون کیا تھا آپ کو!'' میں بولا۔ ''ایک ضروری کام میں پھنس گیا تھا، ابھی فارغ ہوا ہوں۔ کہیں تو آجاؤں؟''

وہ تھوڑی دیر سوچتی رہی پھر گومگو سے لہجے میں بولی۔ ''چاہ تو میں بھی یہی رہی تھی مگر چونکہ بقول آپ کے، اس اہم نشست میں پاپا کا شامل ہونا بھی ضروری ہے لیکن وہ سو چکے ہیں، ایسا کرتے ہیں۔ کل صبح کا وقت رکھ لیتے ہیں۔''

''یہ بہتر رہے گا۔'' میں نے فوراً کہا اور کسی خیال سے پوچھا۔ ''ویسے آپ کے پاپا دفتر کتنے بجے جاتے ہیں؟''

''دس تو بج ہی جاتے ہیں ان کو لیکن تم دس بجے تک ہی آجانا میں کسی بہانے انہیں روکے رکھوں گی۔''

''آپ نے ابھی ان سے اس بات کا ذکر تو نہیں کیا؟''

''نہیں۔''

''گڈ!''

''او کے بائی۔'' اس نے کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔

فرحانہ میری ہدایت پر حرف بہ حرف عمل کر رہی تھی۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ خود بھی چاہتی تھی کہ جلد سے جلد اس کی ماں کے اصل قاتل کا چہرہ بے نقاب ہو جائے۔ ساتھ ہی وہ یہ بھی چاہتی تھی کہ اس کے باپ پر میرا شبہ بھی دھل جائے۔ اسی لیے بھی وہ کر رہی تھی جو میں چاہ رہا تھا کیونکہ ہم دونوں ایک ہی کشتی کے سوار تھے مگر میرا معاملہ زیادہ اہم تھا۔ نیز یہ ساری بساط میری ہی بچھائی ہوئی تھی اور وہ دونوں باپ بیٹی مجھے اسی لیے ساتھ لے کر چلنا چاہتے تھے۔

کالیا کو میں نے گھر چھوڑنے کا کہا اور اس نے بائیک اسی طرف کو گھما لی۔

گھر کے دروازے پر اتارنے کے بعد وہ مجھ سے بولا۔

''کل تو تیری ان دونوں باپ بیٹی کے ساتھ میٹنگ ہے، میں تب تک سیٹھ ستار کو جواب دینے کے لیے کوئی منصوبہ بناتا ہوں۔'' اس کی بات پر میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''اس تازہ ترین مہم کے بعد میں کچھ اور سوچنے لگا ہوں۔'' میری بات پر وہ بے اختیار ایک گہری سانس خارج کر کے رہ گیا اور اسی لہجے میں بولا۔

''اے لے جگری! مجھے پتا تھا تو یہی بولے گا۔''

میں مسکرا کر بولا۔ ''ایسی بات نہیں ہے، سیٹھ ستار کو میں قانونی جنگ کی شکست دینا چاہتا ہوں کالیا! لیکن جہاں ضرورت پڑی اس کے ساتھ بدمعاشی کے ہتھیار سے بھی جواب دیا جاتا رہے گا۔ کل ملتے ہیں...... ابھی میرے ذہن میں اس مافیائی گینگ کے بارے میں بہت سی باتیں اور لائحہ عمل واضح ہونے لگے ہیں۔''

''بہتر، چلتا ہوں!'' وہ بائیک اسٹارٹ کرتے ہوئے بولا۔ میں نے کہا۔

''کھانا تو کھاتے جاؤ!''

''نہیں جگری! اڈے پر پہنچنا ہے مجھے، استاد بھا بھا کو بھی اپنے حریف لاڈلے سائیں کے بارے میں بتانا ہے کہ اس کے ہاتھ کہاں پھنسنے لگے ہیں۔'' وہ کہہ کر آگے بڑھ گیا۔

میں گھر میں داخل ہوا۔ دروازہ فہیم نے کھولا تھا۔ وہ

کراچی
ماہنامہ
سرگزشت

کا ایک اہم خاص نمبر

بے وقت موت نمبر

ان افراد کی روداد جو"بے وقت کی موت" کا شکار ہوئے۔

لیکن اپنی مختصر سی زندگی میں انہوں نے قابلِ تقلید کام کیے۔

اس خاص شمارے کے لیے آپ بھی لکھیں

کیونکہ سرگزشت کا خاص نمبر

اہمیت کا حامل ہوتا ہے، لوگ مجلد کرا کر رکھتے ہیں۔

اگر آپ ایسی کسی شخصیت پر لکھنا چاہتے ہیں تو پہلے آگاہ کر دیں

تا کہ کوئی دوسرا اس شخصیت پر لکھ رہا ہو تو اسے روک دیا جائے۔

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

مجھے دیکھتے ہی پلٹ گیا۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ وہ مجھے سلام کیے بغیر پلٹ گیا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی۔ میں نے خاموشی سے دروازہ بند کیا۔

''سلام بھائی جان!'' عاصمہ سر پہ دوپٹا درست کرتی ہوئی صحن میں آ گئی تھی۔ فہیم اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔ میں نے پُرشفیق مسکراہٹ سے بہنا کے سر پہ ہاتھ پھیرا اور سلام کا جواب دیا۔

''بھائی جان! آپ فریش ہو جائیں، تب تک میں کھانا لگاتی ہوں۔'' وہ یہ کہہ کر کچن کی طرف بڑھ گئی۔ میں کچھ سوچتا ہوا اپنے کمرے میں آ گیا۔ اس وقت تو میں نے فہیم سے کوئی بات نہ کی، تاہم جب میں غسل وغیرہ کر کے کیثویل ڈریس (گھریلو کپڑے) پہنے کمرے میں آیا اور عاصمہ میرے آگے کھانا لگانے لگی تو میں بہ غور اس کا چہرہ تکنے لگا۔

مجھے ایسی کوئی بات محسوس نہ ہوئی، جس سے ظاہر ہوتا ہو کہ ان دونوں بہن بھائیوں کے درمیان کوئی بحث ہوئی ہو۔ اگرچہ فہیم کے کھنچاؤ کی شکایت دبے لفظوں میں عاصمہ بہنا مجھ سے کر چکی تھی اور میں اسے ٹال چکا تھا مگر مجھے یہ ڈر بھی لگا رہتا تھا کہ کہیں فہیم میری نصیحت بھلا کر کہیں بہن سے الجھ ہی نہ پڑا ہو مگر ایسا ابھی کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

''بھائی جان! آپ نے فہیم بھیا سے کوئی بات نہیں کی؟''

جب میں کھانے میں مشغول ہوا تو عاصمہ بہنا نے مجھ سے نیچی آواز میں کہا۔ اس نے مجھے وہی بات یاد دلائی تھی۔

کھانے کا وقت گزر جانے کے بعد میں اپنے بیڈ پر ہی کھانا کھاتا تھا۔ عاصمہ بہنا میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔ میں نے اس کی طرف نظر اٹھا کر شاکی نظروں سے دیکھا اور اسی لہجے میں پوچھا۔

''کیا فہیم نے کچھ کہا ہے تم سے؟''

''کہا تو کچھ نہیں، بس! وہی پرانی روش اختیار کیے ہوئے ہیں وہ مجھ سے؟ بے رخی اور کسی بات کا سیدھے منہ سے جواب نہ دینا۔'' اس نے بتایا۔ بہن کے لہجے کی مغمومیت اور اداسی نے میرے اندر فہیم کے لیے برہمی کا عنصر بیدار کیا۔ میں اب عاصمہ بہنا کو زیادہ دیر نہیں ٹال سکتا تھا۔ بولا۔

''آج پوچھتا ہوں تم فکر نہ کرو بہنا! مجھے یقین ہے کوئی ایسی خاص بات نہیں ہوگی۔''

میں نے پھر اسے طفل تسلی دینا چاہی تو وہ بولی ''بھائی جان! بات معمولی ہوتی تو اتنی طول نہ ہوتی۔ بہن بھائیوں کے درمیان تو کسی بات پر لڑائی ہو ہی جاتی ہے مگر عارضی لیکن فہیم بھائی کے ساتھ تو میری کوئی لڑائی بھی نہیں ہوئی نہ ہی کسی بات پر کوئی بحث بھی ہوئی، پتا نہیں کیوں وہ ایک دم ہی......''

اس کا لہجہ گھٹ گیا اور وہ رقت بھری مغمومیت میں اپنا جملہ بھی پورا نہ کر پائی۔ بہن کو اس قدر ملول اور آزردہ خاطر دیکھ کر ایک بار پھر میرے اندر فہیم کے لیے اشتعال کا مادہ ابھرا تھا جس پر میں نے قابو پایا اور عاصمہ بہنا سے بولا۔

''ادھر آؤ!'' وہ بے چاری اپنی آبدیدہ آنکھوں کے نمناک گوشے دوپٹے کے پلو سے پونچھتی ہوئی میرے بیڈ کے کنارے پر ٹک کر بیٹھ گئی۔ میں نے بڑی محبت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور بولا۔

''تم کچن سنبھالتی ہو ناں! وہاں تم سے کچھ برتن بھی کھڑک جاتے ہوں گے، بس! یوں سمجھو ایک چھت تلے ایسی چھوٹی موٹی باتیں بھی ہو جایا کرتی ہیں، تم اپنا دل چھوٹا نہ کرو، میں ابھی کھانا کھا کر فہیم سے پوچھتا ہوں کہ آخر معاملہ کیا ہے؟''

میں نے بہنا سے دانستہ جھوٹ بولا۔ حالانکہ میں فہیم سے اس کی عاصمہ بہنا کے ساتھ ناراضگی کی وجہ پوچھ چکا تھا اور اس نے اپنی ناراضگی کی جو وجہ بتائی تھی وہ خاصی گمبھیر بھی تھی مگر میں نے غصے یا طیش میں آنے کی بجائے نہایت بردباری اور سمجھداری کے ساتھ فہیم کو سمجھانے اور مناسب وقت کا انتظار کرنے کی تلقین کی تھی۔ نیز اس سے بہن کے ساتھ اپنا رویہ درست کرنے کی نصیحت بھی کی تھی مگر شاید فہیم کے لیے یہ سب ناقابلِ برداشت ہوتا جا رہا تھا۔ وہ میرا بھائی تھا مگر ہمارے مزاجوں میں کافی فرق تھا وہ فطرتاً گرم طبیعت اور جلد باز نوجوان تھا۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ محلے میں منے میاں کے ساتھ ہونے والے تازہ ترین اندوہناک واقعے نے اسے کچھ زیادہ ہی تشویش میں مبتلا کر ڈالا تھا۔

بہرکیف...... عاصمہ بہنا جب کھانے کے برتن سمیٹ کر جانے لگی تو میں نے اس سے کہنا چاہا کہ وہ فہیم کو میرے پاس بھیج دے مگر پھر کچھ سوچ کر میں نے ایسا نہیں کہا۔

جب وہ کمرے سے نکل گئی تو اس کے ذرا ہی دیر بعد میں خود ہی اٹھ کر اپنے کمرے سے نکلا اور فہیم کے کمرے میں جا پہنچا۔ وہ جاگ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ بھی آج مجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہو۔ مجھے دیکھ کر اس نے اپنی نگاہیں میرے روبرو کیں۔ میری بھی بھانپتی ہوئی نظریں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں، جو مجھے پُرجوش سا محسوس ہوا۔ اس میں غالب تاثر

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

برہمی کا ہی تھا۔

''اچھا ہوا بھائی جان آپ آگئے۔ میں خود بھی آپ کے پاس آنے والا تھا۔'' اس نے کہا۔

''پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ میرے سمجھانے کے باوجود تم نے عاصمہ بہنا سے اپنا رویہ ابھی تک کیوں نہیں بدلا؟'' میں نے ٹھنڈی ہوئی سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا تو وہ میری بات کا جواب دیے بغیر بولا۔

''بھائی جان! آپ آخر کب ہوش میں آئیں گے جب متے خاں کی طرح!''

''شٹ اپ!'' میں بھی گرم ہوگیا۔ ''تمہیں بڑے بھائی سے بات کرنے کی تمیز نہیں ہے؟ یا مجھے سکھانی پڑے گی؟''

''بھائی جان!'' اس نے کچھ کہنا چاہا۔

''پہلے میری بات کا جواب دو۔'' میں نے کہا۔ مجھے غصہ کم ہی آتا تھا۔ تاہم ایک عام سا پرخطاب شر تو میں بھی تھا۔ سمجھتا تو تھا کہ فہیم بھی ایک جوان لڑکا تھا۔ پانچ چھ برس کا ہی تو فرق تھا ہماری عمروں میں مگر ان چند برسوں کے تفاوت کو ان حالات اور ذمے داریوں نے شاید طویل کردیا تھا جو ابو جان کی پھانسی کے بعد اچانک میرے کاندھوں پر آن پڑی تھیں۔ یہی سبب تھا کہ مجھے اس قدر اور اچانک غصے میں دیکھ کر ایک لمحے کو تو بے چارہ فہیم بھی پریشان ہوگیا تھا۔ البتہ میرے اس طرح برہمی سے کہنے پر اس کے چہرے پر بھی ابتدا میں سرخی ابھری تھی جو میری سرزنش کرنے پر کچھ ماند پڑ گئی تھی۔

''سوری بھائی جان! یہ اتنا سیریس میٹر ہے کہ آپ کی اس سے پہلو تہی!''

''تم کب سے اتنے سمجھدار ہوگئے ہو کہ خود کو عقلِ کل سمجھنے لگے؟'' میں نے بدستور اسی برہمی سے کہا تو وہ بھی کھل کر بولا۔

''بھائی جان! پلیز، اب میری بات مت کاٹیے گا، میں پھر اور کیا کہوں؟ آپ کو اپنے مسئلوں نے الجھا رکھا ہے۔ خاندان کا داغ دھونے میں آپ اس قدر مصروف رہنے لگے ہیں کہ آپ کو یہ احساس دلانے کے باوجود کہ اس خاندان کی عزت پر ایک اور بٹا لگنے والا ہے۔ آپ نے ابھی تک عاصمہ سے کوئی بات تک نہیں کی۔''

''میں نے خود اس کی ضرورت نہیں محسوس کی تھی۔'' میں نے اس بار اپنے لہجے کو متعدل رکھنے کی کوشش چاہتے ہوئے کہا۔ سمجھتا تھا کہ یہ کس قدر ہاٹ ایشو تھا اور نازک بھی اور پھر

میتھین گیس میں اضافہ

کرۂ ارض کے درجہ حرارت میں بتدریج اضافے کا سبب وہ چند گیسیں ہیں جو سورج کی حدت کو بیرونی فضا میں جانے سے روکتی ہیں۔ نتیجتاً زمین کے اوسط درجہ حرارت میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا جارہا ہے۔ ان گیسوں کو گرین ہاؤس گیسیں کہا جاتا ہے اور ان میں کاربن ڈائی آکسائیڈ، میتھین، اوزون، کلوروفلوروکاربن اور پانی کے بخارات شامل ہیں۔ گرین ہاؤس گیسوں میں سب سے اہم گیس کاربن ڈائی آکسائیڈ ہے جس کی مقدار فضا میں متواتر بڑھتی جارہی ہے۔ گاڑیوں، کارخانوں، بحری جہازوں، آبدوزوں اور ہوائی جہازوں میں جلنے والا پیٹرول، کوئلہ اور قدرتی گیس کاربن ڈائی آکسائیڈ کی مقدار بڑھانے کا سبب بن رہے ہیں۔ گرین ہاؤس گیسوں میں دوسری اہم گیس میتھین ہے جس قدرتی گیس کو ہم گھروں میں استعمال کرتے ہیں اس میں تقریباً 75 فیصد میتھین موجود ہوتی ہے فضا میں میتھین کی مقدار پچھلے سات سالوں میں دگنی ہوچکی ہے۔ اب تک سائنسدانوں کا خیال تھا کہ میتھین کی مقدار میں یہ غیر معمولی اضافہ قدرتی گیس کے زمین سے نکالنے اور ترسیل کے دوران اخراج کی وجہ سے ہے اس کے علاوہ جب کوئلے اور تیل کو بطور ایندھن جلایا جاتا ہے تو اس وقت بھی میتھین کی معمولی مقدار فضا میں شامل ہوتی ہے۔

مرسلہ: ارباب حسین۔ بہاولپور

***

ایک بار مجاز کے سامنے کسی نے اقبال کا یہ مصرع پڑھا:

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں

تو مجاز نے اپنی مخصوص شوخ اور نشیلی مسکراہٹ کے ساتھ یہ فقرہ کسا تھا:

''جب حقیقتِ منتظر لباسِ مجاز میں
نظر آئی تو کوئی پہچاننے والا نہیں رہا''

مرسلہ: احسن عابدی۔ کراچی

فہیم کے آج تیور بھی یہی بتا رہے تھے کہ وہ اس موضوع پر مجھ سے آج کوئی حتمی قدم اٹھوا کر ہی رہے گا۔

"کمال ہے بھائی جان! وہ لڑکا آج ہمارے دروازے تک آ گیا اور آپ...... نے اس کی ضرورت نہیں محسوس کی! کیا اس وقت ضرورت محسوس کریں گے جب وہ لڑکا عاصمہ بہن کو بھگا کر!"

"فہیم...... از بان سنبھال کر بات کرو۔" میں یک دم جوشِ غیرت سے گرم ہو گیا۔

"تمہیں شرم نہیں آتی اپنی بہن کے بارے میں اس طرح کی لغو گفتگو کرتے ہوئے۔"

اسی وقت عاصمہ اندر داخل ہوئی۔ وہ شاید ہماری گفتگو کھلے دروازے کے پیچھے سے سن رہی تھی۔ اس کا چہرہ ہنوز اشک بار تھا مگر ایک طرح کے جوش سے سرخ بھی ہو رہا تھا۔ اس نے دوپٹا اپنے سر پر لے رکھا تھا اور وہ فہیم کی طرف چند قدم بڑھاتے ہوئے گلوگیر سے لہجے میں بولی۔

"فہیم بھیا! میں تو تمہیں ایک سلجھا ہوا اور پڑھا لکھا انسان سمجھتی تھی مگر تم بھی......"

"تم جاؤ یہاں سے...... عاصمہ!" فہیم نے اسے دیکھ کر غصے سے کہا تو میں نے فہیم کو جھڑک دیا۔

"اپنے مزاج کو درست کرلو فہیم! یہ عزت دار اور پڑھے لکھوں کا شیوا نہیں ہے، میری محلے میں عزت ہے، گھر سے اس طرح شور شرابے اور لڑائی کی آواز باہر جائے گی تو لوگ باتیں بنائیں گے۔"

"واہ بھائی جان! کیا خوب بات کہی آپ نے بھی۔" وہ تلخی سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ اس کا لہجہ تمسخر اڑانے والا تھا۔ آگے بولا۔

"کیا باہر صرف آپ ہی کی عزت ہے؟ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا باہر؟"

"میں سب کی عزت کی بات کر رہا ہوں۔ ہمارے میں سے ایک کی بھی عزت خراب ہوگی تو اس کا اثر بھی ہم تینوں پر ہی پڑے گا۔"

"تو اس کا خیال کب ہے آپ کو بھائی جان؟" فہیم تیز لہجے میں مجھ سے بولا۔

"بھائی! آرام سے بات کرو بھائی جان سے...... یہ کیا ہوتا جا رہا ہے آپ کو؟"

فہیم کو بدستور اسی لہجے میں میرے ساتھ بات کرتے ہوئے دیکھ کر عاصمہ نے بھی فہیم کے ساتھ سخت لہجہ اپنایا تو فہیم پُرطیش نظروں سے اس کی طرف گھورتے ہوئے بولا۔

"یہ سارا کیا دھرا تمہارا ہے! تم دفع ہو جاؤ یہاں سے۔"

عاصمہ بہنا کے ساتھ فہیم کا پہلے ہی ناروا رویہ مجھے کھلا ہوا تھا، اب جو میرے سامنے اس نے اسے یہ کہا تو میرا دماغ بھی گرم ہو گیا۔ اپنے طیش پر مزید قابو پانا میرے لیے محال ہو گیا اور تب ہی میں نے آگے بڑھ کر ایک زوردار تھپڑ فہیم کے منہ پر مار دیا۔ یہ سب اچانک اور ان دونوں کے لیے غیر متوقع تھا۔ فہیم اور عاصمہ، دونوں ہی میرے مزاج سے واقف تھے کہ میں اس قدر غصے میں کبھی نہیں آتا تھا یہی وجہ تھی کہ تھپڑ لگتے ہی پہلے تو عاصمہ کے منہ سے بھینچی بھینچی چیخ نکل گئی، دوسرے فہیم ہکا بکا رہ گیا۔ اس کا جوش، اس کی برہمی پل کے پل فرو ہو گئی۔ سچی بات تو یہ تھی کہ خود میں بھی ایک لمحے کو گڑبڑا سا گیا تھا کہ اور پہلا احساس ایک پچھتاوے کی صورت میں یہی ابھرا تھا کہ مجھے چھوٹے بھائی پر اس طرح ہاتھ نہیں اٹھانا چاہیے تھا لیکن عاصمہ کے معاملے میں فہیم کی کج بحثی مجھے پہلے ہی برہم کیے ہوئے تھی اس پر مستزاد اس کی بدتمیزی نے جلتی پر تیل کا کام کر دیا تھا۔

"تم حد سے بڑھتے جا رہے ہو...... فہیم! تمہارا رویہ پہلے ہی میرے لیے ناقابلِ برداشت ہوتا جا رہا ہے۔ اس پر تم نے آج عاصمہ بہن کو بھی ایسے لفظوں میں دھتکارا۔" فہیم سے یہ سب کہتے ہوئے میرا لہجہ ہی نہیں وجود بھی کانپنے لگا جبکہ فہیم تھپڑ کھانے کے بعد ایک دم سرخ پڑ گیا تھا اور وہ میری جانب سخت نظروں سے گھورتے ہوئے بار بار اپنے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں کھول بھینچ رہا تھا، اس نے اپنے ہونٹ بھی میری جانب گھورتے ہوئے سختی سے بھینچ رکھے تھے لیکن میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھیں بھی بھیگ گئی تھیں۔ اس کی وجہ یہی تھی شاید کہ میں نے آج تک اس پر کبھی ہاتھ اٹھانا تو کجا، کبھی اونچی آواز میں ڈانٹا تک نہیں تھا۔ بہت لاڈ اور پیار سے رکھا تھا میں نے ان دونوں کو...... یہ اس کی توقع کے خلاف تھا کہ میں اس پر ہاتھ بھی اٹھا سکتا تھا مگر اس نے عاصمہ بہن کے لیے ایسا کہا تھا جو میری برداشت سے باہر ہو گیا تھا۔

"نہیں...... نہیں بھائی جان! فہیم بھیا کو معاف کر دیں، انہیں ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔" عاصمہ ایک نگاہ فہیم پر ڈالتے ہوئے تڑپ کر مجھ سے بولی تھی۔

"بھائی جان! افسوس مجھے آپ کے تھپڑ مارنے کا نہیں ہے، دکھ ہوا ہے مجھے تو اس بات کا کہ میں نے آپ کو ایک الگ

بات سے آگاہ کیا تھا جو آگے چل کر آپ کو ہی نہیں ہم سب کے لیے اس سے زیادہ دکھ، پشیمانی اور ذلت کا سبب بننے والی ہے۔ میں آپ کو بتانا چاہتا تھا کہ آج بھی وہ خبیث ..... آپ کے آنے سے تھوڑی دیر پہلے ہی دروازے پر کھڑا عاصمہ سے باتیں کر رہا تھا، مجھے آتے دیکھتے ہی وہ کھسک گیا تھا۔ یہ تھپڑ آپ کو میرے چہرے پر نہیں عاصمہ کے چہرے پر رسید کرنا چاہیے تھا۔"

فہیم نے مجھ سے کہا تو عاصمہ سسک پڑی۔ میں نے بڑے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس نے حیران حیران سی معصوم نگاہ میرے چہرے پر ڈالی۔ میں نے اسے اپنے قریب کرلیا اور فہیم سے بولا۔

"تم کیا سمجھتے ہو کہ میں اتنا جاہل اور پاگل ہوں کہ ایک ایسی بات پر عاصمہ بہن کے لتے ڈالتا جس پر ابھی ہم نے اس سے کوئی بات ہی نہیں کی ہے، نہ ہی اسے صفائی کا کوئی موقع دیا ہے۔ فہیم! تم غلطی پر ہو۔ کیوں بھول گئے ہو تم کہ ابھی تمہارا یہ بڑا بھائی زندہ ہے۔ کیوں بھول گئے ہو تم یہ کہ میں تم دونوں کے مستقبل سے تم دونوں کی موجودگی سے تم دونوں کے اچھے برے سے بالکل بھی غافل نہیں ہوا ہوں، اس لیے کہ مجھے اپنے ماں باپ کی ہی نہیں اپنی تربیت پر بھی پورا بھروسا ہے۔ مجھے عاصمہ بہن پر پورا بھروسا ہے کہ وہ ایسا کبھی بھی کوئی قدم نہیں اٹھائے گی جو ہماری ہمارے خاندان کی بدنامی کا سبب بنتی ہو۔ ہم تینوں بہن بھائیوں کے درمیان اعتماد اور بھروسے کا جو رشتہ ہے وہ تمہاری اس جلد بازی نے شگاف زدہ کر ڈالا ہے آج۔ ہر بات کے کہنے اور کرنے کا کوئی وقت ہوتا ہے، جس میں منتظر تھا مگر تم!"

"بس، بھائی جان! بہت ہو گیا۔" فہیم نے ہاتھ اٹھا کر سرد مہری سے کہا۔ "محلے میں ایک تازہ ترین واقعہ ہو جانے کے باوجود آپ نے سبق نہیں لیا اور اس حساس اور اہم معاملے کو عزت اور غیرت کی بجائے آپ نے اندھی محبت کی عینک سے دیکھا، اتنا وقت گزر جانے کے باوجود آپ نے ابھی تک اس معاملے پر عاصمہ سے بات بھی کرنا ضروری نہیں سمجھا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج وہ خبیث ہمارے دروازے پر چکا کھڑا تھا۔ یہ تو شکر ہوا کہ رات کا وقت تھا اور گلی سنسان اگر کوئی اور دیکھ لیتا تو صبح تک محلے بھر میں ہماری عزت کا جنازہ اٹھ رہا ہوتا۔"

عاصمہ باعث خجلت اور شرم کے مارے وہاں کھڑی نہ رہ سکی اور روتی ہوئی کمرے سے چلی گئی۔ میں نے ایک گہری

بابا فریدؒ ایک شب تہجد پڑھ رہے تھے کہ افغانستان سے ایک تجارتی قافلے کا ادھر سے گزر ہوا۔ اس میں تقریباً پندرہ بیس اونٹ تھے جن پر ڈرائی فروٹ لدے ہوئے تھے۔ جیسا کہ اس دور میں رواج تھا اس قافلے کے اونٹوں کے گلے میں گھنٹیاں بندھی ہوتی تھیں۔ قافلے کے چند محافظ اور تاجر آگے آگے چلتے تھے اور چند پیچھے پیچھے ہوتے تھے تاکہ نگرانی کر سکیں۔ بابا فرید عبادت میں اس قدر مستغرق تھے کہ ان کو پہلے تو معلوم ہی نہ ہوا کہ کوئی قافلہ گزر رہا ہے لیکن جب اونٹوں کی گھنٹیوں کی آوازیں تیز ہو گئیں تو آپ کے استغراق میں خلل آیا اور آپ نے مریدوں سے پوچھا کہ یہ شور کیسا ہے؟ مرید حجرے سے باہر نکل کر دیکھنے لگے تو آخری اونٹ پٹن پر سے گزر رہا تھا اور اس کے ساتھ دو تین افغان محافظ بھی تھے۔ مرید ان کو لے کر بابا فرید کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ بابا فرید نے پوچھا: "یہ شور کیسا ہے، کہاں جا رہے ہو؟"

قافلے کے محافظ نوعمر لڑکے تھے۔ ان کے بزرگ آگے آگے تھے اور ان لڑکوں کو پیچھے آنے کا حکم دیا ہوا تھا۔ انہوں نے بابا فرید کی بات سنی اور کہا "زبانِ ہندی نمی دانم" یعنی ہم ہند کی زبان نہیں جانتے۔ بابا فریدؒ چونکہ فارسی جانتے تھے پوچھا "ایں شور و غوغا چیست؟ کدام میری؟ توشہ شما چیست؟"

بابا فرید کی فصیح فارسی سن کر وہ دونوں لڑکے حیران ہوئے اور ان کو شرارت سوجھی۔ ایک نے جواب دیا۔ "بابا می رویم بہ دہلی و توشہ ما سنگ است۔"

یعنی ہم دہلی جا رہے ہیں اور وہاں پتھر لے جا رہے ہیں۔ بابا فرید نے سن کر تبسم فرمایا اور ان کی زبان سے نکلا۔ "سنگ باشد" یعنی پتھر ہی ہوگا۔ ولی اللہ کی زبان سے یہ الفاظ نکلے ہی تھے کہ اونٹوں پر رکھے تمام کجاووں کے خشک پھل پتھر بن گئے۔

مرسلہ: عنایت اللہ۔ کوئٹہ

سانس خارج کرکے اپنے اندر کے غبار کو ہوا کی صورت میں باہر اگلا اور چند قدم اٹھاتا ہوا فہیم کے پاس آیا۔ پھر جب اسے نرمی سے سمجھانے کے لیے اس کے کاندھے پر پیار سے ہاتھ دھرا تو وہ بڑی نخوت سے پرے ہٹ کر اور اپنا منہ پھیر کر کھڑا ہوگیا۔ مجھے اس کی حرکت پر اس بار غصے کی بجائے دکھ ہوا جسے پیتے ہوئے میں نے تحمل مزاجی سے کہا۔

''فہیم! میرے چھوٹے بھائی! تمہیں کیا ہوگیا ہے؟ کیوں اتنے تلخ ہوتے جا رہے ہو تم دن بہ دن؟ کیا بھول گئے تم ارشاد مٹن والے معاملے میں بھی تم نے اسی جلد بازی اور برہمی کا اظہار کیا تھا جب وہ ہماری مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہمیں ہمارا ہی مکان اونے پونے داموں فروخت کرنے پر مجبور کر رہا تھا مگر میں نے کس طرح حکمتِ عملی سے اسے پورے محلے میں رسوا کرکے رکھ دیا تھا اور ہم پر ایک ذرا آنچ بھی نہیں آئی تھی۔ یہ معاملہ بھی میں بالکل اسی طرح ہی حل کرنا چاہتا ہوں...... ٹھہرو ذرا...... میں ابھی عاصمہ بہنا سے اس سلسلے میں تفصیل سے بات کرکے آتا ہوں۔''

یہ کہہ کر میں کمرے سے نکلا اور عاصمہ کے کمرے میں آیا۔ وہ اپنے بستر پر بیٹھی سر جھکائے رو رہی تھی۔ میری آہٹ پا کر اس نے اپنا اشک بار چہرہ اٹھایا اور پھر جھکا لیا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا اور ملائمت آمیزی سے بولا۔

''بہنا! مجھے تم پر پورا بھروسا ہے لیکن یہ زمانہ بھروسے کے لائق نہیں ہے۔ فہیم ذرا مزاج کا تیز ہے اور پھر ابھی تازہ واقعہ بھی محلے میں ایسا ہی رونما ہو چکا ہے۔ اسی لیے وہ زیادہ بے چین اور فکر مند ہوگیا تھا۔ میں اسے سمجھا لوں گا مگر تم......''
میں نے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا۔ پھر دوبارہ اسی بردباری سے بولا۔

''بیٹیوں سے ایسی باتیں ماں ہی کیا کرتی ہیں، ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ہماری ماں نہیں ہے اس دنیا میں، اب میں ہی تمہارا اور فہیم کا باپ بھی ہوں اور ماں بھی...... کیا یہ درست ہے کہ تم کسی لڑکے میں انٹرسٹڈ ہو؟''

تو وہ یک دم سسک کر اٹھی اور میرا ہاتھ تھام کر بولی۔

''بھائی جان! میں نے ایسا کچھ نہیں کیا ہے، جس سے ہماری رسوائی ہو مگر حقیقت کیا ہے وہ چند ہی روز میں باعزت طریقے سے خود ہی ظاہر ہونے والی تھی۔ وہ...... وہ...... ایک شریف لڑکا ہے، اس نے تو کب سے مجھے کہہ رکھا ہے کہ وہ اپنے ماں باپ کو ہمارے ہاں بھیجنا چاہتا ہے مگر میں ہی اسے روکتی رہی تھی کیونکہ آپ دیگر مسائل میں الجھے ہوئے تھے۔''

عاصمہ یہ کہہ کر دوبارہ اپنا سر جھکائے بیڈ پر ٹک سی گئی۔

''بہتر یہی ہے مگر یہ بری بات ہے کہ وہ اس طرح دروازے پر......''

''یہ وہ نہیں تھا بھائی جان!'' عاصمہ نے فوراً کہا اور میں چونک سا گیا، بولا۔

''تو پھر فہیم کس لڑکے کی بات کر رہا تھا؟ اس نے کسے دیکھا تھا ہمارے دروازے پر؟''

''اسے تو میں بھی نہیں جانتی تھی۔ وہ یہی پوچھ رہا تھا مجھ سے کہ کیا نعمان احمد کا گھر یہی ہے؟ میں نے دروازہ کھولے بغیر ہی اسے مختصراً اثبات میں جواب دیا تھا اور وہ فوراً چلا گیا تھا کہ اتنے میں فہیم بھیا بھی آگئے اور انہیں غلط فہمی ہوگئی کہ......''

''میں سمجھ گیا۔'' میں نے اس کی بات کاٹی۔ مجھے خاصی تسلی ہوگئی تھی۔ میں مطمئن ہو کر اپنے کمرے میں آگیا۔ لیٹنے سے پہلے میں نے دل میں یہ تہیہ کرلیا تھا کہ کل صبح فہیم سے بڑا ہونے کے باوجود معافی تلافی کرلوں گا اور اسے سمجھا بھی دوں گا۔ اس سے میری شان میں کوئی کمی نہیں آجائے گی، کیا ہوا جو میں بڑا ہو کر جھک گیا تو، آخر تو میرا سگا بھائی ہی ہے کوئی غیر تو نہیں۔

فجر کے وقت ایک زبردست کھڑاکے سے میری آنکھ کھلی۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ سامنے فہیم کو دیکھا دروازے پر۔ اس کا چہرہ جوشِ غیض سے بری طرح تمتما رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے اجنبیت کا تاثر شعلہ بار زہر کی طرح مترشح ہو رہا تھا۔ وہ حواس باختہ بھی ہو رہا تھا اور کانپ بھی رہا تھا۔ میں اسے یوں دیکھ کر بیڈ سے اٹھ کھڑا ہوا اور ابھی اس سے کچھ پوچھنے ہی والا تھا کہ وہ میرے قریب آیا اور عالمِ غیظ و غضب سے لرزتے ہوئے بولا۔

''بھائی جان! اب میرا یہ حق بنتا ہے کہ میں آپ کے منہ پر اسی طرح طمانچہ ماروں جس طرح آپ نے کل رات میرے منہ پر مارا تھا۔''

یہ کہتے ہی اس نے میری طرف بدستور شعلہ بار نظروں سے گھورتے ہوئے ایک زوردار تھپڑ میرے چہرے پر جڑ دیا۔ میں بیڈ پر گر پڑا۔ تب ہی اس نے پھٹی پھٹی آواز میں ایک لرزہ خیز انکشاف کیا۔

''عاصمہ اپنے کمرے میں نہیں ہے...... بھائی جان......! وہ اس لڑکے کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔''

(جاری ہے)

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

بیت بازی

قارئین

(نزاہت افشاں ملیورہ کا جواب)

انور حبیب .... کوئٹہ

ہمارے حسنِ تخیل کو کردیا پامال
سکونِ خاطرِ بے تاب کو تباہ کیا

(طٰہٰ یاسین حیدرآباد کا جواب)

جمیلہ انصاری .... حیدرآباد

رقص کرنے کا ملا حکم جو دریاؤں میں
ہم نے خوش ہو کے بھنور باندھ لیے پاؤں میں

محمد حسن عثمانی .... جھنگ

رات کے پچھلے پہر پردیس میں
بانسری روئی کلیجہ پھٹ گیا

امتیاز الدین .... سرگودھا

رات دن جس بت کافر کی پرستش کی تھی
بدگماں اس کو ہر اک گام پہ پایا ہم نے

ناعمہ تحریم .... کراچی

رسم و دستور ہمیشہ سے یہی ہے نصرت
عیب گنتے ہیں زمانے میں ہنر سے پہلے

(سدرہ بانو تنا گوری کراچی کا جواب)

آصف سحر .... ملتان

یہ بھی دیکھو کر چمکتی ہوئی شبنم کے لیے
اپنے چہروں پہ سجایا ہے پسینا ہم نے

قمر جہاں .... کراچی

یہ نہ ہوتی تو یہ تنہائی مجھے ڈس لیتی
اک تری یاد ہے دل کے مرے بہلانے کو

عابد علی .... واہ کینٹ

یہی آدمی کی دولت یہی آدمی کی قسمت
غمِ عشق گر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا

(زاہد علی شادی پور کا جواب)

شبیر شاہ .... کشمور

اٹھ کر تو تیری بزم سے آگئے ہیں ہم
کس دل سے آئے ہیں یہ دل ہی جانتا ہے

(امجد علی ساہیوال کا جواب)

عبدالستار .... ساہیوال

اس قوم کو شمشیر کی حاجت نہیں رہتی
ہو جس کے جوانوں کی خودی صورتِ فولاد

(سعید احمد چاند کراچی کا جواب)

انصار احمد .... کراچی

منسوب اس سے قصے اوروں سے بھی تھے لیکن
وہ بات بہت پھیلی جو بات چلی ہم سے

عنایت مسیح .... کراچی

میں ہمیشہ نئے منظر کا کراچی رہا
چاہے قرطاس پہ تصویر کوئی ہو نہ ہو

ہادیہ ایمان، ماہا ایمان .... فورٹ عباس

میری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برق خرمن کا ہے، خونِ گرم دہقاں کا

علی اکبر کمال .... جھنگ

میں اپنی ذات کی پنہائیوں میں تنہا ہوں
کوئی تو ہو جو میرے ساتھ ہم سفر نکلے

غضنفر عباس مرزا .... اسلام آباد

میں نیند میں بھی مسلسل سفر میں رہتا ہوں
کہ سر سے جاتی نہیں ہے کبھی ہوائے سفر

عبدالستار .... ساہیوال

مرے ہر شعر میں روشن ہے مرا اپنا وجود
میرا ہر شعر مری ذات کی تفسیر بنا

(ہادیہ ایمان ماہا ایمان فورٹ عباس کا جواب)

نصیر احمد .... لاہور

اب وہ منظر نہ وہ چہرے ہی نظر آتے ہیں
مجھ کو معلوم نہ تھا خواب بھی مر جاتے ہیں

عرفان حسین زیدی .... رانی پور

آج تک یاد ہیں وہ پیار کی باتیں میری
نقش دل پر میرے اب تک وہ شناسائی ہے

منظر علی........لاہور
اتنی تلخی قہر نہیں اچھی
کچھ تو ہو رکھ رکھاؤ لہجے میں

وحید جہاں........کراچی
اپنے بازو میں ہے قوت بینک میں دولت بہت
جیت کے تم کو الیکشن اب کے دکھلائیں گے ہم

ماہ نور تبسم........ملتان
اب سمیٹے سے سمٹتا ہی نہیں میرا وجود
اس طرح سے تو کوئی شخص نہ بکھرا ہو گا

(عبدالجبار رومی لاہور کا جواب)

نغمہ سراج........منڈی بہاؤالدین
یہ قفس قفس میں رونق یہ چمن ہے اجڑا اجڑا
غم دوست یہ بتا دے کہاں تو نے ہم کو چھوڑا

ارشاد حسین........لاہور
یوں دیکھتے ہی دیکھتے دنیا بدل گئی
کیا کیا جوان و پیر جہاں سے گزر گئے

ملک فیصل........لاہور
یہ زیست کیا ہے جو ہم کو کبھی نہ راس آئی
کہاں کا بار الم ہے جو ہم اٹھا کے جیے

انور حسین........کمالیہ
اقتضائے محبت ہے درد مندی ہے
ستمگری کا نہ شکوہ وفا شعار کریں

(رضائے احمد اعوان دریا خان کا جواب)

سعید احمد........جھنگ
یہ نہیں کہ تیرے فراق میں، میں اجڑ گیا یا بکھر گیا
ہاں محبتوں پر جو مان تھا وہ نہیں رہا میرے گمشدہ

منشی محمد عزیز مے........لندن
یہ رکھ رکھاؤ محبت سکھا گئی اس کو
وہ روٹھ کر بھی مجھے مسکرا کے ملتا ہے

(قندیل بلوچ لاہور کا جواب)

ممتاز احمد........لاہور
لوگ سو گئے کب کے پھونک کر چراغ اپنے
ہم اٹھاتے ہیں تیرے ناز چاندنی تنہا

(ناصر احمد دینہ کا جواب)

عبدالستار........ساہیوال
راستے میں جب کسی کا نقش پا مل جائے گا
میں سمجھتا ہوں کہ منزل کا پتا مل جائے گا

نزہت پاشا........کراچی
رات سے شکایت کیا بس تم سے کہنا ہے
تم ذرا ٹھہر جاؤ رات کب ٹھہرتی ہے

(احمد جاوید ملتان کا جواب)

حکیم سید محمد رضا شاہ........میانوالی
کیسے کہہ دوں کہ مجھے چھوڑ دیا ہے اس نے
بات تو سچ ہے مگر بات ہے رسوائی کی

(زاہد اکبر سیالکوٹ کا جواب)

نیلوفر شاہین........اسلام آباد
آرزوؤں کی سحر میں حسرتوں کی شام ہم
یوں ہوئے ہیں مبتلائے گردش ایام ہم

(ذاکر نقوی لاہور کا جواب)

رعنا رضوی........مانچسٹر یوکے
سانس تھامیں ہیں نگاہیں نجانے کس دم
تم پلٹ آؤ گزر جاؤ یا مڑ کر دیکھو

(بابر عباس گلیانہ روڈ کا جواب)

سعید احمد چاند........کراچی
وہی محسوس کرتے ہیں خلش درد محبت کی
جو اپنے آپ سے بڑھ کر دوسروں سے پیار کرتے ہیں

(فرخندہ مرزا لاہور کا جواب)

رضا احمد اعوان........دریا خان
ہے نمایاں تیرے جذبے کی صداقت
ایک ہی شخص کا برسوں تجھے پاگل رکھنا

☆☆

بیت بازی کا اصول ہے جس حرف پر شعر ختم ہو رہا ہے اسی لفظ سے شروع ہونے والا شعر ارسال کریں۔ اکثر قارئین اس اصول کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ان کے شعر تلف کر دیے جاتے ہیں۔ اس اصول کو مدنظر رکھ کر ہی شعر ارسال کریں۔

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

علمی آزمائش
139
30 جولائی 2017ء

میرے خیال سے اس مرتبہ دریافت کی گئی شخصیت کا نام .... ہے۔

نام: ....

پتا: ....

....

انعام یافتہ ہونے کی صورت میں مجھے جاسوسی ☐ سسپنس ☐ پاکیزہ ☐ سرگزشت ☐ بھجوایا جائے
کسی ایک پر ☑ کیجیے۔

کوپن سے کے ہمراہ اپنے جوابات بمورخہ 30 جولائی 2017 تک علمی آزمائش 139 پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200 پر ارسال کریں

مقابلہ بیت بازی

قارئین کے مسلسل اصرار پر ادبی ذوق کی تسکین کے لیے اک نیا سلسلہ "بیت بازی" شروع کیا گیا ہے۔ آپ اپنے پسندیدہ شعر کے آخری حرف سے شروع ہونے والا شعر ارسال کر سکتے ہیں۔

نام ....

پتا ....

....

محترم / محترمہ .... کے شعر کے جواب میں شعر ارسال کر رہا ہوں اسے شامل اشاعت کر لیں (شعر الگ کاغذ پر ہے)

100

مقابلہ بیت بازی
پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی۔ 74200

اگر آپ کو

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ'
ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ'
ماہنامہ پاکیزہ' ماہنامہ سرگزشت'

کے حصول میں دقت پیش آ رہی ہے یا آپ کو اپنے علاقے کے بک اسٹال سے کوئی شکایت ہے اور آپ کے علاقے میں بروقت پرچہ نہیں پہنچ رہا تو

شکایت فیکس کریں

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں
ثمر عباس 0301-2454188
سرکولیشن منیجر 35802552-35386783-35804200
فیکس نمبر 35802551

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
فون: 35895313 فیکس: 35802551

علمی آزمائش۔ 139

ادارہ

ماہنامہ سرگزشت کا منفرد انعامی سلسلہ

علمی آزمائش کے اس منفرد سلسلے کے ذریعے آپ کو اپنی معلومات میں اضافے کے ساتھ انعام جیتنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ ہر ماہ اس آزمائش میں دیے گئے سوال کا جواب تلاش کر کے ہمیں بھجوایئے۔ درست جواب بھیجنے والے پانچ قارئین کو ماہنامہ سرگزشت، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ اور ماہنامہ پاکیزہ میں سے ان کی پسند کا کوئی ایک رسالہ ایک سال کے لیے جاری کیا جائے گا۔

ماہنامہ سرگزشت کے قاری ''ایک علمی سرگزشت'' کے عنوان تلے منفرد انداز میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں مقام رکھنے والی کسی معروف شخصیت کا تعارف پڑھتے رہے ہیں۔ اسی طرز پر مرتب کی گئی اس آزمائش میں دریافت کردہ فرد کی شخصیت اور اس کی زندگی کا خاکہ لکھ دیا گیا ہے۔ اس کی مدد سے آپ اس شخصیت کو بوجھنے کی کوشش کریں۔ پڑھیے اور پھر سوچیے کہ اس خاکے کے پیچھے کون چھپا ہوا ہے۔ اس کے بعد جو شخصیت آپ کے ذہن میں ابھرے اسے اس آزمائش کے آخر میں دیے گئے کوپن پر درج کر کے اس طرح سپرد ڈاک کیجیے کہ آپ کا جواب ہمیں 30 جولائی 2017ء تک موصول ہو جائے۔ درست جواب دینے والے قارئین انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔ تاہم پانچ سے زائد افراد کے جواب درست ہونے کی صورت میں بذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اب پڑھیے اس ماہ کی شخصیت کا مختصر خاکہ

5 جنوری 1928ء میں پیدا ہوئے۔ لاہور کے اندرون بھاٹی گیٹ میں بچپن گزرا۔ عبدالحفیظ کاردار کے پڑوسی تھے۔ مشتاق احمد اور افتخار احمد کے بھائی تھے۔ دنیائے کرکٹ میں بہت نام کمایا۔

علمی آزمائش 137 کا جواب

مصطفی قریشی کا سندھ کے سہون شریف میں جنم ہوا۔ ابتدائی تعلیم جامعۃ العربیہ حیدرآباد سے حاصل کی۔ پھر حیدرآباد سے میٹرک کیا۔ گورنمنٹ کالج حیدرآباد سے گریجویشن کیا اور یونیورسٹی سے ایم اے اسلامی تاریخ میں کیا۔ حیدرآباد میں ریڈیو اسٹیشن قائم ہوا تو ''اسانجھو پاکستان'' نامی فیچر میں آواز شامل کی پھر ''لاکھوں میں ایک'' فلم سے فلمی دنیا میں آگئے اور اب لیجنڈ میں شمار ہوتا ہے۔

انعام یافتگان

1- زاہد حسین (لاہور) **2-** اسماعیل بٹ (میرپور آزاد کشمیر) **3-** ریاض فاطمہ (جھنگ)

4- آغا علی رضا (چکوال) **5-** نوید حسن (پشاور)

ان قارئین کے علاوہ جن لوگوں کے جوابات درست تھے۔

کراچی سے ناعمہ تحریم، منور یاسمین، جلیل احمد جعفری، حسن افضال، تبسم عرفان، قریشی، خادم حسین، پروین اختر، محمد خواجہ، عطیہ نورین، حسن افضال، رضیہ مسعود، امامہ تجمل، عبدالحکیم شر، جمیل احمد جعفری، سعد احمد چاند، فیضان احمد، سلیم جاوید صدیقی، مرزا نوشاد بیگ، سمیع الدین، نازش ممتاز، فیاض ہاشمی، نہال اختر، عباس علی سید، محمد علی قریشی، نوشاد اختر، انور کمال، تبسم عرفان قریشی۔ چکوال سے مندلیس زارا، نیاز ہاشمی، فیض حسن فیض، فاطمہ احسن، زاہد شاہ۔ لاہور سے عبدالجبار رومی

انصاری، سید محمد رضا زیدی، حنیف ادیب، چوہدری اشفاق، نادیہ خان، انور علی شاہ، کوکب اختر، شاہینہ بتول، شاور علی، احتشام لاہوری، صاحب جان، بہادر خان اچکزئی، کلیم وٹو، مہوش جان، شوکت ملک، امجد خان، ثناء اللہ بخاری، حسان خان، امروز اسلم، افروز جہاں، ملک خورشید، نوشین اختر، کوکب جمیل۔ اسلام آباد سے غضنفر عباس مرزا، انور یوسف زئی، نیلوفر شاہین، زیب علی، شہزاد حسن خان، میثم زیدی، ایمن زیدی، عزیز الدین فریدی، اکبر حسن، فرحت علی خان، حسان خان، شہزادہ حسن، تمکین ایاز، فراز احسن، میاں اشفاق، نورین وٹو، پرنس ایاز، شہباز علی، عباس کاظمی۔ راولپنڈی سے رضوان احمد ہاشمی، قرۃ العین، ڈاکٹر سعادت علی خان، عرفان اللہ قادری، یاسمین، چوہدری اشفاق، اختر علی، کاوش علی، نعمان صدیقی، وقار احمد، نیاز احسن، سلیم اللہ خان، اقراء سلیم، نیاز ملکانی، حکیم اللہ صدیقی، ثمینہ پرویز، فرید الدین چمن، سہیل احمد خان، نورین اسلم، زرین مجید، قاری فدا حسین تبسم، اسلام علی اچکزئی، یاسین حسن خان، نگار مصطفیٰ۔ ڈی جی خان سے محمد احسن جاوید، رفیق احمد ناز۔ راجن پور سے ملک محمد ظفر اللہ، رحمین شاہ۔ ماسٹر محمد ظفر اللہ۔ بھکر سے رضا احمد اعوان۔ میرپور خاص سے طاہر الدین بیگ، نعمان اشرف، شیرین نعمان، ارشد قائم خانی۔ ساہیوال سے عبدالستار، زین الایمان احمد قریشی۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ سے اویس طارق، کلیم اصغر۔ گڈو بیراج کشمور سے شبیر شاہ۔ ملتان سے محمد سرفراز مغل، امام بخش۔ واہ کینٹ سے مسرت النساء، کلیم اصغر، ارشد خان، ظہیر الدین بابر۔ کھاٹان سے سلیم کامریڈ۔ ملک وال سے سیف اللہ۔ پاک پتن سے علی محمد۔ منڈی بہاؤ الدین سے مدثر علی، اشفاق حسن، گلزار حسن عباس تمنائی، کوکب علی کوکب، ستار مدنی۔ بدین سے سید ایس ڈی ساغر، ابرار مصطفیٰ ڈرائیور۔ فتح جنگ سے نزابت افشال۔ پشاور سے نصر من اللہ (حیات آباد)۔ جہلم سے اختر شاہ عارف، ثناء علی (پشاور یونیورسٹی)، میانوالی سے عبدالخالق (کالا باغ)۔ حیدر آباد سے محمد یاسین اندروی، مریم بنت کاشف۔ سیالکوٹ سے مومو اقبال۔ ہوتی مردان سے م انور۔ گوجرانوالہ سے محمد جمیل، احمد قاسم بٹ۔ میانوالی سے حکیم سید محمد رضا شاہ، سید غضنفر حیدر شاہ۔ ملتان سے سید حسن گردیزی، انصار حسن، شہباز تسلیم، سبط حسن زیدی، کلثوم ترین، کوثر پروین، درویش شاہ، دلاور خان، انعم اقبال، دلنواز خان۔ فیصل آباد سے عتیق اسلم، خاقان خان، فلک افشین، سلیم اللہ منور خان، نعمان حسن، عرفان مروت، نصرت جہاں، ثمین اختر، دلدار بھٹی، عباس علی اصفہانی، کاشف خان، شہناز نواز، بتول زیدی۔ رحیم یار خان سے فرحت فاطمہ، محمد عابد، شبیر شاہ شبیری، اسماعیل شاہ، گل باز خان، فرحت زیبو، کاشان لاشاری، امتیاز احمد، نازش علی نازش، فرح اسلم خان۔ مظفر گڑھ سے کیف صہبائی، نور الاسلام، نیاز خان، اشرف علی سید، عباس خان۔ اٹک سے حاجی محمد صادق قریشی، فرح حسن عتیق، اکبر علی، جاوید ایاز، نصرت پروین۔ سرگودھا سے ذیشان اختر، اشرف خان، نعمان ظفر، کائنات فاطمہ رضوی۔ کمالیہ سے ذیشان احمد۔ ٹنڈو آدم سے انعام اللہ۔ چارسدہ سے جی باز خان۔ بھکر سے ضیاء اللہ، نذیر احمد۔ سیالکوٹ سے فیروز اختر، نوشہرہ فیروز سے انعام حسن۔ گوجرانوالہ سے ثناء احمد۔ راجن پور سے اصغر حسین۔ شہداد کوٹ سے بلال اکبر، خوشاب سے محمد خان جوئیہ۔ دادو سے فیض جو نیجو۔ شیخوپورہ سے حسن اعجاز، بشیر احمد۔ قصور سے شاہین عثمانی، فخرا اعجازی۔ شجاع آباد سے سید محمد نقوی۔ مظفر گڑھ نواں شہر سے: محمد سجاد راجپوت۔ وزیر آباد سے: توقیر اشرف۔ فیصل آباد سے: طیب محمود، محمد طارق اقبال، ثنا۔ حیدر آباد سے: زریاب فرحان، اقرا مظاہر۔ لطیف آباد، حیدر آباد سے: طہٰ یاسین، نسرین رانا، توقیر جمالی، نزہت پروین، مسکان بھٹو۔ پشاور سے: محمد شہزاد اعظم، کشمالہ مفتی، گلباز خان، مفتی اکبر خان، عمران وردگ، فہیم احسان زئی، ڈاکٹر نعمان شہزاد خان۔ لاہور سے: امروز اسلم ملک، ثاقب سجاد، محمد عاقب جنید، سید محمد احسن نواز، عبدالخالق چوہدری، عبدالقادر، یاسمین ملک، فرزانہ مصطفیٰ، کائنات مرزا، شاہینہ اسلم چوہدری، روایت خان، کلثوم شہزاد، سرفراز اکرم خان، عنبرین شاہد، محمد اسلم۔ لالہ موسیٰ سے: بشریٰ اصغر، صفدر ملک، ارشد محمد ولی، صبیحہ نواز۔ کھاریاں سے: شعیب اقبالی۔ طاہر پورہ، بہاولپور سے: شاہ رخ ہاشمی۔ کوٹلی، آزاد کشمیر سے لیاقت علی۔ بھمبر، آزاد کشمیر سے: پروفیسر خالد جاوید۔ ڈڈیال ضلع میرپور آزاد کشمیر سے: محمد ہارون ..۔ خانیوال سے: گل لیاقت، اسما توحید، ملک فیروز، اعجاز حسین محمد اقبال۔ ملتان سے: سید فیض الحسن شاہ گیلانی، لبنیٰ ارشاد، امام بخش ملک، اویس سلمان، محمد معین چشتی، نازش فاروقی، خواجہ محمد حسین، محمد شفیق بھٹی۔ ڈیرہ اسماعیل خان سے: آصف اقبال، ڈاکٹر ایس اے اختر۔ سوئی ضلع ڈیرہ بگٹی سے: محمد اکمل خان۔

ممالک غیر سے عنبرین عظمت (لاس ویگاس، امریکا)، عنایت خان (دبئی)، ملک فیروز (ٹورنٹو)، عباس خان، نسیم زبیری، اشفاق خان (العین)۔

قیمت

جناب معراج رسول
سلامِ مسنون
میں نے پہلی بار کہانی لکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس کہانی کے تمام واقعات کا سامنا میں نے کیا ہے۔ خود بیتی کو کہانی کی شکل میں لکھنا آسان نہیں۔ اس لیے کہ زندگی کے کس حصے کو حذف کیا جائے اور کس کو لکھا جائے اس کا انتخاب ایک مشکل مرحلہ ہے پھر بھی میں نے کوشش کی ہے۔ اب اس میں روانی آئی ہے یا نہیں، یہ آپ ہی بتا سکتے ہیں۔ اپنی سرگزشت صرف اس لیے لکھی ہے کہ میری طرح کوئی اور یہ غلطی نہ کرے۔

سیما صفدر
(کراچی)

آج عید کا دن ہے دنیا دکھاوے کو میں نے اپنے ہاتھوں پر مہندی بھی لگائی ہے اور کلائی بھر شیشے کی چوڑیاں بھی پہنی ہیں مگر میرے اندر ایک آگ سی لگی ہوئی ہے۔ صفدر کی آواز بازگشت بن کر میرے کانوں میں گونج رہی ہے اور مجھے رہ رہ کر ماسی نوراں یاد آرہی ہے۔ وہ عرصہ دراز سے ہمارے ہاں کام کرنے آرہی ہے۔

اس روز بھی ماسی نوراں کام پر آئی تو اس کا چہرہ سوجا ہوا تھا اور ہاتھوں پر نیل پڑے ہوئے تھے۔ اس دن میری بھی یونیورسٹی میں کوئی کلاس نہیں تھی، اس لیے میں بھی گھر پر ہی تھی۔ نوراں کی یہ حالت دیکھ کر امی پریشان ہوگئیں۔ لیکن میں نے اس کا کوئی نوٹس نہیں لیا کیونکہ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی اور آئے دن اس کی شوہر کے ہاتھوں پٹائی ہوتی تھی۔ وہ خود تو کام کرتا نہیں تھا۔ الٹا بیوی کی کمائی پر اپنا حق جتاتا۔ وہ بے چاری صبح سے شام تک پانچ چھ گھروں میں کام کرکے جو کماتی۔ وہ سب اس سے چھین لیتا۔ گھر کی ساری ذمے داری نوراں پر تھی۔ چار بچے تھے۔ ان کے کھانے پینے اور کپڑے لتے کا بندوبست بھی اسی کو کرنا ہوتا۔ ان حالات میں بچوں کی تعلیم و تربیت کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا حالانکہ نوراں کی بڑی خواہش تھی کہ اس کے بچے اسکول جائیں۔ دو لڑکے بڑے تھے۔ اس نے انہیں سرکاری اسکول میں داخل کروادیا تھا لیکن وہ وہاں سے بھاگ جاتے اور دن بھر محلے کی گلیوں میں آوارہ گردی کرتے۔

اس روز بھی وہ یہی دکھڑا رو رہی تھی۔ مہینے کا آخر تھا اور اس کے پاس تقریباً پیسے ختم ہوگئے تھے۔ جن گھروں میں وہ کام کرتی تھی۔ وہ سب اس کے حالات سے واقف تھے۔ اس نے ان گھروں میں جو پکتا۔ اس میں سے تھوڑا بہت وہ نوراں کو دے دیا کرتے جو وہ گھر لے جاکر بچوں کو کھلا دیا کرتی۔ اس میں سے بھی اس کا شوہر اپنے لیے اچھی چیزیں نکال لیا کرتا اور بچے منہ دیکھتے رہ جاتے، اس روز بھی یہی ہوا۔ اس نے نوراں سے پیسے مانگے اور انکار کرنے پر اسے روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا۔

جب وہ اپنا رونا رو چکی تو میں نے اس سے کہا۔ ”جب وہ تم پر اتنا ظلم کررہا ہے تو تم اسے چھوڑ کیوں نہیں دیتیں؟“

”کیسے چھوڑ دوں بی بی۔ ان بچوں کو لے کر کہاں جاؤں گی؟“

”کیوں، تمہارے ماں باپ نہیں ہیں؟“

”وہ تو کب کے مر کھپ گئے۔ ایک بھائی ہے۔ وہ بھی بال بچوں والا ہے۔ اس کا اپنا گزارا مشکل سے ہوتا ہے۔ وہ مجھے کہاں سے کھلائے گا۔“

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے، جیسے اب کام کررہی ہو، اسی طرح بعد میں بھی کرتی رہنا۔ کم از کم۔ کمائی تو تمہارے ہاتھ میں رہے گی۔“

”بی بی جی، آپ نہیں سمجھیں گی۔ اپنا گھر پھر اپنا ہوتا ہے۔ جو چاہوں کروں، کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں۔ بھائی کے گھر میں تو کسی چیز کو ادھر سے اُدھر نہیں کرسکتی۔ بھاوج ہنگامہ کردے گی۔“

”بس تو پھر اپنے آپ کو رگڑتی رہو اور جوتے کھاتی رہو۔“ میں نے جل کر کہا۔

”کوئی بات نہیں بی بی جی۔“ وہ ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولی۔ ”جو مقدر میں لکھا ہے وہ تو ہو کر ہی رہے گا بس

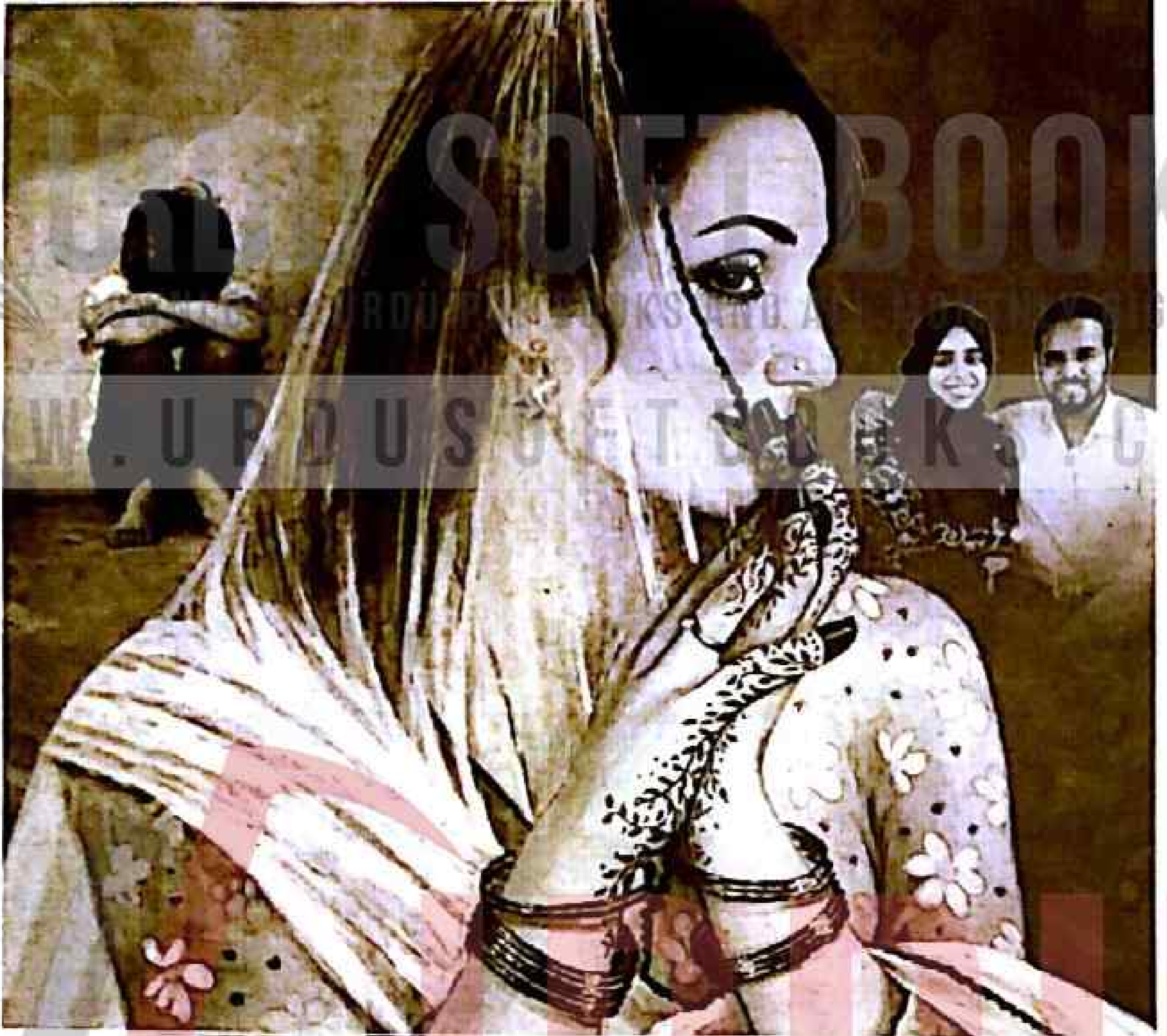

دعا کریں کہ وہ نکھٹو کسی کام دھندے سے لگ جائے۔“

ان دنوں میں یونیورسٹی کے فائنل سمسٹر میں تھی کہ میرے لیے خاندان سے ایک رشتہ آیا۔ وہ امی کی خالہ زاد بہن کا لڑکا تھا۔ اس نے ایک مقامی یونیورسٹی سے ایم بی اے کیا تھا اور کسی بینک میں اچھے عہدے پر فائز تھا۔ گوکہ انہوں نے باقاعدہ پیغام نہیں دیا لیکن وہ اسی نیت سے ہمارے گھر آنا چاہ رہی تھیں۔ امی نے وقتی طور پر انہیں ٹال دیا اور کہا کہ وہ گھر والوں سے مشورہ کر کے جواب دیں گی۔ انہوں نے یہ بات ابو کو بھی نہیں بتائی اور پہلے میری مرضی جاننا چاہی تو میں نے بھی گول مول باتیں کر کے انہیں ٹالنے کی کوشش کی۔

”آپ کو اتنی جلدی کیوں ہو رہی ہے؟“ میں نے کہا۔ ”ابھی تو میری پڑھائی بھی ختم نہیں ہوئی ہے۔“

”لڑکیوں کی شادی جتنی جلد ہو جائے۔ اتنا ہی اچھا ہے۔“ امی سنجیدگی سے بولیں۔ ”تمہیں تو خوش ہونا چاہیے کہ اتنا اچھا رشتہ آ گیا۔ لڑکا دیکھا بھالا ہے۔ شکل و صورت بھی اچھی ہے۔ تعلیم یافتہ برسرِ روزگار، اپنا گھر، اپنی کار اور تمہیں کیا چاہیے؟“

”کچھ بھی ہو، مجھے ابھی شادی نہیں کرنی۔“ میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

”انکار کی کوئی وجہ بھی تو ہو۔“ امی نے تیز لہجے میں کہا۔ ”اگر کسی اور کو پسند کرتی ہو تو بتا دو۔“ اسے بھی دیکھ لیں گے۔

میں نے سوچا کہ امی کو صفدر کے بارے میں بتا دینا چاہیے۔ جب وہ خود پوچھ رہی ہیں تو ان سے کچھ چھپانا ٹھیک نہیں۔ ویسے بھی ماں سب سے بڑی دوست اور رازدار ہوتی ہے۔ لہٰذا میں نے جھجکتے ہوئے امی کو بتا دیا۔ وہ مری کلاس میں ہی پڑھتا تھا اور پہلے روز ہی میری اس سے دوستی ہو گئی تھی۔ اس کے بعد امی نے مجھ سے اس کے بارے میں تابڑتوڑ سوالات کیے اور میں نے انہیں وہ سب کچھ بتا دیا جو صفدر کے بارے میں جانتی تھی۔ وہ ڈیفنس میں رہتا تھا۔ باپ کا انتقال ہو چکا تھا۔ بڑا بھائی کسی ملٹی نیشنل کمپنی میں ایک اچھی پوسٹ پر تھا۔ دونوں بہنوں کی شادیاں ہو چکی تھیں جبکہ صفدر سے چھوٹا بھائی ایم بی اے کر رہا تھا۔

امی نے سب کچھ سننے کے بعد کہا۔ ”مجھے تو یہ لڑکا کسی طرح بھی تمہارے لیے مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ ابھی تو وہ پڑھ رہا ہے۔ اس کے بعد نہ جانے اسے کب ملازمت ملتی

ہے اور کب وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے قابل ہو سکے گا۔"

"اس کی آپ فکر نہ کریں۔" میں نے کہا۔ "اسے باپ کے ترکہ میں سے بہت کچھ ملا ہے۔ جیسے ہی اسے جاب ملی۔ وہ اپنے گھر والوں کو ہمارے یہاں بھیج دے گا۔"

میرے لہجے سے امی نے اندازہ لگا لیا کہ بات بہت آگے تک جا چکی ہے اور میں نے صفدر سے شادی کرنے کا قطعی فیصلہ کرلیا ہے۔ اس کے بعد وہ کچھ بھی نہیں بولیں بس اتنا کہا۔ "تمہیں اپنے بارے میں فیصلہ کرنے کا پورا حق ہے کیونکہ زندگی تمہیں گزارنی ہے، ہم صرف نصیحت ہی کر سکتے ہیں۔ میں پھر کہوں گی کہ اچھے رشتے قسمت سے ملتے ہیں۔ اس لیے فیصلہ کرنے میں جلدی نہ کرو۔ اچھی طرح سوچ بچار کرلو۔ یہ لڑکا ندیم ہر لحاظ سے اچھا ہے۔ صفدر اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔"

امی کی بات سن کر مجھے غصہ آ گیا اور میں نے بھی تیز لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔ "میں صفدر کو چار سال سے جانتی ہوں۔ ہم ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اور میں نے سوچ سمجھ کر ہی یہ فیصلہ کیا ہے۔"

"ٹھیک ہے تم اسے کسی دن گھر بلاؤ میں اس سے ملنا چاہتی ہوں۔" امی نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔

میں بچپن سے ہی ضدی اور خودسر واقع ہوئی ہوں اس کے علاوہ میرے مزاج میں غصہ بہت ہے۔ اس لیے سب گھر والے مجھ سے ڈرتے ہیں حالانکہ میں ابو کی لاڈلی ہوں اور وہ مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں لیکن وہ بھی مجھ سے بہت محتاط ہو کر بات کرتے ہیں۔ نہ جانے کب میرا پارہ ہائی ہو جائے۔ غصہ کی حالت میں مجھ پر جنون طاری ہو جاتا ہے اور مجھے کچھ پتا نہیں ہوتا کہ میں کیا کہہ رہی ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ گھر والے میرے معاملہ میں نہیں بولتے اور میں وہی کرتی ہوں جو میرا دل چاہتا ہے۔

دوسرے دن یونیورسٹی میں صفدر سے ملاقات ہوئی تو میں نے اسے امی سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتا دیا جسے سن کر وہ بھی پریشان ہو گیا لیکن میں نے اسے تسلی دی کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ وہی ہوگا جو میں چاہوں گی۔ میری بات سن کر اسے کچھ سکون ہو گیا لیکن وہ اپنی پریشانی نہ چھپا سکا اور بولا۔ "اب یہ سلسلہ شروع ہو گیا ہے تو تمہارے لیے اور رشتے بھی آئیں گے۔ تم کس کس کو منع کرو گی؟"

"اس کا صرف ایک ہی حل ہے اور وہ یہ کہ امتحانوں کے فوراً بعد تم اپنے گھر والوں کو ہمارے یہاں بھیج دو تاکہ ہمارا رشتہ طے ہو جائے پھر کوئی خطرہ نہیں رہے گا۔"

"جب تک مجھے جاب نہیں مل جاتی۔ میں اپنے گھر میں یہ بات کیسے کہہ سکتا ہوں۔"

"یہ تمہارا مسئلہ ہے۔ ایک پارٹی کو تو میں نے ٹال دیا لیکن اگر اس سے بھی زیادہ مضبوط پارٹی آ گئی تو میرے پاس انکار کا کوئی جواز نہیں ہوگا۔"

میری بات سن کر صفدر کا منہ لٹک گیا اور وہ روتی صورت بناتے ہوئے بولا۔ "ایسی دل دہلانے والی باتیں مت کرو۔ میں تمہارے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔"

"فلمی ڈائیلاگ بولنے کی بجائے کوئی عملی قدم اٹھاؤ۔"

"مثلاً قطعی؟"

"مثلاً یہ کہ تم اپنی والدہ کو میرے بارے میں بتا دو، اگر تم انہیں قائل کرنے میں کامیاب ہو گئے تو ہو سکتا ہے کہ وہ کوئی بہتر حل نکال سکیں۔"

"جب تک پڑھائی مکمل نہ ہو جائے۔ میں ایسی بات منہ سے نہیں نکال سکتا۔ سب میرا مذاق بنائیں گے۔"

ایک طرح سے وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ جب تک وہ اپنے پیروں پر کھڑا نہ ہو جائے۔ اسے شادی کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہیے۔ اس لیے میں نے بھی اپنی بات پر زور نہیں دیا اور وقتی طور پر خاموشی اختیار کرلی پھر مجھے یاد آیا کہ امی نے اس سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ کسی دن ہمارے گھر آ جائے۔ امی اس سے ملنا چاہتی ہیں۔ وہ اپنی عادت کے مطابق ٹال مٹول کرنے لگا۔ اس پر مجھے غصہ آ گیا اور میں نے تڑخ کر کہا۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم دنیا میں کیا کرو گے۔ ہر معاملہ میں پیچھے ہٹ جاتے ہو۔"

"یہ بات نہیں ہے سیما۔" وہ سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔ "مجھے ان کے سامنے آتے ہوئے شرم آئے گی۔ تم خود سوچو... کہ یہ قبل از وقت نہیں ہوگا؟"

"بالکل نہیں۔ بہت سے لوگوں کی شادیاں بچپن میں ہی طے ہو جاتی ہیں۔ ہم تو پھر بھی عاقل بالغ ہیں۔"

اس کے بعد وہ کچھ نہیں بولا۔ اس کی پہلی خوبی مجھے پسند تھی کہ وہ تھوڑی سی بحث کے بعد میری بات مان جاتا تھا۔ ویسے تو اس میں اور بھی کئی خوبیاں تھیں جن کی وجہ سے

وہ بڑی تیزی سے میرے قریب آیا تھا۔ میں ہمیشہ سے الگ تھلگ اور اپنی دنیا میں مگن رہنے والی ہوں۔ کالج میں بھی چند لڑکیوں کے سوا میری کسی سے دوستی نہیں تھی۔ بلکہ دوستی کیا اسے میل جول کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ یونیورسٹی میں داخلہ لینے کے بعد میری یہی روش برقرار رہی۔ حالانکہ یہاں کا ماحول کالج سے بالکل مختلف تھا۔ میں نے دیکھا کہ پہلے روز ہی کلاس میں لڑکے لڑکیوں کے گروپ بن گئے تھے۔ وہ سب ایک ساتھ کینٹین جاتے مختلف تقریبات میں شرکت کرتے اور کلاس میں بھی اکٹھے ہی آتے۔ جبکہ میں کسی گروپ میں شامل نہیں ہوئی تھی۔ مجھے تنہا رہنا پسند تھا اور شاید اسی لیے کسی نے مجھے اپنے گروپ میں شمولیت کی دعوت نہیں دی تھی۔

صفدر سے میری دوستی کی ابتدا بڑے ڈرامائی انداز میں ہوئی۔ ہوا یوں کہ میں ایک کتاب ایشو کروانے لائبریری گئی تو کاؤنٹر پر موجود لڑکی نے بتایا کہ وہ کتاب کچھ دیر پہلے ہی ایشو ہوگئی ہے یہ کہہ کر اس نے صفدر کی جانب اشارہ کردیا جو اس وقت کاؤنٹر پر موجود تھا۔ لڑکی کا جواب سن کر مجھے بہت مایوسی ہوئی کیونکہ مجھے اس سے نوٹس بنانا تھے اور صفدر کو کتاب ایشو ہونے کا مطلب تھا کہ پندرہ دن سے پہلے اس کی واپسی نہ ہوتی اور مجھے اتنا عرصہ انتظار کرنا پڑتا۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ اتنی بڑی لائبریری میں کیا یہ ایک ہی کتاب تھی۔ اس لیے میں نے حجت تمام کرنے کے لیے اس لڑکی سے کہا۔ ”دیکھیے۔ مجھے اس کتاب کی سخت ضرورت ہے۔ اگر آپ کے پاس دوسری ہو تو مجھے دے دیں۔“

وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ”اگر ہوتی تو پہلے ہی دے دیتی۔ دراصل آپ کو آنے میں دیر ہوگئی۔ یہ سب کتابیں ایشو ہوچکی ہیں۔ یہ آخری تھی وہ بھی گئی۔“

صفدر وہیں کھڑا ہماری باتیں سن رہا تھا۔ اس نے میری طرف کتاب بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ آپ رکھ لیں۔ جب کام ختم ہوجائے تو واپس کردیجیے گا۔“

”لیکن۔ لیکن آپ کو بھی تو اس کی ضرورت ہوگی۔“ میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

”آپ میری فکر نہ کریں۔ میں کسی دوسرے لڑکے سے شیئر کرلوں گا۔“

مجھے کسی کا احسان لینا پسند نہیں تھا لیکن مجبوراً مجھے وہ کتاب لینا پڑی ورنہ میں نوٹس نہیں بنا سکتی تھی۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔ ”میں دو تین دن میں آپ کو یہ کتاب واپس کردوں گی۔“

”کوئی بات نہیں، آپ اطمینان سے اپنا کام کریں مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔“

اس کے جانے کے بعد بہت دیر تک اس کے بارے میں سوچتی رہی۔ واقعی وہ ایک مخلص انسان تھا ورنہ آج کل کون کسی کے بارے میں سوچتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کے سینے میں ایک دردمند دل بھی تھا۔ اسی لیے اس نے میری پریشانی کو محسوس کرتے ہوئے وہ کتاب میرے حوالے کردی۔ اس سے پہلے میں نے کسی لڑکے کے بارے میں اس طرح نہیں سوچا تھا۔ نہ جانے کیوں وہ مجھے ایک دم ہی اچھا لگنے لگا۔

میں نے وعدہ کے مطابق تین دن میں اپنا کام مکمل کرکے وہ کتاب اسے واپس کرنا چاہی تو وہ بولا۔ ”اسے تم اپنے پاس ہی رکھو۔ بعد میں بھی اس کی ضرورت پیش آئے گی۔“

وہ ایک ہی جست میں آپ سے تم پر آگیا۔ مجھے تھوڑی سی حیرت تو ہوئی لیکن اس کا تم کہنا اچھا لگا۔ ویسے بھی ہم کلاس فیلوز تھے۔ ہمارے درمیان آپ جناب کا تکلف کچھ عجیب سا لگتا تھا۔ میں نے بھی اسی لہجے میں کہا۔ ”پھر تم کیا کروگے؟“

”میری فکر مت کرو۔ میرا کام چل رہا ہے۔ اگر زیادہ مسئلہ ہوا تو دو چار دن کے لیے تم سے لے لوں گا۔“ میں سمجھ گئی کہ اس بہانے وہ مجھ سے تعلق استوار کرنا چاہ رہا ہے۔ میں نے وہ کتاب اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”نہیں بھئی۔ مجھے اچھا نہیں لگے گا کہ تم اپنی ضرورت کے لیے بار بار میرے پاس دوڑے ہوئے آؤ۔“

”اوہ“ وہ جھنجلاتے ہوئے بولا۔ ”تم نے تو اس کتاب کو اپنی انا کا مسئلہ بنالیا ہے۔ چلو اگر تمہیں اچھا نہیں لگتا تو نہیں آؤں گا تمہارے پاس، کسی اور سے لے کر کام چلالوں گا۔ اب اس ٹاپک پر کوئی بات نہیں ہوگی۔ چلو کینٹین چلتے ہیں۔ چائے کا موڈ ہو رہا ہے۔“

میں نے انکار کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اس نے مجھ پر احسان کیا تھا اور میں اتنی بد اخلاق نہیں تھی کہ اس کی پیشکش رد کردیتی۔ ویسے بھی یونیورسٹی کے ماحول میں یہ کوئی معیوب بات نہیں تھی۔ زیادہ تر لڑکے لڑکیاں ایک ساتھ گھومتے پھرتے تھے۔ اس نے کینٹین پہنچ کر چائے اور سموسوں کا

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

آرڈر دیا پھر کہنے لگا۔ ''میں دیکھ رہا ہوں کہ تم زیادہ تر تنہا ہی رہتی ہو۔ میں نے کبھی تمہیں کسی کلاس فیلو سے باتیں کرتے نہیں دیکھا اور نہ ہی تم نے ابھی تک اپنا کوئی دوست بنایا ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟''

''کوئی خاص وجہ نہیں ہے۔ بس میں شروع ہی سے ایسی ہوں۔ کالج میں بھی کسی سے دوستی نہیں تھی۔ مجھے تنہا رہنا اچھا لگتا ہے۔''

''یہ کوئی اچھی علامت تو نہیں ہے۔ تم نے کتابوں میں پڑھا ہوگا کہ انسان ایک سماجی حیوان ہے۔ ہم جس ماحول میں رہتے ہیں۔ وہاں ایک دوسرے سے میل جول رکھنا ایک سماجی ضرورت ہے۔ وقت پڑنے پر انسان ہی انسان کے کام آتا ہے۔''

''تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟''

''دیکھو سیما تمہیں اس یونیورسٹی میں چار سال گزارنے ہیں۔ یہ ایک طویل سفر ہے جو تم تنہا طے نہیں کرسکتیں۔''

''پھر میں کیا کروں؟''

''تنہائی کے خول سے باہر نکلو۔ لوگوں سے میل جول بڑھاؤ تمہارے اردگرد دو چار لوگ ایسے ہونے چاہئیں جو ضرورت پڑنے پر تمہاری مدد کے لیے آگے آسکیں۔''

''لیکن میں تو یہاں کسی کو نہیں جانتی۔'' میں نے کہا۔ ''تم پہلے شخص ہو جس سے میں باتیں کررہی ہوں۔''

''ہمارا چار لوگوں کا ایک گروپ ہے۔ اس میں دو لڑکے اور دو لڑکیاں ہیں۔ تم اس میں شامل ہوجاؤ۔ بہت جلد تمہیں اندازہ ہوجائے گا کہ گروپ میں رہنے کے کتنے فائدے ہیں۔''

میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''ایک شرط پر میں تمہاری پیشکش قبول کرسکتی ہوں۔''

''وہ کیا؟''

''گروپ کے لوگوں نے میری دوستی صرف یونیورسٹی تک ہی محدود رہے گی۔ اگر تم لوگوں نے باہر کوئی پروگرام بنایا مثلاً سالگرہ، پکنک، کسی ہوٹل میں لنچ یا ڈنر تو اس میں شرکت نہیں کروں گی اور نہ ہی کسی کے گھر تقریبات میں جاؤں گی۔''

''جیسے تمہاری مرضی۔ ہم تمہیں اس کے لیے مجبور نہیں کریں گے۔''

دوسرے دن اس نے مجھے گروپ کے دوسرے لوگوں سے متعارف کروایا۔ وہ سب میری ہی کلاس کے اسٹوڈنٹ تھے۔ عامر، شفیق لبنیٰ اور سعدیہ ان چاروں نے میرا بہت خوش دلی سے استقبال کیا۔ عامر اور شفیق کم گو تھے اور دیکھنے میں ہی پڑھاکو لگتے تھے۔ لبنیٰ بھی سنجیدہ دکھائی دے رہی تھی لیکن سعدیہ ان چاروں میں سب سے زیادہ شوخ اور باتونی تھی۔ لگتا تھا کہ میرے آنے کی خوشی سب سے زیادہ اسے ہی ہوئی تھی۔ مجھ سے مصافحہ کرتے ہوئے بولی۔ ''میری بڑی خواہش تھی کہ تم سے دوستی کروں۔ جب بھی تمہیں دیکھتی۔ یہی خیال آتا کہ کاش تم ہمارے گروپ میں آجاؤ۔''

''تمہیں مجھ میں ایسی کیا خاص بات نظر آئی جو تم مجھ سے دوستی کرنا چاہ رہی تھیں۔''

''خاص بات کا تو مجھے پتا نہیں۔ بس تم مجھے پہلے دن سے ہی اچھی لگیں۔''

اس روز صفدر نے پورے گروپ کو اپنی طرف سے ٹریٹ دی۔ اس گروپ میں شامل ہونے کا یہ فائدہ ہوا کہ پڑھائی کے سلسلے میں ان لوگوں سے بہت مدد ملنے لگی۔ اگر کسی روز میں کوئی کلاس نہ لے پاتی تو ان میں سے کوئی مجھے اپنے نوٹس دے دیتا۔ ٹیسٹ وغیرہ کی تیاری بھی ہم ساتھ ہی بیٹھ کر کیا کرتے تھے۔ البتہ اس دوران میں نے یہ بات محسوس کی کہ صفدر کو پڑھائی سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ وہ عموماً صبح کو دیر سے یونیورسٹی آتا۔ اس وقت تک اس کے دو تین پیریڈ نکل چکے ہوتے تھے۔ اس کے بعد بھی وہ اِدھر اُدھر گھومتا رہتا اور بمشکل تمام ایک دو پیریڈ ہی اٹینڈ کرپاتا تھا۔ اس کے تعلقات کا دائرہ بھی وسیع ہوتا جارہا تھا اور دوسرے ڈیپارٹمنٹ کے لڑکوں سے بھی اس کی دوستی ہوگئی تھی۔ اس کے باوجود وہ ہر امتحان میں پاس ہوجاتا تھا۔

ایک دو مرتبہ میں نے سوچا کہ اسے ٹوکوں لیکن مجھے دوسروں کے معاملے میں دخل اندازی کرنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ ویسے بھی وہ میرے ساتھ بہت مخلص تھا اور میرے بہت سے کام کردیتا تھا۔ مجھے اس سے بڑی ڈھارس تھی۔ اس لیے میں اس سے کوئی ایسی بات نہیں کرنا چاہتی تھی جو اسے ناگوار گزرے۔ رفتہ رفتہ ہماری بے تکلفی بڑھتی گئی اور ہم گروپ کے علاوہ اکیلے میں بھی ملنے لگے۔

تیسرے سمسٹر تک ہم ایک دوسرے کے بہت قریب آچکے تھے۔ اب گروپ سے ہمارا تعلق برائے نام رہ گیا تھا اور ہم دونوں زیادہ وقت ایک ساتھ ہی گزارتے۔

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

انہی دنوں اس کے والد بیمار پڑ گئے۔ انہیں کینسر ہو گیا تھا۔ میں گروپ کے لوگوں کے ساتھ انہیں دیکھنے دو تین مرتبہ اسپتال گئی۔ وہیں اس کی والدہ اور بھائی بہنوں سے بھی ملاقات ہوئی۔ وہ سب پڑھے لکھے اور مہذب لوگ تھے۔ اس کی والدہ شوہر کی بیماری کی وجہ سے بہت پریشان تھیں پھر بھی ہم لوگوں سے بڑی اچھی طرح ملیں۔ مجھ سے انہوں نے خاص طور پر بہت شفقت کا برتاؤ کیا۔ چند روز بعد اس کے والد کا انتقال ہو گیا۔ ہم لوگ اس کے گھر تعزیت کے لیے گئے تو وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ ہم لوگ تسلی دینے کے سوا کیا کر سکتے تھے کچھ دیر بیٹھ کر واپس آ گئے۔

وقت بہت بڑا مرہم ہے۔ سارے زخم مندمل کر دیتا ہے۔ صفدر نے بھی چند روز باپ کا سوگ منایا پھر یونیورسٹی آنے لگا۔ لیکن اب اس کے معمولات میں خاصی تبدیلی آ چکی تھی اور وہ پڑھائی کے بارے میں پوری طرح سنجیدہ ہو گیا تھا۔ شاید احساس ہو گیا تھا کہ اب اس کے پاس وقت ضائع کرنے کی گنجائش نہیں ہے اور اسے جلد از جلد تعلیم مکمل کر کے اپنے پیروں پر کھڑے ہو جانا چاہیے۔

گو کہ ہم دونوں کے درمیان ابھی تک کوئی ایسی بات نہیں ہوئی تھی جس سے اس کے دلی جذبات کا اندازہ لگایا جا سکتا لیکن میں اسے اپنے سے بہت قریب محسوس کرنے لگی تھی۔ اتنا عرصہ ساتھ رہنے کے بعد اس کے بارے میں اچھی طرح جان گئی تھی اور اس کے ..... عادت و اطوار کا خوب اندازہ ہو گیا تھا۔ وہ میری زندگی میں آنے والا پہلا مرد تھا۔ اس لیے فطری طور پر میں اس کے نزدیک ہوتی چلی گئی۔ ایک طرح سے اس کی عادی ہوتی جا رہی تھی۔ وہ میرے سارے کام کیا کرتا تھا اور مجھے بھی اس میں مزہ آتا تھا۔ یہاں تک کہ جو کام خود کر سکتی وہ بھی اس کے ذمہ لگا دیتی۔ جس دن وہ نہ آتا تو بے چین ہو جاتی۔ دن میں چار پانچ مرتبہ اس سے فون پر بات کرتی۔ دل چاہتا تھا کہ وہ ہر وقت میری نظروں کے سامنے رہے مجھ سے باتیں کریں، دوڑ دوڑ کر میرے سارے کام نمٹائے نہ جانے وہ بھی ایسا ہی سمجھتا تھا یا نہیں۔

پھر ایک دن اس کے دل کی بات زبان پر آ ہی گئی۔ اس روز موسم بہت خوشگوار تھا۔ صبح سے ہی آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ لگتا تھا کہ بہت زور کی بارش ہوگی۔ امی نے یونیورسٹی جانے سے منع کیا لیکن میں نہ مانی۔ امتحان نزدیک آ رہے تھے اور میں کوئی پیریڈ مس کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے میرا یونیورسٹی جانا بہت ضروری تھا۔ اس کے باوجود امی نے تاکید کی کہ میں بارش شروع ہوتے ہی گھر کے لیے روانہ ہو جاؤں ورنہ سڑکوں پر پانی جمع ہو گیا تو بسیں بند ہو جائیں گی۔

دوپہر تک بارش نہیں ہوئی تو میں مطمئن ہو گئی۔ کلاسز ختم ہو چکی تھیں لیکن مجھے کچھ نوٹس بنانا تھے اس لیے لائبریری چلی گئی۔ اس کے بعد میں اپنے کام میں یوں مگن ہوئی تو وقت گزرنے کا خیال ہی نہیں رہا۔

تقریباً دو گھنٹے بعد میں فارغ ہوئی۔ اپنے کاغذات سمیٹے اور گھر جانے کی تیاری کرنے لگی۔ باہر آ کر دیکھا تو موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ میرے تو اوسان خطا ہو گئے۔ گھڑی پر نظر ڈالی۔ پوائنٹ کی بس بھی نکل چکی تھی اور اس... بارش میں سلور جوبلی گیٹ تک جانا تقریباً ناممکن تھا۔ ایسے میں مجھے صفدر کا خیال آیا۔ میں نے پرس سے موبائل نکال کر اس کا نمبر ملایا تو وہ بولا۔ ''تم کہاں ہو سیما؟ میں کب سے تمہیں تلاش کر رہا ہوں۔''

''لائبریری میں۔'' میں نے کہا۔ ''تم ابھی تک گھر نہیں گئے؟''

''نہیں ...... بارش رکنے کا انتظار کر رہا ہوں۔ اب تم کیسے جاؤ گی۔ پوائنٹ کی بس تو نکل گئی۔''

''میں بھی یہی سوچ رہی ہوں۔ اس لیے تمہیں فون کیا ہے۔''

''اچھا تم وہیں ٹھہرو۔ میں آ رہا ہوں۔''

پانچ منٹ بعد وہ بھیگتا ہوا آیا اور بولا۔ ''بارش ہلکی ہو گئی ہے۔ میں تمہیں سلور جوبلی گیٹ تک چھوڑ دیتا ہوں۔ وہاں سے تمہیں کوئی بس مل جائے گی۔''

اس کے پاس بائیک تھی۔ میں پہلے ہچکچائی لیکن وہاں سے نکلنا بھی تھا۔ اس لیے مجبوراً بیٹھنا پڑ گیا۔ ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی اور اس رومان پرور موسم میں اس کی قربت نے مجھ پر سحر طاری کر دیا تھا لیکن یہ سفر چند منٹوں میں ہی ختم ہو گیا۔ سلور گیٹ پہنچے تو بس اسٹاپ پر سناٹا چھایا ہوا تھا اور سڑک پر ٹریفک برائے نام تھی۔ دس پندرہ منٹ انتظار کرنے کے بعد بھی کوئی بس نہ آئی تو میں پریشان ہو گئی۔ وہ بھی کسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس نے کہا۔ ''اب مزید وقت ضائع کرنا بے کار ہے۔ تمہیں بائیک پر ہی جانا ہوگا۔''

میں سوچ میں پڑ گئی۔ کیا اس کے ساتھ بائیک پر بیٹھنا مناسب ہوگا یونیورسٹی کی بات اور تھی لیکن شہر کی سڑکوں پر

کوئی بھی دیکھ سکتا ہے۔ عزیز، رشتے دار یا کوئی محلے والا، پھر میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ میں نے دوپٹے کا پلّو اٹھا کر اسے نقاب کی طرح چہرے پر لپیٹ لیا۔ اب اگر کوئی دیکھ بھی لیتا تو مجھے نہیں پہچان سکتا تھا۔ صفدر میرا حلیہ دیکھ کر ہنسنے لگا اور بولا۔ ''دیکھا تم نے پردہ کرنے کے کتنے فائدے ہیں۔''

میں نے جل کر جواب دیا۔ ''ہاں سوچ رہی ہوں کل سے حجاب اور عبایا پہننا شروع کردوں۔''

بارش اب تھم چکی تھی لیکن سڑکوں پر کافی پانی جمع ہوگیا تھا وہ بڑی احتیاط سے بائیک چلا رہا تھا لیکن پھر بھی کہیں کہیں پانی کے چھینٹے اڑ کر شلوار کو بھگو دیتے۔ راستے میں ایک ریسٹورنٹ کے باہر اس نے بائیک روک لی اور بولا۔ ''مجھے چائے کی شدید طلب ہورہی ہے۔ اگر تم کہو تو دس منٹ کے لیے یہاں بیٹھ جائیں۔''

میں نے گھڑی دیکھی اور کہا۔ ''کافی دیر ہوگئی ہے۔ امی پریشان ہورہی ہوں گی۔''

''تم انہیں فون کرکے بتادو۔ دیر تو ویسے بھی ہوگئی ہے۔ دس منٹ سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔''

میں اسے انکار نہیں کرسکتی تھی۔ لہٰذا میں نے امی کو فون کرکے گول مول لفظوں میں بات کی اور اس کے ساتھ ریسٹورنٹ میں چلی آئی۔ اس نے بیرے کو بلا کر چائے اور سینڈوچ کا آرڈر دیا پھر بولا۔ ''زندگی میں آج پہلی بار بائیک چلانے کا مزہ آیا ہے۔''

''آج ایسی کیا خاص بات ہوگئی؟'' میں نے انجان بنتے ہوئے کہا۔ حالانکہ میں سمجھ گئی تھی کہ اس کا اشارہ کس جانب ہے۔

''تم جو ساتھ بیٹھی ہوئی تھیں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ہواؤں میں اڑا جارہا ہوں۔''

''اوہ تو یہ بات ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم کہو تو میں روزانہ تمہارے ساتھ بائیک پر بیٹھنے کے لیے تیار ہوں۔''

''لیکن کب تک۔'' وہ سرد آہ بھرتے ہوئے بولا۔ ''یہ ساتھ تو صرف یونیورسٹی کی حد تک ہے۔ اس کے بعد تو ہمارے راستے جدا ہوجائیں گے۔''

''ہاں یہ تو ہے۔'' میں نے کہا۔

''کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ یہ ساتھ امر ہوجائے۔'' وہ جذباتی ہوتے ہوئے بولا۔

میرے دل کی دھڑکن تیز ہونے لگی۔ مجھے جس لمحے کا انتظار تھا۔ وہ آن پہنچا تھا۔ میں نے اپنے دل کی بے ترتیب دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''کیا مطلب؟''

''مطلب بالکل صاف اور واضح ہے۔ میں تمہیں ہمیشہ کے لیے اپنا بنانا چاہتا ہوں۔ تم مجھے شروع دن سے ہی اچھی لگی تھیں۔ میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں اور تمہارے علاوہ کسی اور کے ساتھ زندگی گزارنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔''

''اوہ۔ تم نے تو ایک ہی سانس میں اتنی ساری باتیں کرڈالیں۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہاری کس بات کا جواب دوں۔''

''زیادہ لمبی چوڑی بات کرنے کی ضرورت نہیں۔ مجھے صرف ہاں یا نہ میں جواب چاہیے۔ بولو کیا تم میری شریکِ سفر بننا پسند کروگی؟''

میں نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔ ''تم اتنے اچھے ہو کہ تمہاری کسی بات پر انکار نہیں کرسکتی۔''

''اوہ تھینک یو سیما۔'' وہ خوش ہوتے ہوئے بولا۔ ''مجھے یقین تھا کہ تم مایوس نہیں کروگی۔''

بیرا چائے اور دیگر لوازمات لے کر آیا۔ میں نے جلدی جلدی چائے پی اور کہا۔ ''اب چلنا چاہیے۔ دیر ہورہی ہے۔''

اس طرح ہماری محبت کی ابتدا ہوئی۔ اب ہمارے درمیان کوئی جھجک باقی نہیں رہی تھی۔ اس لیے زیادہ آزادی سے ملنے لگے۔ گروپ کے لوگوں سے ہمارا تعلق برائے نام رہ گیا تھا۔ زیادہ ... وقت ہم ایک ساتھ ہی گزارتے۔ وہ جب بھی بائیک پر آتا تو کلاس ختم ہونے کے بعد اس کے ساتھ گھومنے چلی جاتی۔ ہم گھنٹوں بیٹھ کر مستقبل کی پلاننگ کرتے۔ اس کا ارادہ تعلیم مکمل کرنے کے بعد ملک سے باہر جانے کا تھا لیکن میں اس کے خلاف تھی۔ میرا کہنا تھا کہ آدمی کو اپنے ہی ملک میں رہ کر حالات بہتر بنانے کی کوشش کرنا چاہیے۔ باہر ملکوں میں رہنے والے کس کرب اور آزمائشوں سے گزرتے ہیں یہ ان کا دل ہی جانتا ہے۔ اپنے پیاروں سے دوری، اجنبی ماحول میں شب و روز گزارنا۔ فیملی کے مسائل بچوں کی پرورش اور تعلیم کا مسئلہ، ہزاروں بکھیڑے جان کو لگے رہتے ہیں۔

میرے بے حد اصرار پر وہ امی سے ملنے کے لیے تیار ہوگیا لیکن اس نے یہ شرط رکھی کہ وہ ایسے وقت آئے گا جب

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

ابو گھر پر نہیں ہوں گے۔ اس کی یہ شرط سن کر مجھے غصہ آ گیا اور میں نے کہا۔ ”یہ کیا بے تکی بات کہہ دی تم نے؟“

”سمجھا کرو سیما۔ فی الحال میں تمہارے ابو کے سوالوں کا جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔“

”سوالات تو امی بھی کرسکتی ہیں۔ ان کا جواب ہے تمہارے پاس؟“

”انہیں تو میں کسی نہ کسی طرح قائل کرلوں گا لیکن تمہارے ابو سے نمٹنا میرے بس کی بات نہیں، ملازمت ملنے کے بعد ان سے ملنے آؤں گا۔“

”ٹھیک ہے۔ تم امی سے ہی مل لو۔“ میں نے ہار مانتے ہوئے کہا۔ ”انہیں بھی اطمینان ہوجائے گا۔“

میں نے امی کو سمجھا دیا تھا کہ وہ صفدر سے زیادہ سوال جواب نہ کریں۔ اس کے بارے میں جو بتا چکی ہوں وہی کافی ہے۔ اس لیے جب وہ آیا تو امی نے اس سے ایسی کوئی بات نہیں کی جس کا جواب دینے میں اسے مشکل ہوتی۔ وہ کچھ دیر بیٹھا امی کی باتوں پر ہوں ہاں کرتا رہا۔ اس نے صرف چائے پی۔ امی نے اس کے لیے جو لوازمات تیار کیے تھے۔ اس نے انہیں ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ اس کے جانے کے بعد امی نے مایوسانہ انداز میں میری طرف دیکھا اور بولیں۔ ”مجھے نہیں لگتا کہ یہ لڑکا تمہارے لیے مناسب رہے گا۔“

”کیوں؟ اس میں کیا خرابی نظر آئی آپ کو؟“ میں نے تنک کر کہا۔ ”ذرا میں بھی تو سنوں کہ آپ نے اس میں ایسا کیا دیکھ لیا جو مجھے نظر نہیں آرہا۔“

”آج کل ہر لڑکی یہ چاہتی ہے کہ اس کا ہونے والا شوہر مالی طور پر مستحکم ہو۔ اپنا کاروبار یا اچھی ملازمت، ذاتی گھر، گاڑی، وہ ایک آسائش بھری زندگی کا خواب دیکھتی ہے۔ مجھے افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ صفدر کے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ ابھی وہ پڑھ رہا ہے۔ کچھ پتا نہیں کہ تعلیم مکمل ہونے کے بعد اسے جاب ملنے میں کتنا وقت لگے گا۔ بھائی کے گھر میں رہتا ہے۔ ایک پرانی موٹر سائیکل اس کے استعمال میں ہے۔ نہیں بھئی۔ میں تو اس رشتے کے حق میں نہیں ہوں۔ آگے تمہاری مرضی۔“

”ایسا کچھ نہیں ہے امی۔ آپ بلاوجہ گھبرا رہی ہیں۔ میں نے سب سوچ لیا ہے۔ ہم دونوں جاب کریں گے پہلے سال میں گاڑی آجائے گی۔ پھر کوئی اپارٹمنٹ بک کروالیں گے۔ اللہ نے چاہا تو تین چار سال میں مکان بھی اپنا ہوجائے گا۔ ویسے صفدر بالکل ہی کنگال نہیں ہے۔ اس کے اکاؤنٹ میں اچھی خاصی رقم موجود ہے۔“

اس کے بعد امی خاموش ہوگئیں لیکن ان کے چہرے کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ وہ میرے فیصلے سے خوش نہیں ہیں۔ دوسرے دن یونیورسٹی میں صفدر سے ملاقات ہوئی تو اس نے مجھ سے پہلا سوال یہی کیا۔ ”ہاں بھئی۔ کیسا رہا انٹرویو؟ تمہاری امی نے میرے بارے میں کیا رائے قائم کی؟“

”ویسے تو سب ٹھیک ہے۔ بس وہ تھوڑا سا تمہارے مستقبل کے بارے میں متفکر ہیں۔ یہی کہہ رہی تھیں کہ تمہیں سیٹ ہونے میں کم از کم چار پانچ سال تو لگ ہی جائیں گے۔“

”پھر تم نے کیا کہا۔“

”وہی جو سوچ رکھا ہے۔ میں نے ان سے کہہ دیا کہ ہم دونوں جاب کریں گے اور چند سالوں میں گاڑی، مکان سب کچھ کرلیں گے۔“

”پلان تو اچھا ہے بشرطیکہ تعلیم مکمل ہوتے ہی ہمیں نوکری مل جائے۔ تم تو جانتی ہو کہ آج کل یہ بھی ایک مسئلہ ہے۔“

”ہمارا کام کوشش کرنا ہے۔ نتیجہ اللہ پر چھوڑ دو۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔“

امتحان قریب آرہے تھے۔ اس لیے میں سب کچھ بھول کر پڑھائی کی طرف متوجہ ہوگئی۔ میں نے صفدر سے بھی کہا کہ وہ فضول کاموں میں وقت ضائع کرنے کی بجائے امتحان کی تیاری کرے کیونکہ اسی پر اس کے مستقبل کا دارومدار تھا۔ میری بات اس کی سمجھ میں آگئی اور وہ سنجیدگی سے امتحان کی تیاری کرنے لگا۔ اب ہمارے درمیان برائے نام ہی گفتگو ہوتی اور معاملہ ہائے ہیلو تک محدود ہوکر رہ گیا تھا۔

ہم لوگ آخری پرچہ دے کر باہر آئے تو وہ مجھے اپنے ساتھ کینٹین لے کر چلا گیا۔ ہم کافی دیر تک مستقبل کی منصوبہ بندی کرتے رہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ بھائی نے ایک دو جگہ ملازمت کی بات کی ہے۔

بس نتیجہ کا انتظار ہے۔ اس کے بعد اس کا میٹر چل پڑے گا۔ یہ سن کر مجھے اطمینان ہوگیا۔ ایک دفعہ اس کی ملازمت شروع ہوجاتی۔ اس کے بعد میں زیادہ زور و شور سے اس کے حق میں بول سکتی تھی۔

چائے ختم کرنے کے بعد اس نے کہا۔ ”آج ہمارا

یونیورسٹی میں آخری دن ہے۔ اس کے بعد ملاقات کس طرح ہوگی!"

"یہیں یونیورسٹی میں۔" میں نے اطمینان سے جواب دیا۔

"کیا مطلب؟" وہ حیران ہوتے ہوئے بولا۔ "اب ہم یہاں کیوں آئیں گے؟"

"دیکھو بھئی۔ میں نے اس مسئلے پر بہت غور کیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ آج کل ایک ڈگری کافی نہیں اگر ہم اپنی تعلیمی قابلیت بڑھالیں تو اچھی ملازمت مل سکتی ہے۔"

"میں اب بھی نہیں سمجھا کہ تم کیا کہنا چاہ رہی ہو؟"

"یونیورسٹی میں شام کی کلاسیں بھی ہوتی ہیں اگر ہم کسی کورس میں داخلہ لے لیں تو ملازمت کرنے کے ساتھ ساتھ ایک اور ڈگری بھی مل سکتی ہے۔"

وہ ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔ "مجھے تو معاف ہی رکھو۔ میں باز آیا ایسی پڑھائی سے۔ خدا خدا کر کے تو اس امتحان سے فراغت ہوئی ہے۔"

"بس تو پھر ٹھیک ہے۔ میں بھی گھر بیٹھ جاتی ہوں پھر تم میری شکل دیکھنے کو بھی ترس جاؤ گے۔"

"خدا کے واسطے ایسا غضب نہ کرنا۔ تمہیں دیکھے بغیر تو مجھے ایک دن بھی چین نہیں آئے گا۔"

"پھر کیا کروں۔" میں نے جل کر کہا۔ "تم سے ملنے کسی ریسٹورنٹ، پارک یا کسی پبلک مقام پر تو آ نہیں سکتی۔ اوّل تو مجھے ان جگہوں پر ملنا پسند نہیں اور دوسرے یہ کہ گھر سے کیا بہانہ بنا کر نکلوں گی۔ یہی ایک راستہ ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے ملنے کی کوئی اور صورت نہیں۔"

میری بات سن کر وہ لاجواب ہوگیا اور اس نے شام کی کلاس میں داخلہ لینے پر رضامندی ظاہر کر دی۔

کچھ دنوں بعد نتیجہ بھی آ گیا۔ ہم دونوں ہی پاس ہوگئے لیکن میرے نمبر اس سے کہیں زیادہ اچھے آئے تھے۔ شام کی کلاسیں شروع ہونے میں ابھی کچھ وقت باقی تھا۔ اس لیے میں نے ملازمت کی تلاش شروع کر دی۔

روزانہ نیٹ کھول کر بیٹھ جاتی اور مختلف سائٹس پر اپنے مطلب کی ملازمت تلاش کرتی۔ اس طرح میں نے اتوار کا اخبار بھی دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ جہاں کوئی جگہ نظر آتی۔ میں فوراً درخواست بھیج دیتی اور صفدر کو بھی فون کر کے اس کے بارے میں بتاتی۔ میرے کہنے پر وہ درخواست تو بھیج دیتا لیکن میں نے محسوس کیا کہ اسے ان ملازمتوں سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی بلکہ وہ سرکاری نوکری کے چکر میں تھا اسے دو تین جگہ سے انٹرویو کے لیے بلاوا آیا لیکن وہ نہیں گیا۔ اس پر میری اس سے فون پر خوب جھڑپ ہوئی اور میں نے پوچھا۔

"آخر کیا وجہ ہے کہ تم اتنے اچھے مواقع ضائع کرتے جا رہے ہو؟"

"دراصل بات یہ ہے سیما کہ میں پرائیویٹ ملازمت نہیں کرنا چاہتا۔ نو سے پانچ کی پابندی مجھ سے نہیں ہوگی۔"

"تو کیا تم سمجھتے ہو کہ سرکاری ملازمت میں گھر بیٹھے تنخواہ مل جاتی ہے۔"

"ہاں تقریباً ایسا ہی ہے۔ وہاں کوئی نہیں پوچھتا کہ کون کب آ رہا ہے۔ کب جا رہا ہے۔ بس باس سے سیٹنگ ہونی چاہیے۔ میں ایسے کئی لوگوں کو جانتا ہوں جو گیارہ بجے گھر سے نکلتے ہیں اور حاضری لگا کر ایک بجے واپس آ جاتے ہیں۔"

"پھر وہاں کام کس طرح ہوتا ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"کچھ بے وقوف ہیں جن کا کوئی والی وارث نہیں۔ ان پر کام کا بوجھ ڈال دیا جاتا ہے۔ باقی مزے کرتے ہیں۔"

"یہ تو سراسر نمک حرامی ہے۔ تم نے دیکھا نہیں کہ کرنسی نوٹوں پر کیا لکھا ہوتا ہے 'رزق حلال عین عبادت ہے۔'"

"نہ لکھا جائے تو بہتر ہے کیونکہ یہی نوٹ رشوت، اسمگلنگ، بھتہ خوری، لوٹ مار اور دیگر حرام کاموں میں استعمال ہوتے ہیں۔ لکھنے سے کیا ہوتا ہے۔ اصل بات تو نیت و عمل کی ہے۔"

یہ تو میں جانتی تھی کہ وہ ہمیشہ سے ہی آرام طلب اور مست واقع ہوا تھا۔ اسے صبح کو دیر سے اٹھنے کی عادت تھی۔ اس لیے گیارہ بجے کے بعد ہی یونیورسٹی آیا کرتا تھا اور اب یہ عادت اتنی پختہ ہوچکی تھی کہ اس کے لیے علی الصبح اٹھنا کوہ ہمالیہ سر کرنے کے مترادف تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ کسی پرائیویٹ ادارے میں ملازمت کرنے سے کترا رہا تھا۔

امتحان ختم ہوتے ہی امی نے ایک بار پھر میرا پیچھا لے لیا۔ وہ چاہ رہی تھیں کہ صفدر اپنے گھر والوں کو بھیج کر رشتہ طے کر لے تاکہ وہ بھی میری طرف سے

یکسو ہو جائیں۔ ان کا کہنا بھی ٹھیک ہی تھا کیونکہ میرا رشتہ مانگنے والوں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ اب تک تو امی ان سب لوگوں کو یہ کہہ کر ٹال رہی تھیں کہ پہلے میری پڑھائی مکمل ہو جائے پھر وہ اس بارے میں سوچیں گی لیکن میرے امتحان ختم ہو جانے کے بعد ان کے پاس کوئی بہانہ نہیں رہا تھا۔

''اب تک میں نے تمہارے باپ کو کسی رشتے کے بارے میں نہیں بتایا۔ خود ہی لوگوں کو ٹال رہی ہوں لیکن اب وہ بھی تمہاری شادی کے لیے فکرمند ہیں اگر انہوں نے اپنے طور پر کوئی فیصلہ کر لیا تو میں کچھ نہیں کر سکوں گی۔''

''آپ بے فکر رہیں۔ ایسا کچھ نہیں ہوگا۔'' میں نے کہا۔ ''ان کے خاندان میں میرے جوڑ کا کوئی لڑکا نہیں ہے۔ اس لیے وہ بھی یہی دعا کر رہے ہوں گے کہ میرے لیے جلد از جلد کوئی رشتہ آ جائے۔''

''یہ مت کہو۔ انہوں نے اپنے کئی جاننے والوں سے کہہ رکھا ہے۔ اگر ان میں سے کسی نے کوئی رشتہ بتا دیا تو کیا ہوگا۔''

''رشتے ... درختوں پر نہیں اگتے کہ آپ ہاتھ بڑھا کر توڑ لیں۔ یہ سب رسمی باتیں ہیں۔ آج کل کوئی کسی کے لیے اتنا تردد نہیں کرتا۔ اور اگر کوئی ایسی بات ہوئی تو میں صفدر کے گھر والوں کو بلا لوں گی۔''

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اب اسے اپنے گھر والوں کو بتانے میں کیا قباحت ہے۔ اس کی پڑھائی تو ختم ہو چکی ہے۔ نوکری بھی مل ہی جائے گی۔''

''وہ اسی دن کا انتظار کر رہا ہے۔ جیسے ہی اسے ملازمت ملی۔ وہ اپنے گھر والوں کو ہمارے یہاں بھیج دے گا۔''

اس کے بعد امی نے اس موضوع پر کوئی بات نہیں کی اور میں بھی پورے زور و شور سے ملازمت کی تلاش میں لگ گئی۔ کچھ ہی دنوں بعد مجھے ایک سرکاری کالج میں ایڈ لیکچرار کی ملازمت مل گئی۔ جس کا مستقبل قریب میں مستقل ہونے کا امکان تھا۔ مجھے اس جاب میں سب سے بڑا فائدہ یہ نظر آیا کہ اس کے اوقات کار بہت کم تھے۔ دو بجے چھٹی ہو جاتی تھی بلکہ زیادہ تر لوگ تو اپنی کلاسیں پڑھانے کے بعد ہی چلے جاتے تھے۔

اس کالج میں آنے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ صفدر سرکاری ملازمت کو کیوں ترجیح دیتا ہے۔

شاہد احمد دہلوی نے برِاعظم کی ایک ہزار سالہ موسیقی کا سہرا مسلمانوں کے سر سجاتے ہوئے لکھا ہے کہ ''ہند و پاک کی موجودہ تمام موسیقی مسلمانوں کی ساختہ، پرداختہ ہے۔ برِعظم کے علاقوں کی موسیقی مقامی لوک گیتوں سے آگے نہ بڑھ سکی۔ مسلمان فنکاروں نے اپنی عربی و عجمی موسیقی کو موجودہ موسیقی کے قالب میں ڈھال دیا اور اسے ایک علمی صورت دی۔ عہدِ اکبری میں میاں تان سین جن کا اصل نام عطا حسین خاں تھا، انہوں نے مسلم کلاسیکی موسیقی کو بامِ عروج تک پہنچایا۔'' سید عابد علی عابد فرماتے ہیں۔ ''میاں تان سین نے کلاسیکی سنگیت کو نیا رنگ، نئی حلاوت اور نیا بانکپن بخشا۔ انہوں نے راگوں میں نہایت دلکش تصرفات کیے اور یہ راگ ان تصرفات کے ساتھ اب ان کے نام سے منسوب ہے۔'' مثلاً میاں کی ملہار، میاں کی ٹوڈی لیکن جو راگ تان سین کا نام کلاسیکی سنگیت میں ہمیشہ زندہ رکھے گا وہ درباری ہے جسے سن کر بقول اکبر اعظم دل کی سوئی ہوئی تمنائیں جاگ اٹھتی تھیں اور بڑے بڑے کام کرنے والے ولولے بیدار ہوتے تھے۔

مرسلہ: نازش خاں۔ لاہور

یونیورسٹی میں شام کی کلاس کے داخلے ہوئے تو ہم دونوں نے ہی اپلائی کر دیا۔ مجھے ایم بی اے میں داخلہ مل گیا لیکن صفدر کے ٹیسٹ میں نمبر کم آئے لہٰذا اسے پبلک ایڈمنسٹریشن کا انتخاب کرنا پڑا۔ اس مضمون میں ماسٹرز کرنے کے بعد اسے سرکاری ملازمت ملنے میں آسانی ہوتی۔ اس لیے اسے ایم بی اے میں داخلہ نہ ملنے کا کوئی افسوس نہیں تھا۔ وہ بڑی سنجیدگی سے ملازمت تلاش کر رہا تھا لیکن ابھی تک کوئی کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ میں نے اسے کئی مرتبہ سمجھایا کہ وہ سرکاری ملازمت کے انتظار میں وقت ضائع نہ کرے بلکہ وقتی طور پر کسی پرائیویٹ ادارے میں جاب کر لے لیکن وہ اس کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں تھا۔

وقت گزرتا رہا اور دیکھتے ہی دیکھتے میں نے ایم بی اے مکمل کر لیا۔ صفدر کی پڑھائی بھی ختم ہو چکی تھی لیکن وہ ابھی تک بے روزگار تھا۔ میری ملازمت مستقل ہو چکی تھی۔ اگر چاہتی تو کسی اچھی کمپنی میں جا سکتی تھی لیکن میں نے سرکاری

ملازمت کو ہی ترجیح دی۔ ملٹی نیشنل کمپنی میں تنخواہ تو اچھی ملتی لیکن پانچ بجے تک کام کرنا پڑتا اور کبھی کبھی دیر تک بھی رکنا پڑ جاتا تھا۔ مجھے پیسوں سے زیادہ اپنا سکون عزیز تھا۔ اس لیے میں نے دوسری ملازمت کے لیے کوئی کوشش نہیں کی جبکہ صفدر کی خواہش تھی کہ میں اپنی ایم بی اے کی ڈگری سے فائدہ اٹھاؤں۔ اس کا خیال تھا کہ میں اگر کسی ملٹی نیشنل کمپنی میں چلی جاؤں تو وہاں مجھے موجودہ ملازمت کے مقابلے میں دو تین گنا زیادہ تنخواہ ملے گی جبکہ دیگر مراعات اس کے علاوہ ہوں گے۔

اس کی بات سن کر مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ وہ خود تو سرکاری ملازمت کے لیے بے چین تھا اور مجھے پرائیویٹ جاب کرنے کی ترغیب دے رہا تھا گویا اسے میرے آرام و سکون سے زیادہ میری آمدنی سے دلچسپی تھی جس کام کو وہ اپنے لیے اچھا نہیں سمجھتا تھا۔ وہ میرے لیے کیسے بہتر ہوسکتا تھا۔ یہی بات جب میں نے اس سے پوچھی تو وہ ہنستے ہوئے بولا۔

”میں نے تو تمہاری بھلائی کے لیے کہا تھا۔ اب دیکھو نا، تم ابھی تک گریڈ سترہ میں ہو۔ نہ جانے سنیارٹی لسٹ میں تمہارا کون سا نمبر ہوگا اور اگلے گریڈ میں جانے کے لیے کتنا انتظار کرنا ہوگا۔ اگر پروموشن ہو بھی گئی تو تمہاری تنخواہ میں زیادہ سے زیادہ چند ہزار کا اضافہ ہوجائے گا۔ اس کے علاوہ کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اس کے برعکس ملٹی نیشنل کمپنی میں تمہاری تنخواہ دگنی تگنی ہوجائے گی۔ اس کے علاوہ دیگر مراعات مثلاً بونس، میڈیکل، کار، پیٹرول اور نہ جانے کیا کچھ ملے گا۔“

”اگر پرائیویٹ جاب میں اتنی ہی کشش ہے تو تم خود کیوں نہیں کرلیتے۔“ میں نے جل کر کہا۔ ”کیوں سرکاری نوکری کے لیے خوار ہورہے ہو؟“

”اس لیے کہ یہ ڈگری ایک پُرکشش ملازمت کے لیے ناکافی ہے۔“

”بہرحال تم کچھ بھی کہو۔ میں چند پیسوں کی خاطر اپنا سکون غارت نہیں کرسکتی۔ میرے لیے یہ ملازمت ہی کافی ہے۔“

اس دوران ہماری کئی مرتبہ جھڑپ ہوئی۔ میں نے اس سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ امی کی طرف سے دباؤ بڑھتا جارہا ہے اور میرے لیے زیادہ دیر مزاحمت کرنا مشکل ہوتا جارہا ہے۔ اگر اس نے فوری طور پر کوئی ملازمت نہیں کی تو میں اس کی دسترس سے بہت دور چلی جاؤں گی۔ میری بات سن کر وہ گھبرا گیا اور اس نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ میرے مشورے پر عمل کرتے ہوئے وقتی طور پر کوئی ملازمت کرلے گا اور اس کے ساتھ ساتھ سرکاری نوکری کے لیے بھی کوشش جاری رکھے گا۔

چند روز بعد اس نے خوش خبری سنائی کہ اسے ایک گارمنٹ فیکٹری میں ایڈمن آفیسر کی جاب مل گئی ہے۔ اس نے بتایا کہ چھ مہینے کی آزمائشی مدت پوری ہونے پر اس کی نوکری پکی ہوجائے گی اور تبھی وہ اپنے گھر والوں کو ہمارے یہاں رشتے کی بات کرنے کے لیے بھیجے گا۔ مجھے یہ سن کر اطمینان ہوگیا اور میں نے امی کو بھی یہ بات بتادی۔ انہوں نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ اس کی دو وجوہات ہوسکتی تھیں۔ پہلی یہ کہ انہیں اس خبر پر یقین نہیں آیا، انہیں مایوسی ہوئی۔ وہ اپنے ہونے والے داماد کو کسی بہتر پوزیشن پر دیکھنا چاہ رہی تھیں۔

چھ مہینے بھی گزر گئے۔ صفدر کی نوکری پکی ہوگئی۔ اس کے باوجود اس کی طرف سے خاموشی تھی۔ ایک دن میں نے اسے جھنجوڑا تو وہ رونی صورت بناتے ہوئے بولا۔ ”میں نے امی سے بات کی تھی لیکن وہ ابھی میری شادی کرنا نہیں چاہتیں۔“

”کیوں؟“ میں نے تلملاتے ہوئے کہا۔ ”کیا انہوں نے تمہارے لیے کوئی اور لڑکی دیکھ رکھی ہے؟“

”نہیں۔ یہ بات نہیں ہے۔“ وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ”ان کا کہنا ہے کہ میری تنخواہ بہت کم ہے۔ جب تک مجھے کوئی اچھی نوکری نہیں مل جاتی۔ وہ میرا رشتہ لے کر کہیں نہیں جائیں گی۔“

”تم نے انہیں بتایا نہیں کہ میں بھی جاب کرتی ہوں۔ ہم دونوں مل کر گزارہ کرلیں گے۔“

”بتایا تھا لیکن وہ کہتی ہیں کہ آدمی کو اپنی قوت بازو پر بھروسا کرنا چاہیے۔ عورت کی کمائی کھانے والا مرد بے غیرت کہلاتا ہے۔“

”یہ منطق میری سمجھ سے باہر ہے۔ قانوناً بھی میاں بیوی کا پیسا ایک سمجھا جاتا ہے پھر وہ کیوں اس فکر میں گھل رہی ہیں؟“

”میں کیا کہہ سکتا ہوں، اپنی اپنی سوچ ہے۔ بہرحال تم تھوڑی سی مہلت دے دو۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ کوئی بہتر ملازمت مل جائے۔ اس کے بعد امی کو رشتہ ڈالنے پر

URDU SOFT BOOKS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

کوئی اعتراض نہ ہوگا۔"

"مہلت مہلت مہلت۔ میں تنگ آگئی ہوں یہ لفظ سنتے سنتے۔" میں چلاتے ہوئے بولی۔ ایک طرف تم مہلت پر مہلت مانگے جارہے ہو، دوسری جانب امی نے میرے کان کھارکھے ہیں۔ انہیں یہ فکر لگی ہوئی ہے کہ میری عمر نکلی جارہی ہے اگر زیادہ دیر ہوگئی تو پھر مجھے کوئی نہیں پوچھے گا۔ میں تو چکی کے دو پاؤں کے درمیان پس کر رہ گئی ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔"

"تمہیں زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ بس چند دنوں کی بات ہے پھر سب ٹھیک ہوجائے گا۔"

"دیکھ لو۔ اب اگر میرا کوئی رشتہ آگیا تو شاید مزاحمت نہ کرپاؤں۔ اس لیے جو کرنا ہے جلدی کرو۔"

میری دھمکی سے وہ ڈر گیا۔ دو دن بعد ہی اس نے مجھے فون کرکے کہا کہ اس کی امی مجھ سے ملنا چاہتی ہیں۔ میں نے وجہ پوچھی تو وہ کوئی واضح جواب نہ دے سکا بس اتنا کہا کہ اگر میں ان سے مل لوں تو شاید معاملہ آگے بڑھانے میں آسانی ہو۔ میں نے رضامندی کا اظہار کیا تو اس نے کہا کہ وہ اگلے روز مجھے بارہ بجے کالج سے پک کرلے گا۔

جب میں اس کے گھر گئی تو اس کی امی کے سوا وہاں کوئی نہیں تھا۔ سب لوگ اپنے اپنے کاموں پر گئے ہوئے تھے۔ اس کی بھابی بھی گھر پر نہیں تھیں۔ وہ کسی اسکول میں پڑھاتی تھیں۔ یہ جان کر مجھے بڑی حیرت ہوئی کیونکہ ان کے شوہر بہت اچھے عہدے پر فائز تھے اور انہیں ملازمت کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کی وجہ مجھے بعد میں معلوم ہوئی۔

صفدر کی امی بڑی شفقت سے پیش آئیں۔ انہوں نے میری خاطر مدارات کے لیے خاص اہتمام کررکھا تھا۔ صفدر مجھے ان کے پاس بٹھا کر کہیں چلا گیا تو انہوں نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ "بیٹی۔ میں نے تمہیں اس لیے بلایا ہے کہ بات کو آگے بڑھانے سے پہلے حقیقت سے آگاہ کردوں۔ اس کے بعد تمہیں اختیار ہے کہ جو چاہو فیصلہ کرو۔"

"آپ کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔" میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "میں سب جانتی ہوں۔"

"لیکن تم میرا مسئلہ نہیں سمجھ رہی ہو۔ صفدر کی ضد نے مجھے عجیب مخمصے میں ڈال دیا ہے۔ دیکھو بیٹی۔ ہر والدین کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کی لڑکی کسی اچھے گھر میں بیاہ کر جائے۔ ان کا ہونے والا داماد مالی طور پر مستحکم ہو اور وہ اپنے بیوی بچوں کی ضروریات پوری کرنے کی اہلیت رکھتا ہو۔ جبکہ یہاں ایسا کچھ نہیں ہے۔ یہ سب شان وشوکت اس کے بھائی کی مرہون منت ہے۔ اسے جو تنخواہ ملتی ہے۔ وہ اس کے اپنے اخراجات کے لیے ناکافی ہے۔ اس کے پاس اپنا کچھ بھی نہیں ہے تمہی بتاؤ میں کس منہ سے رشتہ لے کر تمہارے گھر آؤں۔ نا بابا مجھے اپنی بے عزتی نہیں کروانی۔"

"حالات کبھی ایک جیسے نہیں رہتے۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ "مجھے یقین ہے کہ بہت جلد انہیں اچھی ملازمت مل جائے گی۔ میری تنخواہ بھی اچھی خاصی ہے۔ ہم مل جل کر گزارہ کرلیں گے۔"

"دیکھو بیٹی۔ میں نے تم سے کوئی بات نہیں چھپائی۔ سب کچھ بتادیا۔ اس کے باوجود بھی اگر تم اس سے شادی کرنے کے لیے تیار ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن مجھے ایک گارنٹی چاہیے۔"

"وہ کیا؟" میں نے چونکتے ہوئے کہا۔

"تم اپنی امی کو یہ سب باتیں بتادو۔ وہ تمہارے ابو سے بھی مشورہ کرلیں۔ اگر وہ اس رشتہ پر رضامند ہیں تو میں باقاعدہ پیغام لے کر آجاتی ہوں لیکن میری ایک شرط ہے کہ مجھے انکار نہ سننا پڑے اور نہ ہی صفدر کے بارے میں سوال جواب کیے جائیں۔"

"آپ بے فکر رہیں آنٹی۔ وہی ہوگا جو آپ چاہتی ہیں۔ بہرحال میں امی سے بات کرکے صفدر کو بتادوں گی۔"

اس کے بعد انہوں نے کوئی بات نہیں کی۔ تھوڑی دیر بعد صفدر آیا اور اس نے مجھے بائیک پر بٹھا کر گھر چھوڑ دیا اور باہر سے ہی واپس چلا گیا۔ میں امی سے کوئی بات نہیں چھپاتی تھی۔ اس لیے انہیں صفدر کی امی سے ہونے والی ملاقات کے بارے میں سب کچھ بتادیا۔ میری بات سن کر وہ کچھ دیر خاموش رہیں پھر بولیں۔ "تم خود ہی دیکھ لو۔ اس کی ماں بھی نہیں چاہتی کہ یہ رشتہ ہو۔ وہ بھی اپنے بیٹے کے مستقبل کے بارے میں پرامید نہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ تم سے زیادہ اپنے بیٹے کو جانتی ہے۔ اسی لیے اس نے تمہیں بلا کر آنے والے وقت کی بھیانک تصویر دکھادی تاکہ بعد میں تمہیں کوئی شکایت نہ ہو۔"

"آپ لوگوں کے اندیشے بے بنیاد ہیں۔ ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ اس لیے میں بالکل بھی فکرمند نہیں ہوں۔"

"میں تو یہ سوچ کر پریشان ہورہی ہوں کہ تمہارے

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

باپ سے کیسے بات کروں۔ وہ تو کبھی نہیں مانیں گے۔ تم تو انہیں جانتی ہو۔"

"یہ آپ کا مسئلہ ہے۔ میرا نہیں۔ اگر وہ مخالفت کریں تو انہیں بتا دیجیے کہ میری شادی صرف اور صرف صفدر سے ہوگی۔ اس کے علاوہ کسی اور کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔"

امی میری ضدی اور خودسر طبیعت سے واقف تھیں۔ اس لیے خاموش ہوگئیں۔ جانتی تھیں کہ میں جو فیصلہ کرلوں۔ اس سے پیچھے نہیں ہٹتی۔ مجھے اندازہ تھا کہ ابو کو راضی کرنے میں انہیں کافی مشکل پیش آئے گی اور ایسا ہی ہوا۔ ابو کو جب انہوں نے صفدر کے بارے میں بتایا تو وہ اس کے کوائف سنتے ہی بھڑک اٹھے اور لمحہ بھر کی تاخیر کیے بغیر انہوں نے انکار کردیا۔ مجبوراً امی کو بتانا پڑا کہ میں اس بارے میں کتنی سنجیدہ ہوں اور ہر قیمت پر صفدر سے شادی کرنے کا فیصلہ کرچکی ہوں۔ ابو کی یہ عادت تھی کہ وہ صرف ایک مرتبہ کوئی بات کرتے تھے اگر اسے مان لیا جائے تو ٹھیک ورنہ وہ پیچھے ہٹ جاتے تھے اور اس معاملہ سے بالکل لاتعلق ہوجاتے۔ اس دفعہ بھی انہوں نے یہی کیا۔ جب امی نے انہیں میرے فیصلے سے آگاہ کیا تو گرجتے ہوئے بولے۔ "ٹھیک ہے اگر اسے گڑھے میں گرنے کا شوق ہے تو گرنے دو۔ میں اس کے لیے صرف دعا ہی کرسکتا ہوں۔"

میں نے صفدر کو بتادیا کہ سب معاملات طے ہوگئے ہیں اور وہ اپنی امی کو ہمارے گھر بھیج سکتا ہے لیکن بہتر ہوگا کہ وہ آنے سے پہلے رسماً امی کو ایک فون کرلیں۔ دو دن بعد ہی صفدر کی امی کا فون آگیا۔ انہوں نے تعارف کروانے کے بعد خواہش کا اظہار کیا کہ وہ اپنے بیٹے صفدر کے رشتے کے سلسلے میں ہمارے گھر آنا چاہ رہی ہیں۔ امی نے انہیں آنے والے اتوار کا وقت دے دیا اور کہا کہ وہ صفدر کو بھی ساتھ ہی لے آئیں تاکہ ہمارے گھر کے سب لوگ اسے دیکھ لیں۔

وقت مقررہ پر صفدر، اس کی امی، بڑے بھائی اور بھاوج ہمارے گھر آئے۔ امی نے چائے کے ساتھ خاصا اہتمام کررکھا تھا۔ حیرت انگیز طور پر ابو نے صفدر اور اس کے گھر والوں کے ساتھ خوش گوار رویہ اختیار کیا اور صفدر کے بارے میں کوئی ایسا سوال نہیں کیا جس سے ان لوگوں کی سبکی ہو۔ شاید حالات سے سمجھوتا کرنا اسی کو کہتے ہیں۔ البتہ صفدر کی امی خود ہی خاصی شرمندہ نظر آرہی تھیں۔ انہوں نے معذرت خواہانہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔ "بہن۔ ہم نے آپ سے کچھ نہیں چھپایا۔ اس وقت صفدر کی مالی حیثیت ایسی نہیں کہ میں اس کے لیے رشتہ مانگنے آتی لیکن یہ کوشش ہے۔ امید ہے کہ جلد ہی اسے کوئی بہتر ملازمت مل جائے گی۔"

امی نے انشاء اللہ کہا اور بات ختم کردی۔ وہ وعدہ کرچکی تھیں کہ صفدر کے بارے میں کوئی سوال نہیں کریں گی۔ اس لیے مزید گفتگو کرنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ چائے کے دوران صفدر کی امی نے منگنی کرنے کی خواہش ظاہر کی اور کہا کہ وہ چاہتی ہیں۔ اس سے پہلے آپ لوگ ہمارے گھر آئیں۔ امی نے ان کی دعوت قبول کرلی اور اگلے اتوار کو آنے کا وعدہ کرلیا۔

اس کے بعد سب معاملات بڑی تیزی سے طے پائے۔ امی منگنی کے حق میں نہیں تھیں لیکن میرے اصرار پر وہ صفدر کو انگوٹھی پہنانے پر رضامند ہوگئیں۔ شادی چھ ماہ بعد ہونا قرار پائی۔ صفدر سے منگنی ہوجانے کے بعد میں مطمئن ہوگئی تھی اور میں نے صفدر سے کہہ دیا تھا کہ وہ اس مہلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جلد از جلد کوئی بہتر ملازمت تلاش کرنے کی کوشش کرے لیکن وہ شاید مجھ سے بھی زیادہ مطمئن ہوگیا تھا۔ اور ایک بار پھر اس کی توجہ سرکاری ملازمت پر مرکوز ہوگئی تھی۔ اس مقصد کے حصول کے لیے اس نے سیاسی پارٹیوں کے دوسرے تیسرے درجہ کے لیڈروں کے پیچھے بھاگنا شروع کردیا تھا۔ اس کی کوشش یہی تھی کہ کسی وزیر سے اس کا رابطہ ہوجائے تاکہ وہ اس کی سفارش کے بل بوتے پر سرکاری ملازمت حاصل کرسکے لیکن ابھی تک اسے کوئی.... کامیابی نہیں ہوئی تھی۔

بالآخر شادی کا دن آن پہنچا۔ صفدر کی امی اور بھائی نے اپنا بھرم رکھنے کے لیے بہت اچھی بری بنائی اور ولیمہ بھی بڑی دھوم دھام سے کیا۔ دس پندرہ دن تو شادی کی گہما گہمی رہی۔ اس کے بعد میں نے کالج جانا شروع کردیا۔ صفدر کا اصرار تھا کہ مجھے اپنی چھٹی بڑھوا لینی چاہیے۔ لیکن میرے لیے یہ ممکن نہیں تھا۔ انٹر کے امتحانات قریب آرہے تھے اور مجھے ابھی بہت سا کورس پڑھانا تھا۔ اس لیے میں مزید چھٹی نہیں کرسکتی تھی۔ البتہ صفدر نے ایک ماہ کی چھٹی لے رکھی تھی اور میں حیران تھی کہ پرائیویٹ ادارے میں ہوتے ہوئے اسے اتنی لمبی چھٹی کیسے مل گئی۔ اس کا بھید مجھ پر بعد میں کھلا۔

ایک مہینا بعد اس نے بھی کام پر جانا شروع کردیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ کس وقت جاتا اور کس وقت واپس آتا تھا کیونکہ جب میں صبح کالج جاتی تو وہ سورہا ہوتا تھا اور دوپہر

میں واپس آتی تب بھی گھر میں موجود ہوتا۔ کچھ دن تو میں نے اس پر توجہ نہیں دی پھر ایک روز پوچھ ہی لیا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیسی نوکری ہے۔ میں تو تمہیں ہر وقت گھر میں ہی دیکھتی ہوں۔"

"میری نوکری ختم ہو گئی ہے۔" اس نے بے پروائی سے کہا۔

مجھے اس کے لہجے پر حیرت ہوئی۔ وہ نوکری ختم ہونے کا ذکر اس طرح کر رہا تھا جیسے دس کا نوٹ کہیں گر گیا ہو۔

میں نے غصہ ہوتے ہوئے کہا۔ "اور تم نے مجھے بتایا بھی نہیں۔"

"وہ ڈھٹائی سے بولا۔ "کیا بتاتا یہ کوئی خوشی کی خبر تو تھی نہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ آئندہ خیال رکھوں گا۔" اس نے مصالحت آمیز انداز میں کہا۔

"اب کیا کرو گے؟" میں نے جل کر کہا۔

"پرائیویٹ جاب تو مجھے کل مل سکتی ہے لیکن مجھ سے وقت کی پابندی نہیں ہوتی۔ یہ نوکری بھی اسی وجہ سے ختم ہوئی۔ اسی لیے سرکاری ملازمت تلاش کر رہا ہوں۔ ایک دو لوگوں سے بات ہوئی ہے۔ اُمید ہے کام بن جائے گا۔"

"آج کل سرکاری ملازمت ملنا اتنا آسان نہیں۔ اس کے انتظار میں وقت ضائع کرنے کی بجائے تم وقتی طور پر کسی پرائیویٹ ادارے میں جاب کرلو۔ یوں خالی بیٹھنا ٹھیک نہیں۔"

"کیا فائدہ۔ چار دن بعد وہ بھی ختم ہو جائے گی۔ تم جانتی ہو مجھے صبح دیر تک سونے کی عادت ہے۔ اسی لیے وقت کی پابندی نہیں کر سکتا۔"

"پھر کوئی کاروبار شروع کر دو تاکہ اپنی مرضی سے جاؤ اپنی مرضی سے آؤ۔"

"مشورہ تو معقول ہے لیکن کاروبار کے لیے پیسے کہاں سے آئیں گے۔ میرے پاس تو اتنا سرمایہ نہیں ہے۔"

"اچھا۔ جو دل چاہے کرو۔" میں نے زچ ہوتے ہوئے کہا۔ "تمہیں سمجھانا بہت مشکل ہے۔"

میرے بار بار کہنے اور شرم دلانے پر اس نے ایک بار پھر ایک پرائیویٹ جاب کرلی لیکن وہ بھی دو ماہ بعد ختم ہو گئی۔ اس کے بعد سے یہی سلسلہ چل رہا ہے۔ اسے نوکری ملتی ہے اور چند ہفتوں یا مہینوں بعد ختم ہو جاتی ہے۔ پھر وہ کئی کئی مہینے فارغ بیٹھا رہتا ہے۔ اس دوران اس کا محبوب مشغلہ اخبارات میں سرکاری ملازمت کے اشتہار دیکھنا اور ان کے لیے درخواست بھیجنا ہے لیکن آج تک کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔

ایک دن میں شاپنگ کے لیے گئی تو وہ بھی میرے ساتھ تھا۔ مجھے شروع سے ہی کھلا خرچ کرنے کی عادت ہے۔ میں نے کبھی بچت کرنے کے بارے میں نہیں سوچا۔ اسی لیے اچھی خاصی تنخواہ ہونے کے باوجود مہینے کے آخر میں بالکل خالی ہو جاتی ہوں۔ اس روز بھی یہی ہوا۔ میں نے دل کھول کر شاپنگ کی اور اچھے خاصے پیسے خرچ کر دیے۔ صفدر خاموشی سے سب دیکھتا رہا لیکن گھر آ کر اس نے ہنگامہ کھڑا کر دیا اور کہنے لگا۔ "میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم اتنی فضول خرچ ہو سکتی ہو۔"

"تو کیا ہوا؟" میں نے بے پروائی سے کہا۔ "آدمی کماتا کس لیے ہے۔"

"اس طرح تو ہم کبھی کچھ نہیں کر پائیں گے۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"اب مجھے مطلب بھی سمجھانا پڑے گا۔ شاید تم بھول رہی ہو کہ شادی سے پہلے ہمارے درمیان کیا طے ہوا تھا کہ میری تنخواہ سے گھر چلے گا اور تمہاری تنخواہ بینک میں جمع ہوگی۔ اسی طرح ہم اپنے لیے گاڑی اور مکان کا بندوبست کر سکیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔ آئندہ احتیاط کروں گی۔" میں نے شرمندہ ہوتے ہوئے کہا۔

"نہیں، بگڑی ہوئی عادتیں اتنی آسانی سے ٹھیک نہیں ہوتیں۔ تم اپنی چیک بک مجھے دے دو تاکہ تم کوئی بڑی رقم نہ نکال سکو۔"

میں نے اس کا دل رکھنے کے لیے چیک بک اس کے حوالے کر دی۔ ویسے بھی مجھے اس کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔ میں چیک کی بجائے اے ٹی ایم سے پیسے نکالتی تھی لیکن چند روز بعد ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ مجھے اے ٹی ایم کارڈ سے بھی ہاتھ دھونا پڑ گئے۔ اس روز میں نے اے ٹی ایم کارڈ سے دس ہزار روپے نکالے کہ اچانک ہی ایک لڑکا بوتھ میں داخل ہوا اور مجھ سے گن پوائنٹ پر وہ پیسے چھین لیے۔ ابھی میرے حواس بھی بحال نہیں ہوئے تھے کہ وہ سیکنڈوں میں چھلاوے کی طرح غائب ہو گیا۔ میں شور مچاتے ہوئے باہر آئی لیکن اس کا کہیں پتا نہیں تھا۔ شاید اس کا کوئی

ساتھی پہلے سے موٹر سائیکل پر موجود ہوگا جس کے ساتھ بیٹھ کر وہ فرار ہوگیا۔

میں نے گھر آکر یہ واقعہ صفدر کو سنایا تو وہ بولا۔ ''شکر کرو کہ تمہاری جان بچ گئی۔ اگر ذرا سی مزاحمت کرتیں تو وہ تمہیں گولی مار دیتا۔''

اس کی بات سن کر میرا چہرہ خوف سے زرد ہوگیا۔ اس نے کہا۔ ''آئندہ اے ٹی ایم مشین پر تنہا جانے کی ضرورت نہیں۔ میں ساتھ چلوں گا بلکہ ایسا کرو کہ اپنا اے ٹی ایم کارڈ کا پن کوڈ نمبر مجھے دے دو جب ضرورت ہو۔ مجھے بتا دینا میں پیسے لا دیا کروں گا۔''

میں اتنی ڈری ہوئی تھی کہ کچھ سوچے سمجھے بغیر اے ٹی ایم کارڈ کا پن کوڈ نمبر اس کے حوالے کر دیا ایک دو مہینے تو معاملہ ٹھیک ٹھاک چلتا رہا۔ میں جتنے پیسوں کے لیے کہتی۔ وہ مجھے اے ٹی ایم سے نکال کر لا دیتا۔ پھر اس نے حساب کتاب کرنا شروع کر دیا۔ میں جب بھی اس سے پیسے مانگتی۔ وہ یہی کہتا کہ مجھے ہاتھ روک کر خرچ کرنا چاہیے۔ کل کو یہی پیسے ہمارے کام آئیں گے۔ اس وقت میرا جی جل کر خاک ہو جاتا اور میں یہی سوچتی کہ خود تو کبھی کچھ کرتا نہیں ہے اور میرے پیسوں پر سانپ بن کر بیٹھ گیا ہے۔ انہی دنوں میرے یہاں پہلا بچہ پیدا ہوا۔ اسپتال کا بل، بچے کا عقیقہ اور مٹھائی وغیرہ تمام اخراجات میرے ہی اکاؤنٹ سے ادا کیے گئے۔ اس طرح صفدر کو بولنے کا موقع مل گیا۔ اس نے کہا ''اگر میں تمہارا ہاتھ نہ روکتا تو اس وقت ہم بڑی مشکل میں پڑ جاتے۔ ہمارے اکاؤنٹ میں پیسے تھے۔ اس لیے یہ اخراجات برداشت کرنے کے قابل ہو سکے۔''

جی میں آیا کہہ دوں کہ یہ تمہاری ذمہ داری تھی لیکن اس کی مجبوری سمجھتی تھی۔ اس لیے طعنہ دینا مناسب نہ سمجھا۔ بچے کی پیدائش کے بعد اخراجات میں اضافہ ہوگیا۔ اس کی دیکھ بھال کے لیے آیا رکھنا پڑی۔ اس کے کپڑے، پیمپر، دودھ، اچھا خاصا خرچ بڑھ گیا تھا۔ میں جب بھی اس سے پیسوں کے لیے کہتی۔ اس کا منہ بن جاتا اور وہ ہمیشہ کی طرح لیکچر دینا شروع کر دیتا۔ تنگ آکر میں نے اس سے پیسے مانگنا چھوڑ دیے بلکہ جس چیز کی ضرورت ہوتی۔ اسے بتا دیتی تاکہ وہ خود خرید کر لائے اور اسے آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو سکے۔

حالات کی ستم ظریفی نے مجھے اس موڑ پر پہنچا دیا کہ میں اپنا پیسا اپنی مرضی سے خرچ نہیں کر سکتی تھی۔ مجھے ہمیشہ سے ہی کپڑوں کا شوق تھا اور ہر مہینے ایک دو نئے جوڑے ضرور بنایا کرتی تھی لیکن۔ جب صفدر نے اس پر بھی روک ٹوک کی تو مجھے غصہ آگیا اور اس بات پر اس سے میرا جھگڑا ہوگیا۔ میں نے اس سے مطالبہ کیا کہ وہ میری چیک بک اور اے ٹی ایم کارڈ واپس کردے۔ مجھے یہ محتاجی قبول نہیں۔

اس نے جو جواب دیا۔ اسے سن کر میرے ہوش اڑ گئے۔ اس نے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ اگر تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں رہا تو میرے ساتھ رہنے کی بھی ضرورت نہیں۔ تم اپنے ماں باپ کے گھر چلی جاؤ۔ تمہیں کاغذ مل جائے گا۔''

''کیا؟ میری چیخ نکل گئی۔ تمہیں پتا ہے کہ تم کیا کہہ رہے ہو؟''

''ہاں۔ اچھی طرح جانتا ہوں کہ کیا کہہ رہا ہوں جو عورت شوہر سے زیادہ پیسے کو اہمیت دے۔ اسے میرے ساتھ رہنے کا کوئی حق نہیں۔''

اس کے بعد میں کچھ نہیں بولی۔ میرے پاس کہنے کے لیے کیا رہ گیا تھا۔ یہ اس شخص کے الفاظ تھے جس کی خاطر میں نے اپنے والدین کی ناراضی مول لی۔ اچھے اچھے رشتے ٹھکرا دیے۔ خود اس کی ماں نے ڈھکے چھپے لفظوں میں مجھے سمجھانے کی کوشش کی لیکن میری عقل میں کوئی بات نہیں آئی۔ آج مجھے ابو کے الفاظ یاد آتے ہیں کہ اگر میں گڑھے میں گرنا چاہتی ہوں تو مجھے گرنے دیا جائے کاش وہ باپ بن کر سختی کرتے اور مجھے اس گڑھے میں گرنے سے بچا لیتے۔ بدنصیب ہیں وہ لڑکیاں جو اپنے ماں باپ کی نصیحتوں کو نظر انداز کر کے اپنی من مانی کرتی ہیں۔ جبکہ میری دور اندیش ماں نے صفدر کو دیکھتے ہی اس بارے میں رائے قائم کر لی تھی لیکن میری آنکھیں وہ سب نہ دیکھ سکیں جو انہیں نظر آرہا تھا۔

مجھے اپنی ماسی بھی بہت یاد آتی ہے۔ جس سے اس کا شوہر پیسے چھین لیا کرتا تھا صفدر اس سے بھی دو ہاتھ آگے نکلا۔ اس نے تو میری کمائی پر بھی قبضہ جما لیا ہے۔ میں پورے مہینے محنت کر کے کماتی ہوں اور وہ عیش کرتا ہے لیکن میں یہ ستم سہنے پر مجبور ہوں کیونکہ طلاق کا ٹیکہ ماتھے پر سجا کر میکے جانا نہیں چاہتی اور نہ ہی اپنے بیٹے کو باپ کے نام سے اور شفقت سے محروم کرنا چاہتی ہوں۔ وہ جیسا بھی ہے۔ میرا شوہر اور میرے بیٹے کا باپ ہے اور اس سے بہت محبت کرتا ہے۔ اسی لیے میں اپنا گھر بچانے کے لیے تاحیات یہ قیمت ادا کرنے پر مجبور ہوں۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

چھتنار درخت

محترمہ عذرا رسول

السلام علیکم

انسان اگر خود کو بدلنا چاہے تو بہ آسانی بدل سکتا ہے۔ جس طرح ندیم نے اپنی زندگی بدل لی۔ جو لوگ قسمت کا لکھا سمجھ کر کوشش ترک کردیتے ان کے لیے بہت بڑا سبق ہے۔

زرین قمر

(کراچی)

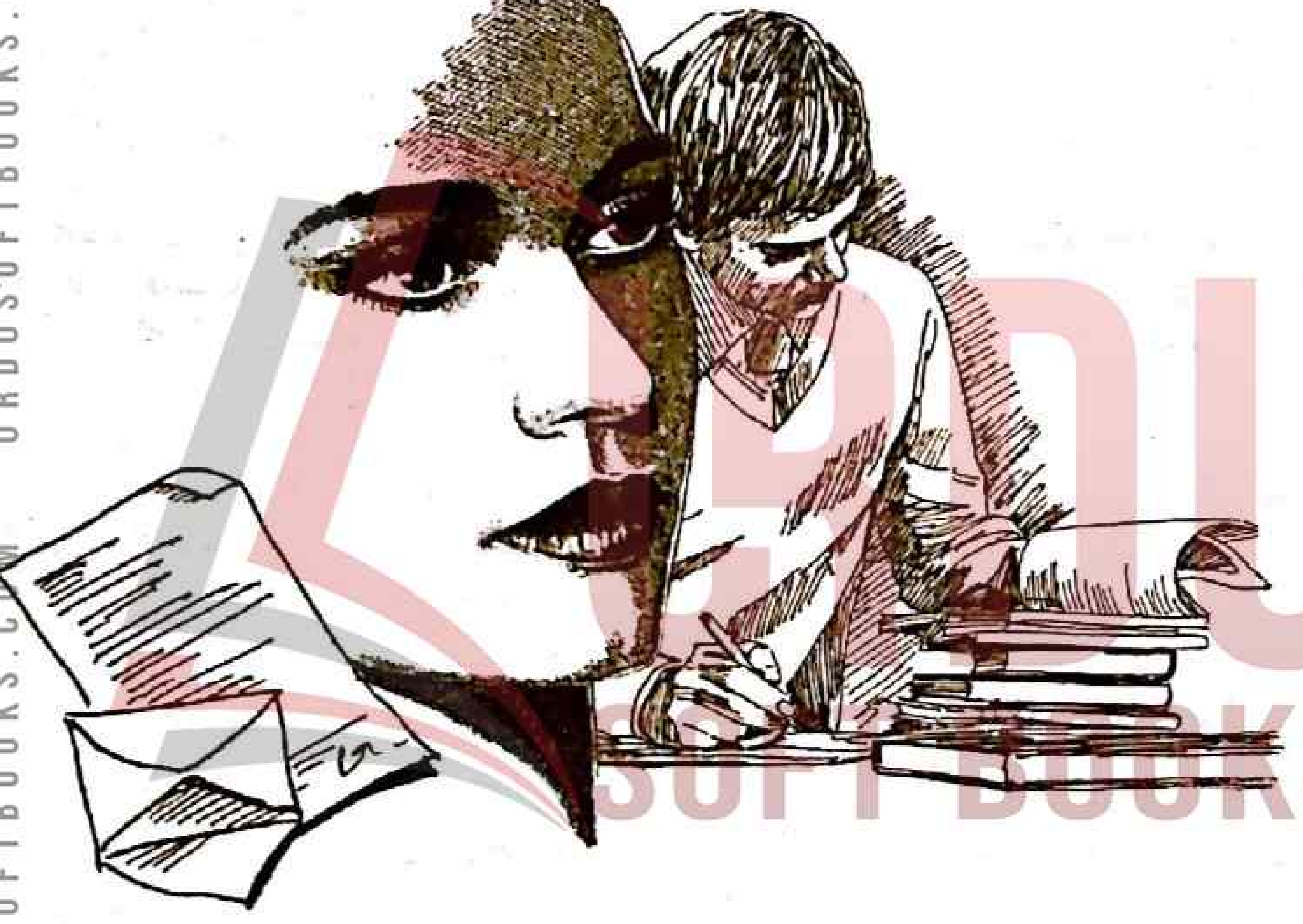

رمضان کے اختتامی دن چل رہے تھے۔ گرمی بھی شدید تھی۔ ایسے موسم میں روزہ رکھنا آسان نہیں۔ میں یہی کچھ سوچ رہی تھی کہ کال بیل بجی۔ ایسے وقت کون آگیا میں نے امی کی طرف دیکھ کر کہا۔

"دروازے پر جا کر دیکھو تب ہی تو پتا چلے گا۔" امی نے گھر کا۔

پنکھے کے آگے سے ہٹنا عذاب لگ رہا تھا مگر مجبوری تھی۔ دروازے پر پہنچ کر پوچھا۔ "کون ہے؟"

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

باہر سے آواز آئی۔ ''باجی کچرا دے دیں۔''
میرا دل ہول اٹھا۔ اس تپتی دوپہر میں وہ کس طرح اپنا کام کررہا ہے۔ میں نے کچرے کی تھیلیاں اسے تھماتے ہوئے کہا۔ ''پانی پیو گے لاؤں؟''
''نہیں باجی میرا روزہ ہے۔''
روزے میں وہ محنت کررہا ہے یہ سن کر میں اور زیادہ متاثر ہوگئی۔ وہ عام کچرے والوں کی طرح میلا کچیلا نہیں تھا۔ اس نے صاف ستھرے کپڑے پہن رکھے تھے۔ میں نے اس سے پوچھا۔
''لکھنا پڑھنا جانتے ہو؟''
شاید یہ گرمی کا اثر تھا جو میں نے اس سے ایسا سوال کیا مگر جب جواب سنا تو حیران رہ گئی۔ ''جی باجی، میں نے آٹھویں کلاس تک پڑھا ہے پھر... ابا کا ایکسیڈنٹ ہوگیا۔ ان...... کے چلے جانے سے چھوٹے بھائی بہنوں کی ذمے داری مجھ پر آگئی۔ اسی لیے خالی وقت میں یہ کام کررہا ہوں ورنہ ایک دکان پر کام کرتا ہوں۔''
میٹرک کا امتحان دے دو۔''
''گھر میں کھانے کو نہیں ہے اسکول فیس کہاں سے دوں گا۔''
میں نے اسے مشورہ دیا کہ... اگر تعلیم حاصل کرنے کا اتنا ہی شوقین ہے تو پرائیویٹ تعلیم حاصل کرلے۔ اس طرح اسے تعلیمی اداروں کی فیسوں سے نجات مل جائے گی اور شوق بھی پورا ہوجائے گا۔ میری بات سن کر وہ خوش ہوا تھا۔
''کیا واقعی ایسا ممکن ہے؟'' اس نے کمال شوق سے پوچھا اس کی ویران آنکھوں میں اُمیدوں کے دیئے جل اٹھے تھے۔
''ہاں، یہ ممکن ہے اگر تمہیں مدد کی ضرورت ہو تو تم میرے پاس آسکتے ہو۔ میں تمہیں نوٹس فراہم کردیا کروں گی۔'' میں نے اسے مزید اُمید دلائی کیونکہ میں بھی یہی چاہتی تھی۔ تعلیم حاصل کرنے میں اگر اس کی کوئی مدد کرسکتی ہوں تو کردوں کیونکہ یہ کار خیر ہے۔
''اوہ! اگر ایسا ہوجائے تو بہت اچھا ہوگا۔'' اس نے پُراُمید لہجے میں کہا۔
''بالکل ایسا ہوسکتا ہے دیکھو میں نویں کلاس کے پرچے دینے کی تیاری کررہی ہوں اور تم نے آٹھویں کلاس سے اسکول چھوڑ دیا تھا۔ تم ایسا کرو کہ سیکنڈری کے بورڈ آفس سے نویں کلاس کے امتحان میں بیٹھنے کے لیے رجسٹریشن کروالو میں تمہارے رجسٹریشن فارم پر اپنے اسکول کی ہیڈ مسٹریس کے دستخط کروادوں گی اور تمہیں امتحان میں بیٹھنے کی اجازت مل جائے گی۔''
''اوہ یہ تو بہت اچھا ہوگا۔ امتحان میں کتنا وقت ہے؟'' اس نے پوچھا۔
''ابھی چند ماہ ہیں تمہیں صرف پانچ مضامین کا امتحان دینا ہوگا...... میرے خیال میں اتنے عرصے میں تم پانچ پرچوں کی تیاری آسانی سے کرلوگے۔''
''ٹھیک ہے میں آج ہی اپنے کسی دوست کے ساتھ بورڈ آفس جاتا ہوں۔'' اس نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔
پھر واقعی وہ بورڈ آفس سے امتحان میں پرائیویٹ اسٹوڈنٹ کی حیثیت سے بیٹھنے کی معلومات اور فارم لے آیا تھا۔
''اوہ! تم نے تو کمال ہی کردیا اتنی جلدی فارم لے آئے؟'' میں نے حیرت سے کہا۔
''ہاں جب ایک کام کرنے کا ارادہ کر ہی لیا ہے تو پھر دیر لگانے کی کیا ضرورت ہے؟ اگر میں سستی دکھاتا تو فارم بھرنے کا وقت نکل جاتا لیکن......'' وہ بات کرتے کرتے رک گیا۔
''لیکن کیا؟'' میں نے پوچھا۔
''آپ تو کہہ رہی تھیں کہ پرائیویٹ پڑھنے میں پیسے خرچ نہیں ہوں گے؟''
''ہاں مجھے یاد ہے میں نے یہ بات کہی تھی۔'' میں نے جواب دیا۔
''لیکن بورڈ آفس والوں نے بتایا ہے کہ اس فارم کے ساتھ مجھے فیس بھی جمع کرنا ہوگی۔'' اس نے فکرمندی سے کہا۔ پریشانی اس کے چہرے سے عیاں تھی۔
''دیکھو ندیم! میرے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ تمہیں اسکول کی ماہانہ فیس بھرنے سے نجات مل جائے گی۔ اسکولوں میں آئے دن ہونے والے فنکشنز میں دیئے جانے والے اخراجات کم ہوجائیں گے لیکن تمہیں امتحانی فیس تو ادا کرنا ہوگی تم چاہو تو کتابیں بھی مت خریدو تم میری کتابوں سے پڑھ سکتے ہو۔ پھر میں تمہیں نوٹس دوں گی ان سے بھی مدد ملے گی۔'' میں نے اسے سمجھایا۔
''یہ ٹھیک ہے۔'' ندیم نے آہستہ سے کہا۔ ''بات دراصل یہ ہے کہ آپ تو جانتی ہیں کہ میرے والد نہیں ہیں۔ امی بیمار رہتی ہیں اور میں ایک دکان پر کام کرتا ہوں وہاں سے جو ملتا ہے اس سے اپنے دو بہن بھائیوں اور ماں کا خرچا

URDUSOFTBOOKS.COM

چلاتا ہوں۔"

"اگر کچھ مسئلہ ہے تو تمہاری فیس میں دے دوں گی۔" میں نے اسے آفر کی۔

"نہیں.... نہیں تم سے یہ ساری بات شیئر کرنے کا میرا یہ مقصد ہرگز نہیں تھا کہ میں تم سے پیسے لوں مقصد صرف یہ تھا کہ میں جاننا چاہتا تھا کہ تعلیم حاصل کرنے کا آسان اور سستا راستہ کیا ہوسکتا ہے۔ تم نے معلومات دے دیں۔ یہی کافی ہے۔" ندیم نے تشکرانہ انداز میں کہا۔

"میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا، اپنا فرض ادا کیا ہے۔"

"ٹھیک ہے میں ایک دو دن میں فارم پُر کر کے لے آؤں گا تم اپنی ہیڈ مسٹریس سے اس پر تصدیقی دستخط اور مہر لگوا دینا۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے جواب دیا۔

اس روز ندیم ہمیشہ کے مقابلے میں بہت خوش تھا اس نے یہ خبر اپنے دوستوں کو بھی بتائی تھی کہ وہ بہت جلد نویں کلاس کا امتحان دینے والا ہے پھر واقعی اس نے کمال کر دیا تھا۔ وہ دکان پر چار گھنٹے کی ڈیوٹی کرنے کے بعد جب واپس آتا تو محلے کے ایک کلینک میں کمپاؤنڈر کی حیثیت سے کام کرتا اور رات کو پڑھتا۔ میں اسے کتابیں اور نوٹس فراہم کرتی تھی پھر اس نے نویں کا امتحان اچھے نمبروں سے پاس کر لیا تھا اور میٹرک کی تیاری میں لگ گیا تھا۔

پھر دو سال جیسے پر لگا کر گزر گئے تھے۔ اس نے میٹرک کر لیا تھا۔

میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے کچھ ہی عرصے بعد اس کی والدہ کا انتقال ہوگیا اور میرے والد کی پوسٹنگ اسلام آباد میں ہوگئی والد صاحب نے نئی جگہ جانے کی تیاری شروع کر دی۔ اس سے جب میں آخری بار ملی تو میں نے ایک تاکیدی جملہ کہا تھا۔

"ندیم! پڑھتے رہنا، علم ہی تمہارے کام آئے گا۔" جملہ ختم ہوتے ہی اس نے اداسی سے مجھے دیکھا۔

"میں اپنی ماں کے لیے پڑھ رہا تھا کہ پڑھ لکھ کر اچھا گھر بناؤں گا، اپنی ماں کو وہاں رکھوں گا۔ اسے آرام پہنچاؤں گا۔ بہن بھائیوں کو زندگی کی ساری خوشیاں دوں گا لیکن ماں کی موت کے ساتھ میرے منصوبے بھی مر گئے۔"

"نہیں ندیم ایسا نہ کہو تم تو بہت باہمت ہو۔ دیکھو تم نے عزم کر لیا تھا تو میٹرک بھی کر ہی لیا نا؟"

"ہاں لیکن آپ کو پتا ہے کہ میں نے میٹرک اور ماں کی بیماری کا خرچ کہاں سے پورا کیا؟" اس نے کہا۔

"کہاں سے پورا کیا؟" میں نے تجسس سے پوچھا۔

"رات کو جب میں پڑھنے بیٹھتا تھا تو دو گھنٹے سے زیادہ نہیں پڑھتا تھا۔ میں نے سوچا اس وقت میں بھی کچھ کیا جائے۔ چنانچہ میں رات کو کچرا اٹھانے لگا۔"

میں اس کی بات سن کر حیران رہ گئی۔ "کیا؟ تم صبح کو دکان پر نوکری کرتے رہے۔ شام میں کلینک پر اور رات کو کچرا اٹھاتے تھے؟"

"ہاں کیونکہ اس مہنگائی میں صرف دکان اور کلینک کے پیسوں سے گھر کے اخراجات پورے کر کے پڑھائی کا خرچا بھی پورا کرنا ممکن نہیں تھا۔"

"تم کچرا اٹھاتے تھے؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"گھریلو کچرا نہیں۔ آپ کو تو علم ہوگا کہ چندریگر روڈ پاس ہی ہے۔ وہاں اخبارات ورسالے کے بہت سے دفتر ہیں۔ ان دفاتر کا کچرا جہاں پھینکا جاتا ہے وہاں سے میں مطلب کی چیزیں چن لیتا اور انہیں جمع کر کے کباڑیوں کو بیچ دیتا اس طرح کچھ رقم کا بندوبست ہو جاتا۔" اس نے پھیکی سی مسکراہٹ سے کہا۔ میں اسے حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

"اوہ تم مجھے کہتے میں تمہاری فیس دے دیتی۔"

"نہیں میں نے تو زندگی میں بہت پڑھنے کا سوچا ہے بہت کچھ کرنا ہے آپ کہاں کہاں میری مدد کریں گی۔ مجھے اکیلے ہی صحرا نوردی کرنے دیں یوں مجھے زندگی کی تلخ حقیقتوں کا تجربہ بھی ہوگا۔"

"اللہ تمہاری مدد کرے۔ میں تو جا رہی ہوں۔ تم اب کتابوں اور نوٹس کے لیے کیا کرو گے۔"

"اس کا بھی کوئی نہ کوئی بندوبست ہو ہی جائے گا۔" اس نے پُرامید لہجے میں کہا۔

"میں تمہاری کامیابی کے لیے دعا گو رہوں گی۔" میں نے وعدہ کیا۔

"میرا ایمان ہے کہ اگر کسی نیک کام کے لیے انسان کا ارادہ پختہ ہو تو اللہ تعالیٰ مدد کے ہزار راستے پیدا کر دیتا ہے۔"

"انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔" میں نے کہا۔

یہ ندیم سے میری آخری ملاقات تھی پھر تقریباً تیس سال گزر گئے۔ میرے والد کی پوسٹنگ اسلام آباد میں ہوئی تھی وہیں میں نے تعلیم مکمل کی اور میری شادی ہوگئی۔ وقت تیزی سے گزرتا رہا۔ میرے بچے بھی جوان ہو گئے۔ بڑی بیٹی کی شادی بھی ہوگئی اور وہ بچے کی ماں بھی بن گئی۔ آج

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

میں نے بیٹی داماد کو افطار پر بلایا تھا۔ کچن میں باورچی پکوان بنا رہا تھا۔ مجھے بلڈ پریشر کا عارضہ ہو گیا ہے۔ اس لیے میں وہاں زیادہ ٹھہر نہ سکی اور ڈرائنگ روم میں آ گئی۔ سامنے آج کا اخبار تھا اسے اٹھا لیا۔ اخبار میں چھپا ایک مضمون پڑھ کر میں چونک گئی۔ ایک مشہور پبلشنگ ادارے پر تھا جسے لوگوں کا ایک گروپ چلاتا تھا اور اس کا مالک و بانی ندیم تھا۔ مضمون پڑھ کر یقین نہیں آیا تھا لیکن تحریر کے ساتھ جو تصویر لگی تھی وہ بلاشبہ ندیم ہی کی تھی جسے میں نے پرائیویٹ پڑھنے کا مشورہ دیا تھا اور کسی حد تک اس کی مدد بھی کی تھی۔ یہ وہی ندیم تھا۔ میں اسے ہزاروں میں پہچان سکتی تھی۔ اس مضمون میں اس کے ادارے کا نام بھی لکھا تھا۔ ''اینگک میگزین پبلشنگ ہاؤس''۔ میں نے نیٹ پر اس کا ایڈریس اور کانٹیکٹ نمبر ڈھونڈا اور ندیم سے رابطہ کیا۔ اس سے پہلی ملاقات بھی رمضان میں ہوئی تھی اس بار بھی اسے میں نے رمضان میں ہی ڈھونڈ نکالا تھا۔ یہ وہی ندیم تھا اس نے مجھے فون پر اپنی کہانی سنانا شروع کر دی۔

''نہیں ندیم یوں نہیں۔ تم ایسا کرو مجھے اپنی یہ کہانی لکھ کر پوسٹ کر دو۔ میں اس کی نوک پلک درست کر کے اسے شائع کراؤں گی۔'' میں نے کہا۔

''ٹھیک ہے میں آپ کو بھیجتا ہوں۔'' ندیم نے جواب دیا۔

دوسرے دن واٹس اپ پر مجھے ندیم نے اپنی زندگی کے اگلے تیس سال کی کہانی بھیج دی۔ یہ تب سے شروع ہوئی تھی جب میں اپنے والد کی پوسٹنگ کے وقت اس سے جدا ہوئی تھی۔ اس نے لکھا تھا کہ وہ کافی عرصے تک تینوں کام مستعدی سے کرتا رہا پھر اس نے محسوس کیا کہ دکان، کلینک اور کچرا جمع کرنے کے کاموں میں سے کچرا جمع کرنے والا کام اس کے مزاج سے زیادہ میل کھاتا ہے پھر اسے اس کے پیسے بھی اچھے ملنے لگے تھے اور اس کا پڑھنے کا شوق بھی پورا ہو رہا تھا۔

آگے کی کہانی میں ندیم ہی کے الفاظ میں آگے بڑھاؤں گی تاکہ قارئین کو اندازہ ہو سکے کہ ندیم ایک کچرا اٹھانے والے سے ایک پبلشنگ ہاؤس کا مالک کیسے بنا چنانچہ ندیم کی کہانی ندیم ہی کی زبانی سنیں۔

''میں کچرا اٹھانے کا کام مستعدی سے کر رہا تھا کبھی مجھے اتنا کچرا مل جاتا کہ اس کی کمائی سے میرے کئی دن کٹ جاتے اور کبھی کئی کئی روز تک کوئی خاص چیز نہیں ملتی۔ چنانچہ ایسی صورت میں، میں جگہ بدل دیا کرتا تھا۔ ایسے ہی ایک بار میں نے جگہ بدلی اور ایک میگزین کے دفتر کے عقب میں پہنچ گیا۔ یہ میگزین کا دفتر ایک پریس کے قریب ہی واقع تھا اس پریس کے پیچھے ایک گندی گلی بنی تھی جس میں بہت کچرا اور ردی پڑی تھی۔ میں نے وہاں سے بہت سے کاغذ اٹھائے اور اپنی بوری میں بھر لیے۔ یہاں کاغذوں کی اتنی ردی تھی جس سے کئی روز کی کمائی ہو سکتی تھی۔ میں بوری بھر کر اپنے ٹھکانے پر لے گیا۔ یہ میری مخصوص جگہ تھی جو ایک پل کے نیچے واقع تھی اس پل کے ستونوں کے نیچے میں دوپہر کی گرمی سے بچ کر پہروں اپنی ردی کے بنڈل بناتا اور پھر انہیں بیچ دیتا اس طرح زیادہ اچھے پیسے مل جاتے تھے۔

اس بار مجھے پریس اور میگزین کے دفتر کے پیچھے سے جو ردی ملی تھی اس نے ردی کو ترتیب دیتے ہوئے میرے ہاتھ ایک کاغذ لگا تحریر بہت خوش خط تھی۔ میں نے اس عبارت کو پڑھنا شروع کر دیا۔ وہ کوئی ادھورا افسانہ تھا مجھے اچھا لگا تو میں ردی میں اس افسانے کے دوسرے صفحے بھی تلاش کرنے لگا۔ مجھے چند صفحے اور مل گئے۔ میں نے انہیں ترتیب دیا اور پھر انہیں پڑھا۔ وہ افسانہ بہت دلچسپ تھا اس پر کسی نئے لکھنے والے کا نام تھا شاید دفتر والوں نے ناقابلِ اشاعت سمجھ کر ردی میں پھینک دیا تھا۔ میں نے اسے سنبھال کر رکھ لیا اس کے بعد میرا ایک اور کام شروع ہو گیا تھا۔ ردی جمع کرنے کے ساتھ ساتھ اب اس کی چیکنگ بھی کرتا تھا اور جونہی مجھے کوئی ناقابلِ اشاعت یا ادھورا مسودہ ملتا میں اسے ایک طرف رکھ دیتا۔ پہلے میں اکثر اپنا دوپہر کا کھانا گرم کرنے کے لیے کاغذ جلایا کرتا تھا لیکن اب میں بغیر دیکھے کاغذ نہیں جلاتا تھا بلکہ انہیں پڑھنے کے بعد فیصلہ کرتا تھا کہ کس کاغذ کو جلایا جائے کس کو ردی میں بیچا جائے اور کس کو مسودے کے طور پر محفوظ کیا جائے۔

شروع میں دلچسپ مسودوں کو کسی مقصد کے استعمال کرنے کے بارے میں، میں نے سوچا ہی نہیں تھا بس میں فارغ وقت میں انہیں پڑھ کر ٹائم پاس کیا کرتا تھا پھر ایک دن میرے دل میں ایک خیال آیا کہ اگر ان مسودوں کو پڑھنے کے بعد کسی لائبریری میں رکھ دیا جائے تو دوسرے لوگ بھی انہیں پڑھ سکیں گے۔ چنانچہ میں نے ایک لائبریری میں جا کر چند مسودے جمع کرائے جنہیں لائبریرین نے پسند کیا اور مجھ سے کہا کہ اگر تمہیں مزید ایسے مسودے ملیں تو لا کر مجھے دینا میں تمہیں اس کا معاوضہ دوں گا چنانچہ میں یہی

کرنے لگا۔ اب میں مکمل اور دلچسپ مسودے لائبریری میں دینے لگا۔ ایک مسودے سے مجھے ایک دن کی پوری ردی کی کمائی کے برابر پیسے مل جاتے تھے۔ چنانچہ میں نے کچرا جمع کرنا چھوڑ دیا اور صرف ردی جمع کرنے لگا۔ اس کے بعد میرے دل میں خیال آیا کہ اگر اس کام میں، میں دوسرے لوگوں کی مدد حاصل کروں تو یہ کام مزید بڑھ سکتا ہے اور میں ایک کے بجائے زیادہ لائبریریوں میں کام دے سکتا ہوں۔ چنانچہ میں نے دوسرے کچرے جمع کرنے والوں سے رابطہ کیا۔ ان میں میرا ایک دوست طارق تھا اسے بھی پڑھنے لکھنے سے شوق تھا اور اس نے میرے ہی ساتھ میٹرک کیا تھا۔ اسے یہ آئیڈیا بہت پسند آیا اور اس نے اس کام میں اپنی شراکت داری کی بات کی۔ لیکن اس میں شراکت داری کیسی؟ یہ کوئی کاروبار تو ہے نہیں؟'' میں نے اعتراض کیا۔

''تو کاروبار بن جائے گا۔'' طارق نے کہا۔

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ جب ایک لائبریری سے زیادہ لائبریریاں ہوں گی زیادہ مسودے جمع کرنا ہوں گے سلیکشن کی ٹیم بنانا ہوگی تو پھر کام تو بڑھ جائے گا۔'' طارق نے سمجھایا اور مجھے اس کا آئیڈیا پسند آیا۔ ''ٹھیک ہے تم اپنے علاقے کو سنبھالو میں اپنے علاقے کو سنبھالتا ہوں۔'' میں نے تجویز دی اس کے بعد ہم الگ الگ علاقوں میں ردی جمع کرنے لگے۔ ہمارا ٹھکانا زیادہ تر پبلشنگ ادارے، پریس اور میگزین کے دفاتر ہوتے۔ ہم ان کے عقب میں پڑے ردی کے ڈھیروں میں سے مسودے جمع کرنے لگے اور کچھ پڑھے لکھے غریب لوگوں کو مسودے پڑھنے میں لگا دیئے۔''

میں جوں جوں ندیم کی کہانی پڑھتی جا رہی تھی توں توں میری دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی اور مجھ پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ رہے تھے میں سوچ رہی تھی کہ کیا یوں بھی کاروبار ہو سکتا ہے۔ کچھ دیر رک کر میں نے آگے پڑھنا شروع کیا۔

''یوں مسودے جمع کرتے کرتے ہمارے پاس اتنے مسودے ہو گئے کہ رکھنے کی جگہ بھی نہ رہی۔ ہم لائبریریاں بڑھاتے گئے لیکن مسودوں کی تعداد بھی بڑھتی گئی۔ اب میں نے تمام ردی جمع کرنے والے اپنے دوستوں کو کہہ دیا کہ اپنا انتخاب سخت کر دیں ادھورے مسودے نہ اٹھائیں۔ مکمل اور دلچسپ مسودے ہی لائیں اور پھر میں نے ایک اور ترکیب سوچی اگر ان مسودوں کو چھپوا کر کتابی شکل میں لائبریریوں کو دیا جائے تو آمدنی میں مزید اضافہ ہو سکتا ہے۔ میرا یہ آئیڈیا میرے باقی ساتھیوں کو بھی پسند آیا۔ اب ہم نے ان مسودوں میں سلیکشن اور ایڈیٹنگ کا کام بھی کرنا شروع کر دیا۔ ابتدائیہ لکھتا۔ کہانی دلچسپ بنانے کے لیے اختتام لکھنے لگا اور ایک پبلشنگ ہاؤس سے بات کر کے انہیں سستے کاغذ اور کم خرچے پر چھپوانے بھی لگا۔ آہستہ آہستہ یہ کتابیں لوگوں میں مقبول ہو گئیں اور کم قیمت ہونے کی وجہ سے لائبریریوں میں بھی اپنی جگہ بنانے لگیں۔

میرے ساتھ کام کرنے والے سارے لوگ بے گھر تھے۔ غریب تھے صرف کچرا جمع کر کے ہی زندگی گزارتے تھے۔ چنانچہ ان کا سارا وقت اسی کام کے لیے تھا۔ ہمارے کام کے کوئی اوقات مقرر نہیں تھے۔ ہم ہر وقت دن ہو یا رات کام کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ اس بے نام سے ادارے نے بڑی جلدی ترقی کی اور ہم سے کچھ ایسے مصنفین نے بھی رابطہ کیا جو اپنی کتابیں شائع نہیں کروا سکتے تھے یا ان کی اشاعت کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ ایسے ہی لوگوں میں میری ملاقات ترانہ سے ہوئی۔ وہ بہت ہنس مکھ، خوب صورت اور حساس دل کی مالک ہے، اسے بھی لکھنے کا شوق ہے۔ وہ زیادہ تر معاشرتی کہانیاں لکھتی ہے اور اس کا تعلق بھی ایک غریب گھرانے سے ہے۔ وہ بھی اپنے ناولز کے اشاعتی اخراجات برداشت نہیں کر سکتی تھی چنانچہ اس نے مجھ سے رابطہ کیا اور میں نے اس کے ناول چھپوانے میں اس کی مدد کی۔ وہ آہستہ آہستہ میرے قریب آتی گئی اسے کمپیوٹر اور نیٹ استعمال کرنے میں مہارت تھی چنانچہ اس نے مجھے ایک اور نیا آئیڈیا دیا۔

''آپ جو کتابیں شائع کرتے ہیں انہیں نیٹ پر کیوں نہیں ڈالتے؟'' اس نے پوچھا۔

''کیا مطلب!'' میں نے حیرت سے کہا۔

''بھئی جو کتابیں لوگ لائبریریوں میں جا کر پڑھتے ہیں اور سستے داموں بازار سے خریدتے ہیں وہ کتابیں اگر انہیں نیٹ پر دستیاب ہو جائیں تو کتنا اچھا ہو اس طرح آپ کی کتابیں صرف اس ملک میں یا اس شہر میں نہیں بلکہ پوری دنیا میں پڑھی جائیں گی۔'' اس نے بتایا تو میں حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

''بھلا یہ کیسے ممکن ہے؟''

''یہ ممکن ہے۔ میں اسے ممکن بناؤں گی میں بھی آپ کے ساتھ اس کارِ خیر میں حصہ لینا چاہتی ہوں۔'' اس نے پیشکش کر دی۔

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

اس کا آئیڈیا اچھا تھا۔ چنانچہ میں نے اس کی پیشکش قبول کرتے ہوئے اسے بھی اپنی ٹیم میں شامل کرلیا۔ ہمارے کاروبار میں زیادہ تیزی آگئی تھی۔ اب ہمیں اتنی رقم مل جاتی تھی کہ ہم اپنے کارکنوں کو ماہانہ کی بنیاد پر کچھ رقم دینے لگے تھے۔ میں نے اپنے والد کا چھوڑا ہوا بوسیدہ گھر تعمیر کروالیا تھا اور وہاں اپنے بہن بھائی کے ساتھ رہتا تھا۔

میرے ساتھ کام کرتے کرتے ترانہ کو جب کچھ عرصہ ہوگیا تو اس نے ایک روز مجھے اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔ وہ مجھے اپنے والدین سے ملوانا چاہتی تھی۔ میری بھی خواہش تھی کہ میں اس کے والدین سے ملوں کیونکہ دل ہی دل میں، میں بھی ترانہ کو پسند کرتا تھا وہ میرے ہی علاقے میں رہتی تھی اور اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ جب میں اس کے گھر گیا تو اس نے مجھے اپنا کمرا بھی دکھایا جہاں بہت مختصر سا سامان تھا۔ کمرے میں ایک بیڈ اور کتابوں کی الماری کے علاوہ ایک بڑی سی رائٹنگ ٹیبل اور چیئر بھی موجود تھی۔ میز پر ایک فلیٹ اسکرین کمپیوٹر، اسپیکرز اور پرنٹر موجود تھا جہاں بیٹھ کر وہ کہانیاں لکھنے کا کام کرتی تھی۔

''میرے لکھنے کے شوق کو دیکھ کر میرے ابو نے یہ پورا سیٹ مجھے تحفے میں دیا ہے۔'' ترانہ نے مجھے اپنا کمپیوٹر دکھاتے ہوئے کہا۔

''بہت خوب اور تم نے ان چیزوں کا استعمال کہاں سے سیکھا؟'' میں نے پوچھا۔

''تعلیم حاصل کرنے دوران کمپیوٹر کا مضمون میرے سلیبس میں شامل تھا لیکن ساتھ ہی ساتھ میں نے ایک اچھے سوفٹ ویئر ہاؤس سے بھی کچھ کورسز کیے جو میرے لیے مفید ثابت ہورہے ہیں۔''

''کیا تم مجھے کمپیوٹر کا استعمال سکھا سکتی ہو؟'' میں نے اپنے دل کی خواہش کا اظہار کردیا۔

''ہاں ہاں کیوں نہیں۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ وہ ہنستے ہوئے بہت اچھی لگتی ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ میری زندگی میں اتنے دکھ اور محرومیاں آئیں کہ ہنسی مجھ سے بچھڑ ہی گئی تھی۔

پھر ترانہ نے مجھے اپنے والدین سے ملوایا۔ وہ مجھ سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ خاص طور سے ترانہ کی والدہ کی آنکھیں ان کے جذبات کی عکاسی کررہی تھیں جن میں خوشی سے آنسو آگئے تھے۔ اسے بچپن ہی سے لکھنے کا شوق تھا۔ پڑھائی سے جب وقت ملتا تو کہانیاں لکھنے بیٹھ جاتی تھی لیکن اس کو سکھانے والا کوئی نہیں تھا اس کی کہانیوں میں کوئی نہ کوئی کمی رہ جاتی تھی اور وہ شائع نہیں ہوتی تھیں لیکن جب سے تم سے ملاقات ہوئی ہے یہ بہت خوش ہے۔'' انہوں نے کھانے کی میز پر بیٹھتے ہوئے خوش دلی سے کہا۔

''یہ خود بھی بہت محنتی ہے۔ میں جانتا ہوں میرے ساتھ کام کرتی ہے۔ کسی بھی کہانی کے معیار سے اب یہ آسانی سے مطمئن نہیں ہوتی۔'' میں نے بھی مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''بس ہماری تو دعا ہے کہ اس کو اپنی زندگی کا ساتھی بھی ایسا ملے جو اس کی خواہشوں کو سمجھے اور اس کا ساتھ دے۔'' ترانہ کی والدہ نے دبے لہجے میں دلی جذبات کا اظہار کیا۔ میں نے کن انکھیوں سے ترانہ کی طرف دیکھا تھا۔ اس کے گالوں پر شرم کی سرخی نمایاں ہوگئی تھی اور وہ بظاہر انجان بنی نظریں جھکا کر کھانے میں مصروف تھی۔

ترانہ کے والدین نے جس انداز سے میرا استقبال کیا تھا اور کھانے کا جتنا اچھا انتظام کیا تھا اس سے مجھے باخوبی اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ مجھے اہمیت دے رہے تھے۔ پھر میں کئی بار ترانہ کی خواہش پر اس کے گھر گیا تھا۔ مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ بھی مجھے پسند کرتی ہے لیکن ہم دونوں کے درمیان کبھی اس موضوع پر بات نہیں ہوئی تھی۔ وہ مجھے کمپیوٹر سکھانے لگی تھی اور آہستہ آہستہ اس نے مجھے الیکٹرک میڈیا کے بارے میں بہت سی باتیں بتائی تھیں پھر مجھے پتا چلا کہ کتابیں ہاتھ سے لکھنے کے علاوہ اب کمپیوٹر سے بھی لکھی جاتی ہیں اور نہ صرف لکھی جاتی ہیں بلکہ انہیں باقاعدہ کتابی شکل بھی دی جاتی ہے اور کمپیوٹر پر نیٹ کا استعمال کرتے ہوئے انہیں مختلف ویب سائٹس پر اپ لوڈ بھی کیا جاسکتا ہے۔ یہ ویب سائٹس اپنے ملک کی اور دنیا کے کسی دوسرے ممالک کی بھی ہوسکتی ہیں جہاں سے ان کی اچھی قیمت بھی مل جاتی ہے۔

''یہ سب تو میرے علم میں نہیں تھا ترانہ، تم نے میری زندگی کو ایک نیا موڑ دے دیا ہے۔ اب میں اپنے کاروبار میں ان چیزوں سے بھی مدد لوں گا۔'' میں نے ایک روز ہنستے ہوئے اس سے کہا۔

''ہاں بالکل......! کیوں نہیں......! تم اور میں مل کر یہ کام کرسکتے ہیں اور اب تو ہماری آمدنی اتنی ہے کہ ہمیں باقاعدہ اپنا ایک دفتر بنالینا چاہیے۔'' ترانہ نے مجھے مشورہ دیا اس کی بات میرے دل کو لگی۔ میں تو دل سے اس کاروبار کو

بڑھانا چاہتا تھا ایک کاروبار جس کے بارے میں، میں نے سوچا بھی نہیں تھا بس اچانک ہی آئیڈیا میرے دماغ میں آگیا تھا اور میں نے اکیلے ہی اس پر کام شروع کر دیا تھا۔

"ٹھیک ہے ترانہ آج جب میرے گھر پر میرے باقی دوست جمع ہوں گے جو میرے اس کام میں میرے ساتھی ہیں تو میں ان سے مشورہ کروں گا۔" میں نے کہا اور واقعی پھر میں نے اسی دن اپنے دوستوں سے اس بات کو شیئر کیا تھا۔

سب کو ہی یہ آئیڈیا پسند آیا تھا اور میری تجویز پر میرے ہی گھر میں ایک کمرے میں آفس بنانے کی رضامندی دے دی گئی تھی۔ میں اپنی آمدنی کی جو رقم ہر ماہ پس انداز کرتا تھا اس سے ہی میں نے آفس کے لیے ضروری فرنیچر اور کمپیوٹر سیٹ خرید لیا تھا اور اب ہمارا کام باقاعدہ آفس میں ہونے لگا تھا۔ شہر سے جگہ جگہ سے جمع کیے جانے والے مسودات کے علاوہ ہم نئے مصنفین سے کہانیاں لکھوانے بھی لگے تھے۔

میں ترانہ کا شکر گزار تھا جس نے مجھے الیکٹرونک میڈیا کا استعمال اور اس کی اہمیت کے بارے میں بتایا پھر ایک روز ہمت کر کے میں نے اس سے دل کی بات کہہ ہی دی تھی۔

"ترانہ ایک بات کہوں؟" میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ وہ اس وقت میرے آفس ہی میں بیٹھی ہوئی تھی۔

"ہاں بولو۔" اس نے بے تکلفی سے کہا۔

"تمہیں یاد ہے جب میں پہلی بار تمہارے گھر گیا تھا تو تمہاری والدہ نے ایک بات کہی تھی؟"

"کون سی بات؟ انہوں نے تو بہت سی باتیں کی تھیں۔ تمہارا اشارہ کس بات کی طرف ہے؟"

"وہی...... تمہاری زندگی کے ساتھی کے بارے میں۔" میں نے جھجکتے ہوئے کہا تو اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

"کیا کہا تھا؟" اس نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔ گویا وہ میرے منہ سے سننا چاہتی تھی۔

"یہی کہ وہ چاہتی ہیں کہ تمہارا زندگی کا ساتھی ایسا ہو جس کی دلچسپیاں تم سے ملتی ہوں۔" میں نے کہا۔

"یہ دلچسپیاں؟ کیا مطلب؟" وہ مزید انجان بنی لیکن اس کے ہونٹوں پر بکھری شریری مسکراہٹ نے میری ہمت بڑھائی۔

"یعنی اس کا تعلق بھی لکھنے لکھانے کی دنیا سے ہو۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"ہاں...... کہا تو تھا۔" اس نے جیسے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"کیا کوئی نظر میں ہے؟" میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

"نہیں۔" اس نے شرارت سے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا جیسے مجھے دل کی خواہش کہنے پر اکسا رہی ہو۔

"میرے بارے میں کیا خیال ہے؟" میں نے ہمت کر کے کہہ ہی دیا اور وہ ہنستے ہنستے رک گئی پھر اس نے مسکرا کر نظریں جھکا لی تھیں۔

"تو یہ بات کہنے میں تم نے اتنے دن کیوں لگائے؟" اس نے دھیمے مگر شکایتی لہجے میں کہا۔

"میں ڈرتا تھا کہ شاید تم پسند نہ کرو۔"

"اگر میں تمہیں پسند نہ کرتی تو تمہیں اپنے گھر نہ بلاتی۔ اپنے والدین سے نہ ملاتی اور آج تمہارے دفتر میں نہ بیٹھی ہوتی۔" اس نے دل کی بات بڑے تھما پھرا کر کی تھی۔

"گویا تم بھی...... تم بھی مجھے پسند کرتی ہو؟" میں نے خوش ہوتے ہوئے کہا اور اس نے شرما کر اثبات میں

متوازن غذا اچھی صحت کی ضمانت ہے

پھلوں سے انسانی جسم کو بھاری مقدار میں پانی اور وٹامنز حاصل ہوتے ہیں۔ پھل انتہائی زود ہضم ہوتے ہیں اور نظام ہاضمہ اور خون کی صفائی بھی کرتے ہیں۔ ان میں بڑی مقدار میں پروٹین اور چکنائی موجود ہوتی ہے۔ ان میں موجود اورگینک ایسڈ اور شوگر کی بڑی مقدار سے انسانی جسم میں توانائی فوراً بحال ہو جاتی ہے۔ پھل اس وقت زیادہ مفید ثابت ہوتے ہیں جب وہ تازہ اور رس بھرے ہوں، اس کے علاوہ اگر ان کا استعمال صبح کے ناشتے میں کیا جائے تو صحت کے لیے اور بھی مفید ثابت ہوتے ہیں۔

شہد ایک بہترین غذا ہے۔ اس سے جسم میں کیلشیم کی کمی دور ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ جگر اور گردوں کے کام کو درست رکھتا ہے۔ شہد کے استعمال سے جسم میں خون کی بہترین فراہمی ہوتی ہے اور چہرے پر رونق اور نکھار آتا ہے۔

مرسلہ: عنایت حسین رضوی۔ دبئی، یو اے ای

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

گردن ہلا دی۔

''ارے بھئی تو پھر ہم وقت کیوں ضائع کر رہے ہیں؟'' میں نے باآواز بلند کہا اور وہ سہم کر مجھے دیکھنے لگی۔

''کیا کرتے ہو...... کوئی سن لے گا۔''

''میں سنانا ہی تو چاہتا ہوں۔'' میں نے بے خوف ہو کر کہا۔ ''بھئی لوگوں کو سناؤں گا تمہارے والدین کو بتاؤں گا دوستوں کو آگاہ کروں گا تب ہی تو ہماری شادی ہو گی۔ یہ کام خاموشی سے تو ہونے والا نہیں۔'' میں تیزی سے اپنی کرسی سے اٹھا۔ وہ میرا ارادہ بھانپ گئی تھی اس نے اٹھ کر میرا ہاتھ تھام لیا۔

''ابھی نہیں ندیم...... اچھا نہیں لگتا...... مجھے گھر جانے دو پھر تم کسی سے بات کرنا...... اور اب میں آفس نہیں آؤں گی جب تک تم میرے والدین سے میرا رشتہ نہیں مانگ لیتے۔'' اس نے نظریں جھکائے جھکائے کہا اور آفس سے نکل گئی۔

میں نے اسی روز اپنے دوستوں سے بات کی تھی انہیں بھی اس خبر سے بہت خوشی ہوئی تھی اور دوسرے ہی روز ترانہ کے گھر فون کرنے کے بعد ہم مٹھائی لے کر وہاں پہنچ گئے تھے۔ ترانہ کے والدین بہت خوش تھے ان کی دیرینہ خواہش پوری ہو رہی تھی۔ وہ اس کے لیے بہت کچھ کرنا چاہتے تھے لیکن میں نے انکار کر دیا تھا۔

''انکل! میں کچھ بھی نہیں لوں گا۔'' میں نے ترانہ کے والد کو سمجھایا جو مجھے جہیز کی لمبی فہرست دکھا رہے تھے۔

''میں نے بہت سادہ زندگی گزاری ہے اور میں اس کا ہی عادی ہوں۔ مجھے ان چیزوں کی ضرورت نہیں اور خاص طور سے جہیز کی لعنت کو میں پسند نہیں کرتا۔''

''میں جانتا ہوں۔ تمہارے خیالات سے واقف ہوں لیکن تم یہ بھی دیکھو کہ ترانہ میری اکلوتی اولاد ہے ہمارا جو بھی کچھ ہے وہ ترانہ ہی کا ہے۔ یہ سب تو تمہیں لینا ہی ہو گا۔'' انہوں نے ضد کی۔

''نہیں انکل میں آپ کی سب باتیں مان سکتا ہوں لیکن جہیز والی بات نہیں۔'' میں نے بھی اپنا فیصلہ سنا دیا۔

''میرے پاس جو بھی کچھ ہے وہ بھی ترانہ ہی کا ہے میں اس کی ضرورتیں اپنی حد میں رہ کر پوری کر سکتا ہوں۔''

''میں جانتا ہوں بیٹے لیکن میں اپنے دل کا کیا کروں۔ میں اسے خالی ہاتھ تو نہیں رخصت کر سکتا۔'' انہوں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

''ٹھیک ہے بس ضروری چیزیں جو آپ سمجھتے ہیں دے دیں لیکن زیادہ کچھ نہیں بس آپ دونوں ہمارے سر پر سلامت رہیں میرے بھی والدین نہیں ہیں۔ آج سے آپ لوگ ہی میرے...... والدین کی جگہ ہیں۔'' میں نے دل کی بات کہہ دی۔ ''میری پوری کوشش ہو گی کہ ترانہ کو خوش رکھ سکوں اور آپ کو بھی شکایت کا موقع نہ دوں۔''

پھر جلد ہی میری اور ترانہ کی شادی ہو گئی کاروبار بڑھتا گیا۔ میں نے اپنا نیا گھر اچھے علاقے میں بنا لیا۔ ترانہ کے والدین کو میں اپنے ہی گھر لے آیا ہوں کیونکہ وہ اپنے گھر میں اور ترانہ اپنے گھر میں تنہائی کا شکار تھے۔ اب سب مل کر رہتے ہیں۔ میں نے اپنا پرانا گھر اور ترانہ کے والدین کا گھر فروخت کر کے ایک بڑا دفتر بنا لیا ہے۔ ہماری کتابیں ساری دنیا میں پڑھی جاتی ہیں۔ میرا خیال ہے تمہیں میری کہانی پسند آئی ہو گی میری خواہش ہے کہ تم میرے گھر آؤ اور اپنی آنکھوں سے اس چمن کو پھلتا پھولتا دیکھو جسے تم نے لگایا تھا۔

تمہارا خیر اندیش ہمسایہ

ندیم

میں ندیم کا خط پڑھ کر بہت دیر تک ہاتھ میں لیے بیٹھی رہی۔ میں حیران تھی کہ وہ لڑکا جس کے پاس تعلیم حاصل کرنے کے پیسے نہیں تھے اتنا کامیاب انسان کیسے بن گیا اس نے اپنی کہانی بڑی تفصیل سے لکھ کر بھیج تو دی تھی لیکن میں بھی ایک بار اس سے ملنا چاہتی تھی۔ میں نے اس سے ملنے کے لیے عید کے دوسرے دن کا انتخاب کیا تھا تاکہ اتنے عرصے بعد جب ملوں تو عید کے بہانے کوئی تحفہ بھی لے کر جاؤں جب میں نے فون پر اس سے بات کی اور اس کے گھر آنے کی خواہش کا اظہار کیا، تب مجھے پتا چلا تھا کہ اس کے دو بیٹے بھی ہیں جو اسکول میں پڑھتے ہیں اور میں نے تب ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ جب جاؤں گی تو ان بچوں کے لیے بھی ان کی عمر کی مناسبت سے تحفے لے کر جاؤں گی۔ ویسے بھی میں ایک پڑوسی ہونے کے ناطے بچپن میں ندیم کے ساتھ گزاری ہوئی عیدوں کی یاد بھی تازہ کرنا چاہتی تھی۔

وہ عید کا دوسرا دن تھا۔ جب میں ندیم سے ملنے اس کے گھر گئی۔ گھر کے دروازے پر ندیم اور ترانہ نے میرا استقبال کیا اور مجھے اپنے ساتھ گھر میں لے گئے ان کا گھر دیکھ کر میں حیران رہ گئی وہاں زندگی کی تمام آسائشیں موجود تھیں۔ گھر کی سجاوٹ اور خوب صورتی ترانہ کے ذوق اور سگھڑاپے کی منہ بولتی تصویر تھی وہ دونوں مجھ سے بڑے

URDUSOFTBOOKS.COM

عیدالفطر کے حسین رنگوں سے سجا جولائی 2017ء کا خوشیاں بکھیرتا پاکیزہ

DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

ماہنامہ **پاکیزہ** کراچی

رفعت سراج و شیریں حیدر کے دلکش ناول، نت نئے روپ لیے......

سحر ساجد کے خوب صورت اندازِ بیان کا مرقع **من جاں بازم**

سیما رضا ردا کا منی ناول، تیزی سے اگلی منزل کی جانب گامزن

اختر شجاعت، اخلاص کے موثر بیان کے ساتھ

عید کے رنگ **عقیلہ حق، رضوانہ پرنس، منشا محسن علی، غزالہ عزیز** کے ساتھ ساتھ دیگر مایہ ناز رائٹرز کی تحریروں کے سنگ۔

پاکیزہ کی دیرینہ ساتھی و معروف قلم کار **فریدہ اشفاق** نے بڑھائی ہماری بزم کی رونق

شائستہ زرین کے دلچسپ خصوصی عید **سروے** میں شرکاء کے خوب صورت جوابات

اس کے علاوہ

نادیہ احمد، فریدہ سیفی، فوزیہ احسان رانا، فصیحہ آصف خان، فریدہ لاکھانی، فوزیہ اشرف و ریما نور رضوان کے پُرمسرت افسانے

عید کی مناسبت سے دل خوش کن سلسلے مزیدار پکوان مہندی کے حسین ڈیزائن لوجیے سنورنے کے انداز صرف آپ کی خوش ذوقی کی خاطر

DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

تپاک سے ملے۔

"تم تو بہت بدل گئے ہو ندیم۔" میں نے اسے دیکھ کر کہا۔ میرے سامنے ایک منحنی، بکھرے بالوں والے معصوم صورت لڑکے کی بجائے تندرست و توانا بہترین لباس میں ملبوس شخص کھڑا تھا۔

"بھئی تم سے میں تیس سال بعد مل رہا ہوں۔ تیس سال میں تو دنیا بدل جاتی ہے۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا اور مجھے ڈرائنگ روم میں لے گیا جہاں بہترین قسم کے صوفے موجود تھے۔ دروازوں اور کھڑکیوں پر قیمتی پردے پڑے ہوئے تھے۔ ڈرائنگ روم سے متصل ڈائننگ روم بنا تھا جس کے شیشے کے دروازے سے وہاں رکھی ہوئی فل سائز کی ڈائننگ ٹیبل نظر آرہی تھی۔ ترانہ میرے قریب ہی آبیٹھی تھی۔ وہ گلابی کلر کا قیمتی سوٹ زیب تن کیے تھی۔

"ندیم نے مجھے آپ کے بارے میں بتایا تھا ان کا کہنا ہے کہ وہ آج جو کچھ ہیں آپ کی بدولت ہیں۔" ترانہ نے کہا۔ "وہ اکثر آپ کا ذکر کرتے ہیں اور بچوں کو بھی آپ کی مثالیں دیتے ہیں۔"

"یہ تو ندیم کا بڑا پن ہے جو وہ ایسا کہتے ہیں ورنہ میں نے ان کے لیے کچھ خاص نہیں کیا۔" میں نے کہا۔ اس وقت ندیم کمرے میں موجود نہیں تھا وہ مجھے بٹھا کر کمرے سے چلا گیا تھا۔ کچھ ہی دیر میں گھر کی ملازمہ نے آکر ترانہ کو اشارہ کیا اور مجھے سلام کرتی ہوئی کمرے سے چلی گئی۔

"آئیں عید کا موقع ہے۔ منہ میٹھا کریں ہمارے ساتھ۔" ترانہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔ میں بھی اس کے ساتھ اٹھ گئی تھی اور ہم لوگ ڈائننگ روم میں جا بیٹھے تھے۔ میز پر قرینے سے کئی ڈشز رکھی ہوئی تھیں اور ساتھ ہی ڈشز کے ڈیزائن کی چھوٹی پیالیاں موجود تھیں۔

"لیں...... یہ چکھیں...... میں نے خاص طور سے عید کے موقع پر آپ کے لیے بنائی ہے۔" ترانہ نے سویوں کی ڈش میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"شکریہ۔" میں نے ڈش میں سے کچھ سویاں اپنی پیالی میں ڈال لیں۔

"ترانہ تم نے ندیم کو کیسا پایا؟ تم اس کے ساتھ خوش ہو؟" میں نے پوچھا حالانکہ اس کے چہرے سے جو خوشی نمایاں تھی وہ اس بات کی گواہی دے رہی تھی کہ وہ ندیم کے ساتھ بہت پرسکون زندگی گزار رہی ہے۔

"ہاں! اللہ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے اتنی محبت کرنے والا شوہر دیا اور ایک پُرسکون زندگی عطا کی۔"

ترانہ نے کہا کچھ ہی دیر بعد ندیم اپنے بچوں اور ساس، سسر کو بھی وہاں لے آیا تھا۔ سب ہی مجھ سے مل کر خوش ہوئے۔

"ندیم میں جو پیکٹس لائی ہوں وہ ڈرائنگ روم میں رکھے ہیں اور وہ تم سب کے لیے عید کا گفٹ ہیں۔" میں نے کہا۔

"ہاں! میں جانتا ہوں یہ سب تم نے مجھ سے عیدی لینے کے لیے کیا ہے۔" ندیم نے ہنستے ہوئے مذاق کیا۔

"یونہی سمجھ لو تمہاری طرف بہت سی عیدوں کی عیدی جمع ہوگئی ہے میری۔" میں نے اسے جتایا۔

کچھ دیر ندیم کی فیملی کے ساتھ گزارنے کے بعد میں واپسی کے لیے کھڑی ہوئی تو ندیم بھی کھڑا ہوگیا۔

"بھئی تم جس مقصد سے آئی ہو وہ تو رہ ہی گیا۔" اس نے کہا۔

"کیا مطلب؟"

"بھئی تم مجھ سے ملنے آئی تھیں تو تمہارا مقصد یہی تھا نا کہ تم تیس سال پہلے والے اور آج کے ندیم میں فرق دیکھنا چاہتی تھیں۔"

"ہاں بالکل۔"

"تو یہ فرق تمہیں میرا پبلشنگ ہاؤس دیکھنے کے بعد زیادہ نمایاں محسوس ہوگا آؤ میں تمہیں اپنا آفس بھی دکھاتا ہوں۔" ندیم نے دروازے کی طرف قدم بڑھایا۔

"ہاں ضرور...... میں ضرور دیکھنا چاہوں گی۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

پھر ندیم مجھے اپنا پبلشنگ ہاؤس اور آفس دکھانے لے گیا تھا ترانہ بھی ہمارے ساتھ تھی اور ندیم کی گاڑی میں بیٹھتے ہوئے میں سوچ رہی تھی کہ وہ معصوم، غریب اور تعلیم کا شوقین بچہ جسے میں تیس سال پہلے جانتی تھی آج اپنی محنت کی بدولت اپنی فیملی اور دوستوں کے لیے ایک چھتنار درخت بن چکا تھا۔ اس نے تعلیم تو میٹرک تک ہی حاصل کی تھی لیکن آج وہ جو کتابیں شائع کر رہا تھا۔ اس میں ناولوں کے علاوہ طالب علموں کے لیے علم کے بڑے بڑے ذخیروں پر مبنی معلوماتی کتابیں بھی تھیں۔ وہ علم کا پیاسا اب دوسروں کی علمی پیاس بجھانے کے لیے علم کا سمندر لٹا رہا تھا اور سب کے لیے چھتنار درخت بنا ہوا تھا۔

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

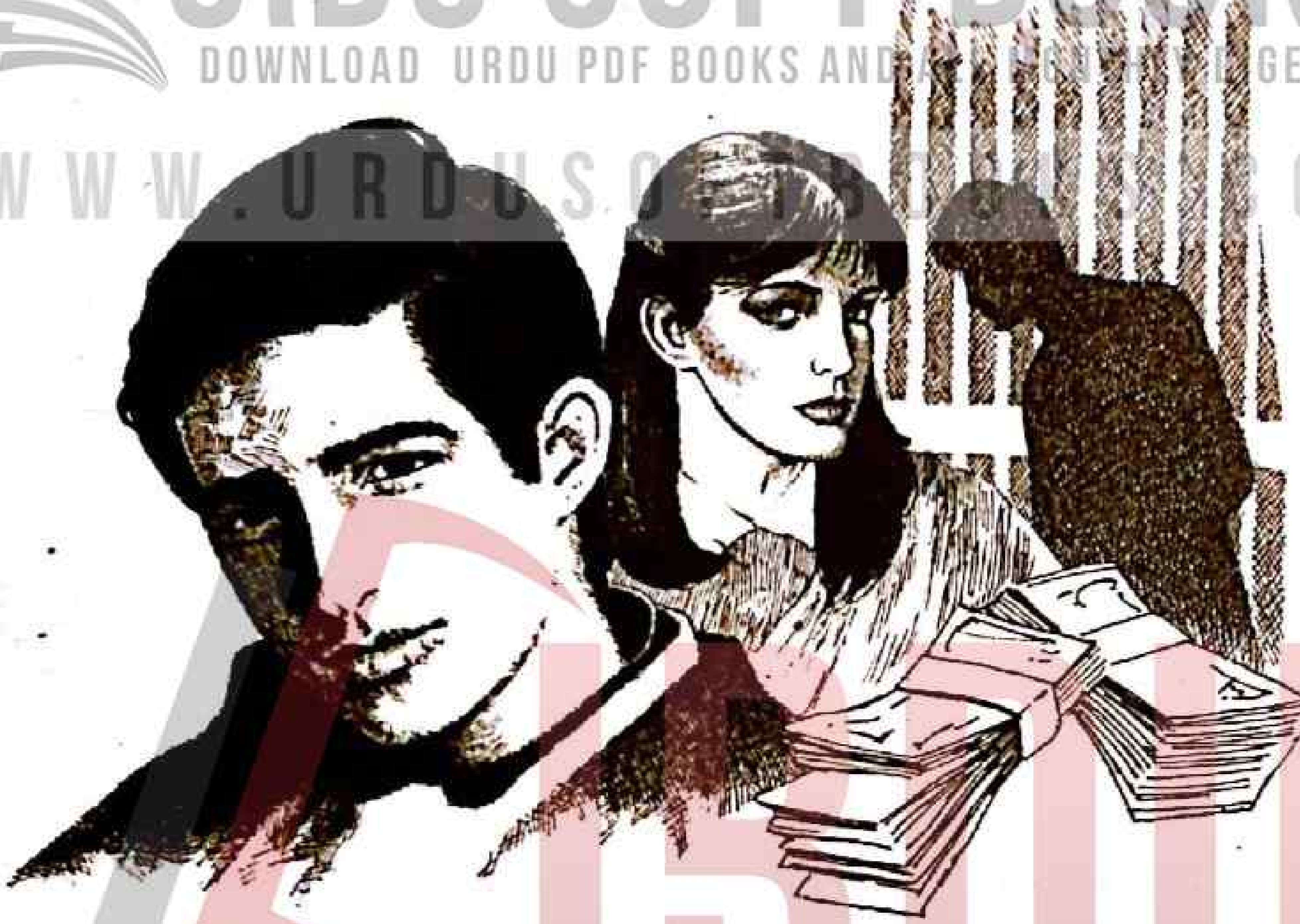

دیر آید

محترم ایڈیٹر سرگزشت
السلام علیکم
ایک مشہور ضرب المثل ہے کہ دیر آید درست آید۔ یہ کہاوت محترمہ شمع پر مکمل ہے۔ اس نے کس طرح اپنی زندگی خود تباہ کی یہی کچھ میں بیان کررہا ہوں۔ صرف اس اُمید پر کہ دوسری عورتیں بھی شمع کی طرح اپنی زندگی برباد نہ کریں۔

کبیر عباسی
(مری)

میں بلیو ٹوتھ ہینڈز فری کانوں میں لگائے برتن دھونے میں مصروف تھی۔ سماعت میں "فاسٹ ٹریک" دھما دھم بج رہا تھا۔ اس کے ردھم پر میرے ہاتھ بھی تیزی سے چل رہے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ کچھ ہی دیر میں برتنوں کا ڈھیر دھل گیا۔

ویسے تو لنچ کے وقت میں گھر میں اکیلی ہی ہوتی ہوں اپنے لیے بہت ہلکا پھلکا سا کچھ بناتی ہوں مگر آج لنچ میں اپنی ایک دوست افشاں کو مدعو کیا تھا۔ وہ کافی عرصے

DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

بعد ہمارے گھر آرہی تھی اس لیے میں نے اچھا خاصا اہتمام کیا تھا۔ چائنیز رائس کے ساتھ مٹن کڑاہی اور رشین سلاد تھا۔ چکن تمبورا اور بیف رول فرائی بنائے تھے جبکہ سویٹ میں کافی ڈیزرٹ تھا۔ باقی کولڈ ڈرنکس جیسے لوازمات تو تھے ہی۔

دعوت انتہائی شاندار رہی تھی۔ افشاں نے میرے بنائے ہوئے کھانوں کی کھلے دل سے تعریف کی تھی۔ میں اس کی تعریف سن کے بہت خوش ہوئی مگر اس تعریف کی قیمت مجھے ڈھیر سارے برتن دھو کے چکانا پڑی۔ گھر کے سارے کام میں انتہائی خوش دلی سے کرتی ہوں بس برتن دھوتے ہوئے میری جان جاتی ہے۔

میں برتن دھو کے اب فارغ ہوئی تھی، حمنہ اور ارحم ٹیوشن پڑھنے گئے ہوئے تھے۔ میں کمر سیدھی کرنے کے لیے صوفے پر ڈھے سی گئی۔ سامنے ٹی وی تھا۔ میں ٹی وی پر چینلز سرچ کررہی تھی کہ میرا سیل بجا۔ یہ میرے شوہر کے بھانجے عاشر کی کال تھی جو انہی کے دفتر میں کام کرتا تھا۔

میں نے کال ریسیو کرکے ہیلو کہا۔ وہ میری آواز سنتے ہی تیز تیز بولنے لگ گیا۔

”کیا؟ کب ہوا یہ سب؟“ عاشر کی بات سن کر تو میرے ہوش ہی اڑ گئے۔

عاشر تفصیل بتانے لگا۔

”نہیں، نہیں حمزہ ایسا نہیں کرسکتے۔ انہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہوگی۔“ میں بے یقینی کے عالم میں بولی۔

”آنٹی وہ رنگے ہاتھوں پکڑے گئے ہیں۔“ وہ اپنی بات پر زور دے کے بولا۔

”اف، یا خدایا۔“ میں سر پکڑ کے بیٹھ گئی۔

”آنٹی، آپ فکر نہ کریں۔ انشا اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ عاشر مجھے تسلی دینے لگا۔

اب بھلا اب ٹھیک ہوسکتا تھا؟

میرے اندر کشمکش کی ایک لہر اٹھی۔ حمزہ کی اس حرکت کے بعد میں تو کسی کو منہ دکھانے کے قابل بھی نہ رہی تھی۔ میرے رشتے دار جو بظاہر مجھ سے بہت خوش اخلاقی سے پیش آتے تھے، انہیں تو مجھ پر طنز کرنے کا موقع ہاتھ آجائے گا۔ میں جانتی تھی وہ سب اندر ہی اندر مجھ سے خار کھاتے ہیں۔ بعض لوگ تو حمزہ کے بارے میں اشاروں ہی اشاروں میں کافی کچھ کہہ دیتے تھے مگر میں ان کی باتوں کو ہمیشہ نظرانداز کردیتی تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ سب مجھ سے حسد کرتے ہیں اس لیے ایسا کہتے ہیں مگر شاید وہ ٹھیک کہتے تھے۔ میری ہی آنکھوں پر پٹی بندھی تھی۔

اف، حمزہ آپ پر مجھے کتنا مان، کتنا بھروسا تھا۔ آپ نے تو میرا سارا مان توڑ دیا۔ کیوں کیا آپ نے ایسا۔ کس چیز کی کمی تھی آپ کو۔ میرے ذہن میں بگولے اٹھ رہے تھے۔

فون رکھنے کے بعد میں گم صم سی بیٹھی تھی۔ جانے میری پُرسکون زندگی کو کس کی نظر لگ گئی تھی۔ میں نے تو زندگی میں اس طرح کی صورتِ حال کے متعلق کبھی سوچا تک نہیں تھا۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ اب میں کیا کروں۔

میں خیالوں میں کھوئی اپنے آپ سے لڑ رہی تھی اور وقت گزرتا جارہا تھا کہ کال بیل کی آواز پر چونکی۔ بمشکل قدم گھسیٹتے ہوئے میں گیٹ تک گئی۔ گیٹ پر بچے تھے۔ ارحم کی عمر تیرہ سال ہے جب کہ حمنہ نو سال کی ہے۔ وہ اندر آتے ہی اپنے کمرے میں چلے گئے۔ انہوں نے میری پریشانی کو محسوس ہی نہیں کیا۔

کافی دیر سوچ بچار کے بعد میں ایک فیصلے پر پہنچ ہی گئی۔ اب حمزہ کے ساتھ باقی زندگی گزارنا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ میں نے سیل اٹھایا اور اپنے بھائی کا نمبر ملانے لگی۔

☆☆☆

میرا تعلق ایک خوشحال گھرانے سے تھا۔ شروع میں ہم مالی لحاظ سے اتنے اچھے نہیں تھے۔ ابو فوج میں تھے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد انہوں نے ہارڈ ویئر اور سینٹری کے سامان کا اسٹور کھول لیا تھا۔ اسٹور چل نکلا اور گھر میں پیسے کی ریل پیل ہوگئی۔

گھر میں امی ابو کے علاوہ مجھ سے بڑا ایک بھائی اور دو چھوٹی بہنیں تھیں۔ بھائی میٹرک میں تھا جب ابو نے ہارڈ ویئر کا بزنس شروع کیا۔ میٹرک کے بعد وہ ان کا.... ہاتھ بٹانے لگا تھا۔

مجھے بھی پڑھائی کا کوئی خاص شوق نہیں تھا۔ بڑی مشکل سے بیس سال کی عمر میں ایف اے ہی کرسکی تھی۔

اب میں گھر میں ہی تھی کہ میری امی نے میرا رشتہ ڈھونڈنا شروع کردیا۔ رشتہ آیا مگر جب انہوں نے میری چھوٹی بہن کو دیکھا تو اسے پسند کرلیا۔ میں شکل صورت کی تو اچھی تھی مگر قد کچھ چھوٹا تھا۔ رشتہ اچھا تھا امی نے میری چھوٹی بہن کے لیے قبول کرلیا۔

میں اپنے قد کو تو نہیں بڑھا سکتی تھی البتہ اپنے اندر کچھ

اور ایسی خوبیاں پیدا کر سکتی تھی جن کے نتیجے میں میری یہ خامی قدرے دب جاتی۔ میں نے کٹنگ اور ڈریس ڈیزائننگ کے کچھ کورس کر لیے۔ کچھ تو مجھ میں اس کام کی قدرتی صلاحیت بھی کچھ شوق کی وجہ سے جلد ہی میں اس کام میں ماہر ہو گئی۔ کوئی بھی فنکشن ہوتا میں خوب بن ٹھن کے جاتی۔ ہر طرف میرے پہناوے کے چرچے ہونے لگے۔ ہمارے گھر کوئی مہمان آتا تو میں کھانے میں خاص اہتمام کرتی۔ نت نئے کھانے بنانا میرا من پسند مشغلہ جو تھا۔ گھر میں پیسے کی کمی نہ تھی اس لیے مجھے کوئی پریشانی نہیں تھی۔ نتیجے میں خاندان بھر میں میری ہنرمندی اور سلیقے کی دھوم مچ گئی۔

میری ان کوششوں کا خاطر خواہ فائدہ ہوا اور میرا ایک اچھے گھرانے سے رشتہ آ گیا۔ حمزہ ہمارے دور پار کے عزیز تھے۔ ان کے بارے میں اتنا ہی پتا چلا کہ سرکاری ملازم ہیں۔ شکل وصورت کے بھی اچھے تھے۔ ان کے ابو کا سپر اسٹور تھا۔ مالی لحاظ سے وہ ہمارے ہم پلہ ہی تھے۔ رشتہ طے ہونے کے بعد جلد ہی ہماری شادی ہو گئی۔

حمزہ بہت اچھے شوہر ثابت ہوئے۔ انہوں نے شادی کی وجہ سے اپنی جاب سے ایک ماہ کی چھٹیاں لے رکھی تھیں۔ پہلا ماہ دعوتیں کھانے میں ہی گزر گیا۔ میں کہیں ہنی مون پہ جانا چاہتی تھی مگر دعوتوں کی وجہ سے موقع ہی نہیں مل سکا۔ البتہ حمزہ شہر ہی میں مجھے ایک دو دفعہ گھمانے لے گئے۔

انہوں نے جاب پر جانا شروع کیا تو میں نے کچن سنبھال لیا۔ میری ایک ہی نند تھی اور وہ شادی شدہ تھی۔ ایک دیور بھی تھا وہ اپنے ابو کے ساتھ جنرل اسٹور پر ہی ہوتا تھا۔ دن کے وقت گھر میں میرے علاوہ صرف میری ساس ہی ہوتی تھیں۔ انہوں نے کچن میں میرا خیر مقدم کیا۔ میں گھر والوں کے لیے جو کچھ بھی پکاتی ان کے مشورے ہی سے پکاتی تھی۔ وہ بھی مجھ سے مطمئن تھیں۔

انہی دنوں میری ایک دوست مجھ سے ملنے آئی۔ وہ میری شادی کے بعد پہلی بار میرے گھر آئی تھی۔ میں نے اس کے لیے کھانے میں خصوصی اہتمام کیا۔

جب وہ واپس چلی گئی تو میری ساس مجھ سے کہنے لگی۔ ”اتنا اہتمام کرنے کی کیا ضرورت تھی؟“

مجھے بہت برا لگا۔ تاہم میں تحمل سے بولی۔ ”آنٹی، وہ شادی کے بعد پہلی بار میرے گھر آئی تھی۔ میں جیسا اہتمام اس کے لیے اپنے گھر کرتی تھی ویسا ہی ادھر کیا ہے۔“

”ٹھیک ہے ادھر تم جیسا بھی کرتی تھی تمہارے باپ کا گھر تھا مگر پرائے گھر میں جا کے سسرال والوں کی مرضی کے مطابق چلنا پڑتا ہے۔“ وہ سپاٹ انداز میں بولیں۔

میری عادت ہے کہ اپنی ذمہ داری میں خوش اسلوبی سے پورا کرنے کی کوشش کرتی ہوں مگر میرے کام میں کوئی مداخلت کرے یہ مجھے گوارہ نہیں۔ میں ان سے بحث نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس لیے خاموش ہو گئی۔

شام کو حمزہ گھر آئے تو میں منہ بسورے بیٹھی تھی۔ میں نے رات کا کھانا بھی نہیں بنایا تھا۔

”کیا ہوا، خیریت تو ہے۔ یہ میری جان کے منہ پہ سات بجے ہی بارہ کیوں بج رہے ہیں؟“ وہ ہلکے پھلکے انداز میں بولے۔ ان کی آنکھوں میں شوخی تھی۔

میں تو پھٹ ہی پڑی۔ ”حمزہ، آپ بیوی بیاہ کے لائے ہیں یا کٹھ پتلی جو سب کے اشاروں پہ ناچتی رہے؟“

وہ محتاط انداز میں بولے۔ ”کیوں کیا ہوا۔ امی نے کچھ کہا ہے؟“

میں نے انہیں سارا قصہ سنا دیا۔ جسے سن کے ان کے چہرے پر شکنیں پڑ گئیں۔

”تم بھی ناں، میں سمجھا پتا نہیں کیا ہو گیا۔ دیکھو بھئی، اس گھر میں اتنے عرصے سے امی کے حکم کا سکہ چل رہا ہے۔ اب یکدم ہی تو وہ اپنی حکومت کسی دوسرے کے حوالے نہیں کر سکتیں۔ تھوڑا صبر کرو۔ جلد ہی تم اپنی مرضی سے سب کچھ کر سکو گی۔“ انہوں نے رسان سے مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔

ان کی باتیں سن کے مجھے کافی مایوسی ہوئی۔ میرا تو خیال تھا وہ میری ڈھارس بندھائیں گے اور اپنی امی سے اس حوالے سے بات بھی کریں گے مگر وہ تو الٹا مجھے ہی سمجھانے لگ گئے تھے۔

خیر اس مسئلے کا بھی میرے پاس ایک حل تھا بس مجھے تھوڑے صبر کی ضرورت تھی۔ یہی سوچ کے میں نے ان سے بحث نہیں کی، مگر اس واقعے کے بعد میں اپنی ساس سے کچھ کھنچی کھنچی رہنے لگی۔ انتہائی ضرورت کے علاوہ ان سے بات نہ کرتی۔ انہوں نے بھی کوئی خاص نوٹس نہیں لیا۔

دو تین دن بعد ہی میری ایک دوست عالیہ کی کال آئی۔ حال احوال دریافت کرنے کے بعد وہ مجھ سے بولی۔ ”شمع، میں شاپنگ پر جا رہی تھی۔ تم ساتھ چل سکتی ہو؟“

شاپنگ تو میرا من پسند مشغلہ تھا۔ شادی کی شاپنگ

DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

کے بعد سے اب تک مجھے شاپنگ کے لیے کہیں جانے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ میں نے ہامی بھر لی۔

''میں ٹیکسی میں آؤں گی اور تمہیں تمہارے گھر سے پک کرلوں گی۔ تم تیار رہنا۔'' اس نے کہا تو میں نے اوکے کردیا۔

فون رکھنے کے بعد میں نے حمزہ کو کال کر کے شاپنگ پر جانے کا بتا دیا۔ وہ کچھ مصروف لگ رہے تھے اس لیے ٹھیک ہے کہہ کے انہوں نے فون بند کردیا۔ کچھ دیر کے بعد ہی کال بیل بجی تو میں پرس لے کے باہر آگئی۔

عالیہ نے شاپنگ پر کافی دیر لگا دی۔ مجھے تو کچھ لینا نہیں تھا، تاہم اس کے ساتھ شاپنگ کرتے ہوئے وقت کا پتا ہی نہیں چلا۔ واپسی پر وہ مجھے گیٹ پر ڈراپ کر کے اپنے گھر چلی گئی۔ آج کافی دن بعد میں گھر سے نکلی تھی۔ اس لیے خاصی خوش تھی۔

ایک گانا گنگناتے ہوئے میں لاؤنج میں داخل ہوئی تو میری نظر اپنی ساس پر پڑی۔ وہ صوفے پر بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھیں۔ میں انہیں نظر انداز کر کے اپنے کمرے کی طرف جانے لگی کہ ان کی کڑک دار آواز میرے کانوں میں پڑی۔

''کدھر گئی تھیں؟''

ان کے سوال سے زیادہ ان کا لہجہ مجھے ناگوار گزرا۔ تاہم میں نے خود پر قابو پایا اور نارمل انداز میں بولی۔ ''عالیہ کے ساتھ شاپنگ پر گئی تھی۔ اسے کچھ چیزیں لینی تھیں۔''

''وہ تو ٹھیک ہے مگر کس سے پوچھ کے گئی تھیں؟'' وہ پاٹ دار آواز میں بولیں۔

''حمزہ کو بتا دیا تھا میں نے۔'' میں نے اس بار بھی اپنا لہجہ اعتدال پر ہی رکھا تھا۔

''اس گھر میں صرف حمزہ نہیں رہتا۔ تم جدھر بھی جاؤ گی مجھ سے پوچھ کے جاؤ گی۔ سنا تم نے؟''

میں ان کی بات کا جواب دیے بغیر کمرے میں آگئی۔ اب پانی سر سے اونچا ہونے لگا تھا۔ مجھے جلد ہی اس مسئلے کا کوئی حل ڈھونڈنا تھا۔

شام کو حمزہ گھر آئے تو میں معمول کے مطابق ان کے لیے چائے بنا کے لے آئی۔ وہ کافی تھکے ہوئے لگ رہے تھے۔ میں ان کے پاس بیٹھ کے ان کے بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگی۔

شادی کے بعد ہی مجھے پتا چلا تھا کہ وہ میونسپل کارپوریشن میں کلرک ہیں۔ میں تو انہیں کوئی آفیسر سمجھتی تھی۔ ہر کوئی یہی کہتا پایا جاتا تھا، بہت اچھی سرکاری نوکری ہے باپ کا بہت بڑا اسٹور ہے، وغیرہ وغیرہ۔

ان کی کلرکی کا سن کے مجھے مایوسی تو ہوئی تھی مگر اب کیا ہوسکتا تھا۔

ان کا دفتر میرے میکے سے کافی قریب پڑتا تھا، مگر یہاں سے ان کا دفتر کافی دور تھا۔ انہیں روز ڈیڑھ گھنٹے کے لگ بھگ سفر کرنا پڑتا تھا۔ وہ بھی دو گاڑیاں تبدیل کر کے۔ شام کو رش بھی بہت ہوتا تھا جس کی وجہ سے وہ جب گھر آتے تو بہت تھکے ہوئے ہوتے تھے۔

میں ان کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے پیار سے بولی۔ ''آپ روز اتنا لمبا سفر کر کے تھک جاتے ہیں۔ کہیں پاس ہی ٹرانسفر کیوں نہیں کرا لیتے۔''

''تھک تو جاتا ہوں مگر کیا کروں۔ اس کے علاوہ شہر میں میونسپل کارپوریشن کا اور کوئی دفتر نہیں ہے۔'' وہ میری ناک مروڑتے ہوئے شریر سے انداز میں بولے۔

میں یہ جانتی تھی کہ شہر میں میونسپل کارپوریشن کا اور کوئی دفتر نہیں، یہ بات تو میں نے بطور تمہید ہی کی تھی۔

''تو پھر دفتر کے قریب کوئی گھر دیکھ لیں۔ تین گھنٹے تو روز آپ کے سفر میں ''suffer'' کرتے ہوئے ضائع ہو جاتے ہیں اور اتنا زیادہ کرایہ الگ سے لگ جاتا ہے۔'' میں فکرمندی سے بولی۔

''یہ تو ہے مگر مجبوری ہے جان۔ میری تنخواہ سے تو ہم دو لوگوں کی ضروریات پوری ہونی بھی مشکل ہیں۔ گھر کا کرایہ میں کہاں سے ادا کروں گا۔'' وہ بے بسی سے بولے۔

''کیا مطلب۔ آپ کی تنخواہ کتنی ہے کہ ہماری ضروریات تک پوری نہیں ہوسکتیں۔'' میں چونکی۔

''بس گزارے لائق ہی ہے فی الحال تو۔ ابھی نئی نئی نوکری ہے تم فکر نہ کرو آہستہ آہستہ بڑھ جائے گی۔'' انہوں نے مجھے بہلایا۔

''اچھا تو آپ بھی دوسرے مردوں کی طرح اپنی تنخواہ مجھے نہیں بتانا چاہتے۔'' میں نے منہ بسورا۔

وہ میرے منہ بسورنے پر ہنسنے لگے۔ پھر انہوں نے جیب میں ہاتھ ڈال کے ایک کاغذ میری طرف بڑھایا۔ ''یہ میری سیلری سلپ ہے۔ آج ہی دفتر سے ملی ہے۔ دیکھ لو میری تنخواہ۔''

تنخواہ دیکھ کے مجھے خاصی مایوسی ہوئی۔ اس تنخواہ میں

تو مہینے میں میرے دو جوڑے بمشکل آسکتے تھے۔
"اوہ، یہ تو بہت کم ہے اس میں ہمارا گزارا کیسے ہو گا؟" میں پریشانی سے بولی۔
"میں نے کہا نا تنخواہ آہستہ آہستہ بڑھ جائے گی۔ ویسے بھی فی الحال ہمارے کون سے اتنے خرچے ہیں۔ گھر ابو کے پیسوں سے چل رہا ہے۔ میں تو تھوڑے سے پیسے امی کو دینے کے علاوہ سارے ہی بچا لیتا ہوں۔" انہوں نے مجھے تسلی دی مگر میری پریشانی بڑھ گئی۔ آخر ساری زندگی ہم اسی گھر میں نہیں رہ سکتے تھے۔ ساری زندگی کیا مجھے تو یہ گھر ابھی سے کال کوٹھڑی کی طرح لگنے لگا تھا جہاں میں اپنی مرضی سے کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ خیر اس مسئلے کا بھی کوئی نہ کوئی حل نکل ہی آئے گا۔ میں نے خود کو تسلی دی۔
کچھ دن کے بعد ہی مجھے اپنے مسئلے کا ایک حل مل ہی گیا۔ میں اپنے میکے آئی ہوئی تھی۔ پتا چلا کہ ہمارے کرائے دار گھر خالی کر رہے ہیں۔ میں نے امی کے سامنے اپنے سارے مسئلے رکھے اور ان سے کہا کہ مکان کرائے پر دینے کی بجائے مجھے دے دیں۔ امی کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ وہ مان گئیں۔ مسئلہ حمزہ کو منانے کا تھا، مگر یہاں بھی قدرت نے میری مدد کی۔
انہی دنوں شہر میں سڑکوں کی مرمت کا کام شروع ہو گیا۔ اس وجہ سے شہر کے ایک خاص روٹ پر ٹریفک کا مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ یہ روٹ حمزہ کے دفتر کے راستے میں ہی آتا تھا۔ پہلے جو انہیں دفتر سے واپسی میں ڈیڑھ گھنٹا لگتا تھا اب تین گھنٹے سے بھی زیادہ لگنے لگے۔ صبح بھی انہیں جلدی نکلنا پڑتا۔ وہ انتہائی چڑچڑے ہو گئے تھے۔
جس رفتار سے کام چل رہا تھا اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ کم سے کم ایک سال انہیں یہ مصیبت سہنا ہوگی۔ ایسے میں میں نے انہیں کہا کہ ہم عارضی طور پر اپنی امی کے مکان میں شفٹ ہو جاتے ہیں۔ وہ اس کے لیے راضی تو نہیں تھے مگر چار و ناچار انہیں ماننا ہی پڑا۔
حسب توقع ان کی امی نے ناک بھوں چڑھائی مگر حمزہ نے عارضی شفٹنگ کا کہہ کر انہیں رام کر ہی لیا۔ ویسے بھی ان کے پاس تو حمزہ کے مسئلے کا کوئی حل تھا نہیں۔
جہیز کے سامان میں مجھے ضرورت کی تمام اشیا مل گئی تھیں۔ میں نے وہ سارا سامان شفٹ کرا لیا۔ حمزہ نے سارے سامان کی شفٹنگ پر اعتراض کیا۔
"شمع، ہم کچھ عرصے کے لیے ہی تو شفٹ ہو رہے ہیں۔ پھر سب چیزیں شفٹ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔"
میرا ارادہ واپس اس گھر میں آنے کا نہیں تھا تاہم میں حمزہ کو فی الحال یہ نہیں بتا سکتی تھی اس لیے بولی۔ "بھئی، مجھے پتا ہے ہمیں وہاں کس کس چیز کی ضرورت پڑے گی۔ اب ہم یہ چیزیں بار بار دوسروں سے مستعار مانگتے اچھے لگیں گے۔" میں جارحانہ انداز میں بولی۔
میرے جواب نے پتا نہیں انہیں مطمئن کیا تھا یا نہیں بہرحال وہ میرا انداز دیکھ کے دب ضرور گئے۔ اس کے بعد وہ اس حوالے سے کبھی کچھ نہیں بولے۔
بھابی کو میرا وہاں شفٹ ہونا پسند نہیں آیا تھا۔ اس مکان کا کرایہ وہی رکھا کرتی تھیں مگر مجھے ان کی پروا نہیں تھی۔ اس گھر میں میرا بھی حصہ تھا۔ وہ یہ بات جانتی تھیں اس لیے اعتراض کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھیں۔
انہی دنوں میں اُمید سے ہو گئی۔ حمزہ میرا ہر طرح سے خیال رکھنے لگے۔ اب وہ صرف بیس منٹ میں دفتر سے واپس گھر پہنچ جاتے تھے۔ اس سہولت نے بھی ان کے مزاج پر خوشگوار اثرات ڈالے تھے۔
سردیوں کی آمد آمد تھی۔ میرے ایک کزن کی شادی تھی۔ میں نے شادی کے لیے کچھ شاپنگ کرنی تھی۔ میں نے حمزہ سے کہا تو وہ حیران رہ گئے۔
"اتنے کپڑے اور جوتے وغیرہ تو ہیں تمہارے پاس۔ شادی پر بیس سے زائد جوڑے تو تم نے لیے تھے جن میں سے کچھ تو ابھی تم نے پہنے بھی نہیں ہیں؟" وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے بولے۔
"اُفوہ، ان میں سے زیادہ تر گرمیوں کے سوٹ تھے۔ اب سردیوں کے لیے کچھ الگ سے تو لینا پڑیں گے ناں؟" میں معصومیت سے بولی۔
"کچھ سردیوں کے بھی تو تھے جو تم نے پہنے ہی نہیں۔" وہ اپنی جھنجلاہٹ پر قابو پاتے ہوئے بولے۔
"وہ آپ کی طرف سے تھے اور مجھے وہ پسند بھی نہیں آئے تھے اس لیے نہیں پہنے۔ بہرحال لے کے دینے ہیں تو بتا دیں نہیں تو میں امی سے کہہ کے لے لوں گی۔" اس بار میں سرد لہجے میں بولی۔ میں جانتی تھی میرے اس لہجے سے وہ دب جاتے ہیں۔ سو فضول کی بحث سے بچنے اور انہیں فوری طور پر تیار کرنے کے لیے ایسا لہجہ ضروری تھا۔
"امی سے کیوں؟ اب تم میری ذمہ داری ہو۔ خبردار جو ان سے کپڑے یا کپڑوں کے لیے پیسے مانگے۔" وہ

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

قدرے تیز لہجے میں بولے۔

"آپ مجھے لے دیں تو مجھے کیا ضرورت ہے ان سے مانگنے کی۔" میں پہلے سے بھی سرد لہجے میں کہتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔

وہ مجھے بے بسی سے دیکھ کے رہ گئے۔

اگلے دن ان کی چھٹی تھی۔ لنچ کے بعد انہوں نے مجھے شاپنگ کے لیے کہا تو میرا دل بلیوں اچھل پڑا۔ مردوں کی عادت ہے ہر کام میں نکتہ چینی کرنے کی مگر ہوشیاری سے انہیں رام بھی کیا جاسکتا ہے۔

شادی کو چار ماہ گزر چکے تھے اور آج میں پہلی بار ان کے ساتھ شاپنگ کے لیے جا رہی تھی۔ میں لباس کے معاملے میں انتہائی چوزی ہوں اپنی پسند کے ڈیزائنرز سوٹ کے علاوہ میں کم ہی کوئی اور کپڑے پہنتی ہوں۔ ہر سوٹ کے ساتھ کسی مشہور برانڈ کے میچنگ جوتے اور جیولری بھی لازمی ہے۔

ماہین نے بتایا تھا کہ "تانا بانا" پر "فریش ارائیولز" آئی ہوئی ہے میں نے ٹیکسی "تانا بانا" کے سامنے رکوائی اور انہیں ہاتھ پکڑ کے اندر لے گئی۔ سوٹ پسند کرتے ہوئے میں ان سے بھی رائے لے رہی تھی مگر وہ بے توجہی سے بس ہوں ہاں کیے جا رہے تھے۔ آخر ایک سوٹ پسند کرنے کے بعد میں نے ان سے پوچھا۔ "یہ اچھا ہے ناں، خرید لوں؟"

"ہم......ٹھیک ہے۔ کتنے کا ہے؟"

"صرف چھ ہزار کا۔ ویسے تو اس کی اصل قیمت زیادہ ہے۔ مگر میں نے ڈسکاؤنٹ کارڈ بنوایا ہوا ہے۔ اس لیے مجھے دس فیصد کم قیمت پر مل رہا ہے۔" میں نے فخریہ انداز میں انہیں بتایا۔

قیمت کا سن کے ان کا منہ بن گیا۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کے باہر لے آئے۔ میں اکثر اس آؤٹ لیٹ پر آتی رہتی تھی۔ سیلز مینز مجھ سے اچھی طرح واقف تھے۔ ان کے اس طرح کرنے سے سیلز مین کے سامنے مجھے بہت شرمندگی ہوئی۔

"شمع، میں تو کُل پانچ ہزار لے کے آیا ہوں۔ میرے ایک دوست کی ادھر دکان ہے تم وہاں سے اپنے لیے کوئی گرم سوٹ پسند کرلو۔" باہر آ کر وہ بے بسی سے بولے۔

میرے تو تن بدن میں آگ لگ گئی۔ "نہیں رہنے دیں۔ ادھر بھی ویسے ہی سوٹ ہوں گے۔ جیسے آپ لوگوں نے بری میں خریدے تھے۔" میں سپاٹ انداز میں بولی۔

اس کے بعد انہوں نے کافی کوشش کی کہ میں کہیں اور سوٹ پسند کرلوں مگر میں نے صاف انکار کر دیا۔ "آپ کے پاس پیسے نہیں تو کوئی مسئلہ نہیں۔ میں امی سے پیسے لے کے بعد میں خرید لوں گی۔" میری بس ایک ہی رٹ تھی۔

"ٹھیک ہے، میں بازار میں تماشا نہیں بنانا چاہتا۔ گھر جا کے اس پر بات کرتے ہیں۔" وہ سپاٹ انداز میں بولے۔

عیش تو واقعی ماں باپ کے گھر ہوتے ہیں۔ پرایا گھر پرایا ہی ہوتا ہے۔ مجھے بہت دکھ ہو رہا تھا۔ گھر پہنچ کے میں خاموشی سے کام کاج میں لگ گئی۔ حمزہ بار بار مجھ سے بات کرنے کی کوشش کر رہے تھے مگر میں بس ہوں ہاں میں ہی جواب دے رہی تھی۔ آخرکار وہ بے بسی سے بولے۔ "شمع، تم اتنی چھوٹی سے بات کو اتنا بڑا مسئلہ کیوں بنا رہی ہو؟ کپڑے تو کپڑے ہی ہوتے ہیں۔ کیا فرق پڑتا ہے اگر برانڈڈ نہ ہوں تو۔"

میں چپ رہی۔ تو وہ پھر بولے۔ "اچھا کل جا کے لے لینا اپنی مرضی کا سوٹ۔ لیکن اپنی امی سے اس حوالے سے بات نہ کرنا۔"

میری آنکھیں لمحہ بھر کے لیے خوشی سے چمکیں۔ آخرکار وہ ہار مان ہی گئے تھے۔

"میں نے پہلے بھی آپ سے کہا تھا کہ آپ میری ضروریات پوری کرتے رہیں تو مجھے کوئی ضرورت نہیں اپنی امی سے بات کرنے کی۔" میں اپنی خوشی چھپاتے ہوئے بولی۔

"میں نے کب تمھاری ضروریات پوری کرنے سے انکار کیا ہے۔ میں تو بس یہ چاہتا ہوں کہ تم اپنی چادر کے مطابق اپنے پاؤں پھیلاؤ۔" وہ بے بسی سے بولے۔

"مجھے نہیں پتا تھا کہ آپ کی چادر میں میرے لیے چار ماہ میں ایک سوٹ کی بھی گنجائش نہیں۔" میری آنکھیں بھر آئیں۔

وہ میری آنکھوں میں آنسو دیکھ کے تڑپ اٹھے۔ "تم ٹینشن نہ لو، اس حالت میں ٹینشن ہمارے بچے کے لیے ٹھیک نہیں۔"

میں خاموشی سے اپنے ہونٹ کاٹتے ہوئے اپنے آنسو اندر ہی اندر اتارنے لگی۔ کچھ دیر کے بعد میں بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''میں تو ابھی سے آنے والے بچے کے لئے پریشان ہوں۔ آپ مجھے ایک سوٹ نہیں لے کے دے سکتے تو اس کے خرچ کیسے پورے ہوں گے؟''

''لگتا ہے اب مجھے اپنی چادر تھوڑی سے بڑھانا ہی پڑے گی۔ اس کے علاوہ اب کوئی اور چارہ نظر نہیں آ رہا۔'' وہ عجیب سے انداز میں بولے۔ میں نے ان کے لہجے پر غور ہی نہیں کیا۔ آج مجھے ان کے اس انداز کی سمجھ آ رہی تھی۔

خیر اگلے دن وہ شام کو مجھے پھر مارکیٹ لے گئے۔ تانا بانا سے میری پسند کا سوٹ لینے کے بعد ہم اسٹائلو شوز پر گئے۔ وہاں سے میں نے تین ہزار کا سوٹ سے میچنگ جوتا پسند کیا۔ حمزہ اس بار کچھ نہیں بولے۔ انہوں نے خاموشی سے ادائیگی کر دی۔ میں نے بھی انہیں کریدنا مناسب نہیں سمجھا کہ کل تک تو ان کے پاس صرف پانچ ہزار روپے تھے۔ آج ان کے پاس کہاں سے پیسے آ گئے۔ مجھے آم مل رہے تھے، تو مجھے کیا ضرورت تھی پیڑ گننے کی۔ مگر آج مجھے احساس ہو رہا تھا کہ ''پیڑ گننا'' بھی میری ذمہ داری تھی۔

☆☆☆

ایک ماہ بعد ہی میری بہن فریحہ کی شادی کے دن طے ہو گئے۔ شادی پر ساری شاپنگ انہوں نے میری مرضی سے کرا دی۔ میں نے فریحہ کو سونے کی انگوٹھی دینے کی بات کی تو انہوں نے وہ بھی مجھے خاموشی سے لے دی۔

اس کی شادی کے بعد میں نے اسے اپنے گھر دعوت پر بلایا۔ جس دن اس کی دعوت تھی اس سے ایک دن پہلے میں نے حمزہ کو سودے کی لسٹ پکڑائی۔ وہ لسٹ میں ساری چیزیں پڑھ کے حیران نظر آئے۔

''اتنی لمبی لسٹ؟ تم نے صرف فریحہ کے گھر والوں کو مدعو کرنا ہے یا سارے شہر کو؟'' وہ حیرانی سے بولے۔

میرا جی مکدر ہو گیا۔ گھر میں کبھی کسی نے میری لسٹ پر نکتہ چینی نہیں کی تھی۔ میں جو کچھ لکھ کے دیتی شام کو حاضر ہوتا تھا۔

وہ میرا موڈ خراب دیکھ کے نرمی سے بولے۔ ''یہ تو بتاؤ بنانا کیا ہے؟''

میں نام گنوانے لگی۔ وہ چیزوں کے نام سنتے جا رہے تھے اور ان کی آنکھیں پھٹتی جا رہی تھیں۔ جب مجھے لگا کہ ان کی آنکھیں بس اپنے حلقوں سے نکلنے کو ہیں۔ میں چپ ہو گئی حالانکہ ابھی دو تین چیزوں کے نام رہتے تھے۔

''اتنے سارے آئٹمز تیار کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اتنے سارے تو چکھنا بھی ممکن نہیں۔'' کچھ دیر بعد وہ بمشکل اپنی حالت سنبھال کے بولے۔

میں نے خاموشی سے ان سے لسٹ واپس لے لی۔

''اچھا ابھی میں لیٹ ہو رہا ہوں، واپسی پر اس معاملے میں بات کرتے ہیں۔'' وہ جلدی سے یہ کہتے ہوئے باہر نکل گئے۔

وہ تو چلے گئے مگر میرا میٹر گھوم چکا تھا۔ کچھ دیر بعد میٹر کی رفتار سست ہوئی تو میرے دماغ نے کام کرنا شروع کیا۔ شاپنگ کے بعد اب پہلی بار انہوں نے سودے میں مین میخ نکالی تھی۔ انہیں اس کا سبق سکھانا ضروری تھا ورنہ اکثر شوہر حضرات کی طرح میخیں نکالنا ان کی فطرت ثانیہ بن جاتی۔ اور میرے خیال میں ایسی عادات کے مالک شوہر کے ساتھ کوئی بھی خاتون خوش نہیں رہ سکتی۔

میں نے امی کو ساتھ لیا اور امی نے پیسے ساتھ لیے۔ شام کو سارا سودا گھر میں تھا۔

وہ جب رات کو گھر آئے تو میں کچھ چیزیں تیار کرنے میں مصروف تھی۔ وہ آوازیں دیتے ہوئے سیدھا کچن میں آ گئے۔

سلیب پر ڈھیر سارے برتن اور ان میں مختلف چیزیں دیکھ کے وہ حیران رہ گئے۔

''یہ کیا بنا رہی ہو؟'' وہ حیرانی سے بولے۔

میں انہیں یکسر نظرانداز کرتے ہوئے اپنے کام میں مگن رہی۔ انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ میں سب چیزیں امی سے پیسے لے کے خرید لائی ہوں۔

وہ یہ سب دیکھ کے غصے سے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ میں کام ختم ہونے کے بعد کمرے میں پہنچی تو وہ دوسری طرف منہ کیے سو رہے تھے۔

اگلے دن صبح اٹھتے ہی میں کام کاج میں لگ گئی۔ اس دوران حمزہ نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی اور نہ مجھے ان سے کوئی بات کرنے کا موقع مل سکا۔

مجھے حمزہ کی طرف سے کچھ ڈر تھا کہ پتا نہیں وہ مہمانوں کے ساتھ کیسے پیش آتے ہیں مگر خیریت گزری۔ وہ کافی سمجھدار تھے۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

دعوت بہت شاندار رہی۔ مگر کافی چیزیں بچ گئیں۔ کچھ میں نے فریز کردیں اور کچھ محلے میں بانٹ دیں۔

رات کو وہ مجھ سے بولے۔ ''یہ ساری چیزیں تم نے کس سے منگوائیں؟'' ان کے لہجے میں بے بسی نمایاں تھی۔

''آپ کیا سمجھتے تھے آپ نہیں لادیں گے تو میں چیزیں لا ہی نہیں سکتی۔'' ان کے لہجے نے مجھے کھل کے کھیلنے کا موقع دے دیا تھا۔ میں نے اس موقع کا بھرپور فائدہ اٹھایا اور تلخ لہجے میں بولی۔

وہ مجھے حیرانی سے دیکھتے رہ گئے۔

''فریحہ کے سسرالیوں کو پہلی بار میں نے اپنے گھر بلایا تھا۔ اب اگر میں نے ان کے لیے اتنا اہتمام کیا تو آپ ہی کی ان کے دل میں عزت بنی۔ آپ کو تو پتا ہی نہیں کہ دنیا کے ساتھ کیسے چلا جاتا ہے۔'' ایک جارحانہ سٹروک کے بعد ڈیفنس کرنا لازمی تھا ورنہ وہ غصے سے آؤٹ ہوسکتے تھے۔ سو اس بار میں قدرے نرم انداز میں بولی۔

''ٹھیک ہے بھئی۔ میں تو بس پوچھ رہا تھا کہ تم نے ان چیزوں کے لیے پیسے کہاں سے لیے؟'' وہ قدرے صلح جویانہ انداز میں بولے۔

''امی سے ادھار لیے تھے۔'' میں نظریں جھکا کے بولی۔

''یہ انہیں واپس کرآؤ ابھی۔'' انہوں نے پرس سے کافی سارے نوٹ نکال کے میری طرف بڑھا دیے۔ میں نے ان سے اس بار بھی نہیں پوچھا کہ وہ...... یہ پیسے کہاں سے لائے ہیں۔ نہ ہی شادی پر ہونے والے اخراجات کے متعلق میں نے ان سے پوچھا تھا، حالانکہ مجھے پوچھنا چاہیے تھا۔

☆☆☆

جوں جوں وقت گزر رہا تھا میرا پیٹ بڑھ رہا تھا۔ مجھے اپنے سارے کپڑے تنگ لگنے لگے۔ میں حمزہ کے ساتھ مارکیٹ گئی اور ''نشاط'' سے لان کے کچھ نئے جوڑے لیے۔ حمزہ نے یہاں بھی اپنی مرضی تھوپنے کی کوشش کی کہ چند ماہ کی تو بات ہے کیا ضرورت ہے اتنے مہنگے کپڑے لینے کی مگر میں نے اپنی مرضی ہی کی۔ مردوں کا کیا پتا چلتا ہے کپڑوں کا۔ ان کی تو مرضی ہوتی ہے کہ کسی کلاتھ ڈپو سے تھان خرید کے لپیٹ لیں۔

میں ہر ماہ ایک پرائیویٹ کلینک میں اپنا چیک اپ کرایا کرتی تھی۔ حمزہ کی خواہش تھی کہ ڈیلیوری کے لیے میں کسی سرکاری اسپتال سے کارڈ بنوالوں مگر سرکاری اسپتال کا تو نام سن کے میری جان جاتی تھی۔ میں نے ایک نامی گرامی پرائیویٹ اسپتال سے ڈیلیوری کروائی۔ چھوٹا آپریشن ہوا تھا۔ چالیس ہزار کا بل بنا، جو حمزہ ہی نے ادا کیا۔

ان کے پاس اتنے پیسے دیکھ کے مجھے حیرت تو ہوئی مگر میں نے یہی سوچا کہ وہ اضافی اخراجات کے لیے اپنے ابو سے پیسے لے رہے ہیں۔

بچے کی پیدائش پر میرے سسرالی بھی مجھ سے ملنے آئے۔ انہوں نے مجھے واپس گھر شفٹ ہونے کا کہا۔ روڈ کا کام چل رہا تھا اس لیے میں نے بہانہ کردیا۔

میں جب بھی بازار جاتی ارحم کے لیے بہت سے کپڑے اور کھلونے لے آتی۔ حمزہ اس پر چیں بہ جبیں ہوتے مگر میں نے کبھی ان کی پرواہ نہیں کی۔

ارحم تین ماہ کا تھا کہ حمزہ کے والد ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں جاں بحق ہوگئے۔ کچھ دن مجھے اپنے سسرال رہنا پڑا۔ واپس آنے کے بعد میں نے حمزہ سے کہا۔

''آخر کب تک میں اپنے ماں باپ کے گھر پڑی رہوں گی۔ آپ سپر اسٹور اور گھر سے اپنا حصہ لے کے کہیں پاس ہی گھر خرید لیں۔''

''کچھ کرتے ہیں۔'' وہ پُرسوچ انداز میں بولے۔

ادھر پاس ہی ایک ہاؤسنگ سوسائٹی بن رہی تھی جس میں پانچ لاکھ کی بکنگ پر پانچ مرلے میں بنے گھر مل رہے تھے۔ باقی پیسے قسطوں میں ادا کرنے تھے۔ میں نے حمزہ کی توجہ اس طرف دلائی۔

چند دن بعد ہی وہ دفتر سے واپس آئے تو بہت خوش لگ رہے تھے۔

''خیریت تو ہے، آج جناب کے چہرے پر بڑی رونق نظر آرہی ہیں۔'' میں پیار سے بولی۔

''شمع، مجھے پیسے مل گئے ہیں۔ کل ہم گھر پسند کرنے جائیں گے۔'' وہ پُرجوش انداز میں بولے۔

میرا چہرہ بھی خوشی سے کھل اٹھا۔ اگلے دن جا کے ہم گھر پسند کر آئے۔ دو بیڈروم، ڈرائنگ روم، لاؤنج اور پورچ کے ساتھ جدید ڈیزائن پر بنا گھر مجھے بہت پسند آیا تھا۔ حمزہ نے ایڈوانس پیسے جمع کرادیے۔ کچھ دن بعد ہی ہمیں قبضہ مل گیا تو ہم ادھر ہی شفٹ ہوگئے۔

حمزہ کی ماں کو پتا چلا تو انہوں نے خوب واویلا کیا مگر

میں نے پروا نہیں کی۔

گھر کے بعد میرا اگلا ٹارگٹ گاڑی تھا۔ میں نے اس کے لیے حمزہ پر زور ڈالنا شروع کیا۔ کچھ عرصے بعد ہی انہوں نے ایک سیکنڈ ہینڈ کار لے لی۔

ارحم تین سال کا ہوا تو میں نے اسے ایک مہنگے پرائیویٹ اسکول میں داخلہ دلوا دیا۔ شام کو ایکسٹرا کوچنگ کے لیے اسے پاس ہی ایک اکیڈمی میں بھیجنے لگی۔

حمزہ اب میرے کسی کام میں روڑے نہیں اٹکاتے تھے۔ وہ مکمل طور پر میرے رنگ میں رنگ چکے تھے۔

اگلے سال حمنہ کی پیدائش ہوئی تو ہماری فیملی مکمل ہوگئی۔ میں بہت خوش تھی کہ میں نے جو چاہا پالیا۔ میری دوستوں اور رشتہ داروں کو مجھ پر رشک آتا تھا۔ میں وقتاً فوقتاً سب کو کسی نہ کسی بہانے سے اپنے گھر مدعو کرتی اور ان کی خوب خاطر مدارت کرتی۔ اس عرصے میں ہمارے اخراجات کافی بڑھ چکے تھے۔ حمزہ نے جتنی اپنی تنخواہ بتائی تھی، اتنی تو صرف مکان کی ماہانہ قسط تھی، مگر اتنے عرصے میں مجھے ایک بار بھی خیال نہیں آیا کہ یہ اخراجات کیسے پورے ہو رہے ہیں۔ آج مجھے اندازہ ہوا تھا کہ حمزہ یہ اخراجات پورے کرنے کے لیے کیا کرتے رہے ہیں۔

☆☆☆

میں اسی دن اپنے بھائی کے ساتھ امی کے گھر آگئی اور روتے ہوئے امی کو ساری بات بتا دی کہ حمزہ کو رشوت کے الزام میں پولیس پکڑ کے لے گئی ہے۔

وہ بھی یہ سن کے پریشان ہوگئیں۔ میرے بھائی نے عاشر کا نمبر مجھ سے لیا اور اسے کال کرنے لگا۔ اس سے کچھ تفصیل پوچھ کے وہ تھانے چلا گیا۔

رات گئے اس کی واپسی ہوئی۔ وہ مطمئن لگ رہا تھا۔ ''کوئی بڑا مسئلہ نہیں۔ تھانے دار رشوت خور ہے۔ اسے کچھ دے دلا کے جان چھوٹ جائے گی حمزہ کی۔ تم فکر نہ کرو۔'' اس نے مجھے تسلی دی۔

''جو بھی ہو۔ میرا اب اس شخص سے کوئی تعلق نہیں۔'' میں چلائی۔

وہ حیرانی سے مجھے دیکھنے لگا۔ ''شمع تم ہوش میں تو ہو۔ وہ باپ ہے تمہارے بچوں کا۔''

''نہیں لگتا اب وہ کچھ بھی ہمارا۔ اگر اسے ہمارے پرواہ ہوتی تو وہ ایسی حرکت کرتا۔'' میں زار و قطار رونے لگی۔

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں

گھر بیٹھے

رسالے حاصل کیجیے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرسالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 800 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 9,000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 8,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کردیں گے۔

یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہوسکتا ہے

بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر بھاری بینک فیس عائد ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

رابطہ: ثمر عباس (فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

فون 021-35895313 فیکس 021-35802551

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

''وہ ایسا نہ کرتا تو کیا کرتا۔ سب ادھر ایسے ہی کر رہے ہیں۔ تم یہ جو عیاشیاں کر رہی ہو۔ یہ صرف تنخواہ میں ممکن ہیں؟'' وہ سخت لہجے میں بولا۔

میرے تو تن بدن میں آگ لگ گئی۔ ''کیا عیاشیاں کرتی ہوں، کون سے ملازم رکھ کے دیئے ہوئے ہیں اس نے مجھے۔ گھر کا سارا کام اپنے ہاتھوں سے کرتی ہوں۔ اب اگر وہ اپنے بیوی بچوں کی ضروریات پوری نہیں کر سکتا تو شادی کیوں کی تھی اس نے؟'' میں چلائی۔

''تمہاری ضروریات تو قارون کے خزانے سے بھی پوری نہیں ہوسکتیں۔'' وہ تلخ لہجے میں بولا۔

''کیوں، آپ لوگ کیا میری ضروریات پوری نہیں کر رہے تھے؟''.... میرا لہجہ چیخ رہا تھا۔

''کر رہے ہیں، مگر آپ لوگوں کو کیا پتا کہ اس کے لیے ہمیں کتنی دو نمبریاں کرنا پڑتی ہیں۔ آپ لوگوں کو تو بس اپنے اللے تللوں سے فرصت نہیں ملتی۔'' وہ تلخ لہجے میں کہتے ہوئے باہر چلا گیا۔ امی مجھے سنبھالنے لگ گئیں۔

اگلے دن حمزہ واپس آگئے۔ میں اس وقت امی ہی کے گھر تھی۔ وہ میرے بھائی کے ساتھ سیدھا ادھر ہی آئے، مگر میں نے ان کے ساتھ جانے سے انکار کردیا۔

وہ میرا انکار دیکھ کے ششدر رہ گئے۔ ''شمع، یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟''

''نہیں رہنا مجھے آپ کے ساتھ۔ آپ نے مجھے کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا۔'' میں روتے ہوئے بولی۔

''میں نے جو کچھ بھی کیا ہے تمہارے لیے ہی تو کیا ہے۔ شادی سے پہلے کبھی میں نے رشوت نہیں لی۔ تمہاری فرمائشوں نے ہی مجھے اس کام پر مجبور کیا۔'' وہ غصے سے بولے۔

''مجھ پر الزام مت لگائیں۔ کیا میں نے آپ کو کہا تھا کہ آپ رشوت لیں۔'' میں چلائی۔

''تمہیں تو پتا تھی میری تنخواہ۔ پھر بھی تمہاری ضد تھی کہ... سوٹ لوں گی تو برانڈڈ، جوتا لوں گی تو برانڈڈ۔ روز گھر میں کسی نہ کسی کو بلاؤں گی اور چار پانچ ڈشز سے کم تمہارے مہمانوں کی خاطر مدارت ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ میں تمہاری یہ ضروریات پوری کرنے کے لیے رشوت نہ لیتا تو کیا کرتا۔'' وہ غصے سے بولے۔ میں ہکا بکا انہیں دیکھتی رہ گئی۔

''اسپتال جانا ہے تو پرائیویٹ، چاہے بل ہزاروں میں بنے۔ مکان اپنا ہونا لازمی ہے۔ گاڑی کے بغیر زندگی بھی کوئی زندگی ہے۔ یہ سارے کس کے فرمان تھے؟'' وہ بولتے چلے جارہے تھے۔

''یہ تو ساری دنیا کررہی ہے۔ میں نے انوکھا کیا کیا؟'' میں حیرت سے بولی۔

''میں مانتا ہوں ساری دنیا یہی کررہی ہے مگر ایسی عیاشیوں کے لیے زیادہ تر لوگ ناجائز ذرائع ہی اختیار کیے ہوئے ہیں۔ کوئی رشوت لے رہا ہے تو کوئی جھوٹ فراڈ کا سہارا لے رہا ہے۔ کوئی ڈاکے مار رہا ہے، کوئی چوریاں کررہا ہے۔ ٹارگٹ کلنگ، بھتا خوری، ملاوٹ، ناپ تول میں کمی، ناقص اشیا کی تیاری، جعل سازی۔ میں کون کون سی برائی گنواؤں۔ یہ ساری برائیاں کیوں بڑھتی ہی چلی جارہی ہیں؟ کبھی سوچا تم نے؟ یہ سب لوگ اپنے لائف اسٹینڈرڈ کو بڑھانے کے لیے ہی تو کررہے ہیں۔ ورنہ سادگی سے زندگی گزاریں تو ان بہت سی برائیوں سے بچا جاسکتا ہے۔'' آہستہ آہستہ ان کی آواز دھیمی ہوتی چلی گئی۔ وہ کچھ لمحات کے توقف کے بعد پھر بولے۔

''یہ جو کرپشن ہے نا، اس کی ذمہ دار تم جیسی عورتیں ہی ہیں۔ جو کمپرومائز کرنا جانتی ہی نہیں۔ جو پاؤں پھیلاتے ہوئے اپنی چادر نہیں دیکھتیں، بلکہ دوسرے لوگوں کا گھر دیکھتی ہیں۔ وہ دوسروں سے مقابلہ کرتے ہوئے یہ بھول جاتی ہیں کہ وہ سب لینے کے لیے کوئی نہ کوئی چور دروازہ استعمال کرنا ہی پڑتا ہے۔ شادی سے پہلے میرے ساتھ کام کرنے والے جب مجھ سے کہتے کہ ابھی رشوت نہیں لے رہے، دیکھتے ہیں شادی کے بعد بھی اپنی روش پر قائم رہتے ہو یا نہیں۔ اس وقت میں دعا کرتا تھا کہ یا اللہ مجھے صابر شاکر بیوی عنایت کرنا مگر اس نے میری دعا نہیں سنی۔ یہ تو پھر ہونا ہی تھا۔'' اب ان کے لہجے میں صدیوں کی تھکن بول رہی تھی۔

میں اندر ہی اندر نادم ہو رہی تھی۔ میں نے تو کبھی اتنی گہرائی سے سوچا ہی نہیں تھا۔ واقعی اگر ہم عورتیں اپنی خواہشات پر قابو رکھیں، اپنی چادر کے مطابق اپنے پاؤں پھیلائیں تو ہمارے باپ، بھائی یا شوہروں کو کسی بھی غلط طریقے سے کمائی کی ضرورت نہ پڑے۔ میرے لیے تو اب پچھتاوے ہی باقی رہ گئے ہیں، مگر ہو سکتا ہے آپ کے پاس ابھی وقت ہو۔ آپ اپنی زندگی پر نظر دوڑائیں، کہیں آپ بھی میری طرح تو نہیں کر رہیں؟

جناب معراج رسول
السلام علیکم
آپ کے ادارے سے نکلنے والے تمام ڈائجسٹ میں بصد شوق پڑھتا ہوں لیکن کبھی ان ڈائجسٹوں میں چھپا نہیں۔ یہ آپ کے ہاں میری پہلی کاوش ہے۔ یہ ایک معذور شخص کی کہانی ہے جو بالکل سچی ہے۔ اس نے کس طرح دو قتل کیے کس طرح ناممکن کو ممکن بنایا، پڑھ کر آپ بھی حیران رہ جائیں گے۔

فرحان خان
(منڈی بہائو الدین)

معذور

اس نے ایک دن میرا ہاتھ تھام لیا۔ ''میرا ایک کام کردو گے؟''

''کیوں نہیں نسیم صاحب، آپ فرمائیں۔'' میں نے کہا۔

''تم کو میری کہانی لکھنی ہے۔ کیونکہ مجھے پتا چل گیا ہے کہ میں شاید اب زندہ نہیں رہوں گا۔ میری موت میرے سرہانے کھڑی ہے۔''

''ارے کیوں ایسی باتیں کر رہے ہیں۔ خدا آپ کو زندگی دے۔''

''زندگی......! کس لیے...... کس کے لیے۔'' وہ بہت تلخی سے مسکرا دیا۔

اس کی ان مایوس بھری باتوں کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

نسیم میرے ہی محلے میں رہتا تھا بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ میں نے اس کے محلے میں کرائے پر رہنا شروع کیا تھا۔ جب کہ وہ وہاں کا پرانا رہنے والا تھا۔

رفتہ رفتہ وہاں کے لوگوں کے بارے میں معلومات ہوتی چلی گئی تھیں۔ کسی بھی محلے یا علاقے میں اس قسم کی معلومات کا مرکز وہاں کے چائے خانے ہوا کرتے ہیں۔

وہاں بھی ایک چائے خانہ تھا۔ شام ہوتے ہی محلے کے نوجوان اور بڑے بوڑھے اپنی اپنی ٹولیاں بنا کر بیٹھ جاتے۔ ان ہی لوگوں سے بہت سی باتیں معلوم ہوتی گئیں۔

اور جب ان لوگوں کو میرے بارے میں یہ معلوم ہوا کہ میں کہانیاں لکھا کرتا ہوں تو انہوں نے مجھ میں بھی دلچسپی لی۔ اپنی اپنی کہانیاں سنائیں۔

اسی دوران محلے کے ایک صاحب نے مجھ سے نسیم کے بارے میں بات کی۔ ''فرحان صاحب کیا آپ کی ملاقات نسیم صاحب سے ہوئی ہے۔''

"نہیں تو، میں نہیں جانتا۔ کون صاحب ہیں یہ۔" میں نے پوچھا۔

"آپ اپنی کہانیوں کے لیے کردار کی تلاش میں رہتے ہیں نا۔"

"جی ہاں۔ میرا کام ہی یہی ہے۔"

"بہت ہی دردناک کہانی ہے نسیم صاحب کی۔ بہت پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ بینک میں کام کرتے تھے۔ اچھی خاصی زندگی گزر رہی تھی۔ ان کی شادی ذرا دیر سے ہوئی تھی لیکن بیوی بہت جوان اور خوب صورت تھی۔ اخلاق بھی اس کا بہت اچھا تھا۔"

"تو کیا اب وہ اس دنیا میں نہیں رہی؟"

"نہیں صاحب وہی تو بتا رہا ہوں کہ بہت دردناک کہانی ہے، نسیم صاحب بینک میں آفیسر تھے۔ اچھی خاصی خوش و خرم زندگی گزر رہی تھی۔ اولاد نہیں ہوئی تھی۔ نسیم صاحب شام کو بینک سے آتے پھر دونوں میاں بیوی کہیں نہ کہیں سیر کے لیے نکل جاتے۔ محلے والے ان پر رشک کیا کرتے کہ کتنا ہنستا کھیلتا جوڑا ہے۔"

وہ صاحب کہانی سنا رہے تھے اور میں ضروری پوائنٹس نوٹ کرتا جا رہا تھا کہ شاید آگے جا کر یہ کام میں آجائیں۔ یہ میری پرانی عادت رہی ہے۔ میں قلم اور ڈائری ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا ہوں۔

"لیکن فرحان صاحب برا وقت کب بول کر آتا ہے۔" وہ صاحب بتا رہے تھے۔ "ایک رات اچانک نسیم صاحب کو برین ہیمرج جیسا کچھ ہوا۔ ان کو فوری طور پر اسپتال پہنچا دیا گیا۔ وہ اس صدمے سے نکل تو آئے لیکن مفلوج ہو گئے۔"

"اوہ یہ تو بہت برا ہوا۔"

"جی جناب ایک چلتا پھرتا اور ہنستا کھیلتا ہوا انسان جب اچانک بستر پکڑ لے تو کتنا دکھ ہوتا ہے۔ ہم سب محلے والوں کو ان کی حالت دیکھ دیکھ کر افسوس ہوتا تھا۔ بینک والوں نے بھی ان کو فارغ کر دیا۔ ظاہر ہے ایک مفلوج آدمی ان کے کس کام آسکتا تھا۔"

"یہ بات نہیں بھائی۔ اس مشینی دور میں انسان مشین بن کر رہ گیا ہے۔ کوئی پرزہ خراب ہو جائے تو پھر اس کو ایک طرف کر دیتے ہیں۔"

"یہ آپ نے بالکل ٹھیک کہا فرحان صاحب۔ انسان کی بس اتنی ہی حیثیت ہے۔ وہ جب تک کام کا رہتا ہے اس کی ویلیو ہوتی ہے اور جیسے ہی وہ معذور ہو گیا یا کسی کام کا نہیں رہا تھا تو پھر اسے فراموش کر دیا جاتا ہے۔"

"اس کی بیوی کا کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"وہی تو بتا رہا ہوں۔ بہت ٹریجڈی ہوئی ان کے ساتھ۔" اس نے بتایا۔ "ایک ٹریجڈی تو یہ تھی کہ وہ بے چارے مفلوج ہو گئے تھے اور دوسری یہ ہوئی کہ ان کی بیوی کا مرڈر ہو گیا۔"

"کیا!" مجھے ایک شاک سا لگا تھا۔ "مرڈر ہو گیا؟ کیوں۔ کس نے کیا۔"

"ڈاکوؤں نے۔" اس نے بتایا۔ "ایک رات کچھ ڈاکو ان کے گھر میں گھس آئے۔ اس وقت نسیم صاحب کے ایک دوست بھی ان سے ملنے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ ڈاکو گھر میں گھسے، بے چارے نسیم صاحب تو کچھ کر نہیں سکتے وہ مفلوج پڑے تھے۔ ان کی بیوی اور دوست نے مزاحمت کی ہو گی۔ جس پر ڈاکوؤں نے ان دونوں کا مرڈر کر دیا اور زیورات وغیرہ لے کر فرار ہو گئے۔"

"اوہ یہ تو بہت برا ہوا۔"

"جی ہاں بہت برا، خدا ایسی مجبوری کسی کو نہ دے۔ خود سوچیں اس وقت نسیم صاحب کے دل کی کیا حالت ہو گی۔ ان کے سامنے ان کی بیوی اور دوست کو مار دیا گیا۔ زیورات وغیرہ لوٹ لیے گئے اور وہ بے چارے اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکے تھے۔"

"واقعی یہ بہت دردناک کہانی ہے۔ اس کے بعد کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"ہونا کیا ہے۔ ڈاکوؤں کے جانے کے بعد نسیم صاحب نے بستر پر لیٹے لیٹے زور زور سے چلّانا شروع کر دیا۔ پڑوسیوں نے ان کی آوازیں سنیں۔ وہ سب دوڑے ہوئے آئے۔ گھر کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ لوگ اندر آ گئے اور دو لاشیں دیکھیں۔ پھر نسیم صاحب کو دیکھا جو بہت خوفزدہ تھے۔ پولیس کو اطلاع دی گئی۔ نسیم صاحب نے اپنا بیان ریکارڈ کروایا۔ اس کے بعد کہانی ختم ہو گئی۔"

"کیا مطلب۔"

"مطلب یہ فرحان صاحب کہ وہ ڈاکو آج تک پکڑے نہیں گئے اور نسیم صاحب بستر پر پڑے رہتے ہیں ان کی دیکھ بھال ایک میل نرس کیا کرتا ہے۔ بس یہ ہے ان کی کہانی۔"

"بھائی آپ مجھے ان سے ضرور ملوائیں۔" میں نے کہا۔

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

"میں اور کچھ تو نہیں کر سکتا لیکن ان کی یہ کہانی ضرور لکھوں گا۔"

محلے کے وہ صاحب دو چار دنوں کے بعد مجھے نسیم صاحب کے پاس لے گئے تھے۔ وہ نسیم صاحب جن پر دکھ کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔

ان کے گھر میں داخل ہوتے ہی جس بات نے مجھے متاثر کیا وہ ان کے کمروں میں رکھی ہوئی کتابیں تھیں۔ یعنی اس شخص کو لکھنے پڑھنے کا شوق رہا تھا۔

ایک آدمی مجھے ان کے کمرے تک لے گیا تھا جس کے بارے میں بتایا گیا کہ یہی میل نرس ہے اور نسیم صاحب کی خدمت کرتا ہے۔ خاموش مزاج کا انسان تھا۔

نسیم صاحب بستر پر لیٹے ہوئے تھے۔ ہمیں دیکھ کر اٹھنے کی کوشش کی لیکن ان سے اٹھا نہیں گیا۔ ہم نے ویسے ہی ان سے ہاتھ ملا لیا تھا۔

"نسیم صاحب یہ فرحان صاحب ہیں۔" مجھے ساتھ لانے والے نے میرا تعارف کروایا۔ "لکھنے پڑھنے والے انسان ہیں۔ کہانیاں بھی لکھتے ہیں۔ آج کل اسی محلے میں رہنے کے لیے آئے ہوئے ہیں۔"

"اوہ پھر تو بہت اچھا ہے۔" نسیم صاحب نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔ "فرحان صاحب آپ آجایا کریں۔ آپ کے آنے سے میرا دل بہل جائے گا۔ ورنہ آپ تو دیکھ ہی رہے ہیں کہ میری کیا زندگی ہوگئی ہے۔"

"خدا آپ کو صحت دے نسیم صاحب۔" میں نے تسلی دینے کی کوشش کی۔

"صحت!" ان کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ آگئی۔ "نہیں فرحان صاحب پلیز میرے لیے صحت کی دعا نہ مانگیں بس یہ دعا کریں کہ خدا میری موت کے مرحلے آسان کر دے۔"

دکھ ہوا تھا اس کی باتیں سن کر۔ انسان کی مایوسی جب انتہا کو پہنچ جائے تو پھر وہ ایسی ہی باتیں کرنے لگتا ہے۔

نسیم صاحب مجھ سے بہت دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ اس دوران وہ میل نرس ہمارے لیے چائے بنا کر لے آیا تھا۔

نسیم صاحب نے اس کے بارے میں بتایا۔ "خدا بھلا کرے اس شخص کا۔ یہ بہت ساتھ دے رہا ہے ورنہ اس زمانے میں ایسے لوگ ملتے کہاں ہیں۔"

"نسیم صاحب آپ خود سے ٹوائلٹ وغیرہ۔" میں

جادو اثر پودینہ

پودینہ کو قدیم یونانی اور رومی خوب جانتے تھے۔ یونانی اطباء میں حکیم تاؤ فرسٹس نے جو حضرت عیسیٰ سے 370 سال قبل گزرا ہے پودینہ کا ذکر کیا ہے۔ عرب کے محققین نے پودینہ کے افعال و خواص اور حالات کافی تفصیل سے لکھے ہیں۔ چین اور جاپان میں بھی پودینہ کو لوگ جانتے تھے۔ 1862ء میں ایک کیمیا داں نے جوہر پودینہ کا تجربہ کیا۔ اس نے اسے یورپی پودینہ سے حاصل کیا تھا۔ اس کے بعد ڈاکٹر ہریرا نے 1892ء میں چینی و جاپانی جوہر پودینہ کے بارے میں بتایا کہ یہ مٹی کے مرتبانوں میں بند ہو کر چین سے یورپ میں آتا ہے۔ 1879ء میں ڈاکٹر اے ڈیکسن نے اس کے انفیکشن کی روک تھام کرنے والے خواص بیان کیے اور 1885ء میں ڈاکٹر روزان برگ نے اس کے الکحلی اور ایتھری محلول کو ناک اور حلق کے امراض میں مقامی مخدر کے طور پر استعمال کیا۔

مرسلہ: نسرین مشتاق۔ لاہور

نے پوچھا۔

"جی ہاں سمجھ گیا۔" نسیم صاحب نے ایک گہری سانس لی۔ "خدا کا شکر ہے کہ اتنا ہو جاتا ہے کہ میں اسٹک کے سہارے ٹوائلٹ تک خود پہنچ جاتا ہوں۔ اس کی معذوری نہیں آئی ہے ورنہ عام طور پر بستر پر پڑا کتابیں پڑھتا رہتا ہوں۔"

"یہ بہت بڑی بات ہے نسیم صاحب۔" ان صاحب نے کہا جن کے ساتھ میں آیا تھا۔

کچھ اور باتیں ہوئیں تو اندازہ ہوا کہ نسیم صاحب کا شعری ذوق بھی بہت اچھا تھا۔ میں نے اس وقت وعدہ کر لیا کہ میں ان سے ملنے کے لیے آجایا کروں گا۔

واپس ہوتے ہوئے میں نے محلے کے صاحب سے پوچھا۔ "یہ بتائیں نسیم صاحب کے اخراجات کیسے پورے ہوتے ہیں۔"

"یہ بینک میں تھے تو اچھے دنوں میں انہوں نے اس محلے میں ایک اور مکان خرید لیا تھا جو کرائے پر دیا ہوا ہے۔ اس کا کرایہ آتا ہے۔ اس کے علاوہ بینک کی طرف سے کچھ

رقم بند می ہوئی ہے اس طرح ان کا گزارہ ہو جاتا ہے۔"

"ہاں صاحب یہ سب تو ہے لیکن بے چارے کی مجبوری نے انہیں کسی کام کا نہیں رکھا ہے۔" میں نے کہا۔

"ایک تو ایسی مجبوری پھر محبت کرنے والی بیوی کی موت کا دکھ۔ افسوس ہوا ان کو دیکھ کر۔"

"فرحان صاحب! آپ چلے جایا کریں ان کے پاس؟"

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔ میں نے ان سے وعدہ کر لیا ہے ضرور جاؤں گا۔"

دو چار دنوں کے بعد میں اکیلا ہی نسیم صاحب کے پاس چلا گیا۔ اس بار بہت دیر تک ان سے باتیں ہوتی رہیں۔ ان کو دیکھ کر افسوس بھی ہو رہا تھا کہ کیسی تنہائی اور بے بسی کی زندگی گزار رہے ہیں۔

چھ سات ملاقاتوں کے بعد ان سے اچھی خاصی دوستی سی ہو گئی تھی۔

پھر ایک دن کی بات ہے جب اس محلے کے ایک صاحب نے آکر اطلاع دی کہ نسیم صاحب پر کل رات دل کا دورہ پڑا تھا اور وہ اسپتال میں ہیں۔

میں فوری طور پر اسپتال روانہ ہو گیا۔ ان کی طبیعت کچھ سنبھل چکی تھی۔ انہیں کمرے میں منتقل کر دیا گیا تھا میں جب ان کے پاس پہنچا تو ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

میں نے ان کا ہاتھ تھام لیا۔ "ارے نسیم صاحب آپ تو بہادر انسان ہیں اور آپ کس طرح زندگی کے مسائل کا سامنا کر رہے ہیں اب آپ کی آنکھوں میں آنسو اچھے نہیں لگتے۔"

"فرحان صاحب! میرا بلاوا آنے ہی والا ہے۔" وہ دھیرے سے بولے۔ "آپ کو یہ تو معلوم ہوگا کہ بہت سے مرنے والوں کو اپنی موت کا علم ہو جاتا ہے۔"

"آپ پھر ایسی باتیں کرنے لگے۔"

"سنتے رہیں فرحان صاحب کیونکہ اب زندگی نے میری مہلت ختم کر دی ہے۔ بس میں اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر کے مرنا چاہتا ہوں۔"

"آپ کو کچھ نہیں ہوگا نسیم صاحب۔"

"ہو چکا ہے فرحان صاحب ہو چکا ہے۔ بس آپ سے یہ وعدہ لینا چاہتا ہوں کہ آپ میری کہانی ضرور لکھیں گے۔"

"میں آپ کی کہانی جانتا ہوں نسیم صاحب۔"

"نہیں، آپ نہیں جانتے۔ بلکہ کوئی نہیں جانتا۔ جو کہانی آپ کو معلوم ہے وہ کچھ اور ہے جب کہ اصل کہانی کچھ اور ہے۔"

"نسیم صاحب وہ کہانی کیا ہے؟"

"چلیں میں آپ کو بتا دیتا ہوں۔" اس نے ایک گہری سانس لی۔ "لیکن آپ کو ایک وعدہ کرنا ہوگا۔"

"جی فرمائیں۔"

"وعدہ یہ ہے کہ جب تک میں زندہ ہوں آپ میری یہ کہانی کسی کو نہیں بتائیں گے اور نہ ہی لکھیں گے۔ ہاں میری موت کے بعد آپ کو اجازت ہوگی۔"

"نسیم صاحب آپ نے پھر موت کی بات کی۔"

"جی ہاں اس لیے کہ میں جانتا ہوں کہ میری موت اب میرے بہت قریب پہنچ چکی ہے۔" اس نے کہا۔

پھر نسیم نے اپنی جو کہانی سنائی وہ کچھ یوں تھی۔

☆......☆

ہم تینوں ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ یعنی میں، نائمہ اور ذیشان۔ کالج میں ہم ایک دوسرے کے ساتھ تھے۔ ہم نے بہت اچھے دن گزارے تھے۔ میرے اور ذیشان کے درمیان ایسی کوئی بات نہیں تھی جس کو روایتی رقابت کہا جا سکے۔

نائمہ نے مجھے قبول کر لیا تھا اور ہماری منگنی ہو چکی تھی۔ پروگرام یہ تھا کہ کالج سے فارغ ہوتے ہی جب میری جاب ہو جائے گی تو میری اور نائمہ کی شادی ہو جائے گی جب کہ ذیشان نے ملک سے باہر جانے کا پلان بنا لیا تھا۔

کیا بے فکری کی زندگی تھی۔ ہنسنا بولنا، گھومنا پھرنا۔ نائمہ کو سمندر بہت پسند تھا۔ سمندر کو دیکھ کر وہ پُرجوش ہو جاتی تھی۔ اس لیے ہم ہفتے میں کم از کم ایک بار ساحل کی طرف ضرور جاتے تھے۔

واپسی میں کسی اچھے سے ہوٹل میں کھانا بھی کھایا جاتا۔

"ہاں میں یہ بتا دوں کہ عام طور پر اخراجات ذیشان ہی برداشت کرتا تھا۔ کیونکہ وہ پیسے والے باپ کا بیٹا تھا۔ جب کہ میری حالت بس یونہی تھی اور نائمہ کے لیے سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا کہ ہم اس پر کوئی مالی دباؤ ڈالتے۔ بے پناہ بے تکلفی بھی تھی ہمارے درمیان اور بے پناہ خلوص بھی تھا۔ گھومنا پھرنا اور اپنے آئندہ آنے والے دنوں کے خوب صورت خواب دیکھنا۔"

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU SOFT BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

"نسیم صاحب ایک بات بتائیں۔ جب آپ تینوں ایک ساتھ تھے تو پھر نائمہ، ذیشان کی طرف کیوں راغب نہیں ہوئی۔" میں نے پوچھا۔ "جب کہ وہ پیسے والا تھا۔ اس نے آپ سے کیوں منگنی کر لی۔"

"اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ہم ایک دوسرے کے دور کے رشتے دار بھی ہوتے تھے۔" نسیم نے بتایا۔

"خاندان والوں نے بھی سوچ کر ہمیں ایک دوسرے سے منسلک کر دیا تھا کہ ہم ایک دوسرے کو جانتے بھی ہیں۔"

"جی ہاں بات سمجھ میں آ گئی۔"

"کہانی نگار ہیں نا آپ۔" نسیم مسکرا دیا۔ "اس لیے ہر پہلو پر دھیان دینے کی عادت ہو گئی ہو گی۔"

"جی نسیم صاحب معاملہ کچھ ایسا ہی ہے۔" میں نے اعتراف کیا۔

"خیر تو پھر یہ ہوا کہ سب کچھ پلان کے تحت ہو گیا۔" نسیم نے اپنی کہانی آگے بڑھائی۔ "میں اپنی دوستی، محبت اور شادی وغیرہ کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ تم چاہو تو کہانی لکھتے وقت اس میں نمک مرچ ڈال دینا۔"

"وہ تو کرنا ہو گا۔ لیکن میں غیر ضروری تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ جو کچھ آپ بتائیں گے وہی لکھوں گا۔"

"پھر یہ ہوا کہ ہم نے اپنی اپنی تعلیم مکمل کر لی اور نائمہ سے میری شادی ہو گئی۔ فرحان صاحب نائمہ سے میری شادی میری زندگی کا سب سے یادگار اور سب سے خوب صورت واقعہ تھا۔ کیونکہ منگنی ہو جانے کے باوجود دل کو یقین نہیں ہو رہا تھا کہ وہ میری ہو جائے گی۔"

"اس بے یقینی کی کیا وجہ تھی نسیم صاحب۔" میں نے پوچھا۔

"ٹھہرو میں تمہیں کچھ دکھاتا ہوں۔ وجہ بھی سامنے آ جائے گی۔"

اس نے اپنے تکیے کے نیچے سے ایک البم بڑی مشکلوں سے نکالی۔ "جانتے ہو یہ البم میرے پاس رہتا ہے۔ ہر وقت، اس اسپتال میں بھی میرے پاس ہے۔ میں اس کو اپنے ساتھ لے کر نہیں آیا تھا لیکن آج صبح تنویر صاحب پہنچا گئے ہیں۔"

"کون تنویر صاحب؟"

"شاید تم ان کو نہیں جانتے۔ وہ اسی محلے کے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ مجھے یہ البم کتنا عزیز ہے۔ وہ میرے گھر سے اٹھا لائے تھے کہ اسے دیکھتے رہیں آپ کا دل بہلتا رہے گا۔"

"اب سمجھا۔ تو اس طرح یہ البم آپ کے پاس اسپتال میں بھی آ گیا۔"

"ہاں بھائی۔" نسیم صاحب نے ایک گہری سانس لی۔ "اب میری زندگی کی بس یہی خوشیاں رہ گئی ہیں۔ اس البم کی تصویریں ذرا تم بھی دیکھو۔"

میں نے وہ تصویریں دیکھیں اور دنگ رہ گیا۔

نائمہ واقعی بہت خوب صورت تھی۔ اس البم کی کچھ تصویریں بلیک اینڈ وائٹ تھیں اور کچھ رنگین۔ لیکن ہر تصویر میں اس کے جلوے مختلف پائے۔ نسیم کے اندیشے اب سمجھ میں آ گئے تھے۔ وہ اتنی خوب صورت تھی کہ کہیں بھی جا سکتی تھی، کسی کے پاس بھی۔ اس لیے نسیم کو ڈر لگا رہتا ہو گا کہ وہ کسی اور کی نہ ہو جائے۔

جب کہ ذیشان بھی ایک ہینڈسم نوجوان تھا۔ پورے البم میں ان کی مختلف سرگرمیوں کی تصویریں بھری ہوئی تھیں۔ ساحل پر، ہوٹل میں، پارک میں وغیرہ وغیرہ۔ واقعی ان تینوں نے بہت خوشگوار دن گزارے تھے۔

مچھلی

مچھلی سفید گوشت کے حصول کا بہترین ذریعہ ہے اور سفید گوشت دل کے لیے انتہائی مفید قرار دیا گیا ہے، تاہم ایک جدید تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ مچھلی خواہ کم چربیلی ہو اگر وہ تلی ہوئی ہے تو دل کے لیے نقصان دہ ہو سکتی ہے۔ امریکن ہارٹ ایسوسی ایشن کے کارڈیو ویسکولر نے امراض پر ہونے والی کانفرنس میں ایک اسٹڈی کی رپورٹ پیش کی جس میں بتایا گیا کہ ہفتے میں ایک یا دو بار چربیلی اور موٹی مچھلی مثلاً ٹونا، سامن اور میکریل کھانے سے دل کے دورے کا امکان 44 فیصد کم ہو جاتا ہے کیونکہ ایسی مچھلیوں میں مفید چکنائیاں شامل ہوتی ہیں جو دل کے دورے کے خطرات کو گھٹا دیتی ہیں۔ دوسری طرف اتنی ہی مقدار میں تلی ہوئی مچھلی کھائی جائے، خواہ وہ کاڈ، کیٹ فش اور اسنیپر کی طرح پتلی اور Lean ہی کیوں نہ ہو، تو یہ نقصان دہ ہے۔

مرسلہ: احمد سعید عثمانی۔ سکھر

URDUSOFTBOOKS.COM — DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS

"کیوں اب تو سمجھ میں آ گیا نا۔" نسیم صاحب نے پوچھا۔

"جی جناب سمجھ میں آ گیا لیکن ایک بات پھر سمجھ میں نہیں آئی۔"

"وہ کیا ہے۔"

"جب آپ کو اس قسم کا اندیشہ تھا تو پھر آپ نے ذیشان کو اس کے قریب کیوں ہونے دیا۔"

"اس کی وجہ یہ ہے کہ تم کو پتا نہیں معلوم کہ میرے اور ذیشان کے تعلقات کیسے تھے۔" نسیم نے کہا۔ "میں اپنے باپ اور بھائی پر بھی بھروسا نہیں کر سکتا جتنا بھروسا مجھے اپنے دوست پر تھا۔ اس نے میرے لیے بہت کچھ کیا ہے۔ کس کس طرح میرا ساتھ دیتا رہا میں بتا نہیں سکتا۔"

"سوری! میں نے ایسا سوال کر کے آپ کو ہرٹ کیا۔"

"ارے نہیں یہ تو ایک نیچرل سا سوال ہے، اگر تم یہ بات پوچھتے نہیں پھر بھی یہ بات تمہارے دل میں رہتی۔ خیر ملازمت سے فارغ ہو کر مجھے بینک میں جاب مل گئی اور ذیشان ملک سے باہر چلا گیا۔ میں اور نائلہ ہمیشہ کے لیے ایک ہو گئے۔

"اوہ وہ بھی کیا خوب صورت دن تھے۔ واقعی آپ نے اپنی بیوی کے ساتھ اچھے دن گزارے تھے۔"

"میں شام کو گھر واپس آ کر تھوڑا آرام کرتا۔ پھر ہم دونوں میاں بیوی کہیں نہ کہیں روانہ ہو جاتے۔"

"یہ بات مجھے معلوم ہو چکی ہے۔"

"لیکن کیا معلوم تھا کہ ایک رات اچانک سب کچھ بدل جائے گا۔" اس نے کہا۔ "اس رات اچانک مجھ پر فالج کا اٹیک ہوا۔ نائلہ نے جا کر محلے والوں کو خبر دی۔ سب مجھے اسپتال اٹھا کر لے گئے تب پتا چلا کہ میں مفلوج ہو چکا ہوں۔" اس نے کرب سے آنکھیں بند کر لیں۔

میں اس کے دل کی کیفیت سمجھ رہا تھا۔ اپنے آپ کو اس انداز سے دہرانا بھی کتنا اذیت ناک ہوا کرتا ہے۔

"کچھ دنوں کے بعد میں گھر واپس آ گیا۔" اس نے پھر کہنا شروع کیا۔ "نائلہ نے میری کچھ دنوں تک بہت خدمت کی۔ پھر ہم نے ایک میل نرس کا بندوبست کر لیا۔ جو میری دیکھ بھال کرنے لگا۔"

"وہی جس کو میں آپ کے گھر پر دیکھ چکا ہوں۔"

"نہیں وہ نہیں اس سے پہلے ایک اور تھا۔" نسیم نے بتایا۔ "میرا علاج بھی چل رہا تھا۔ فزیوتھراپی بھی ہوا کرتی لیکن فالج اتنی جلدی کہاں ٹھیک ہوتا ہے۔"

"ہاں اس میں تو برسوں لگ جاتے ہیں۔" میں نے تائید کی۔

"کچھ دنوں کے بعد ذیشان بھی پاکستان آیا تھا۔ وہ میری خبر سن کر نہیں آیا تھا بلکہ اپنے کسی کام کے سلسلے میں آیا تھا لیکن میرا حال دیکھ کر اس نے واپسی کا ارادہ کچھ دنوں کے لیے ملتوی کر دیا اور میری عیادت کے لیے روزانہ آنے لگا۔"

"میں اس کی محبت کے جذبے سے سرشار ہو رہا تھا۔ کتنا مخلص دوست تھا لیکن میں نہیں جانتا تھا کہ میرے گھر میں کوئی اور کہانی تخلیق کی جا رہی ہے۔ میں تو اپنے کمرے میں اپنے بستر پر ہوا کرتا اور وہ دونوں دوسرے کمرے میں ایک دوسرے کے ساتھ ہوا کرتے۔"

"اور وہ میل نرس؟" میں نے پوچھا۔

"اس کی ڈیوٹی شام چار بجے تک ہوتی تھی۔" نسیم نے بتایا۔ "شام چار بجے کے بعد وہ چلا جاتا۔ ذیشان کی آمد اس وقت ہوا کرتی تھی۔ پھر وہ رات دیر تک ہمارے یہاں رہتا کچھ وقت میرے ساتھ گزارتا پھر دوسرے کمرے میں چلا جاتا۔ نائلہ بھی کسی بہانے اس کے پاس پہنچ جاتی اور میں بے بسی کی تصویر بنا اپنے بستر پر پڑا رہتا۔"

"نسیم صاحب آپ جو کچھ بتا رہے ہیں یہ ہے تو بہت شرم ناک لیکن نیچرل بھی ہے۔" میں نے کہا۔ "میں انسانی نفسیات کو اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ ظاہر ہے آپ کی بیوی ایک جوان اور خوب صورت عورت تھی۔ وہ زیادہ دنوں تک برداشت نہیں کر سکی۔"

"بالکل ایسا ہی ہوا ہے بھائی۔" نسیم صاحب نے کہا۔ ان کی آواز میں بے پناہ دکھ تھا۔ "ایسا ہی ہوا ہے۔ میں تو ایک بے وقعت گوشت کا لوتھڑا بن کر رہ گیا تھا۔ نائلہ کی خوشیوں کا ساتھ کہاں دے سکتا تھا۔ اس لیے سب کچھ جان کر بھی انجان سا بنا رہتا۔"

"کیا ان دونوں کو بھی احساس نہیں تھا کہ آپ کے دل پر کیا گزر رہی ہوگی؟" میں نے پوچھا۔

"ابتدا میں تو احساس کیا ہوگا۔ پھر آہستہ آہستہ ڈھیٹ ہوتے چلے گئے۔ اب وہ میرے سامنے ہی اس قسم کی حرکتیں کرنے لگے تھے۔ جن کو برداشت کرنا میرے بس کی بات نہیں تھی لیکن مجبور تھا۔ ایک دن تو اس وقت انتہا ہو گئی۔

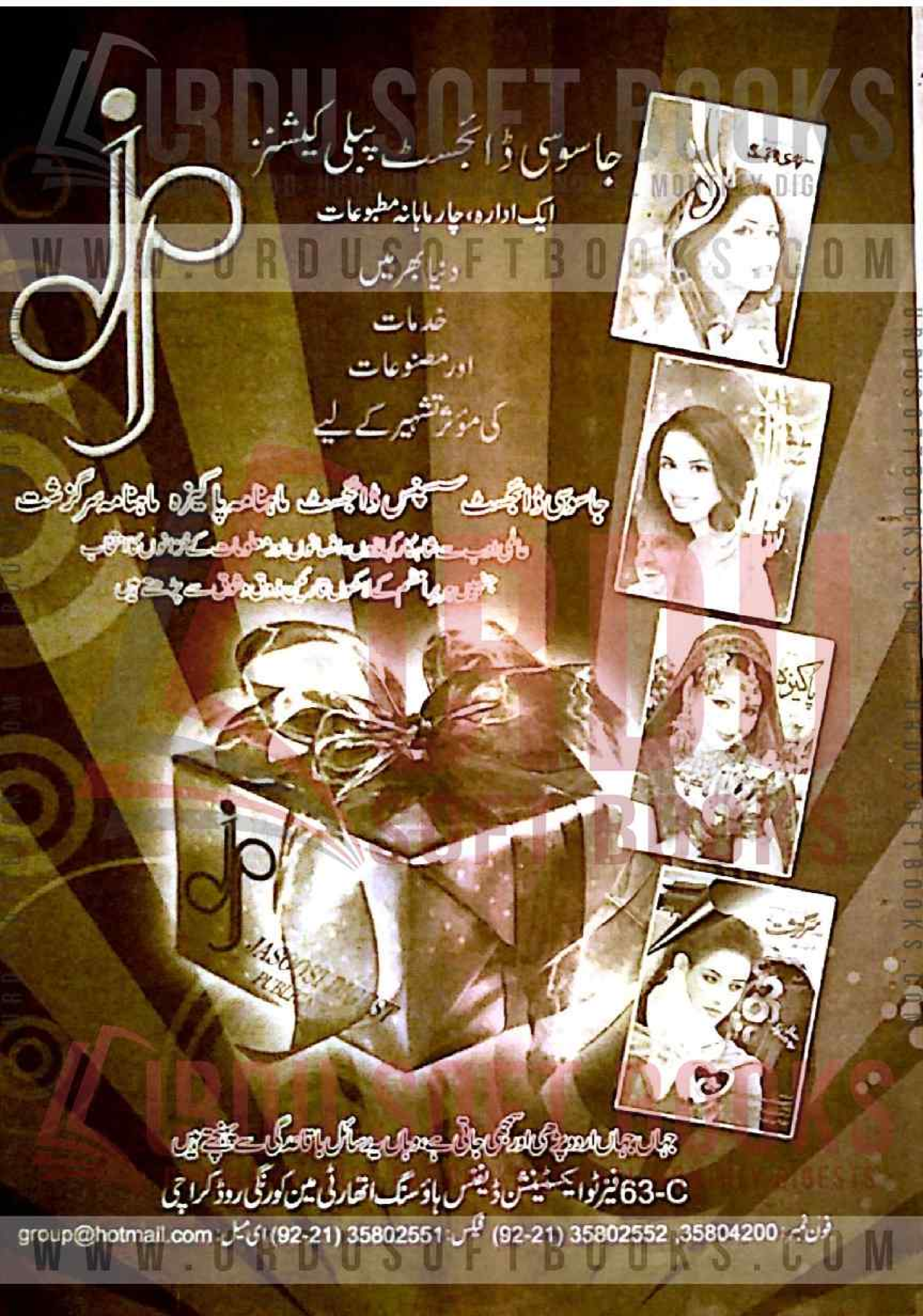
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
ایک ادارہ، چار ماہانہ مطبوعات
دنیا بھر میں
خدمات
اور مصنوعات
کی مؤثر تشہیر کے لیے
جاسوسی ڈائجسٹ سسپنس ڈائجسٹ ماہنامہ پاکیزہ ماہنامہ سرگزشت
جہاں جہاں اردو پڑھی اور سمجھی جاتی ہے وہاں یہ رسائل باقاعدگی سے پہنچتے ہیں
63-C فیز ٹو ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ کراچی
فون نمبر: 35804200, 35802552 (92-21) فیکس: 35802551 (92-21) ای میل: group@hotmail.com

جب ذیشان نے نائمہ کو لپٹا کر پیار کرلیا میرے سامنے اور میں صرف دیکھتا رہا۔"

"واقعی میں اس کرب کو محسوس کرسکتا ہوں۔"

"پھر ایک رات ایک عجیب بات ہوئی۔ میں نے اپنے پیروں میں موومنٹ محسوس کی۔" نسیم نے بتایا۔ "ظاہر ہے ایسا چل ہی رہی تھی۔ اس کے ساتھ میں اپنے گھر پر ورزش بھی کرتا رہتا لیکن میرا خیال ہے کہ میری قوت ارادی پوری طرح میرا ساتھ دے رہی تھی۔ غصے اور بے پناہ نفرت نے میرے اعضا میں حرکت پیدا کرنی شروع کردی تھی۔"

"بالکل درست ہے نسیم صاحب! بعض حالات میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ انسان کے اندر کی شدید خواہش اسے اپنے پیروں پر کھڑا کردیتی ہے۔"

"ہاں! میرے ساتھ ایسا ہی ہو رہا تھا۔ میرے ہاتھوں اور پیروں میں آہستہ آہستہ طاقت آرہی تھی اور حرکت ہونے لگی تھی لیکن میں نے کسی کو بھی اپنی اس پروگریس کے بارے میں نہیں بتایا۔"

"وہ کیوں۔"

"بس یوں ہی۔ میں ان دونوں کو ایک شاک دینا چاہتا تھا۔ رات کے وقت نائمہ دوسرے کمرے میں سویا کرتی تھی۔ میں بستر سے اتر کر پورے گھر میں چلتا رہتا۔ پہلے دیواروں کا سہارا لے کر۔ پھر بغیر کسی سہارے کے چلتا رہتا، ورزش کرتا، ہاتھوں کو حرکت دیتا۔ آگے پیچھے دائیں بائیں۔ ہر طرف بالکل صحت مند انسان کی طرح اور یہ سب کچھ سب کی نگاہوں سے چھپا ہوا تھا۔ میرے ذہن میں پوری پلاننگ مکمل تھی۔"

میں حیران ہوکر اس کی کہانی سن رہا تھا۔ اب اس کہانی میں ٹرننگ پوائنٹ آیا تھا اور دلچسپی پیدا ہونے لگی تھی۔ بہت کچھ تو اندازہ ہونے لگا تھا لیکن بہت کچھ اسی سے سننا تھا۔

"پھر کیا ہوا نسیم صاحب۔"

"پھر وہی ہوا جو ہونا چاہیے تھا۔" نسیم نے کہا۔ "ایک شام جب وہ دونوں دوسرے کمرے میں تھے میں نے دوسرے کمرے میں جاکر دونوں کا مرڈر کردیا۔"

"کیا!" میں اس اعتراف پر بھونچکا سا رہ گیا تھا۔

"ہاں۔" اس نے ایک گہری سانس لی۔ "میں نے ہی مارا تھا ان دونوں کو۔ میں اس لمحے کی لذت بھلا نہیں سکتا۔ جب میں پستول لے کر ان دونوں کے پاس پہنچ گیا تھا۔ یہ پستول میں نے کسی زمانے میں غیر قانونی طور پر خرید کر رکھا ہوا تھا۔ اس کا کوئی ریکارڈ وغیرہ بھی نہیں تھا۔ وہ دونوں اس وقت قابل اعتراض حالت میں تھے اور مجھے دیکھ کر بھونچکے سے رہ گئے تھے۔ میں نے ان دونوں کو اسی وقت شوٹ کردیا۔ پہلے ذیشان کو پھر نائمہ کو۔ اس کے بعد جو کچھ کرنا تھا وہ میرے ذہن میں تھا۔ میں نے جلدی جلدی پورے گھر میں ایسی کیفیت پیدا کردی جیسے ڈاکو لوٹ کر اور دونوں کو مار کر چلے گئے ہوں اور مجھے اس لیے چھوڑ گئے کہ میں تو کسی کام ہی کا نہیں تھا۔ گھر میں نائمہ کے کچھ زیورات تھے کچھ نقد رقم تھی۔ وہ سب چھپا کر ایک جگہ رکھ دیا۔ دروازہ کھول دیا تاکہ محلے والوں کو اندر آنے میں پریشانی نہ ہو اور یہ کہا جاسکے کہ ڈاکو اسی دروازے سے فرار ہوئے ہیں۔ اس کے بعد بستر پر لیٹ کر میں نے چیخنا چلانا شروع کردیا۔ میری آوازیں پڑوسیوں نے سنیں۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ کہانی تم سن چکے ہو۔"

"ہاں سب سن چکا ہوں۔ محلے والے آئے۔ پھر پولیس آئی اور آپ پر کسی کا شک نہیں گیا کیونکہ آپ تو مفلوج پڑے ہوئے تھے اور دونوں قتل ڈاکوؤں کے کھاتے میں ڈال دیے گئے۔ اور بے چاری پولیس آج تک اس کیس کو حل کرنے میں ناکام رہی ہے۔" وہ کچھ دیر کے لیے رکا پھر بولا۔ "لیکن آج میں نے یہ کہانی تم کو بتادی ہے۔ جانتے ہو کیوں! اس لیے کہ میں اب زندہ نہیں رہوں گا۔ وہ دونوں مجھے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے ہر رات میرے پاس آجاتے ہیں۔ میں کہاں تک انکار کروں اور اب تو بالکل بھی نہیں کرسکتا۔ اب تو زندگی کا دامن ہاتھ سے چھوٹتا جارہا ہے۔ میں مرنے والا ہوں۔ ایک بے بس اور بے کسی کی موت۔ میں نے تم کو اپنی کہانی لکھنے کی اجازت دے دی ہے۔ لیکن اس شرط کے ساتھ کہ تم میری موت کے بعد یہ کہانی لکھو گے۔ اس سے پہلے نہیں۔"

اور اب اس کی موت کے دو برس بعد میں یہ کہانی لکھ رہا ہوں۔ نسیم اسی ہفتے انتقال کرگیا تھا۔ اس نے مرنے سے پہلے ایک وصیت بھی لکھوادی تھی کہ اس کے مکان کو بیچ دیا جائے اور مسہری کے نیچے ایک ڈبے میں جیولری اور نقد رقم ہے وہ سب کسی اچھے فلاحی ادارے کو دے دیا جائے۔

تو یہ تھی ایک معذور شخص کی کہانی۔ جس کا ذہن معذور نہیں تھا۔

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

عاجز

جناب ایڈیٹر سرگزشت
السلام علیکم
کافی عرصے بعد میں سرگزشت کی محفل میں آیا ہوں، یہ سچ بیانی میری نہیں ہے۔ یہ شیر علی کی روداد ہے۔ شیر علی بہت قابل آدمی تھا جسے سیاست نے کھا لیا۔ اس کے ساتھ کیا ہوا یہ آپ پڑھ کر جان لیں، کاش وہ سیاست میں نہ جاتا۔

اویس علی سید
(لاہور)

وہ ایک مختلف کردار تھا۔ میری اس سے پہلی ملاقات بے میاں کے ہوٹل میں ہوئی تھی۔ یہ ہوٹل محلے کا ایسا ہوٹل تھا جہاں بے فکرے شام کے وقت جمع ہوتے اور رات گئے تک گپ شپ کیا کرتے تھے۔ شیر علی کو میں نے اسی ہوٹل میں دیکھا تھا۔

میرے دوستوں میں زیادہ تعداد ایسے لوگوں کی تھی جن کو ادب سے دلچسپی تھی۔ ہوتا یہ تھا کہ ہر ہفتے ہم کسی کتاب پر تبصرہ کیا کرتے تھے۔ ایک ہفتے کا وقت دیا جاتا تھا کہ

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
URDUSOFTBOOKS.COM

کتاب پڑھ لی جائے کہ اس کے بعد اس کتاب پر تبصرے ہوتے، چاہے وہ کسی بھی موضوع پر ہو۔

ایک بار ہم نظریۂ ارتقا پر گفتگو کررہے تھے۔ ہم سبھوں کا مؤقف یہی تھا کہ ڈارون کا نظریہ بالکل درست تھا۔ وہ شخص ہماری برابر کی میز پر بیٹھا ہوا ہماری باتیں سن رہا تھا۔ اچانک وہ اٹھ کر ہمارے پاس آگیا۔ ''معاف کرنا حضرات، کیا میں آپ کی اس علمی گفتگو میں شریک ہوسکتا ہوں؟''

یہ تھی تو عجیب سی بات لیکن اس نے جس انداز سے کہا تھا۔ اس سے یہ ظاہر ہورہا تھا کہ وہ بھی باذوق قسم کا انسان ہے۔

''کیوں نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''تشریف رکھیں۔''

وہ ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ ''جناب میرا نام شیر علی ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''آپ کے اس محلے میں نیا آیا ہوں۔''

ہم سبھوں نے بھی اپنا اپنا تعارف کروادیا۔

''آپ لوگ شاید ڈارون کے نظریۂ ارتقا پر گفتگو کررہے تھے۔'' اس نے کہا۔

''جی ہاں۔'' امجد نے کہا۔

''میں نے سنا کہ آپ میں سے ہر ایک اس نظریے کے حق میں ہے۔''

''جی ہاں، کیونکہ یہ ایک عالمگیر سوچ ہے۔''

''معاف کیجیے گا۔ مجھے اس تھیوری سے اختلاف ہے۔'' اس نے کہا۔

''اوہ۔'' شاہد منصور کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ''یعنی آپ ڈارون کو چیلنج کررہے ہیں؟''

''جی ہاں، اور کسی بنیاد پر ہی کررہا ہوں۔'' پھر اس نے جو بولنا شروع کیا ہے تو اس نظریے کی دھجیاں اڑادیں۔ کچھ علمیت تھی اس میں۔ کہاں کہاں سے دلائل لارہا تھا۔ فزکس سے۔ کیمسٹری سے۔ مذہبی کتابوں سے۔ اس نے ثابت کردیا تھا کہ ڈارون کا یہ نظریہ باطل ہے۔

ذرا سی دیر میں ہم سب اس سے مرعوب ہوچکے تھے۔ احساس بجنوری نے اس کے لیے چائے کا آرڈر دے دیا تھا۔

چائے کے گھونٹ لیتے ہوئے اس نے پھر ایک بات کی۔ ''اب میں ایک اور بات بتاؤں۔ ڈارون کا یہ نظریہ بالکل درست تھا۔''

''کیا مطلب؟'' ہم سب چونک پڑے تھے۔

''جی ہاں۔'' وہ بہت اطمینان سے بولا۔ ''اب میں اس کے حق میں دلائل دے کر ثابت کردیتا ہوں۔''

پھر اس نے بولنا شروع کیا ہے تو خود اپنے ہی پہلے پیش کردہ نظریات کی دھجیاں بکھیر دیں۔ ہم سب اس کے سامنے طفل مکتب ہوکررہ گئے تھے۔

کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ اس کی تردید یا تائید کرسکے۔ وہ کچھ دیر بیٹھ کر اجازت لے کر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد ہم نے خاموشی ختم کی تھی۔

''خدایا کیسا آدمی ہے۔'' احساس بجنوری نے کہا۔

''علم کا دریا ہے۔'' شاہد منصور نے تبصرہ کیا۔ ''کیا قوت بیان ہے۔''

''سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ایسا ایک اسکالر ہمارے محلے میں آکر رہنے لگا ہے۔''

''ہمیں اس کی قدر کرنی چاہیے۔''

''قدر تو کرنی ہے لیکن دوستی کرنی چاہیے۔''

''میں تو کہتا ہوں کہ اس کو عظمت دانش وراں میں لے جاکر ان لوگوں سے بھڑا دو جو خود کو بہت طرم باز خان سمجھتے ہیں۔'' فرقان حمید نے کہا۔

غرضیکہ ہم اس کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ اس کے بعد اس سے ہم سبھوں کی دوستی ہوگئی۔ وہ ہر شام ہمارے ساتھ ہی بیٹھنے لگا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہم پر اس کی علمیت کے جوہر بھی واضح ہوتے چلے جارہے تھے۔

خدا نے اسے علم کے ساتھ ساتھ بولنے کی قوت بھی دی تھی۔ ورنہ عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ بہت زیادہ تقریریں کرنے والوں کے پاس علم کا نام و نشان بھی نہیں ہوتا۔ وہ صرف بولنے کے ماہر ہوتے ہیں۔ اور بہت سے ایسے ہوتے ہیں جن کے پاس علم تو بہت ہوتا ہے لیکن ان کے پاس اظہار کی قوت نہیں ہوتی۔

لیکن شیر علی کے پاس یہ دونوں قوتیں تھیں۔ اسی لیے وہ کہا کرتا کہ میں شیر ہوں۔ اور واقعی اس کا نام اس کے والدین نے بالکل درست رکھا تھا۔

اس میں کمال یہ تھا کہ وہ جس نکتے کی مخالفت کرنے لگتا تو سب کو اپنا ہم نوا بنا لیتا۔ کچھ دیر بعد وہ پھر اسی موضوع کی حمایت میں بولنے لگتا اور اس وقت ایک بار پھر آپ کو یقین ہوجاتا کہ وہ جو کہہ رہا ہے، ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔

اس ہوٹل میں مختلف سیاسی پارٹیوں کے سیاسی کارکن بھی بیٹھا کرتے تھے۔ ان میں سے ایک نے شاید اس کی باتوں سے متاثر ہوکر اپنی پارٹی کے بڑوں سے بات کی ہو گی۔

بڑوں نے شیر علی کو اپنے یہاں مدعو کر کے اسے باقاعدہ ایک عہدہ دے دیا۔ ظاہر ہے اس نے وہاں جا کر الفاظ کی جادوگری دکھادی ہوگی۔

الیکشن کچھ دنوں بعد ہونے والے تھے۔

پورے شہر کی طرح ہمارے محلے میں بھی گہما گہمی تھی۔ ویسے تو ہمارے گروپ کا ایسی باتوں سے کوئی واسطہ نہیں تھا لیکن جب پورا شہر اس قسم کی سیاستوں کی لپیٹ میں ہو تو کوئی بھی غیر جانب دار نہیں رہ سکتا۔ شیر علی ابھی بھی آیا کرتا۔

اس نے محلہ بدل لیا تھا۔ وہ کہیں اور رہنے لگا تھا۔ لیکن جب بھی آتا اسی زور و شور کے ساتھ آتا۔ اپنی پارٹی کے حق میں دلائل دیتا ہوا۔

ہم سب چاہے اس کی پارٹی سے اختلاف ہی کیوں نہ رکھتے ہوں لیکن اس کے دلائل کے سامنے بے بس ہو کر رہ جاتے۔ ایسا لگتا جیسے پورے پاکستان میں بس یہی ایک پارٹی ایسی ہے، جس پر بھروسا کیا جاسکتا ہے۔

اب تو یہاں تک ہوگیا تھا کہ وہ اپنی پارٹی کی طرف سے ٹی وی کے ٹاک شوز میں بھی حصہ لینے لگا تھا۔ اس کے بے پناہ دلائل کے سامنے سب ہی ٹھنڈے پڑ جاتے تھے۔

اب اس کے پاس ایک چھوٹی سی گاڑی بھی آگئی تھی۔ شاید پارٹی نے اس کی خدمات دیکھتے ہوئے دلا دی تھی۔

ہم دوست جب بیٹھتے تو یہی بات ہوتی کہ شیر علی کس دنیا کا آدمی تھا اور کس دنیا میں چلا گیا تھا۔ بجنوری اس موقع پر ایک ہی جملہ کہا کرتا۔ ”کچھ بھی ہو۔ وہ آدمی اپنی صلاحیتوں کی مارکیٹنگ جانتا ہے۔“

”لیکن یہ کس قسم کی صلاحیتیں ہیں۔“

”حیرت انگیز۔ وہ آدمی دن کو رات ثابت کرسکتا ہے اور اس کے دلائل کے سامنے ہم یہ ماننے پر مجبور ہو جائیں گے کہ واقعی رات ہے۔ دن نہیں ہے۔ اور جب ہم یہ مان لیں گے تو وہ پھر ایک طنزیہ سی مسکراہٹ کے ساتھ اس دن کو دن ثابت کردے گا۔“

”اور ہم ایک بار پھر اس کی بات ماننے پر مجبور ہو

لہسن

انسانی صحت کے لیے لہسن کی افادیت قدیم زمانے سے تسلیم کی جارہی ہے۔ آج کے محققین بھی اس کے اسی درجہ قائل ہیں بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ۔ مغرب میں پچھلی صدی کے آغاز پر اس بظاہر معمولی لیکن درحقیقت نہایت مفید ترکاری کی اہمیت پہچانی جانے لگی تھی۔ لہسن کے دو دن کے استعمال سے خون کا دباؤ 10 سے 40 ڈگری تک گرجاتا ہے۔ لہسن میں جراثیم کش اجزاء موجود ہیں۔ لہسن آنتوں کی بیماریاں دور کرنے میں مفید رہتا ہے۔ تجربہ شاہد ہے کہ لہسن سے فشار خون (خون کا بڑھا ہوا بلڈ پریشر) کے بیس مریضوں میں سے انیس صحت یاب ہوجاتے ہیں۔ لہسن کے انجکشن لگانے سے بلڈ پریشر میں کمی واقع ہوتی ہے۔ لہسن کی مدد سے مریضوں کے خون کا بڑھا ہوا دباؤ معمول پر لایا جاسکتا ہے۔ لہسن کو پولیو کی روک تھام کے لیے کامیابی سے استعمال کیا جاتا ہے۔ لہسن کے ذریعے تین سو مریضوں کو آنتوں کی بیماریوں سے مکمل نجات ملی جن میں پیچش کے مریض بھی تھے۔

اہل بائبل حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے تقریباً تین ہزار سال قبل کے زمانے میں لہسن کے طبی خواص سے واقف تھے۔ فراعنہ مصر، اہرام تعمیر کرنے والے مزدوروں کو لہسن اضافی مقدار میں کھلاتے تھے۔ قدیم ملاح اور سیاح اپنے رخت سفر میں لہسن باندھنا نہیں بھولتے تھے۔ طویل بحری سفر میں یہ مفید غذا انہیں بیشتر امراض سے محفوظ رکھتی تھی۔ یونانی معالج بڑی باقاعدگی سے اپنے مریضوں کو لہسن استعمال کراتے تھے۔

مرسلہ: عنایت حسین رضوی۔ دبئی یو اے ای

***

آموں کی ایک دعوت میں آم چوستے چوستے سردار جعفری نے مجاز سے کہا۔ ”کیسے میٹھے آم ہیں مجاز! روس میں اور تو ہر چیز مل جاتی ہوگی مگر ایسے میٹھے آم وہاں بھی کہاں؟“

”روس میں آم کی کیا ضرورت ہے۔“ مجاز نے بلاتامل جواب دیا۔ ”وہاں عوام جو ہیں۔“

مرسلہ: احسان اللہ۔ کوئٹہ

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

جائیں گے۔"

"یہی تو فن ہے اس کا۔"

ایک شام ہم معمول کے مطابق ہوٹل میں بیٹھے ہوئے تھے کہ شیر علی آ گیا۔ اس بار وہ بالکل نئی اور بڑی گاڑی پر آیا تھا۔ اس کے ساتھ ایک مسلح محافظ بھی تھا۔

وہ پہلے کی طرح بہت گرم جوشی سے ملا تھا۔

"مبارک ہو۔" میں نے کہا۔ "تم نے نئی گاڑی لے لی۔"

"ہاں۔" وہ ہنس پڑا۔ "میں نے پارٹی چھوڑی ہی اس شرط پر تھی کہ مجھے نئی گاڑی چاہیے۔"

"کیا مطلب؟ کیا تم نے پارٹی چھوڑ دی؟"

"ہاں یار، میں نے دوسری پارٹی جوائن کر لی ہے۔"

پھر اس نے اس پارٹی کا نام لیا جو پہلی پارٹی کے بالکل مخالف تھی۔

"بات سمجھ میں نہیں آئی۔ تم نے پارٹی کیوں بدل لی؟"

پھر اس نے پرانی پارٹی کے خلاف تقریر شروع کر دی اور ایسے ایسے دلائل دیے کہ ہم نے یہ تسلیم کر لیا کہ پہلی پارٹی واقعی اسی قابل تھی کہ اسے چھوڑ دیا جائے۔

میں تو اس کی اس صلاحیت کو کرشمہ کہا کرتا، اس کا خود یہ دعویٰ تھا کہ وہ دنیا کی ہر چیز کی تردید کر سکتا ہے اور اس کی مخالفت میں بول سکتا ہے۔ چاہے وہ کتنا ہی مفید کیوں نہ ہو۔

ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں جن میں اتنی کمانڈ ہوتی ہوگی۔

شیر علی نے کچھ دنوں کے بعد ایک اور پینترا بدلا۔ اس نے دوسری پارٹی بھی چھوڑ دی اور تیسری پارٹی میں چلا گیا۔

یقیناً وہ بھاری معاوضے پر گیا ہوگا۔

اس میں ایک خاص بات یہ بھی تھی کہ اپنی ان تمام تر ترقیوں کے باوجود وہ ہمیں نہیں بھولا تھا۔ جب بھی وقت ملتا تو ہم سے ملنے کے لیے ہمارے پاس ضرور آتا۔

ایک دن اس نے خود اپنے بارے میں بتایا۔ "بھائیو! مجھ میں یہ عادت ہمیشہ سے تھی۔ اسکول کے زمانے میں بھی میرا یہی حال تھا۔ میں بھی کسی ٹیچر کی مخالفت پر اتر آتا تو ساتھیوں کے سامنے اس کی کمزوریوں کے ڈھیر لگا دیتا۔ قدرت نے بولنے کی صلاحیت دے رکھی تھی۔ سب کی نگاہوں میں اس ٹیچر کی عزت کم ہو جاتی۔ پھر دوسرے ہفتے جب موڈ ہوتا تو پھر اسی ٹیچر کی تعریف میں آسمان زمین کے قلابے ملا دیتا۔ بڑا مزہ آتا تھا۔ پھر یہ ہوا کہ بڑا ہو کر تنقیدی نشستوں میں شریک ہونے لگا۔ وہاں بھی میرا یہی حال تھا۔ کبھی ایک موضوع پر بات کرتا تو اس کو آسمان سے ملا دیتا اور دوسرے ہی لمحے پھر اس موضوع کی مخالفت شروع کر دیتا۔"

"مطلب یہ ہوا کہ تمہیں اس موضوع پر بولنے کے لیے بہت سخت محنت کرنی پڑتی ہوگی؟" میں نے پوچھا۔

"بہت زیادہ۔ درجنوں کتابیں پڑھنی پڑتی تھیں۔ اس موضوع کی مخالفت میں بھی اور موافقت میں بھی۔ تم لوگ اسے میری انا پرستی سمجھ سکتے ہو۔ دوسروں کو مرعوب اور حیران کر کے لطف آنے لگا تھا اور اب تو اتنی پریکٹس ہو گئی ہے کہ میں دنیا کے ہر موضوع کی، ہر نظریے کی بلکہ ہر جملے کی نہ صرف دھجیاں بکھیر سکتا ہوں بلکہ اس کو دوسری طرف دنیا کی سب سے بڑی سچائی بھی قرار دے سکتا ہوں۔"

"یار، کچھ بھی ہو۔ تمہاری یہ صلاحیت ہے خطرناک۔"

"ہاں۔" وہ ہنس پڑا۔ "تم لوگ اسے خطرناک سمجھ لو لیکن میرے لیے بہت مفید ہے۔ ایسی باتوں سے جو تقویت ملتی ہے تم اس کے لطف کا اندازہ نہیں کر سکتے۔"

"ایک بات بتاؤ، کیا اس تردید اور تائید کے چکر میں تم اپنی اصل رائے سے دور نہیں ہو جاتے؟"

"ہاں، ہو تو جاتا ہوں۔" اس نے ایک گہری سانس لی۔ "الجھ جاتا ہوں کہ جو کچھ میں پہلے بول گیا ہوں، وہ درست تھا یا بعد میں جو کچھ کہا ہے وہ درست ہے۔ شروع شروع میں تو دل پر ایک بوجھ سا رہتا تھا۔ اپنے آپ کو ملامت بھی کرتا تھا کہ یہ کیسا کھیل شروع کر دیا ہے لیکن اب کوئی احساس نہیں ہوتا۔ کیونکہ میں ایک کامیاب انسان ہوں۔ اب سب کچھ ہے میرے پاس۔"

ہم سب اس کی طرف دیکھتے رہے۔ اس وقت وہ کسی فاتح کے انداز میں ہمارے سامنے تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایسی چمک تھی جو کامیاب انسان کی آنکھوں میں ہوا کرتی ہے۔ ہونٹوں پر دنیا کو ٹھوکروں پر رکھتی ہوئی مسکراہٹ تھی۔

اس نے جو لباس پہن رکھا تھا وہ اتنا قیمتی تھا کہ ہمارے بیس جوڑے بن سکتے تھے۔ ایک انتہائی قیمتی موبائل تھا اس کے پاس۔ ہوٹل سے باہر اس کی شاندار گاڑی کھڑی تھی۔ اس نے جو پرفیوم لگا رکھا تھا۔ اس پرفیوم نے پورے ماحول کو مہکا دیا تھا۔

کچھ دیر بعد اس نے بات آگے بڑھائی۔ "یارو، سچ تو

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

یہ ہے کہ مجھے تم لوگوں کو دیکھ کر افسوس ہوتا ہے تم سب پڑھے لکھے لوگ ہو۔ ذہین ہو۔ لکھنا جانتے ہو۔ اس کے باوجود تم لوگوں کی معاشی حالت تباہ ہے۔ کچھ بھی نہیں ہے تمہارے پاس۔"

"یار، مسئلہ یہی ہے کہ ہم تمہاری طرح منافق نہیں ہو سکے۔" شاہد منصور نے جل کر کہا۔

"منافق!" وہ ہنس پڑا۔ "ہاں، ناکام لوگ اکثر مجھے منافق ہی کہتے ہیں۔"

"تمہارا کیا خیال ہے کہ تم کبھی ہار نہیں مانو گے؟" امجد نے پوچھا۔

"کس بات کی ہار؟"

"یہی کہ دنیا کا کوئی تو ایسا موضوع ہوگا کہ تم اس کی تردید نہیں کر سکو گے۔"

"سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ مجھے اپنے علم پر بھروسا ہے۔" اس نے فخر سے کہا۔

ایک پرابلم یہ تھی کہ ہم سب اس کی اس بات کی تردید بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ہمارے پاس اتنا زور بیان ہی نہیں تھا۔ بہرحال دن گزرتے چلے گئے۔

ایک شام میں اور بجنوری ہوٹل میں تھے کہ شاہد منصور دوڑتا ہوا آیا۔ "یار! تم لوگوں نے خبر سنی؟"

"کیسی خبر؟"

"شیر علی پر قاتلانہ حملہ ہوا ہے۔" اس نے بتایا۔ "اس کی حالت نازک ہے۔"

"او خدا!" ہم دونوں اس خبر سے پریشان ہو گئے تھے۔

"تو کہاں ہے وہ؟"

"جناح اسپتال کے آئی سی یو میں۔" شاہد نے بتایا۔

"ہمیں چلنا چاہیے۔"

"یہ کوئی کہنے کی بات ہی نہیں ہے یار، ویسے اس کے ساتھ ایک نہ ایک دن ایسا ہونا ہی تھا۔ کچھ پتا چلا؟"

"یہاں ایسی باتوں کا اتنی جلدی پتا کہاں چلتا ہے۔ ہوگا کوئی سیاسی مخالف۔"

بہرحال ہم تینوں شیر علی کو دیکھنے اسپتال پہنچ گئے۔ وہ چونکہ ابھی ایک اہم انسان بن گیا تھا۔ اسی لیے پولیس موجود تھی اور ویسے بھی معاملہ قاتلانہ حملے کا تھا۔ پولیس کو تو ہونا ہی تھا۔

ہم نے کوشش کی کہ ہم کسی طرح اس کو ایک نظر دیکھ سکیں۔ لیکن اس کی اجازت نہیں دی گئی۔ ہم سے کہا گیا کہ ڈاکٹرز کا پورا پینل اس کو سنبھالنے میں لگا ہوا ہے۔ کنڈیشن دیکھ کر اجازت دی جائے گی۔

ہم وہیں رک کر انتظار کرنے لگے۔ ہم نے اس کے خاندان کے لوگوں کو پہلی بار دیکھا تھا۔ دو مرد اور تین عورتیں تھیں۔ وہ سب رو رہے تھے اور اس کی زندگی کی دعائیں مانگ رہے تھے۔

ان میں سے ایک اس کا بھائی تھا۔ جو شاید کسی کالج میں پڑھاتا تھا۔ دو اس کی بہنیں تھیں۔ ایک بوڑھا اس کا ماموں تھا۔ مختصر سا خاندان تھا۔ شاید دوسرے لوگ ابھی پہنچ نہیں سکے تھے۔

تقریباً دو گھنٹوں کے بعد ڈاکٹرز نے آکر اعلان کیا کہ اس کے بچنے کی اُمید نہیں ہے۔ وقتی طور پر اسے جزوی ہوش آگیا ہے۔ جس کو ملاقات کرنی ہو وہ جا کر ملاقات کر سکتا ہے۔

سب سے پہلے اس کے گھر کے لوگ گئے تھے۔ کچھ دیر بعد ان کی واپسی ہوئی تو انہوں نے بھی اتنا بتایا کہ اس کی کنڈیشن ٹھیک نہیں ہے۔ البتہ دو تین باتیں کر سکتا ہے۔

پھر ہم کو اجازت دی گئی۔

ہم تینوں اس کے پاس پہنچ گئے۔ وہ نشان عبرت بنا ہوا بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ دنیا بھر کی نلکیاں اس کی رگوں میں لگی ہوئی تھیں۔ انسان بھی کتنا بے بس ہوا کرتا ہے۔

اس کے اختیار میں تو اپنی زندگی بھی نہیں ہوتی۔ ہمیں دیکھ کر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ کچھ کہنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی آواز اتنی دھیمی تھی کہ سنائی نہیں دے رہی تھی۔

ہم تینوں.... اسے گھیرے کھڑے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا۔ "میں...... میں ہار گیا۔ میں پہلی بار ایک جملے کی تردید نہیں کر سکتا ہوں۔"

"تم خاموش رہو شیر علی۔" بخاری نے کہا۔

"نہیں، سن لو کہ وہ...... وہ کیا جملہ ہے۔ وہ ہے لا الہ الا اللہ خدا ایک ہے۔ میں اس کلمے کی تردید نہیں کر سکتا ہوں۔ یہ میرے بس میں نہیں ہے۔"

اس نے بڑی دشواری سے پورا کلمہ ادا کیا۔ اس کے جسم نے ایک جھٹکا لیا اور وہ مر گیا۔ وہ شخص مر گیا جو شاید موت کی بھی تردید کر سکتا تھا لیکن وہ نہیں کر سکا۔ کوئی معبود نہیں سوائے اللہ کے۔ کس کے بس میں ہے کہ اس حقیقت کی تردید کر سکے۔ چاہے وہ شیر علی جیسا قادر الکلام ہی کیوں نہ ہو۔

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

مکرمی مدیراعلیٰ سرگزشت

السلام علیکم

پردیس میں پاکستانی رسائل کچھ زیادہ ہی مزہ دیتے ہیں گو کہ ہم تک سرگزشت تقریباً اٹھارہ بیس دن بعد پہنچتا ہے لیکن جب پہنچتا ہے تو میں اور میرے کئی دوست خوشی سے نہال ہو جاتے ہیں۔ باری باری سے ہم سب سرگزشت سے استفادہ کرتے ہیں۔ اس بار کا سرگزشت پڑھا۔ اس میں ایک سچ بیانی ایسی تھی کہ میری زندگی کا عکس نظر آئی۔ اسے پڑھ کر سوچا کہ اپنی حالاتِ زندگی لکھ دوں تاکہ دوسرے لوگ بھی ہوشیار ہو جائیں اور چالبازوں کے چنگل میں پھنسنے سے بچ جائیں۔

اعجاز احمد

(ٹوکیو جاپان)

مہرباں

میں ایک ملٹی نیشنل دوا ساز کمپنی میں ملازم تھا۔ وہاں ملازمت کرتے مجھے پندرہ سال ہو چکے تھے۔ تنخواہ خاصی معقول تھی۔ کمپنی کی طرف سے گاڑی بھی ملی ہوئی تھی۔ ان دنوں میں کراچی میں تعینات تھا۔ میں ڈیرہ غازی خان کا رہنے والا ہوں۔ اس لیے ہر مہینے چند روز کے لیے ڈیرہ ضرور جاتا تھا۔ گاؤں میں ہمارا کوئی بھی رشتے دار نہیں تھا۔ ایک بڑی بہن تھی جو شادی کے بعد ملتان چلی گئی تھی۔ یوں تو گاؤں کے لوگ ایک دوسرے کا بہت خیال رکھتے ہیں لیکن

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

کوئی اپنا ساتھ نہ ہو تو انسان خود کو بہت اکیلا اور تنہا محسوس کرتا ہے۔ میری والدہ کا بھی یہی حال تھا۔

میں نے کئی دفعہ انہیں بھی کراچی ساتھ لانے کی کوشش کی لیکن انہوں نے گاؤں چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ وہ کراچی آ کر بالکل تنہا ہو کر رہ جاتیں۔ گاؤں میں تو انہیں سو معروفیات تھیں۔ وہ قرآن کی حافظہ تھیں اور گاؤں کے بچوں اور بچیوں کو قرآن پڑھاتی تھیں۔ وہ اکثر بچوں کو قرآن حفظ بھی کرا چکی تھیں۔ پھر گاؤں والے اپنے چھوٹے موٹے مسائل میں ان ہی سے مشورے لیا کرتے تھے۔ کسی کی بیٹی کی شادی ہے تو اماں اس کے جوڑے تیار کر رہی ہیں۔ کوئی بیمار ہے تو اماں اس کی دیکھ بھال کر رہی ہیں۔ ان ہی معروفیات میں دن گزر جاتا۔ وہ بھلا گاؤں چھوڑ کر کراچی کیوں آتیں؟ یوں میں ہمیشہ کراچی میں اکیلا ہی رہا۔

میری جگہ کوئی اور ہوتا تو بگڑ جاتا۔ بگڑنے کے لیے اس سے بہتر موقع کہاں مل سکتا ہے۔ میں خوش شکل اور خوش لباس تھا۔ گفتگو کرنے کا ڈھنگ جانتا تھا، کئی لڑکیوں اور عورتوں نے مجھے رجھانے کی کوشش بھی کی لیکن میں ثابت قدم رہا شاید یہ میری ماں کی تربیت اور بیوی کی محبت کا نتیجہ تھا۔

آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ میری شادی بہت کم عمری میں ہو گئی تھی۔ ہر ماں کی طرح اماں کو بھی میرے سر پر سہرا سجانے کا ارمان تھا۔ بابا نے ورثے میں کچھ زمین چھوڑی تھی۔ اس وقت میں بہت چھوٹا تھا اس لیے اماں نے یہ زمین منظور ماما کو ٹھیکے پر دے دی تھی۔ منظور ماما میرے ماموں نہیں تھے۔ وہ اماں کے منہ بولے بھائی تھے اس لیے میں انہیں ماما کہنے لگا تھا۔ وہ بہت نیک اور دیانت دار شخص تھے۔ انہوں نے کبھی اماں کے ساتھ بددیانتی نہیں کی۔ وہ اماں کو ایک ایک پائی کا حساب دیتے تھے۔ گاؤں میں ان کی بھی زمین تھی لیکن میری زمین سے بہت کم تھی۔ یوں میں زمینداری سے ہمیشہ دور رہا۔

میں نے میٹرک ہی پاس کیا تھا کہ اماں کو میری شادی کی فکر پڑ گئی۔ ان میں یہ اچھی بات تھی کہ کسی پر اپنا فیصلہ مسلط نہیں کرتی تھیں۔ وہ لڑکیاں تلاش کر کے مجھے دکھاتیں اور میں انہیں رد کر دیتا۔ میں اصل میں اتنی جلدی شادی کرنا ہی نہیں چاہتا تھا۔

میں اکثر منظور ماما کے گھر چلا جاتا تھا۔ وہاں ان کے بچوں کے ساتھ میرا دل لگا رہتا تھا۔ ان کی بیٹی نسرین مجھ سے بہت بے تکلف تھی۔ وہ مجھ سے دو تین سال چھوٹی تھی لیکن ذہنی طور پر خود کو بڑا سمجھتی تھی۔ وہ ان دنوں آٹھویں کلاس میں پڑھ رہی تھی۔ میں پڑھائی میں اکثر اس کی مدد کرتا رہتا تھا۔ پھر اماں میرے لیے لڑکی ڈھونڈتی رہیں اور میں ہر لڑکی مسترد کرتا رہا۔ اس دوران میں نسرین نے مڈل پاس کر لیا۔ وہ تو آگے پڑھنا چاہتی تھی لیکن لڑکیوں کا سیکنڈری اسکول وہاں سے بہت دور تھا اور بے چاری دل مار کے رہ گئی۔

اس دن بھی اماں مجھے نزدیکی گاؤں لے جانا چاہتی تھیں، اماں کا مشن وہی تھا، لڑکی کی تلاش! میں اسے مشن امپاسیبل کہتا تھا۔

میں نے اماں سے کہا۔ ''اماں اس دفعہ نسرین کو بھی اپنے ساتھ لے چلو۔''

''کیوں بھئی نسرین کو کیوں؟'' اماں نے پوچھا۔

''اماں، نسرین کی پسند بہت اچھی ہے۔ شاید وہ کوئی مشورہ ہی دے دے۔''

اماں راضی ہو گئیں۔ یوں دوسرے دن ہم لوگ قیوم تانگے والے کے ساتھ دوسرے گاؤں روانہ ہو گئے۔ وہاں کے ایک کھاتے پیتے زمیندار کی اکلوتی بیٹی اماں کی نظر میں تھی۔

ہم گاؤں پہنچے تو دوپہر ہو رہی تھی۔ سورج بالکل سر پر چمک رہا تھا۔ لڑکی کے باپ غلام غوث نے بہت گرم جوشی سے ہمارا استقبال کیا۔ شدید گرمی تھی اس لیے ہماری تواضع گڑ کے شربت سے کی گئی۔ پھر تھوڑی دیر بعد کھانا لگا دیا گیا۔

اس وقت مجھے وہ لڑکی بلقیس دکھائی دی جسے دیکھنے میں یہاں آیا تھا۔

اس کی ماں نے کہا۔ ''بلقیس خالہ جی کو گاجر کا حلوا تو کھلا جو تو نے اپنے ہاتھ سے بنایا ہے۔''

فوراً ہی ایک گیم شیم لڑکی شرماتی لجاتی حلوے کی ڈش لے کر آ گئی۔

میں نے بلقیس کو دیکھا تو نوالہ میرے حلق میں پھنسنے لگا۔ نسرین نے جلدی سے پانی کا گلاس بھر کے مجھے دیا اور خود اپنی ہنسی روکنے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ لڑکی واقعی خوب صورت ہوتی اگر اس کا وزن پندرہ کلو کم ہوتا اور آواز میں کچھ نسوانیت ہوتی اگر اس کے جسم پر خوب صورت تراش

کے کپڑے ہوتے تو وہ مزید خوب صورت لگتی۔

کھانے کے بعد ہم سب نے کچھ دیر آرام کیا، پھر اپنے گاؤں روانہ ہو گئے۔ اماں نے لڑکی کے والدین سے کہا تھا کہ وہ کل پرسوں تک اپنا جواب بجھوا دیں گی۔

تانگے میں تو قیوم کی وجہ سے ہم نے کوئی بات نہیں کی ورنہ سارے گاؤں میں ڈھنڈورا پٹ جاتا۔ گھر پہنچ کر اماں نے مجھ سے پوچھا۔ ''ہاں بھئی اجو اب بتا؟'' میرا نام تو اعجاز ہے لیکن اماں مجھے پیار سے اجو کہتی ہیں۔

''اجو کیا بتائے گا خالہ، مجھ سے پوچھو۔'' نسرین نے کہا۔

''نی تھوڑا صبر کر۔'' اماں نے اس سے کہا۔ ''پہلے مجھے اجو سے پوچھنے دے۔''

''اماں آج تو تم ہی بتاؤ تمہیں لڑکی کیسی لگی؟'' میں نے کہا۔

''پتر شادی مجھے تو نہیں کرنی۔'' اماں نے کہا۔

''اماں مجھے تو وہ لڑکی کم اور پہلوان زیادہ لگ رہی تھی۔ مجھے بالکل پسند نہیں آئی۔''

میرے انکار پر اماں نے کسی ردِعمل کا اظہار نہیں کیا۔ اب تو اماں میرے اس جواب کی عادی ہو گئی تھیں۔

''خالہ میں تو کہوں گی کہ لڑکی بہت اچھی ہے۔''

نسرین نے کن انکھیوں سے میری طرف دیکھا۔ اس کی خوب صورت آنکھوں میں اس وقت شرارت مچل رہی تھی اور ہنسی روکنے کی کوشش میں اس کا سرخ و سفید چہرہ بالکل قندھاری انار بن گیا تھا۔

''کیا اچھائی ہے اس میں؟'' اماں نے پوچھا۔

''خالہ جی وہ گھر کے بلکہ باہر کے کام بھی بہت آرام سے کرلے گی۔ بھینسوں کا دودھ دوھنا، چکی پیسنا، گھر کے بھاری سامان اِدھر اُدھر کرنا اور ضرورت کے وقت اجو کی پٹائی لگانا۔'' یہ کہہ کر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

اماں بھی ہنسنے لگیں اور بولیں۔ ''سچ پوچھو تو یہ لڑکی تو مجھے بھی پسند نہیں آئی۔''

''لیں پھر ہو چکی اجو کی شادی؟'' نسرین گہرے سانس لے کر بولی۔ ''یہ اٹھائیسویں لڑکی تھی خالہ جی اب تو کوئی حور پری ہی آسمان سے اترے گی اجو کے لیے۔'' یہ کہہ کر نسرین اٹھی اور بولی۔ ''میں تو گھر چلی خالہ جی، بہت تھک گئی ہوں۔''

وہ چہکتی ہوئی چلی گئی تو اچانک مجھے احساس ہوا کہ نسرین بہت خوب صورت ہے، اس کی چال بہت مستانی ہے اس کی آواز میں نغمگی ہے اور اس کی زلفیں......''

''اجو!'' اماں نے مجھے چونکا دیا۔ ''تو کیا سوچنے لگا؟''

''اماں!'' میں نے آہستہ سے کہا۔ ''یہ نسرین بھی تو بہت اچھی لڑکی ہے؟''

اماں نے چونک کر مجھے دیکھا۔ پھر بولیں۔ ''یہ بات میری سمجھ میں کیوں نہیں آئی۔'' انہوں نے فوراً لطیف کو آواز لگائی۔ ''لطیفے!''

لطیف اس وقت ہمارے دروازے کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اماں اسے پکار لیتیں۔

''جا ذرا بھا منظور کی بیٹی نسرین کو بلا لا۔''

تھوڑی دیر بعد نسرین اٹھلاتی ہوئی آگئی اور بولی۔

''اب کیا ہو گیا خالہ جی، کیا کوئی اور لڑکی دیکھنے جا رہی ہو؟''

اماں غور سے نسرین کا جائزہ لے رہی تھیں۔ وہ بولیں ''کہیں جانے کی ضرورت کیا ہے پتر، لڑکی تو یہیں اسی گاؤں میں ہے۔''

''اسی گاؤں میں ہے؟'' نسرین ایک دم ہشاش بشاش نظر آنے لگی۔ ''وہ کون ہے خالہ جی؟''

''اسے کہتے ہیں بچہ بغل میں ڈھنڈورا شہر میں۔'' اماں نے ہنس کر کہا۔

''تو خالہ جی کہاں ہے بچہ؟''

''تو جا کر بھا منظور کو بھیج دے۔'' اماں نے کہا۔

تھوڑی دیر بعد منظور ماما وہاں آگئے اور اماں نے نہ صرف فوراً میرا رشتہ نسرین کے ساتھ کر دیا بلکہ مجھے مٹھائی لینے کے لیے دوڑا دیا۔

یوں صرف سولہ برس کی عمر میں میری شادی ہو گئی۔

نسرین تو اس وقت صرف چودہ سال کی تھی۔

شادی کے بعد میں نے کالج میں داخلہ لیا اور بی ایس سی پاس کر لیا۔ جس دن میرا بی ایس سی کا رزلٹ آیا اسی دن میری بیٹی ثمرہ پیدا ہوئی۔ اسی دن میں نے ایک اخبار میں ایک دوا ساز کمپنی کا اشتہار دیکھا تو درخواست دے دی۔ مجھے امید نہیں تھی کہ مجھے وہاں ملازمت مل جائے گی لیکن غیر متوقع طور پر مجھے ملازمت مل گئی اور میں ملتان چلا گیا۔ بعد میں میرا ٹرانسفر کراچی ہو گیا اور میں پندرہ سال سے اسی کمپنی میں ملازمت کر رہا تھا۔

وقت بڑی تیزی سے گزر رہا تھا بیٹی بھی بڑی ہوتی

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

جارہی تھی۔ ان ہی دنوں کمپنی نے گولڈن ہینڈ شیک کی اسکیم نکالی۔ میں نے سوچا کہ یہاں سے ریٹائرمنٹ لے لوں اور ملتان جاکر کسی دوسری کمپنی میں ملازمت کرلوں۔ اس سے مجھے کئی فائدے ہوتے۔ میں ملتان میں ملازمت کرتا تو گھر کے نزدیک ہو جاتا۔ اپنی کمپنی سے گولڈن ہینڈ شیک لینے کے بعد مجھے دس بارہ لاکھ روپے ملتے جو اس زمانے میں پچاس پچپن لاکھ کے برابر تھے۔

میں کوئی کام نسرین کی مرضی کے بغیر نہیں کرتا تھا۔ ہمارے گھر بلکہ پورے گاؤں کی لال بجھکو ان دنوں نسرین ہی تھی۔ اس نے آہستہ آہستہ اماں کی جگہ سنبھال لی تھی۔

میں گاؤں پہنچا تو اماں اور نسرین کسی شادی میں جارہی تھیں۔ مجھے دیکھ کر نسرین اور ثمرہ نے جانے کا پروگرام منسوخ کردیا۔

ثمرہ نے میٹرک پاس کرلیا تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے نسرین کی جوانی یاد آتی تھی۔ وہ بالکل نسرین ہی کی طرح تھی۔ نسرین میں بھی زیادہ تبدیلی نہیں آئی تھی۔ بس وہ کچھ باوقار ہوگئی تھی۔ دیکھنے میں وہ ثمرہ کی بڑی بہن لگتی تھی۔

میں کھانا وغیرہ کھا کر فارغ ہوا تو اماں بھی آگئیں۔

تمام کاموں سے فارغ ہو کر نسرین میرے پاس آئی تو اماں بھی چلی آئیں۔

نسرین نے مجھ سے کہا۔ ”آپا نے پیغام بھجوایا ہے وہ جلد از جلد اپنی امانت لے جانا چاہتی ہیں۔ فہد نے ایم بی اے کرلیا ہے اور کسی بڑے ادارے میں بہت معقول ملازمت کررہا ہے۔ اب وہ مزید انتظار نہیں کرسکتیں۔“

”ہاں تو ہم نے کب انکار کیا ہے۔ آپا جب چاہیں اپنی امانت لے جائیں۔“

”جب چاہیں اپنی امانت لے جائیں۔“ نسرین نے میری نقل اتاری۔ ”ہمیں بھی تو کچھ تیاری کرنا ہوگی۔“

”تم تو کہہ رہی تھیں کہ ساری تیاری ہوگئی ہے۔ زیور بنوالیا ہے، جہیز کا سامان بھی ہوچکا ہے۔“ میں نے کہا۔

”واشنگ مشین، استری، گرائنڈر وغیرہ تو میں خود لے کر آیا تھا۔ باقی جو چھوٹی موٹی خریداری ہے وہ ملتان جا کر کی جاسکتی ہے۔“

”پھر بھی ہمیں کچھ وقت تو چاہیے۔“ نسرین نے کہا۔

”بہو ٹھیک کہہ رہی ہے۔“ اماں نے کہا۔ ”ہم اپنی بیٹی کو خالی ہاتھ تو رخصت نہیں کرسکتے۔“

”میں یہ تو نہیں کہہ رہا ہوں کہ کل ثمرہ کو رخصت

پڑھیے اور یاد رکھیے

1 غذا کو دوا بنائیں اور صحت پائیں......

یہ نصیحت یونان کے مشہور حکیم بقراط (466 ق م ۔ 370 ق م) کی ہے جسے مغربی طب کا بانی سمجھا جاتا ہے اور اس کی سچائی میں کوئی کلام نہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ روزمرہ زندگی میں چمٹنے والی بہت سی چھوٹی بڑی طبی خرابیاں محض درست غذا کھانے سے دور ہو جاتی ہیں۔ خصوصاً موسم کی سبزی پھل استعمال کیے جائیں تو وہ نہ صرف ضروری معدنیات و حیاتین فراہم کرتے بلکہ صحت مند بھی بناتے ہیں۔ چنانچہ عاقل و فہیم وہ ہے جو دوا کے بجائے صحت بخش غذا سے خود کو تندرست رکھے اور بیماریاں نزدیک نہ پھٹکنے دے۔

2 بیماری سے بچنے کے لیے کم کھائیں اور زندگی بڑھانے کی خاطر پریشانی سے بچیں۔ یہ قول مشہور چینی راہب، چو ہوئی ویگ کا ہے۔ اس کا شمار کنفیوشس ازم کے اہم راہبوں میں ہوتا ہے۔ قول کا پہلا ٹکڑا سولہ آنے سچ ہے۔ انسان زیادہ کھانے ہی سے سیکڑوں امراض کا نشانہ بنتا ہے۔ از حد کھانا نہ صرف فربہ کرتا ہے بلکہ نظام ہضم پر بے پناہ دباؤ ڈالتا ہے۔ یہ دباؤ مسلسل رہے تو نظام تلپٹ ہو جاتا ہے۔ لہٰذا عافیت اسی میں ہے کہ انسان زندہ رہنے کے لیے کھانا کھائے نہ کہ اپنی قبر کھودنے کی خاطر......

دوسرا حصہ بھی ہمیشہ یاد رکھنے کے قابل ہے۔ جدید طب دریافت کرچکی ہے کہ عمر گھٹانے والی کئی بیماریاں پریشانی اور ذہنی و جسمانی دباؤ سے جنم لیتی ہیں۔ بدقسمتی سے دورِ جدید میں تیز رفتار زندگی کے باعث دباؤ میں اضافہ ہی ہوا ہے اور اسی سے نجات پانے کا ایک آسان طریقہ نماز پڑھنا و عبادتِ الٰہی کرنا ہے۔

3 تندرستی معالج نہیں فطرت کی طرف سے ملتی ہے۔ لہٰذا ڈاکٹری علاج شروع کرتے وقت ہمیشہ پہلے فطرت سے رجوع کرے۔

مرسلہ: انیقہ انا، چکوال

کردو۔ میں آپا سے دو چار مہینے کی مہلت لے لوں گا۔"

پھر میں نے اماں اور نسرین کو گولڈن شیک ہینڈ کے بارے میں بتایا۔ اماں تو یہ سن کر ہی خوش ہوگئیں کہ میں ملازمت چھوڑنے والا ہوں۔

نسرین نے مجھ سے کہا۔ "آپ کو اگر اتنا پیسا ملے گا تو آپ کوئی کاروبار کیوں نہیں کرلیتے۔"

"کاروبار!" میں سوچ میں پڑ گیا۔

"ہاں کاروبار!" نسرین نے کہا۔ "آپا کا چھوٹا بیٹا گاڑیوں کے اسپیئر پارٹس کا بزنس کررہا ہے وہ ماشاء اللہ خوب کما رہا ہے۔ آپ بھی ملتان یا ڈیرہ غازی خان میں کوئی دکان لے کر اسپیئر پارٹس کا بزنس شروع کردیں۔"

نسرین کی بات میرے دل کو لگی۔ میں نے اس سے کہا۔ "اس کا مطلب ہے کہ میں ملازمت چھوڑ دوں؟"

"اور کیا۔"

کراچی جاکر میں نے گولڈن شیک ہینڈ لے لیا۔ میرا اندازہ تھا کہ مجھے بارہ لاکھ روپے ملیں گے لیکن مجھے کمپنی سے اٹھارہ لاکھ روپے کا چیک ملا۔ گاڑی تو خیر میرے نام ہو ہی چکی تھی۔ یہ کمپنی کی پالیسی تھی کہ اگر کمپنی کے کسی ملازم کو گاڑی ملے پانچ سال ہوجائیں تو وہ گاڑی ملازم کو دے دیتے تھے۔

کراچی سے اپنا سامان سمیٹ کر میں نے گاؤں کا رخ کیا۔ اس مرتبہ میں اپنی گاڑی میں گاؤں جارہا تھا۔

گاؤں پہنچ کر دو تین دن تک تو میں اپنی تھکن اتارتا رہا۔ کمپنی سے ملنے والا چیک میں نے اپنے اکاؤنٹ میں جمع کرادیا تھا۔

مجھے گاؤں پہنچے ہوئے چوتھا دن تھا۔ میں اس دن دیر سے سو کر اٹھا تھا اور ناشتا کرنے کے بعد صحن میں بیٹھا اخبار دیکھ رہا تھا اور دھوپ سینک رہا تھا کیونکہ ان دنوں شدید سردی تھی۔ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ میں اخبار رکھ کر اٹھا اور دروازے کی طرف بڑھا۔ وہاں ایک اجنبی کھڑا تھا۔ اس نے مجھے سلام کیا اور بولا۔ "اعجاز صاحب آپ ہی ہیں؟"

"جی ہاں۔" میں نے الجھ کر پوچھا۔

"میرا نام اکرم ہے۔ میرا کزن اقبال آپ کے ساتھ کراچی میں جاب کرتا تھا۔"

"اقبال چودھری یا رانا اقبال؟" میں نے پوچھا۔

"اقبال چودھری جناب۔" اکرم ہنس کر بولا۔

"ارے وہ تو تین سال تک میرے ہی ڈپارٹمنٹ میں رہا ہے۔ بہت اچھا اور محنتی لڑکا ہے۔" پھر میں نے چونک کر کہا۔ "آپ اندر آئیں بھائی جی، میں بھی کتنا بداخلاق ہوں کہ مہمان کو دروازے پر کھڑا کر رکھا ہے۔"

میں نے اسے بیٹھک میں بلالیا۔

میں نے بیٹھک کو بھی کراچی کی طرز پر ڈرائنگ روم بنالیا تھا۔

اکرم ڈرائنگ روم کی سجاوٹ کو توصیفی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "اعجاز صاحب میں اصل میں ایک کام سے نور پور آیا تھا۔ وہاں سے واپسی پر مجھے آپ کا خیال آیا تو میں نے سوچا کہ ملتا چلوں، اقبال آپ کی بہت تعریف کرتا ہے۔"

"آپ نے اچھا کیا جو چلے آئے۔" میں نے کہا۔

پھر اس کے لیے لسی لے آیا۔

"آپ تو اتنا عرصہ کراچی میں رہے ہیں۔" اکرم ہنس کر بولا۔ "ابھی تک لسی پیتے ہیں؟"

"میں تو کراچی میں بھی لسی پیتا تھا۔" میں ہنس کر بولا۔ "آپ کہیں تو آپ کے لیے چائے منگوادوں؟"

"نہیں جناب، چائے تو بس میں صبح، شام ہی پیتا ہوں۔"

پھر اصرار کرکے میں نے اسے کھانے کے لیے روک لیا۔

ڈیرہ غازی خان میں اکرم کی کپڑے کی دکان تھی۔ اس نے مجھے ڈیرہ غازی خان آنے کی دعوت دی۔ وہاں تو میں اکثر جاتا ہی رہتا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ میں آپ کے پاس ضرور آؤں گا۔

اکرم خاصا خوش اخلاق آدمی تھا۔ پہلی ہی ملاقات میں وہ مجھ سے یوں بے تکلف ہوگیا جیسے ہم دونوں ایک دوسرے کو برسوں سے جانتے ہوں۔

میں گھریلو ضرورت کا سامان ڈیرہ غازی خان ہی سے لاتا تھا۔ ڈیرہ غازی خان وہاں سے چالیس کلومیٹر کے قریب تھا۔ گاڑی میں تو یہ فاصلہ کچھ بھی نہیں ہے۔

دو روز بعد میرا ڈیرہ غازی خان جانا ہوا۔ خریداری کے بعد میں اکرم کے بتائے ہوئے پتے پر پہنچ گیا۔ اکرم اپنی دکان پر موجود تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر خوش ہوگیا۔ اس کی دکان زیادہ بڑی نہیں تھی اس میں مال بھی بہت کم تھا، میں نے دکان کا جائزہ لیا تو وہ بولا۔ "بھائی جی میں نے دو مہینے

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

پہلے کاروبار شروع کیا ہے۔ اس سے پہلے میں سرکاری ملازم تھا اور اسلام آباد میں رہتا تھا۔"

"اکرم بھائی اللہ آپ کے کاروبار میں برکت دے گا۔"

اکرم نے دکان کے ملازم لڑکے کو بھیج کر ٹھنڈی بوتلیں اور بسکٹ وغیرہ منگوا لیے۔ پھر مجھے دکان میں چھوڑ کر وہ کچھ دیر کے لیے باہر چلا گیا۔

وہ واپس آکر بیٹھا تو دکان پر ایک خوش پوش آدمی آیا اور بولا۔ "اکرم صاحب! میرے ویزے کا کیا بنا؟"

"آپ کا ویزا اگلے ہفتے تک لگ جائے گا۔ اصل میں میرا اسلام آباد جانا نہیں ہوا ورنہ تو اسی ہفتے لگ جاتا۔"

"کوئی بات نہیں جناب۔" نو وارد مسکرا کر بولا۔

"میں اگلے ہفتے حاضر ہو جاؤں گا۔"

"ہاں یہ بتائیں کہ وہ آپ کے چچازاد بھائیوں کا کیا حال ہے خط وغیرہ آتا ہے؟"

"وہ تو جناب بہت خوش ہیں۔ اٹھتے بیٹھتے آپ کو دعائیں دیتے ہیں۔ ویزا تو آپ ہی نے لگوایا تھا ان کا۔ اب تو جاپان میں وہ نوٹ چھاپ رہے ہیں۔ چھ سات مہینے میں بیس بائیس لاکھ روپے تو بھیج چکے ہیں۔"

"آپ فکر مت کریں جناب۔" اکرم مسکرایا۔ "اگلے ماہ سے آپ بھی جاپان میں نوٹ چھاپیں گے۔" پھر اکرم چونک کر بولا۔ "آپ بیٹھیں تو سہی۔"

"نہیں اکرم بھائی اب میں چلوں گا۔ مجھے ابھی بہت کام ہے۔"

"ٹھیک ہے پھر اگلے ہفتے آکر اپنا پاسپورٹ اور ویزا لے جائیں بلکہ جانے کی تیاری تو آپ ابھی سے شروع کردیں۔"

میں ہونق بنا ان دونوں کی بات چیت سن رہا تھا۔ اس شخص کے جانے کے بعد میں نے پوچھا۔ "اکرم صاحب، یہ کہاں کے ویزے کی بات ہو رہی تھی؟"

"جاپان کے ویزے کی جناب۔" اکرم ہنس کر بولا۔

"میں اسلام آباد میں پاسپورٹ آفس میں تھا۔ دوسرے ملکوں کے سفارت خانوں سے میرے تعلقات ہیں۔ ان ہی سے ویزے لگوا لیتا ہوں لیکن ان لوگوں کی آنکھوں میں مروت تو نام کو نہیں ہے۔ پیسے لیے بغیر تو میرا کام بھی نہیں کرتے۔ بس یہ رعایت کرتے ہیں کہ دوسروں سے اگر پانچ لاکھ روپے لیتے ہیں تو مجھ سے تین لاکھ لے لیتے ہیں۔"

مجھے تم یاد آتے ہو

جب پہاڑی گھاٹیوں میں گھنگھور گھٹائیں
جھومیں
جب بن کے گھنیرے پیڑوں میں برکھا
کی ہوائیں گونجیں
جب جھینگر ترانے گائیں، موروں کی
صدائیں گونجیں
ایسے میں مجھے تم یاد آتے ہو
جب فضا میں برکھا کے سے لہرائیں
جب کنار دریا ہوا کے نرم جھونکے مجھے
چھو کے گزر جائیں
جب چاندنی رات میں جھیل پر، ملاح
محبت کے گیت گائیں
ایسے میں، مجھے تم یاد آتے ہو
جب ساون میں باغوں میں بہاریں آئیں
جب معصوم دوشیزائیں گیت پیا ملن کے گائیں
مور ناچیں، کوئل کرے کوکو، سکھیاں
جھولوں پر لہرائیں
ایسے میں، مجھے تم یاد آتے ہو
جب افق کے سینے پر شاداب گھٹائیں
جھومیں
گھنے بن اور باغوں میں مستانہ ہوائیں
جھومیں
ان کے معطر نشیلے جھونکوں سے خاموش
فضائیں جھومیں
ایسے میں، مجھے تم یاد آتے ہو

حیا ترمذی، کاغان

اکرم نے کہا۔ ''لیکن کام جلدی کر دیتے ہیں۔'' پھر وہ مجھے غور سے دیکھ کر بولا۔ ''آپ نے بھی تو شاید گولڈن شیک ہینڈ لیا ہے۔ آپ ماشاءاللہ ابھی جوان ہیں اگر آپ چاہیں تو میں آپ کا ویزا بھی لگوا سکتا ہوں۔ آپ کو تو سیلز کا اچھا خاصا تجربہ بھی ہے۔ آپ کو تو بہت اچھی جاب مل سکتی ہے۔''

''میں کہاں جاؤں گا جناب!'' میں نے ہنس کر کہا۔

''آپ کون سے ابھی بوڑھے ہو گئے ہیں۔'' اکرم نے کہا۔ ''زیادہ نہیں بس چار پانچ سال جاپان میں لگا دیں پھر آرام سے بیٹھ کر یا کوئی بڑا کاروبار کریں۔ آپ کو تو کھڑے کھڑے وہاں پانچ چھ لاکھ روپے ماہانہ کی ملازمت مل جائے گی۔ بے شک آپ گھر میں مشورہ کر لیں۔''

میں واپس آتے ہوئے جاپان کے بارے میں سوچتا رہا۔ میں نے دل ہی دل میں حساب لگایا کہ اگر مجھے پانچ لاکھ روپے پاکستانی بھی ملے تو ایک سال میں ساٹھ لاکھ اور پانچ سال میں تین کروڑ روپے کماؤں گا۔ پھر تو میں پاکستان واپس آ کے گاڑیوں کا شوروم کھول سکتا ہوں۔ بہت بڑا الیکٹرونک اسٹور بنا سکتا ہوں۔ گھر واپسی تک میں نے کئی کاروبار کر لیے۔

میں نے جب نسرین سے تذکرہ کیا تو وہ بھی سوچ میں پڑ گئی۔ پھر بولی۔ ''اکرم بھائی آدمی تو بہت اچھے ہیں۔ وہ کام دیانت داری سے کریں گے۔''

''سنا تو میں نے بھی ہے کہ جاپان میں لوگ ایک مہینے میں لاکھوں روپے کماتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''بس تو آپ بسم اللہ کریں۔ پانچ سال تو پلک جھپکتے گزر جائیں گے۔ بھائی نصیر کا ایک بیٹا سعودی عرب میں ہے ان کے تو دن پھر گئے ہیں۔ جاپان میں تو تنخواہیں اس سے بھی زیادہ ہیں۔''

''ٹھیک ہے پھر میں اکرم بھائی سے بات کرتا ہوں۔ کل میں ڈیرہ غازی خان جاؤں گا تو اپنی چیک بک بھی لے جاؤں گا۔''

دوسرے دن میں اکرم کے پاس پہنچا تو وہ خوشی سے کھل اٹھا۔ ''آیئے اعجاز صاحب۔'' وہ ہنس کر بولا۔ ''میں آپ ہی کو یاد کر رہا تھا۔''

''بس جناب آپ نے یاد کیا اور میں چلا آیا۔'' پھر میں کچھ توقف کے بعد بولا۔ ''اکرم صاحب! میں نے بھی جاپان جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔''

''واقعی!'' اکرم چونک کر بولا۔

''ہاں سوچتا ہوں، پانچ چھ سال وہاں لگانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔''

''بہت نیک خیال ہے جناب!'' اکرم مسکرایا۔ ''تو پھر بسم اللہ کریں آپ کا پاسپورٹ تو تیار ہوگا؟'' اکرم نے پوچھا۔

''میں نے پاسپورٹ بنوایا تھا لیکن وہ ایکسپائر ہو چکا ہے۔''

''کوئی بات نہیں۔'' اکرم نے کہا۔ ''پاسپورٹ آفس میں تو میرا اپنا بندہ بیٹھا ہے۔ ارجنٹ پاسپورٹ دو دن میں بن جائے گا۔ آپ اپنا پرانا پاسپورٹ اور دو تصویریں لے آئیں۔ میں ویزے کے لیے درخواست دے دیتا ہوں۔''

''اکرم بھائی، ویزے کے لیے کتنا خرچ ہوگا؟''

''آج کل امریکا کا ریٹ چھ لاکھ اور جاپان کا آٹھ لاکھ چل رہا ہے۔'' اکرم نے کہا۔ ''لیکن میں آپ کا ویزا تین لاکھ میں لگوا دوں گا۔ یہ تین لاکھ تو آپ وہاں صرف ایک ہفتے میں کما لیں گے۔'' پھر وہ ہنس کر بولا۔ ''جاپانی بہت محنتی قوم ہے۔ وہاں پورے ملک میں انڈسٹری کا جال پھیلا ہوا ہے۔ وہاں کام بہت ہے لیکن کام کرنے والے نہیں ملتے۔ اس لیے وہاں مزدور بھی خطیر معاوضہ لیتے ہیں۔''

''تو میں تین لاکھ روپے کا چیک ابھی دے دوں؟'' میں نے پوچھا میں اس وقت تصور میں جاپان پہنچ گیا تھا۔

''پیسوں کی ایسی کیا جلدی ہے آ جائیں گے۔'' اکرم ہنس کر بولا۔ ''چلیے آپ دے رہے ہیں تو ابھی دے دیں، میں اسلام آباد جاؤں گا تو اس بندے کو پیسے بھی دے آؤں گا۔''

میں نے تین لاکھ کا چیک لکھ کر اسے دے دیا۔

اس نے چیک لے کر بے نیازی سے اپنی جیب میں رکھا اور بولا۔ ''اب آپ اگلے ہفتے چکر لگایئے گا۔ میں اس وقت تک اسلام آباد سے لوٹ آؤں گا۔''

''میں گھر پہنچا تو اماں نے مجھے بتایا کہ تیری بہن ملتان سے آ رہی ہے۔ وہ نکاح کی تاریخ مانگے گی ابھی سوچ لے کہ اسے کیا جواب دینا ہے؟''

''اماں اس میں سوچنا کیا ہے۔ بس ان لوگوں سے ایک ماہ کی مہلت لے لوں گا۔'' میں نے کہا پھر نسرین سے کہا کہ تم ان چیزوں کی ایک لسٹ بنا لو جن کی خریداری کرنا ہے۔ ہم ملتان جا کر ایک ہی دن میں ساری خریداری کر لیں گے۔

URDUSOFTBOOKS.COM

"لسٹ تو میں نے پہلے ہی بنالی ہے۔" نسرین نے کہا۔ "کل آپا آرہی ہیں ان کے واپس جاتے ہی ہم ملتان چلیں گے۔"

رات کو میں نے نسرین کو بتایا کہ میں اکرم بھائی کو تین لاکھ روپے دے آیا ہوں بس زیادہ سے زیادہ ایک مہینے کے بعد میں جاپان چلا جاؤں گا۔ میں چاہتا ہوں جانے سے پہلے ہی ثمرہ کو رخصت کردوں۔"

"ایسی بھی کیا جلدی ہے؟" نسرین نے کہا۔

"جلدی؟" میں نے کہا۔ "پھر میں پانچ چھ سال کے لیے جاپان چلا جاؤں گا۔ تم کیا ثمرہ کو میرے بغیر رخصت کرو گی؟"

دوسرے دن آپا اور غلام سرور بھائی گاؤں آگئے۔ آپا سے زیادہ صبر نہ ہوا اور وہ ایک گھنٹے بعد ہی شادی کا موضوع نکال بیٹھیں۔ "بھئی اجو!" آپا نے کہا۔ "میں تو آج نکاح اور رخصتی کی تاریخ لے کر ہی جاؤں گی۔"

"بیٹا ذرا چھری تلے دم تو لے۔" اماں فوراً میدان میں آگئیں۔ وہ چند لمحے سوچتی رہیں۔ پھر بولیں۔ "کلثوم تو ایسا کر اگلے مہینے کی پندرہ تاریخ کو برات لے کر آجا۔"

"اماں پہلے اجو سے مشورہ کرلو۔" آپا نے ہنس کر کہا۔

"مشورہ کیا کرنا ہے آپا؟" میں نے ہنس کر کہا۔ "اماں نے جو کچھ کہہ دیا سو کہہ دیا۔"

"ٹھیک ہے پھر اگلے مہینے کی پندرہ تاریخ کو میں برات لے کر آؤں گی۔" آپا نے کہا۔

اماں فوراً گئیں اور مٹھائی لے آئیں۔ ہم سب نے ایک دوسرے کو مبارک باد دی اور منہ میٹھا کرایا۔

دوسرے دن آپا واپس چلی گئیں۔

میں اور نسرین بھی خریداری کے لیے ملتان روانہ ہو گئے۔

نسرین شادی کی تیاریوں میں معروف تھی کہ دوسرا ہفتہ شروع ہوگیا۔ میں اکرم سے ملنے ڈیرہ غازی خان روانہ ہوگیا۔ اکرم دکان میں ہی تھا وہ ہمیشہ کی طرح بہت گرم جوشی سے ملا اور لڑکے کو کسی کے لیے دوڑا دیا۔

"اور سنائیں بھائی اکرم اسلام آباد ہو آئے۔"

"ہاں بھائی جی اسلام آباد ہو آیا۔ آپ کے ویزے کے سلسلے میں چھوٹی سی ایک پرابلم پیدا ہوگئی ہے۔"

"کیسی پرابلم؟" میں نے پوچھا۔

"اصل میں پرابلم ویزا کی نہیں بلکہ پاسپورٹ کی ہے۔" اکرم نے کہا۔ "سرکار نئے پاسپورٹ نہیں بنا رہی ہے۔ ہمارے تو سارے کام انٹرنیشنل ہوتے ہیں۔" اکرم منہ بنا کر بولا۔ "پاسپورٹ آفس میں پاسپورٹ بک ہی ختم ہوگئی ہے۔ اب نئی کتابیں چھپ رہی ہیں۔ اس میں کم سے کم مہینا تو لگ ہی جائے گا۔" میرے چہرے پر مایوسی دیکھ کر وہ جلدی سے بولا۔ "ہاں اعجاز بھائی، ایک طریقہ ہے۔ پاسپورٹ کلرک کچھ کتابیں چھپا کر رکھتے ہیں تاکہ ضرورت

قارئین متوجہ ہوں

پرچا نہیں ملتا

کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچا نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ بک اسٹال کا نام جہاں پرچا دستیاب نہ ہو۔
☆ شہر اور علاقے کا نام۔
☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا موبائل نمبر۔

رابطے اور مزید معلومات کے لیے

ثمر عباس 0301-2454188

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

سسپنس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگزشت

63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں

35802552-35386783-35804200

ای میل: jdpgroup@hotmail.com

URDUSOFTBOOKS — DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS — WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

منڈوں کو مہنگے داموں بیچ سکیں۔ مفت تو مجھے بھی نہیں دیں گے۔ ہاں رعایت ضرور کردیں گے۔''

''دیکھیے اکرم بھائی اگر ہم پاسپورٹ بکس چھپنے کے انتظار میں رہے تو بہت دیر ہو جائے گی۔'' میں نے کہا۔ ''آپ اپنے کسی کلرک سے بات کریں۔''

''او بھائی جی بات کیا کرنی ہے۔ میں جانتا تھا کہ آپ اتنے دن انتظار نہیں کریں گے۔ میں نے اپنے طور پر کلرک کو پیسے دے کر پاسپورٹ بنانے کو کہہ دیا تھا۔''

''آپ نے کتنے پیسے دیے کلرک کو؟'' میں نے پوچھا۔

''ان لوگوں کے منہ کو حرام لگ گیا ہے۔'' اکرم نے منہ بنا کر کہا۔ ''اس مردود نے مجھ سے بھی بیس ہزار روپے لے لیے۔''

''بیس ہزار!'' میں نے حیرت سے کہا۔ پھر اپنا بریف کیس کھول کر چیک بک نکالی۔

اکرم جلدی سے بولا۔ ''ارے بھائی جی یہ کیا کر رہے ہو پیسے آپ نے دیے یا میں نے دیے ایک ہی بات ہے۔''

پھر میرے شدید اصرار کے باوجود اکرم نے پیسے نہیں لیے۔

اچانک دکان میں ایک شخص داخل ہوا اور اکرم سے بولا۔ ''یار اکرم مجھے ذرا پچاس ہزار روپے تو دے۔ آج میں اس یاسین سے ستر ہزار روپے جیت گیا ہوں۔ اتنا ہی اور جیت جاؤں گا اگر میرے پاس شو کرانے کی رقم ہو۔'' پھر وہ مسکرا کر بولا۔ ''یار میں تمہیں بھی حصہ دوں گا۔''

''یار افضل ایسی چھوٹی باتیں کیوں کرتا ہے۔'' اس نے گلے میں ہاتھ ڈال کر ہزار ہزار کے نوٹ نکالے اور گن کر اس کے حوالے کر دیے۔

وہ چلا گیا تو میں نے پوچھا۔ ''بھائی اکرم یہ کیا چکر ہے؟''

یاسین بھائی بہت دولت مند آدمی ہے تاش کا شوقین ہے لیکن اسے کھیلنا نہیں آتا اس لیے ہمیشہ بڑی بڑی رقمیں ہارتا ہے۔ کبھی کبھی یونہی دو چار ہاتھ کھیل لیتا ہے۔'' پھر وہ مسکرا کر بولا۔ ''کبھی آپ بھی کھیلیں۔ بہت مزہ آئے گا۔''

''میں نے کبھی جوا نہیں کھیلا اکرم بھائی۔'' میں نے کہا۔

''جوا؟'' اکرم نے کہا۔ ''توبہ توبہ اعجاز بھائی یہ آپ کیسی بات کر رہے ہیں۔ ہم تو کبھی کبھار تاش کھیلتے ہیں۔ وہ بھی تفریح کے لیے۔ ہم لوگ جواری نہیں ہیں۔''

''میرا یہ مقصد نہیں تھا۔'' اکرم کی بات پر میں شرمندہ سا ہو گیا۔ ''میں تو صرف یہ کہنا چاہتا تھا کہ......''

''چھوڑیں اعجاز بھائی۔'' اکرم نے میری بات کاٹ دی اور افسردگی سے بولا۔ ''آپ نے تو ہمیں جواری بنا دیا۔''

ابھی وہ یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ افضل آ گیا اور بولا۔ ''یار تیرے نوٹ تو بہت مبارک ثابت ہوئے میرے لیے۔ جانتا ہے وہ بازی کتنے کی ہو گئی تھی؟ ایک لاکھ بیس ہزار کی۔ میں نے یاسین کے سامنے رقم پھینکی اور پتے شو کرا لیے۔'' پھر وہ مسکرا کر بولا۔ ''یار پیسے تو تو لے گا نہیں۔ آج میری طرف سے تیری دعوت ہے۔''

اکرم چونک کر بولا۔ ''یار افضل تیری باتوں میں لگ کر میں ان کا تعارف کرانا تو بھول ہی گیا۔'' اس نے میری طرف اشارہ کیا۔ ''یہ میرے بہت اچھے دوست اور بھائی اعجاز ہیں، کراچی میں جاب کرتے تھے۔ اب جاپان جا رہے ہیں۔'' پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''بھائی اعجاز، یہ میرا بچپن کا دوست افضل ہے۔''

افضل نے آگے بڑھ کر گرم جوشی سے ہاتھ ملایا اور بولا۔ ''یار اکرم میں آج کی دعوت میں اعجاز صاحب کو بھی شریک کرنا چاہتا ہوں۔ ابھی ہم ملتان چلیں گے۔ وہاں کوئی اچھی سی فلم دیکھیں گے۔ کسی بہترین ہوٹل میں کھانے کھائیں گے اور رات ملتان میں گزار کر صبح واپس آ جائیں گے۔''

میں گھبرا کر بولا۔ ''افضل صاحب، میں آپ کی دعوت ضرور قبول کرتا لیکن معذرت چاہوں گا۔ میں گھر والوں کی وجہ سے مجبور ہوں۔''

''افضل ایسا کرتے ہیں کہ دعوت کل رکھ لیتے ہیں کل اعجاز بھائی اپنے گھر اطلاع دے کر آ جائیں گے۔'' اکرم نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' افضل نے جواب دیا۔

میرے لیے اب انکار کی گنجائش نہیں تھی۔

دوسرے دن میں نے نسرین کو بتا دیا کہ میں آج ملتان جا رہا ہوں، کراچی کے کچھ دوست آئے ہوئے ہیں۔ وہاں دیر ہو جائے گی میں رات کو آ نہیں سکوں گا۔''

میں راتوں کو گھر سے باہر نہیں رہتا تھا۔ اس لیے نسرین نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ میں اپنی گاڑی میں روانہ

ہو گیا۔

افضل اور اکرم میرا انتظار ہی کر رہے تھے۔ دونوں مجھے دیکھ کر خوش ہو گئے۔

افضل نے کہا۔ ''یار میں نے یاسین کو بھی ساتھ چلنے پر آمادہ کر لیا ہے۔ وہ بھی آنے والا ہو گا۔''

تھوڑی دیر بعد درمیانے قد اور ابھرے جسم کا ایک شخص اکرم کی دکان میں داخل ہوا۔ اس نے بوسکی کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ پیروں میں طلائی کام والے کھسے تھے۔ کلائی میں انتہائی قیمتی گھڑی تھی اور دونوں ہاتھوں کی انگلیوں میں انگوٹھیاں تھیں۔ وہ چہرے سے بہت باوقار لگ رہا تھا۔

''آؤ یاسین بیٹھو۔'' افضل نے کہا۔ ''یہ ہمارے دوست اعجاز ہیں۔ یہ ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب کرتے تھے کچھ دن پہلے وہاں سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ اب جاپان جانے والے ہیں۔'' پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''اعجاز صاحب یہ ہمارے بہت اچھے دوست یاسین گردیزی ہیں۔ یہاں کی آدھے سے زیادہ زمینوں کے مالک ہیں۔ ملتان میں ایک شوگر مل اور فلور مل بھی ہے۔''

یاسین نے میری طرف اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ میں نے اس کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا۔ بہت نرم و ملائم اور نازک سا ہاتھ تھا۔

''میں سرور ٹیکسی والے کو بلا لیتا ہوں۔'' یاسین نے کہا۔

''ٹیکسی کی کیا ضرورت ہے جناب۔'' میں نے کہا۔ ''اپنی گاڑی موجود ہے۔''

ملتان پہنچ کر یاسین نے ایک بڑے ہوٹل کے سامنے گاڑی رکوائی اور وہاں ایک کمرا لے لیا۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد ہم لوگ فلم دیکھنے چلے گئے۔ فلم کے بعد کھانا اور آئس کریم وغیرہ کھا کے ہم ہوٹل لوٹ آئے۔ یاسین شاید ہمیشہ اس ہوٹل میں قیام کرتا تھا۔ وہاں کے اسٹاف سے اس کی اچھی خاصی جان پہچان تھی۔ اس لیے ہوٹل والوں نے کمرے میں ایک اضافی بیڈ اور ڈال دیا تھا۔

وہاں پہنچ کر یاسین نے چائے منگوالی۔ ہم لوگوں نے خوش گپیوں کے درمیان چائے ختم کی، پھر یاسین نے اپنے بریف کیس سے تاش کی ایک نئی گڈی نکال لی اور مسکرا کر بولا۔ ''ہو جائے ایک بازی۔ آج میں پچھلا سارا حساب بے باق کر دوں گا۔''

''یاسین سیٹھ تمہیں ہارنے کا اتنا ہی شوق ہے تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔''

''پہلے رقم دکھاؤ۔'' یاسین نے تاش پھینٹتے ہوئے کہا۔

افضل اور اکرم نے جھٹ سو سو روپے کے نوٹوں کی گڈیاں نکال کر درمیان میز پر ڈال دیں۔

''اعجاز صاحب، آپ بھی رقم دکھائیں۔'' اس نے مجھ سے کہا۔

''وہ جی...... میں تو...... میں......''

''آئیں ناں اعجاز صاحب۔'' اکرم نے کہا۔ ''آپ یہی کہیں گے نا کہ آپ کو کھیلنا نہیں آتا، تو ہم آپ کو سکھا دیں گے۔''

''لیکن رقم......''

''اس کی بھی فکر مت کریں، چیک بک تو ہے نا آپ کے پاس؟'' اکرم نے پوچھا تو میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ''بس پھر تو کوئی مسئلہ ہی نہیں آپ چیک لکھ کر یاسین کو دے دیں وہ آپ کو کیش دے دے گا۔''

میں نے تذبذب کے عالم میں چیک بک نکالی تو جھٹ یاسین نے اپنی جیب میں لگا ہوا پین نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔

میں نے پچاس ہزار کا چیک لکھ کر یاسین کو دے دیا۔ یاسین نے اپنے بیگ میں ہاتھ ڈالا اور نوٹوں کی گڈیاں نکال لیں پھر اس نے گن کر مجھے پچاس ہزار روپے دے دیے۔ میں شروع میں ایک دو ہاتھ جیتا، پھر ہارنے لگا جب جیتی ہوئی رقم ہار گیا تو میں نے کہا۔ ''یار میرے سر میں شدید درد ہو رہا ہے۔ میں اب نہیں بیٹھ سکتا۔''

''ٹھیک ہے بھائی! آپ آرام کریں ہم تو ابھی کھیلیں گے۔'' افضل نے کہا۔

ان میں سے کسی نے بھی میری چالاکی پر غور نہیں کیا تھا۔ میں نے اپنے آگے رکھی ہوئی رقم سمیٹی اور ان لوگوں سے کچھ فاصلے پر دوسرے بیڈ پر چلا گیا۔ وہاں پہنچ کر میں نے رقم گنی۔ وہ ساٹھ ہزار روپے تھے گویا میں اب بھی دس ہزار روپے کے فائدے میں رہا تھا۔

پھر وہ لوگ کھیلتے رہے اور میں ان کی آوازیں سنتا رہا۔ آہستہ آہستہ میری آنکھیں بند ہونے لگیں اور میں نیند کی وادیوں میں اتر گیا۔

میری آنکھ کھلی تو وہ سب سو رہے تھے۔ پھر ایک ایک کر کے وہ تینوں بھی اٹھ گئے۔ ہم نے وہیں پر تکلف ناشتا کیا اور گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ یاسین اپنے کسی کام کے سلسلے

میں وہیں رہ گیا تھا۔

"کتنا جیتا؟" افضل نے اکرم سے پوچھا۔ "میں تو پچاسی ہزار جیت کر اٹھا ہوں۔"

"میں نے صرف ستر ہزار ہی جیتے ہیں۔" اکرم نے کہا۔ پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ "اعجاز بھائی آپ نے کتنے جیتے؟"

"میں تو زیادہ کھیلا ہی نہیں ہوں۔" میں نے کہا۔ "میں نے صرف دس ہزار ہی جیتے ہیں۔"

ہم لوگ ڈیرہ غازی خان پہنچے تو سورج غروب ہونے والا تھا۔ ان دونوں سے رخصت ہوکر میں گھر کے لیے روانہ ہوگیا۔

اگلے ہفتے میں پھر ڈیرہ غازی خان پہنچا۔ اکرم حسبِ معمول اپنی دکان پر بیٹھا کوئی فلمی رسالہ پڑھ رہا تھا۔

وہ مجھے دیکھ کر مسکرایا لیکن اس کے انداز میں وہ گرم جوشی نہیں تھی۔ رسمی باتوں کے بعد میں نے پوچھا۔ "اکرم بھائی میرے ویزے کا کیا ہوا؟"

"وہ بندہ پندرہ دن کی چھٹی پر لاہور چلا گیا ہے۔" اکرم نے کہا۔

"کون بندہ؟" میں نے پوچھا۔

"وہی جو آپ کا ویزا بنا رہا ہے۔" اکرم نے جواب دیا۔

"اس کا مطلب ہے کہ اب مزید پندرہ دن تک انتظار کرنا پڑے گا۔" میں نے کہا۔

"پندرہ نہیں بلکہ بیس دن سمجھیں۔" اکرم نے کہا۔ "ویسے بھی آپ فارغ آدمی ہیں۔ پندرہ بیس دن سے کیا فرق پڑ جائے گا۔"

"ٹھیک ہے بھائی اکرم!" میں نے کہا۔ "اب میں بیس دن بعد آپ کے پاس آؤں گا۔"

"دعا کریں کہ اس وقت تک آپ کا کام ہوجائے۔" اکرم نے کہا۔

اس سے پہلے وہ مجھے روکنے کی کوشش کرتا تھا، کھانے پر اصرار کرتا تھا لیکن آج تو اس نے کچھ بھی نہ کہا۔ میں اس کے بدلتے ہوئے رویے پر غور کرتا ہوا واپسی کے لیے روانہ ہوگیا۔

گھر میں گھستے ہی نسرین نے پہلا سوال یہی کیا۔ "اکرم بھائی نے آج بھی کام نہیں کروایا؟"

"اکرم کے ہاتھ میں نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ بھی کسی دوسرے سے کرا رہا ہے۔"

"میرے دل میں وسوسے پیدا ہو رہے ہیں اجو۔" نسرین نے کہا۔ "آپ معلوم تو کریں کہ اسلام آباد میں کوئی ہے جو یہ کام کر رہا ہے۔"

"تم فضول میں پریشان ہو رہی ہو۔" میں نے کہا۔ "اکرم بھروسے کا آدمی ہے۔ پھر وہ اقبال کا کزن ہے وہ میرے ساتھ کام کر چکا ہے۔"

نسرین کی باتوں سے میں خود بھی پریشان ہوگیا تھا۔ اب تو مجھے بھی شک ہونے لگا تھا کہ اکرم نے کہیں مجھے دھوکا تو نہیں دے دیا۔ اب میں اکرم سے ملوں گا تو اس ویزے والے کے بارے میں ضرور معلوم کروں گا۔

اس چکر میں میرے ذہن سے ثمرہ کی شادی نکل گئی تھی۔ میں نے سوچا تھا کہ فرنیچر دینے کے بجائے ثمرہ کو ایک لاکھ روپے نقد دے دوں گا۔ وہ خود اپنی پسند سے فرنیچر خرید لے گی۔ پچاس ہزار روپے میں نے اپنے داماد کو دینے کا فیصلہ کیا تھا۔

بیس دن گزرنے کے بعد میں پھر ڈیرہ غازی خان روانہ ہوگیا۔

اکرم دکان میں موجود نہیں تھا۔ اس کا ملازم بیٹھا تھا۔ میں نے اس سے اکرم کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ آج ان کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ وہ گھر پر ہیں۔

میں وہاں سے اکرم کے گھر پہنچا تو اس کی بیوی نے بتایا کہ اکرم سو رہا ہے۔ آپ بیٹھیں میں ان کو جگاتی ہوں۔

"انہیں بے آرام مت کریں بھابی۔" میں نے کہا۔

"وہ صبح سے سو رہے ہیں۔ آپ بیٹھیں میں انہیں بلاتی ہوں۔" وہ مجھے بیٹھک میں بٹھا کر اندر چلی گئی۔

تھوڑی دیر بعد مجھے اکرم کی چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔ "تم نے اسے بتایا نہیں میں سو رہا ہوں۔ پتا نہیں کہاں کہاں سے آجاتے ہیں۔"

میں یہ بات سن کر سناٹے میں رہ گیا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اب بھی اگر ویزا نہ لگ سکا تو میں اسے منع کردوں گا اور اپنے پیسے واپس لے لوں گا۔

اکرم غصے میں بھرا ہوا بیٹھک میں داخل ہوا۔ میں نے سلام کیا تو اس نے بے رخی سے جواب دیا۔

میں نے اپنے غصے پر قابو پایا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "اکرم بھائی میں نے تو بھابی کو منع کیا تھا کہ آپ کی نیند خراب نہ کریں۔ اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟"

"میری طبیعت کو چھوڑیں۔" اکرم لٹھ مارنے والے انداز میں بولا۔ "آپ بتائیں کیسے آئے ہیں؟"

"آپ نے مجھ سے کہا تھا کہ میں بیس دن بعد آپ سے ملاقات کروں اگر میرا کام نہیں ہوا ہے تو کوئی بات نہیں۔ آپ میرے پیسے واپس کردیں میں نے اب جاپان جانے کا ارادہ منسوخ کردیا ہے۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" اکرم نے درشت لہجے میں کہا۔ "میں تو خود بہت پریشان ہوں۔ اصل میں وہ بندہ ہی غائب ہوگیا ہے، جس کو میں نے پیسے دیے تھے۔"

"غائب ہوگیا ہے؟" میں نے حیرت سے دہرایا۔ "اب کہاں غائب ہوگیا ہے؟"

"اگر یہ معلوم ہوتا تو اسے پکڑ نہ لیتا۔" اکرم نے کہا۔ "وہ اور بھی کئی لوگوں کے پیسے لے کر بھاگا ہے۔"

"پھر میں کیا کروں؟" میرا ضبط آہستہ آہستہ جواب دے رہا تھا۔ "میں نے تو آپ کو پیسے دیے تھے۔ میں تو اس بندے کو نہیں جانتا۔"

"وہ شخص پکڑا جائے گا تو میں آپ کے پیسے لوٹا دوں گا۔" اکرم نے سرد لہجے میں کہا۔

"اکرم صاحب!" میں نے درشت لہجے میں کہا۔ "بات دو چار سو یا دو چار ہزار کی نہیں بلکہ پورے تین لاکھ روپے کی ہے۔ وہ پیسا میں نے بہت محنت سے کمایا تھا۔ میں تو ابھی پولیس میں رپورٹ درج کراتا ہوں میں صرف آپ کو جانتا ہوں۔"

"او بھائی تو کن پیسوں کی بات کررہا ہے کسے دیے تھے تو نے پیسے؟" اکرم لہجہ بدل کر بولا۔

"تجھے دیے تھے۔" میں نے اسی کے لہجے میں کہا۔ "پولیس سب کچھ خود معلوم کرلے گی۔"

"شوق سے رپورٹ لکھوا۔" اکرم نے تحقیر آمیز انداز میں کہا۔ "تیرے پاس کوئی ثبوت ہے کہ تو نے مجھے پیسے دیے تھے؟"

میں بوجھل قدموں سے باہر نکل آیا۔ اکرم ٹھیک کہہ رہا تھا۔ میرے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا۔ میں بھلا کیسے ثابت کرتا کہ میں نے وہ رقم اکرم کو دی تھی۔

میں بوجھل قدموں سے گاڑی تک پہنچا معاً مجھے خیال آیا کہ ممکن ہے اس شخص نے ابھی چیک کیش ہی نہ کرایا ہو۔ یہ سوچ کر میں بینک پہنچ گیا۔ بینک منیجر سے اچھی خاصی شناسائی تھی۔ میں نے اس سے اپنے چیک کے بارے میں پوچھا تو اس نے کہا کہ میں ابھی ریکارڈ دیکھ کر آپ کو بتاتا ہوں۔ اس نے کمپیوٹر پر ریکارڈ چیک کیا اور بولا۔ "اعجاز صاحب! آپ نے گزشتہ ماہ دس تاریخ کو بیس ہزار نکالے اس کے بعد اٹھارہ تاریخ کو ایک لاکھ روپے مزید نکالے۔"

"ایک منٹ۔" میں نے کہا اور اپنی چیک بک نکال لی۔ ان ہی تاریخوں میں وہ رقم میں نے خود نکالی تھی۔

"پھر اس مہینے کی تین تاریخ کو آپ کا پندرہ لاکھ کا چیک آیا۔"

"پندرہ لاکھ روپے!" میں نے حیدر سے کہا۔ "میں نے اتنی رقم کا چیک تو کبھی کیش نہیں کرایا، نہ کسی کو اتنی رقم کا چیک دیا ہے۔" میں نے کہا۔

"وہ چیک کیش ہوا ہے۔" منیجر نے کہا۔ "میں ابھی ریکارڈ دیکھ کر یہ بھی بتادوں گا کہ آپ کا وہ چیک کس نے کیش کرایا ہے۔ اب بینکس قومی شناختی کارڈ کی کاپی کے بغیر چیک کیش نہیں کرتے۔ وصول کرنے والے کے شناختی کارڈ کی کاپی ہمارے ریکارڈ میں ہوگی۔"

"اور وہ تین لاکھ روپے کا چیک؟" میں نے پوچھا۔

منیجر نے ایک مرتبہ پھر ریکارڈ چیک کیا اور بولا۔ "جی نہیں ابھی تک اس رقم کا چیک نہیں آیا۔"

میں نے اپنی چیک بک سے دیکھ کر اسے چیک نمبر بتایا اور کہا۔ "اب اگر اس نمبر کا چیک آئے تو اسے کینسل کردیں۔"

"ٹھیک ہے، میں ابھی اپنے اسٹاف کو بتادیتا ہوں کہ یہ چیک کیش نہ کیا جائے۔ ویسے بھی ایک لاکھ سے اوپر کے تمام چیک میرے ہی پاس آتے ہیں۔"

ابھی وہ مجھ سے یہ بات کہہ ہی رہا تھا کہ بینک کا پیون اس کے پاس ایک چیک لے کر آیا۔ منیجر وہ چیک دیکھ کر چونک اٹھا اور بولا۔ "لیجیے اعجاز صاحب آپ کا دیا ہوا چیک اب آیا ہے۔ یہ کوئی ہدایت اللہ ہے جس کی شناختی کارڈ کی کاپی چیک کے ساتھ موجود ہے۔" منیجر نے وہ چیک میری طرف بڑھا دیا۔

شناختی کارڈ کی کاپی دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ ہدایت اللہ کے شناختی کارڈ پر اکرم کی تصویر لگی ہوئی تھی۔

پھر منیجر بھی سارا معاملہ سمجھ گیا۔ اس نے اپنے سیکورٹی والوں کو حکم دیا کہ ہدایت اللہ کو پولیس کے آنے تک وہاں روکو۔

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

پندرہ منٹ میں پولیس وہاں پہنچ گئی۔ انہوں نے ہدایت اللہ عرف اکرم کو موقع پر گرفتار کرلیا لیکن پولیس کے پاس اسے روکے رکھنے کا کوئی جواز نہیں تھا میں نے چیک اسے دیا تھا، اس پر میرے دستخط تھے۔ وہ چیک میں کینسل کرا چکا تھا۔

میں منیجر کے کیبن سے باہر نکلا تو اکرم سامنے ہی بیٹھا تھا۔ میں نے اسے دیکھ کر کہا۔ ''ہاں اکرم صاحب اب بولو۔ میرے پاس کوئی ثبوت ہے یا نہیں؟''

''تم بکواس کرتے ہو۔ کیسا ثبوت تم ہو کون۔ میں تو تمہیں نہیں جانتا۔''

''اگر تم مجھے نہیں جانتے تو میرا چیک تمہارے پاس کہاں سے آیا؟'' میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔

ہماری بات چیت سن کر سب انسپکٹر نے کہا۔ ''اسے تھانے لے چلو، اس سے وہیں بات ہوگی۔''

اس وقت منیجر وہاں آگیا اور بولا۔ ''آپ کا پندرہ لاکھ والا چیک کسی قدیر احمد نے کیش کرایا ہے۔''

قدیر احمد کا شناختی کارڈ دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ وہ یاسین گردیزی تھا یا کم از کم میں اسے اس نام سے جانتا تھا۔ سب انسپکٹر نے اس کی تصویر دیکھی تو بولا۔ ''یہ تو کئی دو نمبر کاموں میں پولیس کو مطلوب ہے۔''

''اس کا پتا بھی ہمارا یہ دوست بتائے گا۔'' میں نے ہدایت اللہ عرف اکرم کی طرف اشارہ کیا۔

پولیس اسے لے کر چلی گئی۔ میں بھی اپنی گاڑی میں ان کے پیچھے روانہ ہوگیا۔

''دو گھنٹے تک پٹنے کے بعد ہدایت اللہ نے بتایا کہ قدیر احمد اس وقت ملتان کے ایک ہوٹل میں ہوگا۔ وہ دبئی جانے والا ہے۔''

پولیس کی ایک ٹیم نے اسی دن ملتان کے اس ہوٹل پر چھاپہ مار کے قدیر احمد اور افضل کو گرفتار کرلیا۔ افضل کا اصل نام افضل ہی تھا۔ پولیس نے اس کے قبضے سے تیرہ لاکھ پچاس ہزار کی رقم بھی برآمد کرلی۔

بعد میں معلوم ہوا کہ وہ جعل سازوں کا ایک گروہ تھا۔ اس گروہ کے تین ارکان مزید تھے جو میرے سامنے نہیں آئے تھے۔ ان تین میں سے ایک اکرم کی بیوی بھی تھی۔ اکرم نے کسی طرح معلوم کرلیا کہ مجھے گولڈن ہینڈ شیک کے بعد اٹھارہ لاکھ روپے ملے ہیں۔ اس نے اندازہ لگایا ہوگا کہ میرے پاس تین چار لاکھ روپے پہلے سے پس انداز ہوں گے۔ یہ تو اسے یقین تھا کہ اٹھارہ لاکھ روپے تو میرے پاس ہیں ہی۔ اس نے میرے بعد میرے آفس کا چکر لگایا تو اسے اقبال کے بارے میں معلوم ہوگیا اور وہ اقبال کا کزن بن بیٹھا۔ پھر اس نے گھر آکر اپنی شرافت اور خوش اخلاقی کا سکہ جمایا۔ ویزے کا چکر چلایا اور مجھ سے تین لاکھ روپے کا چیک اینٹھ لیا۔ پھر قدیر اور افضل بھی میدان میں آگئے۔ قدیر کی کوئی زمین تھی نہ وہ اتنا دولت مند تھا۔ وہ تو سرے سے ڈیرہ غازی خان کا تھا ہی نہیں۔ اگر میں تھوڑی سی معلومات کرتا تو مجھے معلوم ہو جاتا کہ قدیر عرف یاسین یہاں کا رہنے والا نہیں تھا۔ ان لوگوں نے کہیں دینے کے بہانے مجھ سے پچاس ہزار کا چیک لے لیا۔ یہ میری بے پروائی یا پھر بے احتیاطی کچھ بھی سمجھ لیں کہ میں نے پچاس ہزار کی رقم الفاظ میں نہیں لکھی۔ قدیر نے چالاکی سے مجھے چیک لکھنے کے لیے اپنا پین دیا تھا۔ بعد میں اس نے اطمینان سے الفاظ کے خانے میں مبلغ پندرہ لاکھ لکھا اور ہندسوں میں پچاس سے پہلے ایک کا اور بعد میں ایک صفر کا اضافہ کیا اور پچاس ہزار کو پندرہ لاکھ کرلیا۔ اس کی نہ صرف تحریر مختلف تھی بلکہ ہندسوں میں جو رقم کا اضافہ کیا تھا، وہ بھی زبردستی کا اضافہ کرایا تھا۔

دو مہینے بعد مجھے وہ رقم کورٹ سے ادا کی گئی جو پولیس نے برآمد کی تھی۔ اس پورے واقعے میں مجھے ڈیڑھ لاکھ کا نقصان ہوا لیکن وہ نقصان بہرحال اٹھارہ لاکھ کے نقصان سے کم تھا۔

اب میں دوسروں کو نصیحت کرتا ہوں کہ تصدیق کیے بغیر کسی اجنبی پر بھروسا نہیں کرنا چاہیے۔

اماں کہتی ہے کہ اجو شروع ہی سے سیدھا سادہ ہے۔ میں سیدھا سادہ ضرور ہوں لیکن احمق نہیں ہوں ورنہ میں اس دن بینک جانے کے بجائے روتا دھوتا گھر آجاتا۔ پھر واقعی اپنی اس خطیر رقم سے محروم ہو جاتا۔ یہ اکرم عرف ہدایت اللہ کی حماقت تھی کہ اسے میں عین وقت پر تین لاکھ روپے کا وہ چیک کیش کرانے کا خیال آیا اور پکڑا گیا۔

اب میں واقعی جاپان میں ہوں۔ میرا ایک پرانا دوست گولڈن ہینڈ شیک کے بعد ایک ٹریولنگ ایجنسی چلا رہا ہے اس کے توسط سے مجھے جاپان کا ویزا مل گیا۔ وہ بھی بالکل مفت۔ اب میں بقول ہدایت اللہ جاپان میں نوٹ چھاپ رہا ہوں۔

●●

غلط راستہ

محترم مدیر

السلام علیکم

کافی عرصے بعد ایک نئی سرگزشت کے ساتھ حاضر ہوں۔ یہ سرگزشت میری نہیں، میرے ایک دوست کے رشتے دار کی ہے جو اپنے اندر بہت بڑا سبق ہے۔ اُمید ہے میری یہ کاوش قارئین کو بھی پسند آئے گی۔

ناظم بخاری

(بستی ڈانوراں، لودھراں)

میرے امی ابو، میرے بچپن میں ہی میرا ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ مجھے بھائی اور بھابی نے پالا تھا۔ شروع سے ہی میری طبیعت آزاد پنچھی جیسی رہی ہے۔ میں گھر میں لاڈلا تھا۔ بھائی میری ہر جائز و ناجائز خواہش پوری کرتے تھے۔ سو اس بات نے مجھے پڑھائی سے دور کر دیا۔ میں نے صرف چند جماعتیں پاس کیں اور پھر اسکول چھوڑ دیا۔ میں جوان ہوا تو بھائی نے مجھے اپنے ساتھ پرچون کی دکان پر بٹھا لیا۔ دن کا آدھا حصہ وہ دکان پر بیٹھتے، آدھا میں۔ بھائی کی شادی کو

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

پچیس سال گزر گئے تھے مگر ان کے ہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ حالانکہ انہوں نے بہت علاج کرایا، بہت دوا دارو کیے، مگر پھر بھی۔ انہیں بھابی سے بہت پیار تھا۔ اس لیے انہوں نے کبھی بھی اپنے دل میں دوسری شادی کا خیال نہیں لائے۔ جب تک میں شادی کی عمر کو پہنچا، وہ دونوں عمر کے آخری حصے تک پہنچ گئے تھے۔ ان کی اپنی اولاد تو تھی نہیں، سو وہ میرے سر پر سہرا سجانے کا خواب دیکھتے تھے۔ میں پچیس سال کا ہوا تو انہوں نے اپنے اس خواب کو تعبیر دے ڈالی۔ وہ سمیرا کو میری زندگی میں لے آئے۔ دلہن پسند کرنے اور اس کی ہر خوبی اور خامی کو پرکھنے کی ذمہ داری میں نے بھائی اور بھابی پر ڈال دی تھی مگر انہوں نے جو رشتہ تلاش کیا، وہ مجھے زیادہ پسند نہیں آیا تھا۔ سمیرا بالکل عام نقش و نین کی لڑکی تھی، جس میں کچھ زیادہ کشش نہیں تھی۔ گو میں خود بھی خوبصورت انسان نہیں تھا مگر میرے دل میں یہ حسرت تھی کہ جو میری بیوی بنے، وہ زیادہ نہ سہی، کچھ حد تک خوبصورت ضرور ہو۔ جب ہم وہ رشتہ دیکھ کر آئے تو میں نے راستے میں بھائی سے کہا تھا۔ ”آپ کو میرے لیے اس سے بہتر کوئی رشتہ نہیں ملا؟“

”کیوں...... اچھا نہیں ہے؟“ ”اچھا تو ہے، مگر سمیرا.... وہ مجھے زیادہ پسند نہیں آئی۔“

بھائی میری بات پر مسکرا دیے تھے۔ ”صرف ظاہری خوبصورتی ہی سب کچھ نہیں ہوتی، انسان کا دل بھی خوبصورت ہونا چاہیے اور یہ خوبصورتی سمیرا اور اس کے گھر والوں میں موجود ہے۔ وہ بہت ہی اچھے اور سلجھے ہوئے لوگ ہیں۔ میں نے بہت چھان بین اور دیکھ بھال کر یہ رشتہ کیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ تمہاری زندگی سمیرا کے ساتھ بہت اچھی گزرے گی۔“

میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا تھا۔ میں فی الحال ان کے زیر دست تھا۔ سو ان کے اس فیصلے پر سر جھکانے کے علاوہ میرے پاس اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ اگلے چند دنوں میں ہی سمیرا میری شریکِ حیات بن کر میری زندگی میں آ گئی۔ بھائی اور بھابی نے جیسا کہا تھا، سمیرا بالکل ویسی ہی نکلی۔ بہت ہی سلجھی ہوئی سمجھدار اور نیک صفت۔ وہ میری ہر طرح سے خدمت کرتی تھی۔ میرا کہا مانتی تھی۔ اس نے کبھی میری کسی بات سے انکار نہیں کیا تھا مگر اس کے باوجود وہ مجھے زیادہ پسند نہیں آئی تھی۔ اس کی وجہ میں بتا چکا ہوں۔ میں خود بھی خوبصورت انسان نہیں تھا۔ اگر مجھے اور سمیرا کو ایک ساتھ کھڑا کر کے ہمارا موازنہ کیا جاتا تو ہم دونوں ایک سے ہی لگتے مگر اس کے باوجود میرے دل میں یہ خواہش ضرور تھی کہ اس سے خوب صورت لڑکی ملتی تو اچھا تھا مگر میں فی الحال صرف یہ سب سوچ سکتا تھا، اس پر عمل پیرا نہیں ہو سکتا تھا۔ کیوں کہ جب تک بھائی اور بھابی حیات تھے، ایسا کوئی خیال بھی لبوں تک لانا مناسب نہیں تھا، مگر جلد ہی تقدیر نے مجھے وہ موقع عنایت کر دیا، جس کی مجھے خواہش تھی۔ بھائی اور بھابی کے ساتھ بھی وہی انہونی ہو گئی، جو آج کل اکثر لوگوں کے ساتھ ہو رہی ہے۔ ان دنوں بھابی کی طبیعت بہت خراب تھی۔ بھائی نے مجھے دکان پر بٹھایا اور ان کی دوائی لینے کے لیے انہیں موٹر سائیکل پر اسپتال لے گئے، مگر افسوس کہ ان دونوں کو راستے میں ہی موت کے فرشتے نے دبوچ لیا۔ ان کا ایک بڑی گاڑی کے ساتھ ایکسیڈنٹ ہوا اور...... ان کے بے جان وجود، ایمبولینس پر واپس گھر آئے۔

گھر میں ایک کہرام سا مچ گیا۔ میرے دل پر جو قیامت گزری وہ الگ بات، سمیرا کا بھی رو رو کر برا حال تھا۔ اس کے ماں باپ بھی آ گئے تھے۔ دور دراز کے اور بھی رشتے دار گھر میں موجود تھے، مگر مجھے کسی کا ہوش نہیں تھا۔ رونے اور چیخنے چلانے کے شور سے گھر بھر گیا تھا۔ آس پاس کے لوگ بھی آتے رہے جاتے رہے۔ وہ میرے گلے لگ کر مجھے دلاسہ دیتے رہے اور روتے رہے۔

عشاء کی نماز کے بعد، ہم سب انہیں ان کی آخری آرام گاہ تک چھوڑ آئے۔ اگلے کچھ دنوں تک رشتہ داروں اور آس پاس کے لوگوں کا آنا جانا ہوتا رہا اور پھر ایک ہفتے بعد سب کچھ معمول پر آ گیا۔ اس دوران دکان بند رہی تھی۔ میں نے ایک ہفتے بعد دکان کھولی اور اللہ کا نام لے کر دکان پر بیٹھ گیا۔ کہتے ہیں، کسی مرے ہوئے کے ساتھ کوئی نہیں مرتا اور یہ بات بالکل سچ تھی۔ اگلے دو تین ماہ میں، میں نے بھائی اور بھابی کو بالکل بھلا دیا۔

دنیا میں ہر شخص کا کوئی نہ کوئی دوست ضرور ہوتا ہے۔ میرا بھی اس بستی میں ایک یار تھا، اللہ رکھا۔ جسے صرف رکھا کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ مجھے یاد نہیں کہ کب اس کی اور میری دوستی ہوئی تھی اور کب یہ دوستی گہری دوستی میں بدل گئی تھی۔ شاید شروع سے ہی، جب ہم چھوٹے تھے۔ ہمارے محلے میں ایک لڑکی رہتی تھی، رابعہ عرف رابو۔ وہ ایسی خوب صورت اور حسین لڑکی تھی کہ جو بھی اسے ایک نظر دیکھتا تھا، اس کے دل کو کچھ ہونے لگتا تھا۔ میرے اور رکھا جیسے لوگ تو اس پر پہلی ہی نظر میں لٹو ہو جاتے تھے اور وہ ہم ہو گئے تھے۔ ہم

دونوں میں شرط لگی تھی کہ دیکھتے ہیں پہلے رابو کو کون پٹاتا ہے۔

میری طرح گاؤں کے دو چار اور لوگ بھی رابو پر عاشق تھے، مگر اس کے سامنے اپنے دل کی بات لاتے ہوئے سب کی جان جاتی تھی۔ وہ اس لیے کہ رابو کا باپ قسائی تھا۔ وہ ہفتے میں ایک بار گوشت کا پھٹا لگاتا اور گوشت بیچتا تھا۔ اس کا یہ بھرا پرا چہرہ تھا اور اس پر بڑی بڑی مونچھیں۔ جن کی بدولت اس کا چہرہ کافی حد تک خوفناک دکھائی دیتا۔ اس وجہ سے، کسی کو بھی رابو سے دل کی بات کہنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ سب کو پتا تھا کہ اگر انہوں نے ایسا کیا تو رابو کا باپ ان کے ٹکڑے کرکے کتوں کو کھلا دے گا، مگر میری اور رکھے کی بات الگ تھی۔ ہم دونوں میں جو شرط لگی تھی اسے جیتنے کے لیے سب سے پہلے میں نے کوشش کی۔ اس دن رابو مجھے گلی میں اکیلی ہی نظر آگئی تھی۔ وہ بہت اچھا موقع تھا۔ خوبصورت نہ ہونے کے باوجود، ان دنوں میں خود کو بنا سنوار کر رکھتا تھا۔ اچھے کپڑے زیب تن رہتے تھے اور خوشبو کی ایک چھوٹی سی شیشی ہر وقت جیب میں موجود ہوتی۔ اس کوشش سے میں کسی حد تک قابل قبول دکھنے لگتا تھا۔ اسی لیے مجھے ایک خوش فہمی تھی کہ اگر میں نے رابو سے اپنے دل کا حال بیان کیا تو وہ ضرور میری محبت کا ہاتھ تھام لے گی، مگر...... اس وقت گلی میں، میں نے اس سے اپنے دل کی بات کہی تو جواباً اس نے مجھے ایک زوردار تھپڑ جڑا۔ میرے چودہ طبق روشن ہوگئے۔ ”اگر آج کے بعد مجھ سے ایسی کوئی بکواس کی تو میں اپنے باپ سے کہہ کر تمہارا وہ حشر کراؤں گی، جسے تم ہمیشہ یاد رکھو گے۔“

میرے عشق کا بھوت اسی دن اتر گیا۔ اس کی اس بات اور رویے سے میرا دل بہت دکھا تھا اور یہ بات سمجھ میں آگئی تھی کہ رابعہ کا پیار میرے نصیب میں نہیں ہے۔ چاہے اس کے لیے میں اپنی جان ہی کیوں نہ دے دوں۔

میں نے اگلے روز رکھے سے یہ بات کہی تو وہ زور سے ہنسا۔ ”مجھے پہلے ہی پتا تھا کہ وہ تمہیں گھاس بھی نہیں ڈالے گی۔ کیوں کہ وہ مجھے پسند کرتی ہے۔ اب تم میرا کمال دیکھنا کہ میں اسے کیسے پٹاتا ہوں۔“

مگر میری طرح اس کی بھی یہ بھول تھی۔ اس نے اسی دن ہی ایک پیار بھرا خط لکھا اور موقع دیکھ کر رابعہ کو تھما دیا۔

”یہ کیا ہے؟“

”کھول کر دیکھو۔“

رابعہ نے وہ خط کھول کر دیکھا اور دوسرے پل ایک زناٹے دار تھپڑ اس کے گال پر جڑ دیا۔ رابعہ نے اسے بھی وہی سب کہا، جو مجھے کہا تھا۔ میری طرح یہ سب رکھے نے مجھے پوری سچائی سے بتایا۔ میری طرح وہ بھی توبہ کر چکا تھا کہ وہ آج کے بعد بھولے سے بھی رابعہ کو کچھ نہیں کہے گا۔ یہ سب ہونے کے باوجود رابعہ ہم دونوں کے دلوں میں بسی رہی۔ وہ ایسی لڑکی نہیں تھی کہ دل سے نکل سکتی۔ رابعہ سے مایوس ہونے کے بعد رکھے نے اپنے قدم جالو کمہار کی بیٹی کی طرف بڑھا دیے تھے۔ وہ عام سی شکل و صورت کی لڑکی تھی اور اس کے ایک پاؤں میں لنگڑاہٹ بھی تھی۔ نوری نے جھٹ اس کی محبت کا ہاتھ تھام لیا، مگر جلد ہی وہ دونوں ایک دن تنہائی میں ملتے ہوئے پکڑے گئے اور جالو کمہار کے بیٹوں نے رکھے پر اچھی طرح ہاتھ صاف کیا۔ ساتھ ہی انہوں نے رکھے کو تنبیہ کی کہ اگر آج کے بعد وہ نوری کے آس پاس بھی نظر آیا تو وہ اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ جالو کمہار بہت سمجھدار انسان تھا۔ اس نے ایک ماہ بعد ہی نوری کی شادی کر دی تھی۔ ابھی نوری کی شادی کو چند ماہ ہوئے تھے کہ لالو قسائی نے رابعہ کی بھی ایک اچھے سے گھر میں شادی کر دی۔ رابعہ کی شادی کے فوراً بعد میری شادی ہوئی تھی اور یوں سمیرا میری زندگی میں آ گئی تھی۔ وہ ان پڑھ اور بالکل عام نقش و نین کی عورت تھی، جو میرے دل میں نہیں سمائی تھی۔ میں جس لڑکی سے شادی کے خواب دیکھا کرتا تھا، وہ ویسی ہرگز نہیں تھی۔ میری شادی سے صرف دو ماہ پہلے رکھے کی بھی شادی ہوگئی تھی۔ نادیہ اس کے ماموں کی بیٹی تھی۔ اس کا ماما صاحب حیثیت تھا۔ اس کا گھر وہاں پاس ہی تھا۔ رکھا اکثر وہاں جاتا رہتا۔ وہ کوئی زیادہ خوبصورت اور حسین بندہ نہیں تھا، مگر اس کے باوجود نہ جانے کب اس کے مامے کی بیٹی کا اس پر دل آ گیا۔ اس نے اپنے دل کا حال اپنی ماں سے کہہ دیا۔ ماں نے اپنے شوہر سے بات کی اور اس نے اپنی بہن سے۔ تیئس چوبیس سال کا ہونے کے باوجود رکھا کوئی کام کاج نہیں کرتا تھا اور ابھی تک اپنے ماں باپ پر بوجھ تھا۔ وہ خود کا بوجھ اُٹھانے کے قابل نہیں تھا، کسی اور کا کیا اٹھاتا؟ اس لیے اس کے ماں باپ نے ابھی تک اس کی شادی کا نہیں سوچا تھا مگر جب رکھے کے مامے نے اس کی ماں سے بات کی تو انہیں اس شادی کے لیے تیار ہونا پڑا۔ وہ جہیز میں نہ صرف گھر کا سارا ساز و سامان دے رہا تھا، بلکہ اس نے رکھے کو ایک موٹر سائیکل بھی دینے کا وعدہ کیا تھا۔ ساتھ ہی اس نے رکھے کی کسی اچھی جگہ نوکری بھی لگوا دی تھی۔ یہ سب اس نے صرف اپنی بیٹی کے لیے کیا تھا۔ اگر رکھے کی بیوی کوئی عام سی یا خوبصورت سی لڑکی ہوتی تو دنیا میں رکھے سے زیادہ کوئی خوش

قسمت نہ ہوتا، مگر وہ ایسی بالکل نہیں تھی۔ وہ بہت موٹی تھی اور موٹی بھی ایسی کہ خدا کی پناہ۔ غالباً تین لوگوں کی مٹی اس ایک وجود پر خرچ ہوئی تھی۔ اور سونے پر سہاگا اس کا کھانا پینا... وہ ڈٹ کر کھاتی تھی اور ڈٹ کر دودھ کی لسی پیتی۔ یہی وجہ تھی کہ اس کا وجود دن رات ''پھلتا پھولتا'' جا رہا تھا۔ وہ قبول صورت عورت تھی اور رکھے کی وفادار تھی، مگر میری طرح رکھا بھی اپنی زندگی سے مطمئن نہیں تھا۔ ہم دونوں جب ملتے تو ایک دوسرے سے اپنے ''دکھ'' کا اظہار ضرور کرتے۔ رکھا روز کوئی نہ کوئی رونا رو رہا ہوتا۔ ''یار یہ بھی کوئی زندگی ہے۔ میں تو موٹی سے شادی کر کے پھنس گیا ہوں۔ سوچتا ہوں کہ وہ کون سی گھڑی تھی، جب میں نے اس شادی کے لیے ہاں کہی تھی۔ اس سے اچھی تو وہ نوری تھی۔ وہ لنگڑی تھی تو کیا ہوا، کم سے کم بھینس جتنی موٹی تو نہیں تھی۔ میں تو موٹی کے ساتھ کہیں بھی رشتہ داروں میں شادی خوشی کے موقع پر نہیں جا سکتا۔ ایسا لگتا ہے، جیسے ہاتھی کے ساتھ کوئی مچھر بیٹھا ہو۔ لوگ بہت ہنستے ہیں ہم پر۔ اوپر سے وہ موٹی... اپنے کھانے پینے کا بھی خیال نہیں رکھتی۔ جب دیکھو، کوئی نہ کوئی چیز منہ میں ٹھونسی ہوئی ہے۔ جیسے اسے دنیا میں کھانے پینے کے علاوہ اور کوئی کام نہیں ہے۔''

میں اس کی بات پر مسکرا دیا۔ ''اب کیا ہو سکتا ہے؟ اب تو گلے میں ڈالا ہوا ڈھول بجانا ہی پڑے گا۔''

''ہاں یہ تو ہے۔ اور کیا کیا جا سکتا ہے۔''

''میرا معاملہ بھی تم سا ہے۔ بھائی اور بھابی نے مجھے پھنسا دیا ہے۔ میں بھی تمہاری طرح گھر سے خوش نہیں ہوں۔''

''کیوں... بھابی اتنی اچھی تو ہے۔ تم خوش کیوں نہیں ہو؟''

''بس میرا اور اس کا مزاج نہیں ملتا۔ اور دوسرا وہ خوبصورت بھی نہیں ہے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ کاش میری بیوی ہوتی تو رابعہ جیسی ہوتی، ورنہ نہ ہوتی۔'' میں چاہ کر بھی رابعہ کو بھلا نہیں سکا تھا۔ رکھے نے ایک گہری سانس لی۔

''یار کس کا نام لے لیا تم نے تو قیامت تھی'' اچانک اسے کچھ یاد آیا۔ ''میں نے سنا ہے، آج کل وہ میکے آئی ہوئی ہے۔ اس کی شوہر سے ان بن ہے۔ اس کے شوہر نے اس پر ہاتھ اٹھایا تھا۔ تب سے وہ اپنے ماں باپ کے گھر ہے۔''

میرا دل بے اختیار دھڑک اٹھا۔ رابعہ کو دیکھے ہوئے کئی ماہ ہو گئے تھے۔ معلوم نہیں اب وہ کیسی تھی۔

''وہ تمہاری دکان پر آئی تو نہیں؟'' رکھے نے کہا۔

''نہیں، وہ میری دکان پر کیوں آئے گی۔''

''کوئی سودا سلف لینے۔ سنا ہے اس کا باپ بہت بیمار ہے۔ پچھلے دو ہفتوں سے اس نے گوشت کا پھٹا بھی نہیں لگایا۔''

اس کی باتوں سے میرا دل کچھ خوش ہو گیا۔ رکھا میرے پاس تھوڑی دیر بیٹھ کر گھر چلا گیا لیکن میری بے چینی برقرار رہی۔ نہ جانے کیوں میرا دل دعا کر رہا تھا کہ رکھے نے جو باتیں کی ہیں، کاش وہ سب ٹھیک ہوں۔ وہ سچ مچ میکے آئی ہوئی ہو۔ اس کی اپنے شوہر سے ان بن ہو گئی ہو اور اس کا باپ بیمار ہو۔ وہ سامان لینے کے بہانے میری دکان پر آئے اور میں اسے ایک بار جی بھر کر دیکھ لوں۔ گو یہ نہایت ہی غلط اور خودغرضانہ سوچیں تھیں مگر یہ سب سوچنے اور انہیں دعاؤں میں ڈھالنے کے لیے میں مجبور تھا۔ یہ مجبوری تھی صرف رابعہ کے دیدار کی۔ اور پھر سچ مچ میری یہ دعائیں رنگ لے آئیں۔ اگلے دن ہی رابعہ میری دکان پر چلی آئی۔ میں اسے قریباً چھ ماہ بعد دیکھ رہا تھا۔ چھ ماہ پہلے اگر وہ کلی تھی تو اب وہ بھرپور پھول کا روپ دھار چکی تھی۔ اس کا دودھ جیسا سرخ سفید چہرہ ستا ہوا تھا۔ چہرے پر بے رونقی ہونے کے باوجود ایک عجیب سی کشش تھی جو دل کو اپنی طرف کھینچتی تھی۔ میں خود سے بے نیاز ہو کر اسے دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے پر ایک عجیب سا تاثر ابھرا اور دوسرے ہی پل مٹ گیا۔ میرا دل چاہا کہ میں اس سے اپنے دل کا حال بیان کروں مگر دوسرے ہی پل میرے سامنے اس کی اور اپنی حیثیت آ گئی۔ وہ شادی شدہ تھی اور کسی اور کی امانت تھی۔ میں خود بھی شادی شدہ تھا۔ جب اس نے شادی سے پہلے مجھے گھاس نہیں ڈالی تو اب کیا ڈالتی۔ مجھے یاد نہیں کہ وہ میری دکان پر کیا لینے آئی۔ بس مجھے اتنا یاد ہے کہ وہ میری دکان پر آئی تھی اور ضرورت کی کوئی چیز لے کر چلی گئی تھی۔ نہ میں نے اس سے کچھ بات کی تھی نہ اس نے مجھ سے۔ اور اس دن کے بعد وہ اکثر میری دکان پر ضرورت کا سامان لینے آنے لگی۔ وہ جب بھی میری دکان پر آتی، اس کا چہرہ ہمیشہ ستا ہوا ہی ہوتا مگر کبھی کبھار وہ ہنستی مسکراتی ہوئی بھی نظر آتی۔ اس دن مجھے اندازہ ہوتا کہ آج اسے کوئی خاص پریشانی نہیں ہے، یا اس کی پریشانیاں کچھ کم ہیں۔ مجھے اس کی پریشانیوں کا کچھ حد تک اندازہ تھا۔ ایک تو اس سے سسرال چھوٹ گیا تھا اور دوسرا وہ اپنے باپ کی بیماری کی وجہ سے پریشان تھی۔ وہ اپنے ماں باپ کی واحد اولاد تھی۔ بہن بھائی کوئی نہیں تھا۔ سسرال کی پریشانی اور باپ کی بیماری نے اسے دکھ سے دوچار کر رکھا تھا۔ اس دوران رکھے کا بھی میری

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

دکان پر آنا جانا ہوتا رہا۔ ایک دن مجھ سے پوچھا۔ ''رابعہ آتی ہے تیری دکان پر؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

''بڑا پاجی ہے تو۔ تو نے مجھے بتایا بھی نہیں۔''

''کیا بتاتا....؟''

''یہی کہ وہ تیری دکان پر آتی ہے۔''

''میری دکان پر تو ساری بستی آتی ہے۔''

''پر اس کی بات الگ ہے۔ وہ ہم دونوں کی معشوق ہے۔ پر افسوس، نہ میں اس سے فیض حاصل کر سکا اور نہ ہی تو۔''

''بکواس مت کر۔ ایک تو اب ہم دونوں شادی شدہ ہیں۔ دوسرا وہ خود بھی شادی شدہ ہے۔ ہمیں اس کے بارے میں ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔''

وہ میری بات پر زور سے ہنسا۔ ''تو جتنا حاجی بن رہا ہے نا، مجھے سب پتا ہے۔ تو آج بھی اندر سے اس کا دیوانہ ہے اور تجھے موقع ملے تو آج بھی تو اس سے وہ سب کرنے کے لیے تیار ہو جائے، جس کی تجھے خواہش ہے۔''

''ایسی کوئی بات نہیں۔'' میں نے جھینپتے ہوئے کہا۔

''یہ تو آنے والا... وقت بتائے گا۔ ویسے میری دعا ہے کہ کاش تجھے رابعہ مل جائے، میں نہیں، تو تو اس سے اپنی من کی مراد پوری کر لے۔''

میں نے اس کی بات پر دل میں آمین کہا اور ہولے سے مسکرا دیا۔ ''یہ صرف خیالی باتیں ہیں۔ ہم ایسا سوچ سکتے ہیں، ایسا کر نہیں سکتے۔''

''تو اس بار اس سے بات تو کر۔ کیا پتا اس بار وہ پٹ جائے؟ پہلے تو وہ اپنے باپ کی دھمکی دیتی تھی، پر اب تو وہ بھی چارپائی پر پڑا ہے۔ سنا ہے، اسے کوئی بہت بڑی بیماری ہے۔ ہزاروں روپے لگنے کے باوجود بھی وہ ٹھیک نہیں ہو رہا۔ تو ایک بار حوصلہ کر کے دیکھ...''

''نہیں یار، میں ایسا نہیں کر سکتا۔ پچھلی بار تو اس نے تھپڑ مارا تھا مگر اس بار وہ جوتا اُتارے گی اور دھلائی کر کے رکھ دے گی۔ وہ دکان پر آ جاتی ہے، اس کا دیدار ہو جاتا ہے، اتنا بہت ہے۔''

''تیری مرضی۔'' رکھا وہاں سے چلا گیا۔ میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

اگلے چند دنوں تک رابعہ میری دکان پر نہیں آئی۔ میرا دل بے چین رہنے لگا۔ معلوم نہیں وہ کہاں غائب ہو گئی تھی۔ اگلی بار رکھا آیا تو میں نے پوچھا۔ ''آج کل رابعہ نظر نہیں آ رہی۔ خیریت تو ہے اس کے گھر؟''

''وہ تو اپنے سسرال چلی گئی۔''

''کب؟''

''تین چار دن ہو گئے ہیں۔ اس کا شوہر آیا اور اسے منا کر لے گیا۔''

''اب وہ یہاں نہیں آئے گی؟''

''پتا نہیں۔''

میرا دل اداس ہو گیا۔ پوری بستی میں دل بہلانے کا صرف ایک ہی ذریعہ تھا، وہ بھی رخصت ہو گیا۔ زندگی میں بہار کے جھونکے کی طرح کچھ دن آئے تھے جو رخصت ہو چکے تھے۔ معلوم نہیں، اب رابعہ کب سسرال سے یہاں آتی اور کب مجھے اس کا دیدار ملتا۔ ابھی رابعہ کو اپنے سسرال گئے دو ہفتے ہی ہوئے ہوں گے کہ ایک دن پھر اس کی اپنے شوہر سے لڑائی ہوئی اور وہ دوبارہ ماں باپ کے گھر آ بیٹھی۔ اگلے دن وہ پھر میری دکان پر تھی۔ شادی کے بعد اس نے نقاب کرنا شروع کر دیا تھا۔ میری دکان پر بھی وہ نقاب لگا کر آتی تھی اور اکثر دوپہر کے وقت آتی تھی۔ اس وقت دکان پر سکون ہوتا تھا۔ رش نہ ہونے کے برابر ہوتا۔ میری دکان پر آتے ہی وہ اپنے چہرے سے نقاب سرکا دیتی اور میری پیاسی نگاہیں اس کے دیدار سے سیراب ہونے لگتیں۔ معلوم نہیں وہ ضرورتاً اپنے چہرے سے نقاب سرکاتی تھی یا پھر جان بوجھ کر، مگر ایک بات تھی، اسے دیکھتے ہی میری آنکھوں میں ایک والہانہ پن اُتر آتا تھا اور یہ بات رابعہ کو اچھی طرح معلوم تھی۔ میرے کہے بغیر ہی وہ یہ بات اچھی طرح جان گئی تھی کہ میں اسے پہلے دن کی طرح اب بھی چاہتا ہوں۔ اس دن رابعہ دکان پر آئی تو بہت پریشان تھی۔ وہ مجھ سے پہلی بار مخاطب ہوئی۔ اس نے اپنے ہاتھ میں خریدے جانے والے سامان کی ایک چھوٹی سی پرچی پکڑی ہوئی تھی۔ اس نے وہ پرچی میرے سامنے رکھ دی۔ ''ابا کی طبیعت بہت خراب ہے۔ بہت علاج کروا لیا، مگر انہیں آرام نہیں آ رہا۔ اب تو گھر میں زہر کھانے کو بھی ایک پیسا نہیں بچا۔ صرف اللہ سے اُمید ہے کہ وہ ابا کو ٹھیک کر دے تو کر دے ورنہ...... اماں چاہ رہی تھی اللہ کے نام کی ایک دیگ پکوا کر خیرات کرنی چاہیے۔ کیا پتا اللہ تعالیٰ اس طرح ابا کو شفا دے مگر گھر میں اتنے پیسے بھی نہیں ہیں کہ ایک چاولوں کی دیگ کا سامان آ سکے۔ یہ کچھ سامان کی فہرست ہے، اگر یہ سامان اُدھار مل جائے تو...... میں کچھ دنوں تک پیسوں کا

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

بندوبست کر کے لوٹا دوں گی۔" پتا نہیں کیوں میرا دل خوشی سے بھر گیا۔ شاید اس وجہ سے کہ وہ مجھ سے پہلی بار اس طرح مخاطب ہوئی تھی، وہ میری احسان مند ہونے والی تھی۔ یا پھر اس وجہ سے میرا دل خوشی سے بھر گیا تھا کہ اس کے ساتھ بات چیت کا کوئی بہانہ مل رہا تھا۔ "کوئی بات نہیں جی، آپ کی اپنی دکان ہے، جو چیز دل چاہے لے جاؤ۔ جب فرصت ہو تو پیسے دے جانا۔"

پیسے دے جانے والی بات میں نے صرف اوپری دل سے کہی تھی۔ ورنہ میرا دل چاہ رہا تھا کہ وہ مجھ سے میری جان مانگ کر لے جائے اور میں اس سے اس کا بھی تقاضا نہ کروں۔ وہ ہولے سے مسکرا دی۔ میں جیسے اندر سے کھل اٹھا۔ وہ مطلوبہ سامان لے کر چلی گئی اور میں اس کے تصور میں کھونے لگا۔ قدرت بھی کبھی کسی کو اتنا نواز دیتی ہے کہ ہزار لوگوں کو بھی اس جتنا نہیں ملتا۔ رابعہ بھی ان میں سے ایک تھی۔ اس کا پھولوں کی شاخ جیسا لچک دار بدن تھا۔

قمیص پر جگہ جگہ پھول کھلے ہوئے تھے۔ ان میں ایسی دلکشی تھی کہ ایک بار اس کی طرف دیکھنے کے بعد نظر ہٹانا مشکل ہو جاتا تھا۔ اگلے دو دن تک رابعہ میری دکان پر نہیں آئی۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ میری دکان پر آتی، ایک دن مسجد میں اعلان ہوا، اس کا باپ قضائے الٰہی سے وفات پا گیا ہے۔ میرے دل کی عجیب سی حالت ہو گئی۔ میں نے اسی وقت دکان بند کی اور رابعہ کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کے گھر کوئی مرد نہیں تھا، جو باہر کے انتظامات سنبھالتا۔ رابعہ کی شوہر سے ان بن تھی، سو اس کے باپ کی وفات پر نہ وہ آیا، نہ اس کے گھر سے کوئی آیا۔ میں نے فوراً ہی وہاں جا کر سب کچھ سنبھال لیا۔ لوگوں کے ایک طرف بیٹھنے کا انتظام کیا۔ مولوی کو بلایا، غسل کا انتظام کیا۔ قبرستان میں قبر تیار کرائی اور نماز جنازہ تک سب کچھ سنبھالتا رہا۔ اگلے ایک دو دن بہت مصروفیت میں گزرے۔ میں رابعہ کی ماں کو خالہ کہہ کر پکارتا تھا۔ اس گھر میں میرے آنے جانے پر پابندی ختم ہو چکی تھی۔ مجھے جس چیز کی ضرورت ہوتی، میں انہیں کہتا۔ اگر انہیں کوئی کام ہوتا، وہ مجھے کہتیں، جو میں فوراً بجا لاتا۔ چند دن بعد سب کچھ معمول پر آ گیا۔ رابعہ کی ماں میری بہت احسان مند تھی۔ اس کا کوئی بیٹا نہیں تھا اور اس مشکل وقت میں، میں بیٹا بن کر ان کے کام آیا تھا۔ میری اس احسان مندی کی رابعہ بھی معترف تھی۔ بہت جلد میں نے اس کی آنکھوں میں اپنے لیے پسندیدگی کی وہ جھلک دیکھ لی، جسے دیکھنے کا میں خواہش مند تھا۔ میں نے

دو چار دنوں بعد ضرورت کا کچھ سامان لیا اور رابعہ کے گھر جا کر رکھ آیا۔ مجھے دیکھتے ہی رابعہ کھل سی اٹھی۔ میں نے سامان رکھا تو خالہ نے کہا۔ "بیٹا! یہ سب کیوں لائے ہو؟"

میں ہولے سے مسکرا دیا۔ "جب تک زندہ ہیں، جینے کے لیے پیٹ تو بھرنا ہے نا؟ اب چاچا جی تو رہے نہیں، آپ کا خیال کون رکھے گا؟ سو میں ضرورت کا کچھ سامان لایا ہوں۔ ختم ہو جائے تو رابعہ سے کہہ کر اور منگوا لیجیے گا۔"

"مگر بیٹا......"

"بیٹا کہا ہے تو بیٹے کا کہا بھی مانیں۔"

ان کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔ وہ ہاتھ اٹھا کر مجھے دعائیں دینے لگیں۔ میں نے ایک نظر رابعہ کو دیکھا، آنکھوں کی پیاس بجھائی اور واپس دکان پر آ گیا۔ پتا نہیں کیوں آج کل میں بہت خوش رہنے لگا تھا۔ بیٹھے بیٹھے جھومتا، گاتا اور رقص پڑتا۔ جس دن میں اس کے گھر ضرورت کا سامان دے کر آیا، اسی دن رابعہ میری دکان پر آ گئی۔ "آپ پریشان نہ ہوں۔ جو سامان بھی دے رہے ہیں، ساتھ ساتھ لکھتے رہیں۔ جونہی حالات بہتر ہوئے، میں آپ کے سارے پیسے لوٹا دوں گی۔"

"خالہ تو مجھے اپنا بیٹا سمجھتی ہے۔ کیا تم مجھے اپنا نہیں سمجھتیں؟"

"ایسی کوئی بات نہیں۔"

"تو پھر آج کے بعد پیسوں کی بات مت کرنا۔" میرے لہجے میں خفگی تھی۔ "اچھا بھئی نہیں کروں گی۔" وہ مسکرائی، میں بھی مسکرا دیا۔ وہ وہاں سے چلی گئی۔ اس کے بعد جب اس کا جی چاہتا، دکان پر آتی اور ضرورت کا سامان لے کر چلی جاتی۔ ایک دن وہ دکان پر آئی تو اس نے کہا۔ "اماں آپ کی بہت تعریف کر رہی تھی کہ آپ بہت اچھے ہیں۔ ورنہ آج کے زمانے میں کون کسی کے کام آتا ہے۔"

"اصل میں خالہ خود بہت اچھی ہیں، اس لیے سب انہیں اچھے لگتے ہیں۔"

گرمیوں کے دنوں میں، دوپہر کے وقت میں ایک گھنٹے کے لیے آرام کرتا تھا۔ اس دوران دکان بند رہتی۔ دکان کی پچھلی طرف ایک اور چھوٹا سا دروازہ تھا، جو دوسری گلی میں کھلتا تھا۔ اگر کسی کو بہت زیادہ ایمرجنسی ہوتی تو وہ اس دروازے کو کھٹکھٹا کر سامان لے جاتا مگر ایسا کم کم ہی ہوتا۔ اس دن بھی میں آرام کی غرض سے لیٹا ہوا تھا کہ اچانک دروازے

پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ ”کون؟“

”میں ہوں۔“ بہت ہی دھیمے لہجے میں کہا گیا۔

میں وہ آواز ہزاروں میں بھی پہچان سکتا تھا۔ میں نے جلدی سے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ سامنے رابعہ کھڑی ہوئی تھی۔ وہ فوراً ہی اندر آ گئی۔ اس کا چہرہ بجھا ہوا تھا۔ مجھے سمجھ نہیں آیا کہ میں دروازہ کھولے رکھوں یا بند کردوں؟

”دروازہ بند کردیں، کہیں کوئی دیکھ نہ لے“ اس نے میری مشکل آسان کردی۔

”خیر تو ہے، اتنی پریشان کیوں ہو؟“ میرا پوچھنا جیسے قیامت ہوگیا۔ اچانک اس کی جھیل جیسی آنکھوں سے دو آنسو نکلے اور اس کے رخساروں پر بہہ گئے۔

میں گھبرا گیا۔ ”خیر تو ہے؟ کیا ہوا؟“

وہ روتے ہوئے میرے قدموں میں بیٹھ گئی۔ ”میں اماں پر بوجھ بن گئی ہوں۔ وہ مجھے ہر حال میں سسرال بھیجنا چاہتی ہے، مگر میں وہاں ایک پل بھی نہیں رہنا چاہتی۔ میں......“

میں نے نرمی سے اسے دونوں بازوؤں سے تھاما اور اپنے روبرو کھڑا کردیا۔ وہ بالکل میرے سامنے تھی۔ اس کا چہرہ میرے چہرے کے بالکل پاس تھا۔ اچانک میرے دل کو کچھ ہوا اور میں نے نرمی سے اسے بانہوں میں بھرلیا۔ اس نے کسی قسم کی مزاحمت نہیں کی۔ میرا حوصلہ بڑھ گیا۔ مجھے یقین ہوگیا کہ اگر میں نے اسے اس سے بھی زیادہ چھولیا تو بھی وہ مجھے کچھ نہیں کہے گی۔ میرا قرب پاتے ہی وہ اور میرے وجود سے لگ گئی۔ میرا دل تو نہیں چاہ رہا تھا کہ میں اس سے یہ بات کہوں، مگر یہ بات کہنا اور پوچھنا بھی ضروری تھا۔ ”ویسے خالہ اپنی جگہ ٹھیک تو کہتی ہیں۔ بیاہی ہوئی بیٹیاں اپنے گھر ہی اچھی لگتی ہیں۔“

اس نے مجھے پلکیں اٹھا کر دیکھا، آنکھوں میں ہزاروں شکوے تھے۔ ”میں ایک بار کیا، ہزار بار وہاں رہنے کے لیے راضی ہوتی، اگر کاشف اچھا انسان ہوتا۔ تم نہیں جانتے کہ وہ کتنا کمینہ، گندہ اور ظالم شخص ہے۔ وہ شراب پیتا ہے، چرس پیتا ہے، جوا کھیلتا ہے اور...... مجھ پر ظلم ڈھاتا ہے۔ میں تمہیں بتا نہیں سکتی کہ وہ کتنا گھٹیا شخص ہے۔ میں مر تو سکتی ہوں، مگر اس شخص کے ساتھ ایک منٹ کے لیے نہیں رہ سکتی۔“

مجھے اس کا قرب مل رہا تھا۔ اس کا وجود میرے وجود سے لگا ہوا تھا۔ اور مجھے یوں لگ رہا تھا، جیسے میں اب ہواؤں میں اڑ رہا ہوں۔ میں نے آج تک جو کچھ اس پر کیا تھا، اور جس نیت کے ساتھ خرچ کیا تھا، اب وہ سب وصول کرنے کا وقت آ گیا تھا۔ ابھی مجھے اس کے قرب کی عارضی گھڑیاں میسر آئی تھیں، آگے مستقل آنے والی تھیں۔ میں کیسے بھلا ان گھڑیوں کو اپنی قسمت سے دور ہونے دیتا۔ میں نے نرمی سے اس کے رخسار کو چھولیا۔ ”پریشان مت ہو۔ میں خالہ سے بات کروں گا۔ جو تم چاہتی ہو، وہی ہوگا۔“

”میں تو چاہتی ہوں کہ میں ہمیشہ تمہارے ساتھ رہوں اور...... میری اس شخص سے جان چھوٹ جائے۔“

میرا دل جیسے خوشی سے پاگل ہوگیا۔ میں خود پر قابو پانے میں ناکام رہا۔ اگلے ہی پل اس کا پورا چہرہ میری دست رس میں تھا۔ میری سانس پھولنے لگی۔ میں حد سے بڑھنے لگا تو رابعہ نے کہا۔ ”کک...کوئی آ جائے گا۔ اتنا

ماہنامہ پاکیزہ کراچی

میں، قاری بہنوں کی دلچسپی کے لیے ایک نیا اور منفرد سلسلہ باتیں بہار و خزاں کی..... پیش کیا جا رہا ہے۔ جس میں ہر قاری بہن دیے گئے سوالوں کے جوابات دے کر شمولیت اختیار کر سکتی ہے۔ آپ کے خیالات و احساسات ہمارے لیے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔

تو قارئین آج ہی
ماہنامہ پاکیزہ
اپنے ہاکر سے بک کروالیں

جلدی یہ سب...''

''کوئی نہیں آتا۔''

''مگر.....''

''مگر کیا؟ کیا میرا پیار گوارہ نہیں ہے۔ یا تمہیں شک ہے کہ میں تمہیں پیار نہیں کرتا؟ آج مجھے اپنے دل کی پیاس بجھانے دو۔ میں تمہیں اس کمینے شخص سے آزاد کرا کر ہمیشہ کے لیے اپنا بنالوں گا۔''

اس نے مزاحمت ترک کر دی۔ میرے وجود میں سما گئی۔ اس بار وہ قانع تھی۔ ''مجھے تمہاری کسی بات سے انکار نہیں ہے، مگر ابھی میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

مجھے اس کی بات سمجھنے میں چند سیکنڈ لگے۔ میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ رابعہ کچھ دیر بعد ہی وہاں سے رخصت ہوگئی۔ میں گزرے ہوئے حسین ترین لمحات کے تصور میں کھو گیا۔ مجھے زندگی میں پہلی بار اتنے قیمتی اور حسین لمحات ملے تھے۔ وہ لمحات، جن کے میں صرف خواب دیکھا کرتا تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ میں اگلے دن اس کے گھر جاؤں گا اور خالہ سے رابعہ کے شوہر کے بارے میں بات کروں گا مگر چاہنے کے باوجود میں ایسا نہیں کر سکا۔ مجھے وہاں جانے کی فرصت ہی نہیں ملی۔ سمیرا کی طبیعت اچانک خراب ہوگئی۔ اس کی دوائی وغیرہ لینے میں دو دن گزر گئے۔ یہ دو دن میرے شہر میں گزرے۔ دو دن بعد میں نے دکان کھولی۔

میری نگاہیں بے ساختہ رابعہ کا راستہ تکنے لگیں۔ رابعہ میرے دل میں جو آگ بھڑکا گئی تھی، میں اسے ہر حال میں سرد کرنا چاہتا تھا۔ رابعہ اس شام بھی میری دکان پر نہیں آئی تو میں نے اپنے قدم اس کے گھر کی طرف بڑھا دیے۔ وہاں اداس کرنے والی ایک خبر میری منتظر تھی۔ رابعہ کا شوہر اسے آ کر لے گیا تھا۔ میں نے ضرورت کا سامان رکھا اور واپس لوٹ آیا۔ میرا دل بہت اداس ہو رہا تھا۔ مجھے رہ رہ کر خود پر اور رابعہ پر غصہ آ رہا تھا۔ دو دن پہلے اس نے مجھے کہا تھا کہ وہ اپنے شوہر کے گھر جانا نہیں چاہتی اور اب وہ وہاں چلی گئی تھی مگر دوسرے ہی پل خیال آیا۔ وہ اپنی خوشی سے کب گئی ہوگی۔ یقیناً خالہ نے اسے زبردستی بھیجا ہوگا اور کیا پتا اس دوران وہ میری دکان پر مجھ سے ملنے، کچھ کہنے بھی آئی ہو؟ میں ہی وہاں موجود نہیں تھا تو اس میں اس کا کیا قصور؟ اب تو اس کے واپس آنے کی دعا ہی کی جا سکتی تھی اور وہ میں کر رہا تھا۔ اس دوران رکھا بھی میری دکان پر آتا رہا۔ ایک دن اس نے کہا۔ ''میں نے سنا ہے کہ تو رابعہ کے گھر آنے جانے لگا ہے۔ اس کی ماں بھی تجھے منع نہیں کرتی۔ بہت مزے ہیں تیرے۔ لگتا ہے، آخر پٹا لیا ہے تو نے اسے؟''

مجھے اس سے کچھ چھپانا مناسب نہیں لگا۔ صرف تنہائی والی ملاقات کے علاوہ میں نے اسے ہر بات بتا دی۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ''سچ میں.......؟ یقین نہیں آ رہا۔''

''مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے؟'' میں نے ایک گہری سانس لی۔ ''یار اس لڑکی کے ساتھ اچھا نہیں ہوا۔ ایسی ہیرے جیسی لڑکی کو اتنا برا شوہر ملا۔ کاش کسی طرح اس کی اس سے جان چھوٹ جائے اور میں اسے بیاہ کر اپنے گھر لے آؤں۔''

''کیا بھابی مان جائے گی؟'' سمیرا کے ذکر پر میرا منہ بن گیا۔ ''میں کون سا اس کا باپ کا غلام ہوں، جو وہ نہیں مانے گی۔ اگر نہیں مانے گی تو اپنے ماں باپ کے گھر دفع ہوگی۔''

''کاش ایسا ہو جائے۔ ہم تو مجبور ہیں۔ میرا یار تو اچھی زندگی بسر کرے۔''

میں صرف مسکرا کر رہ گیا۔ ایک ہفتے بعد ہی رابعہ واپس آ گئی۔ اس دن بھی میں دوپہر کو آرام کرنے کی غرض سے دکان بند کر کے لیٹا ہوا تھا کہ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا تو سامنے رابعہ کھڑی ہوئی تھی۔ وہ فوراً ہی اندر آ گئی۔ دروازہ بند کرتے ہی میں اس کے قریب ہو گیا۔ وہ میرے پیار میں بھیگنے لگی۔ ''کہاں چلی گئی تھی تم۔ وہ بھی بتائے بغیر؟''

اس نے چہرہ اٹھا کر مجھے دیکھا۔ اس کے سرخ و سفید چہرے پر ہلکا سا نشان تھا۔ جیسے کسی نے اسے مارا ہو۔

''یہاں کیا ہوا ہے؟'' میرا پوچھنا جیسے قیامت ہو گیا۔ اچانک اس کی آنکھ سے موٹے موٹے آنسو بہنے لگے۔ اس نے نرمی سے خود کو چھڑایا اور اپنی پشت سے قمیص ہٹا دی۔ میں دہل کر رہ گیا۔ وہاں جگہ جگہ نیلے اور سیاہ رنگ کے داغ تھے۔

''اس کمینے انسان نے مجھے بہت بری طرح پیٹا ہے۔ میں وہاں سے بھاگ آئی ہوں۔ میں اب بھی وہاں نہیں جاؤں گی۔''

میں نے نرمی سے اسے اپنے قریب کر لیا۔ ''میں خود نہیں جانے دوں گا تمہیں۔ تم بس اس شخص سے طلاق لے لو۔ میں تمہیں ہمیشہ کے لیے اپنا لوں گا۔''

''سچ کہہ رہے ہو؟''

''بالکل سچ۔''

"اماں نہیں مانے گی۔"

"میں اس سے بات کروں گا۔"

"فی الحال اپنے بارے میں بات نہیں کرنا۔ پہلے مجھے وہاں سے طلاق دلوانی ہے، پھر اپنی بات کرنا۔"

"ٹھیک ہے، ایسا ہی کروں گا۔" وہ میرے وجود میں سما گئی۔ میں اسے ٹوٹ کر پیار کرنے لگا۔ جذبات کا طوفان تھمنے کے باوجود میں نے اسے خود سے جدا نہیں کیا۔ وہ میرے سینے سے لگی ہوئی تھی۔ اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔

"اب تو خوش ہو؟"

"خوش نہیں، بہت خوش ہوں۔ مجھے یوں لگ رہا ہے، جیسے میں کسی جنت میں ہوں اور کوئی حور میری بانہوں میں ہے۔ مجھے تو افسوس ہو رہا ہے کہ مجھے آج تک تمہارا قرب کیوں نہیں ملا۔"

"پر اب تو مل گیا ہے نا؟ اب ملتا ہی رہے گا۔"

"اچھا اب چلتی ہوں۔ بہت دیر ہو گئی ہے۔ اماں پریشان ہو رہی ہوں گی۔"

وہ جانے کے لیے پلٹی تو میری نظر اس کے کپڑوں پر پڑی۔ اس کا لباس ایک جگہ سے ہلکا سا پھٹا ہوا تھا۔ ایک انچ کے قریب۔ اس کا سرخ و سفید بدن وہاں سے دکھ رہا تھا۔ مجھے بہت دکھ ہوا۔ "اور کپڑے نہیں ہیں تمہارے پاس؟ دیکھوں تو یہاں سے جسم دکھ رہا ہے۔" میں نے پھٹی ہوئی جگہ پر ہاتھ رکھا۔

"کپڑے تو ہیں، پر سب سسرال میں ہیں۔ میں وہاں سے آئی تو میرے ساتھ صرف ایک لباس تھا۔ وہ میلا ہوا تو اسے اُتار کر یہ پہن لیا۔"

میں نے اپنی پیسوں والی دراز کھولی اور سو سو کے کئی نوٹ نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیے۔ "بازار جا کر اپنے لیے ایک دو اچھے سوٹ لے آؤ۔"

"یہ...... یہ میں پیسے نہیں لے سکتی اور دوسرا گھر میں اور کپڑے موجود ہیں......"

میں نے خفگی سے اسے دیکھا۔ "اس کا مطلب ہے کہ تم مجھے غیر سمجھتی ہو۔" "ایسی بات نہیں ہے۔"

"تو چپ چاپ یہ رقم رکھ لو اور صبح جا کر اچھے کپڑے لے آنا۔ آج کے بعد میں تمہیں ان کپڑوں میں نہ دیکھوں۔"

اس بار اس نے مسکراتے ہوئے پیسے لے لیے اور میرا دل اطمینان سے مکمل اٹھا۔ شام کو میں اس کے گھر میں تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ میں وہاں جا کر خالہ سے اس کے بارے میں بات کروں گا مگر میں وہاں پہنچا تو خالہ بیمار پڑی ہوئی تھی۔ میرے وہاں پہنچنے سے کچھ دیر پہلے انہیں فالج کا بہت شدید جھٹکا لگا تھا۔ میں انہیں فوراً اسپتال لے گیا۔ اگلے دو دن افراتفری میں گزر گئے۔ ہم نے ان کا علاج کرایا، دوائیں لیں مگر زیادہ فرق نہیں پڑا۔ ڈاکٹرز نے ہمیں کچھ ہدایات دیں اور اس کے بعد مجبوراً ہم انہیں واپس گھر لے آئے۔ رابعہ کی ماں کا پورا چہرہ بگڑ گیا تھا۔ وہ صرف بات سن سکتی تھی، بول نہیں سکتی تھی۔ نہ ہی زیادہ حرکت کر سکتی تھی۔ ان کی وجہ سے کچھ دن تو پریشانی رہی پھر میں نے اور رابعہ نے تقدیر کے اس فیصلے کو قبول کر لیا۔

میرے اور رابعہ کے تعلقات اب بھی برقرار تھے، مگر اب وہ میری دکان پر نہیں آتی تھی۔ بلکہ میں دوپہر کے وقت، اس کی ماں کو پوچھنے کے بہانے وہاں چلا جاتا اور رابعہ کے ساتھ بھرپور وقت گزارتا۔ پہلے دن کے بعد رابعہ نے کبھی مجھ سے اپنے شوہر سے طلاق لینے کی بات نہیں کی اور نہ ہی میں نے اس موضوع کو چھیڑا۔ مجھے سب کچھ ہی بغیر شادی کے حاصل ہو رہا تھا، رابعہ میرے ساتھ مخلص تھی، مجھے اور کیا چاہیے تھا؟ اگر رابعہ اپنے شوہر سے طلاق لے لیتی اور مجھ سے شادی کرنا چاہتی تو وہ بعد کی بات تھی۔ اس دوران میں نے رکھے کو بھی اپنی کئی باتیں بتا دیں اور اسے یہ کہہ دیا تھا کہ جونہی رابعہ اپنے شوہر سے طلاق لے گی، میں اس سے شادی کر لوں گا۔ رکھے نے مجھ سے کہا۔ "یار ذرا ہولے چل۔ اتنا تیز بھاگے گا تو منہ کے بل گرے گا۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ پہلے اچھی طرح تسلی کر لو، آیا وہ تمہارے قابل ہے بھی یا نہیں۔"

"کیا بکواس کر رہے ہو...... وہ میرے قابل کیا ہو گی، میں خود اس کے قابل نہیں ہوں۔ وہ تو ایسی خوبصورت اور حسین لڑکی ہے، اس پر تو کوئی بھی عاشق ہو سکتا ہے، مگر اس نے صرف میرا ہاتھ تھاما ہے۔"

"حسن ہی ہر چیز نہیں ہوتا۔ میری بیوی موٹی ہے، زیادہ حسین نہیں ہے مگر عزت والی ہے۔ اگر رابعہ سے عارضی تعلقات رکھنے ہیں تو جو مرضی کرتا رہ، مگر اگر اسے اپنی بیوی بنانے کا ارادہ ہے تو تھوڑا بہت اس کے بارے میں چھان بین کر لے۔ مجھے پتا چلا ہے کہ شادی سے پہلے اس کا کردار ٹھیک نہیں تھا اور کیا پتا اب بھی نہ ہو۔ جو عورت بغیر نکاح کے تمہارے ساتھ عشق کی پینگیں بڑھا سکتی ہے، وہ کسی اور کے ساتھ بھی......"

"بکواس مت کر۔" میں چیخا۔ "تو خود بھی اس کا عاشق تھا۔ اس نے تمہاری بجائے میرے ساتھ تعلق استوار کیا ہے تو تم جل رہے ہو۔ تم سے برداشت نہیں ہو رہا کہ....."

"میں کل مزید تسلی کر کے آؤں گا، پھر تم سے بات ہوگی۔" وہ ادھوری گفتگو چھوڑ کر چل دیا۔

وہ دوسرے دن آیا تو اس کی آنکھوں میں طنز کی جھلک صاف دکھائی دے رہی تھی۔ "میں نے تسلی کر لی ہے۔ چوہدری شفیع کے بڑے بیٹے جیلے سے، ملک قاسم کے بیٹے آصف سے اور شیخ برادری میں چاچا طالب کے بیٹے فانو سے اس کا یارانہ تھا۔ وہ تینوں ہی کھاتے پیتے گھرانے کے لوگ ہیں۔ ان تینوں میں فانو بازی لے گیا تھا۔ اس نے رابعہ پر بے حساب پیسا خرچ کیا تھا اور اسے سَر سے لے کر پاؤں تک حاصل کر لیا تھا۔ وہ آج کل دبئی میں ہے۔ ورنہ تو خود اس سے تصدیق کر لیتا اور رہ گئی شادی کے بعد کی کوئی بات، تو اس کا بھی کہیں نہ کہیں سے پتا کر کے تمہیں بتا دوں گا۔ جو عورت شادی سے پہلے خراب ہو سکتی ہے، وہ شادی کے بعد بھی اس رستے پر چل سکتی ہے....."

میں نے اس کا گریبان پکڑ لیا۔ "اُلو کے پٹھے! تو بکواس کر رہا ہے۔ میں تیرا مقصد سمجھ رہا ہوں تو چاہتا ہے کہ میں اسے اپنی بیوی نہ بناؤں۔ اس کے ساتھ عارضی تعلقات استوار رکھوں، تاکہ میری طرح..... تم بھی اس پر ڈورے ڈال کر اسے حاصل کر سکو۔"

اس نے ایک جھٹکے سے اپنا گریبان چھڑایا۔ "مجھے نہیں پتا تھا کہ تو ایک عورت کی خاطر اپنے یار کے گریبان میں ہاتھ ڈال سکتا ہے۔ تھو ہے تیری یاری اور تیری سوچ پر۔ اس عورت نے تم پر جادو کر دیا ہے اور اب تمہیں اس کے علاوہ اور کوئی نظر نہیں آتا، پر ایک بات یاد رکھنا۔ اگر تم نے اس عورت سے شادی کی تو کہیں کے نہیں رہو گے..... اور ہاں، جس کے تم گن گا رہے ہو نا، ایک بار تنہائی میں، اس عورت سے ان لوگوں کے بارے میں پوچھنا ضرور۔ کیا پتا وہ سچ اگل دے۔"

وہ وہاں سے رخصت ہو گیا۔ میں اپنی سوچوں میں الجھ گیا۔ میں یہ کسی طور ماننے کے لیے تیار نہیں تھا کہ وہ شادی سے پہلے کسی سے اس کے تعلقات تھے۔ اگر میں یہ بات مان لیتا تو میری انا پر ضرب پڑتی کہ اس نے مجھے شادی سے پہلے اظہارِ محبت پر تھپڑ مارا تھا اور دوسرے لوگوں کے ساتھ اس نے تعلقات قائم کیے تھے۔ میں نے پوری کوشش کی کہ اس بات کو ذہن سے جھٹک دوں، مگر میں اس میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ جب تک میں رابعہ سے یہ بات معلوم نہ کر لیتا، مجھے سکون نہیں آتا، مگر رابعہ سے یہ بات پوچھتے ہوئے بھی مجھے ڈر لگ رہا تھا۔ یہ بات پوچھنے کے بعد اگر وہ مجھ سے ناراض ہو گئی تو؟ اس سے یہ جو تعلق بنا ہوا ہے، یہ بھی ٹوٹ جائے گا۔

میں نے دل میں پکا ارادہ کر لیا کہ میں رابعہ سے اس بارے میں کوئی بات نہیں کروں گا، مگر اگلی بار جب میں اس سے ملنے گیا تو یہ بات خود بخود میری زبان پر آ گئی۔ رابعہ نے مجھے دکھ بھری نظروں سے دیکھا اور دوسرے ہی پل اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہنے لگے۔ "اگر ساری دنیا بھی مجھے برا کہتی تو مجھے دکھ نہ ہوتا مگر تم بھی...... مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں جس شخص کو دل سے چاہتی ہوں، وہ مجھے اس طرح بھی سمجھ سکتا ہے۔ میں مانتی ہوں کہ بغیر نکاح کے میں نے تمہارے ساتھ تعلق استوار کیا ہے مگر میں نے یہ سب تمہاری خوشی کے لیے کیا ہے۔ اس اُمید پر کیا ہے کہ ایک دن تم مجھے اپنا لو گے۔ اگر مجھے پتا ہوتا کہ تم میرے بارے میں اتنا غلط سوچ سکتے ہو تو میں کبھی بھی شادی سے پہلے تمہیں اپنے قریب نہ آنے دیتی......" اس نے روتے ہوئے ایک سسکی لی۔ "اگر تم سمجھتے ہو کہ میں بری لڑکی تھی اور اب بھی ہوں تو بے شک تم مجھے چھوڑ دو۔ میں نے تم پر اعتبار کیا تھا، مجھے اس اعتبار کی سزا ملنی ہی چاہیے۔ ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا اور آج کے بعد یہاں مت آنا......" اس کے رخساروں پر تواتر سے آنسو بہہ رہے تھے۔

میرے دل کو کچھ ہونے لگا۔ میں مر تو سکتا تھا مگر اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں اس وقت کو کوسنے لگا، جب میں نے اس سے یہ بات پوچھی تھی۔ میں نے نرمی سے اسے بانہوں میں بھر لیا۔ اس کے آنسو پونچھے۔ "میں ایک دوست کے بہکاوے میں آ گیا تھا۔ بس یہ پہلی اور آخری غلطی سمجھ کر معاف کر دو۔ میں آج کے بعد ایسا کچھ نہیں کہوں گا۔ اگر ایسا کچھ کہا تو جو چور کی سزا، وہ میری۔"

اسے منانے میں مجھے بہت دیر لگ گئی۔ جب وہ مان گئی تو اس نے کہا۔ "اگر آج کے بعد ایسی کوئی بات کی نا، تو دیکھنا میں کوئی چیز کھا کر مر جاؤں گی۔"

"مریں تمہارے دشمن۔" میں نے ایک بار پھر اسے قریب کر لیا۔ "اچھا وہ تمہارے شوہر کا کیا ہوا؟ اس نے ادھر کا چکر لگایا؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "ابھی تک تو نہیں آیا اور اللہ

1987ء سے خدمت میں مصروف

LEUCODERMA-VITILIGO

پھلبہری
قابل علاج مرض ہے

تمام جلدی بیماریوں کا موثر اور بے ضرر علاج

STEROIDS FREE MOST PROGRESSIVE TREATMENT

ملٹی ایوارڈ ہولڈر
اجمل زیدی
ماہر برص
کے دورہ پاکستان کا مستقل پروگرام

ASIAN EXCELLENCE
PERFORMANCE AWARD

AWARD OF
BEST ACHIEVEMENT

AWARD
PILLAR OF LEUCODERMA

اسلام آباد

9-اپریل تا 30 مئی
9-اگست تا 30 ستمبر
9-دسمبر تا 30 جنوری

فون: 2255660 - 2654595 (061)
موبائل: 0300-8566188
فیکس: 2261636

لاهور

گلف سینٹر

14-فروری تا 27 فروری
14-جون تا 27 جون
14-اکتوبر تا 27-اکتوبر

آفس نمبر 16
موبائل: 0300-8566188

پشاور

کیم فروری تا 11 فروری
کیم جون تا 11 جون
کیم اکتوبر تا 11-اکتوبر

فون: 9-2218215 (0521)
موبائل: 0300-8566188

ملتان

28 مارچ تا 6-اپریل
28 جولائی تا 6-اگست
28 نومبر تا 7 دسمبر

فون: 62-4518061 (061)
522803 (0300-8566188)

کراچی

13-مارچ تا 27 مارچ
13-جولائی تا 27 جولائی
13-نومبر تا 27 نومبر

آفس 706، K.F.C کراچی
فون: 9-021-7012068
موبائل: 0300-8566188

Email: syedajmalzaidi@hotmail.com - syedajmalzaidi@yahoo.co.uk

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

کرے آئے بھی نہ۔ بس اس کی طرف سے طلاق نامہ آ جائے۔ میں جب آئی تھی، اسے کہہ کر آئی تھی کہ مجھے اس کے ساتھ ایک دن بھی اب نہیں گزارنا۔ وہ چپ چاپ مجھے شرافت سے طلاق دے دے، ورنہ میں عدالت میں چلی جاؤں گی، مگر......

''مگر کیا؟''

''وہ مجھے اتنی آسانی سے طلاق نہیں دے گا۔ ابا نے اس سے کچھ قرضہ لیا تھا، سود پر، جو بڑھتے بڑھتے اتنا ہو گیا کہ ابا اسے نہ اتار سکا۔ اس نے ابا سے پیسوں کے بدلے میرا رشتہ مانگ لیا اور ابا نے وہاں میری شادی کر دی۔ شادی سے پہلے تو میں نے اسے دیکھا بھی نہیں تھا۔ شادی کے بعد دیکھا تو......وہ مجھ سے دگنی عمر کا تھا اور اس میں ہر برائی تھی۔ اب اس کا کہنا ہے کہ جب تک اسے اس کے ایک لاکھ نہیں ملیں گے، وہ مجھے طلاق نہیں دے گا....''

ایک لاکھ کا سنتے ہی میرا سانس رکنے لگا۔ یہ کوئی معمولی رقم نہیں تھی مگر اگر اس کے بدلے رابعہ جیسی پیار کرنے والی اور حسین لڑکی مل رہی ہو تو پھر یہ رقم بڑی نظر نہیں آتی مگر شرط ہے کہ اتنی رقم آپ ادا کر سکیں۔ میرے پاس لے دے کر ایک دکان تھی، جس میں قریباً دو لاکھ کا سامان تھا۔ میں اپنی دکان کم کر کے اس میں سے ایک لاکھ نکال سکتا تھا اور رابعہ کے لیے اتنا کرنا مجھے کچھ زیادہ نہیں لگ رہا تھا۔ ''اب جب بھی اس سے رابطہ ہو، اسے میرے پاس لے آنا۔ میں ایک لاکھ دے کر تمہیں اس سے آزاد کرا لوں گا۔''

''سچ؟'' اس کی آنکھوں میں بے یقینی تھی۔

''ہاں اتنا تو کر سکتا ہوں نا اپنی جان کے لیے۔''

رکھا جس دن سے مجھ سے خفا ہو کر گیا تھا، تب سے دوبارہ نہیں آیا مگر دو ہفتوں بعد وہ پھر میری دکان پر آ گیا۔ اس نے ضرورت کا کچھ سامان لیا اور چپ چاپ چلا گیا۔ نہ اس نے رابعہ کے حوالے سے کوئی بات کی، نہ میں نے۔ اس کے بعد وہ ضرورت کے تحت وہاں آتا اور مطلوبہ سامان لے کر چلا جاتا۔ اس دن بھی وہ میری دکان پر آیا تو میں سمجھا وہ کوئی ضرورت کا سامان لینے آیا ہے، مگر سامنا ہوتے ہی اس نے کہا۔ ''میں رابعہ کی شادی کے بعد کی ایک دو خبریں لایا ہوں، اگر تم کہو تو......''

''اب اگر ایک لفظ بھی زبان سے نکالا تو میں تمہارا منہ توڑ دوں گا۔ شرافت اسی میں ہے کہ تم چپ چاپ یہاں سے چلے جاؤ اور آج کے بعد مجھے اپنی گندی شکل مت دکھانا۔ پچھلی بار تو میں نے تمہیں چھوڑ دیا تھا مگر اس بار میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔''

وہ ایک گہری سانس لے کر وہاں سے رخصت ہو گیا اور پھر کافی عرصے تک میری دکان پر نہیں آیا۔ ہر دکان کی روزانہ جتنی سیل ہوتی تھی، وہ میں نیچے والے خیہ گلے میں محفوظ کرتا رہتا تھا۔ جب پندرہ، بیس ہزار ہو جاتے، میں نیا سامان لا کر دکان بھر دیتا مگر اس بار میں نے ایسا نہیں کیا۔ دکان کا سامان بکتا رہا اور میں پیسے محفوظ کرتا رہا۔ یہاں تک کہ اگلے ایک ماہ میں آدھی دکان خالی ہو گئی۔ اس کے باوجود دکان میں ضرورت کا ہر سامان موجود تھا۔ بس فرق اتنا تھا کہ پہلے ضرورت کی چیزوں کا اسٹاک لگا رہتا، اب ہر چیز روز کی روز خرید کر لانا پڑتی۔ اس کے باوجود میں خوش تھا کہ میں نے اس کے لیے اتنا کیا تھا۔ جب میں نے رابعہ کو بتایا کہ ایک لاکھ جمع ہو گیا ہے، وہ جب چاہے ایک لاکھ دے کر اپنے شوہر سے طلاق لے سکتی ہے، وہ بہت خوش ہوئی۔ اس کا بینک اکاؤنٹ کھلا ہوا تھا۔ اس کے کہنے پر ایک دن میں اس کے ساتھ جا کر وہ رقم اس کے بینک اکاؤنٹ میں جمع کرا آیا۔ تاکہ جب طلاق لینے کی نوبت آئے، اسے میرا انتظار نہ کرنا پڑے۔ اس کے پاس رقم موجود ہو۔ اب یا تو خالہ ٹھیک ہو جاتی تو طلاق کی بات کی جا سکتی تھی یا پھر اس کا شوہر اسے لینے وہاں آتا تو اس سے بات ہوتی۔ اُدھر دکان کا سامان کم ہونے کی وجہ سے سیل بھی کم ہو گئی تھی۔ رابعہ کی وجہ سے میں دکان کو کم وقت دے پاتا تھا۔ انہی دنوں میری دکان سے کچھ فاصلے پر ایک اور شخص نے پرچون کی دکان کھول لی۔ میرے جتنے بھی گاہک تھے، دکان بند ہونے کی وجہ سے دھیرے دھیرے اُدھر جانے لگے، مگر مجھے زیادہ پروا نہیں تھی۔ میرے شب و روز رابعہ کی زلفوں کی چھاؤں میں گزر رہے تھے، مجھے اور کیا چاہیے تھا؟ دو سے تین ماہ گزر گئے۔ رابعہ کے شوہر نے اس سے رابطہ نہیں کیا۔ مجھے کچھ پریشانی ہونے لگی۔ میں نے رابعہ سے یہ بات کی تو اس نے منہ بنا لیا۔ ''اچھا ہے وہ رابطہ نہ کرے۔ میری تو اس سے جان چھوٹی ہوئی ہے۔ پتا چلا ہے کہ اس کی کسی سے لڑائی ہو گئی تھی۔ دو چار ماہ کے لیے جیل کی ہوا کھانے گیا ہے۔ وہاں سے آئے گا تو کوئی بات ہو گی۔''

میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ ادھر جب سے دکان آدھی ہوئی تھی، ایک تو سیل کم ہو گئی تھی دوسرا رابعہ کی فرمائشیں بڑھ گئی تھیں۔ کبھی وہ جوتے منگوا رہی ہے، کبھی کپڑے اور کبھی کچھ۔ ایک وہ وقت تھا کہ میں اسے پیسے دیتا تھا

اور وہ نہیں لیتی تھی اور ایک یہ وقت تھا کہ...... ویسے مجھے رابعہ کی یہ فرمائشیں پریشان نہیں کرتی تھیں، بلکہ اس کی یہ ساری فرمائشیں پوری کر کے مجھے ایک عجیب سی خوشی کا احساس ہوتا۔ یہ فرمائشیں تو کچھ بھی نہیں تھیں، اگر رابعہ مجھ سے جان بھی مانگتی تو بھی مجھے انکار نہ ہوتا۔ اس کے عشق نے مجھے ہر شے سے بے نیاز اور اندھا کر کے رکھ دیا تھا۔ مجھے یہ بھی احساس نہیں تھا کہ میں اس پر دھڑا دھڑ دکان خالی کرتے ہوئے پیسا برباد کرتا جا رہا ہوں۔ دکان ویسے بھی آدھی سے زیادہ خالی ہو چکی ہے۔ اگر اسی طرح چلتا رہا تو عنقریب سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ مجھے اس وقت کسی چیز کا خیال نہیں تھا۔ میرے سامنے صرف ایک چیز تھی رابعہ کی خوشی، اور اس کی خوشی کے سامنے کسی چیز کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ تین چار ماہ اور گزر گئے۔

دکان میں اب پچاس ہزار سے بھی کم کا سامان بچ گیا تھا۔ دکان بالکل خالی خالی سی ہو گئی تھی، مگر اب بھی مجھے عقل نہیں آئی تھی۔ انہی دنوں، ایک عرصے تک بیمار رہنے کے بعد رابعہ کی ماں بھی چل بسی۔ میں ایک بار پھر اسی طرح رابعہ کے کام آیا، جیسے اس کے باپ کی موت پر آیا تھا۔ اس کی ماں کے مرنے کے بعد میں نے رابعہ کے گھر جانا یا اس نے میرے پاس آنا بہت کم کر دیا تھا۔ وہ اس کی زندگی کے دکھ بھرے دن تھے۔ میں ان دنوں اس سے اس کی قربت کی بھیک مانگ کر اسے دکھ دینا نہیں چاہتا تھا۔ کم سے کم اگلے ایک ماہ تک میں اسے چھو بھی نہیں سکتا تھا۔ ویسے یہ کسی حد تک میرے حق میں اچھا ہوا تھا۔ میں اس طرح تھوڑا دکان پر ٹک کر بیٹھ سکتا تھا، اسے توجہ دے سکتا تھا۔ تاکہ دکان کا جو نظام درہم برہم ہو چکا ہے، اسے کسی طرح سیدھا کیا جا سکے۔ مگر یہ میری بھول تھی۔ دکان کا نظام تھوڑا بہت نہیں، بہت زیادہ درہم برہم ہو چکا تھا، جو میری کوشش کے باوجود بھی سیدھا نہیں ہو رہا تھا۔ میں سارا سارا دن دکان پر بیٹھتا، اسے توجہ دیتا مگر دکان کی سیل کسی طرح نہ بڑھ سکی۔ اور اس کی وجہ وہ دکان بھی تھی، جو میری دکان سے کچھ فاصلے پر نئی نئی کھلی تھی۔ اکثر لوگ وہاں سے سامان لینے جاتے تھے۔ وہاں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔

دکان پر توجہ دینے کے بعد میں اگلے دس پندرہ دنوں تک رابعہ کے گھر نہ جا سکا۔ اور ویسے بھی میں اس کی قربت سے جی بھر کر لطف اندوز ہو چکا تھا، اگر کچھ دنوں تک اس کے پاس نہ جاتا تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ عنقریب وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے میری زندگی میں آ جاتی اور میں جب چاہتا، اس کی زلفوں کی چھاؤں میں وقت گزار لیتا۔ پندرہ دنوں بعد میں رابعہ کے گھر گیا تو وہاں تالا لگا ہوا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ وہ کہاں چلی گئی ہے، مگر میں نے اس بات کو زیادہ محسوس نہیں کیا اور دکان پر چلا آیا۔ میں نے دوسرے دن چکر لگایا تو اس دن بھی تالا لگا ہوا تھا۔ میری پریشانی اور بڑھ گئی۔ اگلے دو چار دن تک وہاں مجھے تالا لگا ہوا دکھائی دیا۔ اب مجھ سے برداشت نہیں ہو سکا۔ میں نے آس پاس سے پتا کیا تو پریشانی اور بڑھ گئی۔ رابعہ نے وہ مکان ساتھ والے کو بیچ دیا تھا اور خود معلوم نہیں کہاں غائب ہو گئی تھی۔ میں پریشان سا دکان پر لوٹ آیا۔ اگلے دن رکھا میری دکان پر تھا۔ وہ قریباً کئی ماہ بعد دکان پر آیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ملامت اور دکھ کی آمیزش تھی۔ ''رابعہ کے بارے میں پتا کرتے پھر رہے ہو نا۔ تو سنو، وہ ہمیشہ کے لیے یہاں سے رفو چکر ہو چکی ہے، اپنے کسی یار کے ساتھ۔ اگر سننے کا حوصلہ ہے تو پوری کہانی بھی سنا سکتا ہوں۔''

میرا دل سینے میں بیٹھنے لگا۔ پتا نہیں کیوں، اس بار مجھے لگ رہا تھا کہ رکھا جھوٹ نہیں کہہ رہا ہے۔ رابعہ نے اپنا مکان بیچ دیا تھا، خود یہاں سے کئی دنوں سے غائب تھی، یقیناً اس نے کوئی بڑا اقدام اٹھا لیا تھا۔ ''تمہیں یہ سب کیسے پتا؟'' مجھے اپنی آواز کسی کنویں سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔

رکھے نے ایک گہری سانس لی۔ ''میں نے اسی دن سے ہی رابعہ پر نظر رکھنی اور اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنا شروع کر دی تھی، جس دن تم نے میرا گریبان پکڑا تھا۔ میں نے تمہیں پہلے بھی بتایا تھا کہ شادی سے پہلے اس کے دو تین لڑکوں سے یارانے تھے، جن میں فانو سب سے آگے تھا۔ دوسروں کو تو وہ چکر دیتی پھر رہی تھی مگر فانو کو وہ سچ مچ چاہتی تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے سے عمر بھر ساتھ نبھانے کا وعدہ کیا تھا مگر رابعہ یہ وعدہ وفا نہیں کر سکی۔ اس کے باپ نے اس کی شادی کر دی۔ یہ تو بعد میں پتا چلا کہ اس کے باپ نے اس شخص کا بہت سا قرضہ دینا تھا، جس کی بھینٹ رابعہ چڑھی تھی۔ اس کا شوہر اس سے دوگنی عمر کا تھا۔ وہ صاحب حیثیت تو تھا مگر رابعہ کو وہ ضرورت سے زیادہ ایک روپیا بھی نہیں دیتا تھا۔ اور رابعہ...... وہ بہت اونچے خواب دیکھتی تھی۔ اسے اپنے حسن کا بہت مان تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس کی قسمت میں کوئی شہزادہ آئے گا، مگر...... وہ اس شخص سے بھی نبھا کر لیتی، اگر وہ اس پر اس طرح پیسا خرچ کرتا، جیسے فانو کرتا تھا۔ رابعہ کو جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ اس کی اپنے شوہر سے نہیں بنے گی اور اسے جتنا جلدی اس سے چھٹکارا مل جائے، اتنا ہی بہتر ہے۔ اس نے فوراً ہی پر پرزے نکالنے شروع کر دیے۔ شوہر سے

بدزبانی، آس پاس تانکا جھانکی اور ہر بات پر ضد.... وہ بات بات پر اپنے شوہر سے طلاق طلب کرتی مگر اس کا شوہر اتنی آسانی سے اسے طلاق دینے والا نہیں تھا۔ اس نے اس کے باپ سے ایک لاکھ روپے لینے تھے جس کے بدلے وہ رابعہ کو بیاہ کر لے گیا تھا۔ جب تک اسے وہ رقم نہ مل جاتی، وہ رابعہ کو طلاق نہیں دے سکتا تھا۔ رابعہ نے اپنی طرف سے ہر حربہ استعمال کرلیا، مگر اس کی وہاں سے جان نہیں چھوٹی۔ انہی دنوں اس کے شوہر کا بہنوئی سسرال آیا۔ اس نے رابعہ کو دیکھا اور اس پر مرمٹا۔ رابعہ کو دوسروں کا دل جیتنے کا فن آتا تھا۔ اس نے اپنے شوہر کے بہنوئی کو رات کو چھت پر ملنے کا اشارہ دیا۔ اس رات وہ دونوں چھت پر ملے اور..... رابعہ کے شوہر نے انہیں موقع پر پکڑلیا۔ عین ممکن تھا کہ وہ رابعہ کو اور اپنے بہنوئی کو وہیں مار ڈالتا، اگر بیچ میں رابعہ کی ساس نہ آتی۔ اس کے باوجود اس کے شوہر نے رابعہ پر اچھی طرح ہاتھ صاف کیا تھا۔ ''میری نظروں کے سامنے وہ لمحہ آ گیا، جب دوسری بار تنہائی میں رابعہ مجھ سے ملی تھی اور اس نے اپنی پیٹھ سے کپڑا اٹھا کر مجھے سیاہ اور نیلے داغ دکھائے تھے۔ رکھا اپنی کہتا رہا۔ ''وہ اسی دن ہی اپنے گھر آ گئی تھی یا شاید اس کی ساس نے اسے گھر بھیج دیا تھا کہ اگر وہ وہاں رہی تو کہیں اس کا شوہر اسے جان سے نہ مار دے۔ اس کا بہنوئی اسی دن وہاں سے نکل بھاگا تھا۔ رابعہ کچھ اس لیے بھی شوہر سے طلاق لینا چاہتی تھی کہ اس طرح وہ فانو کی زندگی میں آ سکتی تھی۔ وہ کھاتے پیتے گھرانے کا فرد تھا۔ شادی سے پہلے بھی اس نے اس پر بہت پیسے برباد کیے تھے، شادی کے بعد بھی یقیناً کرتا۔ دوسرا وہ خود بھی رابعہ سے شادی کرنا چاہتا تھا، مگر افسوس جب وہ واپس آئی، فانو دوبئی جا چکا تھا۔ رابعہ کی اُمید ٹوٹ گئی۔ اس کے باوجود وہ واپس نہیں جانا چاہتی تھی۔ اس نے یہیں کسی ایسے شخص کو تلاشنا تھا جو اس کی خواہشات کو پورا کرسکتا۔ اس کی نظر تم پر آ پڑی۔ اس نے اپنے شوہر سے ہر حال میں چھٹکارا حاصل کرنا تھا، سو اس نے تمہیں پھانس لیا اور اس کے بعد..... جو کچھ ہوا وہ تم بہتر جانتے ہو۔ میں نے تمہیں اس کے بارے میں آگاہ کرنے کی بہت کوشش کی، مگر......''

جانے کیوں میرا دل سینے میں بیٹھنے لگا۔ ''اور اب وہ کہاں ہے؟''

''پتا نہیں۔ اپنا مکان تو اس نے بیچ دیا ہے، سنا ہے، تم سے ایک لاکھ روپیا بھی اس نے ہتھیا لیا تھا۔ یہ رقم اس کے بہت کام آئے گی۔ یقیناً اب وہ اپنے کسی نئے یار کے ساتھ کسی نئی جگہ مزے کررہی ہوگی، جہاں تم اس کے سائے کو بھی نہیں پہنچ پاؤ گے۔''

مجھے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ میں اس صورتِ حال میں کیا کروں۔ میرا دل بار بار دعا کررہا تھا کہ کاش یہ سب غلط ہو۔ رکھے نے جو کچھ کہا ہے، اس میں رتی بھر بھی سچائی نہ ہو، مگر... اب یہ سوچنا اور دعا کرنا فضول تھا۔ رکھا یقیناً میرے دل کی کیفیت سمجھ رہا تھا۔ وہ مجھے دلاسہ دیتا رہا، حوصلہ بڑھاتا رہا اور یہ سب بھول جانے کی تلقین کرتا رہا، مگر شاید میں اس کی کوئی بات نہیں سن رہا تھا۔ میں شاید اپنے ہوش میں ہی نہیں تھا۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ میں نے جس عورت کے لیے اتنا کچھ کیا تھا، اسی نے مجھے دھوکا دیا تھا۔ میرے جذبات سے کھیلتی رہی تھی۔ رکھے نے درست کہا تھا۔ جو ہونا تھا، ہوگیا تھا۔ اسے بھلا دینا چاہیے تھا، مگر یہ سب آسان نہیں تھا۔ میں چاہ کر بھی رابعہ کو بھلا نہیں سکا تھا، بلکہ میں نے جتنا اسے بھلانے کی کوشش کی، وہ اتنا ہی میرے ذہن پر سوار ہوتی چلی گئی تھی۔ یہاں تک کہ اسے بھلانے کی کوشش میں میں اپنے آپ کو بھلا بیٹھا تھا۔ میرا خود پر اختیار ختم ہوگیا تھا۔ اگلے چند ماہ کے اندر اندر میں ذہنی مریض بن گیا اور مجھے اسپتال داخل کرادیا گیا۔ مجھے پوری طرح یاد نہیں کہ میں کتنا عرصہ دماغی اسپتال میں زیرِعلاج رہا، بس مجھے اتنا پتا ہے، جب میں وہاں سے لوٹا تو رابعہ ہمیشہ کے لیے میرے دل سے نکل چکی تھی۔ میری دکان کا کام دوبارہ چل پڑا تھا اور میرا اُمید سے تھی۔ یہ سب میرا کی کوششوں سے ہوا تھا۔ اسی نے میرا علاج کرایا تھا۔ اپنے گھر سے چھوٹے بھائی کو بلا کر دکان پر بٹھایا تھا اور دکان کا کرتا ہوا کام سنبھالا تھا۔ اور تب مجھے احساس ہوا تھا کہ بھائی اور بھابی کا فیصلہ بالکل درست تھا۔ میرا آج میں ایک اچھی بیوی ثابت ہوئی تھی۔ اس نے میری ہر خامی کو نظرانداز کرکے میرا ساتھ دیا تھا اور...... اس کے بعد میں نے بھی اسے وہ پیار دیا تھا، جس کی وہ مستحق تھی۔ مجھے بس آپ لوگوں سے اتنا کہنا ہے رابعہ جیسی اور میرے جیسے لوگ ہر جگہ موجود ہوتے ہیں۔ مجھ جیسے لوگوں کو خدا کا شکر ادا کرکے اپنے حال میں خوش رہنا چاہیے، ورنہ ہم اگر رابعہ جیسی عورتوں کے عشق میں گرفتار ہوتے رہے تو خدا کے گنہگار ہونے کے ساتھ ساتھ، اپنی ہستی بستی زندگی کو بھی خود ہی برباد کریں گے۔ سو سمجھداری کا تقاضہ یہی ہے کہ اوپر والا ہمیں جیسے اور جس حال میں رکھے، ہمیں اسی میں خوش رہنا چاہیے اور میرا جیسی بیویوں کی قدر کرنی چاہیے۔

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

میں ایک قبر پر فاتحہ پڑھ رہا ہوں۔ یہ قبر ایک ایسے شخص کی ہے جس نے مجھ پر احسان کیا تھا۔ میرا اس سے اتنا ہی تعلق ہے لیکن یہ رشتہ بہت عظیم اور بہت گہرا ہے۔ اس شخص کا نام ہی احسان تھا۔ احسان حبیب، وہ

میں ہر جمعرات کو اس کی قبر پر آتا ہوں۔ پھول چڑھاتا ہوں۔ فاتحہ پڑھ کر اس کی مغفرت کی دعائیں مانگتا ہوں۔

محسن

محترمی ایڈیٹر سرگزشت

سلام تہنیت

لوگ دوسروں کی حالاتِ زندگی پیش کرتے ہیں لیکن میں اپنی کہانی بھیج رہا ہوں۔ اُمید ہے آپ کو بھی پسند آئے گی۔ ان لوگوں کو اس سچ بیانی سے بہت فائدہ ہو گا جو آنکھ بند کر کے ہر کسی پر بھروسا کرلیتے ہیں۔ میں نے اپنی زندگی بچانے کے لیے کتنی بڑی غلطی کی ہے یہ آپ میری سچ بیانی پڑھ کر جان لیں گے۔

سلیم ناصر

(کراچی)

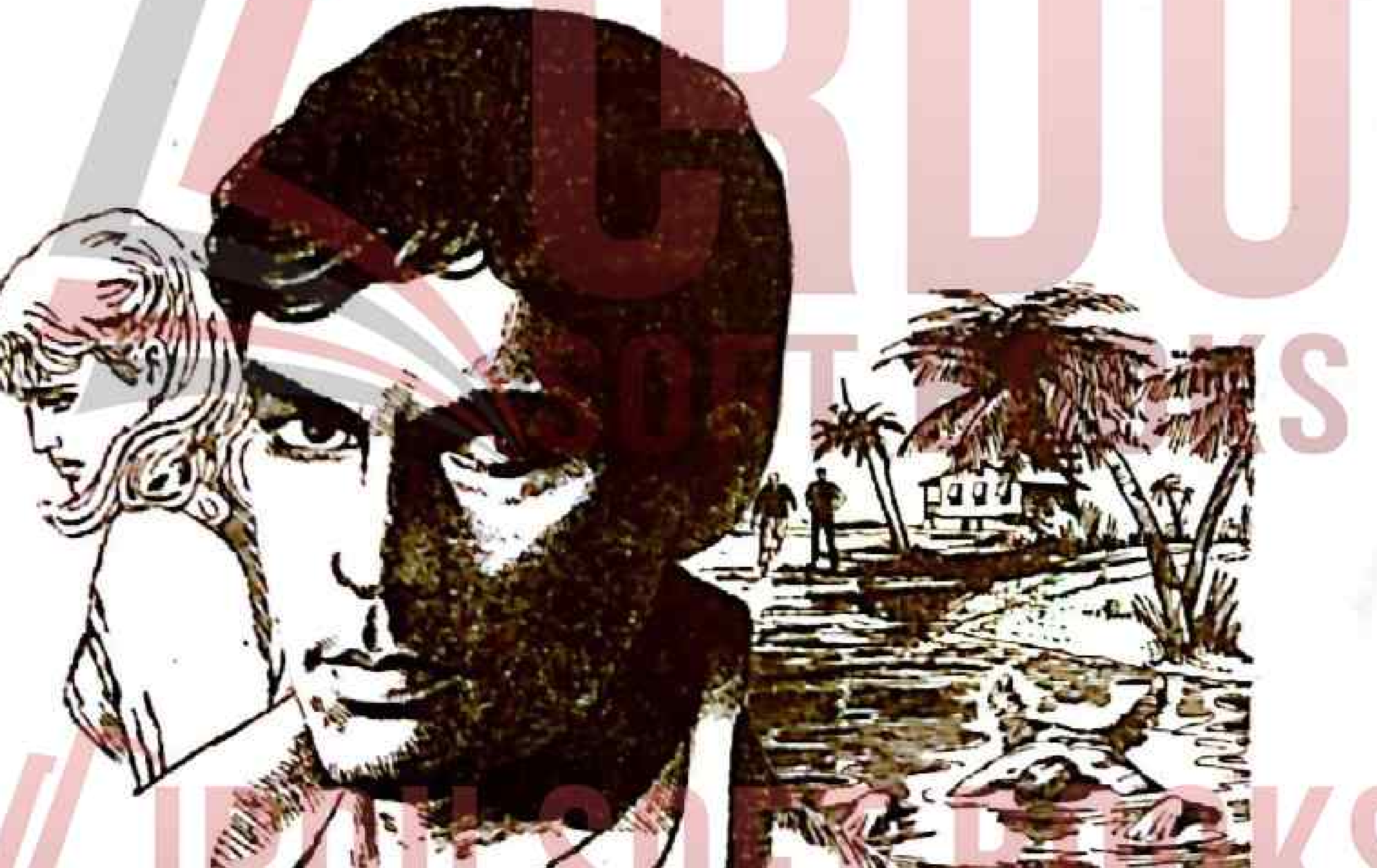

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

سراپا احسان تھا اور یہ اس کا احسان ہی ہے کہ آج میں زندہ ہوں اور اپنی یہ کہانی لکھ رہا ہوں۔

بہت ہی پریشان حال زندگی تھی، بہت اداس کر دینے والے شب و روز تھے میرے۔ مایوسیاں جب انتہا کو پہنچ جائیں تو پھر صرف ایک ہی راستہ رہ جاتا ہے اور وہ ہے زندگی سے فرار کا۔ زندگی سے نجات کا۔

میرا نام سلیم ناصر ہے۔ ناصر میرے والد صاحب کا نام تھا۔ انہوں نے بھی کوئی خاص اچھے دن نہیں گزارے تھے بلکہ ایک احسان یہ کیا تھا کہ نیو کراچی میں ایک بہت چھوٹا سا مکان ضرور خرید لیا تھا۔

میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھا۔ ان دونوں کے انتقال کے بعد بالکل ہی تنہا رہ گیا۔ میں نے تعلیم تو حاصل کر رکھی تھی لیکن کوئی پروفیشنل تعلیم نہیں تھی بس کسی طرح گریجویشن کر لیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کہیں ڈھنگ کی ملازمت ہی نہیں مل سکی۔ کیونکہ ہر طرف پروفیشنل ایجوکیشن کی ڈیمانڈ تھی۔ بہت برے دن گزر رہے تھے۔

اور اس وقت والد صاحب کا یہ احسان یاد آتا کہ وہ میرے لیے ایک مکان چھوڑ گئے تھے۔ لاکھ چھوٹا سہی لیکن اپنا تو تھا۔ کوئی ہر مہینے کرایہ لینے نہیں آتا اور نہ ہی کوئی دھمکی دینے آتا کہ جاؤ مکان خالی کرو۔ یہ بہت بڑی سہولت تھی۔

لیکن سوال یہ تھا کہ صرف اس سہولت سے تو شب و روز نہیں گزر سکتے تھے۔ زندہ رہنے کے لیے تو اور بھی بہت کچھ چاہیے اور وہ اور کچھ کسی صورت حاصل نہیں ہو رہا تھا۔

انتہا یہ تھی کہ جس لڑکی سے محبت کی تھی اس کی شادی بھی کہیں اور ہو گئی تھی۔ میری غربت سبب بن گئی تھی۔ ایسی حالت میں انسان کے ذہن میں بہت سے الٹے سیدھے خیالات آنے لگتے ہیں۔

پہلا خیال تو یہی آتا ہے کہ وہ کوئی الٹا سیدھا کام شروع کر دے، چوری اور ڈکیتی کے راستے پر چل پڑے۔

لیکن اس کے لیے بہت ہمت کی ضرورت ہوتی ہے اور اتنی ہمت مجھ میں نہیں تھی۔ البتہ ایک کام ہو سکتا تھا اور تھا خودکشی۔

اپنی جان دے کر تمام بلاؤں اور آفتوں سے نجات حاصل کر لوں۔ موت کے بعد زندگی کے یہ مسائل پھر تنگ نہیں کرتے۔ انسان صرف اور صرف اپنے خدا کے سامنے جا کر کھڑا ہو جاتا ہے اور وہ بہت مہربان اور بخشنے والا ہے۔

یہ سب سوچ کر میں نے خودکشی کا ارادہ کر لیا۔

جان دینے کا طریقہ کار بہت واضح تھا۔ یعنی سمندر کی موت۔ سمندر ویسے بھی میرا عشق رہا ہے۔ میں فرصت کے اوقات میں اکثر سمندر کی طرف نکل آتا اور ساحل پر بیٹھ کر اس کی طرف دیکھا کرتا تھا۔

سمندر ایک طرح سے میرا محبوب تھا اور مجھے اس محبوب کی آغوش میں اپنی جان دینی تھی۔ لہٰذا پورا فیصلہ کر لینے کے بعد میں ساحل پر پہنچ گیا۔

کراچی والوں کے لیے سمندر ایک بہت بڑی سہولت کی طرح ہے۔ وہ یہاں تفریح کے لیے آتے ہیں۔ پکنک مناتے ہیں۔ گھڑ سواری کرتے ہیں۔ کشتیوں کی سیر کرتے ہیں اور جب ضرورت ہو اور وقت آ جائے تو اس سمندر میں ڈوب کر اپنی جان بھی دے دیتے ہیں۔

لیکن ایسی سہولت ان شہروں کے ساتھ نہیں ہے جہاں سمندر نہیں ہے۔ ان بے چاروں کو موت کے لیے دوسرے راستے تلاش کرنے پڑتے ہیں۔ جیسے اپنے آپ کو گولی مار لی۔ زہر کھا لیا۔ اپنے بدن میں آگ لگا لی۔ یا کسی بلند مقام سے کود کر جان دے دی۔ بہت تکلیف دہ اور پریشان کن موت ہوا کرتی ہے۔

اس لحاظ سے سمندر کے ساحل پر آباد شہروں کے لوگ خوش نصیب ہوتے ہیں کہ انہیں مرنے کے لیے زیادہ زحمت نہیں کرنی پڑتی۔ بس آنکھیں بند کیں اور سمندر میں چھلانگ لگا دی قصہ ختم ہو گیا۔

تو میں ساحل پر پہنچ گیا۔

میں نے جان بوجھ کر ایسی جگہ کا انتخاب کیا تھا جہاں یا تو عام طور پر سناٹا ہوا کرتا یا بہت کم لوگ اس طرف کا رخ کرتے تھے۔

دو چار لوگ تھے تو ان کی توجہ کسی اور طرف تھی۔ میری طرف کوئی دھیان نہیں دے رہا تھا۔

میں نے اپنے جوتے اتار کر ایک طرف رکھ دیے۔ آخری بار آسمان اور دور بنے ہوئے مکانات کی طرف دیکھا اور پانی کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔

پہلے تو گیلی ریت نے میرے پیروں کو کس لیا۔ پھر ٹھنڈے پانی میں اتر گیا۔ گھٹنوں تک پانی آ گیا تھا لیکن میں آگے بڑھتا چلا گیا۔

پانی کمر سے اوپر آ گیا لیکن میں آگے بڑھتا رہا اور آگے اور آگے، سینے تک پانی، پھر گردن پھر چہرہ۔ اس کے بعد بری طرح بوکھلا گیا۔ میں تو مر رہا تھا۔ سانسیں گھٹنے لگی تھیں۔

پھیپھڑوں میں پانی بھرنے لگا تھا۔

اس وقت سوائے ہاتھ پاؤں چلانے کے اور کوئی ہوش نہیں تھا۔ آنکھیں بند ہوتی جا رہی تھیں۔ موت کی خواہش ذرا سی دیر میں ہوا ہو گئی تھی لیکن اب مرنا ہی تھا۔ اب کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔

لیکن کچھ ہو گیا۔

کسی نے میرے بالوں کو بہت مضبوطی سے جکڑ لیا اور ایک طرف کھینچنے لگا۔ اس نے بہت ہوشیاری اور مہارت کے ساتھ میری گردن بھی پکڑ لی تھی۔ جب کہ مجھے اپنا ہوش نہیں تھا۔ میں بس اس کے ساتھ بہاؤ میں تھا۔

کوئی مجھے اس حالت میں کھینچ کر کنارے پر لے آیا۔

مجھے ہوش کہاں تھا۔ وہ شخص تربیت یافتہ معلوم ہوتا تھا۔ اس نے میرا پیٹ دبا دبا کر میرے منہ سے پانی نکالا۔ سانسوں کا عمل جاری کیا اور آدھے گھنٹے کے بعد میں اپنے حواس میں آ چکا تھا۔

میرے ارد گرد بہت سے لوگ جمع تھے اور اس شخص کو مبارک باد دے رہے تھے جو ایک ڈوبتے ہوئے شخص کو بچا کر لے آیا تھا۔ جب کہ میرا یہ حال تھا کہ اس وقت وہ شخص مجھے زہر لگ رہا تھا۔ اس نے میری جان بچا کر مجھ پر احسان نہیں کیا تھا بلکہ مجھے دوبارہ اس درد بھری دنیا میں چھوڑ گیا تھا۔

''ہاں بھائی جان اب کیسی طبیعت ہے تمہاری۔'' اس شخص نے پوچھا۔

وہ پینتیس اور چالیس کی عمر کا ایک صحت مند شخص تھا۔

''جی ٹھیک ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''دیکھو سمندر سے چھیڑ چھاڑ نہیں کرتے۔'' اس شخص نے کہا۔ ''یہ کسی کا لحاظ نہیں کرتا۔ بڑے بڑے تیراک اس میں ڈوب جاتے ہیں اور تم کو تو شاید تیرنا بھی نہیں آتا۔''

''جی جناب میں تیرنا نہیں جانتا۔''

''خدا کا شکر ادا کرو کہ تمہاری جان بچ گئی۔'' ایک بڑے میاں نے کہا۔ ''ان صاحب کا شکریہ ادا کرو جو وقت پر تمہیں بچا کر لے آئے۔''

''جی ہاں۔ میں ان کا بھی شکر گزار ہوں۔''

''اب چلو میرے ساتھ۔'' مجھے بچانے والے نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ''میں تمہیں گھر تک پہنچا دیتا ہوں۔''

''نہیں جناب میں چلا جاؤں گا۔ میں اب ٹھیک ہوں۔''

''تم کو اندازہ نہیں ہے کہ سمندر سے باہر آنے کے بعد طبیعت اچانک خراب ہو جاتی ہے۔'' اس نے کہا۔ ''مجھے چونکہ اس کا تجربہ ہے۔ اس لیے اگر ایسی کوئی بات ہوئی تو میں تمہیں سنبھال سکتا ہوں۔''

''ہاں بھئی چلے جاؤ ان کے ساتھ۔ یہ تمہارے محسن ہیں۔'' کسی نے کہا۔

اب مجبوری تھی۔ اس لیے مجھے اس شخص کو اپنے ساتھ گھر لانا پڑا۔ اس کے پاس اپنی بائیک تھی۔ وہ اس پر مجھے نیو کراچی تک لے آیا تھا۔

راستے میں اس نے مجھے اپنا نام احسان بتایا تھا۔

بہرحال میں نے اس دن مرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا تھا۔ لیکن یہ کام تو ہر حال میں کرنا تھا۔

گھر آ کر میں نے اسے کمرے میں بٹھایا اور خود دوسرے کمرے میں کپڑے بدلنے چلا گیا۔ کچھ دیر بعد میں اس کے لیے چائے بنا کر لے آیا تھا۔

''ہاں تو سلیم صاحب! اب یہ بتاؤ تم خودکشی کیوں کرنا چاہتے تھے۔'' اس نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے پوچھا۔

''خودکشی۔'' میں نے اس کی طرف دیکھا۔

''ہاں خودکشی! مجھے اس وقت اندازہ ہو گیا تھا جب تم پانی میں اترے تھے۔ میں ایسے درجنوں کیس دیکھ چکا ہوں۔ میں بہت سوں کو بچانے میں کامیاب رہا اور بہت سوں کو بچا نہیں سکا۔ اس لیے مجھ سے کچھ چھپانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے وہاں لوگوں کے سامنے اس لیے نہیں بتایا کہ لوگ خواہ مخواہ تمہارے پیچھے پڑ جاتے۔''

''جی جناب!'' اب اس سے کچھ چھپانا بے کار تھا۔ اس لیے اعتراف کرنا ہی پڑ گیا۔ ''میں خودکشی ہی کر رہا تھا۔''

شمارہ جون 2017ء کی منتخب سچ بیانیاں

ہماری پیش کش ...... آپ کا انتخاب

☆ اول: خود اعتمادی ...... سعدیہ علی ...... (لاہور)

☆ دوم: آئیڈیل ...... مظہر سلیم ...... (رحیم یار خان)

☆ سوم: اسیر ذات ...... عارفہ ...... (کراچی)

[illegible] ماہ تیسرے انعام کے لیے آپ بھی انتخاب کیجیے
ہم آپ کی رائے کا احترام کریں گے

"لیکن کیوں، تم تو ابھی جوان آدمی ہو اور ابھی سے اتنی مایوسی۔"

"اس لیے کہ میری زندگی میں سوائے مایوسیوں کے اور کچھ نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ پھر میں نے اسے بتا دیا کہ میں کس کس طرح پریشان ہوں۔

"خدا کے بندے اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم ایک ناشکرے انسان ہو۔ تمہارے پاس بہت کچھ ہے۔ تم اپنی آنکھوں سے اس دنیا کو دیکھ سکتے ہو۔ اپنے کانوں سے سن سکتے ہو۔ اپنے پیروں سے چل سکتے ہو۔ اپنے ہاتھوں سے کام کر سکتے ہو۔ اس کے باوجود کہہ رہے ہو کہ تمہارے پاس کچھ نہیں ہے۔"

میں خاموش رہ کر اس کی باتیں سنتا رہا۔ شاید وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔

"میں یہ سمجھ رہا تھا کہ شاید تم پر غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے۔ یا دو تین سو دشمن تمہیں مارنے کے چکر میں ہیں لیکن ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ تم صرف اس لیے اپنی جان دے رہے تھے کہ تمہارے پاس جاب نہیں ہے۔ حد ہو گئی۔"

"تو کیا یہ محرومی ایسی نہیں ہے کہ آدمی مایوس ہو جائے۔"

"ہے، لیکن ایسی نہیں ہے کہ اس کے لیے جان دے دی جائے۔"

"تو پھر آپ ہی بتائیں میں کیا کروں۔" میں نے پوچھا۔

"کوشش کرو۔" اس نے کہا۔ "چلو میں تمہیں ایک دو جگہ بھیج دیتا ہوں۔ خدا نے چاہا تو تمہاری جاب ہو جائے گی۔"

اس نے ایک دو جگہ کے نام بتائے۔ پتا سمجھایا۔ ایک دو آدمیوں کے نام سفارشی چھٹی لکھی۔ اور یوں دو چار دنوں کی دوڑ دھوپ کے بعد ایک فرم میں جاب ہو ہی گئی۔

یہ جاب بھی اچھی خاصی تھی۔ یعنی اچھی تنخواہ پر رکھا گیا تھا اور یہ سب اس آدمی کی وجہ سے تھا جس نے نہ صرف میری جان بچا کر مجھ پر احسان کیا تھا بلکہ مجھ کو جاب دلا کر بھی احسان کیا تھا یعنی سراپا احسان تھا۔

میں نے جاب ملنے کی سب سے پہلے خبر اس کو دی تھی۔ ظاہر ہے اس کے علاوہ اور کون ہو سکتا تھا۔ اس نے مجھے مبارک باد دیتے ہوئے کہا۔ "اب تم ایک کام کرو، کسی پارک میں جاؤ۔ ساحل کی طرف جا کر سمندر کو دیکھو، پھر شہر کی خوب صورت عمارتوں کو دیکھو۔ کسی بازار میں کھڑے ہو کر دلکش عورتوں اور لڑکیوں کو دیکھو۔ اس کے بعد مجھے بتاؤ، لیکن یہ سب تمہیں ضرور کرنا ہے۔ یہ تمہارے لیے ایک ٹوٹکا ہے۔"

میں نے اس کی بات پر عمل کیا۔ شام کے وقت دفتر سے فارغ ہو کر میں ایک پارک کی طرف چلا گیا۔ خدا کی پناہ سب کچھ مجھے نیا نیا اور خوب صورت لگ رہا تھا۔ پھولوں کے رنگ بہت دلفریب تھے۔ پارک میں شور مچاتے ہوئے بچے اچھے لگ رہے تھے۔

اس وقت احساس ہونے لگا کہ مجھے کیا ہوا تھا؟ کیا میں پاگل ہو گیا تھا کہ زندگی جیسی قیمتی شے کو ختم کرنے چلا تھا۔ خدا بھلا کرے احسان کرنے والے کا کہ اس نے مجھے نئی زندگی دے دی تھی۔

کمال کا آدمی تھا۔ اس نے نہ صرف میری جان بچائی تھی بلکہ میرے لیے جاب کا بندوبست بھی کر دیا تھا۔ اس دور میں کون کس کا انتظار کرتا ہے۔

خود غرض اور بے رحم معاشرے میں وہ آدمی کسی فرشتے کی طرح تھا۔ کاش میں کسی طرح اس کے احسانات کا بدلہ دے سکتا تھا۔

لیکن نہیں ایسے لوگ بدلے ودلے کی خواہش نہیں رکھتے۔ وہ تو بغیر کسی لالچ کے احسان کرتے چلے جاتے ہیں۔

صرف دو مہینوں کے بعد میں اپنی نارمل زندگی کی طرف واپس آ چکا تھا۔ اس دوران ایک اور خوشگوار موڑ میری زندگی میں آ گیا۔

میں جس فرم میں کام کر رہا تھا اسی فرم کی ایک لڑکی شازیہ میرے قریب آنے لگی تھی۔ میں نے اس سے پہلے ہی ایک لڑکی کو اپنے خوابوں میں بسایا تھا لیکن وہ شادی کر کے کہیں دور جا چکی تھی۔ اس کے جانے کے بعد میری زندگی کے سارے رنگ غائب ہو گئے تھے۔

لیکن اب شازیہ آ گئی تھی۔ یہ بھی ایک اچھی لڑکی تھی۔ ایک متوسط لیکن مذہبی گھرانے سے تعلق تھا اس کا۔ شرمائی شرمائی سی رہنے والی یہ لڑکی مجھے پہلی نظر میں پسند آ گئی تھی۔

اور وہ دن تو بہت ہی خوب صورت تھا۔ جب ہم نے ایک دوسرے سے محبت کا اظہار کیا تھا۔ میں اس کی تفصیل بتانا نہیں چاہتا۔ بس یہ سمجھ لیں کہ ہم دونوں شاید ایک دوسرے ہی کے انتظار میں تھے۔

میں نے سب سے پہلے یہ خبر جا کر احسان کرنے والے احسان کو سنائی۔ وہ بھلا آدمی یہ سن کر اس طرح خوش ہو گیا تھا جیسے کوئی بڑا بھائی اپنے چھوٹے بھائی کی کسی کامیابی پر خوش ہوتا ہے۔

"دیکھا تم نے اب زندگی کتنی خوب صورت اور خوش گوار ہو گئی ہے۔ خود سوچو اگر سمندر میں ڈوب کر مر جاتے تو کیا اس قسم کی خوشیاں مل سکتی تھیں؟"

"نہیں احسان صاحب!" میں نے اعتراف کیا۔ "اس کے بعد تو کہانی ہی ختم ہو جاتی۔"

"اس کے علاوہ ایک بات اور بھی ہوتی۔ خدا کے یہاں بھی کڑا محاسبہ ہوتا۔ خدا خودکشی کرنے والوں کے گناہ معاف نہیں کرتا۔ کیونکہ زندگی تو خدا کی امانت ہے۔ اگر کوئی شخص خودکشی کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس نے امانت میں خیانت کی ہے۔"

"جی ہاں اب یہ سب کچھ سمجھ میں آ گیا ہے۔"

"بس تو جاؤ اور زندگی کو ایک نئے انداز سے برتنے کی کوشش کرو لیکن اب تمہیں میرا ایک کام کرنا ہوگا۔"

"جی احسان صاحب آپ کے لیے جان بھی حاضر ہے۔"

"خیر، اتنا بڑا کام تو نہیں ہے لیکن تمہیں ایک نیکی کرنی ہوگی۔ اسے صدقہ جاریہ سمجھ لو۔"

"فرمائیں میں کیا کر سکتا ہوں۔"

"دیکھو تمہیں ایک وعدہ کرنا ہوگا۔" اس نے کہا۔ "دیکھو تمہیں بچا کر میں نے ایک چراغ جلایا ہے۔ اُمیدوں اور انسانیت کا چراغ۔"

"جی ہاں اس میں کیا شک ہے۔"

"اب تم اس چراغ کی روشنی کو آگے بڑھاؤ گے۔"

"میں نہیں سمجھا احسان صاحب۔"

"تم بھی کسی ڈوبتے ہوئے آدمی کو بچاؤ گے۔" اس نے کہا۔ "یا اس کو بچاؤ گے جو خودکشی کی نیت سے سمندر کی طرف جا رہا ہو۔ یہ بہت بڑی نیکی ہوگی اور اس طرح چراغ سے چراغ جلتے چلے جائیں گے۔"

"احسان صاحب! میں آپ کے اس مشن کو ضرور آگے بڑھاؤں گا۔" میں پُرجوش ہو کر بولا۔ "لیکن پرابلم یہ ہے کہ مجھے تیرنا ہی نہیں آتا۔"

"اس کی فکر مت کرو، میں تمہیں سوئمنگ سکھا دوں گا۔" اس نے کہا۔ "صرف دو دنوں میں تم اس قابل ہو جاؤ گے کہ بغیر

> 1832ء میں ڈاکٹر جوزف انتونی فرڈیننڈ پلیٹیو نے بیلجیئم میں اور ڈاکٹر سائمن رٹر فان سیمپفر نے آسٹریا میں بیک وقت تصویروں کو متحرک بنانے کا ایک آلہ تیار کیا جسے سنیما کی ایجاد کی جانب ایک اہم قدم قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس میں ایک چرخی پر بہت سی تصاویر چسپاں کر دی جاتی تھیں اور جب اس چرخی کو گھمایا جاتا تھا تو تصویریں حرکت کرتی محسوس ہوتی تھیں۔
>
> مرسلہ: احمد عثمانی۔ لاہور

کسی کی مدد کے خود سوئمنگ کر سکو اور ایک ہفتے کی ٹریننگ کے بعد تم خود کسی اور کو بچانے کے قابل ہو جاؤ گے۔"

"میں تیار ہوں احسان صاحب۔"

"تو کل شام کو میرے پاس آ جانا۔ تمہاری ٹریننگ شروع ہو جائے گی۔ ایسے کاموں میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔"

میں نے دوسرے دن شازیہ کو بتایا تو وہ بہت خوش ہو گئی۔ "ہاں یہ بہت زبردست بات ہوگی۔ تمہیں اس نیک انسان کی یہ خواہش ضرور پوری کرنا چاہیے۔"

میں شازیہ کو اپنی پوری کہانی بتا چکا تھا کہ کس طرح ایک بھلے انسان نے میری جان بچائی تھی اور اس نے مجھے یہ جاب بھی دلوائی تھی۔

"کاش اس قسم کی ٹریننگ میں بھی لے سکتی۔" شازیہ نے کہا۔ "کسی کی جان بچانا تو بہت بڑا ثواب ہے۔"

"اس کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے میں اچھی طرح سیکھ لوں۔ اس کے بعد جب ہماری شادی ہو جائے گی تو پھر میں تمہیں سکھا دوں گا اور ہم دونوں میاں بیوی مل کر اس کام کو آگے بڑھائیں گے۔"

"یہ بہت اچھی بات ہوگی۔" شازیہ بہت خوش ہو رہی تھی۔ "اس طرح ہم اس نیکی کو آگے بڑھاتے جائیں گے۔"

دوسری شام کو میں اس جگہ پہنچ گیا جہاں پہلی بار احسان سے ملاقات ہوئی تھی۔ یعنی اس نے جہاں ڈوبنے سے مجھے بچایا تھا۔

اس شام وہاں کچھ لوگ تھے یعنی پچھلے دن کی طرح وہ ساحل ویران نہیں تھا۔ وہ لوگ اپنی اپنی باتوں میں مصروف تھے۔

کچھ دیر بعد احسان بھی پہنچ گیا۔ ہمیشہ کی طرح

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

مسکراتا ہوا۔

ہم ساحل پر ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھ گئے۔

"ناصر!" اس نے سمندر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ سمندر جتنا عظیم اور مہربان ہے۔ اس قدر اس کے مزاج میں غصہ بھی ہے۔ یہ خود سے چھیڑ چھاڑ کرنے والوں کو برداشت نہیں کرتا۔ میرا خیال ہے کہ ہر سال ہزاروں انسان اس سمندر میں ڈوب کر مچھلیوں کی خوراک بن جاتے ہیں۔"

"ہاں یہ تو ہے۔"

"سمندر کی واپس جاتی ہوئی لہریں زیادہ خطرناک ہوتی ہیں۔ یہ پیروں کے نیچے سے توازن نکال دیتی ہیں۔ انسان بے بس ہو کر ہاتھ پاؤں مارنے اور اپنے پاؤں جمانے کی کوشش کرتا ہے اور اسی قدر سمندر میں اترتا چلا جاتا ہے۔"

"ہاں اس دن مجھے اس کا تجربہ ہو چکا ہے۔"

"ایک خاص بات یہ ہے کہ سمندر اپنے شکار کو ایک بار ضرور سطح پر لے آتا ہے۔ یعنی لاش کو اچھال دیتا ہے۔ اس کے پانیوں میں ایک خاص قسم کی کشش ہوتی ہے۔ سمندر خود ہی اتر جانے والوں کو ہپناٹائز کر دیتا ہے۔ ایک روایت ہے کہ ڈوبنے والوں کو ایک خاص قسم کی موسیقی سنائی دیتی ہے۔ وہ اس میں گم ہو جاتا ہے۔ پھر اسے اپنا ہوش نہیں رہتا۔"

"میں نے بھی یہی سنا ہے۔"

"اصل کھیل ہے سانسوں کا۔ جو شخص کافی دیر تک سانس روک سکتا ہے۔ وہ اتنی دیر سمندر کی لہروں کے خلاف جدوجہد کر سکتا ہے۔"

پھر وہ بہت دیر تک سمندر کی خصوصیات کے علاوہ یہ بتاتا رہا کہ تیراکی کے کیا اصول ہوا کرتے ہیں۔ کس طرح مخالف یا موافق دھاروں میں تیرا جا سکتا ہے۔ وغیرہ۔

"چلو اب تمہیں سوئمنگ سکھاتا ہوں۔"

"احسان صاحب! ڈر لگ رہا ہے۔" میں نے کہا۔

"ڈر۔" وہ ہنس پڑا۔ "کمال ہے اس شام تو تم خود ہی سمندر میں اترتے جا رہے تھے۔"

"وہ بات اور تھی۔ اس وقت اپنی جان دینے کا ارادہ تھا۔ لیکن اب تو زندگی سے محبت ہو گئی ہے احسان صاحب خاص طور پر۔"

"ہاں کہو۔" اس نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

"خاص طور پر شازیہ سے ملاقات کے بعد کیوں یہی نام بتایا تھا نا؟"

"جی ہاں یہی نام ہے۔" میں ہنس پڑا۔

"چلو اٹھو بہادر بنو میں تمہارے ساتھ ہوں۔"

پانی میں کچھ دور اتر آنے کے بعد اس نے مجھے چند اسٹروک بتائے۔ طریقے بتائے کہ سانسوں کو کس طرح قابو میں کیا جاتا ہے۔ دونوں ٹانگوں کا استعمال کس طرح ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

اچانک مجھے ایسا لگا جیسے میرے پیروں کے نیچے سے زمین نکل رہی ہو۔

سمندر کی ریت کھسکنے لگی تھی۔ میں نے خود کو بچانے اور سنبھالنے کی کوشش کی لیکن پانی میں ڈوبتا چلا گیا۔ میں نے بوکھلا کر احسان کو پکڑ لیا۔

احسان کی آواز آئی۔ "بے وقوف تم مجھے مت پکڑو۔ مجھے پکڑنے دو۔"

لیکن اس وقت میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ کیسی عجیب بات تھی۔ ایک وہ وقت تھا کہ میں خود مرنے کی کوشش کر رہا تھا اور ایک یہ وقت تھا کہ بس ایک ہی خیال تھا کہ کسی طرح اپنی جان بچالی جائے۔

اس کے منع کرنے کے باوجود میں نے اس کی کمر پکڑ لی اور ہم دونوں ڈبکیاں کھانے لگے۔ وہ جس قدر مجھ سے جان چھڑانے کی کوشش کرتا میں اتنا ہی اس سے لپٹتا جاتا۔

پھر کیا ہوا۔ مجھے ہوش نہیں رہا۔ جب ہوش آیا تو میں ساحل پر تھا اور کچھ لوگ میرے چاروں طرف کھڑے تھے۔ ان میں سے شاید کوئی ڈاکٹر بھی تھا۔ جس نے ابتدائی ٹریٹمنٹ دے کر میری جان بچالی تھی۔

میں نے احسان کی تلاش میں نگاہیں دوڑائیں لیکن وہ کہیں دکھائی نہیں دیا۔ میں نے لوگوں سے پوچھا۔ ایک نے بتایا۔ "ہمیں افسوس ہے نوجوان کہ ہم تمہارے ساتھی کو بچا نہیں سکے۔ وہ بے چارہ تو ڈوب گیا۔"

میں نے اس وقت پھر کچھ نہیں پوچھا۔ اب کسی کو کیا بتاتا کہ وہ بے چارہ کس چکر میں مارا گیا ہے۔

وہ دن ہے اور آج کا دن۔ ہاں اس بے چارے کی لاش دو چار گھنٹوں کے بعد ساحل پر آ گئی تھی۔ اس کی تدفین میں، میں بہت دیر تک روتا رہا تھا۔ پھر وہ دن ہے اور آج کا دن۔ میں ہر جمعرات کو اس کی قبر پر فاتحہ پڑھنے ضرور جاتا ہوں۔

اس نے مجھ پر احسان کیا تھا۔ میں یہ سوچ رہا ہوں کہ اگر اس نے حضرت علیؓ کا یہ قول سنا یا پڑھا ہوتا تو مجھ سے دور ہی رہنے کی کوشش کرتا۔ "جس پر احسان کرو اس کے شر سے بچو۔"

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

آج عید کا دن ہے۔ لوگ خوشیوں سے سرشار ہیں۔ گلی میں بچوں کا شور ہے۔ سب نئے نئے کپڑوں میں ملبوس اچھل کود میں مصروف ہیں۔ میں کھڑکی پر کھڑی انہیں دیکھ رہی ہوں۔ ننھی ننھی پھول سی بچیاں، بھر بھر کلائیاں چوڑیاں پہنے مہندی لگائے اِدھر سے اُدھر پھدکتی پھر رہی ہیں۔ وہ کتنی خوش ہیں۔ کبھی میں بھی اسی طرح بھرے ہاتھوں مہندی لگائے خوب خوش ہوتی تھی مگر آج ایسی خوشی محسوس نہیں ہوتی گو کہ میں نے آج بھی بھر کلائی چوڑیاں پہنی ہیں اور پارلر جا کر

انتقام

محترمہ عذرا رسول
السلام علیکم
آپ نے اکثر بچوں کے پاس ایک قسم کی پھرکی جسے ہم لٹو کہتے ہیں دیکھی ہو گی جس کا کام صرف گھومتے رہنا ہے۔ میری زندگی بھی گردش کناں ہے۔ اپنی زندگی کے اہم واقعات میں نے کہانی کے انداز میں پیش کردیے ہیں۔ کہاں تک کامیاب رہی ہوں اس کا فیصلہ قارئین کریں گے۔ بس ایک التجا ہے کہ اسے ردی میں نہ ڈالیں۔ نوک پلک سنوار کر شائع ضرور کردیں۔

مریم
(اسلام آباد)

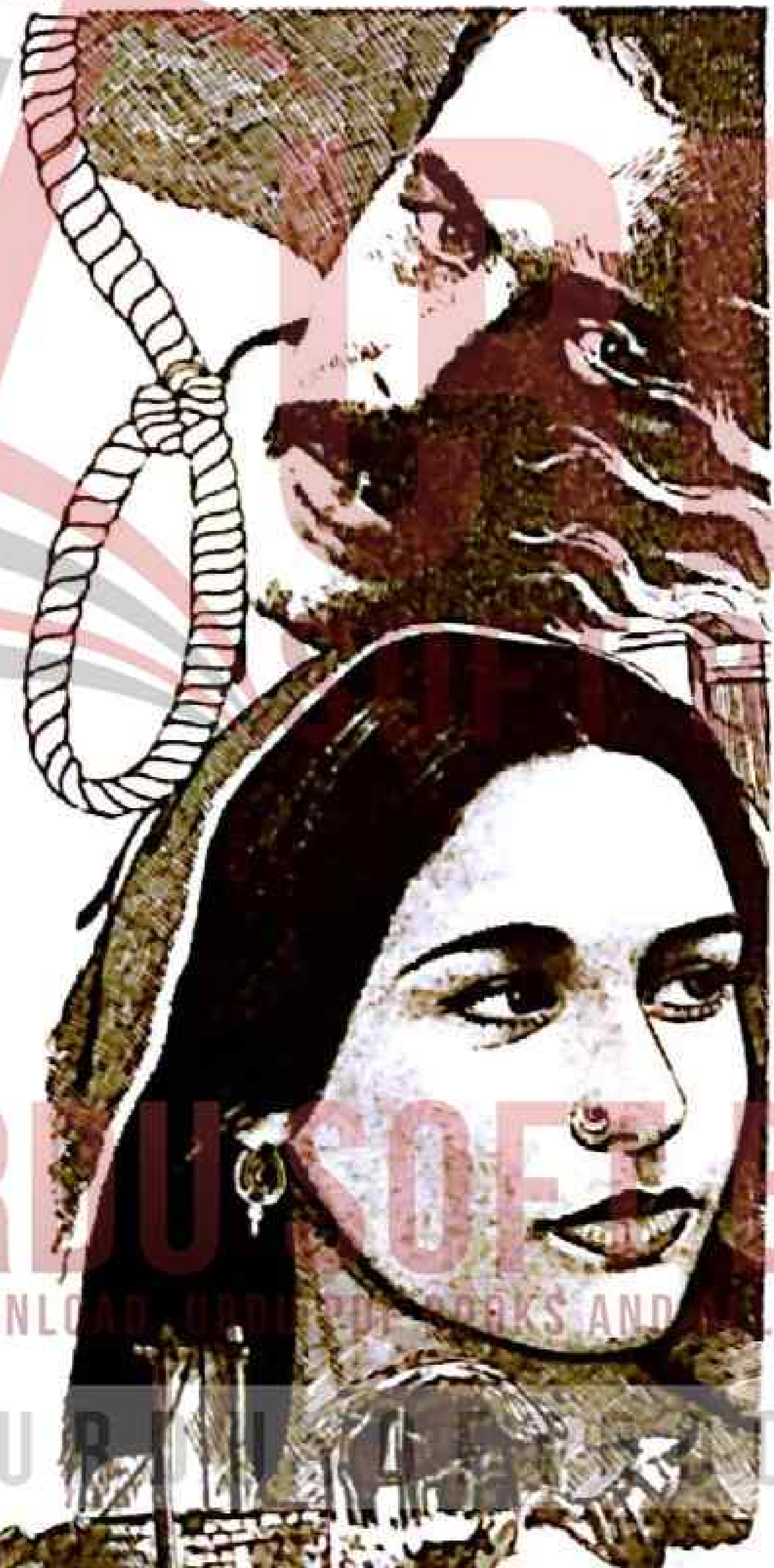

URDUSOFTBOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

مہندی بھی لگائی ہے لیکن بچپن والی خوشی سے محروم ہوں۔ کیوں؟ اس کا جواب دینے کے لیے اپنا تعارف کرادوں:

میرا نام مریم ہے۔ میں نصیبوں جلی بیس سال کی عمر میں بیوہ ہوکر باپ کے گھر آگئی۔ ہوا یہ تھا کہ میرے شوہر کا زمیندار سے جھگڑا ہوگیا۔ بات بہت معمولی تھی لیکن بڑھتے بڑھتے فساد کی شکل اختیار کرگئی۔ جس کی ابتداء زمین کو پانی دینے سے ہوئی تھی۔ اس روز میرے شوہر کی باری تھی۔ وہ رات کو ہی کھیتوں پر چلا گیا تھا لیکن وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ اس کا پانی چوری ہو رہا ہے، بڑے زمیندار کے کارندوں نے اس کا پانی روک کر اس کا رخ اپنی زمینوں کی طرف کرلیا ہے۔ یہ دیکھ کر میرا شوہر جمال خان مشتعل ہوگیا۔ اس نے بیلچہ اٹھا کر جوابی کارروائی کی اور زمیندار کا پانی بند کر کے اس کا رخ اپنی جانب کرلیا۔ ابھی وہ اس کام سے فارغ ہوا ہی تھا کہ زمیندار کا چھوٹا بیٹا نذیر اپنے آٹھ اس کارندوں کے ہمراہ آگیا۔ وہ پہلے ہی چھٹا ہوا بدمعاش تھا اور گاؤں کے سب لوگ اس سے پناہ مانگتے تھے۔ وہ کیسے برداشت کرسکتا تھا کہ کوئی اس کی زمینوں کا پانی روکے۔ اس نے کڑک دار آواز میں جمال خان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”اوئے تیری یہ مجال کہ تو نے ہمارا پانی بند کیا؟“

جمال نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ”آج میری باری ہے۔ تم نے کیوں میرا پانی اپنی طرف کیا تھا؟“

”بڑا آیا بہادر کا بچہ۔“ نذیر دانت پیستے ہوئے بولا۔ ”چلو جی اپنا پانی کھولو۔“ اس نے اپنے کارندوں کو حکم دیا۔

جیسے ہی وہ آگے بڑھے۔ جمال ان کے سامنے آگیا اور راستہ روکتے ہوئے بولا۔ ”خبردار اگر کسی نے میرا پانی بند کیا ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔“

نذیر نے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا اور وہ سب اس پر ٹوٹ پڑے۔ جمال اکیلا ان کا کہاں تک مقابلہ کرتا۔ وہ سب اس پر لاٹھیاں اور بیلچے برسا رہے تھے پھر کسی کے بیلچے کا پھل اس کے سر پر لگا اور وہاں سے خون کا فوارہ پھوٹ پڑا۔ خون بہتا دیکھ کر وہ سب جائے وقوعہ سے فرار ہوگئے۔ صبح چوکیدار نے اس کی لاش کھیتوں میں دیکھی تو دوڑتا ہوا جمال کے باپ کے پاس آیا۔ اسے یہ جاننے میں دیر نہیں لگی کہ اس واقعے میں کس کا ہاتھ ہے لیکن اس نے زبان سے کچھ کہنے کی بجائے پولیس کو اطلاع دینا ضروری سمجھا۔ پولیس آئی اور ضروری کارروائی کے بعد لاش ورثاء کے حوالے کردی گئی۔

گاؤں کے سب لوگ جانتے تھے کہ جمال کو مارنے والے کون ہیں لیکن زمیندار کے ڈر سے کسی میں زبان کھولنے کی ہمت نہ تھی۔ قتل کا کوئی عینی شاہد یا ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے تھانے دار نے کیس داخل دفتر کردیا۔ جمال کا چھوٹا بھائی پشاور میں کاروبار کرتا تھا۔ اس نے زمین بٹے پر دے دی اور ماں باپ کو اپنے ساتھ لے گیا۔ وہ جانتا تھا کہ نذیر منتقم مزاج بندہ ہے۔ جمال کا خون بہا کر بھی اس کی انا کو تسکین نہیں ہوئی ہوگی اور وہ بعد میں بھی اس کے باپ کو تنگ کرتا رہے گا۔ مریم کو اس کے میکے بھیج دیا گیا۔

میرے بابا زمیندار کے مزارع تھے۔ بیٹیوں کی شادیوں میں مقروض ہو جانے کی وجہ سے ان کی اپنی زمین گروی رکھی ہوئی تھی اور وہ بہت زیادہ محنت و مشقت کے باوجود اتنے پیسے نہ جوڑ سکے کہ اپنی زمین واپس لے سکتے۔ میری ماں مرچکی تھی اور زمیندار کے ہاں سے جو کچھ ملتا وہ اس میں اپنا گزارہ کرنے پر مجبور تھے۔

میرے آنے کے بعد انہیں کئی فکریں لاحق ہوگئیں۔ پہلی بات تو یہ کہ وہ مجھے کھلائیں گے کہاں سے ان کا تو اپنا گزارہ ہی بڑی مشکل سے ہوتا تھا۔ دوسرے یہ کہ وہ مجھے ساری عمر اپنے پاس نہیں رکھ سکتے تھے۔ ان کی زندگی کا بھی کوئی بھروسا نہیں تھا۔ پھر میں کہاں جاتی اور کیا کرتی۔ اسی لیے وہ چاہ رہے تھے کہ عدت پوری ہونے کے بعد وہ میرا عقد ثانی کردیں کیونکہ میں بہت خوب صورت تھی اور وہ مجھے بھیڑیوں سے نہیں بچا سکتے تھے لیکن وہ جو کچھ سوچ رہے تھے اس کا پورا ہونا بہت مشکل تھا کیونکہ گاؤں کا کوئی بھی شخص ایک بیوہ سے شادی کرنے پر تیار نہ ہوتا۔ دوسری بڑی وجہ یہ تھی کہ میرے مرحوم شوہر نے نذیر کو للکارا تھا۔ اس کی سزا اسے فوراً ہی مل گئی۔ اس کے باوجود نذیر کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوا کیونکہ میرے سسر نے اس کے خلاف پرچا کاٹنے کی درخواست کی تھی۔ زمیندار کے اثر و رسوخ کی وجہ سے تھانے دار نے پرچا تو نہیں کاٹا لیکن نذیر اس کے خاندان کو اپنا دشمن سمجھنے لگا۔ سسر کے شہر چلے جانے کے بعد اس نے پٹواری کو ساتھ ملا کر اس کی زمین پر قبضہ کرلیا اور وہ مجھے بھی کوئی نقصان پہنچا سکتا تھا۔ ایسی عورت سے کون شادی کرتا۔

پھر وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ ایک رات نذیر اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ہمارے گھر میں داخل ہوا۔ اس نے بابا کو چارپائی پر لٹا کر رسیوں سے باندھا اور ان کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا۔ پھر وہ مجھے دوسرے کمرے میں لے گیا اور رات بھر میرے ساتھ زیادتی کرتا رہا۔ فجر کی اذان سے پہلے وہ اور

اس کے ساتھی چلے گئے۔ جاتے جاتے اس نے دھمکی دی کہ اگر اس نے کسی سے اس بات کا تذکرہ کیا تو وہ میرے بابا کو جان سے مار دے گا۔

میں بہت دیر تک یونہی بے سدھ پڑی رہی۔ جب ہوش و حواس بحال ہوئے تو اپنا لباس درست کر کے بابا کے پاس آئی۔ وہ اسی طرح لیٹے ہوئے تھے۔ میں نے ان کے منہ سے کپڑا نکالا اور جسم کو رسیوں سے آزاد کیا۔ پھر بھی انہوں نے کوئی حرکت نہیں کی۔ میں نے انہیں ہلایا جلایا۔ آوازیں دیں لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ رات کے کسی پہر ان کی روح جسم کا ساتھ چھوڑ چکی تھی۔ میں دھاڑیں مار مار کر رونے اور بین کرنے لگی۔ گاؤں میں دیوار سے دیوار ملی ہوئی ہوتی ہے۔ میرے رونے کی آواز سن کر منٹوں میں پورا محلہ جمع ہو گیا۔ عورتیں مجھے سنبھالنے میں لگ گئیں اور مردوں نے تجہیز و تکفین کی تیاری شروع کر دی۔ ظہر کی نماز پر بابا کو دفنا دیا گیا اور شام ہونے تک عورتیں بھی اپنے گھروں کو چلی گئیں۔

مغرب کے بعد پڑوسن میرے لیے کھانا لے کر آئی تو اس کے بے حد اصرار پر میں نے دو چار لقمے زہر مار کر لیے۔ وہ برتن لے کر جانے لگی تو میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر التجا آمیز لہجے میں کہا۔ ”خالہ! آج میرے پاس رک جاؤ۔ مجھے اکیلے میں ڈر لگے گا۔“

”بیٹی! میں ضرور رک جاتی لیکن بہو بیمار ہے۔ اس لیے میرا گھر پر رہنا ضروری ہے۔“ پھر اس نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تو دروازہ بند کر کے سو جا اللہ مالک ہے۔“

اس کے جانے کے بعد میں نے سوچا کہ اگر آج خالہ میرے کہنے سے رک جاتی تو بھی کیا ہوتا۔ وہ روز تو ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ بالآخر مجھے تنہا ہی رہنا تھا۔ وہ پوری رات میں نے جاگ کر گزاری۔ پتا بھی کھڑکتا تو میرا دل ہولنے لگتا۔ جانتی تھی کہ نذیر دوبارہ آئے گا۔ اب تو بابا بھی نہیں رہے تھے۔ وہ بڑی آسانی سے آ کر مجھے روند سکتا تھا۔ رات بھر یہی سوچتی رہی کہ کہاں جاؤں۔ کیا کروں۔ ایک مرتبہ تو اس کی درندگی کا نشانہ بن چکی تھی لیکن بار بار اس کی ہوس پوری نہیں کر سکتی تھی۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ دل بھر جانے کے بعد وہ مجھے اپنے کارندوں کے آگے ڈال دیتا اور وہ میری بوٹیاں نوچتے رہتے۔ یہ گاؤں میرے لیے قطعی غیر محفوظ ہو چکا تھا۔ اس لیے میں نے جلد از جلد یہاں سے نکلنے کا فیصلہ کر لیا۔

دوسرے دن گاؤں کی عورتیں وقفے وقفے سے میرا حال پوچھنے آتی رہیں۔ سب کو یہی فکر ستائے جا رہی تھی کہ میں تنہا کس طرح رہوں گی۔ وہ مجھے بھانت بھانت کے مشورے دے رہی تھیں لیکن کسی کو اتنی توفیق نہیں ہوئی کہ وہ چند روز کے لیے مجھے اپنے گھر رکھنے پر تیار ہو جاتی۔ پڑوسن دوپہر کا کھانا لے کر آئی تو اس نے کہا کہ اگر مجھے اپنے سسر یا دیور کا پتا معلوم ہے تو میں ان کے پاس چلی جاؤں۔ اسی وقت میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ حالانکہ مجھے ان کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا کہ وہ لوگ کہاں رہتے ہیں لیکن میں نے لاعلمی ظاہر کرنے کی بجائے کہا۔ ”ہاں خالہ! میں بھی یہی سوچ رہی ہوں۔“

یہ میں نے اس لیے کہا کہ اگر مجھے بحالت مجبوری گاؤں سے جانا پڑا تو لوگ یہی سمجھیں کہ سسر کے پاس چلی گئی ہوں۔ پڑوسن کے جانے کے بعد میں نے اٹھ کر بابا کی چیزوں کی تلاشی لی تو مجھے ایک پلاسٹک کے ڈبے میں چند نوٹ ملے۔ میں نے انہیں اپنے دوپٹے کے پلو میں باندھ لیا اور آئندہ کا لائحہ عمل طے کرنے لگی۔ میں نے گھڑی کی چوتھائی میں گاؤں چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ گاؤں سے نکل کر کہاں جاؤں گی۔ کیا کروں گی لیکن میں گاؤں میں رہ کر مزید برباد ہونا نہیں چاہتی تھی۔ اس سے تو بہتر تھا کہ میں لاری اڈے پر بیٹھ کر بھیک مانگ لوں۔ دارالامان چلی جاؤں یا گھر میں جھاڑو پوچھا کر کے پیٹ کا دوزخ بھر دوں۔ یہ سوچ کر میں نے پشاور جانے کا فیصلہ کیا۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی معجزہ رونما ہو جائے اور میں اپنے سسر تک پہنچ جاؤں۔

اس رات بھی جاگتی رہی۔ فجر سے ذرا پہلے اٹھی۔ وضو کر کے نماز پڑھی۔ لباس تبدیل کر لیا۔ جسم کو اچھی طرح ڈھانپا اور اپنی پوٹلی بغل میں داب کر گھر سے نکل پڑی۔ اس وقت مسجد میں فجر کی نماز ہو رہی تھی اور گلیوں میں سناٹا تھا۔ میں نے چادر کا کونا چہرے کے گرد نقاب کی طرح لپیٹا اور کھیتوں میں راستہ بناتی ہوئی اس سڑک کی جانب بڑھنے لگی جس پر لاریاں چلتی تھیں۔ اس وقت اگر کوئی مجھے دیکھ لیتا تو یہی سمجھتا کہ میں رفع حاجت کے لیے جا رہی ہوں۔ نذیر اور اس کے ساتھیوں کی جانب سے مجھے ڈر نہیں تھا کیونکہ وہ سب رات بھر عیاشی کرتے اور دن میں دیر تک سوتے تھے۔ میں بخیر و عافیت سڑک تک پہنچ گئی اور چند منٹ بعد بس بھی آ گئی۔ اس کے شیشے پر پشاور لکھا ہوا تھا۔ میں نے رکنے کا اشارہ کیا اور اس میں سوار ہو گئی۔

صبح کے وقت بس میں زیادہ مسافر نہیں تھے۔ اس لیے میں بڑے آرام سے زنانہ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ چند منٹوں بعد ہی کنڈیکٹر کرایہ لینے آ گیا۔ میں نے پیسے نکالنے کے لیے چادر کا پلو پکڑا لیکن وہاں کچھ نہیں تھا میری تو سٹی گم ہو گئی۔ دراصل میں

نے لباس تبدیل کرتے وقت وہ دوپٹا گھر میں ہی چھوڑ دیا جس میں پیسے بندھے ہوئے تھے اور جلدی میں چادر لپیٹ کر چلی آئی۔ یا اللہ اب میں کیا کروں؟

مجھے رونا آگیا۔ کنڈیکٹر سے صبر نہیں ہو رہا تھا۔ وہ تیز آواز میں بولا۔ ”جلدی کرو بی بی دیر ہو رہی ہے۔“

میں نے ڈبڈبائی آنکھوں سے اسے دیکھا اور بولی۔ ”بھائی پیسے تو گھر میں رہ گئے۔“

وہ ترخ کر بولا۔ ”پھر تم کیوں آگئیں۔ گھر میں ہی رہتیں۔ بہت دیکھے ہیں ایسے ڈرامے چلو اترو۔“

یہ کہہ کر وہ ڈرائیور سے بولا۔ ”گاڑی روکو استاد۔“

پیچھے نشستوں پر بیٹھا ہوا ایک شخص یہ ساری گفتگو سن رہا تھا۔ اس نے کنڈیکٹر سے کہا۔ ”کچھ تو خیال کرو۔ یہ بے چاری اس ویرانہ میں اتر کر کہاں جائے گی۔“

”اگر اتنی ہی ہمدردی ہے تو تم اس کا کرایہ دے دو۔“ کنڈیکٹر نے انتہائی بدتمیزی سے کہا۔

”ہاں ہاں دے دوں گا۔“ اس آدمی نے کہا پھر اس نے جیب سے بٹوہ نکالا اور چند نوٹ کنڈیکٹر کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔

میں بے بسی سے بیٹھی یہ تماشا دیکھ رہی تھی۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کا شکریہ کیسے ادا کروں اگر وہ میری مدد نہ کرتا تو کنڈیکٹر واقعی مجھے اس ویرانہ میں اتار دیتا اور جنگلی جانور مجھے چیر پھاڑ کر رکھ دیتے یا میں کسی بدمعاش کے ہتھے چڑھ جاتی۔ میں انہی خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی کہ مجھے بس رکنے کا بھی پتا نہیں چلا۔ سب مسافر ایک ایک کر کے اتر گئے لیکن میں اسی طرح بیٹھی رہی۔ تب اس شخص نے کھنکھار کر کہا۔ ”کیا اسی بس سے واپس جانے کا ارادہ ہے؟“

”اوہ!“ میں چونک اٹھی اور اپنی پوٹلی بغل میں داب کر بس سے اتر گئی۔ اس آدمی نے مجھ سے پوچھا:

”کہاں جاؤ گی؟“

”پتا نہیں۔“ میں نے آہستہ سے کہا۔

”اوہ میں سمجھ گیا۔“ اس نے ہونٹ سکیڑے اور بولا۔

”آؤ میرے ساتھ۔“

میں تھوڑا سا جھجکی اور سوچنے لگی کہ نہ جانے یہ کون ہے اور مجھے کہاں لے جا رہا ہے لیکن میں اپنی کشتیاں جلا کر آئی تھی اور میرے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ وہ دیکھنے میں شریف اور معزز لگ رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ چلو اس پر اعتبار کر کے دیکھتی ہوں۔ ہونا تو وہی ہے جو میری قسمت میں لکھ دیا گیا ہے۔

وہ مجھے ٹیکسی میں بٹھا کر درمیانہ درجے کے ایک ہوٹل میں لے گیا اور بولا کہ تمہارے پاس شناختی کارڈ ہے۔ اتفاق سے میں نے کارڈ ایک دن پہلے ہی ساتھ رکھ لیا تھا۔ جانتی تھی کہ قدم قدم پر اس کی ضرورت پڑے گی۔ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس نے میرے نام سے ایک کمرا بک کروایا اور مجھے وہاں پہنچانے کے بعد بولا۔ ”تم نہا دھو کر فریش ہو جاؤ، پھر ناشتا منگواتے ہیں۔“

اچانک ہی اسے کچھ یاد آگیا۔ اس نے گھڑی دیکھی اور بولا۔ ”اوہو۔ مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔ میں ناشتے کے لیے کہہ دیتا ہوں۔ کھانا بھی تم آدم سروس سے ہی منگوا لینا۔ میں ریسپشن پر کہہ دوں گا۔ کسی بھی صورت میں کمرے سے باہر جانے کی ضرورت نہیں۔ میں شام کو آؤں گا پھر اطمینان سے باتیں کریں گے۔“

جتنی دیر وہ بیٹھا رہا۔ میں نے چہرے سے نقاب نہیں ہٹایا۔ اس کے جانے کے بعد میں باتھ روم میں گئی۔ منہ ہاتھ دھو لیا۔ اتنی دیر میں بیرا ناشتا لے کر آگیا۔ میں نے زندگی میں کبھی ایسا پرتکلف ناشتا نہیں دیکھا تھا۔ گھر میں تو رات کی بچی ہوئی روٹی اور چائے پر ہی اکتفا کرنا پڑتا تھا۔ البتہ شوہر کے گھر میں کبھی کبھی پراٹھا بنا لیا کرتی تھی لیکن یہاں تو ٹرے بھری ہوئی تھی۔ اورنج جوس، سلائس، مکھن، انڈے، چائے سے میں نے ڈٹ کر ناشتا کیا اور کمرا بند کر کے بستر پر دراز ہو گئی۔

میں گہری نیند سو رہی تھی کہ دروازہ پر دستک سے میری آنکھ کھل گئی۔ وال کلاک پر نگاہ ڈالی۔ ایک بج رہا تھا۔ میں سمجھ گئی کہ روم سروس والا ہوگا۔ پھر بھی میں نے دروازہ کھولنے سے پہلے پوچھ لیا۔

باہر سے جواب آیا۔ ”روم سروس۔“

میں نے دروازہ کھول دیا۔ اندر آ کر اس نے کھانے کی ٹرے تپائی پر رکھی۔ فریج سے پانی کی بوتل اور گلاس نکالا پھر بولا۔ ”میڈم! چائے پینا پسند کریں گی۔“

میں نے کہا۔ ”نہیں تم آدھ گھنٹے بعد برتن لے جانا۔ میں کچھ دیر آرام کروں گی۔“

کھانا بھی بے حد عمدہ اور لذیذ تھا۔ چکن بریانی، مٹن قورمہ، نان، سلاد، کھیر اور کولڈ ڈرنک۔ میں نے خوب سیر ہو کر کھایا اور بیرے کے آنے کا انتظار کرنے لگی۔ کمرے میں ٹی وی بھی تھا لیکن مجھے چلانا نہیں آتا تھا۔ بیرا کھانے کے برتن لے کر چلا گیا تو میں ایک بار پھر بستر پر دراز ہو گئی۔ اب مجھے

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

اس آدمی کا انتظار تھا۔ وہ وعدے کے مطابق ٹھیک چھ بجے آگیا۔ اس بار بھی میں نے پوچھ کر دروازہ کھولا۔ اتفاق سے اس وقت میرے چہرے پر نقاب نہیں تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ ٹھٹک گیا۔ جیسے اس کی سانس رک گئی ہو۔ وہ چند لمحے یونہی ساکت کھڑا رہا پھر اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے بولا۔ ''اوہ میرے خدا! تم کتنی خوب صورت ہو تمہیں تو واقعی نقاب کے بغیر باہر نہیں نکلنا چاہیے۔''

میرا مرحوم شوہر بھی یہی کہا کرتا تھا اور میں سمجھتی تھی کہ وہ میری خوب صورتی سے جلتا ہے۔ اسی لیے میں نے کبھی اس کی بات کو اہمیت نہیں دی لیکن اس آدمی کی زبان سے یہ جملہ سن کر مجھے احساس ہوا کہ بعض اوقات بہت زیادہ خوب صورت ہونا بھی عورت کے لیے عذاب بن جاتا ہے۔

وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''تم نے چائے پی؟''

میں نے نفی میں سر ہلایا تو اس نے روم سروس کو فون کر کے چائے منگوائی اور بولا۔ ''اب تم اپنے بارے میں تفصیل سے بتاؤ۔''

''اس آدمی نے صبح سے اب تک میرے ساتھ جو برتاؤ کیا تھا۔ اس کے پیشِ نظر میں نے اسے اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ البتہ نذیر نے میرے ساتھ جو زیادتی کی تھی وہ حصہ میں نے حذف کر دیا۔ صرف اتنا کہا کہ نذیر نے میرے شوہر کو قتل کرنے کے بعد پیچھا نہیں چھوڑا اور وہ میری عزت کے درپے ہو گیا تھا۔ اسی لیے بابا کے مرنے کے بعد میں اس کے خوف سے گاؤں چھوڑ کر چلی آئی۔''

''ہوں۔'' وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ''اب کہاں جاؤ گی؟''

میں نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ ''آپ مجھ پر ایک احسان اور کر دیں۔ کسی طرح مجھے سسر تک پہنچا دیں وہ ضرور مجھے پناہ دیں گے۔''

''ان کا پتا یا فون نمبر ہے تمہارے پاس؟''

''نہیں۔''

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''تم بہت بھولی ہو، اتنے بڑے شہر میں فون نمبر یا پتا کے بغیر کسی کو تلاش کرنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکنات میں سے ہے اور ویسے بھی اگر انہیں تمہارا خیال ہوتا تو وہ یوں دشمنوں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر نہیں جاتے۔ کم از کم تمہارے باپ کے مرنے کے بعد تو انہیں آنا چاہیے تھا۔''

''آپ اخبار میں میری تصویر چھپوا دیں۔ ہو سکتا ہے۔ اسے دیکھ کر وہ مجھ تک پہنچ جائیں۔''

''اور اگر ان سے پہلے نذیر نے یہ تصویر دیکھ لی تو؟''

نذیر کا نام سن کر میں سر سے پیر تک کانپ گئی اور بولی۔

''پھر میں کہاں جاؤں؟''

''ٹھہرو۔ مجھے کچھ سوچنے دو۔''

جب بہت دیر تک اس نے کوئی بات نہیں کی تو میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ''آپ مجھے اپنے گھر لے چلیں۔ میں نوکرانی بن کر رہوں گی۔ گھر کے سارے کام کروں گی۔ کھانا پکانا، کپڑے، برتن دھونا، گھر کی صفائی سب کچھ کروں گی۔ آپ بے شک مجھے تنخواہ بھی نہ دیں۔ صرف دو وقت کی روٹی اور سر چھپانے کے لیے جگہ چاہیے۔''

''تم اتنی خوب صورت ہو کہ میری بیوی تمہیں ایک منٹ کے لیے بھی برداشت نہیں کرے گی۔ وہ انتہائی شکی اور بدمزاج عورت ہے۔ میں گھر میں کوئی جھگڑا نہیں کھڑا کرنا چاہتا۔''

''پھر آپ مجھے کسی ایسی جگہ چھوڑ دیں جہاں بے سہارا عورتیں رہتی ہیں۔''

''نہیں، وہ جگہ بھی تمہارے لیے مناسب نہیں۔''

''پھر میں کیا کروں؟'' میں روہانسی ہوتے ہوئے بولی۔

''اگر تم کچھ دیر کے لیے خاموش رہو اور مجھے کچھ سوچنے کا موقع دو تو شاید میں تمہارے مسئلے کا کوئی حل تلاش کر سکوں۔''

اس نے کچھ ایسے انداز میں یہ بات کہی کہ میں سہم گئی اور کافی دیر تک خاموش بیٹھی رہی۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا تھا۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد اس نے سر اٹھایا اور بولا۔

''اس کا ایک ہی حل ہے۔''

''وہ کیا؟'' میں جلدی سے بولی۔

''تم شادی کر لو۔''

''یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ، میں تو یہاں کسی کو بھی نہیں جانتی، کون کرے گا مجھ سے شادی؟''

''کوئی نہ کوئی مل ہی جائے گا۔'' اس نے معنی خیز انداز میں کہا پھر سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔ ''دیکھو مریم! شادی تو تمہیں کرنا ہوگی۔ اس وقت تم بالکل غیر محفوظ اور بے سہارا ہو۔ تمہارا کوئی گھر ہے اور نہ کوئی عزیز رشتے دار جہاں تمہیں پناہ مل سکے۔ ان حالات میں تمہیں صرف شوہر کے گھر میں ہی تحفظ مل سکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم کچھ دن اسی ہوٹل میں قیام کرو۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

میں تمہارے لیے کوئی رشتہ دیکھتا ہوں۔"

مجھے ہنسی آگئی۔ اس نے اس انداز میں یہ بات کہی جیسے شوہر دکانوں پر ملتے ہیں۔ وہ بازار جائے گا اور میرے لیے ایک عدد شوہر لے کر آجائے گا۔ میں نے بات بدلتے ہوئے کہا۔ "مجھے تو یہ جگہ بھی محفوظ نہیں لگتی۔ ہر وقت یہی دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کہیں نذیر مجھے ڈھونڈتا ہوا یہاں تک نہ پہنچ جائے۔ ویسے بھی ہوٹل کا بل بہت زیادہ بن جائے گا۔ نہ جانے کب تک یہاں رہنا پڑے۔"

"اس کی تم فکر نہ کرو۔ بہت پیسا ہے میرے پاس، تھوڑے بہت تم پر خرچ کردوں گا تو کوئی کمی نہیں آجائے گی۔ البتہ اگر تم اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھتی ہو تو میں تمہارے لیے کسی دوسری جگہ کا بندوبست کرتا ہوں۔"

میں پوچھنا چاہ رہی تھی کہ وہ کیا کام کرتا ہے اور مجھ پر اتنا مہربان کیوں ہو رہا ہے لیکن اس سے پہلے ہی اس نے جیب سے ایک کارڈ نکال کر مجھے دیا اور بولا۔ "یہ رکھ لو۔ ضرورت پڑنے پر مجھے فون کرسکتی ہو۔"

میں نے کارڈ الٹ پلٹ کر دیکھا۔ اس پر ایک طرف انگریزی اور دوسری طرف اردو میں لکھا ہوا تھا۔

"شاہجہاں اینڈ کمپنی۔ امپورٹرز ایکسپورٹرز۔ نیچے تین چار فون نمبر درج تھے۔ میں پرائمری پاس تھی اور انگریزی نہیں پڑھ سکتی تھی۔ البتہ اردو عبارت میری سمجھ میں آگئی۔ میں نے پوچھا۔ "امپورٹرز ایکسپورٹرز کا کیا مطلب ہے تو وہ ایک آنکھ میچتے ہوئے بولا۔ "اِدھر کا مال اُدھر۔ اُدھر کا مال اِدھر۔"

میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا تو اس نے کہا۔ "اگر مجھے فون کرنا ہو تو ریسیور اٹھا کر زیرو ڈائل کرنا۔ تمہارا رابطہ آپریٹر سے ہوجائے گا۔ وہ تمہیں میرا نمبر ملا دے گا۔"

دوسرے دن وہ مجھے اپنے ساتھ ایک ہوسٹل میں لے گیا۔ جہاں دوسرے شہروں سے آنے والی ملازمت پیشہ خواتین اور یونیورسٹی کی طالبات رہائش پذیر تھیں۔ اس نے ریسپشن پر بتایا کہ میں گاؤں سے ملازمت کے سلسلے میں آئی ہوں اور مجھے رہائش کے لیے کمرا چاہیے۔ کاؤنٹر پر بیٹھی ہوئی لڑکی نے ایک فارم میری طرف بڑھایا۔ شاہ جہاں مجھے لے کر لاؤنج میں چلا گیا اور وہاں بیٹھ کر اس نے ہی وہ فارم بھرا اور مجھ سے دستخط کروانے کے بعد کاؤنٹر پر جمع کروا دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ایک ماہ کا کرایہ اور کھانے کے اخراجات بھی جمع کروا دیے۔ اس طرح مجھے ہوسٹل میں کمرا الاٹ ہوگیا۔

چلتے وقت اس نے مجھے کچھ روپے پکڑائے اور بولا۔ "احتیاطاً رکھ لو۔ ضرورت پڑ سکتی ہے۔ اب تم بالکل محفوظ ہو۔ نذیر کے فرشتے بھی یہاں نہیں پہنچ سکتے۔"

اس ہوسٹل میں مردوں کا داخلہ ممنوع تھا۔ مہمانوں کو لاؤنج تک آنے کی اجازت تھی۔ وہ وہیں بیٹھ کر اپنی باتیں کرتے اور چلے جاتے۔ اس کے لیے بھی وارڈن کی اجازت درکار تھی۔ ورنہ چوکیدار گیٹ سے ہی بھگا دیا کرتا تھا۔

دوسرے دن شام کو شاہجہاں آیا اور مجھے اپنے ساتھ شاپنگ کروانے لے گیا۔ اس نے میرے لیے کپڑے، جوتے، عبایا، بیگ، پرفیوم، میک اپ کا سامان اور نہ جانے کیا کیا خرید لیا۔ میں نہ نہ کرتی رہی لیکن اس نے میری ایک نہ سنی پھر وہ مجھے کھانا کھلانے ایک ریستوران میں لے گیا۔ اب میرے ضبط کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ کھانے کے دوران میں نے پوچھ ہی لیا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ مجھ پر اتنا کیوں خرچ کر رہے ہیں؟ آخر میرا کیا رشتہ ہے آپ سے؟"

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "انسانیت کا۔" پھر قدرے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہنے لگا۔ "دیکھو مریم! جب تک تمہیں کسی منزل تک نہیں پہنچا دیتا، تم میری ذمے داری ہو۔ میرے لیے بڑا آسان تھا کہ اس روز بس سے اتر کر اپنی راہ چل دیتا۔ لیکن میرے ضمیر نے یہ گوارہ نہیں کیا۔ میں پہلی نظر میں ہی سمجھ گیا تھا کہ تم ایک بے سہارا لڑکی ہو اور کسی مصیبت میں گرفتار ہو۔ لہٰذا میں نے تمہاری مدد کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ تمہارے حالات سننے کے بعد میرا اندازہ صحیح نکلا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن آپ کب تک میری مدد کرتے رہیں گے۔ اس سے تو بہتر ہے کہ آپ مجھے کسی کام پر لگا دیں تاکہ میں اپنا بوجھ خود اٹھا سکوں۔"

"تمہارے پاس تعلیم ہے نہ کوئی ہنر۔ گھروں میں ماسی کا کام کرنے کے علاوہ تم کیا کرسکتی ہو اور میں نہیں چاہتا کہ چند ہزار کی خاطر اپنے آپ کو رگڑو اور بیگمات کی جھڑکیاں کھاؤ۔ پھر تمہاری خوب صورتی بھی ایک مسئلہ ہے۔ بڑے گھروں کے مرد اور نوجوان لڑکے عیاش طبیعت ہوتے ہیں۔ وہ بھی تمہارے لیے خطرہ بن سکتے ہیں۔ تم چند روز انتظار کرلو۔ کوئی نہ کوئی حل نکل آئے گا۔"

واپسی میں اس نے مجھے ایک موبائل فون لے کر دیا اور بولا۔ "میرا روز روز آنا ٹھیک نہیں۔ بلاوجہ لوگ باتیں بنانا شروع کردیں گے۔ میں تم سے فون پر بات کرلیا کروں گا۔ اسی طرح تم بھی ضرورت پڑنے پر مجھ سے رابطہ کرسکتی ہو۔"

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور ہوسٹل واپس آ گئی۔ میرے پاس کرنے کے لیے کوئی کام نہیں تھا۔ دن بھر بستر میں پڑی رہتی یا لاؤنج میں جا کر ٹی وی دیکھ لیتی۔ شاہ جہاں تین چار دن بعد چکر لگاتا اور مجھے کھانا کھلانے لے جاتا۔ میں ہمیشہ عبایا اور نقاب میں اس کے ساتھ باہر جاتی تھی۔ اس طرح ایک مہینا گزر گیا۔ میں انتظار ہی کرتی رہی کہ کسی دن شاہ جہاں مجھے رشتہ ملنے کی خوش خبری سنائے گا لیکن میرا انتظار طویل ہوتا چلا گیا۔

پھر ایک روز ایسا واقعہ پیش آیا جس نے میری پریشانی میں مزید اضافہ کر دیا۔ میں شام کے وقت لاؤنج میں بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی کہ ایک لڑکی میرے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ وہ میرے برابر والے کمرے میں رہتی تھی۔ اس نے رسمی علیک سلیک کے بعد کہا۔ ”ایک بات پوچھوں۔ مائنڈ تو نہیں کرو گی؟“

”نہیں پوچھو۔ کیا بات ہے؟“

”تمہیں یہاں آئے ہوئے ایک مہینا ہو گیا ہے لیکن میں نے تمہیں ایک دفعہ بھی باہر جاتے نہیں دیکھا۔ کیا تم جاب نہیں کرتیں؟“

”ہاں میری جاب ختم ہو گئی ہے۔ دوسری ڈھونڈ رہی ہوں۔ کئی جگہ درخواست دے رکھی ہے لیکن ابھی تک کہیں سے جواب نہیں آیا۔“

”اور یہ صاحب کون ہیں۔ جن کے ساتھ تم اکثر شام کو باہر جاتی ہو؟“

”وہ میرے دور پرے کے عزیز ہیں۔ اس وقت وہی مجھے سپورٹ کر رہے ہیں۔“

”اوہ تو یہ بات ہے۔“ وہ آہستہ سے بولی۔ ”تمہیں معلوم ہے کہ یہاں صرف ملازمت پیشہ خواتین اور طالبات رہ سکتی ہیں۔ اگر انتظامیہ کو پتا چل گیا کہ تم جاب نہیں کرتیں تو تمہیں یہاں سے جانا پڑ جائے گا۔“

میں نے کمرے میں آ کر فوراً ہی شاہ جہاں کو فون کر کے یہ بات بتائی۔ اس نے مجھے تسلی دی اور کہا کہ میں تیار رہوں۔ وہ مجھے لینے آ رہا ہے۔ تھوڑی دیر بعد میں اس کے ساتھ ایک ریستوران میں بیٹھی کھانا کھا رہی تھی۔ کھانا ختم کرنے کے بعد اس نے چائے منگوائی اور گلا صاف کرتے ہوئے بولا۔ ”مریم! مجھے افسوس ہے کہ کوشش کے باوجود تمہارے لیے کوئی مناسب لڑکا نہیں ڈھونڈ سکا۔ میں تمہیں کسی مالی یا ڈرائیور کے پلے نہیں باندھ سکتا۔ میری خواہش تھی کہ کوئی مڈل کلاس لڑکا مل جائے وہ تمہاری قدر کرے لیکن آج کل ایسے لڑکے مشکل سے ملتے ہیں۔ پھر تمہارا پس منظر بھی رکاوٹ بنا ہوا ہے۔ تم بیوہ ہونے کے ساتھ ساتھ لاوارث ہو۔ میں نے جن دو چار لوگوں سے بات کی وہ بھی پلٹ کر نہیں آئے۔“

میں یہ سن کر رونے لگی اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”آپ مجھے ایدھی سینٹر میں چھوڑ دیں۔ میں زندگی کے دن وہاں پورے کر لوں گی۔“

”فضول باتیں مت کرو۔“ وہ ناگواری سے بولا۔ ”ابھی میری بات ختم نہیں ہوئی۔ ہر مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل ہوتا ہے اور میں نے بھی اس کا ایک حل تلاش کر لیا ہے۔ میری بات غور سے سنو۔ اگر منظور نہ ہو تو انکار کر دینا۔ تم پر کوئی دباؤ نہیں۔ میں پھر بھی تمہیں سپورٹ کرتا رہوں گا۔ دوسری صورت میں ہم اس پر مزید بات کر سکتے ہیں۔“

میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا تو وہ بولا۔ ”میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ بولو منظور ہے؟“

میں حیرت کے سمندر میں ڈوب گئی۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کی بات کا کیا جواب دوں۔ بڑی مشکل سے اتنا ہی کہہ سکی۔ ”لیکن آپ..... آپ تو شادی شدہ ہیں؟“

”ہاں! صرف شادی شدہ ہی نہیں بلکہ دو بچوں کا باپ بھی ہوں۔ میری بیوی کا خاندان بہت دولت مند اور اثر رسوخ والا ہے اگر میرے سالوں کو پتا چل گیا کہ میں نے دوسری شادی کر لی ہے تو وہ میری بوٹیاں کر کے چیل کوؤں کو کھلا دیں گے۔“

”پھر آپ یہ خطرہ کیوں مول لے رہے ہیں؟“

”اس کی دو وجوہات ہیں۔ ایک تو یہ کہ انسانی ہمدردی کے تحت تمہیں تنہا نہیں چھوڑ سکتا اور دوسری بڑی وجہ یہ کہ میں تمہاری خوب صورتی پر مرمٹا ہوں اور میں نہیں چاہتا کہ تم کسی دوسرے کے آنگن میں اپنے وجود کی خوشبو بکھیرو۔“

میں حیرانی کے عالم میں اسے دیکھ رہی تھی۔ اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”سچ تو یہ ہے کہ جب میں نے پہلی بار نقاب کے بغیر دیکھا۔ اسی وقت تم پر فریفتہ ہو گیا تھا۔ پھر جب تمہارے حالات معلوم ہوئے تو تم سے ہمدردی ہونے لگی۔ شروع شروع میں سنجیدگی سے تمہارے رشتے کے لیے کوشش کرتا رہا لیکن دھیرے دھیرے میرے دل میں تمہاری محبت جڑ پکڑنے لگی اور میں سوچنے لگا کہ کیوں نہ میں ہی تم سے شادی کر لوں۔ مجھ سے زیادہ تمہارا ہمدرد اور خیر خواہ کون ہو سکتا ہے۔ میں نے تمہارے سامنے اپنا دل کھولنے کا فیصلہ کر لیا۔“

اس کے لیے مناسب موقع کا انتظار کر رہا تھا اور میں سمجھتا ہوں کہ اب اس کے اظہار کا وقت آ گیا ہے۔ اب فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔ چاہو تو قبول کرلو یا انکار کردو۔ مجھے تمہارا ہر فیصلہ منظور ہوگا۔"

میں بے یقینی کے عالم میں اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ اسے کیا جواب دوں۔ میں نے اپنے حواس مجتمع کیے اور صرف اتنا کہہ سکی۔ "مجھے سوچنے کے لیے کچھ وقت چاہیے۔"

"ٹھیک ہے میں تمہارے جواب کا انتظار کروں گا۔"

ہوسٹل واپس آکر میں نے اس کے پروپوزل کے بارے میں سوچنا شروع کیا تو بہت سی باتیں واضح ہوتی چلی گئیں۔ اس وقت میں جن حالات سے گزر رہی تھی ان کے پیشِ نظر مجھے یہ تجویز غنیمت معلوم ہوئی۔ میں ایک بیوہ لاوارث عورت تھی جو اپنی آبرو بچانے کے لیے دشمنوں سے چھپتی پھر رہی تھی۔ اگر شاہ جہاں نہ ملتا تو میں سڑکوں پر بھیک مانگ رہی ہوتی یا انسان نما بھیڑیوں کے ہتھے چڑھ کر روز جیتی روز مرتی۔ اس سے شادی کر کے میں محفوظ ہو جاتی۔ مجھے نہ صرف یہ کہ چھت میسر آ جاتی بلکہ میں ایک پُرسکون اور پُرآسائش زندگی بسر کرسکتی تھی۔ سارا مسئلہ اس کی بیوی کا تھا اگر اسے اس شادی کا پتا چل جاتا تو وہ منٹوں میں مجھے گھر سے نکال دیتی لیکن شاہ جہاں نے بھی اس بارے میں ضرور سوچا ہوگا اور اس کے پاس اس کا کوئی نہ کوئی حل ضرور ہوگا۔

دوسرے دن میں ایک بار پھر اس کے ساتھ ریستوران میں بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے کوئی لگی لپٹی رکھے بغیر کہا۔ "میں آپ سے شادی کرنے کے لیے تیار ہوں لیکن میری ایک شرط ہے۔"

"وہ کیا؟" اس نے چونکتے ہوئے کہا۔

"نذیر میرے شوہر اور باپ کا قاتل ہے۔ اس نے میرے سسر کی زمینوں پر قبضہ کرلیا ہے اور اسی کے خوف سے میں اپنی جان بچاتی پھر رہی ہوں۔ یہ سب سوچ کر میری آنکھوں میں خون اتر آتا ہے میں راتوں کو سو نہیں سکتی۔ اس سے انتقام لینے کی خواہش نے مجھے بے چین کر رکھا ہے۔ میں ایک بے بس اور مجبور عورت ہوں۔ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی لیکن آپ پیسے والے ہیں اور پیسے میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ کیا آپ اس سے انتقام لینے میں میری مدد کریں گے؟"

"دیکھو سیما! میں تم سے کوئی جھوٹا وعدہ نہیں کروں گا۔ کاروبار کے علاوہ میں ایک سیاسی جماعت سے بھی تعلق رکھتا ہوں۔ اس لیے میں کھل کر کسی تنازع میں ملوث نہیں ہوسکتا۔ البتہ پس پردہ رہ کر میں تمہاری مدد ضرور کروں گا۔"

"آپ کو سامنے آنے کی ضرورت نہیں۔ سب کچھ میں کروں گی۔ بس آپ مجھے سپورٹ کرتے رہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ بولا۔ "اب میری بھی ایک دو شرطیں ہیں۔ پہلی یہ کہ ہماری شادی مکمل طور پر خفیہ رہے گی۔ تم کسی پر بھی یہ ظاہر نہیں کرو گی کہ میری بیوی ہو۔ دوم ہم بچہ پیدا نہیں کریں گے۔ کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ میرے بعد وراثت کا جھگڑا کھڑا ہو۔ اس کے عوض میں تمہیں ایک پُرآسائش زندگی دینے کا وعدہ کرتا ہوں۔"

دوسری شرط بہت سخت تھی۔ ماں بننا ہر عورت کی دلی آرزو ہوتی ہے۔ اس لیے اسے قبول کرنا ایک کٹھن مرحلہ تھا لیکن میں نے یہ کڑوا گھونٹ بھی پی لیا۔ میں خود بھی بچوں کے جھنجٹ سے دور رہنا چاہتی تھی۔ خدانخواستہ کل کو شاہ جہاں مر جائے یا بیوی کے دباؤ میں آ کر مجھے چھوڑ دے تو میں ان بچوں کو لے کر کہاں جاؤں گی۔

ہمارے درمیان تمام معاملات طے ہوگئے تو وہ بولا۔ "جمعے کے دن عصر اور مغرب کے درمیان ہمارا نکاح ہوگا۔ اس کے بعد میں تمہیں اسلام آباد لے جاؤں گا۔ وہیں ہم مستقبل کا لائحہ عمل طے کریں گے۔"

جمعے کے دن وہ مجھے اپنے ایک دوست کے گھر لے گیا۔ جہاں قاضی اور گواہ پہلے سے موجود تھے اور نکاح کے بعد ہم اسلام آباد روانہ ہوگئے۔ اس نے پہلے ہی ہوٹل میں کمرا بک کرا رکھا تھا۔ سہاگ رات ہم نے ہوٹل میں ہی منائی۔ ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد اس نے کہا۔ "میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تم اسلام آباد میں ہی رہوگی۔ یہاں بھی میرا ایک گھر ہے۔ وہ میں تمہارے نام کر دیتا ہوں۔ ایک ملازمہ چوبیس گھنٹے تمہارے ساتھ رہے گی۔ میرے کاروبار کی نوعیت ایسی ہے کہ میں زیادہ تر گھر سے باہر رہتا ہوں۔ اگر کوئی ایمرجنسی ہو تو مجھے فون کر کے بھی بلا سکتی ہو۔"

مجھے اس کی کسی بات سے اختلاف نہیں تھا۔ چاہے وہ اسلام آباد میں رکھے یا پشاور میں، مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ ہمارے معاشرے میں عورتیں عموماً گھروں میں ہی قید رہتی ہیں۔ انہیں گھر سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ مجھے یقین تھا کہ نئی جیل پہلے سے بہتر ہوگی۔

شام کو وہ مجھے گھر دکھانے کے لیے لے گیا۔ وہ دس مرلے پر بنا ہوا تین کمروں کا مکان تھا جس میں ہر سہولت

موجود تھی۔ اس کی نگرانی اور دیکھ بھال کے لیے چوکیدار موجود تھا۔ دوسرے دن سے مکان کی تزئین و آرائش کا کام شروع ہو گیا۔ ٹی وی، فریج، اے سی، واشنگ مشین اور دوسری تمام ضروری چیزیں خرید لی گئیں۔ ملازمہ کا بندوبست بھی ہو گیا۔ ہم پانچ دن ہوٹل میں رہے۔ اس کے بعد میں اپنے گھر میں شفٹ ہو گئی۔

جانے سے پہلے اس نے مجھے دس ہزار روپے دیئے اور کہا۔ ''میں نے ایک مہینے کا راشن ڈلوا دیا ہے۔ اس کے باوجود اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو چوکیدار سے منگوا سکتی ہو۔ اب تم اطمینان سے یہاں رہو۔ ٹی وی دیکھو، اخبار پڑھو، اب میں پندرہ دن بعد آؤں گا۔ البتہ ایک بات کا خیال رکھنا تمہیں پڑوسیوں سے میل جول بڑھانے کی ضرورت نہیں۔ اگر کوئی پڑوسن ملنے آئے تو رسمی گفتگو کے بعد اسے رخصت کر دینا۔''

میں اس کا اشارہ سمجھ گئی۔ وہ یہی چاہتا تھا کہ میں دنیا کی نظروں سے چھپ کر رہوں۔ میں نے وعدہ کر لیا۔ وہ میرے لیے اتنا کر رہا تھا تو کیا میں اس کی یہ بات بھی نہیں مان سکتی تھی۔

سچ پوچھیں تو میں نے ایسی زندگی کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ یہاں میں بالکل محفوظ تھی۔ اپنی مرضی سے سوتی اپنی مرضی سے جاگتی۔ روپے پیسے کی کوئی تکلیف نہیں تھی۔ دن بھر ٹی وی دیکھتی، اخبار پڑھتی پھر مجھے رسالے پڑھنے کا شوق ہو گیا۔ میں جب بھی شاہ جہاں کے ساتھ بازار جاتی تو دو چار ڈائجسٹ ضرور خریدتی۔ مطالعہ کرنے سے میرے ذہن میں کشادگی ہوتی گئی اور میں بہت سی باتیں سمجھنے کے قابل ہو گئی۔

اتنا کچھ ہونے کے باوجود میں کبھی کبھی بہت زیادہ بے چین ہو جاتی۔ اب مجھے شدت سے تنہائی کا احساس ہونے لگا تھا۔ میں اکثر سوچتی کہ اس دنیا میں، میں بالکل اکیلی ہوں۔ نہ ماں باپ نہ بہن بھائی اور نہ کوئی عزیز رشتے دار۔ شاہ جہاں کے علاوہ میرا کون ہے اگر وہ بھی نہ رہا یا اس نے مجھے چھوڑ دیا تو کیا ہوگا۔ میں کس کے سہارے جیوں گی۔

زندگی میں کچھ سکون آیا تو میرے دل میں نذیر سے انتقام لینے کی خواہش شدید ہوتی چلی گئی۔ اسے کیفرِ کردار تک پہنچائے بغیر میں چین سے نہیں رہ سکتی تھی۔ میں دن رات اس سے بدلہ لینے کی ترکیبیں سوچنے لگی۔ شاہ جہاں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ وہ سامنے نہیں آ سکتا لہٰذا مجھے ہی کچھ کرنا تھا۔

بہت سوچ بچار کے بعد میرے ذہن میں ایک طریقہ آ گیا۔ اس مرتبہ شاہ جہاں آیا تو میں نے اسے اس کا وعدہ یاد دلایا تو وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''میں تو سمجھ رہا تھا کہ تم اسے بھول گئی ہو گی۔''

میں وہ رات کیسے بھول سکتی تھی جب وہ کتوں کی طرح میرا جسم بھنبھوڑ رہا تھا۔ میں نے زبان سے کچھ نہیں کہا اور زبردستی مسکرانے کی کوشش کی پھر بولی۔ ''خان! ہم اپنے دشمن کا پیچھا قبر تک نہیں چھوڑتے۔''

وہ کاروباری بندہ تھا اور دشمنیاں پالنے کی بجائے دوستیاں بڑھانے پر یقین رکھتا تھا۔ کہنے لگا۔ ''تم ان چکروں میں کیوں پڑتی ہو۔ اس کا معاملہ اللہ پر چھوڑ دو۔ وہی انصاف کرنے والا ہے۔''

''نہیں خان! اسے کیفرِ کردار تک پہنچائے بغیر میں چین سے نہیں رہ سکتی۔''

''اچھا! تمہاری خاطر یہ بھی کر لوں گا۔ میں تو خود تو اسے جا کر گولی نہیں مار سکتا۔ اپنے ایک دوست سے بات کرتا ہوں۔ وہ ان کاموں میں ماہر ہے۔ کسی کرائے کے قاتل کے ذریعے اسے دوسری دنیا میں پہنچا دے گا۔''

''یہ تو بڑی آسان موت ہو گی۔ ایک ہی گولی میں اس کا کام تمام ہو جائے گا۔ میں اسے ویسی ہی اذیت دینا چاہتی ہوں جو اس نے جمال خان اور میرے باپ کو دی تھی۔ میں اسے برباد کر دوں گی۔ وہ مرنا چاہے گا لیکن اسے موت بھی نہیں آئے گی۔''

وہ طنزیہ انداز میں بولا۔ ''رسالے پڑھ پڑھ کر تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ مجھے تو تم خود کسی جاسوسی کہانی کا کردار لگ رہی ہو۔ ذرا میں بھی تو سنوں۔ وہ کون سا طریقہ ہے جس کے ذریعے تم اسے تڑپا تڑپا کر مارو گی؟''

میں اس کے طنز کو نظرانداز کرتے ہوئے بولی۔ ''بس آپ میرے لیے کسی ایسے وکیل کا بندوبست کر دیں جو اسے پھانسی کے پھندے تک پہنچا دے۔''

''تم کیا کرنا چاہ رہی ہو؟'' وہ الجھتے ہوئے بولا۔

''اس کے خلاف جمال خان اور اپنے باپ کے قتل کا مقدمہ دائر کروں گی۔ دوسرا مقدمہ میرے سسر کی زمین کا ہوگا جو اس نے ناجائز طریقے سے اپنے نام کروا رکھی ہے۔''

''نہیں۔'' وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''وکیل کی فیس دینا کوئی مسئلہ نہیں لیکن اس طرح تم منظرِ عام پر آ جاؤ گی۔ اس کے آدمی تمہیں عدالت کے احاطے میں ہی گولی مار دیں گے۔''

''یہ اتنا آسان نہیں اگر اس طرح ہونے لگے تو روزانہ عدالت کے احاطے میں لاشیں پڑی ہوں۔ ایف آئی آر کٹتے ہی میں عدالت سے سیکیورٹی مانگوں گی۔ باقی انتظام آپ کریں گے۔''

وہ بڑی مشکل سے راضی ہوا۔ دوسرے دن وہ مجھے ایک نامی گرامی وکیل کے پاس لے کر گیا۔ جب میں نے اسے الف سے ی تک ساری کہانی سنائی تو وہ بولا۔ ”بی بی بہت مشکل کیس ہے، نہ کوئی گواہ نہ کوئی ثبوت، تم کس طرح ثابت کرو گی کہ اسی نے تمہارے شوہر اور باپ کو قتل کیا ہے۔“

”آپ ایک بار تھانے دار پر دباؤ ڈال کر ایف آئی آر کٹوا دیں۔ قتل کا جرم ناقابل ضمانت ہے۔ وہ جیل چلا گیا تو لوگوں کے دل سے اس کا ڈر نکل جائے گا اور وہ اس کے خلاف گواہی دینے پر تیار ہو جائیں گے۔ باپ کے قتل کی تو میں عینی شاہد ہوں۔ کیا میری گواہی کافی نہیں ہوگی۔“

میری باتوں سے وہ کچھ قائل ہوا۔ کہنے لگا۔ ”ٹھیک ہے آپ مجھے متعلقہ تھانے دار کے نام درخواست لکھ کر دے دیں۔ میں اوپر والوں سے کہہ کر ایف آئی آر کٹواتا ہوں لیکن اس کے لیے آپ کو ایک بار تھانے جا کر بیان ریکارڈ کروانا ہوگا۔“

دوسرے دن میں وکیل کے اسسٹنٹ اور شاہ جہاں کے ہمراہ گاؤں کے تھانے گئی۔ شاہ جہاں نے میرے لیے مسلح محافظوں کا بندوبست کر دیا تھا۔ یہ وہی تھانے دار تھا جس نے زمیندار کے دباؤ میں آ کر جمال کے قتل کا مقدمہ درج کرنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ اب اسے اوپر سے ہدایت مل چکی تھی۔ لہٰذا اس کا رویہ ہی بدلا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وکیل کے اسسٹنٹ نے اس کے سامنے دونوں درخواستیں رکھیں۔ اس نے بلاچوں چرا میرا بیان ریکارڈ کیا اور نذیر کے خلاف قتل کے علاوہ میرے سسر کی زمین ہتھیانے کا مقدمہ درج ہو گیا۔ اسی روز نذیر اور اس کے ساتھیوں کو گرفتار کر لیا گیا۔

گاؤں کے لوگوں کے لیے یہ ایک انہونی بات تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ پولیس نذیر پر ہاتھ ڈال سکتی ہے۔ حالانکہ سب جانتے تھے کہ نذیر نے ہی جمال کو قتل کیا ہے اور بابا کی موت کا ذمے دار بھی وہی ہے لیکن کسی میں یہ بات کہنے کی ہمت نہیں تھی۔ نذیر کی گرفتاری کے بعد ان کا خوف دور ہو گیا اور وہ اپنے اپنے انداز میں اس پر تبصرے کر رہے تھے۔

دوسرے روز نذیر اور اس کے ساتھیوں کو عدالت میں پیش کیا گیا۔ نذیر کے وکیل نے ضمانت کی درخواست دی جو مسترد ہو گئی اور جج نے سماعت اگلی پیشی تک ملتوی کر دی۔ میرے وکیل نے عدالت میں میڈیکل سرٹیفکیٹ پیش کیا کہ میری موکلہ اسلام آباد میں رہتی ہے اور بیماری کی وجہ سے ہر پیشی پر حاضر نہیں ہو سکتی۔ اس لیے اسے حاضری سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔ عدالت نے یہ درخواست منظور کر لی اور کہا کہ اگر وکیل صفائی جرح کرنا چاہے تو اس روز مجھے عدالت میں پیش ہونا ہوگا۔

دوسرے مقدمے میں عدالت نے پٹواری کو طلب کر کے ریکارڈ منگوایا۔ جس سے ثابت ہو گیا کہ اس نے ریکارڈ میں ہیرا پھیری کر کے وہ زمین نذیر کے نام منتقل کر دی تھی۔ عدالت نے وہ زمین اصل مالکان کے حوالے کرنے اور پٹواری کے خلاف مقدمہ درج کرنے کا حکم دیا لیکن میرے سسر اور دیور کا کہیں پتا نہ تھا۔ وکیل نے اخبار میں وقفے وقفے سے تین اشتہار دیئے لیکن ان کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ اس پر عدالت نے مجھے اس زمین کا عارضی کسٹوڈین مقرر کر دیا اور شاہ جہاں نے ایک بار پھر اسے بٹے پر دے مارا۔

نذیر کے خلاف قتل کا مقدمہ طول پکڑتا جا رہا تھا۔ میرے وکیل نے تمام شواہد اکٹھے کیے اور نذیر کے گرد گھیرا تنگ ہوتا چلا گیا۔ جہاں تک کہ اس کے ساتھی بھی وعدہ معاف گواہ بن گئے اور انہوں نے جمال کے قتل کا الزام نذیر کے سر تھوپ دیا۔ زمیندار اور اس کے بیٹے بہت پریشان تھے۔ وکیل ہر پیشی پر بھاری فیس لیتا لیکن وہ کچھ ثابت کرنے میں ناکام رہا۔ زمیندار کی ساری پونجی اس مقدمہ بازی میں ختم ہو چکی تھی اور اب زمین بیچنے کی نوبت آ چکی تھی جس کے لیے وہ کسی صورت تیار نہیں تھے۔ وکیل کو فیس نہیں ملی تو اس نے مقدمے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ دوسرا وکیل کرنے کی گنجائش نہیں تھی چنانچہ نذیر کا دفاع کمزور ہوتا گیا اور مقدمے کا فیصلہ میرے حق میں ہو گیا۔ نذیر کو پھانسی کی سزا سنائی گئی جب کہ اس کے دو ساتھیوں کو سات سات سال اور بقیہ کو بری کر دیا گیا۔

میں جو چاہتی تھی وہی ہوا۔ میرا انتقام پورا ہو گیا۔ نہ صرف نذیر کو اس کے کیے کی سزا ملی بلکہ اس کا خاندان بھی قلاش ہو گیا۔ اس کے لیے میں شاہ جہاں کی مشکور رہوں۔ اس نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ اب میں شدت سے اپنے سسر اور دیور کا انتظار کر رہی ہوں تاکہ ان کی امانت لوٹا سکوں۔ اس زمین سے ہونے والی آمدنی بھی ایک بینک میں جمع کر رکھی ہے اب میں اس معجزہ کا انتظار کر رہی ہوں کہ شاہ جہاں مجھے دنیا والوں کے سامنے اپنی بیوی کہہ سکے اور میں ایک بچے کی ماں بن جاؤں۔ خدا کے یہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔ اس وقت بھی جب دنیا عید کی خوشی منا رہی ہے میرے لب پر ایک ہی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ میری دعا کو قبول کر لے۔

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM